کتابی صورت اور انٹرنیٹ پر

اُردو، پنجابی، انگریزی تخلیقات اور فکری مباحث کا عالمی ادبی کتابی سلسلہ

حریمِ ادَب

www.urdustan.net/hareem-e-adab

مرتبین

جاوید حیدر جوئیہ

سید تحسین گیلانی

رابطہ کیلئے : 1- سیٹلائٹ ٹاؤن، جاوید پلازہ، بورے والا۔ پاکستان۔ 61010، فون: 3355546-067، ای میل: hareem_e_adab2@yahoo.com

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر

اُردو، پنجابی، انگریزی تخلیقات اور فکری مباحث کا عالمی ادبی کتابی سلسلہ

ویب سائٹ www.urdustan.net/hareem-e-adab

مرتبین

جاوید حیدر جوئیہ

سیّد تحسین گیلانی

معاونین

عمران حیدر تھہیم

توقیر تقی، جاوید امجد بھٹی

رابطہ اور خط و کتابت

ڈاکٹر جاوید حیدر جوئیہ، جاوید پلازہ، 1۔سیٹلائٹ ٹاؤن، بورے والا، پوسٹ کوڈ:61010، پاکستان

فون:067-3355546

ای میل:hareem_e_adab2@yahoo.com , hareem_e_adab2@hotmail.com
hareemeadab@gmail.com

1-Setellite Town, Burewala-61010, Pakistan.

"حریمِ ادب" میں شامل تحریریں یا ان کا کوئی جزو حوالہ کے ساتھ کسی بھی کتاب یا رسالے میں شائع کیا جا سکتا ہے

ضابطہ

نام کتاب	:	حریمِ ادب
کتاب نمبر	:	3
سرورق	:	محمد بشیر موجد
کمپوزنگ	:	مثال پبلشرز، رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
اشاعت	:	تیسری جولائی/اگست 2005ء
قیمت	:	150 روپے (پاکستانی) یا 15 امریکی ڈالر (علاوہ ڈاک خرچ)
مطبع	:	رفیق افضالی پرنٹنگ پریس، فیصل آباد

چند گزارشات

- "حریمِ ادب" کی ایک اشاعت سے اگلی اشاعت تک کم از کم چھ ماہ کا وقفہ ہوتا ہے۔
- لکھاریوں سے گزارش ہے کہ مواد بھیجتے وقت لازماً مطلع فرمائیں کہ یہ مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ
- جن اہلِ قلم کے پاس اُردو/پنجابی کی معیاری تخلیقات یا ادبی وفکری تحریروں کے انگریزی تراجم موجود ہوں، براہِ کرم "حریمِ ادب" کے دفتر پر رابطہ فرمائیں۔
- "حریمِ ادب" علم وادب کے فروغ کا داعی ہے اور اس کی تحریروں کے حقوق اشاعت محفوظ نہیں ہوتے ہیں۔
- "حریمِ ادب" کو بیرونِ پاکستان سے ڈسٹری بیوٹرز کی ضرورت ہے۔ دلچسپی رکھنے والے افراد یا ادارے دفتر کے پوسٹل ایڈریس یا فون پر رابطہ فرمائیں۔ ای میل سے نہیں۔
- زرِ خرید کی وصولی ارسال کنندہ کی لازمی قلمی شمولیت سے مشروط نہیں۔
- صرف دفتر "حریمِ ادب" میں وصول ہونے والی کتب وجرائد کی رسید وصولی دی جاتی ہے۔
- براہِ کرم کتب وجرائد رجسٹرڈ پوسٹ یا کسی دوسرے محفوظ طریقے سے ارسال فرمائے جائیں۔

مرتبین ومعاونین کا "حریمِ ادب" میں شامل تحریروں کے لکھاریوں کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

صبا اکبر آبادی

اشفاق احمد

مشفق خواجہ

اور

فہیم اعظمی

کے نام

حُسن کی تاثیر پر غالب نہ آ سکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

اقبالؔ

دستک

اُردو

رسائل و جرائد جو موصول ہوئے

انشائیے

مضامین

فکاہیہ

غزلیں-II

کتابیں

خاکہ

نظمیں-II

پنجاب ویہڑا

نظماں

کہانیاں

غزلاں

ساختیات، ادبی ساختیات اور مصنّف

ہر وہ شے جو درج ذیل شرائط پر پوری اُترتی اور معنی دیتی ہو نشان (Sign) ہے:

۱۔ اس کی مادی صورت ہو یعنی اسے محسوس کیا، سنا، دیکھا، سونگھا یا چکھا جا سکے۔

۲۔ اپنے بجائے کسی دوسرے/دوسروں کی نمائندگی کرے۔

۳۔ بطور نشان متفقہ طور پر کلچر میں مسلّم اور زیر استعمال ہو۔

ہمیں اپنے اردگرد بہت سے نشانات نظر آتے ہیں۔ مثلاً چوک میں یا کسی موڑ پر نصب سُرخ، پیلی اور سبز بتیاں بالترتیب 'رُک جائیے' 'آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو جائیے' اور 'آگے بڑھیے' کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ بتیاں نشان ہیں۔ اسی طرح پگڑی 'عزت و وقار اور بزرگی' کا نشان ہے۔ سبز و سفید پرچم 'ایک ملک و قوم' کا نشان ہے۔

غور کریں تو معنی (Meaning) اِن نشانات کے مادے (Material) میں نہیں بلکہ اُس خیال (Notion) میں ہے جو ان سے ایک کلچر نے (مل جُل کر) وابستہ کیا ہے۔ فردی ناں دی سوسیئر کی فکر میں نشان (Sign) کے مادی حصے (Material form) کو "دال" (Signifier) اور اس سے وابستہ خیال کو مدلول (Signified) کہتے ہیں جبکہ خود "شے" جس کی نمائندگی کی گئی ہو Referent کہلاتی ہے۔ نشان جس 'شے' سے بنتا ہو اُس کا تعلق معنی سے نہیں گویا نام دینا من مرضی والا (Arbitrary) کام ہے۔ ایک دال کے بیشتر مدلول اور ایک مدلول کے متعدد دال ممکن ہیں۔

ساختیات میں زیادہ تر نشان کے اسی تصور کو کلچر کے مطالعے کے لیے برتا گیا ہے۔

کلچر کی کوئی بندھی اور مخصوص تعریف (Definition) مُشکل ہے لیکن غور کریں تو کلچر میں ادب، مصوری، موسیقی، لوگوں کے معاشی، سیاسی، جمالیاتی اور تفریحی رویے، عقاید، اقدار، رسوم و رواج سب شامل ہیں۔۔۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جو کچھ ماضی اور تاریخ سے ایک سماج میں موجود ہے۔ وہ بھی کلچر کا حصہ ہے۔

اب ایک اور زاویے سے دیکھیں تو کاروباری لوگوں کا کلچر، زراعت سے وابستہ لوگوں کا کلچر، صنعت و حرفت سے منسلک افراد کا کلچر اور شہر اور گاؤں کے اور ان کے مخصوص علاقوں میں لوگوں کے اپنے اپنے کلچر ہیں۔

ہر کلچر کے افراد ایک دوسرے سے باہم تبادلۂ معانی (Communication) کرتے ہیں جو اُن کے اپنے کلچر کے نشانات کے ذریعے ہوتا ہے۔۔۔ نشانات اور کلچر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور ایک کلچر کے مطالعے کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اُس کلچر کے لوگ دُنیا کے بارے میں کس طرح سوچتے ہیں اس کا پتہ لگایا جائے۔ گویا کلچر کے نشانات کا ساختیاتی مطالعہ شناخت ہوگا اُس کلچر کی جونی الوقت، یعنی بوقتِ مطالعہ موجود ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'بوقتِ مطالعہ' ہی کیوں؟ اس کا جواب سائیر کی فکر میں یہ ہے کہ نشانات کا ماضی اُن کے حال ہی میں موجود ہوتا ہے۔۔۔ وہ ایسے کہ نشانات لمحہ موجود میں جن اصول و قوانین کے ذریعے معنی دے رہے ہوتے ہیں، وہ ماضی یا تاریخ سے گزر کر آئے ہوتے ہیں اور ان اصولوں پر سب کا اتفاق ہو چکا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر کلچر کی زبانیں نشانات پر مشتمل ہوتی ہیں اور متفق علیہ قوانین کے تحت، اور اُن کی رُو سے لمحۂ حاضر میں کارفرما ہوتی ہیں لہٰذا نشانات کا ماخذ (Origin) جاننے سے ساختیات سروکار نہیں رکھتی بلکہ نشانات کی حامل زبان کے اصول و قواعد کی کھوج لگا کر وہ سب کچھ جاننا چاہتی ہے، جسے اُس کلچر کا فہم عالم (World View) کہتے ہیں۔ اس طرح ساختیات یک زمانی Synchronic ہے۔

اصطلاح میں متن کلچر کے کسی بھی نشاناتی/معنیاتی نظام (Signifying System) کا وہ حاصل (Outcome) ہے جو "پڑھا"

جائے ۔یعنی یہ ایک کلچرل تشکیل (Construction) ہے۔

چونکہ ہر نشانیاتی /معنیاتی نظام ایک زبان رکھتا ہے اس لیے ''پڑھا'' جا سکتا ہے۔ ٹیلی وژن کا پروگرام ایک الیکٹرونک متن ہے' اخبار کی خبر صحافتی متن ہے' گاؤں کا کوئی میلہ دیہاتی رسمی متن ہے' ایک صنعتی نمائش کمرشل متن ہے۔ وڈیو/ آڈیو سی ڈی یا کیسٹ سمعی وبصری متن ہیں' انٹرنیٹ کی ایک ویب سائٹ ورچول (Virtual) سمعی /بصری متن ہے۔ غزل' افسانہ' ناول' نظم' کتاب' سب متون ہیں۔ کلچر کے افراد متون کی زد میں ہیں۔ انسانی شعور انہی متون سے تشکیل پاتا ہے۔ یعنی مختلف Signifiers اور Signifieds مختلف انواع کی زبانوں کے یہاں موجود رہتے ہیں بلکہ اس سے بھی آگے ژاک لاکاں کے نظریے کو پیش نظر رکھیں تو لاشعور بھی زبان کے ساتھ ہی وجود میں آجاتا ہے اور زبان کی طرح کام کرتا ہے۔ ہر متن کچھ رسوم یعنی کنونشنز کو بروئے کار لا کر لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

کنونشنز کا مطلب وہ رائج علم اور اصول ہیں جو ایک کلچر میں کسی متن کی تشکیل (Construction) اور قرأت (Reading) کے لیے مشترکہ طور پر مسلمہ ہوں۔

قرأت (Reading) کا مطلب اُن اصولوں کی دریافت ہے جن سے معانی کا ظہور ایک متن میں ممکن ہوتا ہے۔ نیز یہ اُصول مقرر (Fixed) نہیں' بلکہ قاری کی معنی خیزی کی استعداد پر منحصر ہیں۔

ٹیلی وژن کے متون کی تشکیل و قرأت کی اپنی کنونشنز ہیں' مثلاً ایک ڈرامے (Play) کا متن کچھ اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر تشکیل دیا جاتا اور 'پڑھا' جاتا ہے جبکہ ایک نیوز بلٹن (خبروں) کی اپنی کنونشنز ہیں۔ کنونشنز کو بروئے کار نہ لایا جائے تو پتہ ہی نہ چلے کہ ایک کھیل' ڈاکومینٹری (Documentry) یا نیوز بلٹن میں کیا فرق ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک متن تشکیل دینے یا پڑھنے کے لیے' اُس کی کنونشنز کو برابر ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ یہ عام مشاہدہ (اور تجربہ) ہے کہ جب ایک شاعر مثلاً غزل کا متن تشکیل دے رہا ہوتا ہے تو برابر ذہن میں رکھتا ہے کہ یہ صنف وہ ہے جس میں قافیہ اور (ردیف) ہوتے ہیں۔ آہنگ اور بحر ہوتی ہے' مطلع اور مقطع ہوتا ہے' تشبیہہ واستعارہ ہوتے ہیں۔ یہی کنونشنز غزل کا متن پڑھنے والے کو بھی پیش نظر رکھنا ہوں گی' ورنہ معنی یابی کے اصول دریافت ہو ہی نہ سکیں گے۔

زیرِ نظر تحریر میں ہمارا سروکار صرف ادب سے ہے اور ہم ادب کی ساختیاتی تشکیل و قرأت کے اصولوں تک ہی محدود رہیں گے لیکن اتنی تمہید اس لیے ضروری سمجھی گئی تا کہ یہ دکھایا جا سکے کہ ایک فرد جب ''لمحۂ حال'' میں لکھ رہا یا پڑھ رہا ہوتا ہے' تو (لاشعوری طور پر ہی سہی) کتنے ہی غائب متون اُس کے پاس ہوتے ہیں۔۔۔ جو سب اُس کی 'اپنی تخلیق' نہیں ہوتے بلکہ مختلف نشانیاتی زبانوں پر مشتمل ہونے کے باوصف پورے کلچر کی ''تشکیل'' ہوتے ہیں۔ گویا ساختیات میں متن بین المتونیت کا حامل ہوتا ہے۔

لٹریچر کی زبان کا نشان لفظ ہے (نشان کی متذکرہ بالا خصوصیات پیش نظر رہیں)

شکلیں اور آوازیں جو لفظ 'کتاب' لکھنے یا کہنے سے وجود میں آئیں' اس نشان کا ''دال'' (Signifier) ہیں اور جو تصور اس دال سے وابستہ ہو وہ 'مدلول' (Signified) ہے' جب کہ خود کتاب کے اوراق اور جلد وغیرہ بطور شے (Referent) پس پردہ ہیں۔

عام زبان تبادلۂ معانی (Communication) ہے۔ گویا اس کے ذریعے ہم پیغام رسانی اور پیغام فہمی کرتے ہیں۔ ایک سادہ سے جملے کی مثال لیجیے:

''کتاب علم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔''

اس کا ایک Message قاری تک پہنچتا ہے جو کئی اصولوں کے تحت بنتا ہے' جن میں سے دو اُصول بنیادی ہیں۔

پہلا اصول یہ ہے کہ لکھنے والے نے اُردو زبان کے جو نشانات (الفاظ) اُس کے تصرف میں بوقت تحریر موجود تھے' اُن میں سے صرف آٹھ نشانات کو منتخب کیا۔۔۔ 'کتاب'؛ 'کرنے'؛ 'لیے'؛ 'کے'؛ 'حاصل'؛ 'ہے'؛ 'ضروری'۔۔۔ نشانات کی وہ زَد (Range) جو ایک پیغام کی تشکیل کے لیے ضروری ہو پیراڈائم کہلاتی ہے۔

ساختیات میں ایک پیغام کی ساخت گری کے لیے پیراڈائم سے ایسا چناؤ ''انتخابی'' یا عمودی (Paradigmatic) چناؤ کہلاتا ہے۔

دوسرا اصول یہ ہوا کہ آٹھ نشانات یا الفاظ کے چناؤ کے بعد ایک خاص ترتیب سے انھیں لکھا گیا' تو پیغام (Message) ''بامعنی'' بن پایا۔ اگر اس ترتیب کو آگے پیچھے کر دیا جائے تو پیغام بن نہیں پائے گا۔

یعنی

''ضروری کرنے کے لیے حاصل، علم، کتاب'' کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ کیونکہ کونشنز کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا۔

اِس ترتیب و ترکیب کو نشانات (الفاظ) کے مابین ربطی رِشتہ (Syntagmatic Relation) کا نام ملا ہے۔

ساختیاتی قرأت میں Paradigm اور Syntagm دریافت کرنے کی بہت اہمیت ہے۔ مثلاً مندرجہ بالا جملے کو پیش نظر رکھیئے تو پیغام یوں بھی بن سکتا تھا:

''بائبل علم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔''

صرف ایک پیراڈائم چناؤ کے بدلنے سے Message کی نوعیت ہی بدل گئی۔ یا یوں کہیے کہ اس سے لکھنے والے کی آئیڈیالوجی ظاہر ہوگئی یا اُس کا لاشعور دریافت ہوگیا اور پیغام میں مذہبی آئیڈیالوجی کوڈ ہوگئی۔

پیغام میں معنی Signifiers کے عدم وقوع سے بھی پیدا ہوتا ہے مثلاً: ''علم'' کا نشان اس لیے بھی معنی دیتا ہے کہ یہ ''جہل'' نہیں ہے۔ یہ دونشانی انتہائی فرق جڑواں تخالف (Binary Opposition) کہلاتا ہے۔ ''ضروری'' کا معنی اس لیے بھی ہے کہ یہ ''فضول'' نہیں۔ روزمرہ بات چیت میں ایسے کئی متخالف جوڑے نشان زد کیے جاسکتے ہیں۔

یہی پیغام اپنا معنی ایک اور طریقے سے بھی قائم کرتا ہے۔۔۔ اور وہ سطح دال کی آواز کی سطح ہے مثلاً 'کتاب' کا دال اس لیے بھی اپنا مدلول رکھتا ہے کہ یہ 'کباب'، 'شباب' یا 'عتاب' نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ یہ ''کاپی'' نہیں ہے۔

متذکرہ جملے کو پیش نظر رکھیئے تو ایک اور چیز بھی اس کا معنی بناتی ہے۔۔۔ اور وہ ہے اِس کا تناظر (Context)۔ مثلاً جو تحریر آپ پڑھ رہے ہیں اُس کے تناظر میں اِس Message کا مفہوم ایک 'مثال' کے طور پر لیا جائے گا لیکن اگر یہی جملہ کسی ایسے تناظر میں ہو جہاں ایک باپ اپنی اولاد کو نصیحت کر رہا ہے' تو اس کے معنی کی جہت اخلاقیاتی (Ethical) ہو جائے گی۔ گویا تناظر کے بدل جانے سے بھی معنی بدل جائیں گے۔

اِسی طرح پیغام میں نشانات کے ربطی رشتوں (Syntagmatic Relations) کی بھی معنی سے کئی نسبتیں ہیں۔ مثلاً اسی پیغام کو یوں بھی کوڈ کیا جاسکتا ہے۔

''کتاب علم ہے۔''

گو کہ 'کتاب' اور 'علم' دو الگ الگ نشانات ہیں لیکن اِسے لکھنے والے نے اس اُصول کو مدِ نظر رکھ کر ترتیب دے دیا کہ: بامعنی ہونے کے لیے نشانات کے درمیان قربت (Contiguity) اور مماثلت (Similarity) کے رشتے بھی ہوتے ہیں جو معانی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسانی تجربہ بعض اوقات اظہار کے لیے لفظوں کو مماثلت اور قربت کے لحاظ سے جوڑتا / توڑتا ہے اور سب کچھ زبان کی کونشنز کے مطابق کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب اصول متفقہ کونشنز کے تحت متون میں کوڈ ہو گئے ہوتے ہیں۔

استعارہ (Metaphor) اور مجاز مرسل (Metonymy) اِسی اصول کے تحت وجود میں آتے ہیں۔ زبان کے کئی اصول ہیں جن سے ایک ہی Message کو کئی طرح سے کوڈ کیا جاسکتا ہے مثلاً

''زید نے بکر کا کام کیا۔''

کو اگر یوں لکھا جائے ''بکر نے زید سے کام لیا۔''

تو معنی کم و بیش ایک ہی ہے لیکن اِن کی ترکیب (Syntax) بدل گئی ہے' جس سے نشانات کے Paradigmatic اور Syntagmatic دونوں رشتوں میں فرق آیا ہے۔ نوام چامسکی کا کہنا ہے کہ زبان کے غیب حصے میں ایک گرامر ہے جو انفرادیت کو جنم دیتی اور نشانات کے رشتوں کی

تقلیب کرتی ہے' گویا اُن کی نوعیت بدل ڈالتی ہے۔ وہ اسے نشانات کی تقلیبی گرامر (Transformational Grammar) کا نام دیتا ہے اور زبان کی اس غائب ہیئت کو اہلیت Competence کہتا ہے۔

یہ تو ایک سادہ سے جملے کی بات تھی۔ ایک فن پارے میں کئی کوڈ ہوتے ہیں' جو ایک جملے سے لے کر استعارہ' تمثیل' کردار' علامت' کرداروں کے رویوں' اُن کی خصوصیات اور کلچر کے مختلف معنیاتی نظاموں سے اُن کرداروں کے رشتوں اور دیگر صنائع بدائع سے فن پارے کا متن بناتے ہیں۔ گویا پیغامات کوڈز کی صورت میں ہوتے ہیں' یعنی مخفی ہوتے ہیں اور ان کی تشکیل چند در چند اصول وضوابط کے مطابق کی گئی ہوتی ہے' اور ایسے معانی رکھتے ہیں' جو منقلب ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے ادبی تحریروں میں زبان کا Communication System بدل بھی جاتا ہے۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ اس متن کو کیسے پڑھتا ہے۔ فن پارے کے تھیم Theme پر توجہ کرتا ہے' علامتی نظام پر نظر رکھتا ہے' جز واں متخالف دریافت کرتا ہے یا کچھ اور زاویہ اپناتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے تعین کے بعد وہ کوڈز میں معنی خیزی کا منظر دیکھتا ہے۔ کوئی پڑھے گا نہیں تو معنی کا وقوع و وجود ثابت نہیں ہو سکے گا۔ اسی لیے ساختیات میں قاری (Reader) کی اہمیت 'مرکزی' ہے۔

غور کریں تو یہ سارے قواعد وضوابط ہم لکھتے بولتے وقت لاشعوری طور پر استعمال کر رہے ہوتے ہیں اور انھیں صرف اس لیے'' جانتے'' ہوتے ہیں کہ زبان کی باطنی ساخت میں یہ پہلے سے گویا'' لکھے'' ہوئے ہیں۔ تو نتیجہ کیا نکلا؟ پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ زبان کا'' باطن'' اپنے'' ظاہر'' کے لیے اصولوں کا پابند ہے اور دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ زبان کے باطن کو تجزیاتی عمل سے گزاریں تو معنی پیدا ہونے کے اصول ملتے ہیں۔ گویا ساختیاتی قرأت معانی کا جواز فراہم کرتی ہے' کوئی چھپا ہوا معنی دریافت نہیں کرتی۔ ادبی زبان کی یہ غائب ہیئت جو کنونشنل ہے اہلیت یا لانگ (Langue) کہلاتی ہے اور ادب کی لانگ کو'' شعریات'' کہتے ہیں۔

یا یوں کہیے کہ زبان کی اہلیت نے سب کچھ لکھا' لکھاری محض'' ذریعہ'' بنا۔ اس لیے لسانی ساختیات نے کہا:

''Language writes, not writer.''

''لکھت لکھتی ہے' لکھاری نہیں۔''

جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اگر ایک فن پارے کے ساتھ اُس کے 'لکھاری' کا نام گرامی جو شخصیت کے مماثل ہے' نہ بھی لکھا گیا ہو' تو بھی اُسے پڑھا جا سکتا اور معنی کے مناظر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اسی تناظر میں رولاں بارت نے کہا:

''The Author is dead''

''مصنف مر چکا ہے۔''

واضح رہے کہ اس سے بارت نے گوشت پوست کی انسانی ہستی کی موت کا اعلان نہیں کیا بلکہ' لکھاری پر نشانیاتی زبان اور لسانیات کی برتری بتائی ہے اور یہ بات اُن قضایا کا منطقی نتیجہ ہے جو ساختیات اپنے مطالعے کے لیے بروئے کار لاتی ہے۔ یعنی لکھنا/بولنا زبان کی وجہ سے اور اس کی رُو سے ہے اور زبان کسی کی شخصی ملکیت نہیں' کلچر سے آئی ہے۔ اُس نے واضح طور پر لکھا ہے کہ اب کوئی'' شخص'' نہیں ہے جو لکھتا ہے' بلکہ ایک موضوع (Subject) ہے وہ تحریر کا ایک لمحہ ہے۔

"Linguistically, the Author is never more than the instance writing, just as *I* is nothing other than the instance saying *I*; language knows a 'subject', not a 'person' and this subject, empty outside of the every enunciation which defines it, suffices to make language 'hold together', suffices that is to say, to exhaust it... ("The death of the Author"--- Roland Barthe.)

یوں وہ لکھاری جو زبان کا'' ذریعہ'' ہے۔ اُس کو مصنف قرار دینے کی کوئی منطق اس لیے نہیں ہے کہ قرأت کے وقت قاری اگر مصنف کے ارادے' نیت اور اُس کے نام کو ذہن میں رکھے گا تو (ساختیاتی) معنی میں ملاوٹ کا مرتکب ہوگا۔ بارت نقاد ہے لیکن اپنے پیش رو نقادوں کو اس ملاوٹ کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مصنفین کو دراصل نقادوں نے'' پیدا'' کیا ہے ـــــ اُن نقادوں نے جو متن کا مطالعہ' مصنف کی سوانح عمری

اور کوائف حیات وغیرہ کی رُو سے کرتے ہیں یعنی متن کو مصنف کے ارادے اور شخصیت سے منسوب کرنا، متن پر حد عاید کرنا ہے، جس سے یہ مطلب ہے کہ جیسے کوئی حتمی معنی برآمد کیا جاسکتا ہے جبکہ ایک فن پارہ ہمیشہ کثرتِ معانی سے لبریز ہوتا ہے اور یہ بھی کہ تاریخی طور پر مصنفین کی جو حکمرانی رہی ہے وہ نقادوں کی بھی حکمرانی تھی۔

"To give a text an Author is to inpose a limit on the text, to furnish it with a final signified, to close the writing. Such a conception suits criticism very well, the latter then allotting itself the important task of discovering the Author (or its hypostases: society, history, psyche, liberty) beneath the work: when the Author has been found, the text is 'explained'- victory to the critic. Hence there is no surprise in the fact that historically, the reign of the Author has also been that of the Critic.

گویا بارتؔ مصنف (Author) اور 'لکھاری' (Writer) کا فرق بیان کر رہا ہے۔ وہ لکھاری کا قائل نہ ہوتا تو ان کی دو اقسام کیوں بیان کرتا۔ ایک وہ لکھاری ہیں، جن سے سیدھی سادھی پیغام رسانی سرزد ہوتی ہے اور دوسرے وہ ہیں جن کی تحریریں تہہ دار اور معانی کی کثرت کی حامل ہوتی ہیں اور اِس فرق کا فیصلہ قاری کے پاس ہے۔ بارت نے لکھاری کا اثبات کئی جگہ کیا ہے مثلاً گریگری۔ ایل۔ اُلمر (Gregory. L. Ulmer) نے لکھا ہے:

"Barthes concluded that the categories of literature and criticism could no longer be kept apart, that there were only writers.

(بارتؔ نے یہ نتیجہ نکالا کہ ادب اور تنقید کی مدیں الگ الگ نہیں کی جاسکتیں کیونکہ اب صرف لکھاری ہی موجود ہیں۔)

دیکھنا چاہیے کہ بارتؔ لکھاری کے نام 'شخصیت' کوائف اور اُس کے 'منشائے تخلیق' کو قرأت (معنی یابی) کے عمل سے الگ رکھنا چاہتا ہے تو اس کی دلیل کیا ہے؟ کیونکہ ''نام'' ضروری تو ہے کہ اِسے ایک Norm کا درجہ حاصل ہے، اور ایک نام بطور ایک لسانی نشان کے دوسرے ناموں سے فرق (Difference) کا رشتہ قائم کرتا ہے، اور پہچان کراتا ہے ''یہ'' اعتباطی (Arbitrary) تو ہے لیکن سماجی سطح پر اس کے کچھ پہلو Ethical جہت بھی رکھتے ہیں ــــ مثلاً انسانی تعلقات میں رشتوں کی پہچان اور اُن سے وابستہ عزت و تکریم ایک ناگزیر اخلاقی معاملہ بھی ہے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو شخصی ''نام''، بعض اوقات واقعتاً متون کی قدر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً عام مشاہدہ ہے کہ جب کوئی فن پارہ سُنایا پڑھا جائے، اور اس کے لکھاری کی شخصیت ذہن میں نہ ہو تو قاری غیر جانبدارانہ رویہ اپناتا ہے، لیکن جب پتہ چلے کہ فلاں شخصیت اس سے وابستہ ہے تو دو طرح کے ردِ عمل بالعموم سامنے آتے ہیں۔ اگر تو نام، معاشرتی سطح پر کلچر کا کوئی مرعوب کُن نام ہو، تو قدرِ متن میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس اگر غیر معروف اور کم سماجی رُتبے والا نام منسلک ملے تو ردِ عمل ''اور محنت کی ضرورت ہے'' جیسے تخفیفی عمل میں بدل جاتا ہے۔ تعریف و تحسین بھی ہوتی ہے جس سے لکھاری مسرّت پاتا ہے۔

ہمارے اِردگرد بہت سے ایسے بامعنی متون ''لکھے'' ہوئے ہیں، جن کے ''مصنفین'' کے 'منشائے تخلیق' کو جانے بغیر ہم اُن کی قدر کرتے ہیں۔ مثلاً محاورہ، کہاوت اور ضرب المثل کو لیں جو اگرچہ کثرتِ استعمال سے 'نشان' کی سطح پر پہنچ چکے ہوتے ہیں، لیکن ہم ان تشکیلات کو اپنی لکھتوں میں اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ وہ بامعنی ہیں۔ شادی بیاہ کی رسموں کے ٹپے، ڈھولے اور ماہیے ہیں۔ اِن کے مصنفین کے نام اور ارادے لڑکیوں، بالیوں کو کہاں معلوم ہوتے ہیں! لیکن یہ سب کلچر کے اہم رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ معنی دیتے ہیں۔۔۔ بہت سے لوک گیت ہیں، جن کے لکھنے والوں کا ارادہ جانے بغیر بھی وہ بامعنی ہیں۔ جدید دَور میں فلمیں ہیں جنھیں ہم اُن کے 'لکھاری' کے بجائے 'ڈائریکٹر یا سٹار کے حوالے سے جان کر دیکھتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مجاز مرسل کا استعمال ہے کہ ڈائریکٹر یا 'سٹار' کے نام سے مراد لکھاری ہی ہوتا ہے، لیکن غور کریں تو منکشف ہوگا کہ صرف ایک لکھاری کا نام اور اِرادہ، فلم کے متن کی تشکیل نہیں کرتا، بلکہ سینکڑوں 'ارادوں' کے امتزاج سے فلم کا متن متشکل ہوتا ہے، جن میں سٹارز، کہانی نویس، ڈائریکٹرز، کیمرہ مین وغیرہ سب شامل ہوتے ہیں۔

جہاں تک ادب کا معاملہ ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ ادبی متن دوسرے متون سے منفرد حیثیت کا حامل' زیادہ تہہ دار اور زیادہ 'طلسم' کا حامل ہوتا ہے (اور بے شک ہوتا ہے) لہٰذا یہاں مصنف کا ارادہ جاننا ضروری ہے' اور یہ ارادہ اُس کے تاریخی کوائف اور تذکروں سے حاصل ہوگا' یا اُن دیباچوں اور تقریظوں سے ملے گا جو اس کے فن کے بارے میں لکھے گئے ہوں۔ یہ باتیں شخصیت پرست نقادوں کے لیے تو شاید مفید ہوں' ساختیاتی نقاد ایسی آراء کو خاطر میں نہیں لاتا۔

پچھلے دنوں راقم کی نظر سے ایک مضمون بعنوان ''اصلاحِ سخن'' گزرا جس سے جہاں فنِ غزل گوئی اور زبان و ادب کے نکات سے آگاہی ہوتی ہے تو دوسری طرف مذکورہ غزلیات کے بین المتونی مطالعے میں مدد ملتی ہے اور ارادے/ارادوں کی حقیقت کھلتی ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر یہ مضمون حوالے اور شکریے کے ساتھ ''اطراف'' کے فوراً بعد پیشِ قارئین ہے۔

''حریمِ ادب'' کا موقف ہے کہ ادبی اور فکری معاملات کے ساتھ معاملہ ادبی و فکری سطح پر ہی کیا جانا چاہیے۔ یہ کتاب ساختیات' پس ساختیاتی افکار' مابعد جدیدیت' یا کسی اور مخصوص فکر کے پرچار کے لیے وجود میں نہیں آئی ہے اور نہ ہی ہمارا مقصد کسی قسم کا فکری یا ذہنی استحصال کرنا ہے۔ بلکہ سب افکار سے ادبی قدر کے تعین میں مدد لینا ہے۔

اپنے فلسفے کی رُو سے کارل مارکس کے نزدیک چونکہ مذہب عوام کے لیے افیون تھا۔ تو یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ مذہب سے منسلک تمام عوامی تخلیق کاروں کو افیمی کہتا ہے' سراسر زیادتی ہے۔ اُس کی فکر نے انسانی شعور کو سماجی جدلیاتی عمل کا نتیجہ قرار دیا' اور ہر طرح کی مابعدالطبیعات کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ وہ ایک چیز جسے انسانی جوہر کا نام دیا جاتا ہے اس میں حقیقت نہیں' یوں گویا انسانی شعور اور ادب کو معاشرے اور تاریخ کی ''پیداوار'' قرار دیا۔ ساختیات سے متاثر ہونے والے ایک مارکسی مفکر پیئر ماشرے (Pierce Machery) نے مارکسی خیالات کو ساختیات کی روشنی میں پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ لکھاری ایک Workman (محل مزدور) ہے۔ اب ان کو نشانہ تضحیک بنانا قرینِ انصاف اس لیے نہیں کہ ان قابلِ احترام مفکرین نے اپنی اپنی فکر کے لیے یہی الفاظ منتخب کیے اور ایسا اپنے افکار کے منطقی جبر کے تحت کیا۔ مارٹن گرے نے لکھا ہے:

> Machery examines the relationship between literature and ideology, taking up ideas initiated in political philosophy of Altheusser, and evolves a 'matearialist' theory of literary 'production' in which the writer is a 'workman' who 'produces' texts. These metaphors are supposedly less mysterious than those of the writer as 'creater' (with all the mythological attachments that word has), and the idea that the literary work is a 'creation' made out of nothing.

اب اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ماشیرے نے تخلیق کار کی موت کا اعلان کر دیا اور محل مزدور کو زندہ کر دیا ہے نیز پوچھا جائے کہ ماشیرے نے مثلاً کسی الہامی کتاب کا مارکسی ساختیاتی مطالعہ کیا یا نہیں' تو یہ جذباتیت اور فکری غرابت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا' کیونکہ اُس کی فکر مابعدالطبیعات کی سرے سے نفی کرتی ہے۔

اسی طرح نفسیاتی تجزیہ کرنے والے نقاد (Psychoanalytic Critics) جب لاشعور میں دبی حیوانی جنسی خواہشات کو فن پارے سے برآمد کرتے ہیں' تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تخلیق کار کے ''جانور'' کو دریافت فرماتے ہیں۔

ساختیات' نفسیات' مارکسزم' جدیدیت (موجودیت)' مابعد جدیدیت' امتزاجی رویہ' یا کوئی بھی اور فکر' نظریہ یا تھیوری ادبی قدر کے تعین میں راہنمائی کرے تو وہ یکساں سطح پر قابلِ احترام ہے کیونکہ فکر و فلسفہ کا کام سوال اُٹھانا اور پھر اس کی راہنمائی میں جواب فراہم کرنا ہے اور ہر مکتبِ فکر کے سوالات اور جوابات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ فکر' فلسفہ' طریق کار سب کا موضوع انسان اور کائنات ہیں۔ یا کم از کم انہی پر آ کر منتج ہوئے ہیں۔ اس لیے کوئی فکر حتمی اور آخری ہو ہی نہیں سکتی اور اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ بعض واقعات کو روکنا اور ان پر عبور حاصل کرنا تا حال انسان کے بس میں نہیں ہے مثلاً' موت' ایک ایسی ہی حقیقت ہے۔

نطشے کی فکر سے اثر لینے والے کسی شخص نے لکھا:

God is dead-Neitzsche.

تو کسی مخالف نقطہ نظر والے نے اس کے ساتھ ہی لکھا:

Neitzsche is dead-God.

اسی طرح ساختیات میں ''موت'' کا تصورِ زبان کی ''حیات بعد الموت'' کا تصور بھی ہے جسے شکل دوام بہر حال لکھاری اور قاری ہی دیتے ہیں۔

یہ امر بے حد اطمینان بخش ہے کہ ''حریم ادب'' کے پنجابی اور انگریزی حصے میں کچھ نئے لکھنے والے بھی شامل ہوئے ہیں۔ اس طرح ایک لحاظ سے انگریزی ترجمے کے سلسلہ میں مرتبین کی مشکلات کم ہوئی ہیں اور پنجابی کے لکھاریوں نے اپنا رویہ بدلنے کی طرف مائل ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔

''حریم ادب'' کے دو شماروں کے بعد یہ تیسرا شمارہ بے تعصب فکر و ادب کے فروغ و شمولیت کے لیے کیا کردار ادا کر پائے گا اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں، مگر ایک بات کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ ''حریم ادب'' سچی تحریر کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھے کا ثبوت بفضلِ خدا قارئین کو پیش کرتا رہے گا۔

مَیں اپنے جملہ کرم فرماؤں (ساتھیوں اور قارئین) کا بے حد ممنون ہوں کہ اُنہوں نے ''حریم ادب'' کی پذیرائی کی۔ بالخصوص محترمہ فرحت پروین ملک (بیگم نظیر صدیقی) کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ اُنہوں نے صدیقی صاحب کی چند نایاب کتابیں بھیجیں اور اُن اصحاب کا بھی بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے نظیر صدیقی صاحب کے خطوط مہیا کیے۔

''حریم ادب'' کے معزز قاری اور لکھاری، جمیل آذر صاحب کی اہلیہ کی وفات کی دل سوز خبر سے ابھی دل نہیں سنبھلا تھا کہ ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن بھی راہیِ عدم ہوئے۔ ادارہ کی طرف سے مرحومین کے لیے دُعائے خیر! خدا لواحقین کو صبر دے!

جاوید حیدر جوئیہ

بولی تے بولنا

پنجابی دے وادھے لئی کی کجھ کیتا جا رہیا اے۔۔۔؟ کی کجھ کیتا جا چکیا اے۔۔۔؟ تے کی کجھ ہونا چاہیدا اے۔۔۔ اے سب سوال اک پاسے۔۔۔ جو کجھ میں ہالے تیکر ویکھیا اے تے ویکھ رہیا واں او کجھ انج اے پئی پنجابی لوکائی دا وڈا حصہ پنجابی بولن نوں ای انج سمجھدا اے جیکر چار بندیاں وچ پنجابی بولنی پے گئی تاں ویکھن سنن والے کی آکھن گے۔۔۔ حالانکہ ویکھیا جائے تے جنے چنگے اکھراں وچ اساں لوک اک دوجے نوں پنجابی وچ سمجھا سکدے آں یا انج آکھیا جائے کہ کھل کے جیویں اسیں پنجابی وچ اک دوجے نال گل بات کر سکدے آں او شیدائی کسے ہور زبان وچ کر سکدے ہوئیے پر نئیں پنجابی بولن والے نوں اُجڈ پینڈو تے پتہ نئیں کی کی آکھیا جاندا اے۔ اساں ذرا اپنے گھراں وچ ای اک نظر ماریے تاں ویکھ لواں گے کہ کوئی وی ایس گل لئی تیار نئیں کہ اوہدے بال پنجابی وچ گل کرن۔ اے نفرت اساڈے دلاں وچ کس طراں آئی تے کدوں توں اے؟ اے اک ہور سوال اے۔ اے مٹھی تے سوہنی بولی جہدے وچ اساڈے صوفیاء نیں کنا کجھ لکھیا تے اپنی فکر دے پھل کھڑاون لئی ایس بولی نوں چنیا پر پتہ نئیں کیوں اج دا پنجابی اپنی بولی لئی وی تیار نئیں جد کہ دنیا وچ اونہاں قوماں ہمیشہ ترقی کیتی جیناں اپنی ماں بولی دے وادھے لئی راتاں جاگ کے کٹیاں۔۔۔

سوچن والی گل اے پئی کیا اساڈی بولی ایس حد تک دوجیاں بولیاں دے بھار تھلی دب گئی اے پئی ایہنوں سر چکناں وی اوکھا ہوندا جا رہیا اے۔۔۔ پنجابی پڑھیاراں دی گل کرن واویلا تے دُور دی گل اے، ویکھنا تے اے وے کہ ایس بولی نوں بولن کِنی لوکائی تیار اے تے اساڈی سرکار تے اساڈا لکھاری ایہنوں بولی دے طور تے بولن لئی لوکاں نوں کس طراں تیار کر دے نیں۔

سیّد تحسین گیلانی

اصلاحِ سخن (سولہ غزلوں پر بیالیس اساتذہ کی اصلاحیں)

بحوالہ وبشکریہ ''نقوش'' لاہور' ادبی معرکے نمبر' شمارہ ۱۲۷' ستمبر ۱۹۸۱ء' ص:۵۶۱ تا ۵۸۵

محمد عبدالعلی شوق سندیلوی نے سولہ غزلوں پر بیالیس اساتذہ کی اصلاحیں مرتب کی ہیں یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ شعروادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید بھی ہے اور غور طلب بھی۔ شوق صاحب نے اپنے آپ کو شاگرد کی حیثیت سے ہر استاد کے سامنے پیش کیا اور ان سے اپنی غزلوں کی اصلاح کے لیے درخواست کی۔ چنانچہ ان کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا گیا اور ہر استاد نے ان کی غزلوں کے جس شعر میں اپنی اپنی سمجھ کے مطابق جو سقم دیکھا اُسے بتادیا۔ پھر شوق صاحب نے ایسی جدت سے کام لیا کہ جس کی مثال اُردو ادب میں نہیں ملتی کہ ایک ہی غزل کو مختلف حضرات سے اصلاحیں لے کر اور پھر اُسے شائع کر دیا۔ چند اساتذہ کے خطوط بھی کتاب کے آخر میں شامل کر دیئے اگر چہ اُن میں کچھ رکیک باتیں بھی تھیں لیکن خدا جانے ان کو کیوں خارج نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ان کو ایسا کرنے سے تحقیق و تدقیق میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ البتہ ایسے خطوط کی اشاعت سے اساتذہ کو ضرور رکان ہو گئے ہوں گے لیکن پھر بھی اس حصے میں اساتذہ نے زبان اور فن کے جن باریک نکات کو سمجھایا ہے۔ اس سے شعروادب کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں 'میدانِ محشر' اور 'میدانِ حشر' کی بحث دلچسپ بھی ہے اور دعوتِ فکرونظر بھی دیتی ہے۔ مرتب نے جن غزلیات پر اصلاح لی گئی ہے شروع میں ان کا پہلا مصرع لکھ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بیالیس اساتذہ کے نام درج ہیں جن کی اصلاحیں شاملِ اشاعت ہیں۔ چند حضرات نے اس کتاب کا تعارف لکھا ہے۔ ان میں پہلا نام مولونا نیاز فتح پوری کا ہے۔ انہوں نے تقریب کے عنوان سے اپنی رائے گرامی کا یوں اظہار فرمایا ہے۔

''میرے خیال میں محمد عبدالعلی شوق بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں' جو اس باب میں میرے ہم نوا ہیں اور مجھے یہ محسوس کر کے مسرت ہوتی ہے کہ اُن میں حصولِ شہرت کی کاذب تمناؤں کے بجائے۔ خدمتِ زبان کا صادق مگر خاموش جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ ادبِ لطیف کے دیرینہ قدر شناس اور فنِ غزل گوئی کو ترقی یافتہ دیکھنے کے از بس شائق ہیں۔ چنانچہ ان کا یہی ولولہ تھا جس نے اس رسالہ کی ترتیب پر انھیں مجبور کیا جو اپنے موضوع کے لحاظ سے جس قدر جدید ہے اسی قدر مفید بھی ہے۔''

دیباچہ' مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے۔ حضرت شرر نے جناب شوق کی مساعی جمیلہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور کہا ہے کہ ''ہمارے دوست اگر ایسی ہی تھوڑی اور غزلیں اور اصلاحیں شائع فرمادیں تو اختلافِ زبان و مذاق کے صحیح اصول قائم کر کے اس امر پر بحث کی جاسکے گی کہ یہ اختلاف کیوں ہیں۔ کس صحبت یا کس سرزمین یا کس خاندانِ شاعری کا اصلی مذاق ان اختلافات کا باعث ہوا اور اصولاً اختلافات کے اسباب کا پتہ لگا لینے کے بعد اُردو پر سچی تنقید ہو سکے گی' جس کی طرف فی الحال ہمارے مولوی عبدالحق صاحب اپنے ''رسالہ اُردو'' میں خصوصیت سے توجہ فرما رہے ہیں اگر جنابِ شوق نے خاص اس طریقے کو وسعت کے ساتھ ترقی دی تو محققین زمانہ اُردو زبان کی اصلاح اور اس کے مختلف اسکولوں پر اصولاً بحث کرنے کا بہت اچھا موقع ملے گا۔''

اصلاحِ سخن کا مقدمہ جناب سلطان حیدر جوش نے لکھا ہے جو تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ مقدمہ بلیغ ہونے کے علاوہ اصلاحِ شعر پر محققانہ بحث بھی لیے ہوئے ہے۔ شعر کی اصلیت' سادگی' جوش' مطالعہ کائنات وفطرت پر عالمانہ بحث کی ہے۔ یہ بحث دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی۔ مقدمے کے آخر میں اپنی رائے کا اظہار یوں فرماتے ہیں۔ ''اصلاح کا مقصود محض عیوب و نقائص رفع کرنا یا ماندرنگ کو اُجالنا ہے۔۔۔ مگر نفسِ مضمون کو از سرتا پا بدل دینا یا اپنی طرف سے ایک نیا تخیل پیش کر دینا اصلاح کا منشا نہیں۔۔۔ ناظر کے دل ودماغ میں کسی خاص نقشِ اصلاح کے پسندیدہ یا قابلِ اعتراض قرار پانے کا ذمہ دار خود ناظر کے سوائے اور کون ہو سکتا ہے! حضرتِ شوق متعدد دماغوں سے اصلاح بہم پہنچانے کی محنتِ شاقہ کے علاوہ اس جدتِ تالیف کے لحاظ سے یقیناً مستحقِ داد ہیں۔''

آخر میں التماس کے عنوان سے مرتب نے اظہارِ خیال کیا ہے:

’’مجھے ان سرمستیوں میں ترنگ آئی کہ حریفانِ ہم رنگ کو ان بادہ ہائے رنگین و پُر زور سے چھکا دوں جن کا نشہ مے کوثر کے ملنے سے پہلے اُڑتا نظر نہیں آتا اور یہی سبب ہے کہ ساغرِ سرشار (اصلاحِ سخن) کی جلوہ ریزی کا مشاطۂ سخن مؤلفہ حضرت صفدر مرزا پوری بھی قریب قریب اسی رنگ کی کتاب ہے اور اساتذہ کی اصلاحوں کا گلدستہ مگر اس میں اور میری کتاب میں ایک نازک فرق ہے۔ حضرت صفدر نے بڑی جانکاہیوں سے زیادہ تر ان اساتذہ کی اصلاحیں مہیا کیں جو مدت کی نیند سو رہے ہیں۔ مَیں نے صرف اساتذہ عصرِ حاضر کی اصلاحیں جمع کیں۔ وہاں کلام ایک کا اور اصلاح کسی ایک کی۔ یہاں کلام ایک اور اصلاحیں سب باکمالوں کی۔ میری کتاب میں سب سے زیادہ دلکش منظر یہ ہے کہ ایک شعر ایک جگہ قلم زد ہو جاتا ہے۔ وہی دوسری جگہ استاد کی حوصلہ افزائیوں کا ہار پہنے پلٹتا ہے اور صاد پر صاد نظر آتے ہیں۔ کسی کی نظر کسی سقم پر گئی۔ کسی کی کسی عیب پر۔ سب کی اصلاحیں مدِنظر رکھ کر اگر شعر پر نظر کی جائے تو شاید ہی کسی شعر میں کوئی نقص نظر آئے۔ حضرت صفدر نے اصلاح درج کرنے کے بعد داد اصلاح دی۔ مگر یہ کام میری قدرت سے باہر تھا۔ مَیں اپنے استادوں کی اصلاح پر قلم اُٹھانے کی جرأت کہاں سے لاتا۔ مَیں سب کے فیض سے مستفیض ہوا تھا۔ میری کتاب میں نہ کہیں جنبہ داری کی شان نظر آئے گی نہ استبداد کی۔ میری کتاب سے قدرتِ اصلاحِ اساتذہ آئینہ ہو جائے گی اور ہر صاحبِ نظر دیکھ لے گا کہ کونسی اصلاح کس پایہ کی ہے۔ مَیں نے اصلاحوں پر تنقید کرنا بے ادبی سمجھا اور یہ بھی خوف ہوا کہ بشر ہوں کہیں کسی طرف مائل نہ ہو جاؤں کسی کی خوبیوں کی طرف سے آنکھیں نہ بند کر لوں۔

ترتیبِ کتاب

مَیں نے ہر صفحہ پر اپنا شعر جلی قلم سے لکھا ہے اور حاشیہ پر اساتذۂ کرام کے تخلص لکھے ہیں۔ درمیان میں اصلاح نقل کر دی ہے۔ جس شعر پر کسی استاد نے کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ بھی اصلاح کے ساتھ لکھ دیا ہے، جن حضرات نے جن اشعار پر صاد بنایا ہے ص بنا کر ان کے تخلص لکھ دیئے گئے ہیں اور جن حضرات نے شعر میں کوئی ترمیم نہیں فرمائی ان کے نام ہر صفحہ کے آخر میں لکھے ہیں اور کوئی نشان وہاں نہیں بنایا گیا۔

اصلاح کا یہ سلسلہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۳ء تک جاری رہا ہے۔ درمیان میں اساتذہ کے جو خطوط نکاتِ ادبیہ کا گنجینہ نظر آئے وہ بھی ضمیمہ کے طور پر آخر کتاب میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ اگر کسی استاد کو یہ اَمر کچھ ناگوار گزرے تو مجھے معاف کریں۔ مَیں نے جو کچھ کیا ہے ضیافتِ طبعِ اربابِ ذوق کے لیے کیا ہے اور اساتذہ معتبرہ کے فیوض عام کرنے کے لیے۔‘‘

ان سولہ غزلوں میں سے آخری غزل فارسی زبان میں ہے۔ اس غزل کی اصلاح میں ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے بھی حصہ لیا ہے۔ البتہ اردو کی غزلوں میں سر اقبال نے معذوری فرمائی ہے۔ مرتب نے دبی زبان میں یہ شکوہ بھی کیا ہے کہ ’’حضرت اقبالؔ کے مے کدہ کی خیر ہو جہاں سے مرا جام خالی پھرا۔‘‘

اصلاحِ سخن رسالہ سائز کے ۲۳۴ صفحات پر محتوی ہے چوبیس صفحات فہرس، غزلیات، فہرست شعرا، تقریب، دیباچہ، مقدمہ اور التماس اصل کتاب کے صفحات میں شامل نہیں۔ ہم شروع کے تیئس صفحات ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ان میں ۱۶ غزلیات فہرست ۴۲ اساتذہ کے نام اور دو غزلوں پر اساتذۂ کرام کی اصلاحیں شامل ہیں۔ وجۂ اصلاح کو اہلِ ذوق کے لیے چھوڑتے ہیں اور جن شعروں پر حک و اصلاح کی گنجائش نہیں سمجھی گئی۔ ان کو اساتذہ نے علی حالہٖ چھوڑ دیا ہے بعض اساتذہ نے چند شعر ایزاد بھی فرمائے ہیں جو شاملِ اشاعت ہیں۔

غزلیات

فہرست اساتذہ

احسن — سیّد علی احسن صاحب (مارہرہ)

آرزو — سیّد انوار حسین صاحب (لکھنؤ)

آزاد — سیّد فضلِ حق صاحب (رئیس شاہو بیگہہ ضلع گیا)

اطہر — سیّد معشوق حسین صاحب ہاپوڑی (جے پور)

افضل — سیّد افضل علی خاں (چھوٹے بھیا) صاحب لکھنؤ

اقبال — ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب ایم اے۔ پی' ایچ' ڈی (لاہور)

اکبر — لسان العصر خان بہادر سیّد اکبر حسین صاحب مرحوم (الہ آباد)

باقی — مولوی فضل الرحمٰن صاحب (غازی پور)

بزم — میرزا عاشق حسین صاحب (اکبر آباد)

بیباک — سیّد حسین احمد شاہ صاحب (شاہجہاں پوری)

بیخود — مولوی حاجی سیّد وحید الدین صاحب (دہلی)

بیخود — مولوی سیّد محمد احمد صاحب موہانی ایم۔اے (لکھنؤ)

ثاقب — میرزا ذاکر حسین صاحب قزلباش (لکھنؤ)

جگر — حکیم افتخار حسین صاحب صدیقی (بسواں ضلع سیتاپور)

جلیل — جلیل القدر فصاحت جنگ حافظ جلیل حسن صاحب مانکپوری (حیدر آباد دکن)

دل — مولوی محمد ضمیر حسن خان صاحب (شاہجہان پوری)

دلیر — سیّد امیر حسن صاحب رئیس (ماہر ہر ضلع ایٹہ)

رنجور — مولوی سیّد محمد یوسف صاحب جعفری (عظیم آبادی)

ریاض — سیّد ریاض احمد صاحب (خیر آباد ضلع سیتاپور)

زہری	حافظ محمد جعفر صاحب خیرآبادی (حیدرآباددکن)
سائل	ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب (دہلی)
شاد	خان بہادر مولانا سیّد علی محمد صاحب (پٹنہ)
شہرت	لفٹنٹ حافظ اعجاز علی صاحب اےتھوی (حیدرآباددکن)
شفق	حکیم سیّد حسن مرتضٰی صاحب رضوی عماد پوری (حاجی پور رفیع گنج)
شوق	مولانا احمد علی صاحب قدوائی مرحوم (رامپور)
شوکت	مولانا حافظ سیّد احمد حسین صاحب مرحوم (مجددالسنہ شرقیہ) میرٹھ
صفی	مولانا سیّد علی نقی صاحب (لکھنؤ)
عتیق	حکیم سیّد انوارالدین صاحب (حیدرآباددکن)
عزیز	میرزا محمد ہادی صاحب (لکھنؤ)
فانی	مولانا شوکت علی خاں صاحب بی اے۔ ایل ایل بی (بدایوں)
کوثر	حکیم سیّد عابد علی صاحب مرحوم (خیرآباد ضلع سیتاپور)
مائل	میرزا محمد تقی بیگ صاحب دہلوی (جے پور)
محشر	میرزا کاظم حسین صاحب (لکھنؤ)
مضطر	اعتبارالملک سیّد افتخار حسین صاحب خیرآبادی (گوالیار)
مومن	مولوی سیّد محمد شرف الدین صاحب ٹونکی (اٹاوہ)
ناطق	ابوالعلا حکیم سیّد سعید احمد صاحب (کان پور)
نظم	نواب حیدر یار جنگ مولانا سیّد علی حیدر صاحب طباطبائی (حیدرآباددکن)
نواب	مولوی سیّد نواب علی صاحب ایم اے۔ پروفیسر بڑودہ کالج (بڑودہ)
نوح	شیخ محمد نوح صاحب رئیس (نارہ ضلع الٰہ آباد)
نیاز	مولانا نیاز محمد خاں صاحب فتح پوری (مدیر نگار) بھوپال
وحشت	مولانا سیّد رضا علی صاحب رئیس (کلکتہ)
یکتا	مولانا عبداللطیف مجسٹریٹ صاحب (ریاست جاورہ)

بسم اللہ الرّحمٰن الرحیم ۰

غزل

خواب میں اُن کا گلے مِل کے جُدا ہو جانا
دِل کے ارمانوں میں اک حشر بپا ہو جانا

آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہو جانا
یوں ترے عشق میں انگشت نما ہو جانا

بوئے خونِ دلِ عاشق تو نہیں چھپ سکتی
گو بہت سہل ہے ہمرنگ حنا ہو جانا

صورتِ حال یہ آئینۂ رازِ دل ہے
رنگ چہرے کا سرِ بزم ہوا ہو جانا

آج اُن کی نگہہ ناز کا وہ اُٹھ کے اِدھر
دردمندانِ محبت کی دوا ہو جانا

او ادا قہر کی اظہار وفا پر دمِ غیظ — بدنصیبوں کو نہ پیغامِ قضا ہو جانا
ساتھ پروانوں کے جل جل کے دلِ شمع نصیب — داخلِ ملت اربابِ وفا ہو جانا
دلِ بیمار یہ ہیں دشمنِ صحت آثار — اک خیال آتے ہی پھر درد سوا ہو جانا
آخری وہ وقت بھی کیا ساتھ نباہا دل نے — روٹھنا اُن کا اِدھر دم کا خفا ہو جانا

خوبرویوں سے کہیں کر کے محبت اے شوق
نہ خدا کے لیے محصورِ بلا ہو جانا

خواب میں اُن کا گلے مل کے جُدا ہو جانا — دل کے ارمانوں میں اِک حشر بپا ہو جانا

احسن — میرے حق میں ہے قیامت کا بپا ہو جانا
پہلے مطلع دولخت تھا۔ احسن

آرزو — دل کے ارمانوں میں پھر حشر بپا ہو جانا
آزاد — یاد ہے اُن کا گلے مل کے جُدا ہو جانا
اطہر — خواب نے کچھ کام نہیں دیا۔ اطہر
// — ہائے وہ اُن کا گلے مل کے جُدا ہو جانا — اور ارمانوں میں اِک حشر بپا ہو جانا
افضل — اُس ستمگر کا گلے مل کے جدا ہو جانا — دل کے ارمانوں میں تھا حشر بپا ہو جانا
باقی — خواب میں اُن کا وہ آنا وہ جدا ہو جانا
// — وہ کی ضرورت تھی بلا اس کے جملہ ناقص تھا۔ باقی
بیباک — حسرتوں میں ہے قیامت کا بپا ہو جانا
جگر — آنکھ کھلتے ہی وہ اِک حشر بپا ہو جانا
سائل — دل کے ارمانوں میں تھا حشر بپا ہو جانا
شہرت — دل کے ارمانوں میں تھا حشر بپا ہو جانا
مائل — یاد ہے اُن کا گلے مل کے جدا ہو جانا
محشر — اُن کا ملنا کبھی اور مل کے جدا ہو جانا
مضطر — نہ بھلا کچھ مجھے وعدے کا وفا ہو جانا — قہر تھا اُن کا گلے مل کے جدا ہو جانا
مومن — اور ارمانوں میں اِک حشر بپا ہو جانا
نوح — کیا تھا میرے لیے تھا حشر بپا ہو جانا
نیاز — دل کے ارمانوں میں تھا حشر بپا ہو جانا
یکتا — ہائے وہ اُن کا گلے مل کے جدا ہو جانا

بزم، بیخود دہلوی، جلیل، دل، ریاض، شاد، شوق، صفی، عزیز، ناطق، وحشت

آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہو جانا — یوں ترے عشق میں انگشت نما ہو جانا

احسن — بزمِ اغیار میں اُس بت کا خفا ہو جانا — جاں نثاروں کا ہے انگشت نما ہو جانا
آرزو — میری تقدیر کو چمکا کے بنا دے گا ہلال

آزاد ہو گیا آج نصیبوں میں جو تھا ہو جانا

اطہر مجھ کو ڈر ہے کہیں تجھ کو بھی نہ کر دے بدنام — یوں مرا عشق میں انگشت نما ہو جانا

افضل وہ ترا شرم سے پابند حیا ہو جانا — وہ مرا خلق میں انگشت نما ہو جانا

باقی تھا مقدر کا لکھا ورنہ کسے تھا معلوم

بیباک مجھ سے اب ناصحِ ناداں بھی حذر کرتا ہے

حیف پورا مری قسمت کا لکھا ہو جانا — بیخود دہلوی

لکھنے والے نے مقدر میں لکھا تھا ظالم — جگر

کر چکا آج مقدر کے لکھے کو پورا — جلیل

طے ہوا آج مقدر کا لکھا ہو جانا — دل

مجھ کو ڈر ہے کہیں محشر میں بھی رسوا نہ کرے — ریاض

کام دشوار تھا آسان نہ تھا ہو جانا — سائل

تیری اُنگلی کے اشارے نے دکھایا مجھ کو — شوق

کاہشِ غم نے کیا اور بھی رسوا افسوس — صفی

شمع کی طرح شبِ ہجر فنا ہو جانا — عزیز

اہلِ باطن کے لیے عزتِ دارین یہ ہے — عشقِ دلدار میں انگشت نما ہو جانا — محشر

چاند کو دعویٰ اُلفت ہے تو پہلے سیکھے — جستجو میں تری انگشت نما ہو جانا — مضطر

شہرتِ عشق کی معراج ہے مانند ہلال — تیرے بدنام کا انگشت نما ہو جانا — ناطق

میرے خیال میں جہاں اس طرح کے قافیے ہوں مطلع اس التزام سے کہنا چاہیے کہ ایک قافیہ اُردو ہو اور ایک فارسی ہو جب مطلع میں دونوں قافیے فارسی ہوں۔ تو غزل میں پھر اُردو قافیہ نہ لانا چاہیے۔ یہ میرا خیال ہے اور کوئی اس کا پابند نہیں۔ نوحؔ

کہہ رہا ہوں مہِ نو سے کہ ہنسی کھیل نہیں — اس طرح عشق میں انگشت نما ہو جانا — //

حیف قسمت کو گوارا مجھے کرنا ہی پڑا — نیاز

مصرعہ اوّل ایک اور مطلب کا تقاضا کرتا ہے۔ ''آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہو جانا'' یعنی وہ بات ہوئی جو ہونے والی تھی اگرچہ اُس کی خواہش نہ تھی کسی کے عشق میں انگشت نما ہو جانا۔ یہ عاشق کے لیے کوئی بُری بات نہیں ہے' یہ تو اس کے لیے باعثِ فخر ہے پھر آج کا لفظ تشریح طلب تھا میں نے دونوں مصرعوں پر الگ الگ مصرعہ لگا دیے ہیں۔ وحشت

آخر اُس بت کے تغافل نے کیا کام تمام — آج پورا تھا مقدر کا لکھا ہو جانا — //

تیری تائید بھی تھی ورنہ کہاں ممکن تھا — یوں ترے عشق میں انگشت نما ہو جانا — //

بوئے خونِ دلِ عاشق تو نہیں چھپ سکتی — گو بہت سہل ہے ہم رنگِ حنا ہو جانا

بوئے خونِ دلِ عاشق تو نہیں چھپنے کی — کام کیا آئے گا ہم رنگِ حنا ہو جانا — آرزو

ورنہ کچھ بات ہے ہاتھوں کی حنا ہو جانا — آزاد

اُن کو مشکل ہے شبِ وعدہ مرے گھر آنا — بہت آسان ہے پابندِ حنا ہو جانا — اطہر

یہ بھی لکھا تھا جبیں پر مری شاید دمِ حشر — خونِ ناحق کا مبدّل بہ حنا ہو جانا — افضل

بوے خون دل عاشق سے وہ گھبراتے ہیں		جگر
	گو بہت سہل ہے مخلوط حنا ہو جانا	دل
بوئے خون دل عاشق کا چھپانا ہے محال	غیر ممکن نہیں ہمرنگ حنا ہو جانا	سائل
بوئے خون دلِ عشاق نہیں چھپنے کی	ہاں بہت سہل ہے ہمرنگ حنا ہو جانا	شاد
دل کے پسنے پہ بھی قسمت کی رسائی معلوم		صفی
بوئے خون دل عاشق بھی کہیں چھپتی ہے		عزیز
خون عاشق سے وہ کہتے ہیں کہ تو حشر کے دن	دو گھڑی کے لیے ہمرنگِ حنا ہو جانا	مضطر
بوئے خون دل عاشق کا ہے چھپنا دشوار	گرچہ آسان ہے ہمرنگِ حنا ہو جانا	مومن
	سہل ہے رنگ کا ہمرنگ حنا ہو جانا	//
آئے گی ہاتھ سے خونِ دل عشاق کی بو	یہ بھی کیا رنگ کا ہے رنگِ حنا ہو جانا	//
بوئے خون دل عاشق کبھی چھپنے کی نہیں		نوح
بوئے خوں اے دل پامال کہاں جائے گی	تجھ کو تو سہل ہے ہمرنگ حنا ہو جانا	نیاز
بوئے خونِ دل عاشق بھی کہیں چھپتی ہے		یکتا

باقی، بزم، بیباک، بیخود دہلوی، جلیل، ریاض، شہرت، شوق، مائل، محشر، ناطق، وحشت

صورتِ حال یہ آئینۂ رازِ دل ہے — رنگ چہرے کا سرِ بزم ہوا ہو جانا

شمع کشتہ کے دھوئیں سے نہ سمجھ کم اے دل		آرزو
صورت حال بھی غماز ہے کیا لازم تھا		آزاد
کر رہا ہے یہ محبت کو کسی کی ظاہر		افضل

رنگ فق ہو جانا۔ رنگ اُڑ جانا بولتے ہیں۔ رنگ ہوا ہو جانا نہیں بولتے گو معنا یہ صحیح ہو لیکن یہ اس کا محل نہیں۔ تا فہم و تامل۔ باقی

ترجمانِ دلِ پُر درد نہیں تو کیا ہے		بیباک
آئے ہو بادِ بہاری کی طرح دیکھ تو لو	رنگ رخ کا دمِ دیدار ہوا ہو جانا	جگر
جلوہ افروزیٔ جاناں کی خبر دیتا ہے	شمع کا رنگ سربزم ہوا ہو جانا	جلیل
دلِ بے صبر یہ ہے آئینۂ رازِ نہاں		دل
	رنگ چہرے کا مرے تیرے ہوا ہو جانا	سائل
صورت حال خود آئینۂ رازِ دل ہے		شاد
صاف ظاہر ہے یہ آئینہ رازِ دل ہے		شہرت

مصرع بہت اُلجھ گیا ہے۔ بندش کو ہمیشہ صاف رہنا چاہیے اور صفائی کے سامنے رعایت لفظی کا خیال نہ ہونا چاہیے۔ شوق قدوائی

کیا چھپے عشق کہ کچھ سب سے کہے دیتا ہے		شوق

شعر اچھا تھا مگر رنگ اُڑ جانا۔ رنگ فق ہونا محاورہ ہے رنگ ہوا ہو جانا محل تامل ہے۔ عزیز

شمع نے دیکھ لیا ہے ترے جلوے کو ضرور	ورنہ دشوار تھا یوں رنگ ہوا ہو جانا	مضطر
بن گیا آئینۂ صورتِ حالِ دلِ زار		مومن

چہرے کے رنگ کا ہوا ہو جانا محاورہ میں نہیں محتاج سند ہے۔ رنگ اُڑ جانا۔ رنگ فق ہو جانا۔ زرد ہو جانا۔ ناطق

اضطرابِ دلِ عاشق کا پتہ دیتا ہے — نوح
ضبطِ غماز ہوا' ورنہ بہت آسان تھا — نیاز
کھول دیتا ہے مرے شوقِ نہاں کا پردہ — وحشت
صورتِ حال بھی آئینۂ رازِ دل ہے — یکتا

احسن' اطہر' بزم' بیخود دہلوی' ریاض' صفی' نائل' محشر۔

آج اُن کی نگہِ ناز کا وہ اُٹھ کے اِدھر — دردمندانِ محبت کی دوا ہو جانا

ہائے اُن کی نگہِ ناز کہ اُٹھ اُٹھ کے اُسے — احسن
نااُمیدی میں وہ اُس کی نگہِ قہر کا زہر — آرزو
درد ہو کر نگہِ ناز کا دیکھا تم نے — آزاد
چشمِ بیمار سے کرنا وہ اشارہ اُن کا — اور بیمارِ محبت کی دوا ہو جانا — اطہر
موت کا شامِ شبِ ہجر نہیں ہے دشوار — حق میں بیمارِ محبت کے دوا ہو جانا — افضل

یہ نکتہ لطف کا موقع ہے التماسِ صحت میں جو لطف ہے وہ اظہارِ صحت میں کہاں۔ باقی

ہے تری اک نگہِ لطف و کرم کا اُٹھنا — باقی
تو اگر چاہے تو آتا ہے ترے خنجر کو — بیباک
دیکھنا اپنے مریضوں کا مسیحا بن کر — جگر
ہائے تیری نگہِ ناز نے سیکھا کس سے — جلیل
تیرے صدقے نگہِ ناز تو اُٹھ کر سرِ بزم — ریاض
مدعا پرسشِ بیمار سے کیا ہے سمجھو — سائل
آج اُن کی نگہِ ناز کا اُٹھ اُٹھ کے اِدھر — شاد
اُف وہ اُن کی نگہِ ناز کا اُٹھ اُٹھ کے اِدھر — صفی
تیری خاکِ کفِ پا کو ہے بہت ہی آساں — نائل
تجھ سے ہم اے نگہِ ناز کہے رکھتے ہیں — محشر
تم جو آ جاؤ تو ممکن ہے دمِ آخر بھی — مضطر
چشمِ بیمار کا وہ نازو ادا سے اُٹھنا — اور بیمارِ محبت کی دوا ہو جانا — مومن
زہرِ قاتل بھی اُتارا گیا اس وعدے پر — ناطق
آج اُن کی نگہِ ناز کا اُٹھنا اُٹھ کر — نوح
اس طرف چشمِ حسیں کا تری اُٹھنا اک بار — اس طرف دردِ محبت کی دوا ہو جانا — نیاز
یاد ہے اُس نگہِ ناز کا اُٹھ کر سرِ بزم — وہ مریضانِ محبت کی دوا ہو جانا — یکتا

بزم' بیخود دہلوی' دل' شہرت' شوق' عزیز' وحشت

او ادا قہر کی اظہارِ وفا پر دمِ غیظ — بدنصیبوں کو نہ پیغامِ قضا ہو جانا

او ادائے ستم اظہارِ وفا پر دمِ غیظ — احسن

جانفزا بن کے جو آیا ہے تو اے مژدۂ وصل		آرزو
دیکھ او قہر کی آنکھ اشک وفا پر دمِ غیظ		آزاد
وہ ادا اُن کی ہے اعجازِ مسیحا جس میں	اُس کا میرے لیے پیغام قضا ہو جانا	اطہر
دیکھتے ہوں نگہ قہر سے مجھ کو سرِ بزم	چاہتے ہو ہدفِ تیرِ قضا ہو جانا	افضل

اداے نگاہ بہتر ہے۔ جب قہر کی نوا کہہ دیا تو اب دم غیظ کہنا بے سود ہو گیا۔ باقی

او نگاہِ غضب آ گئیں دمِ اظہارِ وفا		باقی
ہو نہ جائے کہیں موجب تری رسوائی کا	دلِ مشتاق کا ممنونِ قضا ہو جانا	بیباک
نگہہ یار سے کہتی ہیں نگاہیں میری		جگر
او ادا قہر و غضب کی دمِ اظہار وفا		دل
دمِ اظہارِ وفا او نگہہِ قہر آلود		ریاض
او ادا قہر کی او غمزۂ غفلت اوصاف		سائل
او ادا قہر کی اظہار وفا پر لِلّٰہ	تو نہ میرے لیے پیغامِ قضا ہو جانا	شاد
قطع ہو اُن سے جو اُمید تو بڑھ کر اے یاس	تو ہی میرے لیے پیغامِ قضا ہو جانا	شوق
تیرے ہی دم کا سہارا ہے ادائے دلبر		صفی
دمِ اظہار وفا اے نگہہِ غیظ آلود		عزیز
موت کو جان کا دینا مجھے منظور نہیں	اس سے بہتر ہے کہ تم میری قضا ہو جانا	مضطر
نگہہِ قہر خدارا دمِ اظہارِ وفا		مومن
قلمزد		نیاز

ادا اقہر کی۔ یہ خطاب کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ پھر دمِ غیظ بھرتی کا فقرہ تھا۔ وحشت

تیری بیداد کا پیغام قضا ہو جانا	ہے مرے عقدۂ دشوار کا وا ہو جانا	وحشت
دیکھنا او نگہہ قہر دم عرضِ وفا		یکتا

بزم، بیخود دہلوی، شہرت، محشر، ناطق، نوح

ساتھ پروانوں کے جل جل کے دل شمع نصیب — داخلِ ملتِ اربابِ وفا ہو جانا

جل کے پروانوں کے ساتھ اے دل ہم قسمت شمع		آزاد
جل کے پروانوں کے ساتھ اے دل ہم مشرب شمع		آزاد
مثل پروانہ کسی بزم میں جل کر اے دل	تو بھی اب شاملِ ارباب وفا ہو جانا	اطہر
ساتھ پروانوں کے جل جل کے دل شمع صفت		افضل
ساتھ پروانوں کے جل جل کے دل سوز نصیب		باقی
شمع پروانوں سے کہتی ہے کہ جل کر دمِ صبح		جگر
	شامل صحبتِ اربابِ وفا ہو جانا	دل
بوالہوس کو کسی تعلیم سے ہو گا نہ نصیب		سائل
ساتھ پروانوں کے جل جل کے سرِ بزم اے دل		شاد

ساتھ پروانوں کے جل جل کے دلِ سوز نصیب — شہرت
وہ مٹا کر مجھے کہتے ہیں مبارک یہ شرف — شہرت
جل کے پروانے نے چاہا ترے عاشق کی طرح — شوق
منہ سے کہنا تو ہے آسان بہت مشکل ہے — مائل
ساتھ پروانوں کے جل جل کے سحر تک اے شمع — محشر
شمع پروانے کے ارمان میں تو بھی جل کر — مضطر
قلمزد — مومن
مثل پروانوں کے جل جل کے دل شمع نصیب — ناطق
ساتھ پروانوں کے جل بجھ کے ترا شمع سحر — نوح
مثل پروانوں کے جلنا ہی نہیں اے دلِ زار — نیاز

شمع نصیب کی ترکیب درست نہیں ہے۔ غم نصیب' آفت نصیب' حرماں نصیب' ان ترکیبوں سے ظاہر ہے وہ جس کو غم نصیب ہوا ہو' جس کے نصیب میں آفت ہو' حرماں جس کے نصیب میں ہو' پس شمع نصیب کے معنی ہوں گے' جس کو شمع نصیب ہوئی ہو! جس کے نصیب میں شمع ہو!! وحشت

ساتھ پروانوں کے جل جل کے دل شمع صفت — وحشت

ص: بیباک۔ عزیز۔

احسن' آرزو' بزم' بیخود دہلوی' جلیل' ریاض' صفی' یکتا۔

دلِ بیمار یہ ہیں دشمنِ صحت آثار — اِک خیال آتے ہی پھر درد سوا ہو جانا

دل بیمار یہ آثار تو صحت کے نہیں — احسن
یہ مرض کونسا ہے اے دلِ بیمار بتا — کچھ خیال آتے ہی پھر درد سوا ہو جانا — آرزو
دل وحشی کے اس آزار کی تدبیر نہیں — آزاد
دلِ بیمار یہ آثار بُرے ہیں تیرے — اطہر
کیا نہیں ہے یہ محبت کی ترقی کا ثبوت — درد کا دل میں ترے حد سے سوا ہو جانا — افضل

پہلے مصرع میں تعقید ہے۔ نیز طرزِ بیان بہت ہی کمزور۔ دوسرے مصرع میں بجائے اک کے کچھ نے بہت زور پیدا کر دیا۔ باقی

یہی حالت ہے تو بیمار کی صحت معلوم — کچھ خیال آتے ہی پھر درد سوا ہو جانا — باقی
دلِ بیمار یہ ہے دشمنِ صحت آثار — بزم
چارہ گر خوبیِ قسمت سے سمجھتا ہی نہیں — درد کا ہجر میں رہ رہ کے سوا ہو جانا — بیباک
دلِ بیمار پہ بھاری ہے بہت ہجر کی شب — جگر
دلِ بیمار یہ اچھا نہیں تیرے حق میں — درد کا اُن کے تصور سے سوا ہو جانا — ریاض
اب افاقہ سہی ممکن تو ہے یہ چارہ گرو — کچھ خیال آتے ہی پھر درد سوا ہو جانا — سائل
ہیں یہ آثار بُرے اے دلِ بیمار کے درد — اک خیال آتے ہی پھر تیرا سوا ہو جانا — شوق
دلِ بیمار یہ آثار تو جینے کے نہیں — عزیز
اُٹھ کے ہر بار تری بزم سے یوں جاتا ہوں — یاد آتا ہے وہ کہنا کہ ذرا ہو جانا — مائل

مصرع اول	مصرع ثانی	شاعر
دمِ آخر مرے پہلو سے نہ اُٹھو دیکھو	کیونکہ ممکن ہے مرا درد سوا ہو جانا	مضطر
دلِ بیمار یہ صحت کے ہیں کمبخت آثار	اک خیال آتے ہی بس درد سوا ہو جانا	مومن
	اک خیال آتے ہی یوں درد سوا ہو جانا	مومن
قلمزد		ناطق
جب یہ صورت ہے تو مجھ کو نہیں اُمید شفا	کچھ خیال آتے ہی پھر درد سوا ہو جانا	نوح
دلِ بیمار یہ آثار تو کچھ خوب نہیں		نیاز
دلِ بیمار یہ صحت کے نہیں ہیں آثار		یکتا

بیخود دہلوی، جلیل، دل، شاد، شہرت، صفی، محشر، وحشت

آخری وقت بھی کیا ساتھ نباہا دل نے — روٹھنا اُن کا اِدھر دم کا خفا ہو جانا

مصرع اول	مصرع ثانی	شاعر
آخری وقت بھی چھوڑا نہ گیا پاسِ وفا	اُن کا رُکنا کہ مرے دم کا خفا ہو جانا	احسن
زندگی تھی کہ کوئی رازِ محبت کا طلسم	روٹھنا اُن کا مرے دم کا خفا ہو جانا	آرزو
روٹھنا اُن کا اک آفت دمِ رخصت ہے اُدھر	اک قیامت ہے ادھر دم کا خفا ہو جانا	آزاد
پھر اُسی طرح سے کرنا تہ و بالا دل کو	پھر اُسی طرح سے اک بار خفا ہو جانا	افضل

دل نے کیا ساتھ نباہا، دم کا خفا ہو جانا کیا؟ باقی

مصرع اول	مصرع ثانی	شاعر
میرے پہلو سے نہ تھا آپ کا اُٹھ کر جانا	تھا مری روح کا یہ تن سے جدا ہو جانا	باقی
آخری وقت بھی کیا ساتھ نباہا اس نے		بزم
آخری وقت دیا جان نے بھی اُن کا ساتھ		جگر
کیا بگڑنے کی ادا تھی کہ قضا بن کے رہی		جلیل
دمِ رخصت بھی عجب ساتھ نباہا دل نے	رُخ اُدھر پھرنا ادھر دم کا خفا ہو جانا	دل
کیا برابر کا دیا ہے دمِ آخر نے جواب		ریاض
جان تن میں رہی جب تک وہ رہے خرم و شاد	روٹھنا اُن کا تھا یا دم کا خفا ہو جانا	سائل
اک ذرا تھم ابھی رو روٹھنے والے میرے	دیکھ لے مجھ سے مرے دم کا خفا ہو جانا	شوق
	روٹھنا آپ کا اور دم کا خفا ہو جانا	عزیز
آخری وقت بھی کمبخت نے کیا ساتھ دیا		مومن
اُف وہ منظر بھی تھا کس قہر و غضب کا منظر	روٹھنا اُن کا مرے دم کا خفا ہو جانا	نوح
آخری وقت بھی کیا ساتھ نباہا دم نے	روٹھنا اُن کا ادھر اس کا خفا ہو جانا	نیاز

آخری وقت کون کس سے رُوٹھتا ہے۔ اُس وقت تو ضرور رحم آ جاتا ہے۔ وحشت

مصرع اول	مصرع ثانی	شاعر
وہ جو برہم تھے تو نازک تھا کچھ اپنا بھی مزاج		وحشت

افسوس دم کا خفا ہونا بمعنی مرگ مستعمل نہیں بلکہ اس کے معنی انقباضِ نفس۔ دم گھٹنے۔ سانس رکنے کے ہیں۔ اگر یہ محاورہ بمعنی مرگ مستعمل ہوتا تو آخری وقت کا فقرہ بہت ہی مناسب تھا۔ باز ہم روٹھنا اور خفا ہونا لطف دے رہا ہے۔ یکتا

مصرع اول	مصرع ثانی	شاعر
ساتھ ہر حال میں کیا خوب نباہا دل نے		یکتا

ص: اطہر۔ بیباک۔ شہرت۔

بیخود دہلوی، شاد، صفی، محشر، مضطر، ناطق

مصرع	مصرع	شاعر
خوبرویوں سے کہیں کر کے محبت اے شوق	**نہ خدا کے لیے محصورِ بلا ہو جانا**	
خوبرویوں کی محبت ہے مصیبت اے شوق	تم خدارا نہ گرفتارِ بلا ہو جانا	احسن
پھیر قسمت کا ہے اُس زلف کی اُلفت اے شوق		آرزو
دام بے دام حسینوں کی محبت اے شوق	دیکھنا یار نہ محصورِ بلا ہو جانا	آزاد
	نہ خدا کے لیے پابندِ بلا ہو جانا	اطہر
زلف کی اُن کے کہیں کر کے محبت اے شوق		افضل

زلف کے ذکر سے محصورِ بلا ہو جانے کا ثبوت کامل ہو گیا۔ باقی

مصرع	مصرع	شاعر
زلف والوں کو کہیں دے کے دل اپنا اے شوق		باقی
	تم خدارا نہ گرفتار بلا ہو جانا	بیباک
	دیکھنا تم نہ گرفتارِ بلا ہو جانا	بیخود دہلوی
	زندگی سے نہ جدائی میں خفا ہو جانا	جگر
بندۂ زلف بتاں بن کے کہیں تم اے شوق		دل
خوبرویوں سے ذرا کر کے محبت اے شوق	نہ کہیں تم ہدفِ تیرِ بلا ہو جانا	ریاض
	نہ کہیں مصدرِ آفات بلا ہو جانا	سائل
	تم نہ لِلّٰہ گرفتارِ بلا ہو جانا	شاد
خوبرویوں سے تو کرتے ہو محبت اے شوق		شہرت
مرگِ عشاق کی حالت وہی سمجھے ساحل	جس نے دیکھا ہے حبابوں کا فنا ہو جانا	شوق
جان دیتے ہی بنے دام محبت میں تجھے	شوق اِس طرح نہ محصورِ بلا ہو جانا	عزیز
	نہ گرفتار بلا مرد خدا ہو جانا	مائل
شوق نے عشق مجازی کا یہ دیکھا انجام	پائے بند رہِ تسلیم و رضا ہو جانا	محشر
	نہ خدا کے لیے پابند بلا ہو جانا	مائل
اُن کی کاکل کو کہیں چھیڑ کے اے حضرت شوق		نوح
ہم نہ کہتے تھے کہ اے شوق نہ مل اُس سے مگر	تجھ کو منظور تھا خود صیدِ بلا ہو جانا	نیاز
خوبرویوں سے کہیں دل کو لگا کر اے شوق		یکتا

بزم، جلیل، صفی، مومن، ناطق، وحشت

غزل

اب اپنا دل تنگ ہے زندانِ تمنا — اللہ رے یہ جوشِ فراوانِ تمنا

کیا ڈالیں کسی آرزوئے تازہ کی بنیاد — نظروں میں ہے بربادیِ ایوانِ تمنا

ہچکی کی صدا سب جسے سمجھے دمِ آخر — ٹوٹا تھا یہ قفلِ درِ زندانِ تمنا

جز خواب نہیں وعدۂ باطل کی حقیقت — جز وہم نہیں موجۂ طوفانِ تمنا
تیری نگہہ لطف تھی تمہید محبت — میری نگہہ شوق ہے عنوانِ تمنا
اے قافلۂ یاس گزر دل میں نہو کر — پامال نہ کر گور غریبانِ تمنا
اے شوقؔ ہے اب روح کو پرواز بھی دشوار — پیوست کلیجے میں ہے پیکانِ تمنا

اب اپنا دل تنگ ہے زندانِ تمنا — اللہ رے یہ جوش فراوانِ تمنا

اُلفت میں دل تنگ ہے زندانِ تمنا — اللہ رے مرا جوش فراوانِ تمنا — احسن
اپنا ہے دل تنگ کہ زندانِ تمنا — اطہر
تو جب سے ہوا قائل احسانِ تمنا — کرتا ہے ہر اک خلق میں ارمانِ تمنا — افضل

جوش فراواں تمنا کے سبب سے دل تنگ کا زندانِ تمنا ہو جانا سمجھ میں نہیں آیا۔ تمنا کا دل تنگ سے نہ نکلنا ہی اس کے زندانِ تمنا ہونے کے لیے کافی ہے۔ باقیؔ

مدت سے دل تنگ ہے زندانِ تمنا — پھر بھی نہیں کم جوش فراوانِ تمنا — باقی
دل رہ نہ سکا ضبط سے زندانِ تمنا — بیباک
اک قطرہ میں یہ جوش فراوانِ تمنا — یا رب ہے دل تنگ کہ طوفانِ تمنا — بیخود موہانی
اپنا ہی دل تنگ ہے زندانِ تمنا — اللہ یہ ہے جوش فراوانِ تمنا — ریاض
کیا عرض کروں جوش فراوانِ تمنا — سائل
پھر میرا دل تنگ ہے زندانِ تمنا — قربان ترے جوش فراوانِ تمنا — شفق

دونوں مصرعوں میں ربط مطلق نہ تھا۔ دونوں کے مطالب الگ الگ تھے اور ایک کو دوسرے سے تعلق نہیں۔ شوقؔ

نکلا نہ کبھی عشق میں ارمانِ تمنا — آخر مرا دل ہو گیا زندانِ تمنا — شوق

جوش کا مقتضا وسعت ہے نہ کہ تنگی۔ ناطقؔ

اب دل نظر آتا ہے بیابانِ تمنا — ناطق
اور جوش جنوں سلسلہ جنبانِ تمنا — نظم طباطبائی
ہے سیل عرم دست بدامانِ تمنا — نظم طباطبائی

دل تنگ سے کوئی خوبی نہ پیدا ہوئی۔ نوحؔ

پہلو میں دل اپنا ہے کہ زندانِ تمنا — نوح

مصرعہ اوّل میں فراوانی تمنا کا کوئی ثبوت نہیں ہے اگر دل تنگ زندان تمنا ہو گیا تو اس سے جوش فراوان تمنا کیونکر ثابت ہوسکتا ہے۔ نیازؔ

دل شق ہوا وا ہو گیا زندانِ تمنا — نیاز
دیکھے تو کوئی جوش فراوانِ تمنا — وحشت

ص:

یکتا

آرزو، بیخود دہلوی، جگر، جلیل، دل، زمہری، شہرت، صفی، عزیز، محشر، مضطر، مومن

کیا ڈالیں کسی آرزوئے تازہ کی بنیاد — نظروں میں ہے بربادیٔ ایوانِ تمنا

حتی الامکان دبتے ہوئے الفاظ موزوں نہ ہونے چاہیے۔ احسن

ڈالے کوئی کیا آرزوئے تازہ کی بنیاد — احسن
ڈالے کوئی کیا آرزوِ تازہ کی بنیاد — آرزو

فارسی ترکیب میں واؤ کا گرانا ممنوع ہے۔ باقی

جب پڑنے لگی آرزوئے تازہ کی بنیاد — یاد آ گئی بربادی ایوانِ تمنا — بیخود موہانی
برباد کیا ہجر نے ایوانِ تمنا — جگر
اب کیا کسی اُمید کی بنیاد ہو قائم — دل

جب ایوانِ تمنا مصرعہ آخر میں موجود ہے تو مصرعہ اوّل میں کوئی کے ساتھ آرزو، حسرت، اُمید، تمنا کی ضرورت باقی نہیں رہی، بغیر مکان صرف آرزوِ تازہ کی بنیاد ڈالنی اچھا نہیں۔ ریاض

ویرانۂ دل میں کوئی گھر خاک بنائے — ریاض
کیا ڈالیں کسی آرزوِ تازہ کی بنیاد — زمہری
مسمار ہوا جاتا ہے ایوانِ تمنا — سائل

کیا ڈالیں اور بنیاد میں تعقیدی فاصلہ ہے۔ خانہ دل کی ویرانی گویا بربادی ایوانِ تمنا ہے۔ شفق

ہونے لگا جب خانۂ دل ہجر میں ویران — یاد آ گئی بربادی ایوانِ تمنا — شفق

یہ شعر بھی بالکل ناقص دونوں مصرعوں میں کچھ ربط نہیں۔ قلمزد۔ شوق

زلفوں کو نہ وہ میری نگاہوں سے چھپاتے — سنتے جو کبھی حالِ پریشان تمنا — شوق
وہ دل نہ رہا جو کہ تھا ایوانِ تمنا — محشر
کیا رکھئے کسی آرزوِ تازہ کی بنیاد — ناطق
ہے یاد وہ بربادیِ ایوانِ تمنا — نظم طباطبائی

ضرورت تھی کہ کسی گزری ہوئی تمنا کی بربادی کی طرف اشارہ کیا جائے اس لیے ''وہ'' بڑھایا علاوہ اس کے اب تک کا اظہار ضروری تھا شعر کا مفہوم تشنہ رہتا تھا۔ نیاز

کیا آرزوِ تازہ ہو پیدا نظر میں — اب تک ہے وہ بربادیِ ایوانِ تمنا — نیاز

اس شعر میں غزلیت کوٹ کوٹ بھری ہے ماشاء اللہ ص ص۔ یکتا۔

ص: اطہر، افضل، بیباک، صفی، مضطر، وحشت، بیخود دہلوی، جلیل، شہرت، عزیز، مومن، نوح

ہچکی کی صدا سب جسے سمجھے دمِ آخر — ٹوٹا تھا یہ قفل درِ زندانِ تمنا

ٹوٹا تھا وہ قفل درِ زندانِ تمنا — ریاض
ٹوٹا تھا وہ قفل در زندانِ تمنا — احسن
ٹوٹا تھا وہ قفل در زندانِ تمنا — اطہر
ٹوٹا تھا وہ قفل در زندانِ تمنا — افضل
ٹوٹا تھا وہ قفل در زندانِ تمنا — باقی
ٹوٹا تھا وہ قفل در زندانِ تمنا — بیباک
ٹوٹا تھا وہ قفل در زندانِ تمنا — بیخود دہلوی
ٹوٹا تھا وہ قفل در زندانِ تمنا — دل

ٹوٹا تھا وہ قفلِ درِ زندانِ تمنا — جگر

ہچکی کی صدا سُن کے مَیں سمجھا دمِ آخر — ٹوٹا کوئی قفلِ درِ زندانِ تمنا — شفق

اے چارہ گر و نزع میں کیا چیز تھی ہچکی — محشر

ہچکی کی صدا اس کو نہ سمجھو دمِ آخر — ٹوٹا ہے یہ قفلِ درِ زندانِ تمنا — مضطر

ہچکی کی صدا سب جسے سمجھے تھے دمِ نزع ۔ — نیاز

ٹوٹا تھا وہ قفلِ درِ زندانِ تمنا — وحشت

یہ اور وہ اسمائے اشارات ہیں یہ قریب کے لیے اور وہ بعید کے لیے جب صیغہ ماضی بعید کا برتا گیا ہے تو یہ سے وہ مناسب ہے۔ یکتا

ہچکی کی صدا ہم جسے سمجھے دمِ آخر — ٹوٹا تھا وہ قفلِ درِ زندانِ تمنا — یکتا

ص: بیخود موہانی، بزم، شہرت، صفی، آرزو، جلیل، زمہری، شوق، عزیز، مومن، ناطق، نظم، نوح

جُز خواب نہیں وعدۂ باطل کی حقیقت — جز وہم نہیں موجۂ طوفانِ تمنا

ہاں خواب نہیں وعدۂ باطل کی حقیقت — ہاں وہم نہیں موجۂ طوفانِ تمنا — افضل

جزاک اللہ۔ — بیباک

جز خواب نہیں جوشِ تخیل کی حقیقت — جز وہم نہیں ہستی طوفانِ تمنا — بیخود موہانی

سمجھے یہ ترے وعدۂ باطل کی حقیقت — ہے وہم و گماں موجۂ طوفانِ تمنا — جگر

جُز مرگ نہیں موجۂ طوفانِ تمنا — سائل

موجۂ طوفان کا قافیہ کیا تعلق رکھتا تھا۔ کچھ نہیں قلمزد۔ شوق

جُز خواب سبب کون ہے اُمید وفا کا — جز وہم لقب کون ہے شایانِ تمنا — شوق

جُز خواب نہیں جزر و مد قلزم امید — ناطق

جُز خواب نہیں لذتِ فانی کی حقیقت — نظم طباطبائی

موج کے ہوتے ہوئے موجہ فصیح نہیں۔ نوح

جز وہم نہیں صرف طوفانِ تمنا — صفی

چونکہ وعدہ باطل کا تعلق دوسرے سے ہے اس لیے اُسے وہم کہنا مناسب ہے اور طوفانِ تمنا کا تعلق اپنی ذات سے ہے اس لیے اُس کو خواب سے تعبیر کرنا چاہیے۔ نیاز

جز وہم نہیں وعدۂ باطل کی حقیقت — جز خواب نہیں موجۂ طوفانِ تمنا — نیاز

جُز خواب نہیں وعدۂ فردا کی حقیقت — یکتا

ص: اطہر، ریاض، صفی، مضطر، وحشت

احسن، آرزو، باقی، بیخود دہلوی، جلیل، دل، زمہری، شہرت، شفق، عزیز، محشر، مومن

تیری نگہ لطف تھی تمہیدِ محبت — میری نگہہ شوق ہے عنوانِ تمنا

تیری نگہہ لطف ہے تمہیدِ محبت — افضل

سبحان اللہ۔ — بیباک

تیری نگہہ لطف ہے تمہیدِ تغافل — بیخود موہانی

تیری نگہہ لطف تھی تمہید تباہی — میری نگہہ شوق تھی عنوانِ تمنا — سائل

شہرت

سبحان اللہ۔

دوسرے مصرع میں ''ہے'' پہلے میں ''تھی'' نہ چاہیے۔ شفق

تیری نگہہ لطف ہے تمہید محبت — شفق

کیا کیا ابھی حل ہوں گے محبت کے مطالب — شوق

تیری نگہہ لطف تھی تمہید مظالم — عزیز

خوب شعر ہے۔ محشر

تمہید محبت بھی بے معنی نہیں آپ کو اختیار ہے مگر تحریکِ شوق میں اِک لطف ہے کہ پھر وہی تحریکِ شوق نگہہ شوق کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ مومن

تیری نگہہ لطف تھی اک شوق کی تحریک — مومن

تیری نظرِ لطف بھی پیغامِ محبت — ناطق

کیا خوب کہا ہے کوئی سقم نہیں۔ آپ کا طرزِ بیان خبر کی حیثیت سے ہے۔ اس کو محذوف کر کے جذبات کے مجسم فوٹو کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ نواب

تیری نگہہ لطف وہ تمہید محبت! — میری نگہہ شوق، یہ عنوانِ تمنا! — نواب

پہلے مصرعہ کے بعد لیکن محذوف ہے اصلاح سے اندازِ بیان پُر لطف ہو گیا۔ نیاز

تیری نگہہ لطف نہ ہو وعدۂ تسکین — نیاز

میری نظرِ شوق ہے عنوانِ تمنا — وحشت

ص: احسن، جگر، ریاض، زمہری، صفی، محشر۔

آرزو، اطہر، باقی، بیخود دہلوی، جلیل، دل، مضطر، نظم طباطبائی، نوح، یکتا۔

اے قافلۂ یاس گزر دل میں نہ ہو کر — پامال نہ کر گورِ غریبانِ تمنا

اے قافلۂ یاس کرم منزلِ دل پر — پامال نہ کر شہر خموشان تمنا — احسن

اطہر

ہیں دل میں مرے آرزوئے مردہ کی قبریں — افضل

پہلے مصرع میں ایسی تعقید ہے جس نے مصرع کو مہملیت کے درجہ تک پہونچا دیا ہے۔ باقی

اے قافلۂ یاس بچائے ہوئے دل کو — پامال نہ ہو گورِ غریبانِ تمنا — باقی

حضرت، میرے خیال میں اس شعر کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اس لیے کہ دل تو گور ہوا اور غریبان تمنا مدفون، پھر اس صورت میں غریبانِ تمنا کا کنایہ کس سے کیا جائے گا دوسرے یہ کہ غریب بمعنی مفلس اور نادار استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً گورِ غریباں، پھر اس صورت میں اگر غریبانِ تمنا کی طرف مضاف کیا جائے گا تو یہ معنی ہوں گے کہ جن کو تمنا نہیں ہے اُن کی گور کو پامال نکر، حالانکہ یاس عدم حصولِ مطلب کے نتیجہ کا نام ہے۔ بیباک۔ قلمزد

وہ بھی تو ہوا ایک تغافل کی ادا کا — جس نالے کو ہم جانتے تھے جانِ تمنا — بیباک

اب قافلہ یاس مرے دل سے نہ گزرے — پامال نہ ہو گورِ غریبانِ تمنا — بیخود موہانی

اے قافلۂ یاس گزر دل سے تو اس طرح — پامال نہ ہو گورِ غریبانِ تمنا — جگر

دل مدفن صد شوق ہے اے قافلۂ یاس — جلیل

اے صرصرِ غم واسطہ اُس غیرتِ گل کا برباد نہ کر رنگِ گلستانِ تمنا دل

اے قافلۂ یاس نہ اس دل سے گزر تو ریاض

اے قافلۂ یاس نہ کر دِل میں اقامت زمہری

اے قافلۂ یاس گزر دل میں نفرما سائل

اس مصرع میں تعقید لفظی ہے۔ شہرت

اے قافلۂ یاس بچائے ہوئے دل کو شہرت

اے قافلۂ یاس مرے دل سے ہو رخصت شفق

تمنا واحد پھر گورِ غریباں کیونکر بن سکتی ہے مصرعہ اولیٰ میں نہو کرکس قدر ناقص ترکیب ہے۔ شوق

روشن ہے اسی سے شب یلدائے مقدر ہے داغ جگر شمع شبستانِ تمنا شوق

اے قافلۂ یاس گزر دل کو بچا کر صفی

پامال نہ ہو گورِ غریبانِ تمنا محشر

اے قافلۂ یاس نہ کر دل پہ چڑھائی پامال نہ کر گنجِ فراوانِ تمنا مومن

اے قافلۂ یاس مرے دل سے گزر کر ناطق

پامال نہ ہو پڑھیے پھر دیکھیے کیا لطف آتا ہے العاقل تکفیہ الاشارہ۔ نواب

پامال نہ ہو گورِ غریبانِ تمنا نواب

اے قافلۂ یاس نہ تو دل میں گزر کر پامال نہ ہو گورِ غریبانِ تمنا نوح

گورِ غریبانِ تمنا کا وجود ہی قافلہ یاس کے گزرنے سے ہوا تھا پھر اب منع کرنے سے فائدہ۔ نیاز

اے قافلۂ یاس ٹھہر جا مرے دل میں آباد تو ہو گورِ غریبانِ تمنا نیاز

اس مصرع میں ضعف تالیف تھا لہٰذا پامالیٔ قافلۂ یاس کے مقابل میں لشکرِ غم سے زیادہ متصور ہے۔ یکتا

اے لشکرِ غم دل سے ذرا بچ کے نکلنا پامال نہ ہو گورِ غریبانِ تمنا یکتا

مضطر، وحشت، آرزو، بیخود دہلوی، عزیز، نظم

ص:

اے شوق ہے اب روح کو پرواز بھی دشوار پیوست کلیجے میں ہے پیکانِ تمنا

اب روح کو پرواز بھی دشوار ہے اے شوق احسن

اے شوق کبھی روح کھچا تیر جو اُس کا افضل

آخر روح کو پرواز کیوں دشوار ہونے لگی۔ پیکانِ تمنا دلٗ میں پیوست ہوتا ہے کلیجہ میں نہیں۔ باقی

کیوں روح نہ مضطر رہے شوق اُس کی خلش سے پیوست مرے دل میں ہے پیکانِ تمنا باقی

پیوست ہر اک رگ میں ہے پیکانِ تمنا بزم

بیتابیٔ شوق جگر افگار نہ پوچھو بیباک

پرواز کرے طائرِ جاں شوق ہے دشوار جگر

اے شوق حزیں روح کو جنبش بھی ہے مشکل دل

اے شوق اب اُٹھنے کا نہیں ہاتھ جگر سے ریاض

صرف روح کی پرواز سے طائر روح کی پرواز بہتر ہے۔ شفق

اے شوق نہ نکلے گا یہ دم نکلے تو نکلے — شفق

پیوست ہوا دل میں جو پیکان تمنا — محشر

مقطع کو آپ اس صورت میں بھی رکھ سکتے ہیں مگر پرواز کے ساتھ طائر روح یا مرغ روح مناسب ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ مقطع اور کہہ لیجئے اور مصرع اولی کو بدل دیجئے۔ — مومن

پرواز بھی دشوار ہے اب طائر جاں کو — مومن

اے شوق ہے کمبخت کو پرواز بھی دشوار — ہے طائر جاں خستہ پیکان تمنا — مومن

اے شوق نہ کیوں روح کو دشوار ہو پرواز — پیوست مرے دل میں ہے پیکانِ تمنا — ناطق

اے شوق رہے روح کو پرواز کی تحریک — سینہ میں کھٹکتا رہے پیکان تمنا — نظم طباطبائی

اے شوق کرے روح جو پرواز تو کیونکر — پیوست مرے دل میں ہے پیکان تمنا — نوح

اس قسم کی تعقید گو اساتذہ نے برتی ہے لیکن احتراز اولی ہے۔ یکتا

اب روح کو پرواز بھی دشوار ہے اے شوق — یکتا

ص: اطہر، شہرت، مضطر، وحشت، آرزو، بیخود دہلوی، بیخود موہانی، جلیل، زمہری، سائل، شوق، صفی، عزیز، نیاز

عطیہ حضرت ناطق لکھنوی

کیا دل سے مرے پوچھتے ہو شانِ تمنا — خود روح ہے سو جان سے قربان تمنا

ہر قطرۂ خوں دل کا نہ کیونکر ہو پریشاں — قالب تو ہیں سو اور ہے اک جان تمنا

عطیہ حضرت افضل لکھنوی

آفت کی بڑی حسرت و اُمید میں بل چل — اُٹھا جو شب وصل میں طوفانِ تمنا

دل پر ہو اثر وعدۂ وصلت کا تو کیا ہو — کب یاس سے خالی ہے بیابان تمنا

خواہش نکروں وصل کی امکان سے باہر — تجھ کو نہیں معلوم یہ ہے جان تمنا

تم قول سے وصلت کے ذرا پھر کے تو دیکھو — ویراں نظر آ جائے بیابان تمنا

ساتھ ایک کے دیکھو تو کہ کتنوں کا ہے احساں — سو خواہشیں ہیں شامل ارمان تمنا

کیوں صورت آئینہ ہوا آپ کو سکتہ — کیا دیکھ لیا دیدۂ حیران تمنا

چھوڑے تری اُلفت کو اگر وہ دم محشر — ہو ہاتھ مرا اور گریبان تمنا

دے گا جو کوئی ہجر میں آہوں کی اجازت — اُڑ جائیں گے اوراق پریشان تمنا

اصلاح سخن جب زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر سامنے آئی تو ادباء و شعراء نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اساتذہ نے اپنی اپنی اصلاحوں کا موازنہ دوسرے مصلحین کی اصلاحوں سے کیا اور دیکھا کہ کون کون اس میدان میں بازی لے گئے۔ کس نے شعر کے مفہوم کی تہہ تک پہنچ کر اُسے بنایا اور کس نے سرسری طور پر اسے پرکھا۔ پھر ادبی رسائل میں اس وقیع تالیف پر اظہارِ خیال ہونے لگا۔ 'اردو' جولائی ۱۹۲۶ء میں اس پر تبصرہ چھپا۔ حضرت اثر لکھنوی نے اپنے تبصرے میں حضرت آرزو لکھنوی کی اصلاحوں کی تعریف کی اور ان اصلاحوں کو جو بے توجہی سے دی گئی ہیں اُن پر تنقید[1] کی۔ چوہدری

---

[1] مرقع لکھنؤ بابت مئی ۱۹۶۷ء

رحم علی ہاشمی نے بھی اصلاحِ سخن پر اظہارِ خیال کیا۔ یہ رائے بھی مرقع برائے مئی ۱۹۲۷ء میں چھپی اور ایک دوسرا مضمون 'معارف'[1] میں بھی سید رحم علی الہاشمی کے نام سے طبع ہوا۔ یہ مضمون خاصہ طویل ہے اور اصلاحِ سخن کے چند گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔ الناظر لکھنؤ (فروری و مارچ ۱۹۲۷ء) میں امیر بدایونی کا ایک مضمون چھپا جو کافی طویل ہے انہوں نے اصلاحِ سخن کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ یہ مضمون چوبیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ مصر لکھنؤ برائے جنوری' فروری اور مارچ ۱۹۲۹ء میں جو آرا طبع ہوئی ہیں۔ جنوری نمبر میں ابوالعلا ناطق لکھنوی نے اساتذہ کی اچھی اصلاحوں پر داد دی ہے۔ آخر میں لکھا ہے کہ ''بہترین اصلاحیں اُوپر گزریں جن کی تعریف کر چکا ہوں اور یہ میری ذاتی رائیں ہیں[2]۔'' مصر میں چھپے ہوئے تبصروں پر حضرت بیخود موہانی نے گنجینۂ تحقیق[3] میں ایک طویل مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ اس مضمون میں بہت سی اصلاحوں پر نکتہ چینی کی ہے اور کچھ اصلاحوں کے صحیح مقام کی نشان دہی کی ہی۔ بعض اصلاحوں کے متعلق کہا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں۔ مولانا تمنا عمادی نے ایک کتاب ایضاحِ سخن بتوضیح اصلاحِ سخن لکھی۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں چھپی۔ اس کتاب میں فقط ایک غزل جس کا پہلا مصرع یہ ہے:

خواب میں ان کا گلے مل کے جدا ہو جانا

پر مکمل تبصرہ کیا گیا ہے۔ تمنا عمادی نے ہر شعر کو پوری ذمہ داری سے جانچا ہے اور اس پر تنقید کی ہے۔ دورانِ تنقید جو علمی مسائل سامنے آتے رہے ہیں ان کی وضاحت عام فہم زبان میں کر دی ہے۔ فنِ اصلاحِ سخن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے۔ بہت سی اصلاحیں جو عام شعرا نہیں سمجھ سکتے۔ ان کو مثالیں دے کر سمجھایا ہے۔

مذکورہ چند مضامین کی اس لیے نشان دہی کر دی ہے تاکہ تحقیق مزید کی صورت میں بات آگے بڑھ سکے۔

۱۔ معارف اعظم گڈھ بابت فروری ۱۹۲۹ء۔

۲۔ مصر مئی ۱۹۲۹ء' صفحہ ۴۰

۳۔ گنجینۂ تحقیق (پہلا فوٹو اسٹیٹ ایڈیشن) ۱۹۷۹ء' ص ۲۳۱' ۳۴۵ طبع لکھنؤ۔

سجدۂ شوق

حمد / خورشید بیگ میلسوی

کب سے تشنہ ہوں لب، جوُ تمنا ھُو یا ھُو
خم ِ مے خانۂ باھُوؒ ' تمنا ھُو یا ھُو

ذرّے ذرّے میں نہاں دیدۂ دل سے دیکھوں
تری تخلیق کی خوشبو ' تمنا ھُو یا ھُو

ایک ہم ہی تو نہیں ڈھونڈنے نکلے تجھ کو
دشت میں پھرتے ہیں آہو' تمنا ھُو یا ھُو

ایک ہی پل میں ترے عشق کا پیکاں' جاناں!
ہو گیا دل میں ترازوُ' تمنا ھُو یا ھُو

تیرے ہی نام کی ہیبت سے ہیں لرزاں' ترساں
مری آنکھیں' مرے آنسو' تمنا ھُو یا ھُو

جب تصوّر میں تجھے دیکھ رہا ہوتا ہوں
دل پہ رہتا نہیں قابو' تمنا ھُو یا ھُو

پی کہاں؟ کہہ کے پکارے ہے پپیہا
لب ِقمری پہ ہے کوُکوُ' تمنا ھُو یا ھُو

جب اکائی ہے ترے عشق کا حرفِ آغاز
کیوں ہے تفریقِ من و تو' تمنا ھُو یا ھُو

روئے خورشیدِ سخنؔ' سرِگریباں یا ربّ
سر بہ زانو' خم ِ ابرو' تمنا ھُو یا ھُو

نعت / منصور ملتانی

سرورِ عشقِ آقاؐ جب سے اُترا ہے رگِ جاں میں
مری آنکھیں بہت مصروف ہیں جشنِ چراغاں میں

کرم کیجئے کہ گزریں آپؐ کے قدمین میں آقاؐ
جو گھڑیاں بچ گئی ہیں دامنِ عمرِ گریزاں میں

ابد تک بھی فروغِ جہل و گمراہی نہیں ممکن
بھرا ہے نور ہی ایسا چراغِ علم و عرفاں میں

وہ پہلے خاک پر ہو پھر وہ زیرِ خاک ہو جائے
مجھے اک مستقل گھر دیجئے شہرِ نگاراں میں

حضورؐ آپ آئے تو گل ہوگئے سارے ہی انگارے
بہارِ جاوداں اُتری زمانے کے گلستاں میں

زنانِ مصر نے کاٹی نہیں تھیں انگلیاں یونہی
یقیناً نور تھا ماہِ عربؐ کا ماہِ کنعاںؑ میں

تجھے منصورؔ اذنِ حاضری ملنے کو ہے پھر سے
عجب سی سرخوشی کی لہر اُٹھی ہے دل و جاں میں

منقبت / محمد افضل مجید شہیر

بیائی شاہ جیلاں غوثِ صمدانی بیائی
مَرا سیراب کُن تو از جمال مہ لقائی

نظیری در نہ تقویٰ داشت پدرت غوثِ اعظم
عدیم المثل و یکتا مادرت در پارسائی

رسانیدی حبیبِ کبریا بر لامکاں تو
شب معراج تو ہمراہ بودی مصطفائی

بہ سوئے زندگی آورد کہ در خاک ہم خفتند
بہ مرگ و زیست داری تو عجب فرمانروائی

رفیع الشان خاک نقش پائت شاہ جیلانی
رسانید عاجزاں را بر مقامِ اولیائی

بدرگاہت بدیدارت ہزاراں عاشقاں ہستند
چرا دیدار کردی ایں سگ غوث الورائی

پس مرگم بیا رائدز خاک پائے میراں من
چنانکہ سہل خواہد شُد عتاب کبریائی

ظفر اقبال

ملا نہیں جو، اُسی کو سمجھ لیا سب کچھ
یہاں تھا اور تو اللہ کا دیا سب کچھ

نہ ہو سکی وہی مذکور اصل بات جو تھی
وگرنہ ہم نے یہاں پر کہا سُنا سب کچھ

قریب ہو کے وہ آنکھوں سے اور ہے اوجھل
جو دُور رہتا میں اُس سے تو دیکھتا سب کچھ

اُسی کے سارے کرشمے تھے ہر جگہ ہر سُو
مرے لیے مری دُنیا میں تھی ہوا سب کچھ

کمال یہ ہے کہ سودائے عشق میں اُس نے
دیا تو کچھ بھی نہیں، اور، لے لیا سب کچھ

پڑے رہو تو ملے کیا سراغ منزل کا
جو چل پڑو تو بتائے گا راستا سب کچھ

نجانے کونسی شب کس گھڑی ہو کارآمد
نظر پڑے تو اُٹھا لو گرا پڑا سب کچھ

کمی نہیں کوئی آوارۂ تماشا کو
کھلی ہے آنکھ تو ملتا ہے جابجا سب کچھ

ظفرؔ اگرچہ میں اندھا نہیں ہوں ساون کا
مگر، مجھے نظر آتا ہے کیوں ہرا سب کچھ

جس آب و تاب نے روشن کیا یہاں سب کچھ
اُسی کے زور سے ہو جائے گا دُھواں سب کچھ

کچھ اب تو اپنی زمیں سے بھی آشنائی ہے
کبھی ہمارے لیے تھا یہ آسماں سب کچھ

شکوہ و شانِ عماراتِ حسن پر مت جا
یہ شہر وہ ہے کہ ملتا نہیں جہاں سب کچھ

بھری ہوئی تھی ہوا کوئی اور کشتی میں
سمجھ رہے تھے کہ ہے اپنا بادباں سب کچھ

فقط وہ مال ہے ارزاں جو دستیاب نہیں
ہے ورنہ اور تو بازار میں گراں سب کچھ

کبھی کہاں سے یہ آتا ہے، کون جانتا ہے
کسے خبر ہے کہ جائے گا یہ کہاں سب کچھ

کوئی محافظ ان آثار کا نہیں باقی
کہ آج سے ہے لگاتار بے اماں سب کچھ

یہ لازمی ہے کہ آخر کچھ ان کہا رہ جائے
تو کیا رہے گا اگر ہو گیا بیاں سب کچھ

مکیں بھی ہے در و دیوار ہی کا حصہ، ظفرؔ
کہ پائیدار بھی ہو کر نہیں مکاں سب کچھ

محسن بھوپالی

فلک سے آپ کی یاری بہت ہے
زمیں ہم کو مگر پیاری بہت ہے

ہے یوں تو سب سے افضل عشق کرنا
مگر اس کام میں خواری بہت ہے

وفاؤں کا صلہ کب چاہتے ہیں
ہمیں اک حرفِ دل داری بہت ہے

وہ ہوں گے اور جو رکھتے ہیں مطلب
ہمیں تو یار کی یاری بہت ہے

وہی ہے اپنی ویرانی کا عالم
مگر ذکرِ شجرکاری بہت ہے

ق

غزل میں شعریت گھٹتا ہے لیکن
ترنم اور اداکاری بہت ہے

یہی ٹھہرا ہے معیارِ سخن اب
کہ بادہ کم ہے سرشاری بہت ہے

خیالِ حرمتِ فن ہو انھیں کیوں
جنھیں ''تمغائے سرکاری'' بہت ہے

مرتضیٰ برلاس

وقت آغازِ سفر تو نے نہ سوچا یہ بھی
ساتھ میرا ہے تو آساں نہیں رستہ یہ بھی

قربتِ دوست میں رہنے کے بھی آداب ہیں کچھ
قرب حاصل ہو اگر دھیان ہی میں رکھنا یہ بھی

چاک اوروں کا نہیں، اپنا گریبان کیا
ایک پہلو ہے مرے جوشِ جنوں کا یہ بھی

چند افرادِ تہی دست سے لرزاں افواج
معجزہ دیکھ لیا ہم نے خدا کا یہ بھی

سربکف کیوں چلے آتے ہیں ہزاروں عشاق
کتنا کج فہم ہے، ظالم نہیں سمجھا یہ بھی

پہلے محبوب تھے جو، اب وہی معتوب ہوئے
وقت جب وہ نہ رہا، پھر نہ رہے گا یہ بھی

آنکھ اگر جھپکی تو بینائی کے جانے کا ہے ڈر
امتحاں ہے مرے معیارِ نظر کا یہ بھی

جس کو ناراض کیا، غیر کی خاطر ہم نے
وہ بھی ہاتھوں سے گیا، ہاتھ نہ آیا یہ بھی

☆☆☆

ساقی گری کا فرض ادا کر دیا گیا
پانی کا گھونٹ زہر ملا کر دیا گیا

بس تجربوں کی نذر ہوئے اپنے سارے خواب
کیا ہم نے کرنا چاہا تھا کیا کر دیا گیا

خوئے ستم تمہیں دی، ہمیں خوئے ضبطِ غم
سب کو بقدرِ ظرف عطا کر دیا گیا

وابستگی کسی کی تو اس غمکدے سے ہے
ورنہ یہاں پہ کون جلا کر دیا گیا

اب قید ختم ہونے کی وہ کیا خوشی منائیں
پر قینچ کر کے جن کو رہا کر دیا گیا

رکھنے کو کشمکش میں ہمیں آس و یاس کی
دانستہ ہر نشانہ خطا کر دیا گیا

اک ذکر ایسا چھیڑا کسی غمگسار نے
بھرنے کو تھا جو زخم ہرا کر دیا گیا

ناصر شہزاد

ہارن بجے ہے ریل کا
سمے ہے اپنے میل کا

تجھ سے مری سنجوگتا
پھول سے بندھن بیل کا

میں اروار، سکھی اس پار
بیچ میں کھٹکا جیل کا

گھری گھٹائیں بانوری
موسم آیا کھیل کا

تاویلیں اب لاکھ کر
لوبھ تھا تجھ کو تیل کا

گھر بنوایا لون پہ
کپڑا لائے سیل کا

بنوں میں بجی سانوری
موتی تری حمیل☆ کا

مار، اس ٹپکا آم کو
چلّہ چاڑھ غلیل کا

فکر میں وہ من موہنی
ذکر ہے عطر پھلیل کا

☆ سونے یا چاندی کا وہ زیور جسے خواتین گلے میں پہنتی ہیں۔

خیال امروہوی

وہ بے ثبات جو اجمال انتساب میں تھا
وہی بہ طرزِ مفصل مری کتاب میں تھا

میں نارسائی کے باعث نہ رکھ سکا تھا گرفت
وہ بحر تھا جو مچلتے ہوئے حباب میں تھا

میں تیزگام چلا ، شہر و دشت سے گزرا
اگرچہ رات سے تا صبح گہرے خواب میں تھا

برستا کیسے شگوفوں کے نرم چہروں پر
کہ ایسا شوقِ تراوش کہاں سحاب میں تھا

انا کا ظرف پرکھنے کی کس کو فرصت تھی
بس ایک زخم ہی ہر دم مرے حساب میں تھا

اب اور آتشِ دوزخ کی کیا ضرورت تھی
زمانہ سوز جہنم جب آفتاب میں تھا

جو اس جہاں سے گیا راحتوں میں جا پہنچا
ہر ایک فرد وگرنہ یہاں عذاب میں تھا

زباں پہ نادِعلیؑ ذہن میں نجف کے چراغ
عجیب جذب دروں ذکر بوترابؑ میں تھا

اکبر حمیدی

(ایک ہی لفظ میں قافیہ بھی ردیف بھی)

باہر گرمی اندر سردی
موسم کی آوارہ گردی

سرسوں پھولی اُس چہرے پر
کیسے جوبن پر ہے زردی

فرق ہے تو بس رنگوں کا ہے
سب نے ہی پہنی ہے وردی

بڑھکوں سے اخبار بھرے ہیں
سب لفظوں کی غنڈہ گردی

اپنی خاطر جیو مرو ہو
کیسی چاہت کیا ہمدردی

جیون کی ناکامی اکبر
ہمت کی سستی نامردی

☆☆☆

زندگی راستے بدلتی ہے
تب زباں ذائقے بدلتی ہے

رقص میں ہے حسینۂ عالم
ہر قدم زاویے بدلتی ہے

دشمنی اس کی روشنی سے نہیں
بس ہوا تو دیے بدلتی ہے

کیسی پُراعتماد ہے فطرت
یوں کہاں ضابطے بدلتی ہے

خوب سے خوب تر کی خواہش میں
زندگی آئنے بدلتی ہے

دنیا رہتی ہے ویسی کی ویسی
صرف کپڑے نئے بدلتی ہے

روز میں راستوں میں رہتا ہوں
روز وہ راستے بدلتی ہے

کوئی طاقت ضرور ہے اکبر
جو یہ سب سلسلے بدلتی ہے

ریاض مجید

''اُٹھ پھر اس بھولی ہوئی منزل کو چل'' کہتا ہے کون؟
حال میں رہنے نہیں دیتا ہے جو ایسا ہے کون؟

چونک چونک اُٹھتا ہوں کس کے پاؤں کی آواز سے
سایہ سایہ صحنِ احساسات میں پھرتا ہے کون؟

کس کی خوشبو آ رہی ہے دُوریوں کو چھیدتی
ان گلی کوچوں، محلوں سے پرے رہتا ہے کون؟

ڈھونڈتے ہیں ہم کسے؟ ہر اجنبی ماحول میں
کیا کہیں؟ ہر بھیڑ میں کھویا ہوا اپنا ہے کون؟

بھول کر بھی ہم کبھی جس کو نہیں کہتے بُرا
ہم کو اس حالت میں پہنچانے پہ بھی اچھا ہے کون؟

☆☆☆

غبارِ جاں ابھی دھونا بہت ہے
دِلا! روشن تجھے ہونا بہت ہے

شکست آثار لمحوں کو خبر ہے
ہمارے بخت میں کھونا بہت ہے

یہ خواہش کا سفر ہے، عمر بھر کا
ہمیں اس راہ میں رونا بہت ہے

زمانے نے جگہ لینی ہے دل میں
ابھی خود سے جدا ہونا بہت ہے

نہ جانیں ہم، یہ دشمن جانتے ہیں
ہماری خاک میں سونا بہت ہے

دل آبِ حرص سے ہے زنگ آلود
ابھی یہ آئینہ دھونا بہت ہے

بھری دنیا تعاقب میں ہے اُن کے
وہ جن کو قبر کا کونا بہت ہے

ریاضؔ اک جبر ہے خارج کا یہ بھی
ہمیں اس عمر میں سونا بہت ہے

امجد اسلام امجد

بے کراں شب میں کہیں ایک ستارا ہی سہی
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہی سہی

ہم زباں دے کے نہیں بات سے پھرنے والے
ہے خسارے کا یہ سودا تو خسارا ہی سہی

دلِ عشاق بھی بچّے کی طرح ہوتا ہے
اس کے ہاتھوں میں دلاسے کا غبارا ہی سہی

وقت کی اپنی عدالت بھی ہوا کرتی ہے
آج اس شہر میں قانون تمہارا ہی سہی

کچھ تو ہو زادِ سفر، راہِ طلب میں جاناں
ایک دزدیدہ نظر، ایک اشارہ ہی سہی

وہ ہیں اس جیت پہ نازاں، یہ خوشی کیا کم ہے!
چلئے اس کھیل میں نقصان ہمارا ہی سہی

آپ کی بزم میں ہونا ہی بہت ہے ہم کو
ایک کونا ہی سہی، ایک کنارا ہی سہی

آخری موج تلک ہاتھ میں پتوار رہے
زندگی بحرِ بلاخیز کا دھارا ہی سہی!

خالد اقبال یاسر

سادہ انداز ترا ' سجنے کا
کھل اُٹھا رنگ بجھے کمرے کا
ہاتھ سے کاڑھے ہوئے پھول ہی پھول
شال پر باغ کھلا دیکھے کا
جگمگاتی رہی دل کی بتی
پھول تازہ ہی رہا گجلے کا
ہاتھ میں ہاتھ رہے دونوں کے
پردہ آنکھوں نے کیا کجلے کا
دھوپ سردی کی مزا دیتی تھی
سایہ تھی تیری پلک ' جلوے کا
اب بھی جی جان سے ناز اٹھوائے
بے بدل انگ ترے نخرے کا
تیری باتوں میں پتا ہی نہ چلا
زندگی کا نہ کسی لمحے کا
نیند اچٹتی ہی رہی تیرے بغیر
سنبل اُڑتا ہی رہا تکیے کا
کافی ہے عمر کے باغیچے میں
ایک ہی زخم ترے صدقے کا

معین تابش

کچھ اس طرح مری اس بزم ہاؤ ہُو میں کٹی
ہر ایک گام خموشی سے ڈوبدو میں کٹی
میں اُس کو زیست کے معنی کہاں سے پہناتا
جو تیری کھوج میں نہ اپنی جستجو میں کٹی
جحیم دہر میں یہ عمر بے ثبات مری
کسے خبر ہے کہ تخفیفِ آرزو میں کٹی
میں ارتقائے انا سے گرا تو زیست مری
تغیرات کے اک سیلِ خشک رُو میں کٹی
شریک جاں رہا ہر شب ترے خیال کا لمس
ہر ایک رات مری شہد مشکبو میں کٹی
ہر اک صدا مرے اندر کی بے صدا ہی رہی
تمام عمر مری خود سے گفتگو میں کٹی
میں اک شجر ہوں سرِ مزرعِ اُفق تابشؔ
ہر ایک صبح مری حسرتِ نمو میں کٹی

صابر ظفر

تری پناہ میں ہے ' زندگی اگر ہے بھی
یہی تو ایک خوشی ہے ' خوشی اگر ہے بھی
اُسی کے رنگ سے تصویر میں ترنگ آئی
کمال اُسی کا ہے ' صورت گری اگر ہے بھی
اُسی کے رُوپ سے روشن تمام ظاہر و غیب
جمال اُسی کا ہے ' جلوہ گری اگر ہے بھی
نہیں ہے کوئی مرے دل کے راستے میں ابھی
نہ ہونے ہی کی طرح ہے ' کوئی اگر ہے بھی
تم اپنے لکھے ہوئے کو کمال جانتے ہو
نفاذِ شعر ہے کیا ' شاعری اگر ہے بھی

تاجدار عادل

دل سے اُس کی نظر نے باتیں کیں
دھوپ میں اک شجر نے باتیں کیں

روبرو اس کے آج پہنچے تھے
آج عجزِ ہنر نے باتیں کیں

وہ اچانک ملا تو کیا کہتے
چشمِ گریہ اثر نے باتیں کیں

دل میں اس وقت ہُو کا عالم تھا
جب نظر سے نظر نے باتیں کیں

دل میں آئی جب اُس کی یاد کبھی
کیسی، سنسان گھر نے، باتیں کیں

اس کے رستے میں کب میں تنہا تھا
مجھ سے میرے سفر نے باتیں کیں

جب وہ آیا تو زندگی آئی
گھر کے دیوار و در نے باتیں کیں

جب مَیں کئی برس کے بعد گیا
مجھ سے بچپن کے گھر نے باتیں کیں

خورشید بیگ میلسوی

ہَوا کا شور ہے آوازۂ جرس تو نہیں
صدائے دشت کوئی نعرۂ قفس تو نہیں

میں اپنے عشق کی کم مائیگی سے ڈرتا ہوں
وگرنہ مجھ کو محبت میں پیش و پس تو نہیں

ذرا سی دیر یہاں بھی قیام کر دیکھو
ہمارا دل ہے کوئی پنجۂ ہوس تو نہیں

سفر میں وہ بھی شریکِ سفر ہے مری طرح
وہ ہمسفر ہے مگر میرا ہم نفس تو نہیں

فصیلِ جسم کو کیسے ہوا گرائے گی
فصیلِ جسم ہے دیوارِ خار و خس تو نہیں

کسی کسی کو ملا ہے مقامِ سرافراز
فرازِ دار پہ ہر اک کی دسترس تو نہیں

ہر ایک سوچ کو ملتی ہے کب پر افشانی
ہر اک خیال ہی خورشید دُور رس تو نہیں

انوار فیروز

رہبر ہے وہ جو صاحبِ کردار بھی نہیں
مجرم ہے اور جرم کا اقرار بھی نہیں

ماحول کی جلن سے سلگنے لگے بدن
راہوں میں اپنی سایۂ اشجار بھی نہیں

لفظوں کے تیر لب کی کماں سے نکل گئے
رستے میں کوئی خوف کی دیوار بھی نہیں

ہم نے تو تیرگی کے نشاں تک مٹا دیئے
لیکن یہ کیا کہ صبح کے آثار بھی نہیں

یہ حکم ہے کہ اس کو چمن ہی قرار دوں
پھولوں کا جس میں ذکر کہاں، خار بھی نہیں

یہ برگ ہیں یا شاخ سے چہرے اُبل پڑے
لیکن کسی میں زیست کے آثار بھی نہیں

سُن اے امیرِ شہر ترے خوف سے ہیں چپ
ورنہ یہ لوگ تیرے طرفدار بھی نہیں

انوار جس نے مارا ہے شب خون شہر میں
اس سے نپٹ آج وہ ہشیار بھی نہیں

اِبرار عابد

کیا معجزہ دکھا کے مرا چارہ گر گیا
آنکھوں میں جو لہو تھا جگر میں اُتر گیا

عزت جسے عزیز تھی جاں سے گزر گیا
دستار کو بچانا تھا لازم ' تو سر گیا

مجبوریوں نے میری مجھے کر دیا فروخت
میں آج آپ اپنی نظر سے اُتر گیا

جس کی پناہ میں تری یادوں کے عکس تھے
وہ آئنہ بھی کرچیاں ہو کر بکھر گیا

دنیا نے سانس لینا بھی دشوار کر دیا
سمجھے تھے تجھ کو پا کے مقدر سنور گیا

اُس نے کہا تھا فکر نہ کر میں ہوں تیرے ساتھ
پھر میں حدودِ وحشتِ دل پار کر گیا

اب ناگزیر ترکِ تعلق ہے میری جاں
مجھ کو خبر سنا کے مرا بے خبر گیا

برسوں رہا ہوں تیرہ نصیبوں کے درمیاں
آیا جو روشنی میں اچانک تو ڈر گیا

نوحہ بلب ہے اہلِ محبت کا قافلہ
منزل پہ آ کے قافلہ سالار مر گیا

ہے سدِراہ کوئی ارادہ شکن نگاہ
عابد نہ باندھ رختِ سفر' اب سفر گیا

صفدر سلیم سیال

تری روز روز کی حجتیں مجھے کھا گئیں
تری بے جواز شکایتیں مجھے کھا گئیں

تو نہیں کسی کا مرے سوا میں یہ مانتا ہوں
تری بے مراد رفاقتیں مجھے کھا گئیں

تو قریب ہے تو لپٹ کے مجھ سے رُلا مجھے
تری دوریوں کی اذیتیں مجھے کھا گئیں

تو شکی مزاج شروع سے تھا یہی دُکھ رہا
مری بار بار وضاحتیں مجھے کھا گئیں

تری زُود رنجی نے میری نیندیں حرام کیں
تری روٹھنے کی یہ عادتیں مجھے کھا گئیں

میں امیرِ شہر کی سختیوں سے نہیں مرا
مرے عہد کی یہ عدالتیں مجھے کھا گئیں

میں جو کر رہا تھا حساب اُن کے فتور کا
اسی خوف سے بڑی طاقتیں مجھے کھا گئیں

مجھے حاسدوں سے گلہ نہیں کسی بات پر
مری سر پھری یہ ذہانتیں مجھے کھا گئیں

مجھے مصلحت کے ہنر کی کوئی خبر نہ تھی
مری بے نیام صداقتیں مجھے کھا گئیں

میں جو دشمنوں کے ہر ایک وار سے بچ گیا
مرے اپنے گھر کی عداوتیں مجھے کھا گئیں

وہ بھی لوگ تھے کہ جو بے وسیلہ بچے رہے
مری بے حساب سہولتیں مجھے کھا گئیں

کبھی مسلکوں کے محاذ پر ہیں ڈٹے ہوئے
مری مسجدوں کی امامتیں مجھے کھا گئیں

کسی چیز کی بھی مرے وطن میں کمی نہ تھی
مری بے دماغ حکومتیں مجھے کھا گئیں

مجھے یاد تک نہ رہا زمانہ فراق کا
سرِ شب تری یہ عنایتیں مجھے کھا گئیں

کبھی غور کر مری بے بسی پہ مرے خدا
مرے روز و شب کی مشقتیں مجھے کھا گئیں

جو مقام تھا مرا مہ رخوں میں' وہ دیکھ کر
مرے دوستوں کی رقابتیں مجھے کھا گئیں

تجھے ضبطِ شوق کا تجربہ ہی نہیں ہوا
تری بچوں جیسی یہ عادتیں مجھے کھا گئیں

میں جو قبلہ اپنا درست کرنے سے رہ گیا
مرے رہبروں کی ہدایتیں مجھے کھا گئیں

تو جو پہلی بار ملا تھا مجھ سے یہیں کہیں
تجھے دیکھنے کی وہ حسرتیں مجھے کھا گئیں

کسی جنگ میں مجھے زیر کوئی نہ کر سکا
مرے شہریوں کی شقاوتیں مجھے کھا گئیں

میں سلیم زغۂ راہزن سے نکل گیا
مرے ساتھیوں کی کدورتیں مجھے کھا گئیں

شہناز نور

وفاداری کی یکطرفہ لکھی تفسیر سے باہر
میں رہنا چاہتی ہوں اب تری جاگیر سے باہر

بہت باتیں سمٹ پائی نہیں لفظوں کی جھولی میں
بہت جذبے رہے ہیں دامنِ تحریر سے باہر

طرب کے سارے رنگوں سے سجی تصویر تھی جس کی
دکھائی وہ دیا ' کتنا بجھا تصویر سے باہر

کسی پل بھی درو دیوارِ جاں ڈھے جائیں گے یکدم
لگا گھن غم کا اندر' آ گیا شہتیر سے باہر

مجھے اس کی مہارت پر ذرا بھی شک نہیں لیکن
تبسم رہ گیا ہو گا مری تعمیر سے باہر

گزشتہ کو جو آئندہ سے جوڑے وہ کڑی ہوں میں
گنی جاتی ہوں جانے پھر بھی کیوں زنجیر سے باہر

جو چاہا تھا کہاں ہوں نورؔ جو ہوں کب یہ سوچا تھا
رہی منزل مسافت سے' دعا تاثیر سے باہر

محمد فیروز شاہ

بنجر دھرتی میں تخلیقی سوچیں میری تقصیریں ہیں
کرب کی گہری لہریں میرے خون میں شامل تعزیریں ہیں

میرے عہد کی پیشانی پر اس کے نام کی تحریریں ہیں
تابندہ لمحوں کی آنکھوں میں یادوں کی تنویریں ہیں

اب تو شاید رنگوں کی پہچان بھی ہم سب کھو بیٹھے ہیں
اک جیسے ہیں سارے منظر' اک جیسی ہی تصویریں ہیں

اک محبوب صدا اُٹھی تھی صدیوں پار جزیرے میں سے
سچے جذبے' سچے ناتے سب اس کی ہی تفسیریں ہیں

اب فیروزؔ لیے پھرتے ہیں خوابوں اور یادوں کے لاشے
دھندلائی آنکھوں کے آگے بے مفہوم سی تعبیریں ہیں!

حمیدہ شاہین

وہ چشمِ بخت کشا مجھ پہ گر ٹھہر جائے
مرا ستارہ مرے ہاتھ پر اُتر آئے

مَیں اپنی ماں کی کہانی کو تب سمجھ پائی
جب اس کے لفظ مقدر نے مجھ پہ دُہرائے

مَیں آسمان سے بڑھ کر بسیط ہو جاؤں
مرے لیے کوئی شمس و قمر بنا پائے

نئے سرے سے مرتب ہو کائنات مری
کوئی ترانۂ ہستی کو اس طرح گائے

وہ سارے چاند ستارے پہن کے بیٹھا ہے
فلک سے جا کے کہو' میرے گہنے لوٹائے

مَیں سر سے پاؤں تلک کِھل اُٹھوں' مہک جاؤں
وہ ابرِ موسمِ گل اب کے اس طرح چھائے

میں کائنات میں گونجوں' خدائے صوت و صدا
کلیدِ بابِ سخن مرحمت جو فرمائے

صدائے وحشتِ گل ہوں' ذرا خیال سے سن
میں گل نہیں ہوں جسے تو چمن سے چُن لائے

امین خیال

قبا کے ساتھ سینہ چاک ہو جاتا تو کیا ہوتا
بیانِ غم تھا حسرت ناک ہو جاتا تو کیا ہوتا

کمالِ سادگی میں بھی قیامت اُس کا لہجہ ہے
غمِ جاناں ذرا چالاک ہو جاتا تو کیا ہوتا

حسیں پھولوں کی نازک چلمنوں سے جھانکنے والو
کوئی کانٹا اگر بیباک ہو جاتا تو کیا ہوتا

زمانہ تو مری تر دامنی سے چونک اُٹھا ہے
وہ دامن بھی اگر نمناک ہو جاتا تو کیا ہوتا

تعلق ایک مدت تک رہا ہے رنجِ دوراں سے
غمِ جاناں کا بھی ادراک ہو جاتا تو کیا ہوتا

خیالؔ اپنی تو پہلے بھی کہاں زندوں میں گنتی تھی
سرِ کوئے محبت خاک ہو جاتا تو کیا ہوتا

سجّاد مرزا

تو نے ہدف ہمیں کو اے آسماں بنایا
ہم نے کسی چمن میں جب آشیاں بنایا!

راہوں کے پیچ و خم نے ڈھائے ہیں وہ ستم بھی
رہرو بکھر گئے ہیں جب کارواں بنایا

اے چشمِ نیم خوابی! دے داد اس ہنر کی
عکسِ نظر کو ہم نے حسنِ جہاں بنایا!

آنکھیں تو بجھ گئی ہیں اس کارِ فن میں لیکن
برفوں کی ضو کو ہم نے شعلہ رُخاں بنایا

روشن ہوئے تو شب کو صبحِ طرب کیا ہے
سلگے تو روشنی کو ہم نے دُھواں بنایا

آئینہ بھی ہماری پہچان سے ہے قاصر
غم دے کے تم نے ہم کو کیا مہرباں بنایا

موجِ ستم ہیں آنسو کیسے بچائیں دل کو
دریا کے پاس ہم نے اپنا مکاں بنایا

سجادؔ ہر شجر پر زردی رُتوں نے چھڑکی
کیا دورِ منقلب نے رنگِ جہاں بنایا!

جمال اویسی

میں گردباد بن کے بھٹکتا پھروں تمام
آہوئے بے ستون مرا پڑ گیا ہے نام

اے منزلو! تمہاری طرف کون جائے گا
دیکھا ہے کاروانِ زمانہ کو بے امام

آنکھیں ہماری سوچ میں گم دیکھتی رہیں
رقصِ شررؔ طوافِ سناںؔ رخشِ بے لگام

پھینکا ہے کس نے مجھ کو حوادث کی گود سے
اس بحرِ بے کنار میں میرا ہو انضمام

بے ارض سے فلک تلک اک گردباد چھائی
بے منظری میں ڈوب گئے سلسلے تمام

لیل و نہار سلسلۂ موت و زیست ہیں
کون آگے آگے جھومتا جاتا ہے بے قیام

تسلیم الٰہی زلفی

دماغ کے لیے، سینے میں آگہی دے دی
چراغ کے لیے مُٹھی میں روشنی دے دی

تراشتا رہا لفظوں کو ہاتھ خون ہوئے
خدا نے شہرِ سخن کی جو آذری دے دی

سفید پوشی ہماری نہ رہ سکی قائم
غبارِ راہ نے دامن کو گرد بھی دے دی

ہمیں بہار کے آنے کا اس قدر ہے یقیں
جو گل کھلا نہیں اُس کی بھی حاضری دے دی

سمجھ میں آئے نہ جو بات پوچھ لیتا ہوں
اس ایک بات نے آسان زندگی دے دی

جو تھک کے بیٹھ گئے راہروانِ منزلِ شوق
تمام عمر کی قسمت نے بے گھری دے دی

بس اُیکبار وہ آیا تھا خانۂ دل میں
تمام عمر کے جذبوں کو تازگی دے دی

گرا دیئے در و دیوار اپنے ہی گھر کے
گلی کی راہ گزر کو کشادگی دے دی

بٹھا کے لایا جو اس پار اپنی کشتی میں
اُسی نے واپسی میں ناؤ کاغذی دے دی

مرے لکھے میں اثر اُس کی دین ہے زلفی
کہ میرے حرف کو جس نے پیمبری دے دی

شہاب صفدر

خاک کو کیمیا سمجھ بیٹھا
میں اُسے کیا سے کیا سمجھ بیٹھا

کتنا سادہ تھا، دنیاداری کو
کاوشِ بے ریا سمجھ بیٹھا

لازمی صرف اختیار ہوا
متن کو حاشیہ سمجھ بیٹھا

غلطی کی جو سامری کا طلسم
آیتِ انبیا سمجھ بیٹھا

کہنا تھا جس کو دیدۂ حیرت
ایک دو دن نیا سمجھ بیٹھا

بجھ گیا، نغمۂ ہوا سن کر
جانے کیا وہ دِیا سمجھ بیٹھا

متوہم تھا بوریئے کو مرے
مسندِ اولیا سمجھ بیٹھا

صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی
تیرگی کو ضیا سمجھ بیٹھا

ایک ابرِ بخیل کو صحرا
وارثِ اسخیا سمجھ بیٹھا

تھی عقیدوں کی جنگ، میں جس کو
فکر کا زاویہ سمجھ بیٹھا

ق

پہلے پہلے تو دشتِ وحشت میں
بزم کو تخلیہ سمجھ بیٹھا

چارسو کو الگ خیال کیا
خلد کو بادیہ سمجھ بیٹھا

کھل گیا راز، تشنگی کو جب
سب سیمیا سمجھ بیٹھا

میں وہ فرعون تھا کہ دنیا کو
برتر از آسیہ سمجھ بیٹھا

دوہے، ماہیے، ہائیکو

دوہے/امین خیال

پرجاپت سُن بینتی پرچ کے پرچک دے
ہم بڑے مجبور ہیں یوں نہ پرچہ لے
تن پلندہ روگ کا من میں دُکھ ہی دُکھ
ملے نہ جیتے جاگتے جگ کے بھیتر سُکھ
سادھو اس سنسار کو پھوکٹ میں نہ لیں
پھوکا پھگلا جگت یہ اور کسی کو دیں
اپنے من میں کھوٹ نہ، جگ سے کیسا بھو
جا کے من ماں کھوٹ ہو رَس بناوے سو
اُلٹی گنگا چل پڑی ہوئیو عجب بگاڑ
راجے پاپ کمائیو کھیتر کھائیو باڑ
پوتھی پنتھ پڑھائے کے نسرے گی کیا جوت
شبد کیرتن چھوڑ کے من کی تختی پوت
کال کلونا کوئلہ کیونکر ہووے چاک
صورت ہووے آم کی پھر بھی آک ہے آک

دوہے/ بھگوان داس اعجاز

چندا سا چہرہ ترا، پھول سے نازک ہونٹ
ہاتھ نہ رکھ منہ پر مرے، گلا نہ میرا گھونٹ
باتیں ہوں گی پیار کی، ملا آج ایکانت
نین اُتاریں آرتی، من کا سنشے شانت
پاس پہنچ کر آپ کے، ہُوا مجھے احساس
میں ہر شے سے دُور تھا، ہر شے میرے پاس
بڑی شرط مت تھوپئے، مت کریے ضد زور
پنکھ چھوڑ کر تتلیاں، جائیں بھی کس اور
ایسا نا دیکھا کہیں گرماتا سا روپ
تم پونم کا چاند ہو، یا ساون کی دھوپ
سجنی! ایسی کر کوئی، آج رسیلی بات
من کا اندھیارا مٹے، کھلے چاندنی رات
مہنگی اک مسکان کا لگا چکانے مول

بیٹھا ہے دھرنا دیئے، من کی گٹھڑی کھول
کبھی کہے تو چاند ہے، کبھی کہے تو پھول
میں کوری تعریف میں ہوتی جاؤں ڈھول
سکھی اُسے ہونے لگی، اب میری پہچان
اپنے گھر کا راستہ، بھول گیا نادان!

رباعیات/اسلم حنیف

(۱)

غم کی تجسیمِ زریں ہونا ہے
اُجڑے ہوئے لمحوں کا امیں ہونا ہے
آتش کدۂ خواب نہ ہو جائے سرد
کندن مجھے اے عمر! یہیں ہونا ہے

(۲)

ویرانیٔ صحرا در آئی مجھ میں
جاگا خوفِ لامتناہی مجھ میں
کیا حادثہ تھا، بطنِ شب میں رینگا
کیا چیز تھی جو ٹوٹ کے بکھری مجھ میں

(۳)

پھیلی ہوئی بیٹھی ہے ہَوا جھولی میں
اب کچھ نہیں خوابوں کے سوا جھولی میں
پھر بھی نہیں لٹنے کا ہمیں کچھ احساس
یہ کیسا خلا در آیا جھولی میں

(۴)

آندھی وحشت خیز چلی تھی جس روز
دنیائے سکوں لرز گئی تھی جس روز
ہر گھر کا گھڑا اوندھا پڑا تھا اے دوست
چھپّر میں مرے آگ لگی تھی جس روز

(۵)

بے گانۂ وسعت ہے منظر میرا
مایوس ہے ہر ایک شناور میرا
بڑھنے لگی شہرت تو ہوا یہ احساس
اک قطرے کی صورت ہے سمندر میرا

ماہیے/ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

تنویر وفا دیدو
دور کی وادی سے
اُلفت کی صدا دیدو

جلتی ہوئی شمعوں سے
کچھ تو سبق لے لو
بکھرے ہوئے لمحوں سے

کمرے میں اندھیرا ہے
کون مگر در پر
دستک دیئے جاتا ہے

سپنے ہیں پرانے سے
ملتے نہیں اب تو
سائے بھی تمنا کے

برکھا رُت آئی تھی
پھولوں کے آنگن
ہریالی چھائی تھی

کیسی یہ ملہاریں
آنگن آنگن کیوں
نفرت کی دیواریں

ہائیکو/عزیز اللہ عابد

خوں میں ہیں لت پت
سارے حرف محبت کے
مجھ سے چھینو مت

باغوں میں جھولے
تم سے پیت بڑھاتے ہی
ہم ہر شے بھولے

کیوں ہے اندھیرا گھپ
لڑکا ہے بڑبولا سا
لیکن لڑکی چپ

اُس کے ہونٹوں سے
میٹھی باتیں کیا پھسلیں
دل میں جا اُتریں

تیرے آنے پر
میرے سُونے من اندر
بجلی کوندی ہے

تو مادہ میں نر
میری چاہت کی مالا
تیری گردن پر

ماہیے/ڈاکٹر نسیم اختر

نہ غم میں، کراہوں میں
ساتھ تو دے دیتے
اُلفت بھری راہوں میں

بانہوں میں اُٹھا لائیں
بس جو چلے گوری
لاہور گھما لائیں

چھپ چھپ کے نہ چوری سے
مل بھی کہاں پائے
کشمیر کی گوری سے

کیا خوب نظارہ ہے
صبح بنارس ہے
گنگا کا کنارہ ہے

بیکار کی باتوں سے
نفع نہیں کچھ بھی
اخبار کی باتوں سے

سانسوں میں بسی خوشبو
ماہی ملا مجھ سے
پاؤں کے بجے گھنگھرو

پربت کے دامن میں
ماہی گاتا ہے
پائل کی چھن چھن میں

مایوس نہ ہو جانا
پتھر پہ دیپوں کے
چلنے سے نہ گھبرانا

اختر کو بلا دینا
ساحل راوی پر
ہاں پیار جتا دینا

ماہیے / شاہین فصیح ربانی

کمرے میں لگے جالے
رابطہ اس سے ٹوٹ گیا، خط اس کے جلا ڈالے

چپ تیز ہوا ماہی
میرے دل میں نہیں رہتا، کوئی تیرے سوا ماہی

تنکے کا سہارا ہے
ہم نے تیری چاہت میں ہر لمحہ گزارا ہے

طوفانی راہوں پر
چلنا بڑا مشکل ہے انجانی راہوں پر

ماہیے / سید تحسین گیلانی

آنا ہے تو آ جاؤ
سوچا نہیں کرتے
میرے دل میں سما جاؤ

یہ پیار کی وادی ہے
کس کی ہے ماں جائی
جس کی یہاں شادی ہے

میں لوٹ کے آؤں گا
اپنی محبت کو
سنگ لے کر جاؤں گا

باغوں میں آیا کرو
گیت محبت کے
مل مل کے گایا کرو

روٹی کیوں جل گئی ہے
اُس کی خموشی تو
باتوں میں ڈھل گئی ہے

سونے کی بالی ہے
سوہنے مدینے کی
ہر بات نرالی ہے

سڑکوں پہ روڑی ہے
سب ہی کہتے ہیں
سوہنی یہ جوڑی ہے

کیسا وہ نظارہ ہے
سارے فلک پہ ہی
بس ایک ستارہ ہے

کاگوں نے شور کیا
زہر جدائی کا
ہنس ہنس کے ہم نے پیا

آنسو جو چھلکتا ہے
دکھ لاوا بن کے
آنکھوں سے نکلتا ہے

وعدہ نہ توڑیں گے
تیری قسم تجھ سے
ہم منہ نہ موڑیں گے

چاندی کا کوکا ہے
مجھ سے کہا اُس نے
یہ پیار تو دھوکا ہے

افسانے

تسلسل

رشید امجد

سفر آغاز ہوا تو منزل معلوم تھی‘ لیکن چند ہی لمحوں میں نہ آغاز کا احساس رہا نہ اختتام کا‘ بیٹھتے بیٹھتے دائیں طرف نظر پڑی اور پھر کچھ یاد نہ رہا۔ اُن آنکھوں میں عجب سحر تھا‘ لگا یہ آنکھیں اسی کی منتظر ہیں‘ لیکن نہ چلبلا پن نہ چمک‘ بس ایک خاموش گہرائی۔۔۔ اُس کی منتظر۔ صدیوں سے اس کی راہ تکتے تکتے اُداسی سی آ گئی تھی۔ ان آنکھوں کے آس پاس اُوپر نیچے کیا تھا‘ اس کی تو خبر ہی نہ ہوئی۔ نہ کچھ جانچنے پرکھنے کا موقع ملا‘ یہ اُداس اُداس آنکھیں تو خود ایک دنیا تھیں۔ وہ ان میں داخل ہو گیا۔ کب اور کیسے خود اُسے بھی معلوم نہ ہوا۔ اب نہ کوئی من تھا نہ تُو‘ نہ بس نہ مسافر۔

وہ آنکھیں تھیں اور وہ۔۔۔ لیکن اب وہ بھی نہیں تھا‘ اُن آنکھوں کی وادیوں میں اُترا ہوا ایک بے نام وجود‘ آگے منظر ہی منظر تھے۔

سرمئی دُھند میں لپٹے دو مجسمے‘ وقت کی دُھول میں اَٹے ہوئے‘ اپنے آپ کو پہچان کر اُس نے دوسرے مجسمے کے سینے پر اُنگلی پھیری‘ دھول میں لکیر بن گئی۔ دوسرے مجسمے کی آنکھیں بند تھیں اور سارا وجود ترشے ہوئے نگینے کی طرح ڈھلکیں مار رہا تھا‘ اُس نے آہستگی سے اُسے دوبارہ چھوا۔ بند پپوٹوں پر دستک ہوئی اور خاموش گہری آنکھیں اُس پر مرتکز ہو گئیں‘ ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرائی۔ لمحے سمٹ گئے اور ننھے ننھے پنکھ پھیلائے واپس مڑنے لگے۔

وہ تلوار سونتے قدم قدم اُس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پاس پہنچی تو دفعتہً تلوار کو ایک طرف پھینک کر بولی۔۔۔ ’’تیرے دیکھنے کو یوں آئی ہوں ورنہ کوئی اپنے آپ پر بھی تلوار چلاتا ہے۔‘‘[1]

تخت پر شعلہ ناچا‘ ایک کریہہ آواز گونجی اور لفظ کوندتی بجلی کی طرح ان پر گرے۔ تلوار سونتے جلاد قدم قدم قریب آ رہا تھا‘ وہ اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی ’’تیرے ساتھ جی تو نہ سکی لیکن تیرے ساتھ مرنے کی آرزو تو پوری ہوئی۔‘‘

لہراتی تلوار کی چمک نے فضا میں اُداس سُر پھیلا دیئے اور خون کی چھینٹوں نے درباریوں کے قیمتی کپڑوں پر نقش بنا دیئے۔

گہری اُداس آنکھوں میں مسکراتی چمک نے سنہری پنکھ پھیلا دیئے۔

منظر بدلا۔۔۔ اب آس پاس لوگ مختلف تھے‘ لیکن صورت حال وہی تھی۔ مندر کی ساری گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ سفید چوغہ پہنے‘ دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھائے‘ کرخت آواز میں نامانوس لفظوں کا ورد کرتے وہ مڑا اور ان کے قریب آ گیا۔ وہ دونوں بڑے گنبد سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی‘ مسکرائے جا رہی تھی۔۔۔ پھر وہی ہوا‘ جو ہمیشہ ہوتا آیا تھا‘ ایک طویل چپ‘ ٹھہرے ہوئے وقت کی جھیل میں کنکر گرا‘ لہریں دائرہ در دائرہ رقص کرتیں کناروں کو چھونے لگیں۔ سب منظر ایک جیسے تھے‘ لمحہ بھر کی خوشی اور پھر فضا میں لہراتی تلوار کی چمک‘ ایک ایسا سفر جس کی کوئی منزل نہیں‘ چلتے رہنا‘ چلتے رہنا۔۔۔ بس بھی چل رہی تھی۔ درمیان میں کہاں کہاں رُکی‘ کون چڑھا‘ کون اُترا۔۔۔ اُسے کچھ خبر نہ ہوئی‘ اب شاید آخری سٹاپ آ گیا تھا۔ مسافر سیٹوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اپنے اپنے بیگ اُتار رہے تھے۔۔۔ وہ بھی کھڑی ہو گئی۔ بیگ پکڑا جانے سے پہلے مڑ کر اسے دیکھا۔۔۔

وہ اپنی سیٹ پر گم سم بیٹھا۔ بس دیکھے جا رہا تھا۔ وہ بھی لمحہ بھر اُسے دیکھتی رہی۔ اتنے میں اُسے لینے آنے والا اندر آ گیا اور اُس کا بیگ اُٹھا لیا۔ پھر دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف چل پڑے۔ اُترنے سے پہلے اُس نے مڑ کر دیکھا‘ یوں لگا خاموش‘ اُداس آنکھوں میں موتی سا ڈھلکا ہے‘ پھر وہ تیزی سے اُتر گئی۔ لینے آنے والا پاس کھڑی گاڑی میں بیگ رکھ رہا تھا۔ بیٹھنے سے پہلے اُس نے پھر مڑ کر اُسے دیکھا۔۔۔ وہ جو اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھا‘ شیشے میں سے دیکھے جا رہا تھا۔ گاڑی رینگتی سڑک پر پہنچ گئی اور ٹریفک کے سیلاب میں بہہ گئی۔ وہ اُسی طرح چپ بیٹھا دیکھتا ہی رہ گیا۔

اُسے بھی کسی نے لینے آنا تھا۔ جب دیر تک وہ سیٹ سے نہ اُٹھا تو آنے والا اندر آ گیا اور اُس کے پاس آ کر بولا۔۔۔ ’’سر آپ ٹھیک تو ہیں نا۔‘‘

---

[1] تیسرے درویش کی سیر

وہ چونکا —— ''ہاں —— ٹھیک ہوں۔''

آنے والے نے اس کا بیگ اُٹھالیا اور کہنے لگا —— ''سارے مسافر اُتر گئے لیکن آپ سیٹ سے اُٹھے ہی نہیں میں تو ڈر گیا تھا۔''

وہ کچھ نہ بولا —— بولتا ہی کیا' لیکن اُس نے اپنے آپ سے کہا —— ''یہ پہلی بار ہے' وہ مجھے اکیلا چھوڑ گئی۔''

''اکیسویں صدی جو ہے۔'' آنے والے نے بیگ اُٹھاتے اُٹھاتے مڑکر کہا' اُس نے شاید اُس کی بات سن لی تھی۔

''اکیسویں صدی'' اُس نے دُہرایا۔

''جی سر —— میری ماں کہتی ہے کہ اُس نے اپنی بزرگوں سے سُنا ہے کہ اکیسویں صدی میں کوئی کسی کو نہیں پہچانے گا —— بس ایک نفسانفسی ہوگی۔''

''لیکن اُس کی اُداس آنکھوں میں ایک موتی تو تھا۔'' اُس نے سوچا' لیکن کچھ نہ بولا۔ اس قیامت کی گھڑی میں کہا بھی کیا جا سکتا تھا۔

ناصر عباس نیر کی 'جدید اور مابعد جدید تنقید' —— چند آراء

''اردو تنقید کے میدان میں ناصر عباس نیر کی آمد ایک ادبی واقعہ ہے اور اگر اس کی لگن' تجسس اور مطالعے کا یہی عالم رہا تو آگے چل کر اُس کا نام اردو کے چوٹی کے نقادوں میں شامل ہوگا۔ اس کا مجھے یقین ہے۔''

وزیر آغا

''ان (ناصر عباس نیر) کا مطالعہ اور آراء نہ صرف مستقبل میں بڑے مباحث کی راہیں کھولنے کا سامان ہیں بلکہ بڑی قیمتی کتابیات کے علاوہ خود متن کی حوالہ جاتی حیثیت میں بھی ہمارے لیے ایک وقیع ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یقیناً یہ کتاب ان مباحث میں اپنے اندر ایک تاریخی حیثیت حاصل کر لینے کے تمام عناصر رکھتی ہے۔ اس موضوع پر آئندہ تحقیق و تجزیات اس کے استفادے اور اُس کے حوالے کے بغیر نامکمل رہیں گے۔''

جمیل الدین عالی

''ناصر عباس نیر اردو کے نوجوان نقادوں میں سربرآوردہ ہیں۔ تنقید کے عہد بہ عہد تصورات اور تغیرات پر فاضل نقاد کی نظر ان کی ہوش مندی اور وسعتِ مطالعہ کی آئینہ دار ہے۔ ناصر عباس نیر کا نہ صرف مغربی فلسفے کا مطالعہ اچھا ہے بلکہ انگریزی زبان اور اس میں موجود تنقیدی اصطلاحات پر بھی ان کی گیرائی قابلِ داد ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں نیر صاحب نے مذکورہ مباحث کے اہم پیش کنندگان کے افکار کا خلاصہ ہی نہیں کیا' انھیں تجزیے' تحلیل اور تنقید کی کسوٹی پر بھی کسا ہے۔ ان کے یہاں کہیں مرعوبیت دکھائی نہیں دیتی۔ اُمید ہے کہ گہرے مطالعے اور تمکین آمیز اعتماد سے ترتیب پانے والی یہ کتاب نئے سوالات اور نئے مباحث کو تحریک دے گی۔''

ڈاکٹر تحسین فراقی

''بڑی خوشی کی بات ہے کہ ناصر عباس نیر ادبی نظریات کی تفہیم اور تشریح میں علمی دیانت سے کام لیتے ہیں اور ان میں نتائج اخذ کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے۔''

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

''ناصر عباس نیر ایسے تنقید نگار ہیں' جن کی فکر و نظر اور ادبی شعور کا رنگ اپنے ہم عصروں سے بہت حد تک مختلف ہے۔ مابعد جدید تنقیدی تھیوری پر جتنے مدلل انداز میں انہوں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ساری مشکلات ان کے لیے آسان ہوگئیں' جو اس راہ میں ہر کسی کو اُٹھانا پڑتی ہیں۔''

حقانی القاسمی

باسٹرڈی

اسلم سراج الدین

ہوش وحواس اور ہاتھوں میں ٹیس کے پلٹ آنے کو پُورن نے ایک ساتھ محسوس کیا۔ وہ کسی پکّی جگہ پر ایک مرصع اور نقشین خیمہ گاہ کے سامنے پڑا تھا۔ ایک طرف اُونچی مچان پر چڑھا ایک مسخرہ ہاتھ میں پکڑے کوڑے کو بار بار ہوا پر مار رہا تھا۔ چہرے پر اُس نے رنگدار لکیریں کھینچ رکھی تھیں جن سے چہرے کی حد تک وہ رنگین سلاخوں میں مقید معلوم ہوتا تھا۔ متواتر سَر گھما کر مخروطی ٹوپی کا پھندنا ہلاتے ہوئے وہ ٹین کے ایک طولانی بھونپو میں بولتا لوگوں کو خیمہ گاہ کی طرف بُلا رہا تھا۔

پُورن پر جب یہ بات واضح ہوگئی کہ دوسری طرف جانے کے لیے اُسے خیمہ گاہ کے اُسی راستے سے گزرنا ہوگا جس کے سامنے اُس نے خود کو پڑا پایا تھا، جس میں اِکا دُکا لوگ غائب ہو رہے تھے، تو جھولا سنبھالتا وہ اُٹھتا۔۔۔ اُونچے مسخرے سے بات کرنے کے لیے سَر پیچھے ڈال کر اُسے بھی اونچا بولنا پڑا: ''یہاں کہیں کھانے کو ملے گا کچھ!۔۔۔''

''ملے گا۔۔۔ اُدھر''۔۔۔ مسخرے نے بھونپو سے خیمہ گاہ کی پچھلی طرف اشارہ کیا۔ پھر کہا: ''پر کیا یوں گندے ہی کھانے بیٹھ جاؤ گے۔ پہلے دھو نہا تو لو۔۔۔''

''یہاں کہاں بتاؤں دھوؤں!؟۔۔۔''

مسخرے نے کولہے خیمہ گاہ کو جاتے راستے کی طرف مٹکائے اور بھونپو میں پادتے ہوئے بتایا:

''یہاں''

''اِدھر؟۔۔۔ یہ خیمہ غسل خانہ ہے کیا؟''

''اور کیا۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔'' اُس کے اشارے کی سمت پورن کو پھٹا ہوا ایک کپڑا ہَوا میں پھڑ پھڑاتا دکھائی دیا جس پر لکھا تھا: حمام/ کوارنٹین۔

''کوارنٹین! مگر مجھے تو کوئی بیماری نہیں۔ کوئی وباء پھوٹ پڑی ہے کیا!؟۔۔۔''

''پھوٹ بھی سکتی ہے۔ اگر تم ایسوں کو جو باہر سے تن من پر پتہ نہیں کیسا کیسا گند منڈلا دے ادھر چلے آتے ہیں یوں راج گدی میں کھلے چھوڑ دیا جائے، حمام سے گزارے بغیر۔۔۔''

''مگر بھائی میرا ہاتھ زخمی ہے اور بھوک بھی بہت لگی ہے۔۔۔''

''یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ ہمارا یہ ہے کہ تمہارا اندر باہر صاف ہونا چاہیے راج گدی میں داخلے سے پہلے۔ ارے تم تو ڈر گئے۔ ڈرو نہیں۔ نہ کچھ تمہارے اندر جائے گا نہ باہر آئے گا۔۔۔'' مسخرے نے بھونپو ٹانگوں میں لے کر آگے پیچھے جھولتے ہوئے کہا:

''اندر ایک چھوٹی سی تقریر ہوگی۔ پھر ایک کھیل، اور کھیل کھیل میں تمہاری طبیعت صاف۔۔۔ چلو!''۔۔۔ یہ آخری لفظ مسخرے نے مسخریت سے زیادہ کوڑے کے ساتھ کہا۔ مت ماری گیا پورن اس پر بھی نہ ہلا تو مسخرا اور کوڑا ایک ساتھ کڑ کے: چلو۔

نیم تاریکی میں چپ چاپ بیٹھے لوگوں۔۔۔ بشمول ٹوڈ کوٹ، اغلباً اسی کتاب میں کھویا جو اسے مُردگاں کے میدانوں سے نکال لائی تھی، کی چند قطاروں سے اُوپر پورن کی نظر دودھ کی طرح سفید اُوپر تلے رکھے ہم مرکز دائروں کی ایک بناوٹ پر پڑی جسے فٹ لائٹس روشنی میں نہلا رہی تھیں۔ اس بناوٹ کے پیچھے خیمہ گاہ کے تقریباً آدھے عرض کی ایک سکرین تھی جس کے پیچھے سے کھڑبڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر پورے قد سے کھڑا ایک مائیک لگتا تھا کسی کا منتظر ہے۔ مائیک اور سکرین کے پیچھے خیمہ گاہ کی پشت پر باہر جانے کا راستہ ہے جسے ادھر کو پشت کیے ایک ہتھیار بند رو

کے کھڑا ہے جب وہ ذرا سا ہلتا ہے قدرتی روشنی اندر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ دائیں بائیں بھاری بانات کے پردے جھول رہے ہیں جنہوں نے خیمہ گاہ کو پارٹیشن کر کے خیموں میں بانٹ رکھا ہے۔ کبھی کبھی کوئی آدمی ان پردوں میں سے نکل کر دائیں بائیں غائب ہو جاتا ہے یا اس طرف کے لوگوں میں آ بیٹھتا ہے۔ ٹوٹی پھوٹی ایک کرسی خالی دیکھ کر پورن بیٹھ رہتا ہے۔

بیٹھتے ہی بُو کا ایک بھبکا آیا۔ اُس نے دیکھا کہ ساتھ والی کرسی پر ایک آدمی ہاتھ پر سگریٹوں کے چھوٹے بڑے ٹوٹے پھیلائے بغور اُن کا جائزہ لے رہا ہے۔ اُن میں سے ایک کو اُٹھا کر اُس نے ہونٹوں میں دبایا اور باقی پورن کو پیش کر دیئے اور اُس کے انکار پر پائجامے میں رکھ لیے۔ پھر نیفہ ڈھیلا کر کے ماچس نکالی۔ منہ میں دبے کو آگ دکھائی اور دائیں ٹانگ بائیں پر رکھ کر سامنے دیکھتے ہوئے چبا چبا کر دُھواں نگلنے اور بچا بچا کر باہر نکالنے لگا۔

اپنے کھچڑی پن میں اُس کی کئی روز کی بڑی داڑھی اور سر کے بال بھی دُھواں ہی لگ رہے تھے۔ خاک آلود دھوئیں میں اٹکے تنکوں اور گھاس پھونس کی صورت اُس سے زیادہ اُس کا سفر کرسی پر بیٹھا معلوم ہوتا تھا۔ بے خیالی میں پورن کا ہاتھ اپنے بالوں تک گیا اور بہت کچھ خس وخاشاک ساتھ لگا لایا۔ وہ جھاڑ پونچھ کر ہی رہا تھا کہ ایک گھنٹی بجی اور سکرین کے پیچھے سے نکل کر ایک آدمی مائیک کی طرف آیا۔ اُس نے اعلان کیا کہ:

پروفیسر موچنا مشکبوئی ڈی لٹ سٹرابری' وزٹنگ پروفیسر وسکانسن یونیورسٹی' ڈین آف دی فیکلٹی آف فیشل ماسکس تشریف لا چکے ہیں۔ اُن کے آج کے لیکچر کا موضوع ہے: آدمی کا شرف۔

اُس کے مائیک سے ہٹتے ہی جو صاف سکرین کے پیچھے سے نمودار ہوئے انہوں نے قد کی ایک کمی کو پورا کرنے کے لیے کئی چیزیں بڑھا رکھی تھیں۔ تو ند اور کوٹ' گل مچھے' فلائی تک پہنچتی نکٹائی۔ مسکراہٹ کے ایک مستقل تاثر سے اُن کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ خود اہمیتی کے احساس سے بوجھل پاؤں اس اُمید میں سنبھل سنبھل رکھتے ہوئے کہ ابھی اُنہیں کھڑے ہو کر تعظیم دی جائے گی' وہ مائیک تک آئے اور جھپٹ کر مائیک گرفت میں لے لیا۔ کیونکہ کوئی کھڑا نہیں ہوا تھا۔ مسکراہٹ اُن کے چہرے سے زائل ہوگئی' آنکھیں پوری کُھل گئیں۔ یوں کچھ دیر کھڑے وہ تھوک نگل نگل کر غصے کی آگ پر ڈالتے رہے اور جب یہ کچھ سرد ہوئی تو اندر کسی چیز کو بھینچ کر پیچھے رکھتے ہوئے اُنہوں نے کہنا شروع کیا:

''مسمیزم کے جس قعر مذلت میں آپ گرے ہوئے ہیں اُسے دیکھ کر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنے عہد کی اتھکس کی بنیادیں ہمیں کامک سٹرپس (Comic Strips) میں ڈھونڈنا پڑیں گی' مگر اتنے ہی یقین سے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ لوگوں سے آدمی کے شرف پر بات کرنا میری عظیم خوش قسمتی ہے کہ بدبختی ۔۔۔'' اتنا کہہ کر اُس نے محسوس کیا کہ بہت حد تک وہ اپنی برافروختگی پر قابو پا چکا ہے اور جب رہا سہا غصہ بھی اُس نے ناک کے راستے رومال پر نکال دیا تو وہ اپنے سامنے کی صورتِ حال پر مکمل طور پر حاوی ہو چکا تھا۔ سکون سے اُس نے سر دوبار نصف دائرے میں گھمایا اور ایک ذرا کھنکار کر غضب آلود رینٹ سے لتھڑے رومال کو پتلون کی جیب میں رکھتے ہوئے اُس نے کچھ دیکھنے کی کوشش اور خواہش کے بغیر اپنے سامنے کی اُس نیم تاریکی کو نظر سے چھچھل دیا جس کی کوارنٹین میں کچھ لوگ کرسیوں پر پرانی سبزیوں کی طرح پڑے تھے۔

''خواتین وحضرات! لیکچر دینا سکول ماسٹر لی جبکہ لیکچر پلانا گاڈلی ہے۔ تاہم کسی بات کے مبادی پر بات کرتے ہوئے کسی حد تک سکالیسٹک (Scholastic) ہونا ہی پڑتا ہے اور اس حد کے لیے میں مدرسین کو کبھی معاف نہیں کر سکتا اور اُمید کرتا ہوں کہ دُنیا میں پائے جانے والی مذموم مدرسیت کے لیے انھیں جہنم کے زیریں ترین طبقہ میں رکھا جائے گا۔ ذرا آپ ہی بتلایئے کہ بھلا یہ طے کیے بغیر کہ موضوع زیر بحث اتھکس کی ذیل میں آتا ہے کہ نہیں کیا ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔۔۔ ہرگز نہیں اور اس 'نہیں' کا سیدھا سادھا مطلب ہے کہ ہم علم الاخلاق کے مختلف نظریات کی دلدل کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ سوچئے! مجھے کتنے حوالہ جات لڑھکانا پڑیں گے۔ کئی طرح کے سلوجزم (Syllogism) کے کتنے جال ہیں جو مجھے کترنا ہوں گے! جناب میں تو پھنس کر رہ جاؤں گا۔ اری ٹریویبلی (Irretrievab!y)۔۔۔ اور میری اس مصیبت کا ذمہ دار کون ہے؟ سکول ماسٹرز۔۔۔ صرف سکول ماسٹرز۔ تو خواتین وحضرات! آیئے مل کر حریت فکر کا پرچم بلند کریں اور مل کر نعرہ لگائیں: ''ڈاؤن وِد سکول ماسٹرز آف دی ورلڈ۔ دُنیا بھر کے مدرسین ۔۔۔'' [رُک کر مقرر نے اپنے نعرے کے جواب کا انتظار کیا۔ ایک لحظ جس میں کوئی کھانسا' ایک نقطہ دہکا پھر دُھواں بلند ہوا اور مقرر کو آگ لگ گئی:] ''مردہ باد۔۔۔'' اپنے نعرے کا آپ جواب دے کر اُس نے آگ ٹھنڈی کی اور آگے بڑھا:

''تو پیارے حاضرین! ہمیں دیکھنا ہے کہ ایتھکس دراصل ہے کیا؟ آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے؟۔۔۔ارے تم لوگ کیا بتاؤ گے۔۔۔ تم۔۔۔''مقرر نے پھر کچھ غالباً سامعین کے لیے اُٹھتے ہوئے تاؤ کو نگلا۔۔۔

''تم کیا۔۔۔کبھی کہیں کوئی آج تک بتا پایا کہ علم الاخلاق کے مبادی کیا ہیں؟ تم لوگ خود کو خوش بخت سمجھو جو آج یہاں موجود ہو اور مجھے سن رہے ہو کیونکہ۔۔۔عزیزو غور سے سنو!۔۔۔کیونکہ علم الاخلاق کی واحد کنجی صرف اور صرف میرے۔۔۔کس کے؟۔۔۔صرف پروفیسر موچنا مشکبوئی کے پاس ہے۔ میں آج یہاں آپ کے سامنے علم الاخلاق کے بھید پر پڑا وہ پردہ اُٹھاؤں گا جو آج تک اُٹھایا نہ جا سکا۔۔۔تو حاضرین ایتھکس کیا ہے' کیا ہے ایتھکس۔۔۔محض یہ کہ: ہاؤ ٹو ڈیرائیو آٹ فرام از' (How to Derive' ought' form' is) یعنی 'ہے' میں سے 'چاہیے'' برآمد کرنا۔۔۔آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھیں۔ دیکھیں اُٹھا کر تاریخ اور دیکھیں کہ یہ کتنے بڑے بڑے ناموں سے بھری پڑی ہے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ آج تک کوئی یہ برآمدگی بروئے عمل نہ لا سکا۔ مگر میرے لیے یہ اتنا ہی آسان ہے جتنا کسی موچنا کے لیے ناک سے بال نکالنا۔۔۔یوں [جیب میں سے موچنا نکال کر ہر نتھنے سے ایک ایک بال اُکھیڑ کر دکھاتا ہے] یہ۔۔۔یا اتنا ہی آسان جتنا کہ۔۔۔کہ [کہ کہ کرتے ہوئے مونوڈرامائی انداز میں اوورکوٹ میں سے ایک خرگوش نکال کر اپنے سامنے کی نیم تاریکی کو دکھاتا ہے] جتنا کہ کوٹ میں سے یہ خرگوش نکالنا۔۔۔تالیاں'' [جونہیں بجتیں تو مسخرے کا سر انٹرنس کے اُوپر اُفقی رُخ نمودار ہوتا ہے۔

ایک کوڑھوا کی کھال کھینچتا ہوا چنگھاڑتا ہے: تالیاں۔ سبزیاں تالیاں بجاتی ہیں۔ پورن بھی۔ [اور جب اُس کے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی ایک اور ٹوٹے کی طلب میں ٹوٹتا ہوا ٹانگیں ایک سے دوسری پر بدل رہا تھا' مقرر نے ننھا خرگوش مائیک سٹینڈ کے قدموں میں رکھ دیا] یہ رہا خرگوش۔ ٹھیک آپ کی نظروں کے سامنے۔ اسے غور سے دیکھیے۔ دیکھیے کیسے اس کی نرم کھال میں سیاہ و سفید' ایتھکس کے بُرے بھلے کی طرح گھلے ملے ہیں اور یاد رکھیے حاضرین کرام! بوتھ آف دیز (Both of these)۔۔۔یعنی نیک و بد' بُرا بھلا۔۔۔آرایٹری بیوٹونائٹ پریڈی کیٹوائیڈ جیکٹوز (Are attributive not predicative adjectives) یہ بات سن کر خرگوش اپنے حیرت سے کھڑے کان ذرا ہلاتا ہے تو مقرر آپے سے باہر ہو جاتا ہے] دیکھا! اس کا میری بات پر صاد کرنا تم نے دیکھا؟ ارے کیسے نہ کرتا صاد کیا مجال اس کی'' [خرگوش ایک جست بھرتا ہے پھر ایک زقند اور سٹیج کے سَتّی کنارے پہنچ کر نیم تاریکی میں گھورنے لگتا ہے] ''اور اب وہ لمحہ آ پہنچا ہے حاضرین جس کی بنا پر کچھ لوگ ہمیشہ آپ کو رشک اور کچھ حسد سے دیکھیں گے۔ ابھی یہ خرگوش سٹیج سے کود ے گا اور آپ کی زندگی بدل کر رکھ دے گا۔ آپ کے پاس سے پھدکتا یہ ایتھکیل خرگوش آپ کو ایسی اخلاقی رفعت سے آشنا کرے گا جو Genetically منتقل ہوتی ہوئی آپ کی بلڈ لائن کو ہمیشہ سرفراز سرخرو رکھے گی۔۔۔''

خرگوش اب اپنے ایتھکلی سیاہ و سفید دھبوں کے ساتھ قرنطینہ کے نیم اندھیرے میں پھدکتا پھر رہا تھا۔ کہیں رک کر وہ زمین سے منہ لگاتا اور پھر تھوتھنی ہوا میں اُٹھا کر تیزی سے منہ چلانے لگتا ہے۔ دل کشی کی اس پوٹ کو دیکھ کر کرسیوں پر پڑی نباتات نے گویا ارتقائی جست بھری۔ پورن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بلاشبہ اُس چھوٹی سی چیز کا حسن بے نہایت تھا۔ خلقی اور بے پایاں اور اُس پر لاچار کر دینے والی بے بسی کی ایسی چھوٹ پڑ رہی تھی کہ پورن کے ساتھ بیٹھے آدمی کا جی۔۔۔کیا تو۔۔۔کہ اُسے گود میں بھر لے۔۔۔مگر فقط اپنے تمبا کو سنے ہاتھوں کو دیکھتا رہ گیا۔۔۔

مقرر پر یوں گوش بند وہ دونوں۔۔۔پورن اور پیا جا چکا تمبا کو پینے والا آدمی۔۔۔خرگوش کی آنکھ کے کناروں پر آ رکی اُس انوکھی مائع معصومیت میں گم ہو گئے جس کے امکان کو زیادہ تر جاندار اپنے پہلے یک خلوی سانس کے ساتھ فراموش کیے جا چکے ساحلوں پر تج آئے تھے۔۔۔کہ ناگہاں پورن نے بہیمیت کو سنا جو بھیس بدل کر اپنی آوازوں میں تحلیل ہو آئی تھی۔ ہزار ہا بھیڑیے لگڑ بگھے اور کتے اپنی ہی کشیدہ دور تک دراندازغراہٹوں کے غیر مرئی درندوں پر جھپٹتے انبوہ در انبوہ ہانپتے ہونکتے ہر طرف سے خرگاہ کی طرف بڑھ رہے تھے: مجھے' اس تمبا کو خور' ٹوئیڈ کوٹ' کہ اس خرگوش کو بھنبھوڑنے!؟

پورن کی طرح یہ سوال شاید خرگوش کے ذہن میں بھی اُٹھا۔۔۔باہر جاتے جاتے رُک کر وہ تیزی سے پلٹا اور اُچھل کر تمبا کو خور کی گود کی پناہ بس آ گیا۔۔۔اور وہ بے فکرا جو لگتا تھا صرف تمبا کو کھاتا ہے اور صرف تمبا کو کی فکر جسے کھاتی ہوگی یکبارگی یوں فکر مند ہو گیا جوں کسی نے گیتی کا گولا اُس کی گود میں گرا کر کہا ہو: لو سنبھالو!۔۔۔کر دو دیکھ ریکھ اس کی۔۔۔اب وہ کیسے۔۔۔اُس خرگوش کے بے داغ پن کو اپنے ناصاف پن سے اور خود کو شادی

مرگ ہونے سے بچائے۔۔۔اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

پورن اُسے یوں تشنج میں چھوڑ کر باہر کی ایک نظر چرانے کے لیے اُٹھا۔ مسخرہ منہ پر بھیڑیے کا مکھوٹا چڑھائے بھونپو میں بھونکتے غراتے اور دھاڑتے ہوئے ایک سے دوسرے پاؤں کو دتا گرگ مسخرگی کر رہا تھا۔۔۔بعد۔۔۔بہت بعد' پورن سے جو بات ہمیشہ خود کو کہتی رہی' یہ نہیں تھی کہ کیسے اُس مسخرے کی ایک نظر اُس کے وجود کو متھ کر متلاگئی تھی نہ یہ کہ مکھوٹا ہٹانے پر بھی وہ مسخرہ گرگ ہی رہا قریب قریب۔ پورن کو وہ طربیہ گیت بھی یاد نہ رہا جو وہ گرگ ظریف کسی گُرگسار جنت کی مدح میں گا رہا تھا' ایک ایسی جنت جس میں صرف کانِ خوبی' گرگ خوئی میں خوب راسخ بھیڑیے ہی بار پا سکیں' ہمیشہ رہیں اُس میں' جہاں سے جو چاہیں اچھا اچھا کھائیں پئیں' پڑوس کی ایک زیادہ معروف جنت سے درآمد شدہ عمروں کی پارسائی کا کمایا' تپیا سے تمپرڈ' مشرف اور نوزائیدگان کی بے کُسنی کا اچھوتا اور حیرت انگیز حد تک لذیذ لحم اور ایک لمبی غُسل آلود آسائش جسے مئے مختوم دوآتشہ کرے۔۔۔نہیں' اُس کی ساعت کو یہ گیت بھی لوٹانے کے لیے نہیں کہا کبھی پورن کی یاد نے۔ ہاں ایک بات جس کا عقرب یاد سے نکل کر ہمیشہ اُس کی ساعت پر ڈنک مارتا رہا یہ تھی کہ گُرگئی گیت کے مسخرے کے ہونٹوں پر دم توڑنے کے بعد بھی وہ آوازیں اکناف کو بھنبھوڑتی ہر لحظہ خرگاہ سے قریب ہوتی سنی جا سکتی تھیں۔ طرفی چوب کا سہارا لے کر پورن نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔۔۔تاریک کھائی کے اُدھر' مدوّر بناوٹ کے پاس مقرر کی آواز اب چٹکنے لگی تھی۔ پھر بھی باہر کی آوازوں سے وہ بہر حال جدا تھی۔ اپنی ایک ذاتی غراہٹ کے باوجود قطعی الگ۔۔۔سیسہ گھٹنوں میں اُترنے سے پہلے وہ کرسی پر آ گیا۔

تمبا کو خورا اور سیہا سو رہے تھے۔ آدمی کی ٹھوڑی سینے کے میلے گھنے بالوں میں گھسی تھی اور ہاتھ گود کے سہے پر رکھے تھے۔ کوئی بات کوئی بھاونا اُن دونوں کی بھر آئی تھی۔ پورن نے سر پیچھے ٹکا کر دونوں کی خواب آلود خرخراہٹ کو حواس پر چھانے دیا اور آ رہی ایک جھپکی کو بھی وہ آنے ہی دیتا' اگر بچک کر بکھر رہی مقرر کی آواز لہروں کو سمیٹتی یکا یک اُٹھ نہ کھڑی ہوتی: 'پانی'۔۔۔پورن اور ٹوئیڈ کوٹ میں وہ آدمی ایک ساتھ چونکے' کہ جوں پانی مقرر نے پیانہ ہوا اُس پر پڑ گیا ہوا سے پی کر اُس کی آواز اور بیٹھ گئی:۔۔۔''ڈاؤن' ڈاؤ چڈ' ڈراؤنڈ۔۔۔'' ٹوئیڈ کوٹ بدبدایا اور پھر کتاب میں ڈوب گیا۔ مائیک کے کان میں ایک سرگوشی ہوئی پھر ایک بدبداہٹ: 'اُمید' [رنجک چاٹتی رنجش]'۔۔۔کیا اُمید بھلا' [اُلٹ کر گلے پڑا غصہ جس سے کچھ اونچ نیچ کے بعد آواز کے فلیتے نے آگ پکڑ لی اور دَم تمانچا سی ہو کر کھائی پر برسنے لگی]'' بھلا دلدلی پودوں سے کیا اُمید کہ علم الاخلاق پر میرے اس ناقابلِ فراموش مونوگراف کی خاطر خواہ پذیرائی کریں۔ پھر بھی اُمید کے خلاف اُمید رکھتے ہوئے اسے میں اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتا ہوں کہ تم میں خوابیدہ اُس اِتھکیل رمق کو جگا کر ایکٹی ویٹ کرنے کے مقدور بھر کوشش کروں جس سے تمہاری جڑیں قریب قریب عاری ہو چکی ہیں۔ خواہ اس کے لیے مجھے سکول ماسٹر لی ہی کیوں نہ ہونا پڑے' لیکن نوبت اگر میری بدبختی پر اس آفت کے ٹوٹ پڑنے تک آ ہی گئی ہے تو میں جی۔ ای مُور' مِل' کانٹ شانٹ شر شلک یا ٹک مین وغیر ھم سے سر کیوں کھپاؤں' اتھاہ دانائی کے عُظموں کے کندھوں سے کندھا کیوں نہ بھڑاؤں' وہ عُظمے مجھ ہیچ میدان عجز کے مکان موچنا مشکبوئی کے کندھے سے کندھا نہ بھڑا پائیں۔۔۔یہ بات دوسری ہے۔ میرا کندھا بہر حال اُن کے لیے حاضر ہے۔ تو عزیز پودو کدو! کریلو بینگنو! آ ؤ پہلے سقراط کی خبر لیں۔ ہمارے یہ استاد کہنا چاہیے کہ استاذ الاساتذہ' چھوٹے موٹے ٹھگنے سے گول مٹول بے حد بھلے آدمی تھے' مگر کام کے ذرا چور تھے۔ کاہلی پر ان کی قلم تک بار تھا۔ ایک لفظ عمر بھر میں لکھ کر نہ دیا۔ کیونکر لکھتے۔ آل دا ٹائم ہی ایدر لیزڈ آر لوفڈ اباؤٹ سٹی سٹریٹس اہیڈ آف اے ریگ ٹیگ گروپ آف اِتھینین آئڈلرز' (All the time he either lazed or loafed about city streets ahead of a reg tag crowd of Athenean idlers)' گھر آتے تو بجا طور پر اُن کی بیوی کے پاس اُنھیں سکھانے کے لیے اخلاقیات کے ایک دو سبق ضرور ہوتے۔ مختصر اً یہ کہ سقراط کی اخلاقیات اُس کی ناک کی طرح بھدی اور قد کی طرح کوتاہ تھی اور اگر الکی بائڈیز (Alcibiadese) فیکٹر نظر میں ہو تو اسے اخلاق باختہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ موصوف تھے بیحد چالاک۔ ہوائے شہرت کا اُنھیں ہوکا تھا' جیسے بھی ملے۔ زہر کھا کر ہی خواہ۔۔۔یہ بات اَب پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اُنہوں نے حالات وواقعات کو کچھ اس طرح مینی پولیٹ کیا کہ بات ہیملاک کے پیالے سے اِدھر رُک ہی نہ پائی۔۔۔کیوں؟۔۔۔کیوں کیا اُنہوں نے ایسا؟۔۔۔تا کہ بعد از مرگ ہی کم از کم اُن کے ویز ان اِتھکیل (Ways Unethical) اِتھکس کی کسی ابتدائی کتاب میں جگہ پا سکیں اور ایسا ایک کھڈا۔۔۔سیکیو رائنڈ سینکٹی فائڈ بوساطت افلاطون اُنھیں مل بھی گیا۔۔۔افلاطون جو سقراط کا معذرت خواہ نہیں تو کچھ نہیں اور فلاطونیوں میں سب سے کم فلاطونی ہونے کے باوجود جسے اُس کی فلاطونی زندگی ایک بادشاہ کو فلسفی بنانے ے بی۔ مگر

جب بادشاہ پر کھلا کہ سوائے بیوقوف بننے کے وہ کچھ نہیں بن رہا تو اُس نے فلاطون کو بردہ فروشوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔۔۔سو عزیزو! ہمیں حیرت کیوں ہو۔ حیرت کی بھلا کیا بات اگر فلاطون آج بھی بردہ فرشوں کے چنگل میں ہے۔ اُن کی کچھار میں کچھ اور لوگوں کے ساتھ زنجیروں میں جکڑا پڑا اُس کا کل فلسفۂ اعیان و اخلاقیات بھی ہے جب کہ پیچھے آگ کے بھانبڑ اور آگے دیوار پر ناچتے سائے ہیں۔۔۔اور اب وارد ہوتے ہیں جناب مشائی' دی پیری پے ٹیٹک (The Peripatetic) جن کے لائسیم (Lyceum) میں کوٹ کوٹ کر یہ بات بھیجوں میں بھری جاتی تھی [مقرر ہوائی ہاون میں کچھ کوٹتا ہے] کہ زمین ایک ساکت گیندی ہے جس کے گرداگرد سورج چاند ستارے بولائے پھرتے ہیں۔ سچ ہے بھئی حق ہے کسی معلم اول کو ایسے ہی اونچے وچار رکھنے چاہئیں۔ مگر اس سے کہیں اُونچے بکھان اُنہوں نے اخلاقیات میں بگھارے ہیں۔ ارے میں تو کہتا ہوں کہ آدمی کا دشمن کوئی پاپی جن شتر وتھا وہ۔۔۔جس نے اُس مَن مانے یونانی اصل مقدونی کی اخلاقیات کو ایک تہہ خانے کی فنکس سے چھڑا کر سارے زمانے کو سیلن اور سڑاند سے بھر دیا [مقرر ناک پر رُومال رکھتا ہے اور یک لحظہ توقف کے بعد سلسلہ کلام پکڑتا ہے] جنے یہ کس بزی نے کہا ہے کہ لائک اے کلوسس ہی بیسٹرائیڈز دی سینچریز (Like a colossus he bestrides the centuries) میں کہتا ہوں کہ لائک اے کینی بل ہی بیسٹرائیڈز دی سینچریز (Like a cannibal he bestrides the centuries) جی ہاں وہ ہمارے سب سے قیمتی اثاثے۔۔۔وقت۔۔۔کا ایک بڑا حصہ ڈپھ گیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ کسی نے کیا کہنا ہے اور کہہ بھی کیسے سکتا ہے میں ہی کہتا ہوں کہ۔۔۔ارسطو کا شمار نوعِ انسانی کے عظیم ترین مصائب میں ہوتا ہے۔۔۔''

[وہ پانی کا ایک اور گلاس پیتا ہے اور رُومال کو ہونٹوں سے ذرا ذرا چھواتے ہوئے' حاضرین کی ذہنی سطح پر آنے کے لیے کوشاں' جوں اُس نے اُنھیں قبول کر لیا ہو۔۔۔اُن لوگوں کو۔۔۔جیسا کہ وہ تھے۔۔۔تھوڑے نباتی' کچھ گھاس پھونس سے۔۔۔وہ بولا:] ویل لسرز! کیا میں اب بھی ایک سٹینڈنگ اوویشن کا مستحق نہیں ہوں!؟ یقیناً ہوں اور یقیناً تم بھی دل سے چاہتے ضرور ہو کہ کھڑے ہو کر دیر تک مجھے پر زور تعظیم دو۔ مگر میں جانتا ہوں کہ تم کھڑے ہو گے نہیں۔ کیسے ہو سکتے ہو؟۔۔۔ورطۂ حیرت میں ڈوبے تم تو غور و فکر میں غلطاں ہو کہ جہاں دوسرے ناکام رہے وہاں یہ عاجز کیونکر سرخرو ہوا اور واقعی تم قابلِ داد ہو۔ تمھیں تمہاری اس سوچ پر جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔۔۔لو میں۔۔۔تمھیں۔۔۔تمہاری اس ارفع سوچ پر تعظیم دیتا ہوں۔ [دایاں ہاتھ دل پر رکھ کر وہ ذرا سا جھکتا ہے پھر قریب تیس سیکنڈ تک تالیاں بجاتا ہے] ''مگر عزیزو! اگر جواب نہیں دے سکتے تو کم از کم اس سوال پر غور تو کر سکتے ہو کہ جہاں۔۔۔سقراط' افلاطون اور ارسطو جیسے لوگ بنی نوع انسان کے لیے نظام الاخلاق وضع کرنے میں ناکام رہے وہاں پروفیسر موچنا مشکبوئی کیونکر کامیاب ہوا اور لکھو! پتھروں پہ لکھ لو یہ بات کہ آئندہ ملینیا (Millenia) میں۔۔۔ایتھکس انتھروپولوجی اور دوسری تمام سوشل سائنسز کا اہم ترین قضیۂ بحث ہی یہ ہوگا کہ کون سے امور موچنا مشکبوئی کو دوسرے مشاہیر سے ممتاز و ممیز کرتے ہیں۔۔۔تو سنو! او نکمو کسی نہ کام جوگو سنو! اور نازاں ہو اپنے بخت پر۔۔۔بخدا مجھے رشک آتا ہے تم پر کہ آج یہاں تم سے' جی ہاں تم سے یہ عظیم موچنا مخاطب ہے' کیوں کہ دراصل یہ میں نہیں' آنے والا وقت تم سے مخاطب ہے۔۔۔صدیاں بول رہی ہیں اور ایک کے بعد ایک اپنا پردہ کھولتی ہوئی تمہارے سامنے عریاں ہو رہی ہیں۔۔۔تو سنو او نکمو سنو! کیوں وہ پچھلے نامراد اور یہ اگلا بامراد ہے۔۔۔اس لیے کہ انہوں نے گراؤنڈری ایلے ٹیز کو پیش نظر نہیں رکھا' بر سرِ زمین حقائق سے روگردانی کی۔ تو سو۔۔۔ملیو (Milieu) اور ماحول سے جدا مورز (Mores) کی بھلا کیا حقیقت! اور بر سرِ زمین حقائق کی تہہ میں اُترنے کے لیے ذرا گھما کر اپنے اس گولے زمین کو دیکھنا ہوگا۔۔۔تو عزیزو! یہ گولا کیا ہے!؟ (مقرر کی آواز اُٹھتی ہے) کیا ہے یہ کرہ؟ یہ زمین!؟ (بیٹھتی' اُٹھتی ہے) ایک عظیم بیت الخلاء کے سوا اور کیا؟ برسوں تدبرن یمیرے تجر میں طوفان اُٹھائے رکھا۔ ریاضت سے میرے روز و شب گداز رہے اور سوز و سازِ شبانہ میں اکثر آبِ القا مجھ پر ٹپکنے لگتا۔ میری آلائشِ وجود ڈھل جاتی اور میں ایسا نظیف و لطیف ہو جاتا کہ میرے پر نکل آتے۔ میں آفاق میں اُڑا پھرتا اور میری فکر رسا فوق الافلاک کا در کھٹکھٹا آتی۔ ایسا ہی ایک سبلائم لمحہ تھا جب مجھے روشنی ملی تھی۔ ہوا یوں کہ اس شب بھی وہی الٹی میٹ سوال مجھے دق کرنے لگا کہ زندگی کیا ہے!؟۔۔۔تو میرے اندر روشنی کا جھپاکا ہوا۔۔۔میں نے جواب پا لیا تھا۔۔۔کہ زندگی کیا ہے!؟ شِٹ' گوہ۔۔۔اور زمین!؟۔۔۔گوہ گاہ بیت الخلاء۔۔۔حاضرین ذرا سوچئے کہ انسان کو یہیں۔۔۔اس زمین پر ہی کیوں۔۔۔اُتارا گیا۔۔۔سیدھا سادھا جواب ہے کہ رفع حاجت کے لیے کہ اس کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ کیا ہوگی۔۔۔یہاں پانی ہے' مٹی ہے' خود یہ ایک عظیم ڈھیلا ہے۔ ضرورت پوری کرنے کے بعد انسان حاجت روا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے جس نے انھیں ایسی دلکشی بیت الخلاء عطا کی تھی۔ سجدے سے سر اُٹھا کر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو دنگ اور گنگ رہ

گئے مگر فوراً ہی ان کی زبانیں گُنگ سے نکل کر گائن پر آ گئیں۔ ہر طرف نغمے گونج اُٹھے‘ دنیا گیتوں سے بھر گئی۔ حاضرین اب یہ تحقیق سے ثابت ہے کہ انسان کی وہ پہلے پہل کی شاعری‘ وہ سریلے گیت‘ اس حسین بیت الخلاء کی ستائش ہی میں تھے اور گو اس شاعری کا بیشتر حصہ اس کے انفرادی حافظہ سے محو ہو چکا ہے مگر اجتماعی حافظے میں آج بھی موجود ہے۔ تسلی بخش فراغت کے بعد وہ تمام قدیم (Latrinol) آرکی ٹائپ اس کے لاشعور سے شعور میں آنے لگتے ہیں۔ تو حضرات یہاں آ کر انسان رج کھا کے پادہگا کیا۔ آج وہ گلٹنی باؤٹس (Gluttony Bouts) منعقد کرتا ہے۔ دکھا دکھا کھا تا سنا سنا پادتا اور تے کرتا ہے۔ شرط بدتا ہے کہ کسی کا پاد کتنے دُور تک سنائی دیتا ہے۔ آپ کا یہ عاجز پروفیسر آج تک یہ شرط نہیں ہارا۔ مگر دوستو کوئی کتنے ہی زور و شور سے پادے‘ توپ ہی کیوں نہ چلالے‘ تسلی بخش اجابت ہر کسی کے نصیب میں کہاں؟ اور یہیں سے ہماری اخلاقیات کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ ڈیموگرافی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے‘ یہیں سے اوّل اوّل انسانی سماج کی درجہ بندی ہوئی اور طبقات وجود میں آئے۔ طبقہ اولیٰ یعنی اپر کلاسز‘ اجابت با فراغت کا اطمینان جن کے بشرے پر کھیل رہا ہوتا ہے‘ جو زندگی کی کلیل کدکڑے لگاتے‘ کلکاریاں مارتے گزار دیتے ہیں اور طبقہ زیریں‘ جو ہزار کلنے کراہنے کے باوجود تسلی بخش اجابت سے محروم رہتے ہیں۔ ہمہ وقت اُن کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور چہرے پر مُردنی چھائی رہتی ہے۔ یہی ہیں ہمارے محروم و محتاج اور مسکین طبقات‘ دی گریٹ ڈیپرائیوڈ‘ دی گریٹ ڈینائیڈ‘ دی انڈر پریوے لیجڈ۔۔۔ اب یہ طے کرنا چنداں مشکل نہیں کہ ہم کس کا ساتھ دیں۔ بلاشبہ بے تامل و تردد ہمیں پسے ہوئے پسماندہ طبقات ہی کا ساتھ دینا چاہیے۔ تمام قدیم صحائف افتادگان کی مدد کی تلقین کرتے ہیں اور اُن کو جو زمین پر دوسرے کے کام آتے ہیں آسمانی بادشاہت کی بشارت دیتے ہیں‘ سو دوستو! ہمیں چاہیے کہ ہر روز سونے سے پیشتر خود سے سوال کریں کہ آس پاس‘ اڑوس پڑوس‘ کہیں کوئی ایسا تو نہیں جو بار بار کھڈی جاتا ہو اور آسودہ نہ ہو سکتا ہو۔ لوگو! جان لو روزِ محشر تم سے سوال کیا جائے گا۔ اس سے کیا ثابت ہوا۔ ثابت اس سے یہ ہوا کہ یہ ہمارا اخلاقی سماجی سوشل سائنسی‘ علم الانسانی‘ ملی و دینی وغیرہ فریضہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں کم از کم از ایک بار کسی ساتھی انسان‘ عورت یا مرد۔۔۔ اور مقدور ہو تو۔۔۔ مُلک یا قوم۔۔۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا بات۔۔۔ تالیاں۔‘‘ [سوئی ہوئی ایک تالی بجتی ہے‘ ایک نئے مکھوئے میں کلاؤن کوڑا بجاتا ہے‘ تمبا کو خور جاگ اُٹھتا ہے۔ کوڑے کا رن نہیں خرگوش کا رن جس نے اُس پر موت دیا ہے۔] پورن دیکھے گا کہ تمبا کو خور نے اونگھتے خرگوش کو ذرا اوپر اُٹھا کر پہلے اُس کی پچھلی ٹانگوں میں جھانکا۔ پھر وہ اپنے پانجامے کو دیکھتا ہے اور خوشی سیمنٹ جیسے تمام دانت۔۔۔ وہ جتنے بھی تھے۔۔۔ نکال کر ہنس دیتا ہے ’’ششی کرتا ہے وشی کرتا ہے۔۔۔‘‘ خرگوش کا گال نوچتے ہوئے وہ بار بار کہتا ہے۔ پھر پورن سے پوچھتا ہے کہ سٹیج پر کا وہ اُول جلول کیا اُول پٹال بولے جاتا ہے۔ پنڈ چھڑانے کو پورن اُسے یہ بات ٹویڈ کوٹ سے پوچھنے پر اُکساتا ہے جو کہ بات ہے کہ کتاب میں مشکل باتوں کا مطلب ہی ڈھونڈ رہا ہے۔ تمبا کو خور سر ہلاتا ہے اور پوچھتا ہے: کیوں بھئی کوٹ والے! چبوترے پر یہ بندہ کیا پڑھے پڑھائے ہے۔۔۔ ٹویڈ کوٹ سُن اَن سُنا ہے مگر تمبا کو خور کے اصرار کی بھڑ بھی ایسی مُصر ہے کہ آخر اُس کے کوٹ میں گھس اُسے کاٹ لیتی ہے۔ وہ کراہتا ہے: ناداں۔۔۔ مگر یہ جواب تمبا کو خور ہی کے لیے نہیں پورن کے لیے بھی نا قابلِ فہم ہے۔ اب وہ ہمت کرتا ہے اور اُس لفظ کا مطلب پوچھتا ہے۔ جواب آتا ہے: کچھ نہیں۔۔۔ تمبا کو خور پہلے ہی خراٹوں کو لوٹ چکا تھا۔ پورن کو رشک ہوتا ہے۔ کاش اُسے بھی ایسی ہی ٹوٹ کر نیند آئے‘ جو اُس کا ہاتھ پکڑ کر ایسی ڈبکی لگائے کہ وہ مرے بنا موت کو چھو آئے۔ خواب سے عاری نیند اور جو خواب ہو بھی تو اُس میں تطہیر کے ملک کی حد پر رکھا ایک کھلا ہو جو اُسے اُس سے ورے کی حدود میں لے جائے‘ مگر یہ کیسی تعزیر تھی کہ وہ اونگھاہٹ میں بھی مقرر کی تقریر کا ایک ایک لفظ سن سکتا تھا۔ کس گناہ کی حد کس پاپ کی ڈنڈ کہ اُس کی سماعت پر سے تمام اوزان اُٹھ گئے تھے اور یہ ایسی شفاف ہو گئی تھی کہ سننے کے ساتھ لفظ دیکھ بھی سکتی تھی۔۔۔ کسی نا گزر کلیریون (Clarion) میں سے نکل کر آئی ایسی جگر ناٹ (Juggernaut) پکار جس کا ہدف رُوح تھی یا خود زندگی اور کلیریون کے پیچھے کھڑا مقرر اخلاقیات پر ٹریپیز (Trapeze) کرتے کرتے انسانیت کے اجتماعی شٹ میں گر گیا تھا اور اب اس میں سے نکلنے کو ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔۔۔ وہ۔۔۔ پورن۔۔۔ کبھی اس سرکس سے نکل پائے گا!

اُس نے ڈھارس کے لیے کم اچھے شگن کے لیے زیادہ تمبا کو خور کی گود میں گھوک سوئے خرگوش کو چھوا اور سامنے نظر کی اور اُس کی ڈھارس واقعی بندھی کہ وہ مقرر اپنی بات سمیٹتے ہوئے اب اخلاقیاتِ عملی اور اطلاقی پر آ چکا تھا اور مثالوں سے بات سمجھا رہا تھا:

’’کبھی سوچا ہے سامعین کرام! آپ نے کبھی سوچا ہے کہ کیوں آپ قعرِ مذلت میں پڑے ہیں۔ پستیوں کے پاتال میں آپ نے جو شینی

ٹاؤن بسا لیے ہیں' اور ٹاٹ بورے گھاس پھونس نرسلوں کی۔۔۔اور پیپے کھول کر کھڑی کی گئی۔۔۔سلمز جو آپ کا مقدر ہیں۔۔۔تو کیوں؟۔۔۔ذرا کھوپڑی کو ٹھوکیے اور اسے بجا کر دماغ سے پوچھیے اپنی ذلت اپنی ریجیڈنس کا سبب مگر افسوس صد افسوس تنگی نچوڑے گی کیا نہائے گی کیا۔آپ بیچاروں کا تو دماغ ہی نہیں' آپ ٹھونکیں گے کیا اور بجائیں گے کیا! سو یہ خاکسار فقیر موچنا مشکبوئی ہی اپنے گرے میٹر (Grey Matter) کو زحمت دیتا ہے اور آپ پر کھولتا ہے آپ ہی کی دگرگونی کا سبب اور کیا کہتا ہے میرا یہ دماغ!۔۔۔واہ کیا کہنے میرے اس دماغ کے جو میرے گزر جانے کے بعد بھی سوچ بچار جاری رکھے گا اور پھر کسی محلول میں محفوظ صدیوں تحقیق کا موضوع رہے گا۔۔۔تو یہ کہتا ہے کہ آپ پر چھائے ابرادبار کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ نے اسلاف کے نقش قدم پر چلنا چھوڑ دیا ہے۔چاہیے تو یہ تھا کہ جہاں جہاں آپ کو یہ نقوش ملتے' آپ احتیاط سے انھیں اُٹھاتے' آدے میں پکاتے اور ٹھیک اُن کی پہلی جگہ لا رکھتے اور پھر سر موانحراف کے بغیر ان پر پاؤں اور پاپوش رکھتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے۔تب منزلیں آپ کے قدم چوم لیتیں' زمین چھوٹی پڑ جاتی اور آپ آسمان پر اُٹھ جاتے لیکن آپ نے کیا کیا؟ کیا کیا آپ نے۔آدے میں پکا کر پختہ کرنا تو درکنار آپ نے تو سلفی نقوشِ پا کو موسموں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔افسوس ہوائیں اُنھیں لے اُڑیں۔افسوس پانی اُنھیں بہا لے گئے۔اب کہاں ہے؟ کہیں ہے کسی سلف کے قدم کا نشان کہ بندہ اُس پر پاؤں یا پاپوش رکھ کر دو قدم بھی چل سکے! بَٹ لیٹس ناٹ ڈسپیئر۔مایوس نہ ہوں آپ میرے اُس دوست کی طرح جس نے کسی معیاری نقشِ پا کی دستیابی سے مایوس ہو کر چلنا پھرنا ہی چھوڑ دیا' بلکہ آیئے ہم اُمید رکھیں َ نہ ہماری قومی ٹاسک فورس برائے بازیابی سلفی نقوش' محکمہ آثار قدیمہ اور منسٹری آف تھری ڈیز ایف اینڈ ایس کے عملی تعاون سے بہت جلد مثالی نقوشِ پا ڈھونڈ نکالے گی اور ہم اُن پر اپنے پاؤں یا جوتیاں رکھ کر چلتے ہوئے ایسا عروج پالیں گے کہ انجم یقیناً سہم جائیں گے۔تب تک مگر کیا آپ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہیں۔ارے پاؤں توڑ کر بیٹھیں آپ کے دشمن۔آپ کیوں [مقرر کھنکار کر گلا صاف کرتا ہے اور پانی کا ایک گھونٹ بھر کے لہجے میں تقریریت اور باہمی بات چیت کا ملا جلا انداز لے آتا ہے] یوں کرتے ہیں کہ اس درمیانی مدت کے لیے میں آپ کو اپنے دادا ابا دیے دیتا ہوں نقوشِ پا سمیت۔بھئی آپ نے تو پیروی ہی کرنی ہے نا تو آپ اُن کی پیروی کریں۔یہ درست ہے کہ ان کی ہمسری ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی آپ میں سے کوئی اُن کے درجات کی گرد کو بھی چھو سکتا ہے' پھر بھی اگر آپ اُن کے حجرے میں رکھی پاپوشِ پر دیں رشک کو آنکھوں سے لگائیں اور اُس سے چمٹی خاک کو حرزِ جاں بنائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اُن کے فضائل ومناقب میں ایسی تجلیاں ہیں جو بجلیوں کو بجھا دیں مگر آپ عامیوں کی تاریک زندگی میں یقیناً اُجالے بکھیر دیں۔اُن کی عظمت کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ ابھی اُن کا نام نامی میری زبان پر آیا بھی نہیں اور میرا نطق میری زبان کے بوسے بھی لینے لگا ہے۔تو جناب موضع کالی دھوتی چٹے پٹ۔۔۔ہے نا عجیب نام۔۔۔مگر یہ حقیقت ہے کہ آج بھی جب ہمارے اس موضع کی گجریاں سروں پر دلتوہوں کی اونچی قطار اُٹھائے ہوئے دودھ بیچنے نکلتی ہیں تو ہوا دیوانی ہو اُٹھتی ہے اور طرح طرح سے اُن کی دھوتیوں سے کھل کھیلتی ہے اور گاؤں کے کھیت ابھی بمشکل ختم ہوئے ہوتے ہیں کہ اُن کا دودھ بک بھی چکا ہوتا ہے۔تو بھائیو میرے نامدار دادا ابا اسی نامور موضع کالی دھوتی چٹے پَٹ ضلع لمبی مٹھ کے اوّل شہری تھے۔آپ انھیں اخلاقی انسان کہہ سکتے ہیں۔وہ شب زندہ دار سحر خیز جب گھر سے نکلتے تو گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک لہر سی دوڑ جاتی۔بے جان اور ادنیٰ جاندار سب سے پہلے اُن کی موجودگی کو محسوس کرتے' چیونٹیوں کی قطار ٹوٹ جاتی' ساوے پتے پیلے پڑ جاتے اور پیلے بھورے ہو کر جھڑ جاتے یا اگر جھڑ نہ پاتے تو بَل کھا کر لپٹ جاتے' کلیاں مُند کر اپنی خوشبو روک لیتیں' کنوؤں اور تالابوں کی سطح ادب سے گر جاتی۔کچے ہوئے پھل کچھ اور پک کر ٹپکنے اور سانس اور سگند چھوڑنے لگتے اور تو اور پے کے گھونسلے تک گر پڑتے۔ہر چیز کا انھیں کورنش بجا لانے کا اپنا طریقہ تھا۔پرندے یہ کرتے کہ اپنے اُس مشفق اور مربی کو دیکھتے ہی خوشی کی چہکار مارتے اور بیٹ کر دیتے۔کھیتوں میں پھرنے کے لیے جاتے لوگ اُنھی قدموں آگا پیچھا کھول کر بیٹھ جاتے۔ہلوں میں جُتے بَیل رُک جاتے اور دھار اور پھوس چھوڑ دیتے' ہالی اپنے تہبندوں کو پیچھے سے اُٹھتا محسوس کرتے۔ اب اور کیا عرض کروں' تعلیم اور تطہیر تو آپ کی ہو ہی گئی ہے' ویسے بھی دادا ابا کی یاد سے میرا گلا رُندھنے لگا ہے۔تو جناب بڑی بات کو چھوٹا کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ بزرگوارم کی آمد کو محسوس کرتے ہی ایک ہمارے گاؤں ہی کی کیا دُور دراڈے دیہوں تک کی بائنی بیالوجی ایکالوجی میں صحتمند تبدیلیاں رونما ہونے لگتیں۔آگ مٹی پانی ہوا کو حقنہ ہونے لگتا۔اصل ہاتھ آوازوں کے ساتھ ہوتا کہ ابھی صبح کی خاموشی میں ہوا کھیتوں کی طرف سے تیز تیز چلتی درانتیوں کی آواز لا رہی ہے جس میں طوطے چڑیاں تیتر اور کوئلیں اپنی آواز ملا رہی ہیں' کسی چھت پر اُگتے ہوئے سورج کی طرف دو زانو بیٹھے

سُر منڈل پر سبج سبج ہاتھ پھیرتے اُستاد بلکن خاں صبح کا کوئی راگ چھیڑ رہے ہیں۔ اُن کے سُر میں سُر ملانے کچھ پرندے بھی منڈیروں پر اُتر آئے ہیں۔ چکّی پیہم چل رہی ہے۔ چرخے کی گھوکر پر پانی کی سرسراہٹ اور فصلوں کی لہلہاہٹ اور لیپ ہو رہی ہے۔ رہٹ میں جُتے بیل کے گلے بندھی گھنٹیوں کے ساتھ بیل کو مسلسل کوستی نخ نخ۔۔۔ ’اوتوں مَر جائیں‘۔۔۔ سُنائی دیتی ہے۔ صاحبان! تطہیر سے جو فہم و دانش آپ کو حاصل ہوئی ہے اُس کے چشم و گوش کو ذرا کھولئے اور تصور کیجئے کہ آوازوں کی ایسی منڈی لگی ہو اور اچانک یہ آوازیں آگے لگ بھاگ جائیں اور کہیں دُبک کر اپنا گلا گھونٹ لیں اور پھر گھڑی بھر کی خامشی کے بعد انسانی اجابت کی سناؤنی دیتی آوازیں ڈبل پر بانگتی دادا کو سلامی دینے آجائیں۔۔۔ میں ہمیشہ حیران ہوا کہ ایک انسان کو کیونکر دوسرے انسانوں کی چھوٹی بڑی آنت‘ معدے‘ مقعد‘ گویا تمام میٹابولزم (Metabolism) پر ایسی قدرت حاصل ہو سکتی ہے۔ میری حیرت کا کچھ اندازہ آپ کو ہر روز بوؤں کی بنتی دُرگت سے بھی ہو سکتا ہے کہ دادا حضور کے دودھیا سفید صافے کُرتے‘ تہمند‘ گرگابی کے بچے چمڑے اور ساگوانی چھڑی کی سگند پاتے ہی وہ سب کی سب دم دبا دبک جاتیں۔ پر آپ سب ہوا کو تو جانتے ہی ہیں کہ ہوا‘ خوری پر نکلی ہوئی یہ ایسی شوقین سوانی ہے کہ عطر پھلیل بنا گھڑی بھر اس کا گزارہ نہیں۔ سو اُدھر وہ بوئیں اپنے اپنے بیل بوٹوں‘ آم جامن اور امرود وغیرہ کے باغوں‘ خربوزے وغیرہ کے کھیتوں اور نہر کے کنارے لہلہاتے سفیدے کے درختوں میں اِدھر اُدھر آجا رہی ہوتیں‘ اِدھر یہ شوقن مٹی مُوت گوہ گوز اور گوبر کے عطر سے معطر ہو جاتی۔ دادا با کے گرد گھمن گھیری سی لے کر مجرئی ہو وہ دُعا کی طلب گار ہوتی اور چٹپٹے کرارے ذائقوں سے لدی پھندی سارے گاؤں میں گھوم جاتی۔ دادا اس میں ایک لمبا گہرا سانس لیتے اور پھر آہستہ آہستہ اسے باہر چھوڑنے لگتے۔۔۔ اب وہ ٹھیک ٹھیک بتا سکتے تھے کہ گزشتہ شب کس گھر میں کیا‘ کیوں یا نہیں پکا‘ یا کیا وہی پکا جو پکنا چاہیے تھا۔ اب سوچتا ہوں تو بات سمجھ آنے لگتی ہے کہ آوازوں اور بوؤں پر اُن حضرت کا تصرف دراصل اس اچھے گڈریے کی گلہ بانی‘ جہانبانی اور آج کے محاورے میں کہا جائے تو گڈ بلکہ ویری گڈ گورننس کا ایک نفیس انداز تھا۔ کبھی انہوں نے کسی بھیڑ کی ٹانگ نہ توڑی نہ ٹینٹوا دبایا۔ پھول کی چھڑی تک سے نہیں چھوا اُس نفیس انسان نے کبھی کسی کو‘ پھر بھی میں نے دیکھا ہے کہ ان کی نظر پڑتے ہی اُن کے سامنے آیا انسان‘ مرد عورت یا بچہ معدے سے اُتر کر ایڑیوں پر آجاتا۔۔۔ اور حاضرین آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ یہی وہ مقام معطور ہے جہاں سے آپ کے اس عاجز موچنا کو اپنے نامِ نامی اسمِ گرامی کا بہتر حصہ ارزانی ہوا۔

آخری لفظ ابھی مقرر کے منہ میں تھا کہ اسٹیج پر روشنیاں مدھم ہو گئیں۔ پورن نے دیکھا کہ عقبی راستے پر متعین گارڈ اپنی آر جار میں ٹھٹک گیا۔ پھر نپے تلے قدموں سے آکر اُس نے مائیک سٹینڈ اُٹھایا اور اس کا قد کچھ گھٹا کر سٹیج کنارے سے ذرا پیچھے رکھ دیا اور جب وہ انہی قدموں سے چلتا آڈیئنس سے دُور ہو رہا تھا‘ موسیقی کی ایک لہر لائیو وائر پر سلگتی دھیرے دھیرے قریب آ رہی تھی۔۔۔ ایک زوردار دھما کہ‘ سٹیج پھر بقعۂ نور۔

پروفیسر کے دکھائی نہ دینے سے آڈیئنس میں جان سی پڑ گئی۔ کچھ تو اپنی بچیاں بیگ سنبھالتے اُٹھ بھی کھڑے ہوئے‘ مگر مسخرے کے کوڑے نے اُن کی اس آدھی اُٹھان کو تُرت چھانٹ دیا۔ تمبا کو خور بھی سہما ایک سے دوسرے ہاتھ سنبھالتا بیٹھ جاتا ہے اور بھورا تمبا کو کے لیے اِدھر اُدھر جھانکتا ہے۔ گیلی جیب پر ہاتھ پڑتا ہے۔ سب یاد آنے پر بسورتا ہوا مسکراتا ہے اور سب کو چٹکی بھرتا ہے پھر اس چٹکی سے سیل چڑھا تمبا کو ہتھیلی پر جمع کرنے لگتا ہے اور ہر چٹکی کے ساتھ سب سے لگاوٹ کی کوئی بات۔۔۔ جسے وہ سمجھتا ہے یا سہما۔۔۔ بھی کیے جاتا ہے۔ جیب سے چٹکی خالی آنے پر وہ تمبا کو ہتھیلیوں کے بیچ مسلتا ہے۔ پھر جو ہاتھ کھول کر اُس نے سونے کے برادے کی اُس چھوٹی سی ڈھیری کے سپن کو دیکھا تو اُس کی چندھی آنکھوں میں پانی بھر آیا اور رال ٹپکنے کو ہوئی اور جب وہ ہتھیلی ناک کے قریب لا کر ڈھیری کی مہک لیتا تھا تو یہ رال اس پر آ پڑی۔ پھر جو‘ پتہ نہیں کہاں کہاں سے آئے کس کس برانڈ کی الگ الگ بھی اور آمیزہ بھی‘ سب کی بھگ میں رلی ملی مہک‘ ڈھیری سے اُٹھ ناک کو چڑھی ہے تو تمبا کو خور کی سرشاری بتانے کی نہیں دیکھنے کی چیز تھی۔ مگر اس تمول میں بھی جب سونے کی اس ڈھیری میں کیف بھرا مستقبل‘ محفوظ و مامون‘ اُس کی مٹھی میں تھا۔۔۔ پورن کو نہیں بھولا وہ تمبا کو خور۔۔۔ ’’لو گے!‘‘۔۔۔ خالی ہاتھ سے رال پونچھتے اور بھرا پُرا ہاتھ پورن کو پیش کرتے ہوئے اُس نے بس حاصل ہونے کو ہی سرور کے خیال سے مُندی جاتی آنکھوں کے اشارے سے پوچھا۔۔۔ مگر پورن کا سسٹم تمبا کو قبول نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی اُسے یہ فیاضانہ آفر ٹھکراتے ہوئے افسوس ہوا۔ ٹوئیڈ کوٹ میں آدمی نے دونوں کو بیزاری سے دیکھا۔ جبکہ موسیقی ایکسپلوڈ کر چکی تھی اور اب شاید امپلوڈ ہونے کو تھی اور اُس کے ہاتھ میں وٹگنسٹائن‘ ممکنہ طور پر انسانی فکری کاوش کا حتمی میکنزم او پس تھا۔۔۔ تو یہ یہ دونوں۔۔۔ ایک مجہول جس کے منہ پر بھوکی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور دوسرا انسانی تلچھٹ

سے بناوہ لمپن لاؤٹ جس سے اُن بیکار جگہوں کے بھبکے اُٹھ رہے تھے جو زمین سے ٹوٹ کر کسی اور سیارے سے جا ملنا چاہتی ہیں ۔۔۔ ہاں یہ دونوں کیونکہ' تمباکو کی ایک بدبودار ڈھیری میں بے پروایانہ دلچسپی کی حد تک بریشم قلندر بانکے فضول اور فرولس (Frivolous) ہو سکتے تھے ۔۔۔ وہ ٹوئیڈ کوٹ میں وہ آدمی ہمت شکن تھا اور اس کی تیور خشم آلود۔ سوتمبا کو خور کیا کرتا' اگر اُس پُر کیف متاع کا خود ہی مہمان میزبان نہ ہوتا تو کیا کرتا۔

جلد ہی اُس کے اندر سے ایک ترنگ اُٹھ کر سُروں کی اُس اونچی چھل میں جا ملی جو تھوڑی دیر تو اپنی سرگمی حد میں بس گھولتی رہی پھر خالی دیتی ہوئی ایک شدید تن تن تا دھا دھن دھن سے گزر کر دھا پر ضرب دیتی آڈینس پر آ پڑی۔ اچھا کان رکھتا تھا' وہ تمبا کو خور۔ سر کی مناسب جنبش سے اُس نے سم کو صاد کیا تھا۔ اُس کی کسل کم ہوگئی تھی۔ آنکھوں کی چندمند جاتے رہنے سے پوری جگار کی ایک لو اُن میں سے باہر لپکنے لگی تھی۔ اب بلا شرکت غیرے راج پاٹ اپنا تھا کہ اُس کے منہ میں چبینا تھا من پسند جس کا رسیلا بلس فُل پانی آہستہ آہستہ حلقوم سے اُتر تا اُس کے اندر کی فرطِ نمک سے بانجھی زمینوں میں حدِ نگاہ تک دھان کپاس اور گیہوں کے رقبہ جات اُگاتے ہوئے پھر تختہ در تختہ گل زار بچھا رہا تھا۔ کسی قطعہ گُل نے اُسے اشارہ بھی کیا تھا اور شاید وہ اُس اشارے کے پیچھے پیچھے باطن کی کسی روش پر چل بھی نکلتا' ذرا ایک اپنی ہی سَیر دیکھنے کے لیے ۔۔۔ اگر دایاں بائیں سے رُوٹھ نہ جاتا تو ۔۔۔

اُس کے اوپری ہونٹ نے تڑپ کر نہ آئے سم کو یاد کیا مگر اُدھر تو ٹھاٹھ باج ہی اور ہو گئے تھے سم کیا آتا۔ ناگواری سے اُس نے نچلا ہونٹ سکوڑا تو سنہرا پانی اُس کی باچھوں پر آب دینے لگا اور تمبا کو کے بھورے دھاگے باہر آنے لگے۔ منہ میں جمع شدہ آدھے رس کو اُس نے نگل لیا اور آدھے کا منہ ہی منہ میں مزہ لینے لگا۔

موسیقی اب پورے طور پر رنگ بدل چکی تھی۔ بائیں کندھوں پر وائلن جمائے ناچتے گاتے کچھ لوگ ایک پچھلی بغل سے نکل کر سٹیج پر آ چکے تھے۔ سب کے سب ایک قد کاٹھ کے اور سب سیاہ ٹیل کوٹ میں تھے۔ سروں پر بھی سب کے ایک سے باؤلر ہیٹ تھے۔ جوں تن تن تا دھا سے انتقام لے رہے ہوں وہ وائلنوں پر ٹی ۔ ٹم ٹم ۔ ٹی ٹی ۔ ٹی سکریچ رہے تھے۔

کچھ دیر اسی طرح وائلنوں پر موسیقی پیٹتے ہوئے وہ فُٹ لائینس سے خوب روشن مدوّر بناوٹ کے گرد چکر لگاتے رہے۔ پھر کوئی اس بناوٹ کے نصف گرد سیاہ چرمی اونچی پشت کرسیاں رکھ گیا اور پانچ کی ایک سیاہ ٹیل کوٹ ٹکڑی اپنے اپنے وائلن نیچے رکھ کر ان کرسیوں پر جا جمی۔ کھیل شروع ہو چکا تھا۔

اطمینان کی ایک سانس لے کر پورن پیروں سے جھولا اُٹھانے کو جھکا تو سہا بھی نیچے کود آیا۔ اُسے پلوسنے کو اُس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ جلدی سے کچھ منہ میں دبا کر یہ پھر سوئے سوئے تمبا کو خور کی گودی جا چڑھا۔ ایک وائلن نواز دودھیا دائروی بناوٹ کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ بایاں ہاتھ پہلو کے ساتھ ساکت' آڈینس میں گھورتے ہوئے اُس نے دایاں باہر نکال دیا۔ کسی نے پیچھے سے آ کر اس پر ماسک نُما کچھ رکھ دیا۔ کھینچ کھانچ کر اُس نے یہ سر منڈھ تو لیا مگر کچھ ٹھیک سے نہیں۔ ہونٹ زیادہ باہر نکل آئے تھے' اتنے ۔۔۔ کہ جب وہ مائیک میں بولا ۔۔۔ بوم ۔۔۔ تو وہ مائیک کے گرد لپٹ گئے۔ آڈینس میں سے کوئی لڑکا بالا ہنسا تو کوڑا بجا ۔۔۔ ہونٹ مائیک سے چھڑا کر اور تھوڑا پیچھے ہٹ کر ٹیل کوٹ پھر بولا ۔۔۔ بَم ۔۔۔ ہونٹ پھر مائیک پر لپٹنے کو ہوئے تو کچھ اور پیچھے ہٹ کر اُس نے آزمائشی طور پر ہونٹ باہر نکالے ۔۔۔ یہ ٹھیک ہے۔

اطمینان بھری وحشت میں ایڑیوں پر گھوم کر سٹیج کے چوبی فرش کو کھٹاک کھٹاک بجاتے ہوئے وہ دفعتاً رُکا اور مائیک میں بولا: باربی کیو ۔۔۔ پھر مدوّر دودھیا بناوٹ کے گرد گھومتے وائلنوں کی ایک بلند چیخ کے ساتھ اُس نے ٹیپ ڈانس آغاز کیا۔ کبھی وہ جھوم جھوم کہتا: بوم بم ۔ بم بوم ۔ باربی کیو' اور کبھی وائلنوں سے جُنگل بند ہوتا: بوم ٹم ۔ ٹم ۔۔۔ ٹی باربی۔

جُنگل بند سے نکل کر وائلن دھیرے دھیرے مدھم ہوتے گئے اور جب ٹیپ ڈانسنگ گائیک نے خود کو وحشت کے سپرد کیا ہے تو وہ ساعت کے عقب میں جا چکے تھے:

بم بم
باربی کیو باربی کیو باربی کیوو ۔۔۔
بم بم باربی کیو

باربی کیو باربی کیو باربی کیو۔۔۔
اون دالش گرین ریگل لانز آ باربی کیو
باربی کیو باربی کیو باربی کیو۔۔۔
فاریو۔ فاریو۔ فاریو۔ فاریو۔

یہاں وائل پھر بول پڑے اور گانے والے کے تواتر سے اوپر نیچے ہوتے ڈھیلے ڈھالے ہاتھ کی پہلی اُنگلی کے ساتھ ساتھ۔۔۔اُسے۔۔۔ فاریو فاریو۔۔۔ کہنے لگے جو دودھا بناوٹ کے پیچھے پہلی اونچی پشت کرسی پر بیٹھا اب پھولے نہ سمارہا تھا۔ کیوں سماتا۔۔۔لش گرین ریگل لانز پر مدعو ہونا نصیب کی بات تھی۔ بس چلتا تو وہ اس نیک شگن انگشت کو توڑ کر جیب میں رکھ لیتا اور اپنے اس ساتھی کو چوم چوم کر مار ہی ڈالتا جو ایک ہاتھ گھٹنے پر ٹیکے' دوسرے کی پہلی انگلی کی اُوپر نیچے کی حرکت سے اسے لش گرین ریگل لانز پر مدعو کر رہا تھا۔

''فار'' مائیک چیخا اور چیخنے والا اپنی جگہ بُت بن گیا۔ ساز سازندے سامعین سٹیچو ہو گئے۔۔۔وہ لمحہ گزرنے پر بت جھرجھرایا' جاگا اور جھوم جھوم پھر گانے لگا:

فاریو آرائے جولی گڈ باسٹرڈ
یو آرائے جولی گڈ باسٹرڈ
یو آرائے۔۔۔

یہ سُن کر لانبی ہڈیالی انگلی کی نیک شگن حرکت کا ہدف پہلی اونچی پشت نشست پر بیٹھا وہ آدمی ایسی شکلیں بنانے لگا جوں شادی مرگ ہوا کہ ہوا۔

کھیل مزے کا تھا۔۔۔نٹ کھٹ نقال' وہ کھیل کار حرافہ' خوشی کی موت' اپنی بہن۔۔۔مرگِ محض۔۔۔سے کتنی الگ' کتنی دلچسپ تھی! ایک سے ایک جدا!! انوکھا سوانگ! زیادہ متعجب پورن اس بات پر تھا کہ شادی مرگ کا ہر بھیس بھاؤ باربی کیو گیت کی سرگمی حد کے اندر تھا۔۔۔سُر سے سوانگ' سوانگ سے سُر ملا ہوا۔ بھلے ہی یہ کھیل باسٹرڈی کھیل رہی ہو مجھے کیا!۔۔۔کھیل دلچسپ ہے اور ویل اور کسٹریٹڈ (Well-Orchestrated)!۔۔۔ اچھا تو یہ ہوتا کہ میں خرگوش ہوتا' کسی گود۔۔۔لازم نہیں کہ اماں یا رُکمنی کی ہی۔۔۔کسی بھی گھاس پھونس یا چُرمُر پتیوں ہی کی کیوں نہ سہی۔۔۔گود میں حیاتِ ساکت کی سی گہری نیند سویا کرتا یا (ٹویڈ کوٹ کی نیم تاریکی پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے) حرف ولفظ کا نشہ جو بت نئے کتب خانوں میں سیندھ لگاتا کرم کتابی ہوتا۔۔۔جو یہ نہیں تو۔۔۔کھیل کھیل میں جو بھی گھڑی کٹ جائے' ٹھیک ہے' جیسا کہ اس مسخرے نے کہا۔۔۔

کھیل کھیل میں طبیعت صاف۔۔۔پھر اس حمام سے نکلیں۔ کہیں بیٹھ کر اطمینان سے تھوڑا کھائیں پئیں اور قبلائی کے گاؤں کی راہ پکڑیں۔ شب بسری وہاں ہو اور اگلے روز پلٹ پڑیں۔ فطری طور پر وہ بوڑھا سانپ' اپنا باس' خُنس کھائے بیٹھا خوخیار ہا ہو گا' مگر میں جا کر پہلے سلام ہی اُس کے سانپ کو جھاڑوں گا۔۔۔خُنس کو خوشی میں بدلتے دیر نہ لگے گی۔

سو آرام سے بیٹھ کر اس مسرور آدمی پر طاری نزع کو دیکھو۔۔۔دیکھو خوشی کی جانکنی کا کھیل کتنا دلچسپ ہے! کبھی دیکھا ہے پہلے تم نے!۔۔۔گو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ باسٹرڈی اور خوشی کا باہم کیا رشتہ ہے!؟ مگر یہ سب کسی سٹر بلٹے کا سفنہ ہی تو ہے۔ سوچ چہ' اچہ معنی!۔۔۔مگر جب سفر تمام ہو چکا اور اپنا دیرینہ جھولا جھاڑ کر اُس نے ایک آنکڑے سے لٹکا دیا تو ایک شب تارے دیکھتے ہوئے اُس کی کھاٹ کے پائے باہر نکل کر پَر بن گئے اور وہ ایسے وقت میں ایسی جگہوں پر سفر کرنے لگا جہاں لحظہ بہ لحظہ جگہوں سے جگہیں نکل رہی تھیں اور اُس کا گزر ایسے دریا پر سے بھی ہوا جو اُس کے آبلہ ہائے پا سے پھوٹ رہا تھا' جس کے ایک کنارے پڑُمی کے بھرے ہوئے گھاؤ بیٹھے غسل صحت کر رہے تھے اور دوسرے پر ہرے بھرے گھاؤ بہار دکھا رہے تھے اور دریا کے اس پار اس نے مقید مقامات کو رہائی پاتے اور سیار کو دفعتاً گر کر ثابت ہوتے دیکھا۔ تب اُس نے جانا کہ سفر کبھی تمام اور خواب کبھی ختم نہیں ہوتے' سفر' قیام میں' خواب ناخواب میں جاری رہتے ہیں اور اسفار کے اعادے میں کہیں تم اُن مقامات سے آشنا ہوتے ہو جو بظاہر دھول میں اٹے اور انام اور معمولی ہوتے ہیں مگر جو ہزار ہا مقامات سے گزر چکے ہوتے ہیں اور اب ہر مقام سے گزرنے پر قادر ہوتے ہیں۔۔۔سو خواب کیا ناخواب کیا' نیند کیا جگار کیا اور سفنہ کسی سٹر بلٹے کا ہو یا دانا عقل وند کا۔۔۔دونوں میں۔۔۔ایک سے دوئے میں کیا تمیز۔۔۔تو واقعہ یہ ہے۔۔۔پورن

نے خود کو یقین دلایا۔۔۔کہ اُس نے خواب میں جگار کا خواب دیکھا تھا اور پہلی نشست پر بیٹھا وہ آدمی واقعی خوش تھا کیونکہ جیسا کہ سند عطا کیے جانے سے قبل کی سائیٹیشن سے واضح تھا وہ سیڑھی پر پاؤں دھر چکا تھا۔ ناؤ سکائی واز دالمٹ اور واقعی گھٹنوں کے بل سند افتخار لینے وہ یوں گیا گویا ہر گھٹنے پر آسمان کو چھوتا ہو جبکہ اس بیچ وہ خوشی سے مرنے کے سترہ سوانگ بھر چکا تھا۔۔۔اب ممنونیت سے اس کے گھٹنے بج رہے تھے اور جب اسے وہ گہرا سبز ڈوسیئر (Dossier) پیش کیا جا رہا تھا جس کے باہر آب زر میں اس کا نام اور اندر باسٹرڈیل ہائیر آرکی (Bastardial Hierarchy) کی خفیہ ترین دستاویز تھی تو اس کے ہاتھ بھی تشکر آمیز مسرت سے مغلوب ہو کر کانپنے لگے۔ آنکھیں بھر آئیں' گلا رُندھ گیا۔ جبکہ ابھی اسے ولیم فاتح سے منسوب پروفیٹی کا ارفع ترین شہکار' اس نظم میں سے گزرنا تھا۔ جس کی قرأت اس موقع پر اعزاز یافتگان کے لیے لازم تھی۔ کچھ اپنی کچھ بیگانی زبان میں غلط سلط پورن کو جتنی یاد رہی کم و بیش وہ نظم:

I,m a bastard
My sole asset is bastardy
Which is also my sole pride,
Which disdains
to have any ancestors, so,
I'm on my won

اُوپر آسمان
نیچے زمین۔۔۔دونوں حریف
اور زمین پر ایسی قبور
جن میں سے ایک بھی
میرے پھولوں کی منتظر نہیں
اور اُفقی سمات میں خونخوار دوسرے۔۔۔دی ادرز
کوئی دیوتا اوتار نہ اپنشد میرا

آپ ہی اپنا دیوتا' اوتار اور اپنشد ہوں میں۔ میں ہی وہ ہوں جس کی تخلیق کے جرثومے بدور میں بہا دیئے گئے اور جسے جنم دے سکنے والی نے اپنے رحم میں دہکتے انگارے رکھ لیے۔ گویا پیدا کرنے سے پہلی مری چتا کو آگ دکھا دی گئی۔

ڈھیروں ڈھیر اعزاز وصول کر کے جب وہ خوشی کا متحمل کیا اپنی نشست کو پلٹ رہا تھا تو پیچھے اعلان ہو رہا تھا کہ ایک ہزار ایک دوشیزاؤں کی اتنی ہی راتوں کی سوزن کاری کا نایاب حاصل' پیلف' پرکس' اور پریوے لج کے فائبر سے تیار کردہ وہ فاخرہ خلعت اسے ایک خاص تقریب میں پیش کیا جائے گا جس کے ہر کیسے میں بے حساب ایناٹلسکس گولڈ فوائل میں لپٹی رکھی ہوں گی۔ تو کیوں نہ بنتا وہ آدمی خوشی کا متحمل' پتا۔۔۔مگر خوشی کے لیے۔۔۔پورن نے سوچا۔۔۔آدمی بھی بڑا چاہیے۔ کاش خوشی سے پھولی اس کپی کو گوز آ جائے یا کوئی اس میں موری ہی کر دے' کچھ ہوا نکلے اور یہ سکون پائے۔ اپنی نشست پر جا کر اپنی ہوا سے تنگ وہ آدمی پھر خوشی سے مرنے کے سوانگ بھرنے لگا' پر اب بات بن نہ پائی۔ سُر کہیں سوانگ کہیں جاتا۔ دائرے میں گھومتے وائلنوں کے ڈی سینڈو کے آس پاس لرزتے سُر اور اس کے سوانگ کے بیچ حائل ہو کر ہوا دونوں کو ہم آہنگ ہونے سے روک دیتی۔ اخیر اسی کپتی ہوا نے یہ کیا کہ اسے نچا کھڑا کیا اور اگلے چند ثانیے پورن کو لگا کہ اپنے تابڑ توڑ رقص کی کھٹاک کھٹاک سے وہ سٹیج کو کھدیڑ ہی ڈالے گا۔ اس کی خوش دیوانگی کو دیکھ کر وائلن یک لخت کریسینڈو پر جا کر چڑھ اُٹھے۔ تب ناچتے میں جھک کر اُس نے بھی اپنا وائلن اُٹھایا اور گاتا ہوا چڑھ اُٹھا۔۔۔

بار بی کیو بار بی کیو بار بی کیو
اون دائش گرین ریگل لانز آ بار بی کیو
بار بی کیو بار بی کیو بار بی کیو

فارمی فارمی فارمی

فار

آئم آجولی گڈ۔۔۔

اس آخری سطر کو وہ جھوم جھوم طرح طرح سے گانے لگا۔ کبھی ڈر کبھی ڈیفائینس' خوف کبھی خودسری' نخوت ابھی ناراضی' استہزاء' عداوت' سرکشی سرخوشی' مجبوری سرشاری' پھر ایک ہیبت ناک خالی پن اور بیزاری' کرب تنہائی اور لاچاری اور ان تمام کیفیات پر اتھاہ درد والم کا اوور لیپ۔۔۔ کہ جوں اُس کے وائلن کے تار خاردار ہو چکے ہوں اور اُنھیں سرخوش رکھنے کے لیے اُسے اپنے رگ ہائے جاں ان سے چھوانا پڑ رہے ہوں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ وائلن کے ان غیر مرئی تاروں پر چلا گیا جو ہر تاردار آلۂ موسیقی کے تاروں کے عقب میں ہوتے ہیں' ہر سازندہ جن تک رسائی کے خواب دیکھتا ہے۔۔۔ مگر زیادہ دیر اُسے ان پر ٹھہرنے نہ دیا گیا۔ کسی نے کیو دیا اور وہ خروج کر گیا۔

بس اب تو روشنیاں گُل ہوئیں کہ ہوئیں۔۔۔ یہ سوچ کر پورن نے تمبا کو خور کو ٹھوکا دیا کہ ہوش کرے اور خود بھی اپنا جھولا اُٹھانے کے لیے جھکا۔ پر اُٹھ کر جو سیدھا ہوا تو سٹیج کی چکا چوند کی ساعت پر گرانی پہلے سے سوا تھی۔۔۔

''۔۔۔ بھائی یہ روشنیاں کب گُل ہوں گی۔۔۔'' جماہی لیتے ہوئے تمبا کو خور نے پوچھا۔ پھر اپنی گود کے سے کہنے لگا: ارے یار تم ہی کچھ ہمت کرو اور لاؤ کہیں سے ڈھونڈ کے بھورا تمبا کو۔ سیہا کچھ کہنے کو تھا اغلباً کہ کوڑے نے کوک ماری۔ تس پر پورن' تمبا کو خور' سیہے۔۔۔ ایک ٹوئیڈ کوٹ چھوڑ۔۔۔ قرنطینہ کے سب عورت' مرد' بچوں نے دیکھا کہ دُہری کمر کے گرتے پڑتے کچھ اتاولے کچھ ٹھوکر کھاؤ سے ایک بڑے میاں سٹیج کی عقبی جانب سے بہ ایں ہیئت بڑھے آتے ہیں کہ ان کے ایک ہاتھ میں سارنگی دوئے میں گز جھول رہا ہے اور ان دو سے بھی آگے ان کے منہ پر کی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ اور ٹھوکر کھو اتاولے سے یوں کہ انھیں تو دراصل وہ ہتھیار بند پیچھے کو ہاں میں کچھ چبھوئے ہانکے لاتا تھا۔ اچھی رہی کہ ٹھوکر کھائی نہیں واقعہ میں ان بڑے میاں نے۔۔۔ ''لو ایک اور آ گئے۔۔۔'' کسی نے کہا۔ تمبا کو خور کے اندر بھی انھیں دیکھ کر تفرح اور تفنن کا مروڑ سا اُٹھا جو منہ پر بھی آ جاتا اگر بھورا تمبا کو ہوتا اس کے منہ میں۔۔۔ مگر اُدھر تو کساؤ تھا کسل تھی اور کسیل اور بیزاری کا تو تاؤ جسے وہ خرگوش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑے میاں پر نظر پڑتے ہی دلچسپی کی ایک پھلجھڑی اس کی آنکھوں میں پھک اُٹھی۔ ان کی ہیئت ہی ایسی تھی۔ ایک پاؤں میں بدرنگ سی مانومٹی کی بنی پھٹی جوتی تھی دُوا ننگا تھا۔ لانبی سفید ریش کے دونوں جانب جھانٹے کے گالے گرتے تھے۔ چونچ پہ اب گری کہ گری' گول میلے تڑخے شیشوں کی انکی عینک۔ بس ان کے آگے جھولتے ایک سارنگی اور گز۔۔۔ ہاں یہ بات اچرج تھی کہ گھٹنے باہر کو نکالے جب وہ کوہان میں کبھی کسی چیز کی چبھن سے ہنکے چلے آتے تھے اور ہر چیز ان کے بس سے باہر ہو رہی تھی تب بھی سارنگی اور گز پر ان کی گرفت میں ایک یقین تھا' قوت تھی۔ خیمہ گاہ میں اندھیرا بڑھ آیا تھا۔ کچھ دیر سے ٹوئیڈ کوٹ فقط اندر کی لو میں ٹریکٹیٹس پڑھ رہا تھا۔ ایک انگوٹھے اور دو انگلیوں سے آنکھوں کو آرام پہنچانے کی غرض سے اُس نے یونہی ذرا سَر اُٹھایا تو۔۔۔ اُسے دیکھا۔۔۔ اُس بڈھے کو۔۔۔ اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ کسی لڈوگی ایفورزم کی طرح حسین تھا۔ ایک غیر ذاتی صداقت۔ منطقی طور پر مکمل کسی زبان کا لفظ جس کی پیرانہ سالی میں پیری سے زیادہ پُراسراریت تھی۔ کسی ضرب المثل کی طرح غیر فانی۔۔۔ ایسی باتوں کو کہنے کی کوشش جو کہی نہیں جا سکتیں۔ وہ قدیم بڈھا یہی تھا۔۔۔ ایک لڈوگی ایفورزم۔۔۔ ٹوئیڈ کوٹ نے سکون سے اپنے ہاتھ گھٹنوں پر کھلی رکھی کتاب پر رکھ دیئے۔ اُس سے پچھلی کرسیوں پر ایک عورت نے بچے کو پیروں پر بٹھال کر مُوت اُتارنے کی سیٹی ابھی بجانا شروع کی تھی کہ اُس کی نظر اُس پر پڑی۔۔۔ وہ چپ ہو گئی اور سیٹی ٹوٹ گئی۔ مُوت اُوپر کا اُوپر نیچے کا نیچے رہ جانے سے بچہ ایک زوردار چیاؤں کے ساتھ رو پڑا۔ اُس کے نیچے اُترے مُوت نے اُس کی ماں کے پیروں میں سے بہہ نکل بازو کی کُرسی پر بیٹھی عورت کی لُنگی بھگو دی۔ بہت کچھ گرم سرد کہنے کو وہ منہ کھولنے کو تھی کہ اُس کی نظر اُس پر پڑی تھی۔ اسی برس سے کیا کم رہا ہوگا' پر کیسے ہر خروش کو خموش کراتا آ رہا تھا۔ یہ لیجیے وہ اب گری کہ گری عینک چونچ پر سے پھسل ہی پڑی آخر اور لگی میلے سُوت کے سرے پر جھولنے۔ بس ابھی کچھ ہی دیر میں جب ڈاکٹر سے ڈریسنگ کراتے ہوئے پورن کی نظر اخبار پر پڑے گی تو وہ ان بڑے میاں کو صفحے پر سے اسی بس نام کی عینک کے مٹ میلے شیشوں کے پیچھے سے گھورتا پائے گا اور وہاں' اخبار تک' وہ براستہ بلیو بلوارڈ آئیں گے کہ جہاں وہ سارنگی سمیت پائے گئے تھے۔ کسی کو وہ عجیب لگا تھا' کچھ بے مقام سا کہ ایسی پاش اور مصروف شاہ راہ کے بیچوں بیچ میلی کچیلی چارخانہ دھوتی'

پھٹدی جوتیوں اور لانبی سفید داڑھی کے ساتھ ایک بڈھا سارنگی پر رُوں رُوں کرتا چلا جاتا ہے۔۔۔ یہ وقفہ اپنے اسّی سالہ کو لپے منکا کر ایک چک پھیری لیتا ہے اور۔۔۔ رُوں رُوں۔۔۔ پھر چل پڑتا ہے۔ پر کب اور کہاں تک۔ کسی نے روک لیا۔ پھر کیا تھا۔۔۔ کاغذوں میں' فائلوں میں اور مراسلت اور مواصلت کے جتنے بھی ذرائع تھے ان سب میں بھول چا لہو گیا۔ ہزاروں کو ہزاروں کے آگے جوابدہ ہونا پڑا' کہ کیونکر پہنچا وہ بلیو بلوارڈ' کوارنٹین سے گزرے بغیر۔ ایک آدھ ٹھوکر تو کھائی اُس نے پر گرانھیں وہ ٹھوکر کھو۔ ہانکتے ہوئے لاکر گارڈ نے اُسے مدوّر بناوٹ کے آگے لا بٹھایا۔ ہاتھ جس میں گز تھا گھٹنے پر دھرے اور سارنگی جسے اُس کی اُجلی سفید ریش چھو رہی تھی گود میں لٹائے' کچھ دیر تو وہ شکستہ سارنگی صورت بوڑھا بُت بنا بیٹھا رہا پھر دھاگہ کان پر لپیٹتے ہوئے اُس نے عینک کو ٹھیک سے بانسے پہ جمایا اور سارنگی کو اُکسا کر بے نہایت پیار سے جوں وہ اُس کا بچہ ہو کاندھے سے لگایا اور اتنی ہی احتیاط سے پھر گز اس سے چھوایا۔ تب جو آواز اس میں سے آئی وہ خاموشی کی آواز تھی۔ اسے اُدھر کون سنتا۔ کسی نے نہ سنا کیونکہ۔۔۔ جب باربی کیو اگلے راؤنڈ میں داخل ہو کر بلندی کو چھو رہا ہو' وائلن بیچ کی انتہا پر ہوں' مائیک کے پیچھے کھڑے مجنون پر بلائیں ٹوٹ پڑی ہوں۔۔۔ تو خاموشی کی کون سنے۔ مگر جب گیت اپنی تھرتھراہٹ کے لچھوں سے نکل کر گانے والے کے زیرلب سے بھی اُتر کر فقط اُس کی اُوپر نیچے ہوتی انگلی کے فاریوفاریو اشاروں میں سمٹ آیا تو تمبا کو خور کو بھنک پڑی سارنگی پر بج رہی وہ خاموشی۔۔۔ جوگا بھی رہی تھی اور جب وائلن بھی جھجکی لینے عقبی تاروں پر چلے گئے تو۔۔۔ اُس کے کان کھڑے ہوئے اور اُس نے پورن سے کہنی چھوائی: 'بھیرویں ہے۔۔۔'

'سارے گاما
پادھانی سا
سانی دھاپاما
کیوں کرتے ہو تم۔۔۔ گارے سا۔۔۔ ایک کہنی پورن کو اور سہنا پڑی: بڑا اُستاد ہے بھئی۔ اب بھیروں کے پوربی انگ پر آ گیا ہے۔
سنو! بندش کیا نرالی ہے:

کیوں کرتے ہو تم گارے
سونا میرا دھاپادھا
لوہا سارے سا
لوہارے سارے گا
کیوں کرتے ہو
تم
سونا میرا
لوہا
لوہارے

مانو نہ مانو یہ میاں جی ضرور کوئی بڑے خانصاحب ہیں' سنو! کیا رچاؤ ہے۔ اَب خیال بھیرویں کی خموشی گا رہا ہے۔ ارے کسی خان صاحب نے آج تک سوائے خاموشی کے کچھ گایا نہ بجایا۔ یہ جو ساز اور آواز ہیں ناں یہ خموشی میں مدھانی سمان پڑ کر اُسے بلوتے ہیں اور جو آواز ہمارے کانوں میں پڑتی ہے ناں وہ خاموشی کا ماکھن ہوتا ہے۔۔۔'' ٹوڈی کوٹ لڈوگی نے تعریف کی ایک نظر تمبا کو خور پر ڈالی اور سامنے دیکھا جہاں وہ سارنگی نواز گویا منطقۂ خامشی کی طرح واقع تھا۔ جہاں جہاں اُس کے سنگیت کے ٹکڑے پہنچتے چپ کے ٹاپو اُبھر آتے۔ ایک ٹاپو مائیک کے پیچھے کھڑا آدمی تھا' ایک ہاتھ گھٹنے پر دوسری بانہہ اُدھر کو اُٹھی جدھر مدوّر بناوٹوں کے پیچھے اُجلا بے داغ حرامی پن اپنی تصدیق و ترقی کے انتظار میں ساتھ ساتھ کرسیوں پر متمکن۔۔۔ صرف ایک موسیقائی خیال کی بڑھت سے ٹھٹھر گیا تھا۔۔۔ اور بناوٹوں کے آگے سٹیج کے کناروں سے شروع ہوتے تاریک گڑھے میں اپنی نہلائی دُھلائی کی رسوم کے ایک بعد ایک مرحلے کو حیرت سے دیکھتے دی گریٹ اَن واشڈ تو چپ کے دائمی ٹاپو تھے ہی خیر۔۔۔ اور اُن کے اُوپر

نگراں۔۔۔ مسخرے کا چہرہ جس پر خیال بہتا ہوا آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اُس کی ظرافت قدرے آرام سے تھی اور مسخریت کی بجائے اُس سے کسی گائے کا معصوم گاؤدی پن ٹپک رہا تھا۔ اُس کا کوڑا ابھی کڑ کتا بھول کر گاؤدم ہی کی طرح منہ لٹکائے تھا اور گارڈ۔۔۔ جو اپنی دربانی آرجار میں ٹھٹک کر خیال کر مینڈھ میں مقید ہو چکا تھا۔

خامشی کچھ دیر اور اپنا کھیل دکھاتی اگر اس لمحے کو جلدی نہ ہوتی۔۔۔ مگر تھی۔ ایک راہی کی طرح جسے رستے میں نیند نے آ لیا ہو' چپ کا وہ چھن ہڑ بڑا کر اُٹھا اور اپنے ریزے چن چل پڑا۔۔۔ اس کے جاتے ہی کوڑا گاؤدم سے پھر کوڑا بن گیا اور مسخرے کی بازیافتہ یاد میں جا کر بج اُٹھا۔۔۔ اُسے سنتے ہی گارڈ اپنی ٹھٹک میں سے نکل آیا اور اپنے ہتھیار کو سنگین کی طرح آگے پیچھے دونوں ہاتھوں تھامے تیز نپے تلے قدم اُٹھاتا اس منقطۂ خامشی کی طرف چلا جس نے نہایت عمدہ اور مہارت سے اور کسٹر یعنی' ایسا سکون بخش شور غارت کر دیا تھا۔ پہاڑ کا پہاڑ وہ بڑے میاں پر جا کھڑا ہوا جس کے کندھے سے کسی بالک کی طرح لگی سارنگی رُوں رُوں کیے جا رہی تھی اور بڑے میاں اس کے گریہ میں گریہ ملا رہے تھے۔ گارڈ نے جھک کر سارنگی اور گز بڑے میاں سے لیے اور جب اس نے انھیں ایک طرف ڈالا تو سارنگی بولی: رُوں۔۔۔ کیوں!۔۔۔ گارڈ نے کچھ سنا نہ وہ کچھ بولا۔۔۔ ہاں۔۔۔ جبکہ بڑے میاں کے ہاتھ ابھی سارنگی بجانے کی کیفیت میں بجے اور منہ خیال بھیرویں کے حال میں کھلا تھا اور وہ انھیں سر اور گھٹنوں کے نیچے ہاتھ ڈال اُٹھا لے چلا تو اپنے پیچھے زندہ ہو چکے شور کو اُس نے بخوبی سُن لیا۔۔۔ وہ مجنون اب تیسری یا چوتھی کرسی کو حرامی پن کی نسل در نسل روشن' قابلِ فخر آگ پر تیار کی گئی باربی کیو ڈیلی کیسی پیش کر رہا تھا۔

اور یہی وہ لمحہ تھا جب تمبا کو خور کے صبر کا آخری شمہ صرف ہوا۔۔۔ اُس نے پورن سے پوچھا کہ کیا اُسے اُس سارے رولے رپے کا سر پیر پتہ پڑا ہے۔ پورن بولا کہ جیسے آپ ویسا ہی میں ہوں یہاں۔۔۔ تمبا کو خور جماہی لیتے ہوئے کہنے لگا کہ وہ تو سارے وقت سونے جگنے کے بیچ ہی لٹکا رہا' نہوئے تمبا کو اور رولے رپے نے اُس کے خلاف ایسی سانجھ پکائی کہ ایک نے اُسے سونے' دُوئے نے جگنے نہ دیا۔ "اب تم ہی بتاؤ بھیے یہ سُسرے کون ہیں اور کیا چیز انھیں نکلنے نہیں دے رہی اور کب ہم یہاں سے چھوٹیں گے۔۔۔" پورن نے اُسے بتایا کہ اُدھر منچ پر جو لوگ ہیں وہ حرامی ہونے کے مدعی ہیں۔ "کہا تو یہ گیا تھا کہ ایک تقریر ہوگی پھر کھیل' پھر ختم۔ مگر یہ کیسا کھیل ہے کہ۔۔۔" تمبا کو خور جو پورن کی بات کے بیچ ہی کھیں ل ل کر کے ہنس پڑا تھا بولا: "ذرا پھر سے کہنا بھیے کون ہیں یہ۔۔۔"

"حرامی۔۔۔ لگتا ہے کھیل کھیل میں اپنا جلسہ کر رہے ہیں۔ جو حرامی پن کی جائز اولاد ہیں اور اس کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں رہے ہیں اُن میں سندیں بٹ رہی ہیں یہ۔" ہنسی تمبا کو خور کو اب بھی آئی پر اب اس کے نمک میں آنے برابر زہر تھا۔ ہاتھ دوسرے پر آ لگنے سے پہلے اینٹھ گیا اور بھینچ کر مٹھی بن گیا اور۔۔۔ "اونہہ ان کی یہ مجال۔۔۔ لینا ذرا۔۔۔" کہتا اور خرگوش بچہ پورن کی گود میں ڈالتا وہ اُٹھا اور سٹیج کی طرف بڑھا۔

اور سینٹر سٹیج پر جب وہاں پاؤں کھولے ہاتھ پہلوؤں پر جما کر کہنیاں باہر کو نکالے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے وہ کسی لغو کھیل کا خرانی سورما معلوم ہوتا تھا' اُس کی ہیئت کذائی سے کہیں شکستہ' ماہر خیاط کی عطا کردہ خوش وضعی کو گنگ کر دیا۔۔۔ بنا مائیک ہی اُس کا بول بالا تھا: کیا بات ہے او سُسر وُ بڑ اپ رہے ہوا یں!؟ شرم نہیں آتی اپنے منہ۔۔۔ متھو بنتے۔۔۔ تم کہاں کے حرامی ہوا وئے۔ اِدھر دیکھو میری طرف' میں ہوں حرامی!۔۔۔"

یہ سُن کر اپنے گنگ پن میں وہ اُس کے دائرہ کر آئے اور ہاتھ پیچھے باندھ ایک نتھنا اور نصف ہونٹ چڑھا کر گھومتے ہوئے وہ اُس کی بدوضعی کو ناپنے لگے۔ کیونکر ہو سکتا تھا حرامی۔۔۔ یہ آدمی جس کا سر خس و خاشاک سے اٹا اور میلی چکٹ بنیان کے سوراخوں سے جھانکتے گھنے بال میل کچیل میں اُگے معلوم ہوتے تھے اور جس کے گہرے نیلے مسوڑھوں سے نکلتی دانتوں پر بھورے زرد سیمنٹ کی تہیں جمی تھیں اور ہونٹوں کی پپڑیوں میں نکوٹین مستقلاً ٹھہر گئی تھی' جو بولتا تھا تو تھوک ہی نہیں پیپ کے چھینٹے بھی اُڑتے تھے۔ کیسے ہو سکتا تھا! تاریخ کی جڑوں تک جاتی باسٹرڈی کی قابلِ فخر روایت کا حصہ یہ۔۔۔ یہ آدمی!؟ جس سے کہ ہر طرح کی بو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ اوٹمپورا! او مورز (Otempora! O Mores) وائلن کے دھیمے سُروں پر زمانے کے ایتھوس (Ethos) کا ماتم کرتے ہوئے وہ۔۔۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ۔۔۔ کیا واقعی! اور کس برتے پر وہ کہتا تھا جو کہتا تھا۔۔۔ وہ اُس کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے۔ کمک کے لیے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بھی اُٹھ آئے اور اُن میں سے ہر ایک ہر گھومتے کے پیچھے دفاع کے دوسرے دائرے

میں کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر تمبا کو خور کی تیوری کے بَل کھلے۔ تب' کہاں تو یہ کہ خم ٹھونک زور زبر سے اُبلتا وہ ایسا دِکھے تھا کہ بس ابھی کہیں سے لکڑی جھپٹ وہ تو تڑاق پٹا بازی کرتا حصار توڑ نکل جاوے گا اور کہاں یہ کہ تڑتیہا اُس کا تمام جاتا رہا۔ کرتا بھی کیا۔ کچھ رکھنے کے نام پہ بھورا تمبا کو تو تھا نہیں گانٹھ میں اُس کی۔ لے دے کے ایک سیہا تھا۔ بیگانہ۔ ان ہی کا جن کی موسیقی کا اُسے سامنا تھا' موسیقی جو اس کے گرد گھیرا تنگ کرتی ہوئی اُس پر جھپٹنے کو تھی' جس کے باہر ایک اور دائرہ تھا' غیر موسیقائی' گوشت پوست کا مگر جس کا ہر جز اور عضو لو ہے کی لاٹھ کی طرح اپنی جگہ گڑا تھا اور میمنہ میسرہ میں منچ کے بغلی دروازے تھے' عدو پر کھلے اُس پر بند۔ تو کیا کرتا جو طنطنہ چھوڑ وہ اکڑفوں اپنی جھاگ کی طرح بٹھا نہ لیتا۔

یوں ٹُن پھن سکوڑ' اُس نے دونوں پاؤں جوڑ کر ایک ہاتھ کو پہلو سے گرایا اور دوسرے کی نکوتین سے سَنی پیلی سیاہ اُنگلیاں چوسنے لگا اور ایسا کرتے ہوئے وہ ایک آدھ ناخن بھی کُتر کر کھا گیا کہ یہ بھی جڑوں سے اُوپر تک اُس کی پسند کے کھاجے سے بھرے تھے۔ منہ کی زبان جدا بدن کی الگ' ہاتھوں کی کچھ' وہ تھوک نگل کر لجاجت' لاف زنی اور لاحاصلی کے ساتھ اپنے محاصرے کے گھومتے اور ساکت نشانوں سے کہنے لگا: ''نہیں مانتے نا تم' تم کیا کوئی نہ مانے کہ جس کا منہ۔۔۔ تمہارے لیے اُگالدان نہ ہو سکے' جس کے بدن کی پوری کھال کی قیمت میں تمہارے تن کا ایک گرہ کپڑا نہ آ سکے' بھی وہی ہو سکتا ہے جو کہ تم ہو۔ پر بھوتین بیسی کہو کہ ساٹھا چج ہے۔ میں مانتا ہوں کہ حرامی ہونا مذاخ نہیں' ہرا یرا غیرا بے بابا حرامی نہیں ہو جاتا' عزت کا یہ مقام کچھ کر کے کمانا پڑتا ہے' جوں میں نے کمایا' تو بھو تمہارا یہ رشتے دار بے بابا تو نہیں حرامی ضرور ہے۔ ہوا پتہ کیا! بتاتا ہوں' ہوا یہ کہ امبر سر میں میرے ٹپ گری کے اڈے پر ایک دن میں اور میرا ایک دوست کسی بات پر بحثا بحثی ہو رہے تھے۔ اچن چیت جنے کیا موڑ آیا کہ میں نے جھنجھلا کر اُوپر اشارہ کرتے ہوئے کہا: ذرا وہ اینٹ دینا۔۔۔ میرے دوست نے طاقچے کی طرف ہاتھ اونچا کیا' پھر بولا: 'ای ی ن ٹ! مگر یہ تو کتاب ہے'۔۔۔ میں نے کہا: 'کھولو'۔۔۔ اس نے کھولی۔ میں نے کہا:۔۔۔'پڑھو'۔۔۔

اُس نے پڑھی۔ میں نے پوچھا: ''کچھ سمجھ آئی۔''

وہ بولا: ''کوئی ناں۔''

میں نے کہا: ''پھر اینٹ ہی ہوئی ناں۔'' وہ منہ کھولے میرا منہ دیکھنے لگا اور پورے ڈیڑھ منٹ دیکھتا رہا۔ پھر وہ اُٹھا اور پوری بات منٹو کو جا بتائی' سعادت حسن منٹو کو جو فن افسانہ کا دیوتا تھا' جو اُدھر امبر سر کے کوچہ وکیلاں میں میرا آڑی تھا۔ سُن کر وہ بولا: بڑا حرامی ہے یہ مستو۔۔۔ مستو میرا نام ہے۔ بس جی پھر کیا تھا۔ منٹو کے منہ سے بعد وں اُتری اور شہر کے منہ پہلے چڑھی یہ بات۔ جس بھی گلی سے میں گزرتا حرامی حرامی ہونے لگتی اور تو اور میر باپ تک جو میری اماں کو ستانے کا کوئی موقعہ جانے نہ دیتا اُسے سنا سنا مجھے حرامی کہا کرتا۔ اماں بھی کیوں پیچھے رہتی۔ وہ ے کھا گئی اور مجھے' رامی کہنے لگی اور جب شہر کے شاعروں میں میرا کچھ نام ہو گیا تو بلانے والا مجھے یوں بلاتا کہ اب تشریف لاتے ہیں امبر سر کے نامی بکتا جناب مستو حرامی۔۔۔ اور منٹو ہی کیا تبسم صوفی اور سیف دین سیف سے لے کر فیروز پھکنی اور کالو انگریز تک سب اس حرامی' نامی گرامی کے پیالے سے پیتے اور تھالی سے کھاتے تھے اور ایک تم ہو کہ مجھے کہیں لکھتے کہیں گنتے ہی نہیں۔۔۔

''گنتے ہیں گنتے کیوں نہیں۔ وی انکلوڈیو آؤٹ۔۔۔'' محاصرین میں سے کسی نے کہا اور دوسرے ہنس پڑے۔ مسخرے نے کھٹ بڑھئی کی آواز نکالی اور اُس کا کوڑا چبک اُٹھا اور طرح طرح کی یہ آوازیں جب حد کو چھونے لگیں تو تمبا کو خور کا غم ہو گئیں۔ تمبا کو نہ ہونے کا بے سروپا غم۔ اس لیے کہ بھری دنیا میں جو بھورا اُس کا سہارا ہو سکتا تھا اُس کے پاس وہی نہیں تھا۔ پھر بھی۔۔۔ کہ شاید۔۔۔ باؤلے جنور کی طرح اُس نے یہاں وہاں خود کو ٹٹولا اور جو پہلے سے معلوم تھا اُسے جان کر باؤلے پن کی جگہ بے وقوفی نے لے لی۔

محاصرین نے اس بیوقوفی کو دیکھا اور موسیقی اُن سے جاتی رہی۔ اب وہ محض ایک غیر موسیقائی محاصرے کی اکائیاں تھے۔۔۔ جو اپنے محصور کے گرد تنگ ہو رہی تھیں اور محصور بیوقوف نے کیا کیا کہ جیسے تمبا کو کا ایک پورا کھیت اُس کی مٹھی میں سلگتا ہو ، اکھ جھاڑ کر مٹھی منہ سے لگائی اور گھونٹ بھرنے لگا اور سمجھا کہ یہ گھونٹ قضا و قدر کے دنیاؤں کا گھونٹ ہے نے تک طول کھینچ لے گا۔ اس میں بھی کیا دیر تھی۔ گھیرا تنگ ہو ہی رہا تھا۔ پھندے کی طرح بے آواز۔ کیونکہ وہ اور اُن کے وائلن اپنی بولی بول چکے تھے اور اب پھندال کی طرح چپ تھے جو شکار کے گرد گانٹھ قطعی طور پر سرکانے سے پہلے کلام ترک کر دیتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ لفظ لغو ہیں۔ وہ مگر چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ صوفی تبسم اور منٹوایسوں کے ساتھ دانتوں کاٹی کھانے والا کیسے رہتا چپ۔

اُس نے مٹھی منہ سے ہٹائی اور ایک کش میں راکھ کیا کھیت جھاڑ دیا:

''نن نن نہیں تو نہ سہی۔۔۔ نہیں کرتے تو نہ کرو۔۔۔ اپنے میں شامل تم مجھے نہ کرو۔۔۔ پیپ پر بھیو میں آخر ہوں تو حرامی۔۔۔ بھانویں ایک پھٹکار ہوں' وستیوں' رہتل اور وستوں کی دُھتکار۔ اپنے میں سے نہ سمجھو تم مجھے۔ پر بھائیو اُس حرامی بھائی چارے کے نام پر جو ہمیں باندھے ہوئے ہے کچھ دان پُن تو کرو۔ کچھ دوا اپنے اس دور کے رشتہ دار کو۔ تا قیامت قائم رہے حرامشاہی۔ ایک دن کے لیے اس میں رخنہ نہ آئے۔ حلال سے کبھی گدلا نہ ہو تمہارا حرامی پن۔۔۔ خدا نظر حلال سے بچائے۔ دو اس لشکتی پشکتی حرامزدگی میں سے میرا بھی حصہ۔۔۔ اور نہیں کچھ تو بنیان ہی نئی لے لوں' گھٹنے پر چینی ہی لگوا لوں کہ بھائیو آخر ہوں تو۔۔۔''

پورن کبھی ٹھیک سے کہہ نہ سکا کہ پھر کیا ہوا' سوائے اس کے کہ روشنیاں دفعتاً گُل ہو گئیں۔ مدوّر بناوٹ منظر کو ایک تاریک دیوتا کی طرح دیکھنے لگی۔ کوزا مسخریت کی نئی راہیں نکالنے لگا۔ گارڈ مگر مضمحل تھا۔ ہاتھ لوہے اور لکڑی پر ہونے سے ملی طاقت لگتا تھا زائل ہو چکی ہے۔ دیوار سے گھسٹتے ہوئے اُس نے دھپ سے پینڈا نیچے لا جمایا اور ہاتھ تسموں کی طرف لے جاتے ہوئے اندھے گڑھے کی طرف دیکھا جہاں گاجر مولی' ساگ پات کی جڑیں کرسیوں کے پینڈوں سے گزر چکی تھیں۔ خود پورن نہا دھو کر ایسا ہلکا ہو رہا تھا کہ چاہتا تو روح کی طرح پرواز کر جاتا۔ تبھی اُس نے ایک ساتھی روح کو پر تولتے دیکھا۔ یہ وہ بڑھیا تھی کچھ دیر پہلے جس کی بُچتی بھیگ گئی تھی۔ پرانے جہاز کی طرح اندھے پانیوں میں ڈولتی کرسیوں سے اُلجھتی وہ گارڈ کی نابہ کی سیدھ میں بڑھنے لگی۔ بُچتی اُس نے سٹیج پر رکھ دی۔ پھر شاید یہ سوچ کر کہ اُس کے اوپر چڑھنے تلک جنے کیا بیت جائے اُس نے جھپٹ کر اسے پھر بانہوں میں بھر لیا۔ گارڈ نے کوفت سے اُس کے تذبذب کو دیکھا اور ننگے پاؤں بوٹ تسموں سے اُٹھائے بدبداتا ہوا آیا۔ سٹیج کنارے رُک کر اُس نے خالی ہاتھ بڑھیا کو دیا۔ بڑھیا کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ صرف ٹویڈ کوٹ پہنے ہوئے وہ آدمی بیٹھا رہ گیا۔ پورن اسے چھونے کا سوچ ہی رہا تھا کہ تمبا کو خور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ننگ دھڑنگ ہانپتا ہوا۔ بنیان کندھوں سے چھوٹ پائجامے پر آ پھنسی اور عقب میں آوازوں کی ایک فوج ظفر موج۔ پورن کی گود سے خرگوش نوچ کر اُس نے جست بھری۔

ادبِ عالیہ کی ضرورت ـــــ فہیم اعظمی کی نظر میں

''فارمولا سازی'' کی اصطلاح ہماری تھیوری کے اطلاق کے سلسلے میں اکثر سننے میں آتی ہے۔ فارمولا تو ہماری زندگی کا حصہ ہے۔ ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر فارمولا کے تحت سوچتے اور زندگی بسر کرتے ہیں لیکن کوئی بھی تھیوری یا فارمولا دائمی نہیں ہوتا۔ نئے فارمولے اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں پوری طرح اس تبدیلی کا فوراً احساس نہ ہو اور ہم امتزاج یا Synthesis کے بارے میں اپنی فکر کو التواء میں ڈال دیں۔ ڈائلکٹس کے عمل کے دوران یہ ضرور ہوتا ہے کہ ہم اینٹی تھیوری کا لبادہ اوڑھ کر اپنے کو آزاد سمجھتے ہیں مگر درحقیقت یہ ایک عارضی (Transitory) دَور ہوتا ہے جس میں ہم کسی تھیوری کا ادعائیت کی حد تک پروموشن اور اُس عقیدتی شدت سے یا شعوری طور پر ادب میں کسی نظریہ کی ترجمانی اور متعلقہ اصطلاحات سے گریز کرنے لگتے ہیں اور شاید ہم اُس دَور سے گزر رہے ہیں لیکن ہمیں سہل انگاری اور حد سے زیادہ مصروفیت کے اثرات سے بھی باخبر رہنا چاہیے ''ادبِ عالیہ'' کی تھیوری اور اصطلاح اب بھی ضروری معلوم ہوتے ہیں' اگر ایسا نہ ہوگا تو ترقی بھی رُک جائے گی اور فن اور آرٹ کا وجود شاید آثاریت (Archeology) کا حصہ بن جائے۔ (ماہنامہ ''صریر'' اگست ۲۰۰۱ء ص ۸)

مُصنّف

محمود احمد قاضی

اس بڑی بلڈنگ میں اس چھوٹے سے دفتر کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ تیسری منزل پر کئی چکردار راہ داریوں کو عبور کر چکنے اور پسینے میں نہا جانے کے بعد وہ سیڑھیوں کی ریلنگ سے لگا سستا رہا تھا کہ اچانک ہی وہ بورڈ جس پر ''مخلص پبلی کیشنز'' لکھا تھا اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ 4"x8" کا یہ بورڈ خاموشی سے ان راہ داریوں میں اُس کی آج کی اس سیر بے لطف کے دوران چھپا رہا تھا اور اب ایک دم سے اس کے سامنے آ گیا تھا شاید اس کا منہ چڑانے کے لیے۔۔۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر گردن پہ آئے پسینے کو خشک کیا تو گریبان میں سے اُمڈتی پسینے کی اس ناگوار بُو کو محسوس کیا جو صبح کے چھڑکے گئے ٹالکم پاؤڈر کی خوشبو کو نگل چکی تھی۔ اس کی طبیعت بھاری سی ہو رہی تھی۔ اس لیے اُس نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا لیکن پھر خود ہی اس کے قدم اُس دروازے کی طرف اُٹھ گئے۔ اندر کا ماحول ٹھنڈا اور پُرسکون سا محسوس ہوا۔ دو تین آدمی میزوں کے قریب جھکے ہوئے کسی کام میں اُلجھے ہوئے تھے ان کے قریب موجود کتابوں کے شیلف ڈھیروں کتابوں کا بوجھ نہ سہارتے ہوئے سے محسوس ہوئے اُن سے پرے شیشے کے کیبن میں وہ شخص بیٹھا تھا جس سے کہ اسے ملنا تھا لیکن اس کی میز کے گرد اس وقت دو آدمی موجود تھے۔ وہ اُن سے ہاتھ ہلا ہلا کر اور مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ ان سب کے سامنے چائے رکھی تھی اور بسکٹ بھی تھے۔ اس نے اُن دونوں آدمیوں کے اُٹھنے کا انتظار کرنے کے لیے موقع غنیمت جانا اور کتابوں میں گھس گیا خوبصورت چمکیلے ٹائٹلوں والی کتابیں اس کے ہاتھ میں آ کر واپس اپنی جگہوں پر جا رہی تھیں چھپے ہوئے حروف والے کاغذ کی ایک اپنی مخصوص خوشبو اس کے وجود کو بلائے دے رہی تھی اسے یہ خوشبو بہت پسند تھی اس نے کافی دقت گزاری کر لی تھی بہت سی کتابوں کے ورق اُلٹ پلٹ لیے تھے لیکن وہ لوگ ابھی اُٹھ نہیں رہے تھے پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے شیشے کے کیبن میں لگے خوبصورت کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے قدم اندر کی طرف بڑھا دیے ان میں سے کسی نے بھی اس کی آمد کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ بدستور اپنی باتوں میں مگن تھے جن کو اب وہ بھی سن رہا تھا ان کے درمیان پچھلی رات کو ہونے والی عقیقے کی کسی تقریب کا ذکر ہو رہا تھا۔ چند لمحوں تک جب وہ ان کی میز کے قریب کھڑا رہا تو اس شخص نے جس سے کہ اسے ملنا تھا اور جس کے بال ماتھے کے قریب سے گرے ہوئے تھے نے بغیر کسی تمہید کے اس سے مخاطب ہو کر کہا:

''اگر آپ کو کوئی کام ہے تو باہر میرے سٹاف سے مل لیجیے۔''

''جی نہیں۔۔۔ ان سے نہیں مجھے آپ سے ملنا ہے۔''

''اچھا تو ٹھیک ہے۔۔۔ ملیئے۔''

''مجھے عین صاحب نے آپ سے ملنے کے لیے کہا تھا۔''

یہ کہتے ہوئے ایک فائل جو اس نے بغل میں دبا رکھی تھی۔ اس کے سامنے رکھ دی۔

اس شخص نے فائل کو کھول کر دیکھنے سے پہلے اس کے کور پر موجود کسی طرح کی گرد کو کھوجنے کی کوشش میں اپنا ہاتھ اس پر ایسے پھیرا جیسے اسے اپنے ذہن میں مرتب شدہ نتائج کے مطابق وہاں کچھ نہ پا کر مایوسی ہوئی ہو۔ کچھ دیر تک اس لایعنی عمل سے گزرنے کے بعد آخر کار اس نے فائل کھول ہی لی وہ مشینی انداز میں ورق اُلٹتا رہا اور وہ کھڑا رہا کیونکہ اس نے اسے بیٹھنے کے لیے ابھی تک نہیں کہا تھا۔ بظاہر وہ بغور اس فائل کا مطالعہ کرتا رہا پھر فائل کو بند کرنے کے بعد اس نے اسے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''محترم۔۔۔ میرے پاس تو اس وقت کام کا بہت رش ہے ویسے بھی اب ایسی چیزوں کو پڑھنے کی کسے فرصت ہے۔ کیا آپ نے باہر پڑی ایسی کتابوں کے ڈھیر ابھی ابھی ملاحظہ نہیں فرمائے۔۔۔ فی الحال میں معذرت چاہوں گا شاید پھر کسی وقت میں آپ کے کام آ سکوں۔۔۔''

''دراصل مجھے کہا گیا تھا کہ۔۔۔''

''آپ عین صاحب سے میرا سلام کہیئے گا۔ شاید ایک دو روز میں میری اُن سے براہِ راست بات چیت بھی ہو جائے۔۔۔اس کے علاوہ کوئی خدمت ہو تو حکم کیجیے۔۔۔''

اس نے پھر سے اپنی فائل بغل میں دابی اور وہاں سے نکل پڑا۔ اسی وقت پبلشر کی میز کے گرد بیٹھے ہوئے دو اشخاص میں سے ایک نے جو نوجوان سا شخص تھا جانے کی اجازت چاہی وہ اور وہ نوجوان شخص اکٹھے ہی وہاں سے نکلے تھے۔ سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر جب وہ سانس بحال کرنے کے لیے ایک لمحے کے لیے رُکا تو اُس نے اُسے اپنے قریب پایا۔

وہ اس سے ہی مخاطب تھا۔

''جناب۔۔۔کیا آپ میرے ساتھ چلنا پسند کریں گے؟''

''کہاں۔۔۔اور آپ کون صاحب ہیں؟''

''آئیے۔۔۔آپ کا فائدہ ہی ہو گا آپ کا جو کام یہاں نہیں ہوا وہ شاید مَیں کر دوں۔ مَیں نے نیا نیا کاروبار شروع کیا ہے۔۔۔حالانکہ یہ تو سراسر رسک لینے والی بات لیکن مَیں کوشش کروں گا کہ آپ کے کام آ جاؤں۔'' اس کے حیرانی میں ڈوبے ہوئے وجود کو اُوپر سے نیچے تک وہ کچھ لمحات تک تو دیکھتا رہا پھر قریب ہی کمپاؤنڈ میں موجود ایک چم چم کرتی کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ ''پلیز۔۔۔''

وہ اس کے ساتھ چل پڑا اور کئی معروف بازاروں سے ہوتا ہوا ایک اور گنجان علاقے میں پہنچ گیا۔ وہاں اس کا دفتر بھی ایک بڑی بلڈنگ کی تیسری منزل پر ہی واقع تھا اس کے دفتر میں البتہ شیشے نہیں لگے تھے۔ سیدھا سادہ سا ایک کمرہ جہاں کتابیں انبار کی صورت میں پڑی تھیں۔ شیلفوں کے بغیر وہ بے ترتیب سی لگ رہی تھیں وہاں ایک پکی عمر کا کلرک نما شخص پہلے سے موجود تھا۔ نوجوان شخص نے کلرک کو چائے لانے کو کہا اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر اس نے بھی فائل کی ورق گردانی شروع کر دی۔۔۔ کچھ دیر بعد وہ بولا:

''جناب جیسا کہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ مَیں نے ابھی ان چیزوں کو سرسری نظر سے ہی دیکھا ہے۔۔۔انھیں آپ میرے پاس چھوڑ جائیں۔۔۔مَیں اپنا اطمینان کر لوں تو آپ کو اطلاع کر دوں گا۔''

''لیکن مجھے تو دوسرے شہر سے آنا ہو گا اس لیے آپ مجھے کوئی تاریخ اور وقت دے دیں تو بہتر ہو گا۔''

''ٹھیک ایک ماہ بعد۔''

''یہ عرصہ کچھ زیادہ نہیں؟''

''میرے خیال میں نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ دوسرے کام میں منہمک ہونے لگا تو اس نے محسوس کیا اب اس کی یہاں ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اُٹھا اور وہاں سے نکل کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔

اصل میں اس کی دو تین کتابوں کے مسودے کافی عرصہ سے تیار پڑے تھے مگر کوئی پبلشر نہیں مل رہا تھا۔ اسی اثنا میں اس کے ایک جاننے والے نے اُس پہلے والے پبلشر کا حوالہ دے کر اسے وہاں بھیجا تھا اور اس کے انکار کے بعد یہ دوسرا شخص۔۔۔ بہر حال صورتِ حال کچھ اس کے حق میں نہیں جا رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے دو کتابوں کا مصنف تھا لوگ کسی حد تک اس کے نام اور کام کو جانتے تھے اور اب مزید کتابوں کی اشاعت کا مرحلہ اسے درپیش تھا وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر تھک تھکا کر اپنے شہر لوٹ آیا اور زندگی کی دوسری قسم کی فضول اور لغو مصروفیات میں اُلجھ کر رہ گیا وہ اپنی دیرینہ عادت کے مطابق دن میں بھی خواب دیکھنے میں لگ گیا۔ وہ اکثر بیٹھے بیٹھے چلتے چلتے فینٹیسیز میں چلا جاتا تھا۔

''شاید ایسا وقت آپ پر بھی آتا ہو کہ جو چیز آپ کو حاصل نہ ہو رہی ہو آپ کی دسترس میں نہ آئی ہو اس کی دستیابی آپ ایسے دن میں نظر آنے والے خوابوں کے ذریعے کر لیتے ہوں۔۔۔ مثلاً کوئی لڑکی جس سے آپ محبت کرتے ہوں۔۔۔ ایک خوبصورت مکان جس کے آگے ایک چھوٹا سا لان بھی ہو۔۔۔ کسی بہت ہی پسندیدہ اور بڑی شخصیت سے ملنے کی خواہش وغیرہ۔۔۔ یہ چیزیں اگر نہ مل رہی ہوں تو انھیں تصورات میں دیکھ لینا' محسوس کر لینا میرے خیال میں کوئی بُری بات بھی نہیں اور پھر آپ کے ایسے عمل سے جب دوسروں کا کوئی نقصان نہ ہو رہا ہو تو پھر اس ذاتی عمل سے

گزرنے میں کوئی قباحت ہونی بھی نہیں چاہیے ہاں یہ ضرور ہے کہ کچھ نہایت عملی قسم کے لوگ ہم جیسے دن کو خوابوں میں بسر کرنے والوں کے خلاف طرح طرح کے بیان دیتے رہتے ہیں۔ دراصل ایسے حضرات کو بیان بازی کی لت پڑی ہوتی ہے جب کہ میرے خیال میں ایسا کرنے میں اس لیے بھی کوئی حرج نہیں کہ پہلے پہل ہر چیز آپ کے لیے ایک خواب ہی ہوتی ہے اور پھر میرے تجربے میں یہ بات بھی آئی ہے کہ میں نے چند ایسی چیزیں ضرور حاصل کر لی تھیں جو پہلے پہل محض میرے دن کے خوابوں کا حصہ تھیں۔''

وہ اپنے آپ سے اکثر ایسی گفتگو کرنے کا عادی تھا اس لیے وہ کسی حد تک مطمئن تھا کہ مزید کتابیں چھپوانے کی خواہش جو اس وقت ایک خواب تھی کل کلاں تعبیر کی صورت میں سامنے آ سکتی تھی جیسے کہ اچانک یہ اجنبی پبلشر اس سے وعدہ کر بیٹھا تھا۔

ایک ماہ کا عرصہ پلک جھپکنے میں گزر گیا۔ جب اشتیاق زیادہ ہو تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔۔۔ دیر گراں نہیں گزرتی۔ وہ ٹھیک وعدے والی تاریخ اور وقت پر پبلشر سے ملنے پہنچ گیا لیکن اس کا کمرہ بند ملا وہاں ایک بڑا سا تالا پڑا تھا۔ ساتھ والے دفتر سے پتہ کیا تو وہاں بیٹھے تاش کھیلنے والے لوگوں میں سے ایک نے جواباً بڑا سا سر ہلا کر صرف اتنا کہا: ''پتہ نہیں۔''

راہ داری میں سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے شخص سے بھی معلوم کرنے کی کوشش کی تو جواب وہی آیا ''پتہ نہیں۔'' اس نے کچھ دیر وہاں انتظار کرنے کی ٹھانی اور سیڑھیوں کی ریلنگ سے لگ کر وہاں دو گھنٹے تک کھڑا رہا مگر وہ نہ آیا۔ کمرہ بدستور بند تھا۔ واپسی پر کسی قدر مایوسی ہوئی لیکن ابھی اس کے پاس قسمت آزمانے کے چانسز تھے مزید ایک ماہ بعد وہ پھر آیا تو اسے وہ مل گیا۔ اس سے معذرت کرنے لگا ''میں اصل میں ملک سے باہر چلا گیا تھا ایک پراجیکٹ تھا اسے حاصل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔۔۔ خیر آپ مطمئن رہئے آپ کا کام ہو جائے گا میں باہر جانے سے پہلے آپ کے مسودوں کو صحیح طرح سے دیکھ نہیں پایا تھا اب جلد ہی دیکھ لوں گا۔۔۔ آپ اگلے ہفتے آ جائیے۔۔۔ آپ کو جو زحمت ہوئی اس کے لیے ایک بار پھر معذرت۔۔۔''

اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی معذرت قبول کر لی اور اگلے ہفتے اس کے پاس آنے کے لیے اپنے آپ کو ابھی سے تیار کرنے لگا۔ اگلا ہفتہ کتنی دُور تھا' یوں چٹکی بجاتے ہوئے آ گیا۔ اب کی بار وہ آیا تو کمرہ پھر بند تھا اس بار اس نے ادھر اُدھر سے پتہ کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے اُن کا جواب پہلے سے معلوم تھا اب کے وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ اپنے ذاتی کاموں میں ایسا اُلجھا کہ ڈیڑھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ پھر اسے فلو نے آ لیا یوں مزید ایک ماہ اس کی صحت کی بحالی میں گزر گیا اس لیے وہ تقریباً اڑھائی ماہ بعد پھر آیا تو اس کا کمرہ تو اسے کھلا ملا لیکن وہاں اس کی جگہ کوئی اور شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اب وہاں کتابیں بھی نہیں تھیں بلکہ کمرے کی دیواروں کے ساتھ چھت تک بڑے بڑے گتے کے ڈبوں کی قطاریں تھیں اور ان کے درمیان کچھ اور طرح کی فضول سی چیزیں پڑی تھیں اب یہ کمرہ ایک طرح کا گودام سا لگ رہا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا ''وہ پبلشر صاحب کہاں ہیں۔۔۔؟''

''پبلشر۔۔۔ کون پبلشر۔۔۔؟''

''جی یہاں پر ایک کتابوں کی دکان تھی بلکہ کتابیں یہاں سے چھپتی بھی تھیں۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔''

''میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔۔۔ آپ فلاں صاحب کی بات کر رہے ہیں شاید۔۔۔ جو ہم سے پہلے یہاں ہوا کرتے تھے۔''

''جی ہاں۔۔۔ آپ ٹھیک سمجھے۔۔۔ وہ کہاں ہیں؟''

''پتہ نہیں۔۔۔'' اس نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ اپنا سا منہ لے کر وہاں سے روانہ ہوا تو سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔۔۔!!!

افسانہ برائے فروخت

محمد حامد سراج

فضا میں حبس اور بلا کی گھٹن تھی۔ درختوں کے پتے ساکن تھے۔ وہ بہت دیر برآمدے میں کھڑا اپنے آپ سے اُلجھتا رہا۔ باطنی جنگ طول پکڑتی جارہی تھی اور جنگ نے اس کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ اس کے اعضائے رئیسہ جنگ میں پسپا ہورہے تھے۔ وہ آخری حربہ آزما کر اس صف کو لپیٹنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی سوچ کا زاویہ ہی نہیں تھا بلکہ اب مسائل نے اسے ایک ایسی سرحد پر لا کھڑا کیا تھا کہ اسے فیصلہ کرنا ناگزیر ہوگیا۔ اس نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر بازو ڈھیلے چھوڑ دیے۔ وہ اپنے اندر فیصلے کی عمارت میں آخری اینٹ رکھتے ہوئے ایک بار لرزا لیکن پھر سنبھل گیا۔ فیصلہ وہ کر چکا تھا۔

کار کی چابی اس کے دائیں ہاتھ کی چھنگلی میں تھی۔ کار سٹارٹ کرتے ہوئے اسے دِقت ہوئی' وہ اپنے آپ سے اُلجھ پڑا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ کار میں بیٹری ڈالے اسے کتنا عرصہ ہوا ہے۔ اس نے ڈیش بورڈ کو کھولا۔ اس میں بیٹری کا گارنٹی کارڈ نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو کوسا۔ کار کا' سلف مرمت کرائے بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا پھر یہ سٹارٹ کیوں نہیں ہورہی۔۔۔؟ مسلسل سَلف مارنے سے کئی قسم کی آوازیں برآمد ہوئیں اور کار سٹارٹ ہوگئی۔ وہ ٹریفک کے سیلاب میں اُتر گیا۔ اسے ایک ہم دمِ دیرینہ سے بھی ملاقات کو جانا تھا لیکن اس نے سوچا پہلے وہ مسئلہ حل کیا جائے جس کی عمارت میں اس نے آخری اینٹ چُن دی ہے۔ اس نے کار بائیں جانب ہی رکھی' وہ قدِ آدم سائن بورڈ پڑھتا جارہا تھا۔ ہزاروں سائن بورڈوں میں اسے ایک نمایاں سائن بورڈ کی تلاش تھی جس میں اس کا ایک کالج فیلو سیلز مین کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی تھی کہ شہر کے سفر میں اسے راستے ہمیشہ بھول جایا کرتے تھے۔ ٹریفک سگنلز پر اسے یہ اُلجھن گھیر لیتی کہ مجھے کس راستے پر مڑنا ہے۔ وہ گاؤں سے شہر تک کا رستہ تو باآسانی ناک کی سیدھ میں طے کر لیتا لیکن شہر کے جنگل میں اُلجھ کر رہ جاتا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا اور اس کی کوشش ہوتی جتنی جلد ممکن ہو وہ کام سمیٹ کر گاؤں لوٹ جائے۔

اس نے کار پارک کی۔ شہر روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ وہ سپر سٹور میں داخل ہوا۔ سٹور کا مالک گاہکوں کے ساتھ اس درجہ مصروف تھا کہ اسے بہت دیر اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ چونکہ وہ رقم دھڑا دھڑ اپنے سیف میں ڈال رہا تھا۔ سیف جس پر ڈیجیٹل میٹر رقم نہ صرف کاؤنٹ کر رہا تھا بلکہ ساتھ لگے پرنٹر پر اس کا پرنٹ آؤٹ بھی نکل رہا تھا اس کے سامنے لال نیلے اور سبز نوٹ تھے۔ گاہکوں سے رقم لے کر Automatic سیف میں ڈالتے ہوئے اسے نوٹوں کے سوا اور کیا سوجھ سکتا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ وہ ذرا فارغ ہولے تو وہ اسے اپنی جانب متوجہ کرے۔ پھر اس لمبے کاؤنٹر پر اس نے ایک نظر ڈالی کہ جو سیلز مین فارغ ہو اس سے ہی بات کرلوں۔ اسے اپنا کالج فیلو نظر نہیں آیا۔ شاید وہ چھٹی پر ہو۔۔۔؟ یہ بھی ممکن ہے کسی کام سے نکلا ہوا ور ابھی آ نکلے۔ ایک چھریرے بدن کی لڑکی نے کسی ہوئی جینز پہن رکھی تھی اور باریک شرٹ میں سے جھانکتا اس کا بدن سٹور میں موجود لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور اس کے ساتھ کھڑی مائل بہ فربہی خاتون اپنے کھلے بالوں کو سہلا رہی تھی۔ سیلز مین کی توجہ پوری کی پوری ان پر تھی۔ اس نے متعدد میڈیسنز اور کھانے پینے کی انواع واقسام کی اشیا ان کے سامنے ڈھیر کر رکھی تھیں۔ ان کی اُنگلیوں کے ناخن بڑھے ہوئے تھے اور ان پر لباس سے میچ کرتی نیل پالش لگی تھی۔ وہ اُنگلی کے اشارے سے جس چیز کی طرف اشارہ کرتیں سیلز مین روبوٹ کی طرح وہ چیز اُتار کر ان کے سامنے لارکھتا۔

اسے اُلجھن ہونے لگی' اسے اپنی خریداری تسلی سے کرنا تھی اور یہاں تسلی کا سرے سے امکان ہی مفقود تھا۔ ایک سیلز مین کو ذرا فارغ دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکا۔ ابھی اس نے بات شروع بھی نہیں کی تھی کہ سیلز مین نے سٹور سے داخل ہونے والے ایک صاحب کا چہرہ دیکھ کر اپنی پوری مسکراہٹ ان پر انڈیل دی۔

''آیئے زردار صاحب۔۔۔ بھابھی اب کیسی ہیں۔۔۔؟''

''ڈاکٹر تبدیل کیا ہے۔ اُمید تو اس نے بہت دلائی ہے۔ دیکھئے اللہ کو کیا منظور ہے۔'' اس نے نسخہ سیلز مین کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

سیلز مین نے بجلی کی سی سرعت سے ادویہ نکال کر انھیں کاؤنٹر پر ڈھیر کیا۔

یہ انجکشن امپورٹڈ ہے اور کیپسول جرمنی کے ہیں۔ چند انجکشن' کیپسول' کچھ ٹرینکولائزرز کا بل اس نے آٹھ ہزار تین سو چالیس روپے بتایا۔ صاحب نے ایک Credit Card اس کے ہاتھ میں تھمایا اور شاپنگ بیگ اُٹھائے سٹور سے نکل گئے۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ آنے والے گاہکوں میں زیادہ تر ایسے لوگ تھے جن کے سامنے سیلز مین ٹرینکولائزر ہی رنگ برنگی Packings میں سے نکال کر رکھ رہے تھے۔

یہ پوری قوم اس نشے کی عادی ہوگئی کیا۔۔۔؟

ان کی نیند کیا ہوئی۔۔۔؟

کس بات کی عجلت نے ان سے دن کا چین اور رات کی نیند چھین لی۔ یہ کیوں بولائے بولائے پھرتے ہیں۔ ان کے بنک بیلنس ہیں۔ لمبی لمبی کاریں اور لش لش کرتی بیویاں ہیں۔ کروڑوں کے پلاٹ' پلازے اور شہر شہر انہوں نے کوٹھیاں بنا رکھی ہیں۔ سفر یہ زمین کی بجائے فضا میں کرتے ہیں شاید اسی لیے انھیں زمین والوں کے دُکھ معلوم نہیں۔ دولت ان کے گھر کی لونڈی' رکھیل اور کار کا روز نیا ماڈل ان کا شوق ٹھہرا۔ ان بڑے بڑے سٹوروں میں بغیر مول تول کیے یہ اس طرح خریداری کرتے ہیں جیسے عالمی منڈی میں ضمیر فروشی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

لیکن میں ان کے بارے اتنا متفکر کیوں ہوں۔۔۔؟

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی رات کا ایک بجا تھا اور اسلام آباد کے جس سپر سٹور میں اس وقت وہ کھڑا تھا وہاں رات اُترنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

وہ یہ بھول گیا کہ وہ یہاں کس کام سے آیا ہے۔ برق رفتار زندگی میں یاد رہ بھی کیا سکتا ہے۔ آسائشات کی دوڑ نے اس حد تک مفلوج کر دیا ہے کہ زندگی کا پورا پیٹرن ہی مصنوعی ہو گیا ہے۔

سیلز مین جیسے ہی گاہک سے فارغ ہوا۔ اس نے پہلے اپنے دوست کا پوچھا۔ وہ کہیں قریب ہی کسی کام سے نکلا تھا اور لوٹنے والا تھا۔ اس نے سیلز مین سے پوچھا:

''یہ سٹور رات کتنے بجے تک کھلا رہتا ہے۔۔۔؟''

''تقریباً دو اڑھائی بجے تک۔۔۔''

''آپ کے سٹور میں تو قیامت خیز رش ہے۔ خاص کر آپ کے Drug Side کی Sale بہت زیادہ ہے۔۔۔''

''یہ سب اللہ کا کرم ہے۔۔۔ آپ کو کون سی میڈیسن چاہیے۔۔۔؟''

''مجھے میڈیسن نہیں ایک تازہ افسانہ چاہیے۔''

''پلیز آپ سامنے والے کاؤنٹر پر چلے جائیے۔ آپ کے دوست آنے والے ہیں یہ شعبہ ان دنوں اس کے پاس ہے۔ ویسے ہم آج کل افسانہ صرف ڈیمانڈ پر ہی تیار کرتے ہیں۔''

وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے۔ اسے یقین تھا یہ اس کے دوست کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ اس سے بغلگیر ہوا۔ کولڈ ڈرنک کے بعد چائے آگئی۔

''کیسے آنا ہوا ہے۔۔۔؟''

''فیڈرل بورڈ میں کام تھا۔ دوستوں سے بھی ملاقات کو ایک عرصہ گزر گیا ہے۔''

''ہاں یار' اب کی بار تو تم میرے خیال میں سال' یا اس سے بھی زیادہ عرصہ بعد آئے ہو۔''

''بہت سے کاموں میں تم سے بھی ایک کام ہے۔۔۔بلکہ مشورہ کہہ لو۔۔۔!''

''میں حاضر۔۔۔!''

''مجھے ایک تازہ افسانہ چاہیے۔''

''تم تو خود افسانہ نگار ہو۔۔۔؟''

''میرے ایک دوست نے ادبی جریدہ نکالا ہے۔''

''شوقِ ناموری کے لیے۔۔۔!''

''نہیں نہیں۔۔۔ادب کی خدمت کے لیے۔''

''ادب کی خدمت والے افسانے رکھنے چھوڑ دیے یار۔۔۔!''

''کیوں۔۔۔؟''

''متعدد جرائد صرف شہرت کی بھوک میں نکالے گئے ہیں' ناکام افسانہ نگار' شعراء اور دیگر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرنے والے جب کوئی قابلِ قدر تخلیقی کام نہیں کر پاتے تو شہرت اور اپنی بقا کے لیے گلی گلی ادبی جرائد کی دکان سجا کر بیٹھ جاتے ہیں۔''

''سٹاک میں اس وقت کون کون سی ورائیٹی ہے۔۔۔؟''

''چند افسانے ساٹھ والی دہائی جیسے پڑے ہوں گے۔کہانی پن والے بھی ہیں لیکن زیادہ ڈیمانڈ ان دنوں تیسرے درجے کی بازاری کہانیوں اور افسانوں کی ہے۔ڈائجسٹ دھڑا دھڑ بکتے ہیں۔ان کی سیل اور مارکیٹ بھی ہے۔''

''اور شاعری کی کیا کیا ورائٹی ہے۔۔۔؟''

''شاعری مسئلہ نہیں ہے وہ تو آرڈر پر ہم رات بھر میں پوری کتاب تیار کرا لیتے ہیں۔''

''ناول یا افسانہ۔۔۔؟''

''ناول کے خریدار بہت کم ہوتے ہیں۔''

''اور افسانہ۔۔۔؟''

''یار کہا ہے۔۔۔نا' تم خود افسانہ نگار ہو۔تمہیں مارکیٹ کا مال پسند نہیں آئے گا۔ہمت کر کے خود ہی لکھ لو۔''

''وہ تو میں لکھ لوں لیکن افسانہ تراشنا پورے وجود کو کاٹ دینے کا عمل ہے۔انسانی وجود پتھر کی مانند کاٹنا آسان ہے کیا۔۔۔؟''

''تم کہہ رہے ہو نیا ادبی جریدہ ہے۔اسے کوئی سی کہانی گھسیٹ کر بھیج دو۔''

''نہیں یار یہ مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔تم اعلیٰ کوالٹی کے افسانے کیوں نہیں رکھتے۔۔۔؟''

''افسانہ عنبر کستوری اور زعفران کی طرح مہنگا اتنا ہو گیا ہے کہ ہم نے خریدار نہ ہونے کی وجہ سے رکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔۔۔!''

''یار کوئی حل سوچو۔''

''تم اسے ساٹھ کی دہائی کا کوئی افسانہ اٹھا کر بھیج دو۔تجریدی آرٹ اور علامتی افسانے کا یہی تو کمال ہے کہ دونوں کی سمجھ نہیں آتی۔نقاد اور قاری اپنی عزت بچانے کے خوف سے چپ رہتے ہیں۔''

''نہیں یار۔۔۔!''

''ہاں تمہیں ایک مشورہ بھی تو کرنا ہے۔۔۔!''

''چائے کا دوبارہ کہو۔۔۔تمہاری مصروفیت آڑے نہ آئے تو سائیڈ روم میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

''بات بھی کر لیتے ہیں۔پہلے یہ افسانے دیکھ لو۔''

اس نے فہرست پر نظر ڈالی۔۔عجیب و غریب موضوعات تھے۔ایک پلندہ سامنے آیا۔اول تا آخر جنسی بے راہروی کے موضوعات اور تحریر

بھی بے رس۔۔۔!

''اوئے اُلو۔۔۔ایسے افسانے بھی بیچنے کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔۔۔؟''

''گزشتہ ماہ ایک نوجوان جسے افسانہ نگار بن جانے کا شوق چرایا وہ ہمارے یہاں آ نکلا۔ اسے ایسا ہی موضوع پسند آیا اور اس نے وہ پندرہ افسانے ایک لاکھ روپے میں خرید لیے۔ہم نے تیس ہزار روپے اپنے قلم کار کو پیش کیے اور ہمارا پرافٹ ستر ہزار روپے رہا۔''

''یہ زیاتی نہیں ہے کیا۔۔۔؟''

''کیا بات کرتے ہو۔۔۔!افسانہ تو اپنی جگہ تم بڑے عرصے بعد آئے ہو۔دنیا ہی بدل گئی ہے۔دنیا پل پل بدل رہی ہے اس لیے تو تمہیں مشورہ دیا ہے۔شہر کا چکر لگانے میں اتنی دیر نہ کیا کرو۔اب ہمارے سٹور میں ضمیر کا اسٹاک بھی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''ہمارے مارکیٹنگ منیجر کی اطلاع ہے کہ اس شہر میں ایک عرصے سے لوگ اپنا ضمیر بیچ رہے ہیں اور ضمیر بھی سستے داموں۔ہم نے سوچا کیوں نہ انھیں عراقی کرنسی کی طرح کوڑیوں کے مول خرید لیں شاید کسی روز قسمت یاوری کرے اور انسانوں کو زندہ رہنے کے لیے دوبارہ ضمیر کی ضرورت پڑے تو پھر ہم منہ مانگے دام کھرے کر لیں گے۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے بغیر ضمیر کے ہی یہ نظام چلتا رہے اور یہ انوسٹمنٹ ضائع ہو جائے۔''

''ناممکن۔۔۔انسان اس جوہر کے بغیر زیادہ عرصہ Survive نہیں کر سکتا۔ ہمارا یقین ہے ایک روز ہماری انوسٹمنٹ ہمیں Big Profit دے گی۔یوں بھی سٹاک باکس میں ضمیر ضائع نہیں ہوتے۔یہ پانی کی طرح ہوتے ہیں جو برف بن جاتا ہے ہماری مشین امپورٹڈ ہے۔''

اس کے دوست نے ساتھ والے کاؤنٹر پر کھڑے بزرگ سیلز مین سے کہا:

''انکل۔۔۔آپ ادھر بھی نگاہ رکھیے گا میں دو منٹ سائیڈ روم میں اپنے دوست کے ساتھ غم بانٹ لوں۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے ساتھ سائیڈ روم میں داخل ہوا آرام دہ صوفے میں دھنستے ہوئے اس نے پوچھا:

''خیریت تو ہے نا۔۔۔؟''

''ہاں یار خیریت ہی ہے۔۔۔''

''یہ تمہارے چہرے پر پسینہ کیوں اُتر آیا ہے۔۔۔؟''

''میں کیسے کہوں۔۔۔وہ۔۔۔وہ۔۔۔بات۔۔۔یوں۔۔۔ہے۔۔۔!''

''اب بول بھی چکو۔''

''میں یار۔۔۔وہ۔۔۔افسانے۔۔۔؟''

''کھل کر کہو۔۔۔''

''افسانے۔۔۔بیچنا چاہتا ہوں۔''

''ایسی بھی کیا مجبوری ہے۔۔۔تمہارا تو یہ مزاج ہی نہیں ہے۔''

''بس یار۔۔۔وقت کی رفتار نے توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے۔۔۔!''

''وعدہ نہیں کرتا کوشش کروں گا کہ تمہارے افسانے مہنگے داموں بک جائیں۔۔۔!''

''تم ہمارے ساتھ Agreement کرلو۔ میں سٹور کے مالک سے بات کرتا ہوں تمہارے افسانوں پر ہم ففٹی پرسنٹ دیں گے۔کل ایک خاتون آئی تھی۔میرے خیال میں وہ منہ مانگی قیمت دینے پر راضی ہو جائے گی۔وہ بھی ایسے ہی افسانے تلاش کر رہی ہے جیسے تم لکھتے ہو۔شوق ناموری میں اگر پانچ لاکھ پر وہ کتاب کے لیے راضی ہوگئی تو تین لاکھ تمہارا اور دو لاکھ ہمارا۔۔۔!یہ رعایت صرف تمہارے لیے یعنی تخلیق تمہاری اور تختی اس خاتون کے نام کی۔۔۔؟''

''یہ تو بزنس ہے نا یار۔ تم دیکھو تعلیم اور علاج مکمل طور پر کمرشلائیز ہو گئے ہیں۔ منہ مانگی فیس' انگلش میڈیم میں نیویارک کا کورس' اور کاپیوں کتابوں کا بزنس الگ Profitable ہے۔ اس دور میں جب ہر چیز کمرشلائیز ہو گئی ہے تم اپنے افسانے کو لے کر بیٹھے ہو۔''

''یار۔۔۔ میں مرنے کے بعد اپنے کتبے پر قلم فروش نہیں لکھوانا چاہتا۔''

''ابھی وہ محوِ گفتگو تھے کہ سائڈ روم کے شیشے میں سے انہوں نے دیکھا' ایک دراز قد خاتون سٹور میں داخل ہوئی۔ اس کے کندھے پر پرس جھول رہا تھا اور شیمپو کے اشتہارات کی طرح اس کی زلفیں کھلی تھیں۔ وہ خاتون سیدھی اسی کاؤنٹر پر آئی جہاں پہلے وہ کھڑے تھے۔ وہ کیبن سے کاؤنٹر کی طرف آئے۔''

''میرے کام کا کیا ہوا۔۔۔؟'' خاتون نے سوال کیا۔

''ہمیں ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی' اُمید کی ایک کرن ہے۔''

''وہ کیا۔۔۔؟''

''یہ میرا دوست ہے اس کے افسانے صفِ اوّل کے ادبی جرائد میں چھپتے ہیں لیکن یہ کسی قیمت پر راضی نہیں ہوگا۔۔۔!''

''اب خاتون کا روئے سخن اس کی جانب تھا۔''

''آپ کے لیے کیا مشکل ہے آپ پندرہ سے بیس افسانے دے دیجئے اور قیمت بتایئے۔۔۔؟''

''خاتون۔۔۔ فن اتنا سستا نہیں' اسے بے جان کرنسی نوٹوں سے آپ مت تولیے۔۔۔!''

''ابھی کل ہی انہوں نے مجھے شاعری کی ایک کتاب دکھائی ہے۔''

''شاعری کی بات اور ہے اور وہ بھی صرف تیسرے درجے کی شاعری۔۔۔ وہ بکتی ہے مان لیا۔۔۔ خاتون معیاری کھرا اور سچا ادب کہیں بھی آپ کو کروڑوں روپے میں بھی دستیاب نہیں ہوگا۔ جب آپ اپنے اندر سے اپنا غم باہر کھینچ لائیں گی اور اسے آپ کو رقم کرنا آ جائے گا تو آپ قلم کار ہو جائیں گے۔''

اس نے گھڑی دیکھی رات کا ایک بجا تھا۔

اسے اچانک اپنے اس افسانے کا خیال آیا جسے وہ میز پر چھوڑ آیا تھا۔ وہ نامکمل افسانہ۔۔۔! اس نے سوچا وہ تو اپنی تکمیل کو میرا منتظر ہوگا لیکن نہیں وہ افسانہ تو اس کے باطن میں موجود تھا۔ اس نے افسانے کی دھڑکن سنی۔ سماعت پر الفاظ کی دستک تھی۔ عجب گھڑی تھی وہ رات کی۔ سوچ کا سرا اس کے ہاتھ سے پھسل رہا تھا اس کے پاس سلجھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اندھی گونگی سوچوں میں کھو گیا۔ ایک لمحے کو اسے ایسے لگا وہ موجود ہی نہیں ہے' وہ گرد و پیش سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ اس نے ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ وہاں سپر سٹور تھا' اس کا دوست اور نہ ہی وہ خاتون۔۔۔! یا خدا۔۔۔ معاملہ کیا ہے۔۔۔؟ میں کس دیار میں کھڑا ہوں۔۔۔؟ یہاں سے وہاں تک دھول اُڑ رہی ہے۔ میری نظر کا دھوکا ہے کیا۔ ابھی تو اتنی چہل پہل تھی۔ اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔۔۔

کیا میں گھر کے برآمدے میں کھڑا ہوں۔ یہ میرے اس دوست کا گھر تو نہیں جہاں میں نے پہلی رات قیام کیا تھا۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ میں تو کسی بھی منظر میں نہیں ہوں۔ کیا میں گاؤں سے شہر پہنچا بھی ہوں۔۔۔؟ یہ سب منظروں کو ہوا کیا ہے۔ میں موجود ہوں' نہ میرا افسانہ موجود ہے۔ خرید و فروخت کے سلسلے میں کس کے ساتھ کر رہا تھا۔۔۔؟ وہ خاتون کون تھی۔۔۔؟ کیا اس سے بات ہو گئی تھی۔۔۔؟ کیا میرا دوست مجھے دھوکا تو نہیں دے گیا۔۔۔؟ ایک دم سے میں اتنا بے اعتماد کیوں ہو گیا ہوں۔ میرا مسئلہ کیا ہے۔۔۔؟ یہ مجھے کیسی اُلجھن نے گھیرا ہے۔ یہ اس شہر کے لوگوں نے ضمیر کیوں بیچ دیئے؟ کیا یہ ضروری تھا کہ میں افسانہ بیچنے سے پہلے اپنا ضمیر بیچتا۔ اگر ضمیر کا سودا طے کر لیتا تو پھر قلم کا کیا ہوتا۔ میں تو زندہ رہنے کے لیے لکھنے کے عمل سے گزرتا ہوں۔ کیا میرا ضمیر کمزور تھا کہ میں نے سفر باندھا اور اس کام کا ارادہ کیا جو مجھے کر گزرنا تو دُور کی بات سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔۔۔ یا مجھے اپنے دوست سے کہہ کر اپنا ضمیر بدل لینا چاہیے تھا ایسا ضمیر جس میں دراڑ آ جائے وہ کیا ضمیر ہوا لیکن یہ سارے سوالات اپنی جگہ' یہ منظروں کو کیا ہوا۔ یہ بھی نظر کا دھوکا ہے کیا۔۔۔''

اگر' یہ نظر کا دھوکا ہے تو سچ کیا ہے۔۔۔؟
ایک لمبی سڑک تھی سوالات کی' تا حدِ نظر پھیلی' وہ کہاں پہنچا۔۔۔؟

اسے یوں محسوس ہوا وہ صحرا میں کھڑا ہے اور اسے واپسی کا سفر درپیش ہے۔ اسے یہ سفر آبلہ پا طے کرنا ہے۔ ایک لمحہ رُک کر اس نے اپنے ذہن کی تختی پر لکھے افسانوں کی تعداد شمار کی کہ کہیں وہ کوئی افسانہ بیچ تو نہیں آیا۔ افسانوں کی تعداد پوری تھی۔ وہ آبلہ پا چلتا رہا۔ اسے اپنے سفر کا دورانیہ معلوم نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا سفر کی سمت اور دورانیہ ہمیشہ نامعلوم رہتا ہے۔ انسان کا کام بس چلتے رہنا ہے۔ وہ کئی صدیوں سے صحرا پاٹنے کی کوشش میں ہے۔ وہ منزل کا بھی متلاشی نہیں۔ زمین کا رنگ پہلے سرخ ہوا اب وہ تانبے میں بدل گئی ہے۔ افسانہ سلگ رہا ہے اور سلگتے افسانے کو اپنی مٹھی میں دبائے وہ چلتا جا رہا ہے۔ اس کے پاس اتنی مہلت بھی نہیں کہ وہ پلٹ کر دیکھ لے۔

سپر سٹور موجود ہے۔
افسانے بک رہے ہیں۔
ادب میں اندھیر نگری ہے۔
گنتی کے چند ادبی جرائد کے علاوہ تمام ادبی جرائد دکانیں سجائے بیٹھے ہیں۔ ڈالر' پاؤنڈ' یورو' درہم اور دینار ان کا ایمان ہے۔
ضمیر کے بغیر نظام چل رہا ہے۔
زمین پر خرید و فروخت جاری ہے۔
لیکن افسانہ نگار جانے کس سفر پر نکلا ہے کہ واپسی کا رستہ ہی بھول گیا ہے۔

حامد سراج کا فن۔ چند آراء

محمد حامد سراج نے ادب کی ان شاہراہوں کو رونق افروز کیا ہے' جس کے راہ رووں کو یہ علم ہی نہیں ہوتا کہ وہ پامال اور فرسودہ ''کلیشوں'' کی پرورش کر رہے ہیں۔ افسانہ حامد سراج پر آیاتِ آسمانی کی طرح اُترا۔ تجریدی اور علامتی افسانے کے دَور کے بعد اس میدان میں حامد سراج کی آمد بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ خدا کرے اس تخلیقی مدار میں اس کی چمک اندھیرے میں جگنو کے مماثل نہ ہو بلکہ اس کی فنی روشنی چودھویں کے ماہتاب کی صورت اختیار کرے جو اندھیری رات کو فروزاں رکھتا ہے۔

محمد حامد سراج زندگی کو مقصد' مرکز اور مناط مان کر افسانہ لکھتا ہے' یوں کہ وہ دھڑکنوں سے معمور قاری کا دل بن جاتا ہے۔ وہ بامعنی کہانی پر ایمان رکھتا ہے اور Absurdity کو متن کا کفر گردانتا ہے۔ اس نے اپنے ہمہ گیر مشاہدے کی بے پناہ قوت' ایقانی جرأت اور تخلیقی توانائی سے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو اپنے پڑھنے والوں کو اندر سے بدل کر رکھ دیتی ہیں۔ محمد حامد سراج کو گزشتہ ربع صدی میں سامنے آنے والے تخلیق کاروں کی اس پیڑھی کا اہم نمائندہ گردانتا ہوں۔ جنھوں نے فن پارے' تخلیقی جمال' معنویت اور امکانات کو ایک ساتھ برت کر کہانی پر قاری کا اعتماد بحال کیا ہے۔

محمد حمید شاہد

ہندوستان میں محمد حامد سراج کے افسانوں کے ہندی تراجم کا معتبر ادبی جرائد میں تواتر سے شائع ہونا مستند اور تخلیقی سطح پر اس کے کامیاب افسانہ نگار ہونے پر دال ہے۔

مشرف عالم ذوقی' دہلی

سورج مکھی

ترنم ریاض

برآمدے میں کھڑے سمیر نے بائیں جانب گردن موڑ کر پیپل کے درخت کی طرف دیکھا۔ جہاں ایک توتے نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔

''ڈیونوسم تھن(Due (Doyou) Know Somethin (Something) سمیر نے ایک نظر ندھی کی جانب ڈالی اور دوبارہ پیپل کو دیکھنے لگا۔

''اٹ مسٹ بی اے میل۔ لُکن فار ہز پارٹنر۔(It must be a male lookin (Looking) for his partner)

ان کا میٹنگ سیزن ہے نا۔''

''او۔ری اے لی۔۔۔(O. really)''

ندھی نے بھی پیپل کی طرف نظر ڈالی۔

دت صاحب اور ان کی بیگم چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگے۔ کھڑکی میں لگے شیشے کے اس پار جہاں برآمدے کی دیوار پڑوس کے گھر سے ملتی تھی۔ وہاں سمیر کھڑا ندھی سے بات کر رہا تھا۔ اس کے طویل قامت بدن پر اسکول کی وردی والی سفید قمیص تھی۔ بھوری دھاریوں والی سفید ٹائی ڈھیلی سی بندھی تھی اور رہ رہ کر ہوا میں لہرا جاتی تھی۔ سامنے درختوں کے اُوپر ہلکا نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ گو کہ دھوپ نکلی تھی مگر جنوری کے مہینے کی میدانی علاقوں میں چلنے والی ہوا خاصی ٹھنڈی تھی۔

''ہے بھگوان۔یہ۔۔۔یہ۔۔۔کیا باتیں کر رہے ہیں۔''

آپ کچھ سن رہے ہیں۔۔۔میں کہتی تھی نا کہ۔۔۔یہ لڑکا۔۔۔''

مسز دت کی آواز میں پریشانی اور تشویش صاف عیاں تھی۔

دت صاحب کھڑکی کی جانب دیکھتے رہے۔

''لولی برڈز نا؟(Lovely Birds)'' ندھی مسکرائی۔

''اویاہ۔ویری کلرفل(O. yes very colorful)''

سمیر نے مسکرا کر کہا۔ پھر وہ دونوں دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔

ندھی کے گھر کا برآمدہ نسبتاً اونچا تھا۔ وہ نازک سی بانہیں ریلنگ پر رکھے آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ شانوں پر لہراتے بال سامنے گرے آ رہے تھے۔ بالوں کے اُوپر اس نے سنہری دھاریاں ڈلوا رکھی تھیں۔ سیاہ بال اس کے ابروؤں اور سنہرے اس کی جلد سے میل کھا رہے تھے۔ سمیر باتیں کرتا ہوا انگلیوں سے اپنے بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھی مسز دت صوفے سے اُٹھ کر کھڑکی کے قریب جانے لگیں تو دت صاحب نے واپس بلا لیا۔

''وہاں مت جاؤ سمن۔دن کا وقت ہے'اس کو بھی کانچ میں سے تم نظر آ سکتی ہو۔ دیکھ لے گا' خواہ مخواہ ٹینس (Tense) ہو گا اور تمہیں بھی ٹینس کرے گا۔''

''میں سننا چاہتی تھی کہ اب ایسی باتوں کے بعد یہ چپکے چپکے کیا باتیں کر رہے ہیں۔'' وہ واپس صوفے پر آ بیٹھیں۔

''ارے ارے۔۔۔ذرا دیکھئے تو۔۔۔یہ لڑکا ہماری عزت خاک میں ملا کر رہے گا۔'' مسز دت کی آواز میں گھبراہٹ ہی گھبراہٹ تھی۔

''ذرا سَر تو اُٹھائیے اُوپر کو۔'' انہوں نے شوہر کے ہاتھ سے ٹائم میگزین کا تازہ شمارہ کھینچ کر قریب کی تپائی پر رکھ دیا۔

''آپ کی آنکھوں کا نور اس کی زلفوں پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ آپ۔۔۔ آپ آخر کچھ کہتے کیوں نہیں۔۔۔''

دت صاحب نے دیکھا تو سمیر نے اپنے بالوں میں انگلیاں پروئیں پھر ندھی کے بالوں کو ہاتھ میں لے کر گویا دیکھ بھال کر چھوڑ دیا۔ پھر دھیرے سے کچھ کہا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

''آپ پلیز کچھ کیجئے۔ نہیں تو یہ لڑکی۔۔۔ ہے بھگوان۔۔۔ چھوٹے چھوٹے کپڑے پہن کر اس لڑکی نے میرے بچے کو پھنسا رکھا ہے۔''

دت صاحب کھڑکی کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ مسز دت کا یہ جملہ سنا تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''چھوڑو بھی۔ کیوں پریشان ہوتی ہو۔ بچے ہیں۔۔۔ یاد نہیں سمیر نے کل کیا کہا تھا۔ وہ ندھی اور اس کے بوائے فرینڈ کو ٹریٹ (Treat) دینا چاہتا۔۔۔ پتا نہیں کاہے کی۔۔۔''

دت صاحب نے مسکرا کر کہا اور چائے کا آخری گھونٹ بھر کر پیالی مسز دت کی طرف بڑھائی تو وہ کیتلی سے چائے انڈیلنے لگیں۔

''دودھ ذرا کم۔۔۔''

''بوائے فرینڈ۔۔۔؟ سال میں دو تو بدلتے ہیں اس کے۔ پیرینٹس بھی اتنا فریکوئنٹلی (Frequently) جاتے ہیں۔ ایبراڈ (Abroad)۔۔۔ جوان لڑکی کو چھوڑ چھوڑ کر۔۔۔'' مسز دت نے پیالی میں شکر کا ایک چمچ ڈالا اور بہ آواز بلند چیخ چلانے لگیں۔

''ارے ارے۔۔۔ چینی نہیں بھئی۔۔۔ شوگر فری۔۔۔'' دت صاحب جلدی سے بولے۔

''اوہ۔۔۔ سوری (Sorry)۔۔۔'' مسز دت نے پیالی اپنی طرف سرکائی اور دت صاحب کے لیے دوسری چائے بنانے لگیں۔

''بچی ہے وہ۔۔۔ گھر میں ملازمہ ہے نا۔۔۔ اس کی دادی بھی تو ہے۔۔۔ پھر ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم بے کار میں پریشان ہونا چھوڑ دونا۔''

''آپ بھی حد کرتے ہیں۔ اب تو ہمارا بیٹا ہی اس کا نیا بوائے فرینڈ ہے۔۔۔ دیکھنا فیل ہو کر رہے گا۔ ٹویلتھ ہے۔ اسکول کا آخری سال۔ بورڈ ایگزیم۔ عزت سے اسکول مکمل کر لیتا' پھر جو مرضی کرتا۔ ندھی میم صاحب تو نہ بھی پڑھیں۔۔۔ کروڑ پتی باپ بیاہ دے گا کسی پیسے والے سے اسے اور ہم۔۔۔ ہم تو نوکری پیشہ لوگ ہیں' عزت والے لوگ ہیں۔ کوئی حرام کے پیسے کے بل پر تھوڑی عزت کمائی ہے ہم نے؟ پڑھنا تو ہے ہی ہمارے بچے کو ہر حال میں۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ ڈونٹ وری۔''

''ڈونٹ وری؟۔۔۔ آس پڑوس میں کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔''

''کسی کو اتنی فرصت نہیں ہے۔ سب کے اپنے مسئلے ہیں۔۔۔ تم۔۔۔ میں بلاتا ہوں اسے اندر۔۔۔ تم ذرا شانتی رکھو۔''

دت صاحب کے بلانے کی نوبت نہیں آئی کہ سمیر ندھی کو اُونچی آواز میں سی یو (See You) اور ٹیک کیئر (Take Care) کہتا ہوا اندر آ گیا۔

''بیٹا چینج (Change) نہیں کیا۔''

''نہیں ڈیڈ۔۔۔ میں آتے ہی سو گیا تھا۔۔۔ مام میرے لیے سینڈوچ بنوا دیجئے اور جوس۔۔۔ نہیں لیموں پانی بھجوا دیجئے روم میں۔ ندھی کہتی تھی میری تو ند نکل رہی ہے۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

''پریپریشنز (Preparations) کا کیا حال ہے؟'' باپ نے اس کی رفتار کے ساتھ گردن گھمائی۔

''کہاں ہوئی ہے ڈیڈ۔۔۔ کر لوں گا۔ یو ڈونٹ وری۔۔۔'' بھوری دھاریوں والے موزوں میں پاؤں گھسیٹتا ہوا وہ کمرے کی طرف گیا۔

مسز دت اسے دیکھتی رہیں۔ اسکول کی وردی والی بھوری پتلون ڈھیلے سے کمر بند کے سہارے اس کے کولہوں پر اٹکی تھی۔ ایڑیوں کے نیچے سے کنارے کثرت سے گھسیٹے جانے کے باعث تار تار ہو چکے تھے۔

''یہ ٹراؤزرس کا حال ہے۔ کوئی ذرا سا پائنچہ کھینچ لے تو سب کچھ نظر آنے لگے۔ اتنی نیچے پہنی جاتی ہے پینٹ۔۔۔ کیا عجیب سا فیشن ہے

یہ۔۔۔''مسز دت نے ہونٹوں کو خم سا دیا۔ ساتھ میں ناک بھی مڑی۔

''یہ جنریشن ایکس ہے میڈم۔۔۔''مسز دت خوشگوار انداز میں بات کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب کہ صاحبزادے کی نامکمل تیاری کی داستان سن کر پریشان سے ہو گئے تھے۔

''کچھ کھاتا بھی تو نہیں ہے۔۔۔ دیکھئے ہڈیاں نکل آئی ہیں اور میم صاحب نے کہہ دیا کہ۔۔۔ کیا گولو مولو سا تھا میرا بچہ دو سال پہلے تک۔۔۔ فاقہ کشی شروع کر دی۔''

''قد بھی بڑھ گیا ہے اس کا۔۔۔ اسی لیے پتلا لگنے لگا ہے' پھر اسٹمک (Stomach) کا فلیٹ (Flat) ہونا ضروری ہے۔۔۔ ہینڈسم ہے میرا بیٹا۔''دت صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

''ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔ صرف کمپیوٹر کے سامنے آنکھیں خراب کرتا رہتا ہے۔۔۔ بھگوان رکھشا کرے اس کی۔۔۔ سارا سارا دن چیٹنگ (Chatting) اور گیمز (Games) ہی میں جو وقت ضائع کرتا ہے نا۔۔۔ پڑھنے میں لگائے تو گولڈ میڈل ملے اسے۔''

''اپنے بچے کو انڈر ایسٹی میٹ (Underestimate) مت کیا کرو۔ دیکھا نہیں کتنا انفارمیٹو (Informative) ہے۔ کسی بھی ٹاپک (Topic) پر بات کر لو۔۔۔''

''اور نہیں تو کیا۔۔۔ ایک بس اپنے کورس کی کتابیں نہیں پڑھتا۔ ایک بار فیل ہو گیا نا تو ساری انفارمیشن دھری رہ جائے گی۔''

مسز دت نے چائے کے برتن کشتی میں سمیٹ لیے اور ملازم کو آواز لگائی۔

دت صاحب باغیچے میں آ کر کنارے سے لگے گملوں میں جھانکنے لگے۔

''ہائے انکل۔۔۔''ندھی اپنے برآمدے میں پنجوں کے بل کھڑی ہو کر بولی۔

''ہائے بیٹا۔۔۔ کیسی ہو۔''دت صاحب نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر گملوں کی طرف جھک گئے۔

''وری گڈ۔۔۔''وہ چہکی۔

دت صاحب نل میں پائپ لگا کر پودے سینچنے لگے۔ کونے میں لگے سورج مکھی کے پودے میں ایستادہ اکلوتا پھول دت صاحب کی طرف سے منہ پھیر کر سورج کو دیکھ رہا تھا۔ دت صاحب پائپ سنبھالے اسی طرف بڑھے۔۔۔

کتنی جلدی بڑے ہو جاتے ہیں یہ بچے۔ انہوں نے پہلے پھول کو دھویا اور پھر پودے کے باقی حصے کو سیراب کیا۔۔۔

کل تک ننھی منی ٹانگوں اور موٹے موٹے بلیزرس (Blazers) پہنے دونوں اس نیم کے ساتھ لگے اسکول بس کا انتظار کرتے ایک دوسرے کو مارتے پیٹتے' ہنستے روتے تھے۔ درخت سے کوئی نبولی ندھی کے کندھے پر ٹپ سے آ گرتی تو وہ سمیر کے شانے پر ایک چپت رسید کرتی۔ وہ رونے لگتا اور کہتا کہ اس نے پھینکی ہے اور پھر پھینکے گا۔ جب پھینکوں گا پھینکوں گا کا ورد کرتا تو وہ مار کر بھاگنے کی بجائے اس کی طرف دوڑ پڑتی تو وہ بھی دو اک چپتیں لگا کر ہی چین سے بیٹھتا۔ کبھی کبھی اسکول بس بھی آ چکتی اور بدلہ باقی رہ جاتا۔ ایسی صورت میں اسکول کے بعد تک بول چال منقطع رہتی۔ پھر دونوں میں سے کوئی معافی مانگ لیتا' وہ بھی گھر کی مداخلت کے بعد۔۔۔ اور پھر دوبارہ وہی سلسلہ چل نکلتا۔

دت صاحب پودوں کو پانی دیتے مسکراتے رہے۔۔۔ پھر پرائمری کے بعد بچے کم جھگڑنے لگے۔ بلکہ کھیلنا بھی کم ہو گیا۔ کچھ تو ہوم ورک بڑھ گیا جواب ماؤں کی مدد کے بغیر خود کرنا ہوتا تھا اور دوسرے۔۔۔ دوسرے۔۔۔

دت صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ دوسری کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ شاید عمر کے ساتھ سمیر میں سنجیدگی اور ندھی میں متانت آ گئی تھی۔ ذہن میں انہوں نے 'سنجیدگی' اور 'متانت' نہیں کہا تھا بلکہ (سیریس نیس (Seriousness) اور ہیومیلیٹی (Humility) جیسا کچھ سوچا تھا)

مگر ادھر دو ایک برس سے دونوں پہلے کی طرح ساتھ ساتھ وقت گزارنے لگے تھے۔

دت صاحب نے پپیتے کے پیڑ کی طرف پائپ جھکا کر تنے کو دھوتے ہوئے سوچا تو خود کو بند لبوں سے بے آواز قہقہہ لگاتے بھی سنا' اس

لیے کہ قہقہہ ان کی ناک سے اُونچی آواز کی سانس بن کر پھسلا تھا۔ انہوں نے چونک کر پڑوس کے برآمدے کی طرف نظر ڈالی۔ ندھی وہاں نہیں تھی۔ وہ اطمینان سے دوبارہ کام میں مصروف ہوگئے۔

ندھی جب چھوٹی تھی تو گول مٹول سی تھی۔ چہرے کے خال وخد بھی گول گول سے تھے۔ چھوٹی سی گول گول ناک' گول گول آنکھیں' گول گول رخسار اور گول گول ہونٹ۔ مگر عمر کے ساتھ اس کا قد بڑھا تو چہرہ گول کم اور بیضوی زیادہ نظر آنے لگا۔ ناک ویسی ہی چھوٹی سی جیسے کوئی تتلی عین ناک کی جگہ پر آن بیٹھی ہو۔ آنکھیں بھی لمبی سی لگتی تھیں جیسے دو روپہلی مچھلیاں منہ پاس پاس کیے تیر رہی ہوں۔ ابرو اونچے اور پیشانی کھلی کھلی سی۔ اس نے لپ اسٹک لگانا سیکھ لیا تھا۔ اُجلے اُجلے چہرے پر لاجوردی رنگ کی لپ اسٹک لگا چھوٹا سا دہانہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے سفید کاغذ پر روشنائی کا قطرہ گرادیا ہو۔۔۔

مسز دت کو وہ عزیز رہی تھی مگر بڑے ہوتے ہی اس کے چھوٹے چھوٹے پہناوے دیکھتے ہوئے مسز دت کی غالبًا لاشعوری کوشش ہوتی کہ سمیر کا اس سے ملنا جلنا کم ہو۔ حالانکہ دونوں ہم جماعت تھے اور دونوں کے دوست بھی ساجھے تھے۔ مسز دت کبھی سر جھٹک کر سوچتیں۔ کبھی وہ بھی اس کے گھر آ رہا ہے' کبھی تشار اسکول سے گھر چھوڑ دیتا' کبھی اظہر اپنی گاڑی میں ٹیوشن کے لیے پک اپ کر رہا ہے اور کبھی کوئی موٹر سائیکل سوار لڑکا پھٹ پھٹ کرتا اسے دت صاحب کے گیٹ کے قریب ہی ڈراپ کر رہا ہے۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ رہتی اور وہ دونوں زور زور سے باتیں کرتے انجن کے شور میں اور اضافہ کرتے۔ بلکہ اب تو اکثر اسکول سے لوٹتے وقت دونوں کی بس مس ہوجاتی اور سمیر برائے نام کتابوں کی لمبی سی پٹی والا بستہ دربان کی طرف پھینک کر ندھی کے وہاں چلا جاتا۔

''بہادر اندر لے جا۔'' سمیر کی آواز آتی تو مسز دت دانت بھینچ لیتیں۔ آنے دے اپنے ڈیڈ کو تو۔۔۔ وہ زیر لب کہتیں۔۔۔ اور باہر جا کر دربان سے بستہ لے کر اندر آجاتیں۔

''تو کہہ نہیں سکتا کہ بیگ گھر میں رکھ دے خود جا کر۔'' مسز دت اندر جاتے جاتے پلٹ کر دربان کو ڈانٹتیں۔

''کیشے بولے گا میم شاب۔۔۔ شمیر شاب ایک شیکنڈ میں اُترا۔ بیگ فناک شے پھینکا اور باجوا لے گھر میں۔۔۔'' دربان گیٹ بند کرتے ہوئے کہتا مگر پوری بات سننے سے پہلی ہی مسز دت گھر کے اندر پہنچ چکی ہوتیں۔

''مین شاب کا بچہ۔۔۔ گدھا۔۔۔ تیری بھی چھٹی کرواؤں گی۔'' وہ من میں دُہراتیں اور کھانا لگواتیں۔

''بھگوان ہی رکھشا کرے اب میرے بچے کی۔۔۔ کسی کو پرواہ نہیں ہے اس کی اب۔۔۔ یہ لڑکی۔۔۔ یہ لڑکی۔۔۔'' وہ دت صاحب کو اندر آتا دیکھ کر کھانے کی میز کے قریب کرسی ذرا سا سرکاتیں۔

''ٹینشن پرون (Tension Prone) ہے میری بیوی بھگوان۔ اس کی بھی رکھشا کرنا۔'' دت صاحب مسکراتے۔

''اسے تم پر بھروسہ ہوتا تو اتنی پریشان نہ ہوتی پربھو۔'' وہ قہقہہ لگاتے۔

''دیکھ لیجئے گا۔۔۔ آپ خود بھی پچھتائیں گے ایک دن۔۔۔ دل گھبراتا رہتا ہے میرا تو۔۔۔ پتا نہیں کیا ہوگا۔'' اور پتا نہیں کیا ہونے کا وقت آیا ہی چاہتا ہے۔

مارچ کے مہینے کی ایک زیادہ ہی گرم دوپہر تھی۔ اسکول کی بس کے آنے کا وقت جانے کب کا نکل چکا تھا۔ سمیر کا کہیں پتا نہ تھا۔ پڑوس میں معلوم کیا تو ندھی کی دادی بھی ندھی کے گھر نہ پہنچنے سے پریشان تھیں۔ مسز دت بے چینی سے پھاٹک کے آس پاس ٹہل رہی تھیں۔ صبح سمیر نے کہا تھا کہ اس کا موبائل ریچارج کروادیں۔

''مام صرف ہنڈریڈ روپیز کا ڈلوادیں۔۔۔ فون کا ان کمنگ بھی بند ہوگیا ہے۔۔۔ ڈسکنکٹ ہونے والا ہے۔'' وہ جوتے کے فیتے باندھتا بولا تھا۔

''یہ جوتے ذرا صاف نہیں کر سکتے۔۔۔ لاؤ مجھے دو۔۔۔''

''او مام۔۔۔ دِس را لُک اِس اِن (This raw look is in)'' اس نے جیسے کہ بے زاری سے کہا تھا۔

''یہ فیشن میں ہے؟۔۔۔ یہ گندے جوتے اور تم۔''

''کم آن ماما۔ گیومی سم منی (Comeon mama give me some money) دیں گے کہ جاؤں میں۔ لیٹ ہو رہا ہوں۔''

''اسکول سے آ جاؤ پھر۔۔۔'' مسز دت نے کہا تھا۔ تین دن پہلے پانچ سو کا کارڈ ڈلوایا۔۔۔ ایک رات میں ختم۔۔۔ فضول میں جانے کیا SMS اور باتیں۔۔۔ وقت بھی برباد اور پیسہ بھی۔ دو ہفتے ٹالوں گی اسے۔۔۔ انہوں نے صبح دل میں سوچا تھا' مگر اس وقت سمیر کے فون پر اس کی آواز کے بدلے ''نمبر استھائی روپ سے سیوا میں نہیں ہے۔'' سن کر انھیں مزید تشویش ہو رہی تھی۔

نیم کی چھاؤں تلے دبلی باہوں والی دھوبن لوہے کی بھاری استری پھرتی سے ادھر اُدھر سرکا کر خاموش دوپہر کو آواز بخش رہی تھی۔ اندر فون کی گھنٹی بجی تو مسز دت لپک کر پہنچیں۔

''ماما۔۔۔ سوری۔۔۔ میں لیٹ ہو گیا۔۔۔ لیٹ ہو جاؤں گا۔'' سمیر کی آواز تھی۔ مسز دت کی جان میں جان آئی۔۔۔

''ہو کہاں تم؟۔۔۔'' انہوں نے تیز آواز میں پوچھا۔

''اسپتال میں۔۔۔ ہوں۔۔۔ وہ میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔۔۔ آپ آ سکتی ہیں؟۔۔۔ ویسے میں ٹھیک ہوں۔ شاید کچھ ٹانکے وغیرہ لگیں گے۔ بس اور کچھ۔۔۔''

''ارے' کہاں۔۔۔ بیٹا۔۔۔ کہاں ہو تم۔۔۔ ٹھیک تو ہو نا۔۔۔ میرے بچے میں ابھی آئی۔ کون سے ہاسپٹل میں۔۔۔ ابھی تک کیوں نہیں کیا تھا فون۔''

آواز میں لائی ہوئی تیزی پل بھر میں غائب ہو گئی۔

''پوچھتا ہے آ سکتی ہوں؟'' وہ نم آنکھیں جھپک کر زیر لب بڑبڑائیں۔ سمیر کا سارا چہرہ خون آلود تھا اور اسکول کی وردی وہی سفید قمیص خون سے سرخ بلکہ سیاہی مائل ہو چکی تھی۔ اس کا داہنا ابرو پھٹ گیا تھا اور سارا جسم چھل سا گیا تھا۔ دوسری طرف کوئی گہری چوٹ نہیں تھی۔

دت صاحب اس دن شہر سے باہر تھے۔

''کسی سے لفٹ لی تھی میں نے بائک پر۔۔۔ اس نے بریک لگائی تو میں گر گیا سڑک پر۔'' اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں ماں کو بتایا۔

مسز دت کی آنکھیں بھیگتی رہیں۔۔۔ ان کے چہرے پر ایسا کرب تھا جیسے تکلیف خون ان کو ہو رہی ہو۔۔۔ تم کب اتنے بڑے ہو گئے بیٹا۔۔۔ وہ زخمی ابرو پر جمع ہو چکے خون کو دیکھنے لگیں۔ ابھی تک فسٹ ایڈ نہیں ہوا تھا اور مزید ایک مصیبت منتظر تھی۔

موٹر سائیکل سوار نے جس آدمی کی خاطر بریک لگایا تھا وہ بھی کچھ زخمی تھا اور اس آدمی کا ساتھی اس بات پر بضد تھا کہ موٹر سائیکل سمیر ہی چلا رہا تھا پولیس بھی آ گئی مگر چونکہ موٹر سائیکل برآمد نہیں ہوئی اس لیے ثبوت کوئی نہیں تھا۔ مگر ایک گواہ کی وجہ سے خاصی پریشانی کا سامنا تھا۔ پولیس کا دعویٰ تھا کہ وہ گھنٹے بھر میں بائک برآمد کر کے کیس مضبوط کرے گی۔ سمیر کو دن بھر اسپتال میں رکھ کر گھر روانہ کیا گیا۔ مگر پولیس نے پیچھا نہ چھوڑا اور پوچھنے چلی آئی کہ سمیر کی موٹر سائیکل کہاں ہے۔ مگر سمیر کے پاس موٹر سائیکل تھی ہی نہیں۔۔۔ مسز دت بڑی شرافت سے کہتیں کہ ان کے بیٹے کے پاس بائک کبھی تھی ہی نہیں مگر خدا جانے پولیس کو کیا چاہیے تھا۔

''آپ پہلے موٹر سائیکل ٹریس (Trace) کریں پھر آئیے۔'' ندھی نے ان سے ایک دن مضبوطی سے کہا تو پولیس دوبارہ نہیں آئی۔ ندھی سمیر کو برابر دیکھنے آتی تھی۔

سمیر کے جس ابرو پر چوٹ لگی تھی وہ آنکھ کچھ دن بند رہی۔ چہرہ اس طرف سے سوج کر نیلے رنگ کا ہو گیا تھا۔ پھر کچھ دن بعد نیلاہٹ سرخی مائل سی ہو گئی۔ اس کے بعد بینگنی رنگ نظر آنے لگا۔ رنگ بدلتے رہے۔ ندھی مسلسل آتی رہی۔ کبھی ڈریسنگ کرنے آ رہی نرس کے ساتھ کھڑی پٹی بدلوا رہی ہے' کبھی شوربہ بنوا رہی ہے۔ میوزک سسٹم کے لیے نئی' سی ڈیز لا رہی ہے۔ اسکول سے سیدھا سمیر کے گھر یعنی سمیر کے کمرے میں پہنچ کر دن بھر اسکول میں آنکھوں دیکھا' کانوں سنا اور کاپی پر لکھا گیا حال بیان کیا جا رہا ہے۔ سمیر کی مزاج پرسی کے لیے آ رہے اسکول کے دوستوں کی مہمان نوازی میں مسز دت کو مشورے بھی دیے جا رہے ہیں کہ کون چائے کافی لے گا اور کون شربت اور کوک وغیرہ۔

جس دن سمیر کے ٹانکے کھولے گئے وہی اس کی مسہری کے پاس کھڑی اپنے نازک سے شانے سے اس کا سر لگائے اسے حوصلہ دیتی رہی اور گھر میں ناریل کا تیل ڈھونڈتی رہی۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہو ندھی؟'' مسز دت نے اسے ایک غسل خانے سے دوسرے اور اپنی سنگھار میز کے آس پاس آتے جاتے دیکھا۔

''آنٹی ناریل کا تیل۔۔۔ دادی نے کہا ہے کہ اس سے سمیر کے آئی برو (Eye Brow) پر ٹانکوں کے داغ نہیں رہیں گے۔'' وہ اُدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔

''سمیر کے ہی باتھ روم میں ہوگا بیٹا'' دت صاحب نے کہا تو وہ تھینک یو انکل کہہ کر چلی گئی۔

دت صاحب نے بیوی کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر زور سے قہقہہ لگایا۔

''تمہاری سچ مچ کی بہو بھی ایسی سیوہ نہ کرتی اس کی۔'' انہوں نے دھیرے سے کہا۔

''ارے آپ تو۔۔۔ وہ سب تو چلئے۔۔۔ مگر اس کی یہ یونیفارم۔۔۔ یہ اسکرٹ ہے یا شارٹس (Shorts) ان کو اسکول میں کچھ کہتے نہیں؟ ایل مینک (Almanac) میں تو صاف لکھا ہے کہ گھٹنوں تک کی لمبائی والا اسکرٹ پہنا جائے۔''

''ارے اس کا قد نکل آیا ہے۔ معصوم بچی ہے۔۔۔ پھول سی۔۔۔ تم بس۔۔۔ یہی فیشن ہوگا۔''

''ہاں شاید۔۔۔ مگر ہمارے گھر میں ان کپڑوں میں۔۔۔''

''تو کیا اسکول میں بھی تو ان کپڑوں میں ساتھ ہوتے ہیں یہ لوگ۔۔۔ اور وہاں تو اور بھی لڑکیاں ہوں گی ایسے لباس والی۔۔۔ تم کس کس سے دور رکھوگی اس کو۔۔۔ بڑا ہو گیا ہے وہ۔۔۔ ایک ذہین دماغ اس کے پاس بھی ہے۔۔۔''

''بڑا کہاں ہوا ہے۔۔۔ ۱۷ برس کا نابالغ بچہ ہے۔۔۔ اور آپ۔۔۔''

''قانونی طور پر نابالغ سہی مگر سمجھ دار ہے۔۔۔ جو تربیت ہم نے دی ہے وہ ضائع تھوڑی ہوگی۔۔۔''

''پھر کہنا کیوں نہیں مانتا پہلے کی طرح۔۔۔''

''یہ ٹین ایج ہے اس کی۔۔۔ اس میں بچے دوستوں کے مشورے زیادہ مانتے ہیں۔۔۔ ہم بھی ایسے ہی تھے۔ ہر دور میں پیرینٹس (Parents) ایسا ہی کرتے ہیں۔۔۔ وہ خود کو بڑا سمجھتا ہے اور تم اسے بچوں کی طرح ٹریٹ (Treat) کرتی ہو۔ تم اسے بظاہر اپنے برابر سمجھ کر ڈیل (Deal) کرو۔۔۔ کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔''

''مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔۔۔ میں تو چاہتی ہوں کہ اسے کوئی پرابلم نہ ہو۔''

سمیر اچھا ہو گیا۔۔۔ اسکول جانے لگا تو زندگی میں پہلے کی طرح ضابطگی بھی آ گئی۔ مگر اچانک ندھی کی دادی انتقال کر گئیں اور ندھی جو کہ والدین کی بہ نسبت دادی سے مانوس تھی یکلخت تنہا ہو گئی سمیر اس کا ساتھ نہ چھوڑتا۔ اسکول سے لوٹتے ہی اس کے وہاں اور پھر بارہ ایک بجے کہیں گھر آتا۔ مسز دت پریشان ہو اٹھیں۔ ندھی کے ساتھ ان کی بھی ہمدردی تھی مگر اس صورتِ حال کے ساتھ وہ سمجھوتہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ گھر کی دوسری چابی سمیر اپنے ساتھ لے جاتا۔

''بیٹا۔۔۔ دیر سے آ رہے ہو۔۔۔'' ایک رات سمیر ایک بجے شب لوٹا تو مسز دت جاگ رہی تھیں۔

''بارہ بجے تک تو گورو بھی تھا۔۔۔ مگر اس سے سنبھلتی ہی نہیں۔ وہ پھوہے وہ ایک دم۔۔۔ میں اُٹھنے لگتا تو رو پڑتی۔۔۔ بڑی مشکل سے سلایا اسے میں نے۔ جب اس کی آنکھ لگ گئی تو میں چپکے سے اُٹھا۔۔۔ اس کے پیرنٹس بھی نہیں سنبھال پاتے اسے۔ وہ پہلے ہی سو گئے تھے۔ ایکسٹرا کیز (Extra Keys) ساتھ لایا ہوں ان کی۔ نندو کے ہاتھ بھجوا دیجئے گا صبح۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ گڈ نائٹ مام۔''

''کچھ کھا تو لو۔۔۔'' مسز دت نے جو کچھ سنا اسے سمجھنے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی بولیں۔

''ندھی نے بھی کچھ نہیں کھایا۔۔۔ مجھ سے کہاں کھایا جائے گا۔۔۔ سوری پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می ماما (Pleas dont disturb me)''

''دو دولڑ کے سلاتے ہیں اس لڑکی کو۔۔۔ کیا سے آ گیا ہے۔۔۔'' مسز دت بڑبڑاتی ہوئی اپنی خوابگاہ میں داخل ہوئیں۔

''رات کا ایک بج رہا ہوگا۔۔۔'' دت صاحب نیند کے جھونکوں میں بولے۔

''ہے بھگوان۔۔۔'' مسز دت نے اپنے ماتھے پر ہتھیلی سے ہلکی سی چپت لگائی اور بتی گل کر دی۔

اگلی رات پھر سمیر نے بارہ بجائے تو مسز دت نے فون کیا۔

''تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں ماما۔۔۔'' وہ بولا تو ساتھ ہی کسی کے دھیمے دھیمے ہنسنے کی آواز آئی۔

''یہ کس کی آواز تھی۔۔۔؟''

''او۔۔۔ یہ؟۔۔۔ ہم سب نے ندتھی کو ایک چھوٹا سا پپی لے دیا ہے۔۔۔ ڈیلمی اے شن (Delmiation) آپ دیکھیں گی تو اسے گود میں ہی لیے رہیں گی۔۔۔ اتنا کیوٹ ہے۔۔۔'' سمیر کی آواز میں خوشی سی جھلکنے لگی۔

''ندتھی روم میں اکیلی ہوگئی ہے نا۔۔۔ یہ اس کے پاس ہوگا نا تو شی ؤڈ ناٹ مس ہر گرینی (She Would not miss her granny) وہ پھر اُداسی سے بولا۔

''از دیٹ سو؟ (Is that so?)'' مسز دت نے کہا۔

''یس۔۔۔ وی ہوپ سو۔۔۔'' (Yes, we hope so)

''اچھا تم گھر آ کر کچھ کھالو۔۔۔ اگیزیمز (Exams) آ رہے ہیں۔۔۔''

''اوکم آن مام۔۔۔ اسے سلائے بنا ہی کیسے آؤں۔۔۔''

''اس کا وہ فرینڈ کہاں ہے۔۔۔ گورو۔۔۔؟''

''وہ۔۔۔ اسٹیوپڈ (Stupid) ہے۔۔۔ چلا گیا۔۔۔ سلا نہیں پایا اسے۔۔۔''

''کوئی جانے لگتا ہے تو رونے لگتی ہے۔۔۔''

''اب تم کب تک اسے چپ کراتے رہوگے۔ اس کے ماں باپ تو ہیں وہاں۔۔۔ یہ ان کا کام ہے۔ تم گھر آؤ۔۔۔''

''ڈونٹ بی سو ہارش (Dont be so harsh) آپ کیسے اتنی ان کائنڈ (Unkind) ہو سکتی ہیں۔۔۔ اس کے سوتے ہی آ جاؤں گا۔۔۔ آپ بڑے گملے کے پیچھے چابیاں رکھ کر سو جائیں۔۔۔ گڈ نائٹ۔۔۔'' سمیر نے فون رکھ دیا۔

مسز دت غصے سے کھولتی رہیں۔ دت صاحب آرام سے سوتے رہے۔

''آپ کیسے گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔۔۔ کیسے نیند آتی ہے آپ کو۔ آپ کا جوان بیٹا ایک اکیلی لڑکی کے کمرے میں ہے۔۔۔ اور آپ۔۔۔'' دت صاحب نے کروٹ لی۔

''اس کے پیرینٹس بھی تو ہیں گھر میں۔ کوئی اندر سے کمرہ بند کر کے تھوڑی بیٹھے ہوں گے۔۔۔ ڈونٹ وری۔۔۔ سو جاؤ۔''

''ڈونٹ وری کوئی گولی ہے کہ کھا کر سو جاؤں۔۔۔ او۔۔۔ گاڈ۔۔'' مسز دت نے کمرے سے باہر آ کر بڑے گملے کے پیچھے چابیاں رکھ دیں اور کچھ دیر بعد آخر کار سو گئیں۔ سمیر کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔

اگلے دن جب پھر رات کے بارہ بجے تو ماں نے فون کیا۔

''او ماما۔۔۔ وہ سونے لگی تھی آپ نے گھنٹی بجا کر ڈسٹرب کر دیا۔۔۔'' وہ سرگوشی میں بولا اور فون بند کر دیا۔

''ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔'' مسز دت بولیں اور دوبارہ نمبر ملایا۔

''داسبسکر ائبر ہیز سوچڈ آف ہز موبائل فون۔۔۔ پلیز ٹرائی اگین لیٹر (The subscriber has switched off his mobile phone please try again later)'' چہکتی ہوئی کمپیوٹرائزڈ نسوانی آواز آئی تو مسز دت کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ دانت پیستی ہوئی خواب گاہ میں داخل ہوئیں اور زور سے کچھ اس طرح مسہری پر خود کو گرایا کہ دت صاحب جاگ جائیں۔ مگر دت صاحب نیند میں ذرا سا کھنکارے اور خراٹے لینے لگے۔

اس کے بعد تین دن سمیر گھر پر ہی رہا کہ ندھی دادی کی استھیاں بہانے گھر والوں کے ساتھ ہری دوار گئی تھی۔ مسز دت نے سکھ کا سانس لیا۔
ندھی لوٹی تو رات کے نو بجے سمیر پھر غائب ہو گیا۔ مسز دت نے فون کیا تو بولا کہ دوست کے وہاں ہے اور ابھی آ رہا ہے۔ مگر انہوں نے کسی کے دھیمے دھیمے ہنسنے کی آواز سنی تھی۔

''آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔۔۔ آپ کا بیٹا اب جھوٹ بول کر ندھی کے گھر میں رہنے لگا ہے۔ میں نے خود کسی کے ہنسنے کی آواز سنی تھی۔'' مسز دت نے تشویشناک لہجے میں شوہر سے کہا۔

''ہنسنے کی۔۔۔ ارے بھئی وہ سوگوار لڑکی کیا ہنسے گی۔'' وہ بے بسی سے بولے۔

''دوست کے گھر میں ہی ہوگا۔''

''نہیں۔۔۔ وہ ندھی کا پلا ایسے ہی کوکوں کرتا ہے جیسے کوئی لڑکی ہنس رہی ہو۔ وشواس کیجئے۔۔۔ جی چاہتا ہے جا کر اسے کھینچ کر گھر لے آؤں اور اس لڑکی کو ڈانٹ لگاؤں۔''

''کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔ ریلیکس (Relax)۔۔۔ غمزدہ ہے بے چاری۔۔۔ وہ تمہارے ڈر سے جھوٹ بول رہا ہے کہ تم پریشان نہ ہو جاؤ۔''

''پریشان۔۔۔؟ میں تو پاگل ہو رہی ہوں اور آپ۔۔۔''

''میں کل سمجھاؤں گا اسے کہ جھوٹ نہ بولے۔۔۔''

''آپ نے سر چڑھایا ہے۔۔۔ اب میں۔۔۔ میں تو۔۔۔'' مسز دت رو پڑیں۔

''میرا بچہ بگڑ رہا ہے۔۔۔ یہ بات تشویشناک ہے۔۔۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔۔۔''

''بگڑنا ہوگا تو اب تک بگڑ چکا ہوگا۔۔۔ تمہارے فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔۔۔''

''کسی پر اثر نہیں میری بات کا۔۔۔ میں زندہ کس لیے ہوں۔۔۔'' وہ ہچکیاں لیتی رہیں۔

رفتہ رفتہ ندھی سنبھلتی رہی۔ سمیر گھر میں رہنے لگا بلکہ ایک بار ندھی اور گورو کے ساتھ کہیں باہر بھی گیا۔
امتحانات آئے تو سمیر نے پڑھائی برائے نام کی تھی جس دن حساب کا پرچہ تھا سمیر ندھی کے گھر پڑھنے گیا اور پھر آدھی رات کے قریب خود ہی ماں کو فون کیا کہ چابی بڑے گملے کے عقب میں رکھ لیں وہ تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔ جوں توں کر کے پریشان سی مسز دت کو نیند آ گئی۔ صبح کے چار بجے آنکھ کھلی تو فوراً اٹھ کر دیکھا۔ سمیر گھر نہیں آیا تھا۔

''اوہ آپ نے پپی کو جگا دیا۔۔۔ ایسا کیا ہو گیا مام۔۔۔ آپ اتنی پریشان ہو گئیں۔ ندھی مجھے پڑھا رہی ہے ماما۔۔۔ بیچاری کا خود کا بھی ایگزیم ہے۔''

''تو تم آ کر گھر میں پڑھ لو۔۔۔ اسے بھی پڑھنے دو۔۔۔''

''اس کا بھی روِیژن (Revision) ہو رہا ہے نا مجھے پڑھانے سے ساتھ ساتھ۔ میں آؤں گا تو وہ آگے کا پڑھ لے گی۔ بے چاری میری وجہ سے پڑھا رہی ہے۔۔۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''میرا تو سر پھٹ جائے گا۔۔۔ اب مجھے ندھی کے پیرنٹس سے بات کرنا ہوگی۔۔۔ بہت ہو گیا۔۔۔ اب تو بس بہت ہو گیا۔۔۔'' مسز دت بڑبڑائیں۔

سمیر اسکول جانے والا تھا کہ ندھی کا فون آیا۔ ''آنٹی سمیر کو فون دے دیجئے۔۔۔''

''کیوں کیا ہوا۔''

''کچھ بات کرنی ہے۔''

''اسکول میں کر لینا نا۔۔۔ وہ تیار ہو رہا ہے۔''

''میں نہیں دے رہی ایگزیم آنٹی۔ پڑھا رہی تھی نا اسے۔الارم رکھا تھا کہ دو گھنٹے پہلے اُٹھ کر روائز (Revise) کروں گی۔۔۔جاگی ہی نہیں۔''

''تو اب کیا کرو گی بیٹا۔۔۔کچھ تو لکھ لو جا کر۔۔۔''مسز دت کا دل یکا یک ممتا سے بھر گیا۔

''نہیں آنٹی۔۔۔ہماری کلاس ریپرزنٹیٹو میم (Class representative ma'm) نے کہا تھا کہ تم اپ سیٹ (Upset) ہو گی۔تو بعد میں دے دینا ایگزیم اور ساتھ میں میڈیکل سرٹیفکیٹ دکھا دینا۔کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔

''اچھا۔۔۔شیور (Sure) بیٹا؟''

''ہاں جی۔۔۔سمیر کا موبائل یہاں رہ گیا ہے۔۔۔اور۔۔۔''

''اچھا اچھا۔۔۔ابھی بلاتی ہوں۔۔۔''مسز دت لاجواب سی ہو گئیں اور سمیر کو بلانے اس کے کمرے کی طرف لپکیں۔

سمیر نے بھی ندھی کو سمجھانے کی کوشش کی۔وہ بائیں ہاتھ سے قمیص کے بٹن بند کر رہا تھا۔ماتھے پر آئے بھیگے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر ٹیلی فون پر گر رہے تھے۔مسز دت ممتا بھری نظروں سے عقب سے اسے دیکھتی رہیں۔

''اچھا۔۔۔؟او کے سویٹ ہارٹ۔۔۔ڈونٹ وری دین۔۔۔گوٹو سلیپ سویٹ ڈریمز (Ok sweetheart, don't worry then go to sleep, sweetheart dreems.)''سمیر نے فون رکھ دیا۔

پل بھر پہلے مسز دت کا ہمدردی بھرا دل غصے سے بھر گیا''سویٹ ہارٹ کا بچہ۔۔۔ہو جانے دے ایگزیمز۔۔۔بدتمیز کہیں کا۔۔۔''وہ دانت بھینچے باورچی خانے کی طرف گئیں۔

''بائے مام۔۔۔''سمیر نے جاتے ہوئے کہا۔

''بیسٹ آف لک بیٹا (Best of Luck)۔۔۔''وہ ایسے مسکرائیں جیسے ابھی ابھی انہوں نے غصے سے دانت بھینچے ہی نہ ہوں۔

سمیر امتحان دے کر لوٹا تو ندھی کے گھر اس خیال سے نہیں گیا کہ ہو سکتا ہے وہ سو رہی ہو۔باہر بالکنی میں ذرا ٹہلا کیا تو ان کی ملازمہ نظر آ گئی پتا چلا کہ ندھی جاگ رہی ہے۔

''فوراً بلاؤ اسے۔۔۔''اس نے ملازمہ کو حکم دیا۔

ندھی جب باہر آئی تو اس نے نہایت عجلت سے ہاتھ آگے بڑھایا۔مسز دت کمرے میں سے دیکھ رہی تھیں بلکہ سن بھی رہی تھیں کیونکہ نندو نے جھاڑ پونچھ کرتے وقت کھڑکی ادھ کھلی چھوڑ دی تھی۔ندھی کو سمیر کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر غصہ آ رہا تھا انھیں۔مگر سمیر نے ہاتھ نہیں ملایا تھا اور ندھی کو امتحان کا پرچہ تھمایا جسے ندھی نے جلدی سے دیکھنا شروع کیا۔

''سبھی کوئیسچنز (Questions) وہی ہیں نا''وہ چہکی۔

''ہاں یار تھینکس۔۔۔تو نہیں پڑھاتی تو میری ریڑھ لگ جانی تھی آج۔۔۔''وہ دھیرے سے بولا۔

''پر تو نے اچھے سے کیے نا سارے؟''

''آف کورس یار۔۔۔آئی مین میم (I mean mam)''سمیر بولا تو وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''یار ایک فیور (Favour) چاہیے تجھ سے۔''ندھی بولی تو مسز دت کے کان کھڑے ہو گئے۔

''شیور (Suer) بول نا۔''

''گورو ناراض ہو گیا ہے۔''وہ اُداسی سے بولی۔

''او۔۔۔نو۔۔۔(Oh-no) مگر کیوں۔''سمیر جلدی سے بولا۔

''ایسے ہی۔۔۔فالتو میں۔۔۔یو نو ہاؤ مچ آئی لو ہم (You know how much I love him)''وہ رو پڑی۔

''اے۔۔۔پلیز یار۔۔۔رونا نہیں ہاں۔۔۔ڈونٹ وری ابھی ٹھیک کرتا ہوں اسے۔۔۔بھاؤ کھانے لگا ہے ایڈیٹ کہیں کا۔۔۔چل چپ

ہو جا۔۔۔دیکھنا کیسے لائن پر لاتا ہوں۔۔۔''سمیر نے اس کی آنکھ سے ٹپکا آنسو اس کے رخسار پر سے شہادت کی انگلی سے پونچھ لیا۔مسز دت دیدے پھاڑے دیکھتی رہیں۔

''ایکچو لی (Actually) اسے غصہ ہے کہ آج مجھے اس کے ساتھ مووی (Movie) جانا تھا۔میں سوتی رہ گئی اور وہ اسکول میں مجھے ڈھونڈتا رہا۔میں نے موبائل سائیلنٹ (Silent) پر رکھا تھا پتا ہی نہ چلا۔''

''ارے فارگیٹ یار۔۔۔ہاں تیرے یہ ہائی لائینڈ (Hightlighted) بال بہت اچھے لگتے ہیں۔''سمیر نے ندھی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا پھر اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کیا۔

''میں بھی کرواؤں گا آج اپنے بال ہائی لائٹ اور گورو کے بھی۔''اس نے دھیرے سے کہا اور پھر چٹکی بجائی۔

''ناؤ کم آن گومی اے سویٹ سمائل (.Now come on give me a sweet smile)''ندھی سچ مچ مسکرادی۔۔۔

''آئی ہیو این آئیڈیا (I have an Idia)''وہ چہکی۔

''کیا۔۔۔؟''سمیر جلدی سے بولا۔

''ہمارا سارا گروپ بالوں میں لائٹ براؤن اسٹریکس (Light brown streaks) ڈلوائے گا۔۔۔کچھ ہی تو دن ہیں اسکول کے۔ فوٹو کھنچیں گے ڈھیر سارے۔۔۔یہ ٹریڈ مارک ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔۔۔''وہ پہلے ہنستے ہوئے بولی پھر کچھ اُداس ہوئی اور اس کے بعد ایک دم جیسے خاموش ہوگئی۔

''فرینڈ شپ مارک (Friendship Mark)''سمیر نے مسکرا کر کہا۔مگر اگلے ہی پل اس کے لبوں سے بھی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''کتنے یاد آئیں گے نا اسکول ڈیز۔۔۔''ان دونوں نے اچانک بڑے افسردہ لہجے میں بالکل ایک ہی وقت میں کہا اور پھر ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

گل شدہ شمعوں کا نوحہ

گلزار ملک

عجیب وبا تھی۔
جان لیوا۔۔۔خوفناک۔۔۔
تاریکی روشنی پر مسلط تھی۔۔۔
بیس بیس کوس پر دیا جل رہا تھا۔
چاند تو کبھی کا مسخر اب زمین پر تسلط کے لیے کوشاں۔
سورج شرمندہ شرمندہ سا تاریک چہرے کے ساتھ۔
اپنے سفر پر رواں دواں۔۔۔
''اب کیا ہوگا۔۔۔''
ہر سوچ میں تاریک سائے رینگ رہے تھے۔ پر جواب ندارد۔۔۔

اب تو بیس بیس کوس دُور ٹمٹمانے والے دیے بھی ایک ایک کر کے بجھنے لگے تھے۔۔۔ تاریکی تھی کہ روحوں میں پنجے گاڑنے کو بے قرار۔ اس خوفناک حالت میں اگر کچھ آسرا تھا تو صرف مخصوص لوگوں کا۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہی لوگ جن کی پیشانیاں روشن تھیں۔

لیکن تاریکی اب کے ایک ایک کر کے انھیں بھی نگلنے لگی تھی۔

''کیا ہے یہ سب۔''

''نہ جانے ہمارا کیا ہوگا۔۔۔'' آواز اُٹھی۔

سبھی عجیب خوف سے اپنے چہرے چھپانے لگے تھے۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔۔۔

کون جانے آج وہ کس گھر کو گھیر لے' آنگن میں اُترے اور چراغ گُل کر چل دے۔۔۔ لمحے بھر کے لیے فضا میں بھاری تاریک جوتوں کی آہٹ' سرچ لائٹوں کی خوفناک بھاگ دوڑ اور پھر سدا کی تاریکی۔۔۔ کوئی پکار نہیں' کوئی آواز نہیں' سب ایسے واقعہ کے بعد یوں آنکھیں مسلتے ہوئے ملتے جیسے ابھی سو کر اُٹھے ہوں۔۔۔

نیم خوابیدہ نگاہیں ایک دوسرے کے چہروں کی جانب اُٹھتیں اور ساکت ہو جاتیں۔ چہرے تیز' کاٹتی' جھلستی آگ کے بعد جیسے راکھ ہو چکے ہوں۔ روشنی مناسب ہوتی تو انھیں ضرور نظر آتا کہ اس لمحے ان سب کے چہرے جھلسے ہوئے جانور کے کھر ونڈوں کی مانند سیاہ ہو چکے تھے' جن پر اس عجیب بیماری سے بال نام کی کوئی چیز نہ رہی تھی۔ تاریکی۔۔۔ خوفناک تاریکی۔۔۔ سینگ نیہوڑے ریوڑ کو ہنکائے جانے والے دُور بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ وہ تاریکی میں بھی ایسے لینز لگائے ہوئے تھے جو بالائے بنفشی اور زیرِ بنفشی طولِ موج کی تاریک لہروں سے گٹھ جوڑ کیے ہوئے تھے۔

اس کے گلے میں کھٹی ڈکار اور پیٹ میں شدید درد کی لہر نے اینٹھن پیدا کرنی شروع کر دی۔۔۔ بیس کوس میں ایک دیا وہ بھی روشن کیے ہوئے تھا۔۔۔ لیکن تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کی پسلیاں کسی ٹھوکر کی زد میں آ کے چٹخنے لگی ہوں۔۔۔ بیس بیس کوس دُور پہلے اس جنگل میں پُرشکم جناور کی بہتات تھی جو گھاس پھوس سے بھرے پیٹ لیے نیم خوابیدہ سے اُونگھتے رہتے۔۔۔

دم گھونٹتی حبس اس کے اندر تاریکی کا باعث بن رہی تھی۔ یہ کیسی زندگی تھی کیسا آنگن' کہ جہاں وہ سب کسی دوسرے کی دی ہوئی زندگی جی رہے تھے۔

وبا پھیل رہی تھی۔
عجیب وبا تھی۔
جان لیوا۔۔۔خوفناک۔۔۔
تاریکی روشنی پر مسلط تھی۔
بیس بیس کوس پر دیا جل رہا تھا۔
کسی شدید جذبے کے تحت اس کا تمام جسم لرزنے لگے۔
تاریک جھاگ نے اس کا دل دبوچ لیا۔
کتنی خوفناک معذوری تھی۔ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کسی تاریک ہوتی روح کی مدد کیسے کی جائے۔۔۔

اس نے بیس کوس میں موجود اکلوتے دیے کی مرتی ہوئی لو میں ارد گرد موجود ہجوم کو دیکھا' کیا سبھی اس کی مانند محسوس کر رہے تھے' لیکن ادھر تو خاموشی تھی اور کاہلی۔۔۔سب کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا' چپ رہو اور اپنی اپنی بھوک کی تسکین کا سامان کرو۔ان کی سوچوں میں کسی بوڑھے بیل کے وجود کی بو رچی ہوئی تھی۔

''کیا ہے یہ سب۔''

''نہ جانے ہمارا کیا ہوگا۔۔۔'' تاریکی میں لمحے بھر کے لیے اس کا چہرہ چمکا۔

''ٹھنڈے رہو۔۔کول مائنڈڈ۔۔۔''

''ٹھنڈا رہوں۔۔۔کیسے۔۔۔تاریکی ہمیں لحہ بہ لحہ ڈبوئے جا رہی ہے۔ایک ایک کر کے کتنے گل ہو گئے۔۔۔ابھی شروعات ہیں' ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دے رہا ہے' لیکن کل۔۔۔جب تاریکی ہماری گردن گردن تک آ پہنچے گی تب۔۔۔''

''جذبات سے کام مت لو۔۔۔حوصلہ رکھو۔۔۔یہ غیر معمولی بات نہیں روشن صبح آنے سے پہلے تاریکی ضرور بڑھتی ہے۔۔۔''

''غیر معمولی بات نہیں۔۔۔عجیب بات ہے۔''

''ہم سب تاریکی کے نرغے میں ہیں اور آپ کہتے ہیں حوصلہ رکھو۔۔۔اگر کسی روز یہ دیا بھی۔۔۔''

''منحوس لفظ زبان سے مت نکالو۔۔۔اور آہستہ بولو۔۔۔ہم سب تاریکی کے رحم و کرم پر ہیں۔'' بوڑھے نے تاریک چہرے کے ساتھ کپکپاتی آواز سے کہا:

''غلط۔۔۔ہم صرف خدا کے رحم و کرم پر ہیں۔۔۔اس کی قدرت میں بندھے ہوئے۔'' نوجوان چہرے سے روشنی کی کرنیں پھوٹیں اور تاریکی میں تیزاب کی مانند بکھر گئیں۔۔۔ارد گرد موجود پُرشکم جنازوں نے نیم خوابیدہ آنکھیں کھولیں اور حیرت سے روشنی کی کرنوں کو پھیلتے دیکھا۔

تبھی ان میں سے ایک نے اپنی گردن پر بیٹھی مکھیوں کو دُور جھٹکا اور چندھیائی آنکھوں سے معاملے کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کی۔۔۔

صاف ظاہر تھا۔وہ آگ سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کا حوصلہ اور خود اعتمادی بڑھی ہوئی تھی۔در پردہ ضرور اس کی روشن چہروں سے مفاہمت موجود ہوگی۔

تبھی اس نے اپنا کام شروع کیا۔

اسے کسی قسم کے اعداد و شمار کی ضرورت تھی' نہ کسی ٹھوس ثبوت کی' بس چہرے کی ایک جھلک اور پھر منا سب گھڑی دُور کہیں اس کی اطلاع۔

عجب وبا تھی۔
جان لیوا۔۔۔خوفناک۔۔۔
تاریکی روشنی پر مسلط تھی۔
بیس بیس کوس پر دیا جل رہا تھا۔

لمحے بھر کے لیے اس کی نظر نوجوان کے چہرے پر پڑی' اس کی پیشانی کو دیکھ کر اس کا یقین پختہ ہو گیا۔ اب اس کی آنکھیں مردار خور گدھ کی مانند چمک رہی تھیں جیسے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہو۔۔۔

تاریکی سے لڑتی مدھم روشنی کی جانب ترچھی نگاہوں سے کبھی کبھار دیکھتے ہوئے وہ بے چینی سے اپنی جگہ پر متحرک تھا۔۔۔ اگلے چند لمحوں میں وہ ناقابل قیاس جال بن چکا تھا۔

اردگرد تاریکی میں جناوروں کا خاموش ہجوم منتشر تھا' جو سب غیر فطری خاموشی کا لبادہ اوڑھے' پالتو بے زبان جانوروں کی مانند گردن ڈالے راتب کھانے میں مشغول تھے' جن کے اندر دُور دُور تک ڈر اتر چکا تھا۔

نوجوان ایک دم اُداس ہو گیا۔ ایک احساس جرم نے اسے آ دبوچا۔ اس کا دل چاہا' بھلے وجود خاکستر ہو جائے پر تاریکی کا بول بالا نہ ہو۔

وہ جناوروں کے اندر گہرائی سے ڈر کی جڑیں نوچ لینا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھیں ان بہے آنسوؤں سے چمکنے لگیں۔ اپنی تقدیر کسی دوسرے کو سونپ کر سب کتنی کاہلی اور بے بسی کی زندگی جی رہے تھے' تنکے کی مانند ہوا کے دوش ڈولتے بے چارے لوگ' جو اپنی اذیت کو لفظ نہیں دے سکتے تھے۔ اوپر تاریک آسمان پر گدھ منڈلانے لگے تھے' چکراتے ہوئے گدھ اپنی خوفناک انگارہ آنکھوں سے اس غیر معمولی روشنی کے حدف کو اپنے مواصلاتی نظام پر گھور رہے تھے۔

تبھی تاریک بوٹوں کی دھمک سے زمین لرزنے لگی۔ کسی عورت کی بلند چیخ نے فضا کو تھرتھرا دیا۔۔ کچھ مردوں کے تیز تیز بولنے اور بھاگنے کی آوازیں اُٹھیں۔ ہجوم میں ابتری پھیل۔ پھر ایک خوفناک نزع میں لتھڑی ہچکی فضا میں گونجی اور یک لخت ہر سُو تاریکی چھا گئی۔۔۔

اب بیس بیس کوس تک جلنے والے دیوں میں ایک اور گُل ہو چکا تھا۔

عجیب وبا تھی۔۔۔

جان لیوا۔۔۔ خوفناک۔۔۔

تاریکی روشنی پر مسلط تھی۔۔۔

''تم اسے جانتے ہو۔''

''نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں کیسے جان سکتا ہوں۔۔۔ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ اس لمحے وہ بوڑھا شخص بالکل کمزور۔۔۔ ڈھلتی پرچھائی کا روپ دھار گیا لیکن کسی اندرونی اُٹھتے طوفان کا گلا کیسے دباتا' بے اختیار بہہ نکلنے والے آنسو چھپانے کے لیے اسے پہلے سے بھی زیادہ جدوجہد کرنی پڑی جس سے اس کا باوقعت اور رُعب دار چہرہ تاریک ہو گیا۔

اب چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ ہر طرف چٹیل میدان چہرے لیے روشن خیال جناور ریوڑ کی صورت کھڑے تھے' جن کے چہرے جلائے گئے کھنڈروں کی مانند تاریک تھے۔

''اس کا قصور۔۔۔''

''انتہا پسند۔۔۔ دہشت۔۔۔'' کوئی چلا اُٹھا۔۔۔

''کیسے۔۔۔ اس کے چہرے پر تو وہ بھی نہ تھی۔۔۔ اور پھر ہتھیار بھی۔۔۔'' کسی نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

''وہ۔۔۔ وہ تو اس کے اندر دُور تک اُتر چکی تھی۔۔۔'' کوئی پکار اُٹھا۔۔۔ کسی بوڑھے کی آواز تھی۔

''ہاں ہاں۔۔۔ اس کے اندر تک۔۔۔ اس نے تو اس کی روح میں جڑیں بھی پالی تھیں۔ تبھی تو اس کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔۔۔ اس کے اندر کا خوف مر چکا تھا۔۔۔ شائد اس نے موت کے تصور کو قبول کر لیا تھا۔۔۔''

اس لمحے فلک سے اُترتے فرشتے اس مردہ وجود پر شبنم فشانی کر رہے تھے جس کی پیشانی پر عمر بھر کی ریاضت کا محراب صبح کے پہلے ستارے کی مانند چمک رہا تھا اور اس کی بنیاد پرستی کا اسلحہ اس کی کلائی سے لپٹا ہُوا جھول رہا تھا۔۔۔

وچھوڑے

سیّد علی محسن

آپ بالے شاہ کو جانتے ہیں؟ وہ میرا ماموں تھا' میری ماں کا ماں جائیا۔ کالا سیاہ مگر دل کا بڑا اُجلا۔ میرا خیال ہے آپ نے اس کا نام سنا ہو گا وہ لوگوں کے گھروں میں نلکے ٹھیک کرتا تھا، تپتی دوپہروں میں۔ اسی لئے اس کی رنگت کالی ہو گئی تھی آپ یہی سمجھے ہوں گے نہیں! ایسا قطعاً نہیں، وہ تو بچپن ہی سے کوے جیسا تھا۔ کوے نہیں شائد توے جیسا' میری امی نے مجھے بتایا تھا ورنہ مجھے کیا پتا جھولنے میں اس کی رنگت کیسی تھی اور بالی عمر میں اسے لڑکے کیا کہہ کے چھیڑتے تھے۔ میں نے تو اس روز اس کا اصل رنگ دیکھا تھا جس دن اس نے اپنے منہ میں چوسی ہوئی گلے کی خراش والی ادھ گھلی نافی نکال کے میرے منہ میں ڈال دی تھی۔ اس جوٹھی گولی کی مٹھاس۔۔۔ آپ نہیں جانتے اور اس روز بالے شاہ کی رنگت' آپ نہیں سمجھتے' آپ سمجھ بھی نہیں سکتے۔

میری پیدائش پر زارے شاہ نے من بھر بتاشے بانٹے تھے اور امرتیاں' سارے گاؤں میں۔ میرے بڑے ماموں کا نام زارے شاہ تھا' گورے چٹے' خوبصورت نین نقوش والے وہ ساری جوانی انگریزوں کے دیس میں گزار آئے تھے مگر گاؤں کے طور طریقے نہیں بھولے تھے۔ شاہ خرچ' کھلے دل والے۔ میں ماں باپ کی پہلی اولاد تھی اور ماموں زارے نے من بھر بتاشے اور امرتیاں بانٹی تھیں' سارے گاؤں میں۔ بالے شاہ کی جیب میں اس روز دھیلا بھی نہیں تھا' ہمیشہ کی طرح۔ وہ میرے گال چومتا رہا تھا اور مجھے بانہوں میں اٹھا کے لوریاں سناتا رہا تھا۔ کسی نے ایک بار اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کے کہا تھا ''بالے شاہ! پیسہ اور اولاد تیرے نصیب میں نہیں۔'' امی بتاتی ہیں بالے شاہ نے بڑی لاپرواہی سے کہا تھا ''نئیں تے نا سہی!'' [نہیں تو نا سہی] پتا نہیں اس کی وہ بے اعتنائی رب کو پسند نہیں آئی یا لکیریں دیکھنے والا بڑی گہری نظر والا تھا۔ پیسہ بالے شاہ کے ہاتھ نہیں آیا اور اولاد۔۔۔! جب میں سعید کی ڈولی میں بیٹھ رہی تھی تو ماموں بالے کی آنکھ کا پانی اس کے گالوں پر دور تک پھیلا ہوا تھا اور میرے سر کو اپنی چھاتی سے لگاتے ہوئے اس نے دل چیر دینے والے لہجے میں ہولے سے کہا ''فاطمہ' تیری ڈولی میں اپنے گھر لے جاندا!'' [تیری ڈولی میں اپنے گھر لے جاتا۔۔۔!] بالے شاہ سے بولا نہیں گیا۔

اس روز مجھے پہلی بار احساس ہوا اولاد کا دکھ تو انسان کو اندر سے کھا جاتا ہے' بلند و بالا عمارتوں کی طرح جو بظاہر سر اٹھائے بڑی شان سے کھڑی ہوتی ہیں مگر بنیادیں۔۔۔ کمزور بنیادوں والی عمارتیں تو تیز ہوا کے جھونکے سے بھربھری مٹی کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔ میں کیا کہتی اولاد تو اس کے نصیب میں تھی نہیں تو کیسے میری ڈولی وہ اپنے گھر لے جاتا۔ میں بے بسی اور دکھ سے بالے شاہ کا منہ دیکھتی رہ گئی جو پرائی ڈولی کا بانس کندھے پر رکھے آنکھیں پونچھتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدموں سے چل رہا تھا' ساری بارات سے الگ' سارے لوگوں سے وکھرا۔ فاطمہ کی ڈولی پر پھینکنے کے لئے اس کی جیب میں چند سکے تک نہیں تھے اور روپے لوٹنے والے بچے اس کی قمیص کو کھینچتے' کہنیاں مارتے ہوئے اس کے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ سیاہ رنگت والا میلے کف کے ساتھ آنکھ میں جمع ہونے والا پانی پونچھتا اور دبی دبی ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس نے تو فاطمہ کی بارات والے دن بھی نیا جوڑا نہیں پہنا' کیسے پہنتا پیسہ تو اس کے نصیب میں تھا نہیں۔

بالے شاہ کی طرح فاطمہ بھی گھونگھٹ میں سر چھپائے کف کے ساتھ گیلی آنکھیں پونچھتی رہی اور جب ڈولی کا پردہ ہٹا کے اسے تھام کے نئے گھر کی چوکھٹ سے گزارا گیا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کے روئی۔ اس کی ڈولی زارے شاہ کے گھر میں نہیں' بالے شاہ کے آنگن میں اتری تھی۔ بالے شاہ چھما چھم روتا تھا اور سعید کے گلے میں بانہیں ڈال کے صحن میں ناچ رہا تھا۔ سعید نے میری طرح بالے شاہ کی چوسی ہوئی جوٹھی نافی کا حق ادا کر دیا تھا۔

میں اکثر سوچتی ہوں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ایک سی کیوں نہیں ہوتی۔ سب کی رنگت اور قسمت الگ الگ' مختلف کیوں ہے۔ ناک تک نہیں ملتی۔ سعید بھی ایسا ہی سوچتا تھا۔ شائد اس لئے کہ ہمارا جوڑا آسمانوں پر بنا تھا مگر بالے شاہ۔۔۔ اور مامی جی! سکے کے دورخ! گوری چٹی' نیلی آنکھوں والی مامی پتا نہیں کیسے کالے سیاہ ماموں بالے شاہ کے پلو سے بندھ گئی۔

''فاطی تیرے مامے نوں شلوار پانیں نیں سی آندی' نالا پائنچے تھائیں نکل آندا سی!'' [فاطی! تیرے ماموں کو شلوار پہننی نہیں آتی تھی' اوزار بند پائنچے سے نکل آتا] مامی میرے سر میں انگلیاں اور نظریں گاڑ کے جوئیں پکڑتی۔ ہم تپتی دوپہر کو دھریک کی چھاؤں میں چارپائی ڈالے ہوتیں۔

''بچاسی!'' جامن کی چھاؤں تلے چارپائی پر ماموں کو مٹھیاں بھرتا ہوا سعید زور سے چلاتا۔

''اسی پتر اسی!'' کھری چارپائی پر لیٹے ہوئے ماموں بند آنکھوں کے ساتھ بڑے سکون سے جواب دیتے۔

''مامی! دیکھا ماموں!'' سعید رونی صورت بنا کے مامی کی طرف دیکھتا۔ میں بھی گردن موڑ کے سعید اور ماموں کو دیکھتی۔

''گوادتی!'' [گم کردی] مامی منہ سے چچ! کی آواز نکال کے افسوس سے کہتی۔ ''چھڈ اونہوں! سر سدھا رکھ!'' [چھوڑو اسے! سر سیدھا رکھو] مامی میری گدی میں ایک چپت جماتی۔

''مامی! بچاسی ہو گیا تھا!'' سعید منہ بسورے بیٹھا ہوتا' ماموں آنکھیں بند کئے دھیمے سروں میں کچھ گنگنا رہے ہوتے۔

''تو جان تے تیرا ماما!'' [تیرا اور ماموں کا معاملہ ہے] مامی جھلا کے کہتی اور میرا کان مروڑ کے سر پیچھے کو کرتی۔

''اسی!'' بالے شاہ چھیڑنے والے انداز میں گنگناتا۔

''بچاسی!'' سعید بالے شاہ کی ننگی چھاتی پر دو ہتڑ مارتا۔

''چل فیر توں گن لے!'' [دوبارہ گن لو] بالے شاہ سیدھا حل بتاتا۔ سعید کی دو ایک بار ریں ریں سنائی دیتی اور وہ نئے سرے سے ماموں بالے شاہ کو مٹھیاں بھرنا شروع کر دیتا۔ اس کا سارا وجود اس کے ہاتھوں کے ساتھ ہلتا' زبان بھی۔ بلند آواز سے وہ گنتی گنتا۔ بالے شاہ آنکھیں بند کئے'' سولہ سترہ۔۔۔ چوبیس پچیس۔۔۔ اسی بیاسی۔۔۔'' کا راگ سنتا رہتا جونہی سوئی نوے کے ریکارڈ پر پہنچتی وہ چونک کے آنکھیں کھولتا اور سعید کو گھورتا'' او فراڈ یئے! بنے سٹھا کاٹھ تے بنے نوے اکانوے؟ ستر اسی کدھر گیا؟'' [ساٹھ اکسٹھ کے بعد نوے اکانوے؟ ستر اسی کدھر گا؟] سعید کا منہ باسی بینگن جیسا ہو جاتا۔ سو کی گنتی اس سے مکمل نہ ہوتی اور ماموں کے ساتھ معاہدہ سو تک کی گنتی کا تھا۔ میٹھی گولی یا اٹھنی کے لالچ میں سات آٹھ دفعہ وہ گنتی کا ورد کرتا اور لڈو کا سانپ ہر بار اسے نوے کے ہندسے پر کاٹ لیتا' وہ پلٹ کے ایک پر آ جاتا۔ بالے شاہ نے سکول کا منہ نہیں دیکھا تھا مگر اس کی گنتی۔۔۔ ہم اکثر حیران رہ جاتے تھے۔ زارے شاہ کہتا'' میں سولہ جماعتیں پاس ہوں اور تمہارے ماموں بالے شاہ! اٹھارہ جماعتیں!''

ہمیں بڑی حیرت ہوتی بالے شاہ نے سکول کا منہ نہیں دیکھا تھا اور اٹھارہ جماعتیں پاس تھا۔ مامی پر رعب ڈالنے کے لئے دو چار الفاظ انگریزی کے بول لیتا۔

زارے شاہ کا گھر بہت بڑا تھا' بڑے بڑے کمرے اور کشادہ صحن' پودوں اور گملوں والا۔ قیمتی پردوں اور قالینوں والا مگر پتا نہیں کیوں سعید کو جامن کی چھاؤں میں مزا آتا تھا اور مجھے دھریک کے سائے میں۔ بالے شاہ کے گھر کے تو کواڑ بھی سلامت نہیں تھے۔ میں شام تک مامی کے ساتھ لڈو کھیلتی رہتی۔ بالے شاہ تھکا ہارا کندھے پہ اوزار لئے پسینے میں شرابور گھر میں پاؤں رکھتا' سعید دونوں ہاتھوں میں رنگ برنگی گولیاں لئے منتظر ہوتا۔

''کم ویکھا اپنے مامے دے!'' [کام دیکھو اپنے ماموں کے] مامی لڈو کا دانہ پھینکتے ہوئے کہتی۔

''لیا یار!'' [لاؤ یار] ماموں اوزار دیوار کے ساتھ لگا کے سعید کے ہاتھ سے بنٹے پکڑ لیتے۔ وہ دونوں رنگ برنگی گولیاں کھیلتے اور بچوں کی طرح قلقاریاں مارتے۔ میں مامی سے کبھی نہ جیت سکی' سعید ماموں سے ہمیشہ ہار جاتا۔

ایک روز دھریک کی چھاؤں میں بچھی چارپائی ہمیشہ کے لئے خالی ہو گئی۔ گوری چٹی مامی ہونٹوں پر سدا بہار مسکان لئے ہم سے روٹھ گئی۔ تب مجھے پہلی بار احساس ہوا ممتا کا رشتہ صرف کوکھ سے جنم دینے والی سے ہی نہیں ہوتا' گود میں کھلانے والی بھی ماں سے کم نہیں ہوتی۔ میں جس آنگن میں کیکلیاں ڈالا کرتی' شٹاپو کھیلتی رہی' کئی روز تک میرا وہاں جانے کو جی نہیں چاہا۔ بہت دنوں بعد سعید مجھے اس چوکھٹ پہ لے گیا۔

میں دکھ سے دیکھتی رہ گئی' مامی کی موت نے بالے شاہ کو چوس لیا تھا' ہڈیوں کا پنجر' چلتی پھرتی زندہ لاش۔ میں دھریک کی چھاؤں میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی جہاں کبھی مامی اپنے گھٹنوں میں میرا سر دبائے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے بالوں میں سے جوئیں نکالتی اور ناخن پہ رکھ کے دوسرے انگوٹھے کے ناخن سے مسل دیتی۔ سامنے جامن کے سائے میں ماموں بالے شاہ چارپائی پہ نیم دراز تھے' کھلی آنکھوں کے ساتھ خلاؤں میں گھورتے

ہوئے' چپ چاپ۔ سعید ان کی پائنتی سر جھکائے بیٹھا تھا اس نے ماموں کے ننگے بازو پر ہاتھ رکھا اور ہولے سے کہا'' چاچا جی! ہمارے ساتھ چلیں نا!
'' ماموں نے خالی خالی نظروں سے سعید کو دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ سعید نے دوبارہ کہا'' چاچا جی! ہمارے ساتھ۔۔۔!

ماموں نے سعید کی آنکھوں میں جھانکا اور ہولے سے پوچھا'' کیوں؟''

''میں آپ کی ٹانگیں دباؤں گا اور خدمت کروں گا اور۔۔۔ اور سوتک۔۔۔'' سعید کی سسکی نکل گئی۔

'' جا فراڈ یئے! تیرا تے پنجاہ بعد نوے آجاندا!'' [جا فراڈیئے! تیرا تو پچاس کے بعد نوے آجاتا ہے] ماموں نے اس کے ہاتھ پہ ہلکی سی چپت لگائی اور منہ پھیر لیا' انہیں کیا پتا ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لکیر ہم دونوں نے دیکھ لی تھی۔

'' صحیح صحیح گنوں گا! قسم اللہ پاک کی بالکل پورا۔۔۔ پورا سو!'' سعید بلبلا کے رو پڑا۔ ماموں نے اس کا ماتھا چوم لیا مگر اٹھ کے ہمارے ساتھ ہمارے گھر نہیں آئے' وہیں جامن کے سائے میں چارپائی پر پڑے، دھریک کی چھاؤں میں بچھی خالی چارپائی کو دیکھتے رہتے۔

پھر جانے کیا ہوا ماموں بالے شاہ ویسے نہ رہے جیسے ہم بچپن سے دیکھ رہے تھے۔ امی سے ان کی تو تکار ہوئی تھی اور انہوں نے ہمارے گھر آنا بند کر دیا' ہمارا ان کے گھر جانا ممنوع قرار پایا۔ مجھے اس وقت یہ سمجھ نہیں آتی تھی بالے شاہ برا کیوں ہے اور زارے شاہ۔۔۔ ہمیں اس کی ہر حال میں عزت کرنی چاہیے۔ تب مجھے امی کے رویے کا دکھ تھا جو بالے شاہ کو بجائے قریب لانے کے دور کر رہی تھیں۔ بالے شاہ کی بے اعتنائی کا افسوس ہوتا' وہ بدل گئے تھے۔

کوشش کروں بھی تو وہ دو تین سال یاد کر نہیں پاؤں گی جب ماموں اور امی کا وہ رویہ مجھے بڑا عجیب لگتا تھا۔ دھندلاہٹ سی ہے' ان دنوں میں ہر شے دھندلا گئی تھی' ماں جائیوں کے رشتے بھی' میں ٹھیک سے کچھ دیکھ نہیں پا رہی۔ میں ان تلخ، سوگوار دنوں کو تیزی سے گزار دینا چاہتی ہوں جیسے فلم دیکھتے ہوئے آپ کچھ بور حصے فارورڈ کر دیتے ہیں یہ الگ بات کہ وہ دن کتنی سست روی سے گزرے تھے۔

بہت بعد کا ایک منظر میری آنکھوں میں جم گیا ہے۔ میں نیند میں ڈوبی ہوئی ہوں' سعید میرے کندھے کو جھنجوڑتا ہے' میں ہڑبڑا کے اٹھتی ہوں وہ پریشان ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی۔ سعید شال میرے کندھوں پر ڈال دیتا ہے اور مجھے بازوؤں کا سہارا دے کر کمرے سے باہر لے آتا ہے۔ رات کہر میں لپٹی ہوئی ہے' صحن میں ماموں زوار اور ممانی چہرے پہ تفکر کی لمبی لکیریں لئے زیر لب کچھ پڑھ رہے ہیں۔ میں ان کے چہرے پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں مگر ناکام رہتی ہوں۔ سعید مجھے بازو سے تھامے چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ باہر گلی میں آ گیا ہے' اس کی آنکھوں میں نمی ہے۔ ماموں اور ممانی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ میں ان سے نہیں پوچھتی رات کے اس پہر وہ سب کیوں گھر سے نکل آئے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ کیوں جا رہے ہیں؟ ہم بالے شاہ کے دروازے پر پہنچتے ہیں۔ چوپٹ دروازے پر جمال بکھرے بالوں کے ساتھ مجھے چھاتی سے لگا لیتا ہے' اس کی چھاتی میں عجیب بے ترتیب سی دھک دھک ہے۔ اس کے مضبوط حصار میں کٹی میں اس صحن میں داخل ہوتی ہوں جہاں میرا بچپن گزرا ہے' ماں کی شفیق گود جیسا آنگن جس میں سر رکھ کے رونے سے سارے دکھ درد دور ہو جائیں۔ صحن میں چند شناسا چہرے موجود ہیں جنہیں میرا الجھا ہوا ذہن شناخت نہیں کرتا۔ بے کواڑ کمرے میں ایک چارپائی ہے' جس پر وہ شخص آنکھیں موندے دراز ہے' جس کے نصیب میں اولاد اور پیسہ۔۔۔! میری ماں اس کے سرہانے بیٹھی ہے اجڑی ہوئی' ننگے سر والی۔ مجھے دیکھ کر وہ کرلاتی ہے اور بین کرتی ہوئی مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیتی ہے۔ میں حیرت میں گم کھڑی ہوں وہ اس گھر میں کیا لینے آئی ہے؟ اس نے تو اس گھر میں نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔ میرے سامنے خدا کی قسم کھا کے بالے شاہ سے کہا تھا'' تیری شکل نہیں دیکھوں گی!'' اور آج! غش کھا کھا کے اس کی چارپائی پر گر رہی ہے۔ نکڑ میں دیوار سے ٹیک لگائے کمال چپ چاپ بیٹھا دانتوں سے ناخن چبا رہا ہے۔

'' فاطمہ! تیرا ماموں ہم سے ناراض ہو گیا!'' امی کی آواز میرے کانوں کے پردے پھاڑ دیتی ہے۔ میں بڑی حیرت کے ساتھ چیختی چلاتی ماں کا چہرہ دیکھتی ہوں۔ ماموں تو کئی سال سے ناراض تھا۔

'' میرے ساتھ بات نہیں کرتا! بولتا نہیں!'' وہ سر کے بالوں کو کھینچتی ہے اور پیشانی کو پیٹتی ہے۔

'' زندگی بھر تیرے ساتھ بات نہیں کروں گی!'' تین سال پہلے امی کی کہی ہوئی بات ڈھول کی طرح بجتی ہے جسے سن کر بالے شاہ کی آنکھوں سے چھما چھم بادل برسا تھا اور وہ چپ چاپ ہمارے گھر سے نکل گیا تھا۔

''سعید! چوبیں پچیس ۔۔۔ ساٹھ اکسٹھ ۔۔۔ اسی اکیاسی ۔۔۔!'' میں منت سے ہاتھ جوڑ دیتی ہوں۔''ماموں کو گنتی ۔۔۔!''

''میرا تے پنجاہ بعد نوے آجاندا!'' [میرا تو پچاس کے بعد نوے آجاتا ہے] سعید چھلکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بے بسی سے ماموں کی طرف دیکھتا ہے۔

امی ماموں کے بے جان پیروں کو چوم رہی ہے۔ یہ پیر بچپن میں کبھی اس نے چومے ہوں گے۔ ہاتھوں کو چھو رہی ہے' یہ ہاتھ کبھی اس کے سر پہ سایہ کرتے ہوں گے۔ سینے پہ سر رکھ کے رو رہی ہے' اسی سینے میں سر چھپا کے کبھی وہ کھلکھلا کے ہنسی ہوگی۔ میں سعید کو دیکھتی ہوں جو جوٹھی گولی کے لالچ میں مردہ ٹانگیں دبا رہا ہے، اس کا سارا وجود بل رہا ہے، سوائے زبان کے۔ میں اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے کہتی ہوں''ماموں کو باہر صحن میں لے چلو!''

امی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتی ہے جیسے میں نے کوئی بیگانہ بات کی ہو۔

''جامن تلے!'' میں سعید سے کہتی ہوں' وہ اثبات میں سر ہلاتا ہے۔

سعید اور کمال ماموں کی چارپائی اٹھا کے باہر لاتے ہیں۔ صحن میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ وہ حیران ہو جاتے ہیں۔ رات بھر میں لپٹی ہوئی ہے' سردی شریانوں میں لہو جما رہی ہے اور جامن کے پیڑ کے نیچے ۔۔۔! لوگ کیا جانیں اس جامن کے پیڑ نیچے کتنی جھلسا دینے والی دوپہریں گزری ہیں۔ اس مہربان سائے میں کبھی دھوپ، گرمی کا احساس تک نہیں ہوا۔ اس ٹھنڈی چھاؤں میں کیسی راحت' کتنا سکون تھا۔

یہ عجیب مماثلت ہے' میری ماں دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ میں دو بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں اور میرے دو بیٹوں کی ایک ہی بہن ہے۔ میرے بھائیوں کی رنگت میں کچھ خاص فرق نہیں' دونوں اجلے اجلے' خوش شکل۔ جمال تو پارس ہے مٹی کو چھو کے سونا بنا لیتا ہے اور کمال! صرف نام کا کمال! بالے شاہ کی طرح اس کے ہاتھ میں پیسے اور اولاد کی کوئی لکیر نہیں تھی۔ جمال کو گفتگو کا فن آتا ہے' مجھے یاد ہے وہ بچپن میں میری مونگ پھلی اور دال سویاں ہتھیا لیتا تھا۔

''آپا! پہلے یہ کھا لیتے ہیں!'' وہ میری مٹھی میں دبی ہوئی مونگ پھلیاں فرش پہ ڈھیر کر لیتا' میں خوش ہو جاتی۔ ہم دونوں سر جوڑ کے وہ چوگ چگ لیتے۔

''باری باری!'' جمال میرے فراک کی جیب میں سے دال سویاں نکال کے اپنی ہتھیلی پہ رکھ لیتا۔ میں ہر بار اس کی باتوں میں آجاتی۔ میرا حصہ ختم ہوتے ہی وہ کسی بات پر منہ پھلا لیتا' ناراض ہو جاتا اور اپنی پھولی ہوئی جیب لئے باہر نکل جاتا۔ اس کا حصہ اس کی جیب میں ہمیشہ محفوظ رہا' اسے باتوں کا گُر آتا تھا اور شیشے میں اتار لینے کا فن۔ آج وہ شہر کا کامیاب ترین بزنس مین ہے۔

کمال ہمیشہ مقروض ہی رہا۔ تنگ دست اور غریب۔ بالے شاہ کی طرح میٹھی گولیاں کھانے والا۔ سائیکلوں کے پنکچر اور ہوا بھرنے والا۔ تپتی دوپہروں نے اس کی رنگت کو سنولا دیا' مزاج میں تلخی بھر دی۔ اکھڑا اکھڑا سا۔ جمال اس کے لئے بہت کڑھتا تھا کہتا''آپا! میرا دل خون کے آنسو روتا ہے' وہ اپنی حالت کیوں نہیں بدلتا!''

مجھے کیا پتا کمال کے حالات کیوں نہ بدلے' وہ سو جتن کرتا مگر اس کی قسمت میں ۔۔۔

وہ بھی بالے شاہ کی طرح کہہ دیتا تھا''نہیں تو نا سہی!''

جمال سدرہ کے لئے نعیم کا رشتہ لایا تو میرا ایک خواب پورا ہوا۔ مجھے یاد ہے ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ مٹھائی کے دو ٹوکرے میز پر پڑے تھے' ارم نے سدرہ کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی پہنائی اور جمال نے پانچ سو والے کرارے کئی نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ کمال کرسی پر بیٹھا ہاتھ کی انگلیوں کو مسل رہا تھا اور اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے بے شمار قطرے تھے۔ اس کے کپڑے اس روز بھی میلے تھے اور قمیص کا کالر پھٹا ہوا' مجھے اچھا نہیں لگا۔ اس نے سدرہ کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور سو کا ایک نوٹ میلا' تڑمڑسا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''ممانی نہیں آئیں؟'' سدرہ نے کمال کے پہلو سے لگ کے سرگوشی کی۔ اس کا خیال ہے میں نے نہیں سنا ہوگا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں!'' کمال نے بھی دھیرے سے سرگوشی کی۔ وہ سرگوشی بھی میں نے سن لی تھی۔ مجھے اندازہ ہے اس کی طبیعت

ٹھیک ہی ہوگی وہ پھٹے اور میلے کپڑوں میں آنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ آتی تو میں اسے اٹھا دیتی؟ قطعاً نہیں! مگر وہ تو ہمارا بھائی چھین لے گئی تھی! اسے ہم سے متنفر کئے رکھتی۔ کمال! جورو کا غلام!

سدرہ جمال کے گھر کی رونق بن کے میرا آنگن سونا کر گئی۔ نعیم اسے بیاہ لے گیا۔ پھر ایک دن سدرہ روتی ہوئی اکیلی میرے گھر واپس آ گئی۔ وقار اس کے آنے سے خوش نہیں تھا مگر میں اور نثار۔۔۔!

کمال میرے پاس صوفے بیٹھ کے کہتا ہے ''آپا! میں سدرہ کو لینے آیا ہوں۔''

میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے ''کیوں؟ تم کیوں؟'' میں چلاتی ہوں۔ وقار چونک کر میری طرف دیکھتا ہے۔

''ٹھیک ہے ماموں!'' وہ ماموں کے سامنے سر جھکا کے ادب سے کہتا ہے۔

''تم چپ رہو!'' میں اسے ڈانٹ دیتی ہوں۔

''نعیم کیوں نہیں آیا؟ جمال کیوں نہیں؟'' میں نہیں دیکھتی میرے لہجے سے کمال کو دکھ پہنچ رہا ہے' وقار کو تکلیف ہو رہی ہے' سدرہ دروازے سے لگی سہمی سہمی کھڑی ہے۔

''نعیم نے مجھے بھیجا ہے' جمال کو نہیں پتا سدرہ ناراض ہو کے آئی ہے۔'' وہ ہونٹوں کو بھینچتا ہے۔

''میں تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گی!'' میں حتمی انداز میں کہتی ہوں۔ کمال کا چہرہ دھواں دھواں ہے۔

''امی! ماموں۔۔۔!'' سدرہ آ کر کمال کے پہلو میں بیٹھ جاتی ہے' اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ کمال اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا ہے۔

''آئندہ تم مت آنا! میرے گھر میں قدم مت رکھنا!'' میں انگلی اٹھا کے اسے متنبہ کرتی ہوں۔ غصہ میرے دماغ کو کھا گیا ہے۔ میں نہیں سوچتی میں کیا کہہ رہی ہوں۔ کمال شانے لٹکائے برسوں کے بیمار کی طرح کمرے سے نکل جاتا ہے۔ سدرہ اور وقار روتے ہوئے دروازے تک اس کے پیچھے جاتے ہیں۔

پھر سال ڈیڑھ کی دھندلاہٹ ہے' واضح نہیں۔

انہی دنوں میں کسی روز سدرہ نعیم کے ساتھ اپنے گھر لوٹ گئی ہے مگر کمال دوبارہ کبھی لوٹ کے میرے گھر نہیں آیا۔ میں اس کے دروازے تک نہیں گئی۔

سدرہ کہتی ہے ''امی! چلیں کسی روز' آپ کے بھائی ہیں۔''

میں سختی سے جھٹک دیتی ہوں ''نہیں! نہیں ہے وہ میرا بھائی!''

نثار منّت سے کہتا ہے ''دل کا میل ہے۔۔۔''

''شکل نہیں دیکھوں گی اس کی!'' نثار کی بات کاٹ دیتی ہوں۔

جمال دو کشتیوں کا سوار ہے' ڈوبتی ناؤ کو بچانا چاہتا ہے۔ کمال کے پاس جاتا ہے تو وہ اسے دھتکار دیتا ہے میرے پاس آتا ہے منّت بھرے لہجے میں ''آپا! اسے معاف کر دو!''

''میں لعنت بھیجتی ہوں اس پر!'' میں پاؤں پٹخ کے اسے جھاڑ دیتی ہوں۔

ہم دونوں جھوٹی انا کے کھیل میں ایک دوسرے کے مقابل ہیں' کوئی ہار ماننے کو تیار نہیں۔ لوگ عجیب عجیب باتیں آ کے سناتے ہیں' میرے بارے میں کہی ہوئی کمال کی باتیں۔ میں مان لیتی ہوں سَو (100) میں سے دو تو ٹھیک ہوں گی۔ میں بھی دل کی بھڑاس نکالتی ہوں، لوگ جا کے اسے دو کی سَو (100) سناتے ہیں' وہ بھی مان لیتا ہوگا۔ دلوں کا میل بڑھ رہا ہے' نفرت کی دھند دبیز ہوتی جا رہی ہے۔

مجھے تو پتا نہیں چلا اک روز سدرہ نے بتایا ''امی! ماموں کی آنکھوں کے حلقے مزید گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔''

میں سدرہ کے کمرے میں بیٹھی جمال کی دی ہوئی گھڑی کی سوئیاں ٹھیک کر رہی تھی' میں نے زیادہ توجہ سے اس کی بات نہیں سنی۔

''امی! ماموں کا جسم گھلتا جا رہا ہے' آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں۔'' وہ میرے مقابل کھڑی ہو گئی۔ میں نے پہلی بار اس کی بات پر غور کیا۔

''تم گئی تھیں اس کے گھر؟'' میں اسے گھورتی ہوں۔

''رات خون کی قے۔۔۔ٹی بی انہیں کھا گئی!'' سدرہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے روتی ہوئی باتھ روم میں چلی گئی۔

یہ گرمیوں کی ایک جھلسا دینے والی دوپہر ہے۔ میں کچے خستہ مکان کی دہلیز پر بال بکھیرے بیٹھی ہوں' بہت سی عورتیں میرے دائیں بائیں' اردگرد جمع ہیں۔ سامنے گلی میں ایمبولینس آ کے رکی ہے۔ نثار اور وقار ایمبولینس کا دروازہ کھول کے سٹریچر باہر نکالتے ہیں۔ مجھے یوں لگا ہے میرے جسم سے کسی نے جان نکال لی ہے۔ میرا ایک بازو کاٹ ڈالا ہے' میں نامکمل ہوگئی ہوں' ادھوری۔

وہ سٹریچر سے اٹھا کے اسے چارپائی پہ ڈال دیتے ہیں۔ میں آگے بڑھتی ہوں اور کمال کے مردہ جسم سے لپٹ جاتی ہوں۔ ڈیڑھ سال بعد میں نے وہ چہرہ دیکھا ہے' اپنے بھائی کا چہرہ۔ میں اسے بے اختیار چومتی ہوں۔ میں سدرہ کو دیکھتی ہوں جو مجھ سے دور، نثار کے پہلو سے جڑی ہچکیاں لے رہی ہے۔ وہ میرے پاس نہیں آتے' وہیں بیٹھے بیٹھے اس کے لئے روتے ہیں جو ہمیشہ انہیں ہنسایا کرتا تھا۔ میں غور سے دیکھتی ہوں' مجھے لگتا ہے وہ دونوں ہنس رہے ہیں' مجھے دیکھ کے طنزیہ ہنسی۔ ان کی ماں کا بھائی مرگیا ہے اور وہ ہنس رہے ہیں' یہ کیا ہے؟

''سدرہ! میت کو میرے گھر لے چلو!'' میں بڑے کرب سے کہتی ہوں۔

''آپ نے کہا تھا میرے گھر مت آنا!'' وہ بڑی بے اعتنائی کے ساتھ میری بات دہراتی ہے۔ کئی مہینے پہلے کمال سے میں نے یہی کہا تھا۔ نثار اور سدرہ میلی قمیص والی مامی کے پہلو سے جڑے بیٹھے ہیں' وقار ایمبولینس والے کو کچھ نوٹ دے رہا ہے۔ میں' جس کا بھائی مرگیا' کوئی اسے دلاسہ نہیں دیتا۔

نثار کو دیکھ کے میرا دل کڑھتا ہے' وہ میری اولاد ہے' میرا خون۔ سنتی ہوں اس کی بیوی اس کا ساتھ نہیں دیتی، ساتھ نہ دیتی تو دو کپڑوں میں ساری عمر کیسے گزار دیتی۔ اس کے بھی کچھ خواب ہوں گے اور نثار! زندگی نے پہلے کم دکھ دیئے ہیں اسے؟ میں راتوں کو جاگ کر اس کے لئے دعائیں مانگتی ہوں۔ ساری ساری رات اس کے لئے روتی ہوں۔ پرندوں کی طرح ٹھکانے بدلتا رہتا ہے، کرائے کے مکانوں میں' کبھی یہاں کبھی وہاں۔ سنتی ہوں گلی کے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہتا ہے' اسے اپنے گھر سے خوف آتا ہے' خالی کمرے اور ویران صحن سے۔

وقار کو اللہ نے بڑا رزق دیا ہے' خوبصورت اولاد دی ہے۔ میرا بڑا فرمانبردار، نیک نیت والا بیٹا ہے۔ میرا خیال رکھتا ہے' سدرہ کے حالات اچھے نہیں' بہانے بہانے سے' بہن کی مدد کرتا ہے۔ شہلا بتاتی ہے چوری چھپے بھائی کو ملنے جاتا ہے۔ سدرہ کو اچھا نہیں لگتا وہ بارہا مجھ سے کہہ چکی ہے ''امی! نثار سے ہمارا کیا رشتہ؟ مرگیا وہ ہمارے لئے!''

وہ نثار کی بیوی کو ڈائن سمجھتی ہے جو نثار کو کھا گئی' ہم سے ملنے نہیں دیتی اور نثار! میں اس کی ماں ہوں۔ میں اس کیلئے کیا کروں؟ کیا کرسکتی ہوں؟

وقار مجھے کہتا ہے ''امی! سدرہ کو سمجھائیں! نثار سے بات کریں!''

وہ دلوں کی خلیج مٹانا چاہتا ہے مگر مٹا نہیں سکتا۔ بہن بھائی ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں۔ سدرہ کہتی ہے ''اسے احساس ہی نہیں! کبھی ایک روپیہ میرے لئے اسے نہیں جڑا۔ بھائی ایسے ہوتے ہیں؟''

وقار دکھی دل سے کہتا ہے ''سدرہ! اس کے حالات اچھے نہیں! جی تو اس کا بھی چاہتا ہوگا مگر کیا کرے؟

سدرہ اس بات کو نہیں مانتی۔

''بھائی تو صرف تجھے سمجھتی ہے!'' نثار لہجے میں زمانے بھر کی تلخی لئے وقار سے کہتا ہے۔

''تمہاری بھی بہن ہے۔'' وقار اسے سمجھاتا ہے۔

''نہیں! وہ مجھے بھائی نہیں سمجھتی!'' وہ طنز سے جھٹک دیتا ہے۔ دلوں کی خلیج بڑھ رہی ہے۔

سدرہ کی بیٹی سات سال کی ہے' وقار ایک روز اسے ساتھ لے آیا تھا' وہ وقار کے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہی۔ میں انہیں دیکھتی رہی وہ ایک ساتھ کھیلتے بہت اچھے لگ رہے تھے جیسے کبھی جمال' کمال اور میں کھیلا کرتے تھے۔ جیسے بچپن میں میری امی اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیلتی ہوگی۔ دل میں اک ہوک اٹھی بالے شاہ کی کوئی اولاد ہوتی! کاش! کمال کا کوئی بچہ ہوتا! خدایا! نثار کے نصیب میں۔۔۔! آنکھیں دھندلا گئیں' نئے پرانے منظر گڈمڈ ہوگئے' میں دیکھ نہ سکی۔ بہت دیر بعد وقار نے چونکا دیا وہ بچوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا جو کھیلتے کھیلتے جانے کدھر کو نکل گئے۔ سدرہ کا فون آیا ''امی!

انعم کہاں ہے؟''

میں اسے مطمئن نہ کرسکی۔ وہ کچھ دیر میں بھاگی چلی آئی بدحواس' پریشان۔ وقار منہ میں بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا' شہلا بھی میرے سامنے صوفے پر بیٹھی زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔

یہ ڈور ٹوٹ کیوں نہیں جاتی' رشتوں کی یہ ڈور! یہ رشتے چھوٹ کیوں نہیں جاتے، دل سے بندھے ہوئے رشتے۔ وقار کے بیٹے' سدرہ کی بیٹی کو لے کے نثار کے گھر گئے تھے۔ کھلے کواڑوں والے مکان میں جس کا صحن کچی مٹی کا تھا' دھریک کی چھاؤں تھی، کچی زمین پر انگلیوں سے شٹاپو کی لکیریں کھینچ کر انعم کے ساتھ کھیلنے والی بے اولاد مامی اور رنگ برنگی گولیوں کے ساتھ کھلانے والا ماموں جس کے نصیب میں پیسہ نہیں تھا' ویلڈنگ کی دکان پر لوہے کی کھڑکیاں اور دروازے بنانے والا۔

اپنے منہ کی چوسی ہوئی جوٹھی گولیاں بھانجے اور بھانجیوں کے منہ میں۔۔۔

سات سال بعد نثار کو خدا نے اولاد دی ہے۔ میں ننگے پاؤں اس کے گھر پہنچ گئی ہوں، وقار کا بھی انتظار نہیں کیا۔ میں اس کے بیٹے کو گود میں لینے کے لئے جھکی ہوں' اسے چوم رہی ہوں۔ کوثر میرے لئے اٹھ کے بیٹھ گئی ہے' میں اسے گلے سے لگا کے اس کی پیشانی چومتی ہوں۔ یہ سب کیا ہے مجھے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی' میں کیوں اسے بیٹیوں کی طرح بانہوں میں لئے چوم رہی ہوں اور وہ ڈائن! میرے لئے اٹھ کے کھڑی ہوگئی ہے' اس کے آنسو میرے آنسوؤں میں مل گئے ہیں، اس کا چہرہ دھل گیا ہے اجلا اجلا۔ وقار کہا کرتا ہے ''امی! بات پہلا قدم بڑھانے کی ہے' دلوں میں اتنی دوریاں تو نہیں۔'' آج میں نے پہلا قدم بڑھایا ہے' رشتے اپنی ساری خوبصورتیوں سمیت میرے سامنے ہیں۔

خوشی اور غم میں مجھے کیا ہو جاتا ہے' نثار کو بھول جاتی ہوں۔ وہ سر جھکائے پیار لینے کا منتظر ہے۔ میں اسے بانہوں میں بھینچ لیتی ہوں۔ اس کے آنسو میری قمیص بھگو دیتے ہیں۔

''اب کیوں روتا ہے؟'' میں روتے ہوئے اس کے بالوں کو چوم لیتی ہوں۔

''سدرہ نہیں آئی؟'' وہ میری چھاتی میں سر چھپائے پھوٹ پھوٹ کے روتا ہے۔

سدرہ کسی بات پر اس سے ناراض ہے' کئی مہینوں سے۔

میرا کلیجہ پھٹ گیا ہے۔

میں اسے لے آؤں گی۔

زندگی میں بھائی کی شکل نہیں دیکھنی تو مرے ہوئے کو۔۔۔؟

میت پہ بین کرنے کا فائدہ؟

مرے ہوئے بھائیوں کو بہنوں کے بین سنائی نہیں دیتے۔ جیسے بالے شاہ نے نہیں سنے تھے' جیسے کمال کو سنائی نہیں دیئے۔

یہ دلوں کا میل؟ جھوٹی انا کا مکروہ کھیل؟ لوگوں کی باتوں سے بنے ہوئے وچھوڑے کے جال۔۔۔

سدرہ میرے ساتھ آئی ہے۔ ہم کچے صحن میں نثار کے ساتھ کھری چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ سدرہ بھتیجے کو گود میں لئے بیٹھی ہے اور خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ بتا رہی ہے'' وقار نے بیس ہزار دیا ہے نئی فریج کے لئے۔''

کوثر سٹیل کے گلاسوں میں شربت لائی ہے۔ انعم شربت کا گلاس بیس دن کے بلال کے منہ سے لگاتی ہے۔ وہ روتا ہے' شائد گرمی کی وجہ سے۔

''پاؤڈر لے آئیں!'' کوثر نثار سے کہتی ہے۔

نثار جیب میں ہاتھ ڈال کے دس والے تین اور پانچ کا ایک نوٹ نکالتا ہے۔ اس کی جیب میں پینتیس ہیں۔

''کل لے آؤں گا!'' وہ جھینپ کے بیٹھ جاتا ہے۔

''تیس روپے کا مل جائے گا!'' کوثر کہتی ہے۔

نثار آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ اشارہ کرتا ہے' کوثر سمجھ جاتی ہے۔ انعم ماموں کے گھٹنے سے چمٹی ہوئی ہے۔

کوثر ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئی ہے۔ بلال اس کی گود میں رو رہا ہے' گرمی کی وجہ سے' جسم پر بیشمار گرمی کے دانوں کی وجہ سے۔ نثار رکشہ دروازے تک لے آیا ہے۔ میں بلال کو چومتی ہوں' کوثر اور نثار کو پیار کر کے رکشے میں بیٹھ جاتی ہوں۔ سدرہ بھی بھائی اور بھابھی سے ملتی ہے' بلال کا منہ چوم کے میرے پہلو میں آ بیٹھتی ہے۔ انعم کو نثار نے اٹھا رکھا ہے۔

رکشے والا رکشا سٹارٹ کرتا ہے۔

نثار جیب میں ہاتھ ڈال کے پیسے نکالتا ہے۔ پچیس روپے رکشے والے کی مٹھی میں چلے جاتے ہیں۔ سدرہ نثار کو روکتی رہ جاتی ہے' میں اس کی خالی جیب کو دیکھتی رہ جاتی ہوں۔ انعم نثار کی بانہوں میں کمٹی ہوئی ہے۔ وہ بڑے پیار سے انعم کی پیشانی کا بوسہ لیتا ہے اور ہاتھ میں پکڑا ہوا دس والا آخری نوٹ انعم کی ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔

رکشا چل پڑا ہے' سدرہ کے نہ رکنے والے آنسو بھی۔

''امی! بلال کا پاؤڈر۔۔۔!'' وہ روئے جا رہی ہے۔

میں اپنے مرے ہوؤں کی یاد میں رو رہی ہوں۔ رکشے والا حیرت میں گم ہے اور انعم کے ہاتھ میں دس والا نوٹ۔۔۔!

لوگ کہتے ہیں ماموں بھی کوئی رشتہ ہے؟

پیئر ماشیرے' آلتھیوسے اور مارکسزم

پیئر ماشیرے کی تصنیف "A Theory of Literary Production (1966)" نے آلتھیوسے کے آرٹ اور آئیڈیولوجی کے نظریے کو متاثر کیا۔ وہ اپنے مبحث کا آغاز واضح طور پر ادب کے مارکسی ماڈل سے کرتا ہے۔ وہ متن کو ایک تخلیق یا خود کفیل فن پارہ سمجھنے کے بجائے اس کو 'پیداوار' (Production) قرار دیتا ہے جس میں طرح طرح کے 'عناصر' استعمال ہوتے ہیں' جن کی شکل پیداوار کے عمل کے دوران خاصی بدل جاتی ہے۔ یہ عناصر کوئی آزاد اجزا نہیں جن کے شعوری اور ضابطہ بند استعمال سے کوئی وحدانی فن پارہ وجود میں آ جائے' بلکہ متن میں جب ان کا صرف ہوتا ہے تو خود متن کو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ گویا اُس وقت متن 'لاشعور' ہوتا ہے' جب شعور کی وہ شکل جس کو ہم آئیڈیولوجی کہتے ہیں' متن میں داخل ہوتی ہے' تو متن کی فارم بدل جاتی ہے۔ آئیڈیولوجی کا تصور بالعموم حقیقت کے ایک وحدانی اور واضح تصور کے طور پر کیا جاتا ہے لیکن جب آئیڈیولوجی ادب یا آرٹ میں داخل ہوتی ہے' تو اس کے تضادات اور اندرونی 'خالی جگہیں' (Absences) نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ادب ان تضادات کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ افتراق ایسا ضرور رہتا ہے جو خود آئیڈیولوجی کا پیدا کردہ ہوتا ہے کیونکہ 'کچھ' کہنے کے لیے ایسے 'بہت کچھ' سے قطع نظر کرنا پڑتا ہے جو کہا نہیں جا سکتا۔ بقول ماشیرے ادبی نقاد کا کام فن پارے کے مختلف اجزا کو مربوط کرنا ان کے تضادات کو دُور کرنا نہیں ہے بلکہ فن پارے کے لاشعور پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے' یعنی کیا نہیں کہا گیا ہے' اور کیا کچھ دبا دیا گیا ہے۔

(گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' سے مقتبس)

پتّھر کی آنکھ

کلیم خارجی

جب اُس نے پتھر کی آنکھ لگوائی۔ تو اس کے دوستوں اور عزیزوں نے جن میں بدنیت و خوش نیت حاسد اور مخلص لوگ سب شامل تھے۔ اپنے مزاج اور ارادوں کے تحت اُسے آ کر مبارک دینے لگے۔ اس کا ایک دوست جو دولت جمع کرنے کی ہر کوشش میں ناکام ہو چکا تھا۔ اُس کے چہرے کو گھورتے ہوئے سنجیدگی سے بولا:

''اس پتھر کی آنکھ نے تمہارے پورے چہرے کو بدل دیا ہے۔ اب تم انتقام پر آمادہ' خطرناک سمندری ڈاکو کی بجائے ایک شریف قسم کے ملاح نظر آتے ہو۔ تمہارے چہرے پہ سے درندگی اور خباثت کی تقریباً سب لکیریں کہیں غائب ہو گئی ہیں۔''

ڈراموں میں اداکاری کرنے والے ایک دوست نے پہلے تو اسے ڈانٹا۔ ''بھئی تمہیں یہ مصنوعی' بے بصارت و بے حس آنکھ کا بوجھ لینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مَیں نے ایک ڈرامے میں ایک کانے سردار کا رول ادا کیا تھا۔ توبہ توبہ۔۔۔ پورے ایک ہفتہ میرے دونوں ڈیلے دُکھتے رہے۔ پتہ کیوں؟ ایک ڈیلا مسلسل بند رہنے کی وجہ سے اور دوسرا کھلا رہنے کی وجہ سے یہ بڑا مشکل کام ہے لیکن۔۔۔ بہرحال۔ اس آنکھ کی وجہ سے اب تم عورتوں اور بچوں میں بیٹھ سکتے ہو۔''

اس کے دوستوں میں ایک پُر جوش مبلغ بھی تھا' اس نے آتے ہی پہلے تو یہ تاثر دیا کہ پتھر کی آنکھ اُس کے حکم پر لگوائی گئی ہے۔ چند دوستوں کو آس پاس موجود پا کر رُعب سے بولا: ''اب اس آنکھ سے نہ کبھی آنسو ٹپکیں گے۔ نہ بدی اور گناہ کے رَستے اور منظر نظر آئیں گے۔ تمہاری نیکیوں میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مَیں تو کہتا ہوں کہ اپنی دوسری اصلی اور قدرتی آنکھ بند ہی رکھا کرو تو اچھا ہے۔ اس سے تمہارے درجات بلند ہوں گے اور دنیا و آخرت کی کامیابی بھی حاصل ہوگی۔''

بادشاہوں کے قصے پڑھ کر سنانے والے ایک بزرگ نے اُسے گلے لگاتے ہوئے محبت سے کہا: ''مبارک ہو بیٹا۔ یہ آنکھ تمہاری دولت' طاقت اور شہرت میں اضافہ کرے گی۔ یہ تمہیں بادشاہ بنا کر تخت پہ بٹھا دے گی۔ کیونکہ ایسی آنکھ صرف بادشاہوں اور حکمرانوں کے پاس ہوتی ہے۔ اسی کو مسلسل استعمال میں رکھنا اور اس کی حفاظت اور تقدس کا خیال رکھنا اور جب کبھی تمہارے رُتبے میں بادشاہت شامل ہو جائے تو مجھے ضرور یاد رکھنا۔''

لیکن اُسے اصل خوشی اس وقت ہوئی جب شہر بھر میں بدزبان اور چڑچڑے بڈھے کی حیثیت سے بدنام اور نابینا بابا لاؤڈ سپیکر نے اپنی بلند اور گونج دار آواز میں اُسے مبارک دی۔ بابا لاؤڈ سپیکر کے آنے سے وہ گھبرا گیا تھا۔ کیوں کہ اُس سے گفتگو کرنا۔ اُسے سمجھنا' اور سمجھانا اور پھر برداشت کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ بابا کے بدلے ہوئے نرم اور آہستہ لہجہ سے حوصلہ پا کر اس نے بابا کو اندر بلا کر اپنے قریب چارپائی پہ بٹھایا۔

بابے نے اپنی بات شروع کی۔ ''سنا ہے تم نے اپنے چہرے کی بدنمائی چھپانے کے لیے پتھر کی آنکھ لگوائی ہے۔ تو کیا اب بدنمائی نہیں رہی۔ خیر میں تمہیں مبارک باد دینے نہیں آیا۔ میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں اصل بات بتا دوں اور وہ یہ ہے کہ تمہاری پتھر کی آنکھ تمہیں زیادہ دیر تک زندہ رکھے گی۔ تم لمبی عمر پاؤ گے اور تمہارے پیر کبھی کمزور نہیں ہوں گے۔ آنکھوں والے' اپنی آنکھوں کے ذریعے ضائع ہوتے رہتے ہیں اور جلد مر جاتے ہیں۔ اب تم اپنے باپ ہی کو یاد کر لو۔ وہ بے چارہ۔ اچھے اچھے کھانوں' اونچی اونچی کوٹھیوں' خوبصورت گاڑیوں اور پُرکشش عورتوں کو دیکھ دیکھ کے۔ مر گیا۔ یہ بھلا اس کے مرنے کی عمر تھی۔ مَیں نے اگر شادی کی ہوتی۔ تو آج میں قبر میں ہوتا اور میرا پڑپوتا تمہیں مبارک دے رہا ہوتا۔ سمجھ گئے نا۔۔۔''

بابا لاؤڈ سپیکر ہمیشہ کی طرح اپنی سُنا کر رخصت ہوا تو اُس نے اپنی پتھر کی آنکھ نکال کر اس کے رنگ اور بناوٹ کو محبت سے دیکھا اور پھر اپنی ہتھیلی میں رگڑ رگڑ کر اُس کی ملائمت اور ہلکے پن سے محظوظ ہوتا رہا۔ اب اُسے اور کسی کے آنے کا انتظار تھا' نہ شوق۔ اس نے اُٹھ کر اپنی چھوٹی سی بیٹھک کا دروازہ بند کیا اور پتھر کی آنکھ کو چوم کر تکیے کے نیچے رکھا اور وقت سے پہلے لحاف اوڑھ کر سو گیا۔

سال کی آخری ٹھنڈی اور سیاہ رات کو اس نے نئے طریقے سے منانے کا سوچ رکھا تھا۔ شہر کے مہذب اور فیشن ایبل نوجوان نے نئے

سال نو آمد کا جشن بھرپور طریقے سے منانے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ وہ عمارت جو کبھی درس گاہ ہوا کرتی تھی۔ اب تفریحی سرگرمیوں اور تقریبات کا مرکز تھی۔ ایک بہت بڑے ہال کو رنگ برنگے قمقموں اور خوبصورت پوسٹروں سے سجایا گیا تھا۔ سٹیج کو بھی انداز سے رقص اور مستی کے لیے موزوں بنانے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ وہ بھی بڑے اعتماد سے دعوت نامہ خرید چکا تھا۔ اندھیرا گہرا ہوتے ہی وہ ہال میں داخل ہوا تو رنگ اور خوشبو کے گرم اور گداز جھونکوں نے اس کو لپیٹ لیا۔ موسیقی کے ہیجان خیز سروں میں لرزتا ہوا وہ سٹیج کے قریب پہنچ گیا۔ تھرکتے نوجوان گلوکار کے مظاہرے کے ساتھ وہ خود بھی تھرکنے لگا۔ پھر اس نے دیکھا کہ کچھ اور بدمست بھی چیختے ہوئے سٹیج پر چڑھ گئے ہیں اور ان میں سے ہر آدمی اپنی مرضی سے اپنے جسم کو مختلف زاویوں پہ گھما رہا ہے۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ سٹیج پہ ان مدہوش نوجوانوں کے ساتھ شامل ہو جائے۔ لیکن پھر اُسے اپنی پتھر کی آنکھ یاد آ گئی۔ اس شور اور ہنگامے میں اُچھل کے گر پڑی تو ڈھونڈنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا اُس نے اپنی جگہ پر جم کر کھڑا رہنا قبول کر لیا۔ وقت کے ساتھ سٹیج پہ موجود اور نیچے ہال میں کھڑے ہجوم کی آزاد خیالی اور دیوانگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر چند نوجوان اور سٹیج پہ وارد ہوئے۔ انہوں نے نیلے لباس میں لپٹی ہوئی ایک خوبصورت اور دراز قد عورت کا مجسمہ مل کے ہوا میں لہرایا اور پھر سٹیج کے وسط میں کھڑا کر دیا۔ سنگِ مرمر سے تراشا ہوا ہوس انگیز عورت کا مجسمہ اتنا دلکش اور مکمل تھا کہ ہال بے اختیار چیخوں اور آہوں سے گونجنے لگا۔ کسی بھی اجنبی اور نو وارد آدمی کے لیے اس مجسمے کو حقیقی عورت سمجھ لینا ایک قدرتی بات تھی۔ وہ مجسمے کے حسن اور اس کے خدوخال میں گم تھا کہ ایک نوجوان چیختے ہوئے بولا۔ یہ ہے حسن و مستی کی دیوی' آج کی شام' آج کی رات' اس کے نام' تالیوں کی گونج اور سازوں کی تھرتھراہٹ میں اُسے یوں لگا جیسے اس کی پتھر کی آنکھ پھڑکی ہے لیکن اس نے اسے اپنا واہمہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

سٹیج پر مجسمے کے گرد ایک جنگلی قسم کا ڈانس شروع ہو چکا تھا۔ کچھ نوجوانوں نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال ڈال کر اپنا بدن اس کے ساتھ رگڑ رگڑ کر اس کے گرد جھوم رہے تھے۔ مجسمے کے ادھ کھلے ہونٹ اور سپردگی کے نشے میں ترچھی آنکھیں دیکھنے والوں کو فریب میں مبتلا کرتی جا رہی تھیں۔ ایک نوجوان نے بے قابو ہو کر مجسمے کے گرد لپٹا ہوا ساڑھی نما سارا کپڑا کھول دیا۔ مجسمے کے اُبھار بالکل قدرتی اور انتہائی اثر انگیز لگ رہے تھے۔

ننگے مجسمے نے ناچتے ہوئے نوجوان کے اندر جیسے آگ بھر دی۔ وہ سٹیج کے قریب کھڑے ہو کر پسینے میں ڈوب رہا تھا۔ اُسے پھر یوں لگا جیسے اس کی پتھر کی آنکھ پھڑک رہی ہے لیکن سٹیج کے ہوشربا تماشے نے اُسے اپنی طرف کھینچے رکھا۔ مجسمے کے گرد ہجوم بڑھتا جا رہا تھا کہ سٹیج کے ایک کونے سے ملک کی مشہور رقاصہ پھڑ پھڑاتی ہوئی نمودار ہوئی۔ رقص کرتے کرتے وہ ناچتے ہوئے نوجوانوں کے دائرے میں داخل ہوئی اور پھر کمال مہارت سے وہ ان سب کو مجسمے سے دور لے گئی۔ پھر اس نے اپنی گلابی قبا اُتارتے ہوئے خود کو نیم عریاں کرتے ہوئے۔ گلوکار کے ہاتھ سے مائیک لے کر نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا: ''کیا میرے ہوتے ہوئے اس پتھر کے بے جان مجسمے کی یہاں ضرورت ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے لرزتی ہوئی دھنوں کے ساتھ اپنے جسم کو اس طرح لہرایا کہ سب نے چیخ کر اس کو داد دی۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں اور چہرے کی اداؤں سے سب پہ ظاہر کر دیا کہ وہ مجسمے کی طرح بالکل بے لباس ہونے والی ہے۔ گاتے ہوئے گلوکار نے مائیک لے کر دوبارہ اپنے ٹوٹے ہوئے بولوں کو بکھرتے ہوئے سروں سے جوڑا اور سٹیج پر زندگی اپنی تمام مستی اور طاقت کے ساتھ رقص میں گم تھی۔ سٹیج کے وسط میں خوبصورت اور عریاں مجسمہ ایک ڈیکوریشن پیس کی طرح منجمد کھڑا رہ گیا۔ دھنوں پہ ناچتی ہوئی اداکارہ کو اپنی بانہوں میں دبوچتے ہوئے ایک جوشیلا نوجوان بغیر مائیک کے چیختے ہوئے بولا: ''دوستو! جب جنسی و مستی کی یہ زندہ دیوی موجود ہے تو پتھر کی بے حسی دیوی کا کیا کرنا۔''

اس کے جواب میں تائید کا ایک زوردار نعرہ اُبھرا۔ ایک اور جوان اداکارہ کے جسم پر ہاتھ مسلتے ہوئے بولا: ''زندہ دل لوگو۔ لمس کے اس زندہ اور گرم جسم کے آگے۔ وہ مجسمہ بے کار ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے ناچتے ہوئے حقارت کے ساتھ سنگِ مرمر کے مجسمے کو کاندھا مارا۔ لمس کے نشے میں چُور ایک اور جوان نے مجسمے کو لات دے ماری اور مجسمہ سٹیج پر گر کے گردن سے علیحدہ ہو گیا۔ اداکارہ نے ناچتے ناچتے بے لباسی کا مظاہرہ جاری رکھا۔ رفتہ رفتہ وہ بے قابو ہوتی جا رہی تھی۔ سٹیج پر دیکھتے دیکھتے نیم عریاں رقاصاؤں کی تعداد بڑھ گئی۔ وہ مستی اور حرارت میں گم تھا کہ اُسے یوں لگا جیسے اس کی پوری قمیص بھیگی ہوئی ہے۔ اس نے چونک کر اپنے لباس اور بدن کو ٹٹولا اور پھر اس کا ہاتھ چہرے سے ہوتا ہوا آنکھ تک پہنچ گیا۔

پتھر کی آنکھ پگھل رہی تھی۔ اُس نے اپنی پگھلی ہوئی آنکھ پر ہاتھ رکھا اور ہال سے باہر آ گیا۔

لال چونا

بلند اقبال

گجی نے سوکھے چونے کے ڈلے پانی کے ڈرم میں ڈالے اور پھر بالٹی بھر کر پانی ڈرم میں انڈیل دیا' کچھ ہی دیر میں ڈرم سے دھواں اُٹھنے لگا' گجی نے چونا چھاننے کا سوتی کپڑا ڈرم کے منہ پہ کس دیا اور ڈرم کو کھسکا کر مسجد کے صحن کی دیوار سے لگا دیا اور پھر نلکے کے پاس پڑی اینٹ پر بیٹھ کر وضو کرنے لگا۔ اُسے پتا تھا کہ چونے کو بھیگنے کے لیے کچھ گھنٹے تو چاہیے تبھی تو اُس کا رنگ دیوار پر ڈسٹمبر کی طرح چڑھے گا۔ گجی اور چونے والوں کی طرح چلتا کام نہیں کرتا تھا' وہ ایک خاندانی چونے والا تھا۔ برسوں سے اُس کے باپ دادا یہی کام کرتے تھے۔ وہ صرف دس سال کا تھا اور اُس نے اپنے باپ کے ساتھ مل کر اردگرد کے محلے کی کئی منزلہ عمارتوں پہ چونا رنگ دیا تھا' وہ اکثر اپنی بیوی کو بڑے فخر سے محلے کی اُن تمام عمارتوں کے نام ایک ایک کر کے گنا تا اور جب ہاتھوں کی انگلیاں ختم ہو جاتی تو باضابطہ کاغذ پر فہرست بنانے لگتا' اس دوران وہ اکثر بھول جاتا کہ اُسکے اور اُسکے باپ کے کارنامے سنتے سنتے اُس کی بیوی گہری نیند میں چلے گئی ہے۔ گجی کو دُکھ تھا کہ اُس کی بیوی اُس کے اکلوتے بیٹے سے چونے والا کام نہیں کروانا چاہتی اور یہ برسوں پرانا خاندانی پیشہ اب اُسکے نام پر ہی ختم ہونے والا ہے۔ مگر جب سے اس کے یار جیرے کی موت ہوئی تھی وہ خود بھی اپنی بیوی کی طرح سوچنے لگا تھا' جیرے کا مرنے سے دو دن پہلے ہی تو بیاہ ہوا تھا' بس قسمت کی خرابی' حاجی صاحب کی چوتھی منزل پہ چونا کرتے ہوئے لکڑی کے پھٹے پر سے پاؤں پھسلا اور اتنا فاناً زمین پہ ایسا گرا کہ اگلا سانس بھی نصیب نہیں ہوا' اُس دن اُس نے اپنی بیوی کی بات مان لی اور اپنے بیٹے کو کام سے اُٹھوا کر اسکول میں داخل کرا دیا' اب وہ سارا دن اسکول میں کتابیں پڑھتا اور شام میں مسجد میں سپارے پڑھنے جاتا۔ کل ہی تو مولوی صاحب نے کہلا بھیجا تھا کہ مسجد کی دیواروں کا چونا پپڑیا بن کر گر رہا ہے' پہلے مسجد میں دن میں دو بار جھاڑو لگتی تھی اور اب ہر دو گھنٹے کے بعد پوری مسجد صاف کرنی پڑتی ہے۔ گجی خوش تھا کہ اللہ کے گھر کا یہ بابرکت کام بھی اُس کے نصیب میں تھا' وہ تو یوں بھی یہ کام فی سبیل اللہ ہی کرنا چاہتا تھا۔ اگلے دن فجر کی اذان سے پہلے ہی وہ لکڑی کے پھٹے' بانس' سیڑھی' کچیاں اور چونے کے خالی ڈبے اور بالٹیاں لے کر مسجد پہنچ گیا' سارا سامان صحن کی دیوار سے لگا کر کونے میں رکھے ہوئے چونے کے ڈرم میں ایک لکڑی سے چونے کو زور زور سے ہلانے لگا اور پھر رات بھر کے بھیگے ہوئے چونے کے گاڑھے سفید رنگ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اچانک اُسے لگا جیسے اُس کے پیچھے کوئی کھڑا ہوا ہے' پیچھے پلٹ کر دیکھا تو اُس کا لاڈلا بیٹا سر پہ مسجد کی چٹائی والی ٹوپی لگائے چونے کے ڈرم کو گھور رہا تھا۔ اُس نے گجی کو مسکرا کر دیکھا اور پھر سنت پڑھنے صحن سے مسجد کے اندر چلا گیا۔ گجی نے سوچا ابھی فجر کے بعد وہ پہلے مؤذن صاحب کے حجرے سے سفیدا شروع کرے گا پھر دیواروں اور چھت کو پورا کرتا ہوا باہر صحن کی طرف آئے گا' اُس کے بعد صحن کے اطراف کی دیواریں' وضو والی ٹنکی اور آس پاس کا حصہ' آخر میں گنبد' مینارے اور پھر باہر کی دیواریں۔ اچانک مولوی صاحب نے اسپیکر پر گلا کھنکارا اور آذان شروع کی۔۔۔ مگر اس سے پہلے کے مولوی صاحب کی آواز آذان بنتی' فضا بندوق کی گولیوں سے گونجنے لگی۔ گجی کو اچانک لگا جیسے مسجد میں کسی نے مشین گن کا برسٹ چلا دیا ہے یکا یک مسجد میں چیخوں کی آوازیں' بھگدڑ' دھواں اور بارود کی بدبو پھیل گئی۔ لوگ مسجد میں سے بھاگ کر صحن کی طرف آتے ہوئے لاشوں کی طرح گر رہے تھے' کسی کو نہیں معلوم گولیاں کہاں سے آ رہی تھی۔ ایک طوفان تھا' جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گجی کے کچھ سمجھ نہ آیا تو چونے کے ڈرم کے پیچھے اپنے دونوں کانوں کو گھٹنوں میں دے کر کانپنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد گولیوں کی آوازیں بند ہو گئیں' تھوڑی دیر میں اُسے لگا کہ جیسے ایک موت کی سی خاموشی ہے اور پھر فضا چیخنے اور درد سے کراہنے والوں کی آوازوں سے گونجنے لگی۔ ڈرتے ڈرتے گجی نے آنکھیں کھولی۔ سارا صحن زخمیوں اور لاشوں سے بھرا پڑا تھا' اُسے یاد آیا کہ اُس کا لاڈلا بھی تو اندر نماز پڑھ رہا تھا' گجی دیوانہ وار صحن سے بھاگتا ہوا مسجد کے اندر داخل ہوا' سامنے ہی اُس کے بیٹے کی گولیوں سے چھلنی لاش خون میں رنگی دوسرے نمازیوں کے ساتھ پڑی تھی۔ مسجد کی دیواریں اور چھت خون سے رنگی ہوئی تھی۔ اُس نے جھک کر اپنے بیٹے کے جسم کو ٹٹولا اور پھر بے اختیار اُس کے منہ کو چومنے لگا۔ گجی نے اپنے اکلوتے بچے کی لاش کو سینے سے لگایا اور دھاڑے مارتا ہوا مسجد کے صحن میں آ گیا اور پھر چیخ چیخ کر آسمان کی طرف دیکھ کر رونے لگا' جب اُسے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بچے کی لاش کو فرش پہ ڈال کر روتا پیٹتا بھاگتا ہوا چونے کے ڈرم کے پاس آیا' اپنے دونوں خون سے لتھڑے ہاتھ چونے کے ڈرم میں گھمانے لگا پھر کچی اُٹھائی اور روتے ہوئے صحن کی باقی دیواروں کو لال رنگنے لگا۔

''حریمِ ادب'' متوازی پریس کی نظر میں

پریس	مبصّر
ا۔''استعارہ'' دہلی	حقانی القاسمی
۲۔روزنامہ''جنگ''ملتان	رضی الدین رضی
۳۔روزنامہ''پاکستان''لاہور	اظہر سعید
۴۔روزنامہ''دن''لاہور	جمیل احمد عدیل
۵۔ماہنامہ''ق''ڈیرہ اسماعیل خاں	طاہر شیرازی
۶۔ماہنامہ''تعمیرِ ادب''لیہ	عبداللہ نظامی
۷۔روزنامہ''پاکستان''لاہور	ناصر بشیر
۸۔روزنامہ''مشرق''کوئٹہ	سیّد نوید حیدر ہاشمی
۹۔روزنامہ''جسارت''کراچی	فہیم شناس کاظمی
۱۰۔روزنامہ''نوائے وقت''راولپنڈی/اسلام آباد	انوار فیروز
Daily "Dawn", Lahore۔۱۱	Shafqat Tanveer Mirza

ماہنامہ''استعارہ''دہلی بھارت

نام مجلّہ : حریمِ ادب
مرتبین : جاوید حیدر جوئیہ/سیّد تحسین گیلانی
ناشر : جاوید پلازہ ا۔سیٹلائٹ ٹاؤن/بورے والا/پوسٹ کوڈ ۶۱۰۱۰ (پاکستان)
مبصر : حقانی القاسمی

ادب میں کچھ دیوانے ایسے بھی ہیں جنہیں 'زیاں' کی نہیں 'زباں' کی فکر لاحق ہے۔ادب ان کے لیے ایک عبادت ہے۔انہی میں ڈاکٹر جاوید حیدر جوئیہ اور سیّد تحسین گیلانی بھی ہیں۔ان کا رسالہ ''حریمِ ادب'' حسن حبر اور ببر سے قاری کو مسحور کر رہا ہے۔یہ ایک سہ لسانی رسالہ ہے جو مدروس مشمولات' فکر انگیز مباحث اور عمدہ تخلیقات کا جامع انتخاب ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ ادب کے جملہ اصناف کی نمائندگی ہو جائے۔کہہ مکرنیاں' دو بیتیاں' ماہیے' دوہے' قطعات' مرثیہ' طنز و مزاح' نظمیں' سفرنامہ' تبصرے' انشائیے' انٹرویو اور مضامین بھی شامل ہیں۔گویا ہر سطح کے قاری کے ذہنی اور فکری تغذیہ کا وافر مواد موجود ہے اور قاری کے مطلبات کا خیال رکھا گیا ہے۔یہ رسالہ کیا ہے۔عمرو عیار کی زنبیل ہے۔جو تلاش کیجیے یا جس کا تصور کیجیے وہ چیز حاضر۔لگتا ہے اس ''حریمِ ادب'' میں طلسماتی فسوں بھی کارفرما ہے۔اس میں جو فکر انگیز مقالات ہیں اُن میں گوپی چند نارنگ کا ''مابعد جدیدیت'' ناصر عباس نیر کا ''اہم مضمون'' اردو میں ساختیات کے مباحث' جمیل آذر کا ''ادبی ساختیات'' سلیم آغا قزلباش کا ''اردو افسانے میں کردار نگاری'' اور دیگر مضامین ہیں۔ناصر عباس نیر کا مضمون ان کی تنقیدی ظرف نگاہی' وسعت مطالعہ' قوتِ تفہیم و ترسیل کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔اس رسالے میں سے اردو میں تمام اہم تخلیق کاروں کی شمولیت سے لگتا ہے کہ جاوید حیدر جوئیہ نے کافی محنت اور ریاضت کی ہے۔اس میں ایک حصہ پنجابی کا بھی ہے جو کہانی' نظم' ماہیے اور غزلوں پر مشتمل ہے۔پنجابی زبان سے واقفیت نہ ہونے کے باوجود ان تخلیقات کو پڑھنے کا ایک الگ ہی ذائقہ اور لطف ملتا ہے۔تحسین گیلانی کی ایک پنجابی غزل کا شعر ہے:

دل نہ چھڈیں وچ سمندر
بیڑی بھانویں ڈبی جاوے

یہ پڑھ کر کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے لیکن اس شعر میں جو کیفیت اور سحر کاری ہے وہ باطن کو متاثر ضرور کرتی ہے اور اس کے آہنگ سے کوئی نہ کوئی معنی ضرور دل پہ منکشف ہوتا ہے۔

انگریزی حصے میں بھی اہم مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ مابعد جدیدیت پر وزیر آغا' انا میزی شمل سے متعلق قاضی جاوید کا مضمون' ضیاء جالندھری پر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اثرات' نظمیں' ہائیکو' تبصرے شامل ہیں۔ انگریزی حصہ بھی قابلِ قدر ہے اور اس میں کوشش کی گئی ہے کہ اردو کے اہم فکری نظری مباحث سے انگریزی داں حلقے کو متعارف کرایا جائے اور یہاں کی تہذیب و ثقافت سے آگہی عطا کی جائے۔ مجموعی طور پر یہ کوشش بہت کامیاب ہے۔ مجلّہ کے مدیران' ادب کے حبض و نبض پہ گرفت رکھتے ہیں مگر آرٹیکلز کے احتیاز سے زیادہ انھیں تخلیقات کے ارتکاز اور ارتباط پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے تاکہ رسالہ بہتر سے بہتر ہو اور اس کی خوش سلیقگی اور حسنِ ترتیبی سے قاری کو اور زیادہ مسحور ہونے کا موقعہ ملے۔

''جنگ'' ملتان ۹ جون ۲۰۰۴ء

۔۔۔ اور اب احوال اس ادبی کتابی سلسلے کا جسے بورے والا سے جاوید حیدر جوئیہ اور سید تحسین گیلانی نے شائع کیا ہے'' حریم ادب'' بورے والا کی ایک فعال ادبی تنظیم ہے۔ یہ تنظیم 1964ء میں قائم ہوئی اور اسے بورے والا کی پہلی ادبی تنظیم کہا جاتا ہے۔ اس کے بانیوں میں پروفیسر عبدالرحیم بھٹہ' پروفیسر منشا سلیمی' پروفیسر نثار احمد' ایم ڈی اسلم' جلیل نقوی اور دیگر شامل ہیں۔ کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد یہ تنظیم غیر فعال ہوگئی۔ اس کا دوبارہ احیاء 1997ء میں جاوید حیدر جوئیہ نے کیا۔ انہوں نے اس تنظیم کے زیر اہتمام تنقیدی اجلاس منعقد کرائے مختلف تقریبات اور مشاعرے بھی ہوئے لیکن اب'' حریم ادب'' کے نام سے ایک کتابی سلسلے کا اجراء بھی کر دیا گیا۔ یوں ایک ادبی تنظیم نے اب ادبی مجلّے کا روپ دھار لیا ہے۔ اردو' پنجابی اور انگریزی مضامین پر مشتمل اس مجموعے کے بارے میں 2 مرتبین کا کہنا ہے کہ'' حریم ادب'' ادب کی حرمت قائم رکھے گا وہ اس کے ذریعے صحت مند ادبی مباحث بھی شروع کرنا چاہتے ہیں۔ 200 صفحات پر مشتمل اس مجلّے میں برصغیر پاک و ہند کے نامور قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ سنجیدہ موضوعات پر مضامین اس کتابی سلسلے کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ خاص طور پر سے ساختیات کے حوالے سے مضامین ادب کے طالب علموں کو ساختیاتی تنقید سے روشناس کرائیں گے۔ نظموں اور افسانوں کا حصہ بھی قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے'' حریم ادب'' کے مطالعے کے دوران اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ساتھ ہمیں رفیق سندیلوی کی ایک نظم'' عجیب ما فوق سلسلہ تھا'' نے اپنے حصار میں لے لیا۔ نظم کی چند لائنیں ملاحظہ فرمائیں:

'' عجیب مافوق سلسلہ تھا/ شجر جڑوں کے بغیر اُگنے لگے تھے/ خیمے طنابوں' چوبوں کے آسرے پر نہیں کھڑے تھے/ چراغ لو کے بغیر جلنے لگے تھے/ دریا بغیر پانی کے بہہ رہے تھے/ یہ اس زمانے کی ہے کہانی/ کہ جب دعائیں گرفتہ پا تھیں/ رکی ہوئی چیزیں قافلہ تھیں۔

'' حریم ادب'' جنوبی پنجاب سے شائع ہونے والا ایک معیاری مجلّہ ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ تسلسل کے ساتھ شائع ہو پائے گا یا نہیں' مرتبین کا کہنا ہے کہ وہ اس کتاب کو ہر ماہ بعد شائع کر دیں گے دعا ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن ہمارے ہاں ادبی جریدے کی اشاعت کو گھر پھونک تماشا دیکھنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور'' حریم ادب'' کے مرتبین کا کہنا ہے کہ

زیاں ہے عشق میں یہ ہم بھی جانتے ہیں مگر

نوٹ:۔'' حریم ادب''، تنظیم کی تشکیل نو' جمیل احمد عدیل صاحب کے زیر صدارت اجلاس میں ہوئی تھی نیز'' حریم ادب'' کتابی سلسلہ ہر ماہ شائع کرنے کا پروگرام نہیں رہا۔ (مرتبین)

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور

ادب' ثقافت کا جزو لاینفک ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے جس خطے کی تاریخ اور انسان فہمی کی ضرورت پیش آئے تو وہاں کے شعر و ادب کا تذکرہ ناگزیر ہوتا ہے۔ علم البشریات کے ماہرین تو قوموں' خطوں اور تہذیبوں کے تاریخی' جمالیاتی اور حیاتیاتی ارتقاء کا مطالعہ کرنے کے لیے قبل از

تہذیب کے انسانی تخلیقی عمل کا مطالعہ صنمیات اور اسطوریات کے بغیر نامکمل سمجھتے ہیں کیونکہ انسانی مشاہدے اور تجربے نے جب زبان استعمال کرنا شروع کی تو اپنے حسی تجربات اور تحیرات کو تخلیقی عمل کے ذریعے اسطور (Mythologies) سازی میں آشکار کیا۔ اور حیاتیاتی نقطۂ نظر کو اگر صائب تصور کیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادب کا تخلیقی عمل انسانی ارتقاء میں انسان کی نفسیاتی، ذہنی اور جسمانی ترقی کے ساتھ ساتھ پروان چڑھا ہے۔ علم نفسیات میں فرائڈ کا دریافت کردہ لاشعور Unconscious کا نظریہ اور پھر بعد ازاں یونگ کا اجتماعی لاشعور Collective Unconscious کا نظریہ اسی حقیقت کا غماز ہے کہ تخلیقی شعر و ادب بنی نوع انسان کا مشترکہ سرمایہ ہے یوں بھی جبلی سطح پر انسانی کی شدید آرزو ہے کہ وہ اپنے تجربے Experience کو اپنے ہم نسلوں کے ساتھ Share کرے۔ اول اول یہ اشتراک ان تحریروں کے ذریعے کیا گیا جو ہزاروں سال قبل انسان نے پتھروں، پتوں، چمڑے اور مٹی کی الواح پر لکھیں۔ یہ الفاظ انسان کی اسی اندرونی خواہش کا اظہار ہیں کہ وہ اپنے جانے اور سمجھے ہوئے کو دوسروں تک پہنچانا چاہتا تھا اور انھیں محفوظ کرنے کا اہتمام بھی کرتا تھا۔ کاغذ کی اس ایجاد نے تحریر کی ترسیل کو انسانوں کے مابین ہر لحاظ سے آسان بنایا۔ کروڑوں اربوں کی تعداد میں کاغذی مخطوطے اور کتابیں اسی حقیقت پر دال ہیں۔ تاریخ انسانی میں انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کوئی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے اور مستقبل کا مورخ ان کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے اس انقلابی تبدیلی کے تذکرے کے بغیر ایک پل کے لیے بھی آگے نہیں بڑھ پائے گا جسے آج انفارمیشن ٹیکنالوجی کا نام ملا ہے۔ تاہم یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انسان نے تحریر کے اس انداز کو جہاں حد درجہ سہل اور ترسیل میں سریع (Swift) کیا ہے وہیں اس کی حفاظت کو قدرے خطرے میں بھی ڈالا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض علمائے بشریات کاغذ کی تحریر یعنی کتاب کو انسانی تجربات کے اشتراک کا محفوظ ترین طریقہ خیال کرتے ہیں۔ یوں بھی دیکھا جائے تو انفارمیشن کا زیادہ زور اطلاعات کی فراہمی ہے (جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے) کتاب کی اہمیت کو نظر انداز کرنا فی الحال ممکن نہیں ہے۔ امریکہ اور یورپ کے علاوہ سکینڈے نیویا اور ایشیا و افریقہ میں ہر روز لاکھوں کی تعداد میں ادب و شعر کی کتابیں چھپتی اور بکتی بھی ہیں۔

اردو ہمارے ملک میں رابطے کی اہم ترین زبان کا درجہ رکھتی ہے اور غالباً یہی صورتحال بھارت کی بھی ہے جہاں سینکڑوں علاقائی زبانوں اور بولیوں کی ثقافتی اہمیت کے باوجود اردو کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ زبان تقریباً ڈیڑھ ارب انسانوں کے مابین اشتراک خیال کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ اس لیے برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش میں اردو کی کلیدی اہمیت سے کسی کو شاید ہی انکار ہو۔ اردو میں بے شمار ادبی رسائل اور جرائد کے نام لیے جاسکتے ہیں جو بیسیوں دہائیوں سے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان ادبی تخلیقات، مسائل، زبان اور علمی و فکری مباحث کو فروغ دیتے آئے ہیں۔ ایک زمانے میں کسی بھی ادیب و شاعر کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنا مجموعہ کلام یا تصنیف شائع کرنے سے پہلے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں اپنی نگارشات کے ذریعے اپنی پہچان بنائے۔ یوں ان جریدوں کی اہمیت بھی زیادہ تھی اور شعر و ادب سے منسلک افراد اور ادارے (سکول، کالج، یونیورسٹیاں اور ادبی تنظیمیں) اپنے افراد کو ان رسائل سے استفادہ کرنے کا مشورہ دینا اپنا فرضِ اولین سمجھتے تھے۔ لہٰذا یہ رسائل خریدے بھی جاتے تھے اور لکھنے والے انھیں شوق سے شائع بھی کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ میڈیا کی فراوانی اور ادباء و شعراء کی سہل پسندی کی وجہ سے انفرادی سطح پر تو تخلیقی ادب کی کتابیں بہت زیادہ شائع ہونا شروع ہوگئیں، لیکن اجتماعی طور پر جمع کیے گئے تخلیقی و علمی تجربات کی اشاعت بصورت رسائل بہت ہی کم ہوگئی۔ ایک اور اہم بات جو گزشتہ تین چار عشروں سے اس کمی کا سبب بنی وہ تھی کہ علاقوں کی اپنی اپنی زبانوں نے زیادہ اہمیت اختیار کر لی (اور بجا طور پر کر لی) نیز گلوبل ولیج کے تصور کے ساتھ ہی انگریزی زبان نے ایک خاص اہمیت اختیار کر لی۔ پنجاب میں پنجابی زبان کی اہمیت کا احساس اس طرز عمل کا ایک اظہار ہے جو بجا طور پر درست اور صائب ہے اس صورتحال کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ ادبی رسائل و جرائد علاقائی، ملکی رابطے کی زبان اور بین الاقوامی رابطے کی زبان پر اپنی توجہ مرکوز کرتے۔ تاہم یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ ملک خداداد میں یا تو اردو کے جرائد شائع ہو رہے ہیں یا پھر علاقائی زبانون میں ایسے ادبی اخبارات اور مجلے چھپتے ہیں جو صرف اپنے اپنے کلچر کی نمائندگی کا حق ادا کرتے ہیں۔ تیسری قسم کے جرائد وہ ہیں جو بین الممالک رابطہ کی زبان انگریزی کو اپنا ذریعہ ابلاغ تو بناتے ہیں لیکن بالعموم ادبی اعتبار سے کوئی ایک دو ہی ایسے جرائد ہوں گے جو انگریزی میں تخلیق ہونے والے اپنے ملک اور علاقے کے مصنفین اور شعراء و ادباء کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوں۔ ضرورت یہ ہے کہ ان تینوں زبانوں کی موجودہ اہمیت کے پیش نظر ادبی رسائل و جرائد اپنے مشمولات ترتیب دیں تا کہ ایک طرف علاقائی زبانوں (مثلاً پنجابی، سندھی،

بلوچی، پختون، سرائیکی) کو اپنا مقام مل سکے دوسری طرف اردو کے ذریعے برصغیر کی آبادی تک یہ پہنچ سکیں اور تیسرے عالمی سطح پر علمی و ادبی اور فکری منظر نامے کے ساتھ بذریعہ انگریزی منسلک ہوا جائے تاکہ فکر مشرق، فکر مغرب کے روبرو آ سکے اور ایک بین التہذیبی ادبی رابطے کا آغاز ہو۔ معدودے چند جرائد یہ کام کر بھی رہے ہیں لیکن اول تو وہ عالمی فکری رو کو پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں اور دوم وہ پاکستان یا بھارت تک محدود ادبا و شعرا تک پہنچ پاتے ہیں اور مغرب میں ان کی رسائی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ ''حریم ادب'' کتابی سلسلہ کا آغاز اس ساری تمہید کے بعد ایک بہت بڑی نعمت سے کم نہیں۔ یہ کتابی سلسلہ ڈاکٹر جاوید حیدر جوئیہ اور سید تحسین گیلانی نے مرتب کیا ہے جس کی کتاب اول حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ مرتبین اسے ہر چھ ماہ بعد (ششماہی) شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ جریدہ بین الاقوامی سطح کے نامور قلم کار اور خطاط مصور بشیر موجود کے خوبصورت ٹائیٹل سے آراستہ و پیراستہ تو ہے ہی اس کے مندرجات متذکرہ بالا تینوں زبانوں یعنی اردو، پنجابی اور انگریزی تخلیقات و نگارشات سے ترتیب پائے ہیں۔ دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ جریدہ بلاشبہ ملک کی ثقافت ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی ادب و ثقافت کا نمائندہ بھی کہا جا سکتا ہے اردو میں تقریباً تمام اصناف نثر و شعر جو ضخامت کتاب میں ممکن تھے شامل ہیں۔ نعت، افسانوی ادب، انشائیہ اور انشائیہ نگاری، تنقیدی و فکری مباحث مثلاً ساختیات مابعد جدیدیت (Postmodernism) عملی تنقیدی نثری و شعری مطالعات، ماہیے، دوہے، قطعات، مرثیہ، سفر نامہ، طنز و مزاح، غزلیات اور نظمیں ایسی ہی خاص اصناف ادب ہیں۔ حصہ پنجابی میں (چونکہ یہ کتابی سلسلہ پنجاب سے شائع ہوا ہے) نظمیں، غزلیں، افسانے، نعت، حمد، دوہے، ماہیے، جو مصرعے بڑی شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہیں حصہ انگریزی کو نہایت خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ پنجابی کہانیوں کے تراجم بھی شامل اشاعت ہیں مرتبین کا کہنا ہے کہ آج تک تراجم کی اُلٹی روش قائم رہی ہے۔ یعنی مغربی علوم و نظریات کو تو علاقائی اور قومی اہمیت کی زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا رہا ہے (اور یوں ہمارے ادیب و شاعر کو مغرب سے مرعوب کر دیا جاتا رہا ہے) لیکن مشرقیت اور مشرقی اندازِ فکر (جو بنیادی طور پر مابعد الطبیعاتی ہے) کو مغرب کی مخصوص سائیکی کا حصہ بنانے کی کوششیں بہت کم ہوئی ہیں۔ ورنہ تاریخی طور پر علامہ اقبال ہی کی طرف دیکھیں تو مغرب نے مشرقی افکار تازہ سے روشنی حاصل کی ہے۔ اعلیٰ نظموں کے تراجم اور اوریجنل انگریزی نظمیں بھی شامل اشاعت ہیں۔ ڈاکٹر جاوید حیدر جوئیہ اردو، پنجابی اور انگریزی میں لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے تراجم کو اصل (Original) کا نعم البدل تو قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ترجمہ کی اپنی مشکلات ہوتی ہیں تاہم یہ مفہوم کی ترسیل اور ابلاغ کے لیے نہایت قریب الاصل تراجم ہیں۔ بھارت، امریکہ، سویڈن، جرمنی وغیرہ کے تخلیق کار اور مصنفین ''حریم ادب'' سے وابستہ ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ کتابی سلسلہ باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا تو بین الاقوامی سطح پر منفرد پہچان قائم کرنے کے بعد اسے برقرار بھی رکھ سکے گا۔ ''حریم ادب'' کی ایک اور خاص بات اس کا ادبی گروہ سازی اور شخصیت پرستی سے احتراز ہے۔ مرتبین نے تمام روشن خیال اور مثبت فکر لکھنے والوں کو یکساں طور پر اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ آئندہ بھی ''حریم ادب'' اپنی غیر جانبداری کو برقرار رکھے گا اور اسے ہر اعتبار سے خالص ادبی شمارہ بنائے رکھے گا۔ (اطہر سعید)

''برجستہ'' روزنامہ ''دن'' لاہور

صاحبو! شاعری، ادب پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے والا شخص جس ادبی جریدے کو سامنے لائے گا وہ پھر خاصے کی چیز تو ہوگی۔ واقعتاً ''حریم ادب'' ایک غیر معمولی جریدہ ہے جسے جادو کے حسن ادارت کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ 344 صفحات پر مشتمل اس دوسرے پرچے کا مزاج نہایت سنجیدہ ہے۔ ہر صفحے پر بے شمار اپنی علمی توضیحات کے ساتھ خود موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پردے کی اوٹ میں مستور ہو کر ادارت کے حق میں نہیں ہیں بلکہ وہ بے نقاب ہو کر نہ صرف سامنے آتے ہیں بلکہ قاری اور لکھاری کے درمیان ایک پُل کا فریضہ بڑے احسن انداز میں ادا کرتے ہیں۔ ''حریم ادب'' کو ہندوستان اور پاکستان کے صفِ اوّل کے ادباء و شعراء کا علمی تعاون حاصل ہے۔ اس جریدے میں التزاماً غیر مطبوعہ تخلیقات و تحریرات شائع کی جاتی ہیں اور بڑے ہی سلیقے اور جمالیاتی ترتیب کے ساتھ خود مدیرِ اعلیٰ کے اداریے ان کے علم و فضل پر شاہد ناطق ہوتے ہیں جو مباحث کے نئے در وا کرتے ہیں۔ واقعہ یہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس تربیت یافتہ علمی و ادبی شخصیت ہونے کا جو Edge موجود ہے وہ انھیں عام مدیران سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں غیر معیاری تحریر کی کھپت کی سرے سے گنجائش ہی موجود نہیں ہے۔

''حریم ادب'' کا دوسرا وصف اس کا مستقل English Section ہے۔ جناب رحیم بھٹہ کے تراجم اپنی مخصوص تخلیقی شان کی بدولت قارئین کے دامن نگاہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ پنجابی حصہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ کلیم شہزاد ایسے نامور پنجابی رائٹر کی چیزیں اس پرچے کو یقیناً مزید مقبولیت عطا کریں گی۔ خطوط کا حصہ قطعاً رسمی نہیں ہے بلکہ اچھا خاصا ہائیڈ پارک ہے جس میں فکر و نظر کے بحث اپنی زندہ گرمی کے ساتھ ایک ہنگامہ سا برپا کیے ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر ''حریم ادب'' کا ظاہر بھی اپنے باطن کی طرح مکرم ہے۔ ''اوراق'' اور ''فنون'' کی جگہ اگر کسی پرچے نے کبھی حاصل کر لی تو یقیناً وہ ''حریم ادب'' ہی ہوگا' بشرطیکہ یہ تواتر سے چھپتا رہے۔ سیّد تحسین گیلانی نے بھی بطور معاون مرتب خاص محنت کی ہے۔ شاباش سب رسالدارو!

ماہنامہ ''ق'' ڈیرہ اسماعیل خان

زیرِنظر رسالہ بورے والا کی معروف ادبی تنظیم ''حریم ادب'' کا پہلا کتابی سلسلہ ہے۔ جاوید حیدر جوئیہ اور ان کے رفقائے کار کے زیرِاہتمام اس کا اجراء کیا گیا ہے۔ اس جریدے میں اردو ادب کی ہر صنفِ سخن کو مناسب جگہ دے کر مدیران نے ہنرمندی اور بہترین سخن فہمی کا ثبوت دیا ہے۔ ملک کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی قلمی معاونت ''حریم ادب'' کے روشن مستقبل کا پتہ دیتی ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ اس پر اگر اسی طرح توجہ دی گئی تو جلد ہی اس کا شمار ملک کے ممتاز ادبی جرائد میں کیا جائے گا۔

ماہنامہ ''تعمیرِ ادب'' لیّہ

جاوید حیدر جوئیہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی ادارت میں حریم ادب کا دوسرا کتابی سلسلہ شائع ہو گیا ہے' جس میں نامور لکھاریوں کی تحریریں' شعراء کرام کا تازہ کلام اور ادبی کتب اور تنظیموں کا تعارف شامل ہے۔ جاوید حیدر نے شمارہ میں ایک خاص حسنِ ترتیب سے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ مرتبین نے انتہائی محبت اور لگن کے ساتھ اردو کے ساتھ انگریزی حصہ بھی ترتیب دیا ہے' جو کہ ان کی شبانہ روز کاوشوں کا ثمر ہے' دیدہ زیب اور خوبصورت سرورق نامور مصور ''موجد'' نے تخلیق کیا ہے۔ جو کہ قابلِ صد تحسین ہے۔ حریم ادب کی کامیاب اشاعت نے ادب کی دنیا میں ایک گراں قدر اضافہ کر دیا ہے۔ اللہ کرے یہ شمارہ جاوید حیدر جوئیہ اور دیگر معاونین کی نگرانی سے پھلتا پھولتا رہے۔

کالم ''چیک پوسٹ'' روزنامہ ''پاکستان'' لاہور

پنجاب کے ایک زرخیز علاقے بورے والا سے ''حریم ادب'' کے نام سے ایک کتابی سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اس کا دوسرا شمارہ میرے سامنے ہے۔ جاوید حیدر جوئیہ اور سیّد تحسین گیلانی کے ذوق نے اس کی ترتیب میں ایک خاص حسن پیدا کر دیا ہے۔ تخلیق اور تنقید کے انتخاب کے سلسلے میں مرتبین نے خاصی احتیاط سے کام لیا ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے بڑے نام جمع کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ معیاری اور عمدہ ادب کی پیشکش کو مدِنظر رکھا ہے۔ یہ شمارہ کسی بھی طرح ''فنون''' ''اوراق'' اور ''سیپ'' کے معیار سے کم تر نہیں' البتہ یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ اس میں تمام تخلیقات' خصوصاً غزلیں' غیر مطبوعہ ہیں۔ اہم انشائیہ نگار اور غزل گو جناب اکبر حمیدی کا انٹرویو ادب کے سنجیدہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے' جس میں شاعری' انشائیے اور تنقید پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ چپ چاپ محوِ تخلیق رہنے والے جناب اکبر حمیدی کا یہ شعر ہمیں آئینہ دکھا رہا ہے۔

نسخے الماریوں میں بند رہے
چلتے پُرزوں نے شہرتیں پائیں

''حریم ادب'' بھی ایک نسخہ ہے مگر یہ الماری میں بند نہیں رہے گا۔

معیاری ادبی جریدہ کی اشاعت' روزنامہ ''مشرق'' کوئٹہ' ۱۲ فروری ۲۰۰۵ء

معیاری ادب کسی بھی معاشرے میں مثبت تبدیلیوں کا سبب بنتا ہے ادیب اور دانشور ہی ہیں جو اپنے قلم کے ذریعے لوگوں میں سوچ کی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں معیاری ادب میں زندگی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور معیاری و سنجیدہ ادب تخلیق کرنے میں مضافات میں بیٹھ کر بھی کئی ادب پر جلوہ گر رہتے ہیں معیاری اور سنجیدہ تحریر خود اپنے ہونے کی گواہی ہوا کرتی ہے۔ جبر و استبداد طبقاتی تضاد اور معاشرتی و سماجی حبس میں اگر

کہیں خوشبوؤں سے مزین بادِ بہار چل پڑے مصلحت انگیز عہد گریہ میں کہیں دبی دبی ہی سہی لیکن مسکراہٹ کا شائبہ محسوس ہو دیارِ تاریک میں اُمید کے تیل سے جلنے والے یقین کے دیئے کی اور اپنی دلآویز کرنوں کے ساتھ اپنے اطراف میں روشنی کا ہالہ بنا دے اور اگر دشت خارزار میں کہیں سرخ و سفید پھولوں کی ایک فصل اُگ آئے صدیوں سے پیاسی دھرتی پر اگر کہیں سے کوئی بوڑھا فلک اپنے ناتواں کندھوں پر برسات کا بوجھ اُٹھائے ہوئے اُتر آئے تو یقیناً حرفِ سپاس قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح آسمان خیال پر اُبھر آئیں گے صرف یہی نہیں بلکہ حالات اور سنگینی دوراں کے راستوں پر بھولے بھٹکے مسافروں کو دُور کہیں دُور منزل کے دُھندلے نشان اپنی طرف آنے کا اشارہ ضرور کرتے ہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دَور میں جبکہ مصنوعی زندگی مشینوں میں سمٹ آئی ہے فاصلے وقت کی رفتار میں پیوست ہوگئے ہیں آنکھوں نے چکا چوند کر دینے والی اتنی روشنیاں دیکھ لی ہیں کہ وہ لفظ دیکھنے کا بوجھ بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں رہیں۔ برق رفتار زندگی نے انسان کو چاروں شانے چت کر لیا ہے اب قدرتی مناظر اور فطرت سے قریب تر زندگی کا خواہاں انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس بجلی نما حصار میں قید ہو کر بھی گلوبل ولیج تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے اس سارے عمل میں وہ انسان کہیں کھو گیا ہے جو ہاتھ سے بنائے ہوئے قلم کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ذہن میں ذخیرہ کیے ہوئے ہزاروں لاکھوں لفظ سپردِ قرطاس کر کے اپنے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتا تھا اور ساتھ ساتھ کسی ان دیکھے فرض کی ادائیگی بھی ہوتی رہتی تھی آج کے اس انحطاط زدہ معاشرے میں کتاب معاشرے سے دُور ہوتی جا رہی ہے کتاب سے دُوری نے انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے لیکن اس برق رفتاری کے دَور میں بھی چند ایسے لوگ ہیں جو ادب کی ترویج و ترقی کے لیے ایسے کام سرانجام دیتے ہیں جنہیں اہلِ ادب قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ورنہ تو آج کل کے دَور میں ادب بھی چند ادبی لیڈروں کے ہاتھوں ٹریپ ہو رہا ہے اور قبضہ گری کی یہ رسم ادب میں بھی در آئی ہے مضافات میں بیٹھے ہوئے حقیقی شاعر ادیب و دانشور جنہیں جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو اہل ہونے کے باوجود بھی اس سطح پر نہیں آ پاتے جس مقام پر انہیں ہونا چاہیے لیکن یہ بات حقیقت ہے کہ مرکزی ادبی سیاست سے دُور کچھ ایسے درویش شاعر ادیب پاکستان کے ہر صوبے میں کثیر تعداد میں موجود ہیں جنہیں شہرت کی ہوس نہیں جو محض ادب کی ترویج کے لیے غیر معمولی نوعیت کے ادبی کام سرانجام دیتے ہیں ابھی پچھلے ہی دِنوں مجھے ادبی حوالے سے بہت زرخیز سرزمین بورے والا سے 2 ادبی جریدے موصول ہوئے جنہیں دیکھ کر مجھے پہلے تو حیرت ہوئی لیکن وہ حیرت چند لمحوں بعد خوشی میں تبدیل ہوگئی کیونکہ ان ادبی جرائد کے مرتبین حلقہ آوارگاں کے رکن نکلے ڈاکٹر جاوید حیدر جو کہ ایک سلجھے ہوئے اور سنجیدہ ادیب و شاعر ہیں بہت خوبصورت شعر کہتے ہیں اتنی بہت سی ملاقاتوں کے بعد بھی ان کی پُراسرار شخصیت مجھ پر عیاں نہ ہو سکی لیکن ان کی محبتیں اور خلوص آج بھی میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجود ہیں تحسین گیلانی تو میرے یار اور بہت پیارے انسان ہیں ان کے ساتھ گزرے ہوئے لمحے بھی میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں جب ان کے مرتب کردہ ادبی جریدے ملے جواب ادبی دنیا میں حریم ادب کے نام سے اپنی پہچان کے عمل میں ہیں تو میں نے اپنے چند دوستوں کو بھی دکھائے جن میں محسن شکیل، افضل مراد، حسن جاوید، پروفیسر بیرم غوری، سرور سودائی، سیّد محمود جاوید، سرور جاوید، ڈاکٹر عصمت درانی شامل ہیں اور ان سے معیاری جریدے کے لیے اپنی تخلیقات دینے کا وعدہ بھی کیا انہوں نے بھی اس ادبی رسالے کو پڑھنے کی خواہش ظاہر کی اور اسے ایک اہم اور غیر معمولی نوعیت کا ادبی جریدہ قرار دیا 344 صفحات پر مشتمل یہ خوبصورت ادبی جریدہ اپنے نام کی طرح بہت ہی پُرکشش لگا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اردو پنجابی اور انگریزی تخلیقات و فکری مباحث کا عالمی ادبی کتابی سلسلہ ہے جس میں پوری دنیا کے ادیبوں اور شاعروں کی نمائندگی ہے۔ بامقصد بامعنی معیاری اور سنجیدہ ادبی تحریروں، افسانوں، مباحثوں اور غزلوں نے اس کی اعزادیت کو کہیں بھی ٹھیس نہیں پہنچنے دی اس ادبی جریدے کے دو شمارے آ چکے ہیں اور تیسرا تیاری کے مراحل میں ہے اس کی قیمت بھی 100 روپیہ ہے جو مناسب ہے کیونکہ آج کل تو عام شاعری کی کتاب بھی 150 سے کم نہیں ملتی جس میں سوائے نثریہ غزلوں اور عنوان کے ساتھ غزلیں پڑھنے کے اور کچھ نہیں ملتا خیر ڈاکٹر جاوید حیدر جوئیہ اور تحسین گیلانی اس کامیاب اور منفرد کاوش پر مبارک باد کے مستحق ہیں اس اُمید کے ساتھ کہ وہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رکھیں گے اور ان کے معاونین عمران حیدر تھہیم جو بے وفا یار ہیں ان کی بے وفائی اپنی جگہ لیکن ہیں کمال کے شاعر وہ بھی اس مبارک میں برابر کے شریک بلکہ حقدار ہیں تو قیر تقی کے اشعار بھی غائبانہ سنے اور پڑھے بھی وہ بھی بورے والے کے اہم ترین نوجوان شعراء میں سے ہیں یقیناً ان کی معاونت بھی اس جریدے کے لیے کارآمد ثابت ہوگی۔

روزنامہ ''جسارت'' کراچی ۲۷ مارچ ۲۰۰۵ء

راہ مضمون تازہ بند نہیں
تاقیامت کھلا ہے بابِ سخن

ولی دکنی کا یہ شعر اپنے دو مصرعوں میں اُمید اور اعتماد کا ایک وسیع جہان رکھتا ہے اور حادثاتِ کائنات کی بھیڑ میں انسان کا مایوس نہیں ہونے دیتا۔ مدت سے نصیر احمد ناصر کے کتابی سلسلے ''تسطیر'' کی کوئی خبر ملی ہے نہ ہی قیوم طاہر کے ''آفاق'' کا نشاں ملا ہے البتہ راولپنڈی کے بجائے ان دنوں ملتان اور اس کے گردونواح کا ماحول ادبی رسائل کے اجراء کے لیے سازگار نظر آ رہا ہے۔ ملتان سے سید عامر سہیل ماہنامہ ''انگارے'' باقاعدگی سے شائع کر رہے ہیں اور ابھی حال ہی میں بورے والا سے جاوید حیدر جوئیہ اور سید تحسین گیلانی کی ادارت میں ایک صوری اور معنوی دلکشی کا حامل شمارہ ''حریم ادب'' منظرِ ادب پر آیا ہے جس کی ایک ظاہرہ خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اردو، پنجابی اور انگریزی زبان میں تخلیقات اور فکری مباحث کو دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ موجودہ شمارہ ''حریم ادب'' کا دوسرا شمارہ ہے جس کا انتساب مشہور و معروف مصور بشیر موجد کے نام ہے اس شمارے میں ماہیے، غزلیں، قطعات، نظمیں، نثری نظمیں، انٹرویو، افسانے، خاکہ نما، طنز و مزاح، فکری مباحث اور کتابوں پر تبصرے غرض ادب کا ایک شہر آباد ہے۔ خصوصاً گوشہ غزل میں مناظر عاشق ہرگانوی، ناصر زیدی، ظفر اقبال، ناصر شہزاد، افتخار عارف، صابر ظفر، معین تابش، بشریٰ رحمٰن، اعزاز احمد آذر، اعجاز توکل، غوث متھراوی، صابر آفاقی کے نام جگمگا رہے ہیں اور گوشہ نظم میں رفیق سندیلوی، خاور اعجاز، عبداللہ عظیم، احمد سہیل کی نظمیں اپنی فضا بنا رہی ہیں حریم ادب کے پنجابی حصے کو بھرپور بنانے کے لیے سید تحسین گیلانی نے پنجابی لکھنے والے اہلِ قلم سے درخواست کی ہے کہ وہ انھیں تخلیقات روانہ کریں اور ہم ان کا یہ پیغام اہل کراچی کو پہنچا کر اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ موجودہ شمارے پنجابی گوشے میں قیصر نجفی کا پنجابی مرثیہ اپنی مثال آپ ہے جس کا ایک ایک لفظ سچے موتیوں سا آبدار ہے جبکہ حنیف حنفی، بشریٰ رحمٰن، سلطان کھاروی، شبیر نازش، عبدالقدوس کیفی، کلیم شہزاد، زبیر کنجاہی، ستیہ پال آنند، سجاد مرزا نے سخن سے بزمِ پنجاب کے وقار میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ انگریزی حصے میں بھی مضامین اور شاعری شامل ہیں۔ حریم ادب ایک شاندار ادبی سلسلہ کا آغاز ہے ہماری دُعا ہے کہ یہ افکار، سیپ اور فنون کی طرح منزلِ کمال تک جائے اور اہلِ علم و ادب حوالے کے طور پر اس کا نام لیں۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' راولپنڈی/اسلام آباد ۱۹ مئی ۲۰۰۵ء

اردو ادب کی ترقی و ترویج میں صرف ادبی مراکز میں ہی نہیں بلکہ ادبی مراکز سے دُور مقامات پر بھی نہ صرف شعر و ادب تخلیق ہو رہا ہے بلکہ وہاں سے معیاری جرائد بھی شائع ہو رہے ہیں۔ بورے والا سے حریم ادب کے نام سے اردو، پنجابی، انگریزی، تخلیقات اور فکری مباحث کا عالمی ادبی کتابی سلسلے کا دوسرا شمارہ حال ہی میں شائع ہوا ہے، جس میں ریاض مجید اور خورشید بیگ میلسوی کی حمد، ستیہ پال آنند، خورشید بیگ میلسوی، ریاض مجید، محمد امین اور ناصر زیدی کی نعتیں، مناظر عاشق ہرگانوی، ظفر اقبال، ناصر شہزاد، افتخار عارف، مرتضیٰ برلاس، اکبر حمیدی، عطاء الحق قاسمی، حیدر قریشی، صابر ظفر، معین تابش، مجاز جے پوری، بشریٰ رحمٰن، اعزاز احمد آذر، خالد اقبال یاسر، صابر آفاقی، خاور اعجاز، کرامت بخاری، ناصر بشیر، سعید اقبال سعدی، زبیر کنجاہی، شناور اسحاق، طاہر شیرازی، قیصر نجفی، سید تحسین گیلانی، جاوید حیدر جوئیہ اور دیگر شعراء کی غزلیں، اکبر حمیدی اور دیگر ادیبوں شاعروں کے انٹرویو، ماہیے، قطعات، افسانے، انشائیے، نظمیں، طنز و مزاح، تنقیدی مضامین، فکری مباحث کے علاوہ پنجابی حصے میں بھی اہم لکھنے والے شامل ہیں۔ اس کتابی سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے تمام ممتاز لکھنے والے شامل ہیں۔ یہ ایک خوبصورت ادبی گلدستہ ہے جسے مرتب کرنے پر جاوید حیدر جوئیہ اور سید تحسین گیلانی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بڑے سائز کے 344 صفحات پر مشتمل اس خوبصورت پرچے کی قیمت 100 روپے ہے۔

Daily "Dawn" Lahore.

"HAREEM-I-ADAB" A tri-lingual magazine eited by Dr. Javed Haider Joya and Syed Tehseen Gilani; pp344; Price Rs.100 (pb); published from Javed Plaza,1- Satelite Town, Burewala.

This is the second anthology which includes Urdu, English and Punjabi prose and poetry ably edited by Dr. Javed, a physician by profession. The linguistic division of the book is: English 22, Punjabi 17 and Urdu 300 pages. Many of the Urdu writers from India have also contributed to the magazine and prominent writers from Pakistan have favoured the anthology including Dr. Wazir Agha, Shehzad Ahmad, Iftikhar Arif, Zafar Iqbal, Dr Moeenur Rahman, Mohsin Bhoopali and Ataul Haq Qasmi.

One of the editorials contained in the book criticizes the indifferent attitude of Punjabi writers. The editorial board says that it has contacted prominent Punjabi writers to contribut to the magazine but many of them did not even bother to acknowledge its letters. Some of the poets whose works feature in the Punjabi section include Bushra Rahman, Sultan Kharvi, Abdul Quddus Kaifi, Satyapal Anand and Qaiser Najfi. The latter has contributed a *marsia* that runs thus:

Kull peghambar duniya dey, hubb toon hatkaindey tur gaey. Angal napp tey wal wal din rah dakhaindey tur gaey.---STM.

بی بی سی ایشیا کی اُردو سروس اور پاکستان ٹیلی ویژن کراچی سنٹر کے پروگرام ''کیفِ ادب'' میں مرتب ''حریمِ ادب'' کے انٹرویوز بسلسلہ کتابی سلسلہ نشر ہوئے نیز ادبی اخبار ''مکمل'' روزنامہ ''جنگ'' لاہور' روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور' روزنامہ ''خبریں'' لاہور' ماہنامہ ''لٹریچر'' جاپان' سہ ماہی ''جدید ادب'' جرمنی' ماہنامہ ''عوامی منشور'' کراچی' ماہنامہ ''صریر'' کراچی اور کتابی سلسلہ ''شعر و حکمت'' بھارت نے بھی ''حریمِ ادب'' کتابی سلسلے کی خبروں کو اہمیت کے ساتھ شائع کیا۔

(مرتبین و معاونین تمام اداروں مبصرین' مرتبین اور مدیران کے شکر گزار ہیں)

نظمیں I

گھراؤ

وزیر آغا

چلو مکاں کے دروازے کو
اندر سے ہم قفل لگائیں
نیچے جاتے زینے کے
تختوں پر اپنے قدم جمائیں
گھراؤ کے اندر اُتریں
اندر جا کر
صدیوں پُرانا منظر دیکھیں
جس کی تہہ میں
تاریکی نے ڈیرے ڈالے ہیں
وہ کچھ دیکھیں جو ہم
اپنی اُجلی تاباں دنیا میں نہ دیکھ سکے تھے
آگے بڑھ کر
آنسو بن کر
تاریکی کے سیپ میں اُتریں
موتی بن کر
باہر آئیں!!

لرزتی گونج نیلے پانیوں کی

وزیر آغا

لرزتی گونج نیلے پانیوں کی
ترے کانوں کے اندر آبسی ہے
ہزاروں ناریل کے پیڑ
تجھ پر جھک گئے ہیں
پرندے۔۔۔خوش نوا آبی پرندے
ترے چاروں طرف اُڑنے لگے ہیں
سنہری ریت پر لیٹے بدن
تیرا سواگت کرنے آئے ہیں
وہ خوش ہیں تُو سمندر بن گیا ہے
مگر مَیں خوش نہیں ہوں
مجھے معلوم ہے
سارے سمندر ساحلوں کو روندتے ہیں
کھلونوں اور سفینوں کو
مکانوں اور مکینوں کو
سدا برباد کرتے ہیں!!

لاشے!

وزیر آغا

وہ شے جو فقط لامسہ تھی
عجب لجلجے پن کی مظہر
جو بس ایک ہی تند خواہش میں
لتھڑی پڑی تھی
کہ 'لاشے' بنے
اور بجلی کے کوندے کی صورت
کڑکتی پھرے
اور چھڑکتی پھرے آگ
ساری زمیں پر
وہ 'شے' منقلب ہو کے
'لاشے' میں اب سامنے آچکی ہے
تجھے اُس کے آنے کی شاید
خبر ہی نہیں ہے!!

زمیں اب کون سی منزل میں ہو گی

شہزاد احمد

ستارے دُور ہوتے جا رہے ہیں
فلک محصور ہوتے جا رہے ہیں
تعلق ٹوٹتا محسوس ہوتا ہے
کوئی آواز آتی ہی نہیں

کیسے بتائیں۔۔۔کون سی دنیا کہاں ہے؟

جہاں مَیں ہوں وہاں خاموشیوں کا اک جہاں ہے
مگر یہ کیسے ممکن ہے
ستارے چل رہے ہوں اور یہیں آہٹ نہ آئے
مگر اتنا تو ممکن ہے
ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے
ماضی کا کوئی لمحہ ہو
یا فردا کی وہ تصویر ہو
جو نامکمل رہ گئی ہے!
کوئی ہے یا نہیں ہے
کیا بتائیں!
کہاں جائیں، کسے روداد ہم اپنی سنائیں؟
ہم اپنی خاک کی آغوش میں بیٹھے ہوئے ہیں
اپنا چہرہ تک رہے ہیں
خدا جانے زمیں اب کونسی منزل میں ہوگی

ققنس

ستیہ پال آنند

قدرت نے اک چال چلی۔۔۔ققنس سے پوچھا
کیا تم انسانی چولا بھی پہن سکو گے؟
سب سے اُونچے پربت کی چوٹی پر اپنے آشیاں میں
پنکھ سمیٹے بیٹھا ققنس
لاکھوں بار جنم لے لے کر تھک تو چکا تھا
لیکن اس نے حامی بھر لی

پاگل، آوارہ، اک شاعر
اپنے اکتارے پر اکثر
گلی گلی میں گاتا پھرتا رہتا تھا اپنے نغمے
آنکھیں قدرت نے دینے سے پہلے ہی واپس لے لی تھیں
ہومر[1]، ملٹن، سورداس، بشار وغیرہ
ایسے اور کئی ناموں سے پہچانا جاتا تھا شاعر

گیتوں میں گھنگھرو تھے، جن سے
روح رقص میں آ جاتی تھی
بانس کی پوری سے چھن چھن کر
آتی لَے میں وہ میٹھا جادو تھا جس سے
کانوں میں رس گھل جاتا تھا!
پاگل، آوارہ وہ شاعر
کبھی کبھی باغی بھی ہوا
کہنہ رسموں، بُرے رواجوں، بدکردار امیروں سے
اس کے نغمے
کُھلی بغاوت کا پرچم لہراتے اُٹھے
آگ بھر گئی ان نغموں میں
جن میں گھنگھرو سے بجتے تھے
اس کے نغمے اب شمشیر سے اُٹھتے تھے
شاہی تخت ہلا، حاکم کی کرسی ڈانوا ڈول ہوئی۔۔۔تو
پاگل، آوارہ وہ شاعر کال کوٹھری بند ہوا اک لمبا عرصہ
لیکن جب آزاد ہوا، تو
وہی سلگتے گیت، وہی جلتے نغمے تھا اس کا چلن
تو پھر حاکم شہر نے پھانسی
یا گولی یا تیغ زنی کا حکم دیا!

جسم کے اندر ہی سے شعلے اُٹھے
بھڑکے، پھیل گئے
ہیرے سے شفاف بدن کو آگ نے جل کر خاک کیا
چونچ جلی، تو نغمے جل کر راکھ ہوئے
چشم زدن میں ققنس راکھ کی ڈھیری میں تبدیل ہوا!

پاگل، آوارہ شاعر انسانی چولا چھوڑ گیا

کہتے ہیں آنکھوں والے۔۔۔جب شام ڈھلی

---

(1)۔ ہومر۔۔۔سن ولادت و وفات۔۔۔800۔200: قبل از مسیح کے دوران (نابینا) ملٹن۔۔۔1608-74 عیسوی (نابینا)
سورداس۔۔۔1540-1642ء ایک سو دو برس عمر پائی۔ (نابینا)
بشار بن بُرد۔۔۔عباسی دَور کا نابینا شاعر سنِ ولادت و وفات کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

اور سورج ڈوبا
تو ققنس اک دولھے جیسا سجا' سجایا
راکھ کی ڈھیری سے اپنے بے داغ پروں پر
اُڑتا نکلا!

مہاجر

ستیہ پال آنند

اک مہاجر بھٹکتا ہوا در بدر
دشمنوں کے تعاقب کا مارا ہوا
ہانپتا' کانپتا
سانس کے زیر و بم میں دھڑکتے ہوئے
دل کو اپنی ہتھیلی پہ رکھے ہوئے
ڈھونڈتا ہے
کوئی ایک جائے تحفظ' نشیبِ اماں
عافیت کا کوئی ایک گوشہ کہ جو
ماں کی آغوش سا اس پہ وا ہو۔۔۔ اسے
بازوؤں میں بھرے
اوٹ میں اپنی ـــ
اس کو حفظ و اماں' عاطفت بخش دے!

اک مہاجر بھٹکتا ہوا در بدر
اک شجر!
اک شجر!۔۔۔ عافیت وا گذیدہ' درونِ جگر
ایک دھجی' لباسِ دریدہ کی جلتی ہوئی بے خبر
ایک آری' جو چلتی رہی دیر تک پیڑ پر!

پیڑ روتا رہا
الاماں' الاماں
یا ذکریا' ذکریا' ذکریا' ذ۔۔۔ک۔۔۔ر۔۔۔!

چھنگلی، چھنگلی

ستیہ پال آنند

پانچ سے ایک زائد۔۔۔ چھٹا
پانڈوؤں کا وہ فاضل برادر' جسے
چھوآئے تھے لاشوں کے انبار میں
جو کہ کنتی کی نادیدنی نال سے منسلک تھا ابھی
سائے سا ان کے پیچھے رواں ہے۔۔۔ چھٹا
پانچ کا زائیدہ!

(پانچ' نا منقسم۔۔۔
پانچ سے چھ تلک ایک زائد عدد
جس کی تقسیم کرنا بھی آسان ہے
جوڑنے میں بھی کوئی تردد نہیں')

چھنگلی
ایک انگشتِ فاضل کہ جو
پانچ کی سنگتی تو ہے' لیکن اسے
اپنی سنگت سے کتنا گوارا نہیں
چاہتی ہے کہ دستِ من و تو کے سنگیت سے
منسلک ہی رہے
چھ کے صوتی عدد کی نئی احدیت
ایک فاضل' مگر بے نہایت صدا!
چھنگلی! چھنگلی!!

پُھنگیوں کے مسافر

ادیب سہیل

یہ ہیں پیڑ پر پُھنگیوں کے مسافر
جڑوں کی طرف دیکھتے بھی نہیں ہیں
سروں پر خلاؤں کی چادر تنی ہے
اسی کو وہ اپنے لیے سارا کچھ جانتے ہیں

جڑوں سے زمینی حقائق کے دیرینہ رشتے کا۔۔۔ادارک رکھتے نہیں
بُعد کو اپنے مابین رکھنا مصالح میں داخل ا

طبیعت کو راس آئے جب بالا بالا ہی تکنا
پھر اُن کو زمینی حقائق کی پہچان آئے بھی کیوں کر

اُنھیں کیا پتا۔۔۔یہ اُفق سے افق تک کا پھیلاؤ کیا ہے؟
اُنھیں کیا پتا اس مسافت میں جینے کی لذات کیا ہیں؟
زمینی حقائق کی پنہاں' عیاں صد ہا برکات کیا ہیں؟؟

اُترن

ادیب سہیل

ماضی خواہ حسیں ہو کتنا۔۔۔ماضی ہے
اپنا حال بتا کر کب کا جا بھی چکا اس منڈپ سے
دوبارہ وارد ہونے کا خواب مگر دیکھے جاتا ہے!
حال پہ بیتے سمے کی من وعن تطبیق پہ زور
ایک اچنبھا'
انہونی کا کھیل

یارو تم جس حال کے صحن میں کھلتے ہو
اُس کو پوری قوت سے محسوس کرو
جان وتن سے تم اِس کی تعظیم کرو
حال تمھیں جو کہتا ہے' تسلیم کرو
حال سے تازہ مستقبل پیدا کرنے پر دھیان دھرو
سمے کے تن پر گزرا لمحہ اُترن ہے
حال کو اُترن پہنانے کی سوچ سراسر
۔۔۔رجعت ہے
اُترن تو پھر اُترن ہے
اُترن کا ہر شکل میں تم۔۔۔بُطلان کرو

شہرِ بے مثال

ادیب سہیل

کبھی جب اپنے شہرِ بے بدل
کے آسماں پر ڈالتے ہیں سوچ کی نظریں
تو یہ محسوس ہوتا ہے
کہ یہ اِک بنجر و نابود و غیر آباد خطّہ تھا
جو ہر دم نیند کا ماتا ہی رہتا تھا'
عجب یکساں سے منظر میں
وہاں اب دُور اور حدِ نظر تک صد ہا قد آور مکانوں کا
تسلسل سر اُٹھا تا' جگمگاتا ہے
کہ جن کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے'
جہاں پر ہر کہہ و مہہ کے خدا نے۔۔۔
اپنے ساحل کو دیے تھے محض طعنے
بے زمینی' بے مکانی کے
وہاں بندوں نے خوش قامت مکانوں کا
منظّم سلسلہ اک شہر کی صورت بسایا ہے
سمندر جس کو اپنا دل سمجھ کر ناز کرتا ہے!

آزوقہ

نصیر احمد ناصر

ایک زمیں کے ٹکڑے سے بھی
کیا کچھ حاصل ہو سکتا ہے
گندم ' چاول ' دال ' کماد
سبزی ' پتے ' ساگ ' سلاد
چوکھر ' بھوسہ ' چارا ' کھاد
جس کو روگ اناج کا لاگے
اُس کو بھولیں جین☆ اور دھاگے
ٹیسٹ ٹیوب ' کلون☆☆ سے آگے
خواب 'حقیقت سب کچھ تیاگے
چین سے وہ پھر سوئے نہ جاگے
چند نوالے حلق میں ڈالے
تَل تَل ناچے ' پگ پگ بھاگے
پیٹ کی خاطر خوب اگاؤ
اپنے دیس کی شان بڑھاؤ
دھکے کھا کر ' آنسو پی کر
درد کماؤ ' دُکھ بسراؤ
دُور دساور سے آتے ہیں
شہد ' پنیر ' کریکر ' کافی
جیلی ' جام ' مربے ' کیچپ
توت فرنگی ' تونا مچھلی
سب کچھ کھاؤ ' سب کچھ کھاؤ
ایک گلوب کے شہری سارے
بھوکے ننگے پیاس کے مارے
سرخ سیاست ' زرد معیشت
ڈھلتی عمریں ' چڑھتے بھاؤ
آنسو ' آہیں ' غم اور گھاؤ
ایک زمیں کے ٹکڑے سے بھی
کیا کچھ حاصل ہو سکتا ہے!

☆ Gene
☆☆ Clone

ایک، دو، تین، ایک

علی محمد فرشی

کتابوں کا زینہ بنا کر
مچانی سے مَیں نے مٹھائی چرائی تو
گھر میں کسی کو بھی غصہ نہ آیا
یہ کم سن ذہانت کی تاثیر تھی
یا شرارت کی شیریں شکر قندیوں جیسی عمروں کی لذت
ابھی تک وہ خوش ذائقہ واقعہ
جب رگِ جاں میں گھلتا ہے
بچپن کے باغات کی تتلیاں
پھول بن کر برستی ہیں
پتھریلی عمروں کے دن رات کی
زرد کالی مصیبت کا غم بھول کر
مسکراہٹ کی میٹھی پھواریں
بیابانِ دل کو جل تھل بناتی ہیں
گاتی ہیں:
''ایک، دو، تین
اللہ میاں کی زمین
چار پانچ چھ سات
سارے مل کر کھائیں بھات
آٹھ، نو، دس
پانی میٹھا رس''
پانی کی لہروں پہ ہچکولے کھاتی ہوئی
کاغذی عمر کی ناؤ
کروٹ بدل کر اُلٹ دیتی ہے خواب سارے
کتابوں پہ گرتے ہوئے آنسوؤں سے
سیاہی کے دریا ہی بنتے ہیں!
دریا سمندر بناتے ہیں
سارے سمندر سیاہی، قلم بن گئیں ساری شاخیں

قسم!
انگلیوں کی
(محبت بھرا خط مرے اور ترے درمیاں تیر ہے)
مَیں لکھوں اور لکھتا رہوں تا قیامت
محبت کی نظمیں

مگر جانیاں!
اِن کتابوں کو زینہ بنا کر
کئی بار مَیں نے
ترے آسمانوں پہ جا کر
تجھے ڈھونڈ لانے کی ناکام کوشش میں
آنسو بہائے
سیاہی کے دریا بنائے
کہاں ہے؟
تُو خود اپنی شیریں صدا سے
مری زہر راتوں میں
شہد رات کی مصریاں گھول دے

ماں تو بیمار ہے
اب کئی روز سے بولتی بھی نہیں

صرف مٹی ہے، صرف پانی ہے

رفیق سندیلوی

اس آب و گِل کے
کنویں کی مٹی
عجیب مٹی ہے
اِس کا پانی
عجیب پانی ہے
بے کنارا ہے
اِک ستارا ہے
جو فلک کے سیاہ پانی میں
جھلملاتا ہے
عکسِ آنسو کا
مسکراتا ہے
دل کے اُجلے سفید پانی میں
زندگانی میں
اتنا کیچڑ ہے
جس سے پانی کشید کرنا
محال ہے
یہ وجود ایک پاتال ہے
جو مرے پسینے سے
اور اشکوں سے بھر گیا ہے
مَیں آب پیا نہیں ہوں
مٹی ہوں
وہ قرنبیق ہوں
جو اک بوند بھر عَرَق تک نہیں بناتی
مَیں وہ ولی ہوں
کہ جس کی ٹھوکر سے
کوئی چشمہ نہیں اُبلتا
مگر کسی پَل
وجود ماء المعین ہوتا ہے
میلے کپڑوں کو
سُوکھے پیڑوں کو
خفتہ داغوں کو
گرد آلود ساری سمتوں کو
جب بھگوتا ہے
خوب مَل مَل کے صاف کرتا ہے
اور دھوتا ہے
ایسے لگتا ہے
جیسے مٹی میں صرف مٹی ہے
اور پانی میں صرف پانی ہے
جیسے پانی میں صرف مٹی ہے

اور مٹی میں صرف پانی ہے
صرف مٹی ہے
صرف پانی ہے!

گھنے انبوہ میں

رفیق سندیلوی

بدن اک واہمہ ہے
اور مَیں اس واہمے کی
منفعل حالت میں
خوابوں کی توانائی پہ زندہ ہوں
مَیں اک بدرنگ، بدصورت پرندہ ہوں
مَیں اپنا بھاری جُثہ ساتھ لے کر
اُڑ نہیں سکتا
زمیں پر رینگتا ہوں
سیدھ میں
اور موڑ کوئی مُڑ نہیں سکتا
مرے ہمراہ
چیونٹوں، کیڑوں اور حشرات کی
لمبی قطاریں ہیں
قطاریں ٹوٹ جاتی ہیں
تو مَیں ان جانداروں کے
گھنے انبوہ میں
اس کلبلاہٹ
کھڑکھڑانے والی اس فوری قیامت سے بھی ڈرتا ہوں
مَیں اپنے سُن بدن کے زخم کے
گہرے شگافوں کو
مسلسل راکھ مٹی
اور نمک کے ساتھ بھرتا ہوں

بدن اک واہمہ ہے
اور مَیں اس واہمے کی
منفعل حالت میں
خوابوں کی توانائی پہ زندہ ہوں
مَیں اک بدرنگ، بدصورت پرندہ ہوں

سمے ہو گیا

رفیق سندیلوی

پھر مقامِ رفاقت پہ
مدغم ہوئیں
سوئیاں دونوں گھڑیال کی
رفت و آمد کے چکر میں
گھنٹے کی آواز میں
میرا دل کھو گیا
اپنی ٹک ٹک میں
بہتا رہا وقت
کتنا سمے ہو گیا

سالہا سال
پانی کے چشمے سے
گیلے کیے لب عناصر نے
جلتے الاؤ پہ
ہاتھ اپنے تاپے مظاہر نے
سینے کی دھڑکن سے
نادید کے رنگ و روغن سے
اشیا نے
بینائی حاصل کی
مقسوم کے طاقچے سے
جہاں پھول رکھے تھے
لکڑی کے صندوقچے سے
خزانہ اُٹھا لے گئی رات
مٹھی سے گرتے رہے

ریت کی مثل دن

ایک دن
صحن کی پیلگوں دھوپ میں
آہنی چار پائی پہ لیٹے ہوئے
ایک جھپکی سی آئی
تو مَیں سو گیا

میرے چہرے پہ
بارش کی اک بوند نے
گر کے دستک دی

بابا چلو
اپنے کمرے کے اندر
سے ہو گیا!

سمندر اگر جانتا

خاور اعجاز

کس طرف مجھ کو جانا ہے اور کس لیے
یہ سمندر اگر جانتا تو بھلا
مجھ سے کیوں پوچھتا منزلوں کا پتہ
سامنے میرے ساحل سجاتا نہ یوں
میرے رستے میں خود بیٹھ جاتا نہ یوں!

آتش کدہ

خاور اعجاز

بدن حرارت سے تپ رہا ہے
لہو میں شعلے مچل رہے ہیں
گمان ہوتا ہے
جیسے مجھ میں
کئی زمانے پگھل رہے ہیں
رگوں میں لاوا اُبل رہا ہے
فضائے جاں میں
اک آگ کب کی لگی ہوئی ہے
مگر یہ حیرت ہے
قلبِ آتش کدہ میں
یخ بستہ برف کی سِل رکھی ہوئی ہے!

یو۔این۔او

قیصر نجفی

اے مری مفلسی
تو بلائے سماوی و ارضی نہیں
عصرِ حاضر کی تہذیب کے ناخداؤں کی سوغات ہے
جن کے آئین کے بے ثمر پیڑ پر
امن کی فاختہ کا بسیرا نہیں
جن کے دستور کے بدنما ساز میں
کوئی سُر زندگی اور خوشی کا نہیں
جن کے منشور کی اولیں شق ہے یہ
اپنے کھیتوں میں اور اپنے دریاؤں میں
بھوک اُگتی رہے پیاس بہتی رہے
اپنی دھرتی پہ پسماندگی ہی سدا
راج کرتی رہے

صنعتِ مفلسی کی مشینیں ہلیں
اپنے شہروں میں قصبوں میں چلتی رہیں
رزق محنت کشوں کا نگلتی رہیں
آہیں مزدور کی بھاپ بنتی رہیں
چمنیاں مل کی افلاس جنتی رہیں
سکّے زخموں کے دن رات بٹتے رہیں
دست و پا کارخانوں میں کٹتے رہیں
دُور محنت کشوں کا اندھیرا نہ ہو
کچی آبادیوں میں سویرا نہ ہو

اے مری مفلسی

تو بلائے سماوی و ارضی نہیں
عصرِ حاضر کی تہذیب کے ناخداؤں کی سوغات ہے
جن کی بے نور سوچوں کی غارت گری
بے زر و مال قوموں کی تقدیر ہے
حالتِ زارِ افریقہ و ایشیاء
جن کی کم ظرف فطرت کی تصویر ہے
یہ تمدّن کے میدان کے سورما
نوعِ انساں کے خود ساختہ رہنما
نظمِ عالم کے گر بہ صفت پاسباں
بھیڑ کے بھیس میں بھیڑیئے بے گماں
امن کے روز و شب گیت گاتے ہیں یہ
ہنستی بستی ہوئی بستیوں کو مگر
کس طرح ہیروشیما بناتے ہیں یہ
الاماں الاماں الاماں الاماں

جنگ ان کے لیے امن کا ہے پیام
انتشارِ جہاں اصل ان کا نظام
آدمیت کی رسوائی سے ان کا نام
ان کے مسلک میں انسانیت ہے حرام
اسلحہ ساز ملکوں کے والی ہیں یہ
زندگی کے لیے ایک گالی ہیں یہ
ان کا بنیادی کارِ سیاست ہے یہ
چھوٹی قوموں کی سانسیں اُکھڑتی رہیں
مرتے مرتے بھی آپس میں لڑتی رہیں
ان کے ہتھیار کا قرض چلتا رہے
امنِ عالم کا خورشید ڈھلتا رہے

اے مری مفلسی دیکھ سنسار میں
ہر طرف خون ہے
ہر طرف آگ ہے
مُطربِ وقت کے لب پہ شام و سحر
موت کا گیت ہے
موت کا راگ ہے
ابلقِ زندگی کی، جدھر دیکھئے
مرگ کے دستِ سفّاک میں باگ ہے
پرچمِ یو این او سینۂ دہر پر
زہر اُگلتا ہوا اک حسیں ناگ ہے

یوں تو اقوامِ عالم کی چوپال میں
ختم ہوتے نہیں بحث کے سلسلے
بات لیکن مسائل پہ ہوتی نہیں
ہوتے رہتے ہیں آپس میں شکوے گلے
ربط قائم ہے امروز و دیروز میں
حل طلب ہیں سبھی حل طلب مسئلے
ارضِ افغاں ابھی تک ہے شعلہ فشاں
شاخِ زیتوں سے بھی اُٹھ رہا ہے دھواں
یورپی مسلمیں بھی ہیں تصویرِ غم
ان پہ بھی ہو رہا ہے ستم دم بدم
جانے چشمِ ضمیرِ جہاں کیا ہوئی
رُوئے انسانیت پر ہیں تازہ ابھی
زخمِ کشمیر و کمپوچیا کی طرح
زخمِ قبرص بھی زخمِ نمیبیا بھی

اے مری مفلسی
قحطِ ایتھوپیا کے زبان و قلم
یوں ہی کرتے رہیں گے بیاں درد و غم
مرگِ انسان و انسانیت پہ مگر
چشمِ تہذیبِ حاضر نہیں ہوگی نم
فاقہ مستوں کی دریوزگی کی قسم
اپنی سوچوں کو جب تک نہ بدلیں گے ہم
اپنے کھیتوں میں اور اپنے دریاؤں میں
بھوک بھی یونہی اُگتی رہے گی سدا
پیاس بھی یونہی بہتی رہے گی سدا

وصیّت یاد تھی ہم کو

فہیم شناس کاظمی

وصیّت میں یہ لکھا تھا
اگر تم اک قدم بھٹکے
تو منزل سے ہزاروں کوس دُوری پہ جا نکلو گے
اگر تم اک قدم بھٹکے
سفر آغاز کرنے سے بہت پہلے،
تمہیں جس سمت جانا ہو
وہاں سے آنے والے تاجروں، خانہ بدوشوں سے
مکمل طور پر احوال لینا تم
وہاں کا کیسا ہے موسم
اور وہاں کے لوگ کیسے ہیں
وہاں کی عورتیں کیسی ہیں
اور بازار کیسے ہیں
کہیں رستے میں دریا ہے کہ جنگل ہے
وہاں کی فصلیں کس موسم میں کیا کیا ہیں
سفر آغاز کرنے سے بہت پہلے تمہیں احوال لینا ہے
وصیت میں یہ لکھا تھا
وصیّت لکھنے والوں کو کہاں معلوم تھا اتنا
ہمیں جس سمت جانا ہے
ہوائیں راستے خوشبو، فضائیں،
لڑکیاں اور لوگ کیسے ہیں
یہ کس سے پوچھتے ہم
کہ وہاں سے کوئی آیا ہی نہیں تھا
وصیّت لکھنے والوں کو کہاں معلوم تھا
کہ ہمیں جس سمت جانا ہے
وہاں سے پھر نہیں آنا
سفر ہم کو نہیں کرنا
سفر نے اس دفعہ طے کرنا ہے ہم کو

ایک سفر کے دوران

محمد نذیر

دُور ہی دُور جاتی اکیلی سڑک
اونچے اونچے دورویہ درختوں پہ چھائی ہوئی
رات جوبن پہ آئی ہوئی!

ایک سے دوسرے شہر کے درمیاں
دُور افتادہ گاؤں بھی ہوں گے
مگر عام جنگل بیابان میں، کوئی راہی نہ جوگی نہ روگی
پرندے بھی جانے کہاں سو رہے ہیں
شجر در شجر بَین کرتی ہَوا، تال دیتے ورَق
رات کی وحشتوں کو بڑھاتے ہوئے!

موڑ کاٹا تو آگے سڑک
دُور اِک ضوفشاں غار میں گر گئی
غار کے جگمگاتے دہانے کا سحر
بے صدائے بلاتی ہوئی
جس قدر اس کی جانب بڑھے
غار اتنا ہی پیچھے کو ہٹتا رہا
کیسا اسرار ہے
کوئی آسیب ہے
یا کوئی فکرِ انساں میں گم،
کشف کا منتظر،
غار میں کون ہے
غار میں روشنی کس سے ہے
شوق لپٹا ہوا خوف میں!

اور تیزی سے بڑھتے گئے
پاس پہنچے تو دیکھا کہ اک کار تھی
جس کی ہیڈ لائٹ سے رات،
دائیں بائیں درختوں پہ قوسیں بناتی ہوئی

اندھیروں کو آگے ہی آگے بھگاتی ہوئی،
شعبدہ ساز تھی!
تیرگی، روشنی،
ایک سے اک بڑا شعبدہ!!

ندامت

محمد افسر ساجد

ہم جو اِک جاں کے سفر پر ہیں رواں برسوں سے
ہم کو معلوم نہیں کب اور کہاں ختم ہو یہ
ہم تو بس تشنہ دہن، لب بہ دُعا، کشتۂ غم
اپنے ہونے ہی میں گم، پڑھ نہ سکے ہیں اب تک
وقت کے بابِ ندامت میں نہاں تحریریں
ان کو پڑھ لیتے تو شائد نہ یوں حیراں ہوتے
اک تماشے کی طرح وقت پہ عریاں ہوتے
اپنی خواہش کو سرِ بزم نہ رسوا کرتے
اپنے لمحوں کو کسی طور نہ زنداں کرتے

سُنامی لہریں

مناظر عاشق ہرگانوی

نگارِ ہستی کے
گل انبار و گل فگن
جملۂ تبسم سے پھوٹتی ہے
وہ اک کرن جو کہیں نظر ہے
کہیں خبر ہے
کہیں حنا رنگ کونپلوں کا نگارِ فن ہے
کہیں چمن زارِ آگہی کی بہارِ فن ہے
حریمِ ناز و جمالِ پیکر میں رقصِ نغماتِ جاں شکن ہے
رواقِ اوراقِ گل ادا میں نگارِ معنی کی انجمن ہے
مگر زمیں سے اُبل کے لاوا
سمندری زلزلہ کی صورت
خیال و خواب و نگارِ خستہ
بنا گیا ہے
آب کے اضطرابِ سرکش میں، مرنے والے
فرشتہ جیسے، اجل کے دشتِ امکاں میں جا چکے ہیں
حنا رنگ کونپلوں کا نگارِ فن اب نہیں رہے ہیں
حقیقتوں سے بھرا فسانہ!

ایک نظم

حامد برگی

(''حریم ادب'' کے مطالعہ کا ہی عطیہ ہے یعنی شعر و ادب کی اس کیفیت کا نتیجہ ہے جو ''حریم ادب'' کے مطالعہ سے طاری ہوئی)

بوقتِ رخصت میں سوچتا ہوں
وہ خواب کیا تھے
کہ جن کی تکمیل آرزو تھی؟
حصولِ علم و ہنر کے بل پر
مقام اپنا، جنون و وحشت کی داستاں اک
کہ جس میں گندھ کے رہ جائے
زیست کی کہانی،
وہ شاد و آباد سلسلہ میری زندگی کا
کہ جس سے اُمید پھوٹتی ہو،
وہ ایک طائرِ نظر
بلندی سے پستیوں پر
حرا سے باہر،
وہ قصرِ شیریں،
وہ کامیابی کی منزلیں سب، گزار کے مَیں
جو اس جھروکے میں جاگزیں ہوں
جو میرے خواب و خیال کا مرمریں محل ہے
تو سوچتا ہوں۔۔۔
وہ خواب تعبیر پا چکا ہے
وہ قصر تعمیر ہو چکا ہے،

رسائل وجرائد جو موصول ہوئے

1۔ کتابی سلسلہ ''آفاق'' 6'210۔اے (ثمر کلینک) ٹاہلی موہری' راولپنڈی کینٹ' پاکستان
2۔ کتابی سلسلہ ''الکلام'' مثال پبلشرز' رحیم سینٹر' پریس مارکیٹ' امین پور بازار' فیصل آباد
3۔ کتاب لڑی ''جاگ'' مثال پبلشرز' رحیم سینٹر' پریس مارکیٹ' امین پور بازار' فیصل آباد
4۔ ماہنامہ ''طلوعِ افکار'' 28 ایچ' رضویہ سوسائٹی' ناظم آباد' کراچی 74600
5۔ کتابی سلسلہ ''زرناب'' 1194/2 دھرم پورہ' میلسی' پاکستان
6۔ سہ ماہی ''گفتگو'' فریاد پبلی کیشنز' سعید مارکیٹ' کمال آباد 3' راولپنڈی (پاکستان)
7۔ سہ ماہی ''عطاء'' کمشنری بازار' ڈیرہ اسماعیل خان' پاکستان
8۔ ''خوشبو'' گفطو پریس' سٹریٹ 4' بلاک نمبر 4' مین بازار' چیچہ وطنی' پاکستان
9۔ کتابی سلسلہ ''شاعری'' آر۔1055' بلاک 9' دستگیر سوسائٹی' فیڈرل بی ایریا' کراچی 75950
10۔ سہ ماہی ''جدید ادب'' جرمنی Haider Qureshi, Rossertstr.6, Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany
11۔ سہ ماہی ''سفیرِ اُردو'' اکتوبر تا دسمبر (۲۰۰۴ء)
47, Sutton Garden, Sundon Park, Lutonbeds Lu33af United Kingdom.
12۔ سہ ماہی ''علم و فن'' فروری' مارچ (۲۰۰۴ء) پوسٹ بکس نمبر 323' گوجرانوالہ
13۔ سہ ماہی ''نیا قدم انٹرنیشنل'' جنوری تا مارچ (۲۰۰۵ء) پہاڑ پور ضلع (لیہ) پنجاب' پاکستان
14۔ ماہنامہ ''حرب'' فروری تا مارچ (۲۰۰۵ء) نزد سوجی مل' جی ٹی روڈ' چیچہ وطنی' ضلع ساہیوال
15۔ ماہنامہ ''مہکاں انٹرنیشنل'' اپریل تا جون (۲۰۰۵ء) 92۔راوی بلاک' شادمان ٹاؤن' ساہیوال
16۔ ماہنامہ ''ق'' نوبل ٹاؤن' صدر بازار' ڈیرہ اسماعیل خان
17۔ سہ ماہی کتابی سلسلہ ''دریچہ'' انٹرنیشنل میونسپل کالونی' گلی نمبر 1' مکان نمبر 4' نزد دفتر ایجوکیشن' نیو سیٹلائٹ ٹاؤن' سرگودھا
18۔ سہ ماہی ''سانجھاں'' مئی تا جولائی (۲۰۰۵ء) 5۔ناصر پارک بلال گنج' لاہور
19۔ ''دبستان'' کتاب گرما۔الرزاق پبلی کیشنز' کمرہ نمبر 5' شوکت پلازہ صفانوالہ چوک' ٹمپل روڈ' لاہور
20۔ سہ ماہی ''ادبِ عالیہ'' انٹرنیشنل' جنوری تا مارچ (۲۰۰۵ء) 26۔پیر مراد کالونی وہاڑی' پاکستان
21۔ ماہنامہ ''لیہ ٹائمز'' لیہ ٹائمز' چوبارہ روڈ' لیہ
22۔ سہ ماہی ''نوادر'' اپریل تا ستمبر (۲۰۰۴ء) 58۔ہدایت اللہ بلاک' مصطفیٰ ٹاؤن' وحدت روڈ' لاہور
23۔ سہ ماہی ''روشنائی'' 21 اپریل تا جون (۲۰۰۵ء) A-8' ندیم کارنر' N نارتھ ناظم آباد' بالمقابل ڈی سی سنٹرل آفس' کراچی 74700
24۔ ''دریافت'' 3' نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز' اسلام آباد
25۔ سہ ماہی ''اُردو سائنس میگزین'' اپریل تا جون (۲۰۰۴ء) 299' اپر مال' لاہور' پاکستان
26۔ سہ ماہی ''فکر'' سرکلر روڈ' ساہیوال' ضلع سرگودھا' پاکستان
27۔ ''بصارتیں'' جناح کالونی' شوگر ملز روڈ' لیہ' پاکستان
28۔ سہ ماہی ''تشکیل'' 5,8/6-2' ناظم آباد' کراچی 74600 (پاکستان)
29۔ ماہنامہ ''شام و سحر'' 14۔اُردو بازار' لاہور

30۔ سہ ماہی ''انشاء'' سی 429' یونٹ 10' لطیف آباد' حیدر آباد۔ 71800' پاکستان

31۔ ''شعر و حکمت'' .#6-3-659/2, Kapadia Lane, Somajigoda, Hyderabad-500082 (A.P) India

32۔ کتابی سلسلہ ''انگارے'' 545/c' گل گشت کالونی' ملتان' پاکستان

33۔ کتابی سلسلہ سہ ماہی ''خیال'' پوسٹ بکس نمبر 7551' صدر ڈاکخانہ' کراچی 74400' پاکستان

34۔ ''استعارہ'' 53۔ اے' ذاکر باغ' اوکھلا روڈ' نئی دہلی۔25' انڈیا

35۔ ''انتخاب'' (۲) وہائٹ ہاؤس' گیا 823001' انڈیا

36۔ ماہنامہ ''لٹریچر'' مکان نمبر 38' گلی نمبر 45' سنت نگر' لاہور' پاکستان

37۔ ماہنامہ ''زاویہ'' .Kallarekroken 25, 22647 Lund, Sweden

38۔ ''دنیائے ادب'' (اگست 2004ء) 623' چھٹی منزل' ریگل ٹریڈ اسکوائر' ریگل چوک' صدر' کراچی

39۔ ''کاغذی پیراہن'' 72۔ بیڈن روڈ' لاہور' پاکستان

40۔ سہ ماہی ''بادبان'' شمارہ (۹) ای۔2' 8/4 معمار اسکوائر' بلاک 14' گلشنِ اقبال' کراچی — 75300

رشتے ناطے

اکبر حمیدی

اس عنوان سے آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نے رشتے ناطے کروانے کا کوئی دفتر کھول لیا ہے اور اس تحریر کے لیے اپنے دفتر کا تعارف کروانا چاہتا ہوں۔ بے شک ایسا دفتر کھول لینے میں کوئی قباحت بھی نہیں۔۔۔ مگر میں آپ کے رشتے ناطے کیوں کروانے لگا۔۔۔ ابھی تو میں خود اپنے رشتے ناطے کے سلسلے میں غور کرتا رہتا ہوں!!

اس غور کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو نئے رشتے ناطے کے بارے میں سوچنا اور دوسرے پہلے سے سرزد رشتے ناطے کے بارے میں غور میں مبتلا رہنا۔ نئے رشتے ناطے کے معنی تو واضح ہیں کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔۔۔ اور پہلے سے سرزد رشتے ناطے کے سلسلے میں سوچتے رہنا کہ یوں نہ بھی ہوتا تو کیا ہو جاتا!! مگر خیر زندگی میں جو کچھ بھی پیش آتا ہے اس میں ہماری کوتاہ دستیوں سے زیادہ دوسروں کی دراز دستیوں کا عمل دخل ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے۔۔۔ یہ دراز دستیاں کسی طرح کی بھی ہوں۔۔۔ پھر ہمارا معاشرہ جس قسم کا ہے اس میں ہماری پیش دستیوں کے مواقع تو خوش قسمتی سے ہی آتے ہیں۔ زیادہ تر ہم کوتاہ دستیوں تک ہی محدود رکھتے ہیں بلکہ زیادہ عمل دخل تو اوروں کی دراز دستیوں بلکہ چیرہ دستیوں کا ہی ہوتا ہے!!

یہ ابتدائی کلمات میں نے اس لیے عرض کیے ہیں کہ میں نے رشتے ناطے کا دفتر نہ تو کھولا ہے اور نہ ہی کھولنے کا ارادہ ہے۔ البتہ جب سے میں سنِ بلوغت کو پہنچا ہوں اس قسم کا ایک دفتر از خود میرے اندر کہیں کھل گیا ہے۔۔۔ اور مسلسل کھلا رہتا ہے۔ جس میں ایک شخص ہر وقت قلم کاغذ لیے کچھ حساب کتاب کرتا دکھائی دیتا رہتا ہے۔ جتنا حساب کتاب وہ دن کے وقت کرتا ہے شام کو اسے پھاڑ کے اور اس سے فارغ ہو کر لیٹ جاتا ہے۔ میں نے اس سے کبھی نہیں پوچھا کہ ''جناب میرے اندر جو آپ نے دفتر جما رکھا ہے تو کس خوشی میں۔۔۔ یا کس ضرورت میں؟۔۔۔'' پوچھا اس لیے نہیں کہ مجھے پتہ ہے وہ کیا کرتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔۔۔ کبھی کبھی وہ ان سب لکھے ہوئے کاغذوں کو میرے سامنے عمل درآمد کے احکام کے ساتھ رکھ دیتا ہے۔ میں ایک نظر ان پر ڈالتا ہوں اور ان کاغذات پر ''زیرِ غور'' کے الفاظ لکھ کر میز کی دراز میں رکھ دیتا ہوں۔۔۔ یوں وہ حضرت اپنے فرضِ منصبی سے فارغ ہو کر پھر سے قلم کاغذ سنبھال لیتے ہیں!!

یہاں مجھے اس عجیب و غریب بات کی وضاحت کر لینے دیجیے کہ ہمارے ہاں ''رشتے ناطے'' کے الفاظ ہمیشہ شادی بیاہ کے سمبندھ جوڑنے ہی کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ سڑک پر چلتے چلتے کسی بازار میں سے گزرتے گزرتے جب میں کسی دکان کے اوپر یہ الفاظ لکھے دیکھتا ہوں تو فوراً سمجھ لیتا ہوں کہ یہاں اس قماش کی کارروائی ہو رہی ہے۔۔۔ تب میں تیز قدموں سے اِدھر اُدھر ہو جاتا ہوں۔۔۔ کسی گوشۂ عافیت میں۔۔۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ویگنوں کے اڈے میں سے گزرتے ہوئے بہت سے کنڈیکٹر میرے گرد ہو گئے اور پھر ان میں سے ایک نے جو ذرا زیادہ صحت مند تھا مجھے دھکیل کر اپنی ویگن میں ڈال دیا۔۔۔ اور ڈرائیور فوراً ہی ویگن کو لے اُڑا۔ کوئی چار چھ کلومیٹر پر جا کر جب میں نے کنڈیکٹر کے کرایہ طلب کرنے پر بتایا کہ ''مجھے تو کہیں نہیں جانا تھا۔۔۔ آپ لوگوں نے زبردستی مجھے ویگن میں ڈال لیا۔'' تب اس نے جس طرح دھکیل کر مجھے ویگن میں ڈالا تھا۔۔۔ اُسی طرح کھینچ کر ویگن سے باہر کر دیا!!! اس وقت سے میں ایسے مقامات سے بڑی تیز قدمی سے نکل جاتا ہوں!!

ہمارے ہاں کئی الفاظ کے مفہوم غلط لیے جاتے ہیں۔۔۔ کہ وہ غلط۔۔۔ یہ اصل معنوں کے برعکس منفی معنوں میں لیے جا رہے ہیں۔ مثلاً ورکنگ ریلیشن شپ کو محض کاروباری یا مطلبی تعلق کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ رشتے ناطے تو انسان کی اس کشادہ دلی اور قابلِ ستائش خواہش کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بگڑے ہوئے حالات میں بھی تعلقات کی ایک سطح کو بہر طور بحال رکھنا چاہتے ہیں۔ کون جانے یہ بظاہر معمولی رشتہ پھر سے معمول کا رشتہ بن جائے اور انسان کو انسان سے ٹوٹنے سے بچا لے۔ غالب نے تو اس تعلق کو یہاں تک بھی بحال رکھنے کی خواہش کی ہے:

؎ قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

''رشتوں ناطوں'' کے موضوع پر غور کرتا ہوں تو تمام کائنات مجھے طرح طرح کے رشتوں ناطوں میں بندھی ہوئی نظر آتی ہے۔۔۔خود انسانی جسم بہت سے رشتوں ناطوں کا مجموعہ ہے۔ کس غیر معمولی معمول کے ساتھ ہر عضو اپنا کام کر کے۔۔۔وہی کام آگے دوسرے عضو تک بڑھا دیتا ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام کر لے اور پھر وہ کام تیسرے عضو کی طرف بڑھا دے اور اسی سلسلے کا نام بقائے حیات ہے جسے ہم انسان کے بدنی رشتے ناطے کہہ سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ اتنا طویل ہے اور اس کا مطالعہ اس قدر دلچسپ بھی کہ اس پر غور کرنا آپ کو پُر لطف لگے گا۔۔۔آپ آزما کر دیکھ لیجیے۔

نباتات وحیوانات کی بقا میں انہی رشتوں ناطوں کی کارفرمائی ہے۔ نباتات میں بلکہ حیوانات میں بھی جو نسلی پیوند کاری کا طریقہ ہے مَیں تو اسے محض رشتے ہی نہیں کہوں گا بلکہ بعض تو باقاعدہ ازدواجی رشتوں میں منسلک ہیں۔ آج جو طرح طرح کے پھل پھول' شجر وحجر دکھائی دیتے ہیں یہ انہی کی شعبدہ کاری ہے۔۔۔ بلکہ تاریخ تو انسانی نسلوں میں بھی ایسے ہی اختلاطی رشتوں ناطوں کا سراغ دیتی ہے۔ صرف انسان سے انسان کے ہی نہیں۔۔۔انسانی اور حیوانی رشتوں ناطوں کا تعلق بھی دکھائی دیتا ہے۔

یہ رشتے ناطے اب سمجھ میں آنے لگے ہیں کہ انسان نے انھیں عملی جامہ دے دیا ہے لیکن بعض رشتے ناطے ابھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آئے مثلاً بلبل کا پھول سے کیا رشتہ ہے؟ شمع کا پروانے سے کیا ناطہ ہے۔ چاند کا چکور سے یا سمندر کا چاند سے کیا رشتہ ہے؟ مقناطیس کا لوہے سے درخت کا ڈالی سے' ڈالی کا پھول پھل سے کیا رشتہ ہے؟ شیطان کا جنت سے کیا سمبندھ تھا کہ وہ مردود اس میں در آیا سارا کھیل چوپٹ کر دیا۔۔۔یا پھر نیا کھیل شروع کروا دیا۔ آسمان کا زمین سے کیا رشتہ ہے کہ دُور جا جا کر اس کے گلے ملتا ہے۔ گو دُور اُفق پر جا کر اپنی طرف سے چھپ چھپا کر ملتا ہے مگر شاید اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کا زمین سے یہ برملا معانقہ سب دنیا دیکھ رہی ہے۔۔۔لیکن شاید اسے معلوم ہی ہو۔۔۔آخر ان معاملات میں جذبات غالب آجاتے ہیں۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہے!!

انسان نے جہاں اور کئی میدانوں میں تحقیق اور دریافت کے دفتر لگائے ہیں وہاں اس نے پہلے اشیاء کی ماہیت معلوم کی۔۔۔پھر اشیا کے باہمی موزوں رشتوں ناطوں کو دریافت کیا۔۔۔کہ کس کا رشتہ کس سے ٹھہرے تو کامیاب ہوگا۔ اس کے لیے اسے اشیا کے خاندانی حالات' نسلی خصوصیات' مزاج' روایات اور بہت سی چیزوں کو معلوم کرنا پڑا۔ آج کی میڈیکل سائنس کی ترقی اسی کا نتیجہ ہے۔ کون کون سی ادویات میں کن کن مختلف نوع اشیاء کو ملایا گیا ہے یہ ایک طویل محنت ہے۔ میڈیکل سائنس میں کیا ادب اور آرٹ میں بھی یہی رشتے ناطے کارفرما ہیں۔ مصرع بنانے میں کن کن اور کیسے کیسے الفاظ۔۔۔زیروں زبروں' شدومدوں سمیت رشتہ' اخوت میں منسلک کیے جاسکتے ہیں۔ یہ شاعروں کو معلوم ہے تا کہ وہ ایک زبان ہو کر۔ یک رنگ ہو کر ایک آواز اور ایک تاثر کا مظاہرہ کریں۔ کس راگ کے لیے کون سی راگنی موضوع ہے۔ کس سُر کو کون سا تال سجے گا۔۔۔کس آواز کو کون سا ساز اچھا لگے گا؟ کس رنگ سے کس رنگ کا ملاپ ہوسکتا ہے؟ یہ صرف متعلقہ لوگ ہی جانتے ہیں جو اس شوق میں عمریں صرف کر دیتے ہیں تا کہ انسانوں کو چند لمحوں کی ذہنی آسودگی اور دلی راحت اور اعصابی سکون مل سکے!!

ہمارے دیہاتوں میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں رشتے ناطے کروانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ یہ ان کا محبوب مشغلہ ہے اور وہ اسے بغیر کسی حرص اور لالچ کے سرانجام دیتے ہیں۔ پھر وہ رشتہ طے ہو جاتا ہے اور شہنائیاں گونجنے لگتی ہیں اور فریقین کے دل ودماغ خوشیوں کے بیش بہا جذبوں سے بھر جاتے ہیں۔ تب رشتہ ناطہ کروانے والے حضرات کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو خوشیاں دے کر' یا دوسروں کی خوشیوں کا سامان فراہم کر کے خوش ہو لیتے ہیں!! تب مجھے عظمتِ انسانی کا اندازہ ہوتا ہے اور مَیں سمجھتا ہوں یہ رشتے ناطے کروانے والے لوگ بڑے ہی عظیم ہیں۔۔۔خواہ ان کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے ہو! یہ کوئی بھی ہوں!

شعبے سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔اصل اہمیت تو ان کے کام کی ہے جو وہ دوسرے انسانوں کی بقا کے لیے اور ان کی خوشیوں کے لیے سرانجام دیتے ہیں!!

فی الحال تو میرا ارادہ نہیں ہے لیکن اگر مَیں اسی طرح فارغ الاوقات رہا تو ممکن ہے مَیں بھی کسی وقت رشتے ناطے کا کوئی دفتر کھول

لوں۔۔۔خواہ یہ رشتے ناطے کسی بھی نوعیت کے ہوں!!
ویسے مجھے تو یہ کائنات بھی رشتوں ناطوں کا دفتر لگتی ہے جس میں اس کے منتظم سلیمانی ٹوپی پہنے کہیں بیٹھے ہیں!!

نظیر صدیقی کی کتابیں

تنقید: 1 تاثرات و تعصبات
2: میرے خیال میں
3: تفہیم و تعبیر
4: اُردو میں عالمی ادب کے تراجم
5: اُردو ادب کے مغربی دریچے
6: جدید اُردو غزل — ایک مطالعہ
7: ڈاکٹر عندلیب شادانی
8: ادبی جائزے
Iqbal and Radhakrishnan:9
Reflections on Life and Literature:10
Views and Reviews:11
To Prof. Nazeer Siddiqi:12
Iqbal: In his varied aspects:13
Glimpses of the East and West in Literature:14
Cloumns on Books in English and Urdu:15
A peep into Literature and Philosophy:16
Dr. Radhakrishnan: The greatest Indian of the 20th Century:17
انشائیے: 18: شہرت کی خاطر (طبع چہارم) 1987ء
شخصی خاکے: 19: جان پہچان (طبع دوم) 1991ء
سفرنامہ: 20: دو سفرنامے (ہندوستان اور انگلستان) 1988ء
خودنوشت: 21: سو یہ ہے اپنی زندگی 1991ء
شعری مجموعہ: 22: حسرتِ اظہار (انتخاب کلام، طبع سوم بااضافہ) 1999ء
23: گزرگاہِ خیال 1999ء
تدوین: 24: نقش ہائے رنگ رنگ (رشید احمد صدیقی) 1977ء
25: شیرازۂ خیال (رشید احمد صدیقی) 1982ء
26: یگانہ چنگیزی (انتخاب کلام مع پیش لفظ) 1982ء
27: ایمن نے کہا 1999ء
آخری کتاب: 28: غالب اور اقبال 2000ء

رات کی جناب میں

منور عثمانی

بے شک! انسان خسارے میں ہے کہ وہ دن ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔

رات اپنے منکروں کو دیکھتی ہے اور پھر بھی چپ رہتی ہے۔ پس! رات' مہربان' بسیط اور عظیم ہے۔ جس نے رات کو پالیا' وہ رازوں کو پانے کے قابل ہو گیا۔

عظیم فیصلے رات ہی کو ہوتے ہیں' بلند ترین سفر' روشن ترین منزلیں' رات کو ہی طے ہوئی ہیں۔ رات ہی میں کلام شروع ہوتا ہے' خود سے بھی' خدا سے بھی۔

مَیں رات سے دُور رہا لہٰذا مجھ پر کھل نہ سکا کہ رات کی قربت میں' بیج پر اُس کے امکانات کیسے کُھلتے ہیں' حرف پر بلوغت اور بلاغت کی منزل کیونکر آسان ہوتی ہے' سکوت' خود کلامی میں مبتلا کیسے ہوتا ہے' جہت اپنے آپ کو پار کرکے کسی اور جہت میں کیوں اُتر جاتی ہے' ہیئت' بے ہیئت ہو کر ایک نئے شرف کو کیسے پالیتی ہے' محبت پہ نور کیوں اُترتا ہے اور دُکھ' خود نور کیونکر بن جاتا ہے؟؟

آپ کو یاد ہوگا کہ مَیں نے رات کو تاریک کہا تھا اور ظلم و جہالت کو رات! بے شک' مَیں ظالم بھی تھا اور جاہل بھی! اصل میں' میرا وہ سارا تجاوز اور تعصب دن کی صحبت' بے چراغ کی عطا تھا؛ جب دیے جلے تو نظر آیا کہ رات تو سبزہ بیگانہ سے بھی بیگانہ نہیں۔ اُس کی قربت میں ہی پروانہ' اپنے طواف اور شمع اپنے گداز کے آخری نکتے تک پہنچتے ہیں اور پھر دونوں جی اُٹھتے ہیں۔ رات' ظاہر ہونا چاہے تو نمو اور خوشبو میں' دھیمے سے تموج اور تغزل میں' چاندنی کی چادر اور تاروں کی چھت میں فقط ''ظاہر'' ہوتی ہے ورنہ عموماً اپنے کشادہ رُو اور پاک دامن اندھیرے میں ''مستور'' رہتی ہے لیکن موجود رہتی ہے۔ اب سوچتا ہوں: جس کی ذات میں شاعری' موسیقی اور محبوبیت دُور تک موجزن ہو اور اُس ''دُور'' سے آگے رازوں سے بھری بستیاں ہوں' وہ بے بصر' بے درد اور بے وقعت کیسے ہوسکتی ہے؟ اور جو اپنے بھرپور' رس بھرے لیکن بھید بھرے حسن سے یکسر بے نیاز ہو' آئینہ بھی نہ تکتی ہو' فقط اپنے ہونے کا احساس رکھتی ہو اور احساس دلاتی ہو' وہ بھلا خود پرست اور تسلط پسند کیونکر ہو سکتی ہے؟؟

دن' رات کا ایک خواب ہے جو وہ اپنے ازلی رتجگے میں دیکھتی ہے اور مسکرا کر وضع کر دیتی ہے۔

دن اپنے طلوع میں رات کی کئی روشن خوبیاں لیے ہوتا ہے: خاموشی' خنکی' شانتی اور شرمیلا پن۔۔۔ ''نجم السحر'' نے باہر دہلیز تک آکر دن کو سمجھایا ہوتا ہے کہ تم رات کے پروردہ ہو' گیان دھیان کی فضا میں پلے ہو' دیکھو! رات کا لمس اور لوریاں' حکایتیں اور نصیحتیں بھول نہ جانا۔۔۔ سب یاد رکھنا تم۔۔۔ ارے سنو ہو۔۔۔ اور پھر دہلیز ختم ہو جاتی ہے' دہلیز ہوتی ہی کتنی ہے؟

دن کی عملداری شروع ہوتی ہے تو وہ سب کچھ بھول جاتا ہے' وہ اپنے ضابطے خود بناتا ہے' خود توڑ ڈالتا ہے؛ نصف النہار پر اُس کی خودسری دیکھیں تو پہچان نہ پائیں کہ کس خانوادے کا ہے۔ بہت آگے جا کر اُسے اپنی رائیگانی کا احساس ہوتا ہے لیکن اب واپسی ممکن نہیں رہتی' سو بہ حسرت و یاس غروب ہو جاتا ہے۔ رات کبھی غروب نہیں ہوتی۔

ہر دن' دوسرے دن سے منہ موڑے ہے' ہر رات' گزشتہ رات سے جڑی ہے۔ دن' ذات و کائنات کے بکھراؤ اور رات یکجائی اور یکتائی پُر یقین رکھتی ہے۔ کثرت کی ابتلا' دن کا حاصل ہے۔ رات کا جوہر' وحدت ہے' کثرت ہمہ وقت اپنے جلوے دکھانے کے لیے مضطرب ہے؛ وحدت کا جلوہ اُس کی چپ میں گم ہے' اس گم کا گیان حاصل کرنا آسان نہیں' مشکل یہ ہے کہ مشکل بھی نہیں' گم کا گیان ہی رات کی جلوت میں باریاب ہونا ہے۔

اگر صرف ''چشمِ ظاہر'' ہی کھلی ہو۔ تو ہر جگہ دو قوتیں ایک دوسرے کے متوازی' مقابل یا معاون کے طور پر نظر آئیں گی؛ البتہ اندر کی آنکھ کھل جائے تو پھر ساری بات آئینہ ہے کہ اصل میں ایک منبع ہے' دوسرا مظاہرہ؛ ظاہر ہے دونوں متوازی ہیں نہ مدمقابل۔۔۔ رات منبع ہے' دن مظاہرہ۔

ہر منبع کا مقدر فراموش ہونا اور ہر مظاہرے کا نصیب شفق کی سرخی میں گھل جانا ہے۔ آسمان سے زمین تک یہی ہو رہا ہے۔

زمین پر، کچھ تہذیبیں منبع کا درجہ رکھتی ہیں اور کچھ فقط ''مظاہرہ'' کی سطح پر فائز ہوتی ہیں۔ محض مظاہرے کی حامل تہذیبیں بہت جلد اس مقام پر پہنچ جاتی ہیں جہاں قدرت اُن کے اعزاز میں الوداعی تقریب منعقد کرتی ہے، حرفِ سپاس پڑھتی ہے اور بجھنے کا اجازت نامہ بخوشی عنایت کرتی ہے؛ ان رسومات کی ادائیگی کو کہنے والے سرخی، سپیدی، خوشی اور خوشحالی کہتے ہیں حالانکہ وہ تو شفق کی سرخی ہوتی ہے۔

تہذیبوں کی طرح انسانی شخصیتوں میں کچھ کو منبع کہنا اور کچھ کو فقط مظاہرہ قرار دینا مناسب ہے۔ مثال کے طور پر۔۔۔ خیر چھوڑیئے، مثالیں پیش کرنا آپ کی دانش اور مشاہدے پر بے اعتباری کے مترادف ہوگا۔

اسی طرح کچھ فن پارے ہوتے ہیں جو کسی منبع سے پھوٹتے ہیں اور خود ایک منبع کا روپ اختیار کر لیتے ہیں؛ اور کچھ فقط کسی منبع کا مظاہرہ ہوتے ہیں سو ذرا سی دیر میں غروب ہو جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ قابلِ تشویش (اور کچھ کے نزدیک قابلِ داد) وہ فن پارے ہوتے ہیں جو کسی منبع کے بجائے فقط کسی مظاہرے سے پھوٹتے ہیں اور دُوسرے یا تیسرے درجے کے مظاہرے کو سامنے لا کر، اپنی عمر کی ''صبح کاذب'' میں اپنا ''غروبِ صادق'' پا لیتے ہیں۔

کاذب کو صادق سے بدلنا اور رات کو دن بنا لینا، ترقی نہیں، تنزلی ہے؛ اس بے عقلی کے مُرتکب وہی ہوتے ہیں جو خواب کو کم تر اور تعبیر کو برتر سمجھتے ہیں اور لفظ کے سواگت میں معنی کو گم کر دیتے ہیں۔ انھیں کون بتائے کہ شعر، اپنی تشریح، راز اپنے افشا اور نامعلوم، معلوم سے رفیع و وسیع تر ہے۔

رات، خواب کا مان ہے اور خواب، رات کی توسیع؛ بلکہ رات تو خود ایک خواب ہے، جس کی تعبیر باہر نہیں، خواب کے اندر ہے۔

ہم جو بھی خواب دیکھتے ہیں: وہ اُس ازلی وابدی خواب اور ''تعبیر'' سے پہلے کی رات کے کسی ننھے سے گوشے کی ہلکی سی جھلک ہوتا ہے؛ جس میں ہم تو تھے لیکن کچھ اور نہ تھا حتیٰ کہ ''ہونا'' بھی نہیں تھا۔

شاید آپ کو یاد ہو وہ رات! جب ''کُن'' کی صدا گونج تھی اور ہم سب کسی کے خواب میں بکھرے اپنے وجود اور اپنے وجود میں بکھرے خوابوں کو مُرتب کرنے لگے تھے؛ کہیں جانے کی تیاری تھی، کچھ ہونے کا چرچا تھا۔ ہاں! یہ بھی طے ہوا تھا کہ واپس اسی رات میں پلٹنا ہے لیکن حق تو یہ ہے کہ رات سے بچھڑنے کا افسوس گھر گھر اور خواب خواب بچھا ہوا تھا، دن کی اجنبیت پر کئی اندیشہ ہائے دُور و دراز تھے، کئی تحفظات تھے لیکن اس عالم میں کون کس کی سنتا ہے؛ اور جب کشتی نے آنسوؤں سے گزرنے کی راہ مانگی تھی تو خواب کی آخری ساعت بولی تھی کہ ''رات تو تمہاری رہے گی، تم رات کے رہو یا نہ رہو!'' اور تب! ہم سب دل پکڑ کر رہ گئے تھے کہ بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ لیکن آج؟؟

بے شک انسان خسارے میں ہے کہ وہ دن کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے۔

چاند

مشتاق احمد

چاند سے میری دوستی بہت پُرانی ہے۔ ہزاروں سال پُرانی۔ ابتدا میں محض جان پہچان ہوئی پھر علیک سلیک ہوئی۔ اس کے بعد شناسائی اور بالآخر آشنائی۔ چاند سے میری دوستی کے یہ چاروں مراحل بڑے طویل بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔

ہزاروں سال پہلے ہم لوگ جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔ جنگلوں کے درختوں کے پھل ہماری خوراک تھی۔ ہم ان درختوں پر جنگلی جانوروں کی طرح کودا پھاندا کرتے تھے۔ ان کے ٹہنوں پر بھاگے پھرتے اور ایک درخت سے دوسرے درخت پر محض ان کی ٹہنیوں کے ذریعے ہی پہنچ جاتے۔ ان درختوں کے میٹھے پھلوں کے حصول میں ہماری لڑائیاں دوسرے جانوروں سے ہُوا کرتی تھیں۔ ہمارے چچیرے بھائی جنہیں آج ہم بندر یا بن مانس کہتے ہیں' ہمارے سب سے بڑے حریف تھے۔ افسوس کہ ان کی فطرت میں تغیر پذیری اور بدلے ہوئے حالات کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنے کی اہلیت نہ تھی' مگر یہ دونوں صلاحیتیں ہماری فطرت میں بدرجہ اُتم موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس بندروں جیسی حالت سے نکل آئے اور انسان بن گئے جبکہ ہمارے حریف ہمارے چچیرے بھائی بندر ہی رہے اور آج بھی بندر ہی ہیں۔

ہم جن جنگلوں میں رہتے تھے۔ وہ بڑے گھنے اور تاریک ہوتے تھے۔ ان میں سورج کی روشنی بھی کم کم ہی پہنچتی تھی۔ تاہم سورج سے ہمارا واسطہ ضرور تھا۔ جب ہم درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ جاتے تو سورج ہمارے سَروں پر' جسموں پر اپنی شعاعیں' برساتا۔ اس کے علاوہ ان درختوں کی نشوونما اسی کی مرہونِ منت تھی اور پھر ان درختوں کے پھلوں کو پکاتا بھی تو وہی تھا۔ وہ ان کو رنگینی' خوشبو اور حلاوت عطا کرتا۔ اس لیے ہم سورج کو جانتے تھے۔ چاند سے ہماری کوئی دوستی نہیں تھی۔

چاند سے ہماری جان پہچان خزاں کے موسم میں ہوتی تھی۔ خزاں آتی۔ خزاں کی ننگی' ٹیڑھی میڑھی اُلجھی ہوئی پالے ماری ٹہنیوں کے عقب سے چاند ہمیں جھانکتا۔ وہ چپ چاپ گہرے تفکر میں ڈوبا ہمیں دیکھتا۔ ہم اسے دیکھتے۔ ہم اس کے وجود کا ادراک کرتے اور وہ ہماری سرگرمیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے دو اجنبی مسافر ایک ہی راستے پر آتے جاتے بغیر کسی تعارف کے ایک دوسرے سے واقف ہو جاتے ہیں۔ بغیر کسی علیک سلیک کے۔ ہم چاند کو کسی قدر خوفزدہ ہو کر دیکھتے۔ وہ دن ہمارے لیے بڑی مصیبت اور ابتلا کے ہوتے۔ درختوں پر کچھ نہ ہوتا۔ کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ شدید سردی ہمارے ننگ دھڑنگ جسموں کو ٹھٹھرا دیتی اور ہمارے بہت سے ساتھی موت کی نیند سو جاتے۔ اس لیے چاند سے ملاقات یا اس کا نظارہ خوشگوار نہیں ہوتا تھا۔

پھر سردی کا موسم ختم ہوتا۔ بہار کا آغاز ہوتا۔ جنگل کے درخت نیا لباس زیب تن کرنا شروع کر دیتے۔ شگوفے پھوٹتے' کلیاں کھلتیں' پھول ہنستے اور درختوں کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھک جاتیں۔ ہر طرف رنگ' خوشی اور خوشبو پھیل جاتی۔ ہم خوش ہوتے۔ پیٹ بھر کر کھاتے۔ جی بھر کے ناچتے اور افزائشِ نسل کے عمل میں مصروف رہتے۔ جنگل پھر پہلے کی طرح گھنے اور تاریک ہو جاتے اور ہم چاند کو بھول جاتے۔ اسی طرح نجانے کتنی صدیاں بیت گئیں۔

پھر یوں ہوا کہ پُرانے حالات بدل گئے۔ ہماری خوراک میں ایک نئی چیز شامل ہوگئی۔ یہ تھا دوسرے جانوروں کا گوشت' کچا گوشت اب ہم نے اپنے رہنے کی جگہیں بھی بدل لی تھیں۔ ہم جنگلوں سے نکلے اور پہاڑوں کی غاروں میں رہنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چاند سے ہماری علیک سلیک ہوئی۔

رات کو جب ہم سوتے تو چاند مختلف زاویوں سے غاروں کے اندر جھانکتا اور غاروں کے بعض تاریک حصوں کو روشن کر دیتا۔ ہم رات کو اسی کی روشنی میں جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کے لیے نکلتے تھے۔ کیونکہ یہ جانور بھی بالعموم رات کو ہی اپنے ٹھکانے سے باہر آتے تھے۔ چاند ہی سے اپنے

غاروں کے رخ اور راستے پہچانتے تھے۔ یوں چاند سے ہمارا ربط بڑھتا گیا۔

زمانے نے ایک اور کروٹ لی۔ زندگی کا تجربہ بڑھا۔ ہم جن جانوروں کو شکار کر کے لاتے اور کھاتے تھے۔ ان میں سے ہمیں کچھ جانور ایسے مل گئے۔ جو ہمارے ساتھ مانوس ہو جاتے تھے۔ ہم نے ان کو پالنا اور ان کی نسل کشی کرنا شروع کر دیا۔ اب ہمیں خوراک حاصل کرنے کے لیے جانوروں کو شکار کرنے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ جانور تو اب ہمارے پاس وافر مقدار میں موجود ہوتے تھے۔ اب زندگی کے وظیفے ہی بدل گئے تھے۔ اب ہم ان کی حفاظت کرتے تھے اور ان کے چارے اور پانی کا انتظام کرتے تھے۔ ان جانوروں کے بڑے بڑے ریوڑ ہمارے پاس جمع ہو گئے۔

ہم ان کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ ان کا دودھ بھی پیتے تھے اور ان کی نرم اونی کھالیں' سردی سے بچنے کے لیے اوڑھ بھی لیتے تھے۔ ہم راتوں کو انھیں کھلی جگہ پر رکھنے پر مجبور تھے۔ اس وقت چاند کی اہمیت ہمیں معلوم ہوئی۔ چاند اپنی ٹھنڈی نرم فرحت بخش روشنی میدانوں پر پھیلا دیتا اور ہم دُور دُور تک اپنے ریوڑوں پر حملہ آور ہونے والے درندوں کو دیکھ سکتے۔ چاند کی روشنی میں ان کی نگرانی کا کام بہت آسان ہوتا۔ چاند ایک خاموش محسن کی طرح ہمارے کام آتا۔ پھر یوں ہوا کہ ہم اپنے مویشیوں سمیت آوارہ خرامی پر مجبور ہو گئے اور ایک غیر مختتم سفر پر چل نکلے۔

ہوا یوں کہ ہم جن میدانوں میں قیام کرتے۔ وہاں تھوڑے ہی عرصے بعد گھاس اور جھاڑیاں ختم ہو جاتیں۔ ہمارے مویشی انھیں کھا جاتے اور ہم ان کے لیے کوئی نئی چراگاہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے دُور نکل آتے۔ نئی نئی چراگاہوں اور گھاس کے میدانوں کی تلاش میں ہم نے نہ جانے کتنے طویل فاصلے طے کیے اور نہ جانے کتنا طویل عرصہ انجانی راہوں اور نامعلوم زمینوں کا سفر کیا۔ اس آوارہ خرامی میں نہیں معلوم کتنی صدیاں گزر گئیں۔

ہم پہاڑوں پر سے گزرے۔ دریا پار کیے اور صحراؤں کی خاک چھانی۔ اس لمبے سفر میں اگر چہ سورج بھی ہمارے کام آتا تھا لیکن اس کی تیز دھوپ میں سفر کٹھن ہوتا تھا۔ البتہ چاند کی چاندنی اس سفر کے لیے نہایت سازگار ہوتی تھی۔ چاند ہمارا رہنما بھی تھا اور مہربان ساتھی بھی۔ ہم جہاں جاتے وہ ہمارے سروں کے اُوپر ہمارے ساتھ ساتھ چلتا۔ ہماری اس طویل آوارہ خرامی اور بے سنگ و میل سفر کی پوری داستان چاند کو معلوم ہے اور اس کے حافظے میں محفوظ ہے۔

ہم محوِ سفر رہے اور چاند سے ہماری شناسائی بڑھتی گئی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی جگہ مویشیوں کے لیے چارہ اور پانی بکثرت ہوتا اور ہمارا قیام طویل ہو جاتا اور ہم چاند کے بارے میں سوچنے اور اس کی تعریف میں گیت بنانے لگتے۔

۔۔۔ پھر ایک نیا انقلاب برپا ہوا۔ ہمیں زراعت کا راز معلوم ہو گیا۔ اپنے مویشیوں کے لیے ہم جن جڑی بوٹیوں اور پودوں کے لیے مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ انھیں خوداُ گانے لگے۔ یہ خوداُ گائی ہوئی فصلیں آگے چل کر ہماری اپنی خوراک بھی بن گئیں۔ زراعت کا یہ راز جو ہم پر منکشف ہوا۔ ہمارے تمدن کی بنیاد بن گیا۔ ہماری آوارہ خرامی آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی۔ ہمارے قدم تھم گئے اور ہم بستیاں بسا کر رہنے لگے۔ تقسیم کار کا آغاز ہوا اور معاشرہ ارتقاء کی راہ پر چل نکلا۔

بستیوں کے مکین اور شہروں کے باسی بن کر ہم سفرِ مسلسل سے چھوٹ گئے۔ ہمیں گھر مل گئے اور جب جسم ساکن ہو گئے تو ذہن متحرک ہو گئے۔ اب ہم نے ان چیزوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا جو ہمیں دُکھ یا سُکھ دیتی رہی تھیں۔ ان چیزوں کو ہم نے اپنی طرح ذی روح ہستیاں تو پہلے ہی مان رکھا تھا۔ اب ہم نے انھیں اپنے دیوتا اور دیویاں بنالیا۔ تخلیقِ کائنات کے سارے کام ان سے منسوب کیے۔ اپنی تقدیریں ان کے سپرد کیں۔ ان کے بارے میں دلچسپ کہانیاں گھڑیں۔ ان کے مجسمے بنائے۔ ان کے لیے شاندار معبد تعمیر کیے۔ ان کی تعریف میں بھجن لکھے۔ ان کے حضور قربانیاں پیش کیں اور دل و جان سے ان کی پرستش شروع کر دی۔ سورج' چاند' ستارے' آسمان' ہوا غرضیکہ تمام مظاہر کائنات کو ہم نے اپنے معبود اور اپنی تقدیروں کے مالک بنالیا۔ جو دیوتا رحم' شفقت اور ہمدردی کے مظہر تھے۔ چاند بھی ان میں سے ایک تھا۔ ہم نے کبھی اسے دیوتا مانا اور کبھی دیوی اور اس کے لیے معبد تعمیر کیے۔ اس کے نام پر شہر بسائے اور اس کی تعریف میں نظمیں لکھیں اور صدیوں تک ہم اس کی پوجا کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ ان دیوتاؤں اور دیویوں کا طلسم ختم ہونے لگا۔ سورج' چاند' ستارے اور دیگر مظاہر کائنات وہم و گمان کی دنیا سے نکل گئے اور ان کی اصل حقیقتیں ہماری سمجھ میں آنا شروع ہو گئیں۔ اس کے باوجود چاند سے ہماری دوستی میں فرق نہیں آیا۔

چاند اجتماعی طور پر بھی اور انفرادی طور پر بھی ہمارا ساتھی رہا جب ہم گہوارے میں ہوتے تو چاند کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے اور کبھی کبھی ہنس بھی پڑتے جب ہم دوڑنے بھاگنے کے قابل ہوتے تو اس کی چاندنی میں کھیلتے جب ہم جوان ہوتے تو چاند ہمارے محبوب کا چہرہ بن جاتا۔۔۔دو دلوں کے پیمانِ محبت کا گواہ بنتا جب ہم اُداس ہوتے تو چاند بھی اُداس ہو جاتا اور جب ہم خوش ہوتے تو چاند بھی خوش ہوتا۔

پھر چاند کے بارے میں ہمیں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ایسی باتیں جنہوں نے چاند کے پُرانے تصور کو تہس نہس کر دیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ چاند ایک چھوٹا سا کرّہ ہے۔جو پُرانے زمانے میں ہماری زمین سے ہی الگ ہوا تھا اور تب سے اب تک ہماری زمین کا طواف کر رہا ہے۔ نیز یہ کہ اس کرّے پر صحرائی میدانوں' گہرے کھڈوں اور عمودی چٹانوں کے سوا کچھ نہیں۔ نہ پانی نہ ہَوا اور نہ ہی کسی قسم کی نباتاتی یا حیوانی زندگی۔ بس ایک خاموش ویرانہ ہے۔ ہمیں یہ بھی علم ہو گیا ہے کہ چاند خود روشن نہیں ہے۔ وہ تو اپنے اُوپر پڑنے والی سورج کی تیز روشنی یا دھوپ کو منعکس کر کے ہماری زمین تک پہنچاتا ہے۔ اس کی اپنی مٹی کا رنگ بھی سفید نہیں سرمئی ہے اور اب تو وہ ہمارے زیرِ قدم آ گیا ہے اور ہم دوسرے سیاروں کی تسخیر کے لیے اسے ایک خلائی سٹیشن کی طرح استعمال کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔

لیکن چاند کی اس بدلی ہوئی صورت اور حیثیت کے باوجود چاند آج بھی میرا دوست ہے۔ آج بھی وہ میرے لیے پہلے جیسا ہی حسین اور دلکش ہے اور آج بھی میں جب بھی کسی حسین اور محبوب شخصیت کے ساتھ کسی پھولوں بھری وادی میں چاندرات میں سیر میں مصروف ہوتا ہوں تو اس کی چاندنی ویسی ہی مسحور کُن مسرت بخش اور راحت افزا ہوتی ہے۔ جتنی کہ ہزاروں سال پہلے ہُوا کرتی تھی۔ چاند آج بھی میرا دوست ہے۔

انشائیہ اور مضمون

ڈاکٹر سلیم اختر کے مضمون سے ایک اقتباس

انشائیہ کے بارے میں بہت سی اُلجھنیں اصطلاحات کی پیدا کردہ ہیں۔ اگر انشائیہ کی حدود متعین کر کے اسے طنزیہ یا مزاحیہ مضامین سے ممیّز کرنے کی کوشش کی جاتی تو بات اتنی نہ اُلجھتی انشائیہ میں۔۔۔ مضامین کے برعکس۔۔۔ دیگر تکنیکی خصوصیات کے علاوہ اصل چیز ذات کا ابلاغ ہے جو "تشہیر" تک بن سکتا ہے اور صرف ایسے ہی نثر پارے کو انشائیہ قرار دینا چاہیے اگر اِس میں یہ اساسی صفت نہ ہو تو اِسے عام مضمون کہنا چاہیے۔ انشائیہ کی تکنیک سے وابستہ تمام خصوصیات' مضمون میں بھی مل سکتی ہیں اور مضمون کیا بعض اوقات تو "تاثراتی افسانہ" میں بھی نظر آتی ہیں۔ تو کیا ان فن پاروں کو بھی انشائیہ سمجھا جائے؟ مگر ہم انھیں افسانہ ہی شمار کرتے ہیں۔ جب ایسا ہے تو پھر مضمون اور انشائیہ کو بھی خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

[انشائیہ۔ مبادیات مشمولہ "جدید اُردو انشائیہ" مطبوعہ ستمبر ۱۹۹۱ء ناشر اکادمی ادبیات پاکستان' ص نمبر ۴۰]

خواہشیں

شگفتہ نازلی

ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جو سدا دامن گیر رہتی ہیں اُن سے پہلو تہی ہو ہی نہیں پاتی بعض خواہشوں کے اشارے اور تمناؤں کی تشبیہیں ایسی دلآویز و دلنواز ہوتی ہیں کہ اُن کے تعاقب میں ہم بکھر جاتے ہیں مگر خواہشوں کی فاختائیں ہماری گرفت میں نہیں آپاتیں۔

ستم ظریفی تو اسے کہیے کہ کبھی ہم کو کچھ ایسا مل جاتا ہے جس کی کبھی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے اُس کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں جاتا اور جسے سوچتے سوچتے خود سوچ اور چاہتے چاہتے خود سرتاپا چاہت بن جاتے ہیں اُس کا دُور دُور تک سُراغ نہیں' کسی کھوج کا چراغ نہیں۔ ایسی ہی خواہشیں ہمیں اپنا اسیر بنائے رکھتی ہیں اور اپنے حصار سے نکلنے ہی نہیں دیتیں۔

کچھ خوش قسمت ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو چاہتے ہیں پالیتے ہیں اور کچھ پانے کی آرزو میں جو ہوتا ہے وہ بھی لٹا دیتے ہیں نفسیات کی رُو سے انسانی مزاج نے کسی بھی ڈگر پر' کسی بھی مرحلے پر' کسی بھی حوالے سے مطمئن ہونا نہیں سیکھا۔۔۔ بلکہ۔۔۔ جو مل گیا تو مزید ملنے کی خواہش سر اُٹھانے لگی یوں ہر گام پر ایسا ہی لگتا ہے کہ۔۔۔ اگرچہ ملا تو ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ اتنا نہیں جتنا کہ چاہا گیا۔

ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کوئی خواہش شعور سے لاشعور میں اُتر جاتی ہے اور وقتی طور پر بھولی بسری یاد بن جاتی ہے۔ مصروفیات زندگی بھی احساس نہیں ہونے دیتیں کہ کبھی وہ خواہش ہمارے شعور کی جھیل پہ کنول کا پھول بن کے تیرتی رہی ہے۔۔۔ اور اب جب وقت کی اتنی گرد سطح آب پر پڑ چکی ہے تو کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ اب بھی بھولی ہی رہتی کہ اب تو عالم یہ ہے۔۔۔ اُس کے بارے سوچا بھی نہ جائے۔۔۔

دراصل خواہشوں کے پھیلنے اور سکڑنے' اُبھرنے اور ڈوبنے' کا کوئی لمحہ اور کوئی گھڑی متعین نہیں کیے جاسکتے۔۔۔ یہ سب کچھ اس طرح کا غیر محسوساتی سفر ہے جس کے پڑاؤ گنے نہیں جاسکتے۔۔۔ محوِ خرام کب تک رہنا ہے' تھکن کب اُترتی ہے' کسی منزل کے بارے سوچا جاسکتا ہے یا منزل کے بارے تو سوچنا ہی سفر کو کثیف کردیتا ہے' چلنا چلنا مدام چلنا ہی منزل ہے۔۔۔

وہ لوگ بہت ہی قناعت پسند ہوتے ہیں جو خواہشوں کے جال میں نہیں اُلجھتے۔۔۔ اور۔۔۔ طمانیت آمیز آسودہ سی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں گویا بہارِ بےخزاں کا لطف اُٹھاتے رہتے ہیں۔۔۔ اُن کی زندگی میں تمناؤں کے گرداب نہیں اُبھرتے جو معمولات زندگی کو سرتاپا تلپٹ کر دیتے ہیں سب کچھ اس طرح منتشر ہو کے رہ جاتا ہے کہ سمیٹنا مشکل ہو جائے ایسی ٹوٹ پھوٹ نہاں خانۂ دل میں وارد ہو کہ جذبوں کی کرچیاں چننے میں اُنگلیاں زخمی ہو ہو جائیں پھر بھی اس کی غیر مرئی کشش کا یہ عالم ہے کہ

ع اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے۔۔۔

خواہشیں کرتے رہنا اور اُن کے پورا ہونے کے متعلق سوچتے رہنا یا نت نئے طریقوں سے اُن کی تکمیل کے منصوبے بنانا۔۔۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں کیونکہ جانی انجانی خواہشیں جلتے بجھتے دیپ ہوتے ہیں اگر ایک دیپ بجھا تو نیا جل اُٹھا خواہشوں کی روشنی کبھی بھی تاریکی کو مسلط نہیں ہونے دیتی۔۔۔ اور۔۔۔ تاریکی پہ حاوی روشنی۔۔۔ خواہشوں کی صورت میں بھی ہمارے عزم کو تازہ دم اور ارادے کو بیدار رکھتی ہے' قوت ارادی کو متحرک کرتی ہے اور کچھ پانے کے احساس کو مہمیز کیے دیتی ہے۔۔۔

جس طرح سمندر بے انت' بے کنار دکھائی دیتا ہے۔۔۔ یونہی۔۔۔ خواہشات کا بھی کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا ایک تک پہنچتے پہنچتے دوسرا ہاتھ سے پھسل جاتا ہے۔۔۔ اور تگ و دو از سرِ نو جاری ہو جاتی ہے جیسے تاحدِ اُفق پھیلے پانیوں پر سے نظر نہیں ہٹتی اور مطالعے و مشاہدے کے رنگ برنگ ابواب کھولتی چلی جاتی ہے اسی طرح خواہشوں کے دامن میں بھی اتنی وسعت ہے کہ بھلے آپ خواہشیں کرتے تھک جائیں۔ اُن کا دامن سمٹنے نہیں پائے گا۔۔۔

خواہشیں ریت کے گھروندوں کی طرح بنتی مٹتی۔۔۔ مٹتی بنتی۔۔۔ رہتی ہیں' جیسے لہروں نے گھروندے بہالیے تو پھر سے بننے شروع ہوگئے

اسی طرح حالات وواقعات کے ہاتھوں میں' خواہشوں کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔۔۔جس طرح گھروندوں کا مشغلہ بچپن کے معصوم دور سے لپٹا رہتا ہے۔۔۔اسی طرح یہی گھروندے زندگی کے اگلے سفر میں۔۔۔سائبان کی جستجو کو جاری رکھتے ہیں۔۔۔تا آنکہ۔۔۔شبانہ روز جدوجہد کی پروازوں سے تحفظ کے لیے کوئی آشیانہ وجود میں آجائے جو تخریب وتعمیر کے ادوار سے گزرتے ہوئے مسلسل مکینوں کے انہماک کو اپنی لپیٹ میں لیے رہتا ہے۔۔۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی خواہش کسی دوسری خواہش کو جگاتی ہے اور یوں خواہش درخواہش سلسلے چلنے لگتے ہیں۔۔۔کچھ اس طرح کہ ایک خواہش کی تکمیل کا دارومدار کسی دوسری خواہش سے پیوست ہو جاتا ہے جب تک دوسری خواہش کے پورا ہونے کی صورت نظر نہ آئے پہلی بھی ادھوری ادھوری رہتی ہے تب صرف مثبت اندازِ فکر ہی ڈھارس بندھائے رکھتا ہے۔۔۔

خواہشیں اور دُعائیں ایسے ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں کہ۔۔۔یہ حساب لگانا مشکل ہو جاتا ہے آیا دُعا نے کسی خواہش کا روپ اختیار کیا ہے یا کسی خواہش نے دُعا کی صورت اپنالی ہے شاید ہونا کچھ یوں ہے کہ جو دُعا کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی خواہش کی تکمیل کا نام ہوتا ہے اور جو خواہش دل میں پروان چڑھتی ہے اس کے لیے دستِ دُعا دراز کرتے رہتے ہیں۔لہٰذا ان کا باہمی ارتباط ظاہر کرتا ہے کہ دُعا کا پورا ہونا خواہش کے پورا ہونے کے مترادف ہے اور خواہش کا پورا ہونا بھی دُعا کی مقبولیت کی دلیل ہے' جب تک دم میں دم رہتا ہے۔خواہشوں سے ہمارا دل آباد اور ذہن روشن رہتا ہے اسی باعث اس چکا چوند سے کبھی بھی پیچھے ہٹنا نہیں چاہتے جو بیک وقت کئی خواہشوں کے سنگم پہ ہماری توجہ کو مرتکز کیے رہتی ہے اور اُن کی تکمیل کے لیے سرگرداں بھی۔۔۔خواہشوں اور دُعاؤں کے مابین پنہاں ربط یہی ظاہر کرتا ہے کہ خواہشوں کا دامن درازتر ہو جائے تو جانے انجانے اُن کی تکمیل میں شدت کا عنصر بڑھنے لگتا ہے یہی پہلو خواہشوں اور دُعاؤں کے دامن کو پیوستہ کیے رہتا ہے۔۔۔تشنۂ تکمیل خواہشیں ہی ساری توجہ کا مرکز ومحور بن کر۔۔۔دُعاؤں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔۔۔ان کی قبولیت ہی میں خواہشوں کی آسودگی چھپی ہوتی ہے۔۔۔

ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے۔۔۔خواہش کسی اور کی ہوتی ہے محسوس ہمیں وہ اپنی ہونے لگتی ہے گویا۔۔۔میں خیال ہوں کسی اور کا' مجھے سوچتا کوئی اور ہے۔۔۔یہ مصرعہ ایسے کنفیوژن میں مبتلا کیے دیتا ہے کہ پوری غزل پڑھ لیجیے مجال ہے جو کسی حتمی نتیجے پہ پہنچ پائیں۔آپ آخر تک کسی کیفیت کا تعین کر ہی نہیں پاتے سوچوں کی بھول بھلیوں میں ایسے اُلجھتے ہیں کہ سلجھنے کے لیے کوئی راستہ دکھائی ہی نہیں دیتا ایسی صورتِ حال کو دوسروں کی خواہشوں پہ غاصبانہ قبضہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے جس کے لیے کسی اخلاقی ضابطے کو خاطر میں نہیں لایا جاتا اور سوچتے ہیں ہم کون سے ایسے بے اختیار ہیں کہ کسی سے اجازت کا کھڑاگ پالتے پھریں۔۔۔

جب خواہشات کے انبار کا غبار بڑھتا ہی چلا جائے تو بعض اوقات انسان اُن کا پیچھا۔۔۔کرتے ہوئے بہت دُور تک چلا جاتا ہے اتنا دُور کہ سب سایوں کی طرح کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں مگر۔۔۔خواہشوں کے میلے۔۔۔اور۔۔۔چاہتوں کے ریلے اس طرح بہائے چلے جاتے ہیں۔۔۔کہ۔۔۔لوٹنے کی راہوں کو بتدریج بڑھتے ہوئے فاصلے نگاہ سے اوجھل کیے دیتے ہیں۔۔۔

بعض خواہشیں ناتمام رہ کر۔۔۔لوگ کہتے ہیں۔۔۔کہ۔۔۔تمام عمر سلگاتی ہیں' جلاتی ہیں' تڑپاتی ہیں' رُلاتی ہیں۔۔۔اُن کی دھیمی میٹھی آنچ بدستور۔۔۔کسی ذہنی دریچے۔۔۔کسی قلبی گوشے۔۔۔سے اپنا احساس دلاتی رہتی ہے۔۔۔ناتمام خواہشیں ہی حسرتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یہ خواہشوں کی ناآسودگی کا وہ مقام ہے جہاں پہنچ کے یکے بعد دیگرے تکمیلی در و دریچے بند ہو چکے ہوتے ہیں۔

مگر۔۔۔یہ بھی۔۔۔کہتے سُنا گیا ہے کہ۔۔۔خواہشوں کی موسموں سے بھی خاص مناسبتیں ہوتی ہیں۔۔۔جب رُتیں سج دھج سے اپنے اپنے پیراہن میں نظر آتی ہیں تو۔۔۔نسبتیں جگاتی ہیں' کیفیتیں جاگتی ہیں' گرما کی شاموں میں خواہشوں کے رنگا رنگ آنچل۔۔۔دُور تک دِکھتے بادبانوں کی طرح لہرانے لگتے ہیں' تو برساتوں میں ہوا کی خوشبو سے خواہشیں جھولتی اور برستی بوندوں کے سنگ گنگناتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔پت جھڑ میں دھرتی پر اُترتے ہوئے پیلے پتوں کے ساتھ خواہشیں بھی سیمابی کیفیت میں ڈھلتی اضطرابی لہریں لینے لگتی ہیں۔جبکہ سرما کی طویل راتوں میں تو خواہشوں کی شال بُنتی اور سوچتی ہی چلی جاتی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی صاحب کا سا ''پٹکا'' کہاں سے لائیں جو مہد سے۔۔۔لحد تک کام آئے۔۔۔!

تنقید اور تنقیدی عمل: میرا نقطۂ نظر

جمیل جالبی

جب آپ اپنی بات، کسی تحریر یا فکر کے حوالے سے یا کسی زاویۂ نظر کے اظہار کے لیے شعوری سطح پر بیان کرتے ہیں تو عام معنی میں وہ تحریری یا زبانی اظہار ''تنقید'' کہلاتا ہے۔ اردو زبان میں ایسی تحریر یا اظہار کے لیے نقد، تنقید یا انتقاد کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جیسے نقدِ ادب، تنقیدِ حیات یا انتقادِ شاعری وغیرہ۔ انتقاد کے معنی ہیں پرکھنا، تنقید کرنا اور نقد کے ایک معنی پرکھ کے ہیں یعنی کھرا کھوٹا دیکھنا۔ ان معنی پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب آپ کسی تحریر، فکر یا نقطۂ نظر کے کھرے کھوٹے کو دیکھتے ہیں تو آپ اس کے ہر پہلو پر غور کرتے ہیں۔ غور و فکر کے دوران اس کا تجزیہ کرتے ہیں، ان عوامل پر غور کرتے ہیں جن کے پس منظر میں یہ تحریر یا فکر وجود میں آئی۔ آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس تحریر یا نقطۂ نظر کی روایت کیا ہے۔ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس تحریر میں جو کچھ کہا یا بیان کیا گیا ہے وہ کس طور پر اور کس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس اظہار میں جمالیاتی پہلو کی کیا نوعیت ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ تحریر یا فکر کس کس سطح کے پڑھنے والوں کو کس کس طرح متاثر کرتی ہے۔ اس اثر و تاثیر کی فنی نوعیت کیا ہے۔ اس کی تکنیک کیا ہے۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں کون سے الفاظ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ الفاظ کس طرح زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ اس تحریر کا تقابلی مطالعہ دوسری تحریروں سے بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی قدر و قیمت بھی متعین کرتے ہیں۔ یہ سارا عمل تنقیدی عمل ہے۔ اس عمل میں جتنا تفکر، جتنا مطالعہ اور شعور شامل ہوگا، یہ عمل اسی اعتبار سے وقیع یا وقیع تر ہوگا۔ جب آپ کوئی شعر سن کر دل سے واہ واہ کرتے ہیں تو یہ بھی تنقیدی عمل ہے لیکن اس تنقیدی عمل میں آپ تعریف یا تحسین کے وجوہ بیان نہیں کرتے بلکہ صرف نعرۂ تحسین بلند کر کے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیتے ہیں۔ جب آپ اس واہ واہ کی وجہ اور اس کے فنی اثر کو بیان کرتے ہیں تو یہ عمل تنقید کے ذیل میں آ جاتا ہے۔

یہ عمل، جسے میں نے تنقیدی عمل کہا ہے ذہنی یا مادی زندگی گزارنے کے دوران میں ایک فطری عمل ہے جس سے ہر شخص کو اپنی ذہنی استعداد کے مطابق واسطہ پڑتا ہے۔ جو شخص اس عمل سے جتنا گزرے گا اسی اعتبار سے وہ اچھی یا اعلیٰ ذہنی و مادی زندگی گزارے گا۔ ایلیٹ نے کہا تھا کہ زندگی کے لیے تنقید اتنی ہی ضروری ہے جتنا سانس لینا اور ڈرائڈن نے جو کہا تھا کہ To breath is to judge تو اس کے معنی بھی یہی تھے۔ جب آپ تنقید کے ساتھ ''ادبی'' کا لفظ شامل کر دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ تنقیدی عمل جو ادب کا بحیثیت ادب مطالعہ کرتا ہے، اس کا فنی تجزیہ کرتا ہے، اس کی تکنیک تلاش کرتا ہے، اس کی مابعد الطبیعات دریافت کرتا ہے، اس کے جمالیاتی پہلو، طرز ادا، لہجہ، چھپے ہوئے معانی کو دیکھتا اور پرکھتا ہے اور اس ادب پارے کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ اس ادبی تنقید کی ایک قسم وہ ہے جسے آئی اے رچرڈز نے استعمال کیا ہے، جہاں اس نے تنقید کا رشتہ ہر چیز سے کاٹ کر اسے مطالعۂ متن اور تلاشِ معنی تک محدود کر دیا ہے اور اسے جمالیاتی اصول بنا کر پیش کیا ہے یا نظریۂ ابلاغ کی وضاحت کے لیے اعداد و شمار جمع کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہ تنقید کلاس روم میں طلبہ کی تربیت کا کام تو دے سکتی ہے لیکن اس سے آگے اس کی معنویت باقی نہیں رہتی۔ بہر حال میں یہاں تنقید کی اقسام یا اس کے مختلف نظریات پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میں نصابی تنقید یا ان تنقیدی نظریات کے بارے میں بھی کچھ کہنا نہیں چاہتا جو ساری دنیا کی جامعات میں ادب کے پروفیسر وضع کر رہے ہیں اور ہر سال ایک دو نظریے سامنے آ جاتے ہیں اور جن کا ہمارے نقاد اس لیے ذکر کرتے ہیں تا کہ ان کی جدید ترین معلومات کا رعب پڑے۔

مختصر ا یہ کہ ادبی تنقید ادب کے مطالعے کے لیے استعمال ہوتی ہے لیکن چونکہ ادب خود زندگی کا آئینہ اور اس کا ترجمان ہے، اس لحاظ سے ادبی تنقید کو ادب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ زندگی اور اس کے ہزار رنگوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے تا کہ ادب کا دائرہ وسیع ہو اور تخلیق ادب کے لیے نئے مناظر سامنے آ سکیں۔ اس تنقید کا بنیادی حوالہ تو ادب ہی رہتا ہے لیکن وہ اس عمل سے ادب کے دائرے کو پوری زندگی پر محیط کر دیتی ہے۔ اس دائرے میں فلسفہ و فکر، کلچر، تاریخ، سماجی، معاشی، تہذیبی، سیاسی و سائنسی شعور سب کچھ آ جاتا ہے۔ میں ادبی تنقید میں اسی کا قائل اور اسی کا عامل ہوں۔ میرا زاویہ نظر

یہ ہے کہ ہر نقاد کو ادب کا نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ سماج کا نقاد بھی ہونا چاہیے۔ وہ بصیرت و روشنی' وہ شعور و ادراک جو ادب کی تنقید میں کام آتے ہیں' اسی بصیرت و شعور سے معاشرے کو بھی دیکھا' پرکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

ہم بیسویں صدی کے اواخر میں جس دور سے گزر رہے ہیں' جس طرح نظامِ فکر کی دیوہیکل عمارتیں گر رہی ہیں' جس طرح نظامِ اقدار ٹوٹ رہا ہے' چیزیں اور ان کے رشتے بدل رہے ہیں' ان کا مطالعہ بھی ادبی تنقید ہی کا کام ہے۔ تنقید کو بیک وقت ادب اور معاشرے پر تبصرہ ہونا چاہیے۔ آج یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جس نظامِ فکر پر بیسویں صدی قائم تھی وہ نظامِ فکر' خواہ مارکسیت کی صورت میں ہو یا مغرب کے نظامِ سرمایہ داری کی صورت میں' ٹوٹ گیا ہے اور جو رہ گیا ہے وہ تیزی سے ٹوٹ رہا ہے۔ اب ہمیں نئے نظامِ فکر کی ضرورت ہے۔ جس پر اکیسویں صدی کو مضبوطی کے ساتھ کھڑا کیا جا سکے۔ تنقید کو یہ کام بھی کرنا چاہیے' جن نقادوں نے مارکس کے جدلیاتی مادیت کے فلسفے کے ذریعے ادب کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کی تھی وہ ساری تحریریں آج یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جدلیاتی فلسفے کی مچڑ کو ادب کی چول میں زبردستی ٹھونکنے کی کوشش تھی۔ پچھلے دنوں ہنگری کے مشہور نقاد لوکاکس کا ایک مضمون پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے جدلیاتی فلسفے میں غوطہ لگاتے ہوئے ادبی تنقید دم توڑ رہی ہے اور نقاد کی سانس پھول گئی ہے' نئی فکر صرف کسی ایک کھونٹے سے بندھی نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کی کوکھ سے پھوٹتی' زندگی کے ساتھ بدلتی اور خود زندگی کو آگے بڑھاتی ہے۔ ''امتزاج'' کے ذریعے' تاریخ کے دھاروں کے شعور کے ساتھ' زندگی میں نئے عناصر کا اضافہ کرے۔ اس عمل سے تنقید تخلیقی قوتوں کو زندہ و بحال رکھنے کا کام بھی کرے گی اور عہدِ حاضر کی منجمد فکر کی تشکیلِ نو بھی کرے گی۔ اسی سے نیا شعور پیدا ہوگا۔ وہ نیا شعور جو معاشرے کی تخلیقی زندگی میں نئی روح پھونکتا ہے اور اسے عمل کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ شعور اور عمل جس سے ہمارا بے جہت' الجھا ہوا' پراگندہ خیال' زر پرست اور انصاف دشمن معاشرہ عاری ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب ''پاکستانی کلچر'' سے ایک اقتباس

ہم پاکستان کے سب باشندے اس ''ہند مسلم ثقافت' کے وارث اور جانشین ہیں جو اس برصغیر میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دورِ حکومت میں یہاں کی فضا' مزاج' آب و ہوا اور میل جول کے زیرِ اثر پروان چڑھی ہے۔ جس میں عربوں کا مذہبی جوش اور آدرش بھی شامل ہے اور افغانوں' ایرانیوں' ترکمانوں اور مغلوں کا مزاج اور روح بھی۔ نہ صرف یہ بلکہ جس کی روح نے برصغیر پاک و ہند کی روح کو اپنے مزاج میں سمو کر تہذیب کا ایک ایسا نمونہ پیدا کیا تھا جو کم و بیش آج برصغیر کی زندہ تہذیب کی بنیاد ہے' جس میں وہ عناصر بھی شامل ہیں جنہیں ہم الگ رکھ کر دیکھ رہے ہیں اور وہ عناصر بھی جو اس میل جول اور ربط ضبط کا منطقی نتیجہ تھے۔ ہم جو کچھ ہیں اسی تہذیب کا نتیجہ ہیں' جس کا صحت مند عمل ایک ہزار سال تک جاری رہا اور جسے ہم اپنی تخلیقی قوتوں سے سیراب کرتے رہے' جس کی نشانیاں ایک طرف برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں بکھری پڑی ہیں اور دوسری طرف ہمارے منہ سے لفظوں کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ آج بھی ہمارا لباس' ہمارا رہن سہن' ہمارے کھانے' ہمارے آدابِ معاشرت' ہمارے روزمرہ کے اوزار' ہمارے رسم و رواج' ہماری مصوری' ہماری موسیقی' ہماری شاعری اور ہمارا مزاج اسی تہذیب کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہی وہ تہذیبی ورثہ ہے' جس میں پاکستان کے سارے لوگ مشترک طور پر مزاجاً اور عملاً شریک ہیں۔ قومی یک جہتی اور ملکی سالمیت کی سطح بھی یہی ہے۔ ایک الگ مملکت کا شعور بھی اسی مزاج کی انفرادیت کو زندہ و باقی رکھنے کا شعوری عمل تھا۔ ہمارا قومی فریضہ ہے کہ ہم اس ورثے کا شعور آنے والی نسلوں تک مسلسل پہنچاتے رہیں۔

اسی منفرد کلچر کی وجہ سے مسلمان قوم ہندو معاشرے میں ایک ہزار سال تک شیر و شکر رہنے کے باوجود ضم نہ ہو سکی ورنہ ہندو مذہب میں متضاد عقائد کو جذب کر کے ہم آہنگی پیدا کرنے کی اتنی زبردست صلاحیت موجود ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں داخل ہونے والی کوئی قوم انفرادیت کو برقرار نہ رکھ سکی۔ کشان فاتح آئے اور شمالی مغربی ہندوستان کو فتح کر لیا لیکن چند ہی صدیوں میں ان کی اپنی انفرادیت ہندوستان کی تہذیب میں جذب ہو گئی' ہنس' گوجر' جاٹ اور راجپوتوں کے ساتھ بھی یہی عمل ہوا لیکن مسلمانوں نے اپنے قومی آدرش کی وجہ سے نہ صرف اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا بلکہ ایک ایسے کلچر کو جنم دیا جو آج سارے برصغیر کے کلچر کی بنیاد کا درجہ رکھتا ہے۔ ہند مسلم ثقافت ہی ہماری یک جہتی' روحانی اتحاد اور قومی تصور کا سرچشمہ ہے۔ اسی کی کوکھ سے اردو زبان پیدا ہوئی۔ اسی کی کوکھ سے ہماری موسیقی وجود میں آئی' جس کی عمارات اس کلچر کی روح کی مظہر ہیں' جس کی نقاشی اور خطاطی کے نمونے ہماری روح کا اظہار ہیں' جس میں ہمارے احساسِ جمال اور تخلیقی روح نے نئے نئے خوشبودار پھول کھلائے ہیں۔ اس تہذیبی ورثے کے مزاج کی وجہ سے اس ملک کا ایک ایک باشندہ ذہنی طور پر یک جہتی کی خواہش رکھتا ہے۔ یہی وہ تہذیبی ورثہ ہے' جس کی وجہ سے اردو' سندھی' پشتو' پنجابی اور یہاں تک کہ ''مسلم بنگلہ'' وغیرہ زبانوں میں صنمیات اور رمزیات اور اساطیر و علامات کا خزانہ مشترک ہے۔ اس ورثے کی ساری خوبیاں اور ساری کمزوریاں ہمیں بطور ترکہ ملی ہیں۔

(بحوالہ ص نمبر ۷۰-۷۱' طبع ششم ۱۹۹۷ء' مطبوعہ ''نیشنل بک فاؤنڈیشن'')

امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر

وزیر آغا

بیسویں صدی میں غیر طبقاتی معاشرے کو وجود میں لانے کی کوشش امتزاجی اکائی کی طرف ایک اہم قدم تھا جو بوجوہ کامیاب نہ ہو سکا لیکن امتزاجی رویے کے اثرات سیاسی، فکری اور انتقادی شعبوں پر ضرور مرتسم ہوئے۔ سیاسی سطح پر بڑی بڑی سلطنتوں کا وہ مخصوص انداز باقی نہ رہا جس میں ''مرکز'' نے سلطنت کی ساری ساخت پر تسلط قائم کر رکھا تھا۔ اس تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے ''مرکز'' کی عسکری قوت نے بھی ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ مگر دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب سلطنتیں ٹوٹیں تو اس کے نتیجے میں معاشرتی نظام پارہ پارہ نہ ہوئے بلکہ ایک نئی وضع کی امتزاجی اکائی پر منتج ہوتے دکھائی دینے لگے۔ اس امتزاجی اکائی کی نشان دہی دوسری جنگِ عظیم سے پہلے علامہ اقبال نے کر دی تھی جب انہوں نے باغ میں صنوبر کو آزاد بھی دیکھا تھا اور پابہ گل بھی، جس سے یہ اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ مختلف خطے کسی ایک سلطنت میں تمام و کمال ضم ہو کر اپنی اپنی انفرادیت سے محروم ہونے کے بجائے ایک ایسی ڈھیلی ڈھالی ساخت میں نظر آئیں جو غزل سے مشابہ ہو۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل و اکمل ہوتا ہے مگر ردیف قافیے میں پروئے ہونے کے باعث پوری غزل سے جُڑا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس وضع کی جو امتزاجی اکائی اُبھری اس کی بہترین مثال یورپی یونین تھی جس میں ہر ملک کی اپنی انفرادیت تو برقرار تھی مگر سارے ممالک ایک ہی چھتنار کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔

بیسویں صدی کی طبیعات میں بھی امتزاج کی طرف جھکاؤ صاف دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً T.O.E (Theory of every-thing) کی تلاش کائنات کی چاروں بڑی قوتوں یعنی الیکٹرو میگنیٹکس، سٹرانگ فورس، ویک فورس اور کششِ ثقل (جس کا پارٹیکل گریوی ٹون ہے) کو باہم آمیز کرنے کی کوشش شروع ہو گئی تھی اور سٹرنگ تھیوری کے آنے سے پہلے ان میں سے تین کا امتزاج ممکن ہو گیا تھا مگر کششِ ثقل ابھی زیرِ دام نہیں آئی تھی۔ بیسویں صدی کے آخری ایام میں سٹرنگ تھیوری نے یہ کام انجام دیا۔ تاہم اس میں کافی وقت لگ گیا۔ شروع شروع میں پانچ سٹرنگ تھیوریاں سامنے آ گئی تھیں اور یہ کہنا بہت مشکل ہو گیا تھا کہ ان میں سے سچی تھیوری کون سی ہے۔ مگر پھر نوے کی دہائی میں ایم تھیوری سامنے آئی جس کا یہ موقف تھا کہ یہ پانچوں تھیوریاں سچی ہیں مگر ان میں سے ہر تھیوری 'حقیقت' کی صرف ایک قاش ہی کو بیان کرتی ہے۔ اُن نابیناؤں کا قصہ یاد کیجیے جن میں سے ہر ایک نے جب ہاتھی کو چھوا تو اُس حصے کی مناسبت ہی سے ہاتھی کو حتمی طور پر بیان کیا جس تک اُس کی رسائی ہوئی تھی مگر ''دیکھنے والوں'' کو پورا ہاتھی دکھائی دے گیا۔ یہی حال پانچوں سٹرنگ تھیوریوں کا تھا جن میں سے ہر ایک نے حقیقت کے صرف ایک پہلو ہی کو بیان کیا۔ ایم تھیوری کا موقف یہ تھا کہ یہ پانچوں تھیوریاں دراصل سپر سٹرنگ تھیوری کی توسیعات ہیں۔ یوں دیکھیں تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ایم تھیوری نے امتزاج کی طرف ایک اہم قدم اُٹھایا۔ اُس نے نہ صرف اس بات کا انکشاف کیا کہ سٹرنگز وہ دھاگے ہیں جن سے Spatial Fabric وجود میں آیا ہے بلکہ یہ کہ اصل حقیقت میں سٹرنگز کی شیرازہ بندی ہے جو زماں اور مکاں سے ماورا ہے، جب سٹرنگز Vibrate کرتے ہیں تو زماں اور مکاں وجود میں آتے ہیں۔ برائن گرین Brian Greene نے اپنی مشہور کتاب The Elegant Universe میں سٹرنگ تھیوری کو یوں بیان کیا ہے:

> String theory is the unified theory of the universe postulating that fundamental ingredients of nature are not zero-dimentional point particles but tiny one-dimentional filaments called 'strings.' String theory harmoniously unites 'quantum mechanics and 'general relativity' the previously known laws of the small and large, that are otherwise incompatible.

گویا ایم تھیوری / سپر سٹرنگ تھیوری نے کائنات کی چاروں قوتوں کو ہم آہنگ اور باہم مربوط دکھا کر اس کے امتزاجی پیٹرن کا احساس دلایا نیز اس انکشاف نے 'رشتوں کے جال' کے تصور کو پیش منظر میں لا کر امتزاج کی ہیئت کو بھی بیان کر دیا لیکن سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ سپر سٹرنگ تھیوری ایک انتہائی پُراسرار توازن کے اصول یعنی Symmetry Principle سے ماخوذ نظر آنے لگی جس کا مطلب یہ ہے کہ زماں اور مکاں کے

وجود میں آنے سے پہلے ہی 'حقیقت' ایک عظیم پُراسرار توازن کا دوسرا نام تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں طبیعات اور مابعد الطبیعات میں کوئی فرق موجود نہیں تھا۔

بیسویں صدی کے لسانی مباحث میں بھی امتزاج کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے مثلاً سوسیور کا موقف یہ تھا کہ لانگ جو زبان کا نظام یا سسٹم ہے نظروں سے اوجھل ہوتا ہے مگر پارول یعنی گفتگو یا عبارت میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال ہاکی یا فٹ بال کا میچ ہے جس میں کھیل (پارول) کے بنتے بگڑتے رشتوں یعنی Interactions میں کھیل کی گرائمر یا سسٹم کو با آسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کھیل کے دوران میں جب گرائمر یا سسٹم کے کسی قاعدے کی خلاف ورزی ہوتی ہے (جسے کھیل کی زبان میں فاؤل کہا جاتا ہے) تو ریفری سیٹی بجا کر کھیل روک دیتا ہے۔ لانگ اور پارول کا یہ انوکھا امتزاج ہے جو کسی شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک فطری عمل کا زائیدہ ہے۔

اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سمندر کی سطح پر لہروں کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا کھیل جاری ہوتا ہے جس کے عقب میں پانی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مراد یہ کہ پانی کی لانگ' پانی کے پارول کی صورت میں 'تماشا' دکھا رہی ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو اس میں صوفیانہ تصورات کی ایک جھلک بھی دیکھ سکتے ہیں۔

امتزاج کے حوالے سے سوسیور کی ایک اور عطا یہ ہے کہ اُس نے زبان کو دو زمانی یعنی Diachronic کے بجائے ایک زمانی یعنی Synchronic قرار دیا اور یہ بات بیسویں صدی کے مزاج کا حصہ تھی۔ بیسویں صدی کے تمام شعبوں میں رشتوں کی مدد سے ایک ایسی ساخت کو وجود میں لانے کی روش عام تھی جس میں واحد مرکز کے بجائے انگنت مراکز کے ربط باہم سے ایک طرح کی Intertextuality اُبھر آئے۔ فلسفے کے میدان میں بھی یہی صورتِ حال اُبھری جب برگساں نے کہا کہ مرورِ زماں یعنی Real Time تو ماضی' حال اور مستقبل پر مشتمل ہے مگر زمانِ مسلسل یعنی Duration ایک ایسی موجودگی ہے جو بٹی ہوئی نہیں ہے' جس میں ماضی' حال اور مستقبل باہم مربوط ہو کر ایک پگھلی ہوئی کیفیت بن گئے ہیں۔

سماجیات میں درکھیم نے سوسائٹی کے بارے میں کہا کہ وہ ایک اجتماعی معاشرتی نظام یا سسٹم کا نام ہے اور افراد کی جملہ سرگرمیاں اس معاشرتی نظام کے حوالے ہی سے وجود میں آتی ہیں۔ سوسائٹی اور فرد کا یہ رشتہ بھی بیسویں صدی کے عام مزاج کے عین مطابق تھا جس میں نہ تو فرد مطلق العنان ہوتا ہے اور نہ سوسائٹی! انیسویں صدی کی سوسائٹی میں فرد کی بالادستی قائم تھی جبکہ بیسویں صدی کے اشتراکی نظام میں سوسائٹی کی بالادستی قائم تھی جبکہ بیسویں صدی کے اشتراکی نظام میں سوسائٹی کی بالادستی قائم ہوئی مگر پوری بیسویں صدی کی جہت کو سامنے رکھیں تو ان دونوں میں ربط باہم کی صورت پیدا ہوئی جو امتزاج کی طرف ایک اہم قدم تھا۔

بیسویں صدی کی نفسیات میں اہم ترین آواز فرائیڈ کی تھی۔ فرائڈ نے شعور کی مطلق العنانی پر کاری ضرب لگائی جب اُس نے کہا کہ شعور کے عقب میں لاشعور کا ایک وسیع منطقہ موجود ہے جو شعور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ فرائڈ کے بعد جب یونگ نے لاشعور کے علاوہ اجتماعی لاشعور کا بھی ذکر کیا تو گویا فرائڈ کے لاشعور کو مزید گہرا اور کشادہ کر دیا اب کھلا کہ فرد کے شعوری اقدامات خود کار اور خود کفیل نہیں ہوتے' اجتماعی لاشعور سے ہم رشتہ ہوتے ہیں جو نسلی تجربات کا ایک گودام ہے۔ غور کیجئے کہ بیسویں صدی کی نفسیات نے اصلاً فرد اور معاشرے کے رشتے ہی کو بیان کیا لیکن نفسیاتی دائرہ کار کے حوالے سے۔

جہاں تک امتزاجی تنقید کا تعلق ہے وہ بیسویں صدی کی مندرجہ بالا امتزاجی صورتِ حال کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ اس صورتِ حال میں جملہ علوم واحد مرکز کے قدیم تصور سے ہٹ کر ایک ایسی ساخت کو پیش منظر میں لائے ہیں جس میں اُفقی اور عمودی خطوط ایک دوسرے کو کاٹ رہے ہیں' جس کے نتیجے میں 'ایک' 'انیک' میں منقسم نظر آ رہا ہے۔ طبیعات نے اس صورتِ حال کو ''رشتوں کا جال'' کا نام دیا ہے۔ لسانیات نے اسے لانگ اور پارول کے رشتے میں اُبھرا ہوا دیکھا ہے اور فلسفے نے 'زمانِ مسلسل' کے تصور میں۔ سماجیات میں فرد اجتماعی معاشرتی نظام سے جُڑا ہوا دکھائی دیا ہے اور نفسیات میں شعور اور اجتماعی لاشعور کا رشتہ اُبھر آیا ہے۔ اساطیر میں جملہ اساطیر ایک ہی مہا اسطور سے ماخوذ نظر آتی ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں امتزاجی تنقید آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر سامنے آ گئی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا ہے؟

انیسویں صدی کے ربع آخر میں مائل بہ مرکز ساخت کی بالادستی قائم تھی۔ نیز بقائے بہترین کے تصور کو فروغ حاصل تھا جس کا بعد ازاں

منطقی نتیجہ سپرمین کی صورت میں سامنے آیا۔ ادب کے معاملے میں مصنف کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور یہ جاننے کی کوشش عام تھی کہ تاریخی تناظر میں اُسے کیا مقام حاصل تھا۔ انیسویں صدی حرکت وحرارت کی صدی تھی جس نے تاریخ کی کارکردگی پر توجہ مبذول کی، مرورِ زماں کے حوالے سے تغیر کے عمل کو دیکھا اور 'مرکز' کو اسی حوالے سے ایک Pivotal Point قرار دیا مگر بیسویں صدی میں مرکز گریزی کی جہت سامنے آئی۔ روسی ہیئت پسندی نے متن کی پوری میکانکی ساخت پر غور کیا اور یہ دیکھنے کی کوشش کی کس طرح اس کے اجزا کی کارکردگی وجود میں آتی ہے۔ اس نے متن کے مادی وجود ہی کو سب کچھ سمجھا۔ نیز یہ موقف اختیار کیا کہ تخلیق کاری میں بنیادی بات متن کو لسانی سطح پر 'نامانوس' بنانا ہے۔ اس نے نہ صرف تاریخی عمل کو مسترد کیا بلکہ تخلیق کے عقب میں کسی اور محرک کی موجودگی سے بھی انکار کر دیا۔ روسی ہیئت پسندی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ تصنیف اپنا ایک لسانی وجود رکھتی ہے جو خود کار بھی ہے اور خود کفیل بھی! لسانی وجود کو کھولنے اور اس کے کل پرزوں کی باہمی کارکردگی کو دیکھنے کا یہ عمل مغربی تنقید میں اُبھرنے والی Intertextuality کی طرف اولین پیش رفت کی حیثیت رکھتا ہے۔

روسی ہیئت پسندی کے بعد ''نئی تنقید'' نے متن یا Text کے اجزائے ترکیبی کی تفہیم کی طرف ایک اہم قدم اُٹھایا مگر جہاں روسی ہیئت پسندی نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ کس طرح متن کی میکانکی ساخت میں موجود پرزوں کی کارکردگی متن کو 'نامانوس' بناتی ہے وہاں 'نئی تنقید' نے متن کی اُس پیچیدہ بنت کاری کا احساس دلایا جو معنی آفرینی کی محرک تھی۔ روسی ہیئت پسندی نے معنی سے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا لیکن نئی تنقید نے متن کو اس مقصد کے ساتھ کھولا کہ اس کے بطون میں رعائتِ لفظی، قولِ محال، تناؤ اور ابہام وغیرہ کے عمل اور ردِ عمل سے پھوٹنے والے معانی کو بے نقاب کیا جائے۔ یوں دیکھئے تو نئی تنقید نے متن کے لسانی وجود میں معنی آفرینی کے وظیفے کی اہمیت کا احساس دلا کر اس کے دائرۂ کار کو وسعت آشنا کرنے کا اہتمام کیا۔

مغربی تنقید کے تدریجی پھیلاؤ میں 'نئی تنقید' کے بعد ساختیاتی تنقید کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ساختیاتی تنقید نے سوسیور کے پیش کردہ لانگ اور پارول کے تعقلات کی روشنی میں اپنے اس موقف کو پیش کیا کہ متن (پارول) کو مصنف تخلیق نہیں کرتا، شعریات (لانگ) کرتی ہے جو ثقافتی Codes اور Conventions پر مشتمل ہوتی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ روسی ہیئت پسندی نے متن کے اندر جھانکنے کی ابتدا کی مگر یہ ابتدا متن کے لسانی کل پرزوں تک محدود تھی۔ اس کے بعد 'نئی تنقید' نے مزید غواصی کی اور متن کے اندر معنی آفرینی کے عمل کو نشان زد کیا۔ ساختیاتی تنقید نے مزید غواصی کی اور معنی آفرینی کے عقب میں ثقافتی ورثے کا احساس دلایا۔ تنقید میں ہونے والی یہ غواصی نفسیات کی غواصی کے مشابہ تھی کیونکہ نفسیات میں بھی شعور، پھر لاشعور، اس کے بعد اجتماعی لاشعور میں جھانکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اجتماعی لاشعور نسلی اور ثقافتی سرمائے پر مشتمل تھا اور ساختیات نے شعریات کے جس منطقے کا احساس دلایا وہ بھی ثقافتی عناصر ہی سے عبارت تھا۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ کس طرح ساختیاتی تنقید نے لسانیات اور نفسیات کے تعقلات کو اپنے نظامِ فکر میں جگہ دی۔ یہی نہیں، اس نے قرأت کے رول کو بھی اہمیت دی اور معنی آفرینی کے عمل کو قاری کی کارکردگی سے مشروط کیا۔ ساختیات نے مصنف کی نفی کی مگر متن کی قرأت کے عمل میں ایک طرف شعریات کے مخفی وجود کو نشان زد کیا جو لانگ کے مماثل تھا نیز متن یعنی Text کی کارکردگی کو پارول کے حوالے سے ایک ایسا وظیفہ قرار دیا جو شعریات کی لانگ کے مطابق تھا اور دوسری طرف قاری کی حیثیت کو اُجاگر کیا جو متن کی تخلیق مکرر کرتا ہے۔ ساختیات کا یہ نظریہ امتزاجی تنقید کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ مگر جس طرح شروع شروع میں طبیعات کے T.O.E میں گریویٹون (Graviton) کی حیثیت ایک ایسے عنصر کی تھی جو باقی تین قوتوں سے ہم آہنگ نہیں ہو رہا تھا اسی طرح ساختیات میں متن اور قاری تو شامل تھے، مصنف شامل نہیں ہو پا رہا تھا۔ یہ بات امتزاجی تنقید کے حق میں کہی جا سکتی ہے کہ اس نے مصنف، متن اور قاری کو باہم آمیز کر کے تنقید کو T.O.E کے مرتبے پر فائز کر دیا۔

امتزاجی تنقید کا یہ موقف ہے کہ تخلیق کاری میں مصنف، متن اور قاری، تینوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ ان تینوں میں ایک ایسی Intertextuality ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ امتزاجی تنقید کو ساختیات کے اس نظریے سے اختلاف ہے کہ تخلیق کاری میں مصنف کی حیثیت صفر کے برابر ہوتی ہے۔ ساختیات یہ کہہ رہی تھی کہ مصنف کہنے کو تو اپنا ایک منفرد وجود رکھتا ہے لیکن دراصل وہ شعریات کے اجزائے ترکیبی کا ایک ہیولیٰ ہے اور تخلیق کاری اصلاً شعریات کی کارکردگی ہی کا نتیجہ ہے۔ یوں گویا ساختیات نے مصنف کی موت کا اعلان کر دیا۔ دیکھا جائے تو اس اعلان میں نطشے کے اُس اعلان کی صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی ہے جو اُس نے خدا کے حوالے سے کیا تھا۔ امتزاجی تنقید کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ شعریات جو

ثقافتی کوڈز اور کوششوں سے عبارت ہے تخلیق کے جوہر کی ضامن ضرور ہے مگر یہ جوہر براہ راست تخلیق کاری پر منتج نہیں ہوتا۔ اسے لامحالہ مصنف کے تخلیقی عمل کا امتحان ہونا پڑتا ہے۔ اس مسئلے کو ایک مثال سے با آسانی حل کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ شعریات اون کے دھاگے پر مشتمل ہے مگر یہ دھاگا براہِ راست سوئیٹر کی بنت کاری پر منتج نہیں ہوتا۔ اُسے ان سلائیوں کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے جو سوئیٹر بننے والے کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب سوئیٹر بننے کا عمل شروع ہوتا ہے تو سلائیوں کی کارکردگی ایک میکانکی عمل نہیں ہوتا۔ اس میں سوئیٹر بنانے والے کی تخلیقیت بھی شامل ہوتی ہے۔ گویا تخلیق کاری کے دوران شعریات کے اجتماعی محرکات میں مصنف کی ذات کے دھاگے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کی زندگی کے سانحات' اس کا مطالعہ' وژن اور زاویۂ نگاہ' سب فعال عناصر کے طور پر اُس کے تخلیقی عمل کا جزو بن جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں شعریات کے منفعل عناصر اور مصنف کی زندگی کے فعال عناصر ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک ایسے عالم کو وجود میں لاتے ہیں جسے صورت پذیر کرنے کے لیے مصنف کا تخلیقی عمل متحرک ہو جاتا ہے۔ ایسے میں مصنف مستقیم دھاگے کو قوسوں اور گرہوں میں منقلب کر کے ایک ایسی 'تخلیق' کو وجود میں لاتا ہے جس سے جمالیاتی حظ کی تحصیل ممکن ہوتی ہے۔

پچھلی کئی دہائیوں پر پھیلی ہوئی مغربی تنقید نے اول اول مصنف کو مرکز نگاہ بنایا' اس کے بعد متن یا Text کی بالادستی قائم کی' پھر قاری کو مرکزی حیثیت تفویض کی۔ امتزاجی تنقید نے تخلیقی عمل میں مصنف' متن اور قاری' تینوں کو شامل کر کے ایک ایسی مثلث کو سامنے لانے میں کامیابی حاصل کی جس کی تینوں اطراف ایک سی اہمیت کی حامل تھیں۔

امتزاجی تنقید کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ''لاتحریک'' ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی تحریک کی تابع مہمل نہیں ہے۔ پوری بیسویں صدی میں مختلف نظریوں کی حامل تنقید کا رواج رہا ہے یعنی مارکسی' نفسیاتی' رومانی' ہیئتی' اسطوری اور موجودی تنقید ہی سے کسی ایک کے حق میں آواز بلند کر کے اور اس کے دائرۂ کار کے اندر رہ کر تنقید لکھی جاتی رہی ہے۔ امتزاجی تنقید اس قسم کی کسی بھی تنقید کو مسترد نہیں کرتی۔ وہ صرف اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ فقط ایک تحریک یا نظریے کی حامل تنقید 'تخلیق' کے محض ایک پہلو پر خود کو مرتکز کر کے تنقید کے دیگر ابعاد سے روگردانی کی مرتکب ہوتی ہے۔ امتزاجی تنقید کا موقف یہ ہے کہ جملہ تنقیدی تھیوریاں' امتزاجی تنقید ہی کی توسیعات ہیں۔ تاہم امتزاجی تنقید سے مراد محض مختلف تھیوریوں کی حاصل جمع ہرگز نہیں۔ وہ ان سب کی حاصل جمع سے 'کچھ زیادہ' ہے اور یہ 'کچھ زیادہ' ہونا اس کا تخلیقی پہلو ہے۔ یوں تو درسی تنقید کو بھی بعض لوگ 'امتزاجی' کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی کسی ایک نظریے کے تابع نہیں ہوتی تاہم وہ اس لیے امتزاجی تنقید قرار نہیں دی جا سکتی کہ اس میں 'کچھ زیادہ' کا عنصر ناپید ہوتا ہے۔ یعنی وہ تخلیقی تنقید نہیں ہوتی۔ تنقید نگاری کا عمل تخلیق کاری کے عمل سے مشابہ ہے۔ تخلیق کاری کے عمل میں منفعل نسلی اور ثقافتی تجربات' تخلیق کار کی ذات کے فعال عناصر میں جذب ہو کر جب منقلب ہوتے ہیں تو 'تخلیق' وجود میں آتی ہے۔ یہی حال امتزاجی تنقید کا ہے جس کی شعریات میں جملہ تنقیدی زاویے منفعل عناصر کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ مگر جب اس شعریات میں تنقید نگار کا مطالعہ' وژن' زاویۂ نگاہ وغیرہ شامل ہوتے ہیں تو یہ اس قابل بن جاتی ہے کہ ''تخلیق'' کو کھول کر اسے منقلب کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں وہ فن پارے کی از سرِ نو تخلیق کرتی ہے۔ ''کچھ زیادہ'' کا مفہوم اس تقلیب ہی کی روشنی میں واضح ہوتا ہے۔

مصنف اور نقاد اصلاً دونوں تخلیق کار ہیں۔۔۔ اس فرق کے ساتھ کہ مصنف شعریات کو بروئے کار لا کر اور اس میں اپنی 'کہانی' کو آمیز کر کے متن کی تخلیق کرتا ہے جبکہ نقاد اپنے تخلیقی باطن میں موجود نقد و نظر کی شعریات کو بروئے کار لا کر متن کو کھولتا اور اُس کے ان چھوئے اور اَن دیکھے ابعاد کو روشن کر کے 'تخلیق' کو از سرِ نو تخلیق کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

شعر کیا نہیں ہے (لاتنقید)

ظفر اقبال

الفاظ یا خیالات کو محض موزوں کر دینے سے شعر نہیں بنتا' وہ خیالات' جتنے بھی اعلیٰ کیوں نہ ہوں۔ حتیٰ کہ کسی نئے خیال کو موزوں کر دینے سے بھی شعر لازمی طور پر وجود میں نہیں آتا۔ تو سوال یہ ہے کہ شعر آخر کس طرح سے بنتا ہے' اور وہ کیا چیز ہے جو شعر کو شعر بناتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ شعر کو شعر بننے سے روکتی کیا چیز ہے' اور یہی وہ کلیہ ہے جس سے اس مسئلہ کے کبھی مقفل در کھولے جاسکتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ شعر کی تاثیر روک لی گئی ہے۔ یہ کام بیشک دانستہ نہ کیا گیا ہو لیکن ہوا ضرور ہے۔ اگرچہ شعر کی تاثیر اور اُس کے تقاضے بھی وہ اگلے سے نہیں رہے' لیکن یہ ایک الگ بحث ہے اور جس کا تعلق معنی سے ہے جو بجائے خود ایک پیچیدہ معاملہ ہے کہ اب تو خود معنی کے انہدام سے معانی نکالنے کی مساعی آغاز کر چکی ہیں جبکہ قاری بھی از کار رفتہ اور بوسیدہ معانی سے باغی ہو چکا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ سب سے پہلے قاری ہی کو ناشاعری کی طرف راغب کرنے' اور اس کو شاعری سمجھنے پر مائل کرنے کی کوشش کی گئی جو بالآخر ناکام ہوئی کہ آج کا قاری شعر کے ضمن میں جس عدم اطمینان کا شکار ہے وہ اس سلسلے کی فکرمندی کی بنیادی وجہ بھی قرار پا چکی ہے کیونکہ اب اُسے مزید بیوقوف نہیں بنایا جاسکتا۔ واضح رہے کہ قاری کی ذیل میں عام قاری کے علاوہ خود شاعر' ادیب اور نقاد بھی آتے ہیں' بطور خاص وہ افراد جو اس فریب سے نکل چکے ہیں۔ شعر کے حوالے سے ایک مغالطہ جو اب تک چلا آ رہا تھا' یہ بھی ہے کہ یہ محض علم و دانش کی تحصیل کا ایک ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ قاری محض حکمت و دانش کے موتی رولنے کے لیے شعر کی قرأت نہیں کرتا کیونکہ اس مقصد کے حصول کے لیے دیگر اصنافِ ادب بھرپور طور پر موجود و میسر ہیں۔ حتیٰ کہ محض علم میں اضافہ بھی شعر خوانی کا منتہائے مقصود نہیں ہوسکتا کہ ادق مضامین بجائے خود شعر سے بیزاری کی ایک صورت پیدا کرتے ہیں۔ چلیے' مضمون کے لحاظ سے اگر شاعر کا ہاتھ تنگ ہے تو وہ اتنا تو کرسکتا ہے کہ شعر کو کم از کم خوش لباس ہی بنا دے کہ جامہ زیبی ایک عام اور معمولی شخصیت کو بھی قابلِ قبول اور پُرکشش بنا سکتی ہے۔ چنانچہ جو لباس فیشن باہر ہو جاتا ہے' عام طور سے ترک کر دیا جاتا ہے لیکن شاعری جس کا ملبوس ہی پیرایۂ اظہار ہے' اسے اپ ڈیٹ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی جس سے ایک اچھی شخصیت اور پیکر بھی مارکھا جاتا ہے۔ تاہم' اس میں شاعر کی نیت کو دخل نہ بھی ہو تو ملبوسات کی طرح خود شاعری بھی ایک خاص مدت کے بعد اپنا فیشن تبدیل کر کے رہتی ہے' لیکن وہی شاعری جس کا خالق اُس کی باگیں کھلی چھوڑ دیتا ہے اور ایسے لوگ زیادہ تعداد میں نہیں ہوتے۔

جو شاعری عام طور پر' اور کثرت سے' ہمارے اطراف و جوانب میں تخلیق کی جا رہی ہے اُس کی بدقسمتی زیادہ تر وہ ناموزوں لباس ہی ہے جو اسے پہنایا جا رہا ہے۔ اس طرح کا شعر قاری کے ذہن و وجدان میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ ایسی شاعری پڑھ کر پہلا خیال یہی گزرتا ہے کہ ایسی شاعری تو وہ پہلے بھی بارہا پڑھ چکا ہے' اور اس میں آخر نئی بات کون سی ہے' بلکہ یہ کہ وہ یہ شاعری آخر کیوں پڑھے' اور اپنا وقت مزید ضائع کیوں کرے کیونکہ قاری کم کوش اور کم عیار ہی کیوں نہ ہو اُس کا ذوقِ شعر از خود ترقی بھی کرتا ہے' اور وہ شاعری سے' بہتری' مزید بہتری کی توقع بھی کرنے لگتا ہے۔ قاری کوئی بھی ہو' شاعری کو وہ لطف اُٹھانے اور اپنے تھکے ہارے اعصاب کو آسودہ کرنے کے لیے پڑھتا ہے☆ جبکہ شعر میں تازگی کے بغیر وہ یہ مقصد حاصل نہیں کرسکتا۔ واضح رہے کہ شعر میں تازگی محض تازہ مضمون باندھنے سے نہیں آتی بلکہ شعر کی ساری جزئیات اور پورا ماحول اس کی سامان رسانی کرتا ہے' اور جس کے کچھ اطراف ایسے بھی ہیں جن کی تعریف ممکن ہی نہیں ہے کہ محض اشاروں کنایوں میں ہی اس کی کسی قدر نشاندہی کی جاسکتی ہے مثلاً میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ وہ لازمی طور پر ایک طلسم ہے جو شعر کو شعر بناتا ہے' اور اگر وہ طلسم شعر کے اندر موجود نہ ہو تو لاکھ جتن کرنے سے بھی شعر' شعر نہیں بنتا اور کہیں نہ کہیں ایک آدھ آنچ کی کسر ضرور رہ جاتی ہے لیکن ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو شعر میں یہ طلسم ارزانی کرسکتے ہیں۔

یہاں شعر کی تکنیکی تعریف مراد نہیں ہے بلکہ غیر شعر سے مطلب یہ ہے کہ سطحی' سپاٹ اور بے کیف ہو۔ آپ کے ساتھ کچھ بھی نہ کرے' سر

☆'لطف لینے' کی بات تو قابلِ فہم ہے لیکن ''اعصاب کی آسودگی'' سے یہ شائبہ ہوسکتا ہے کہ تفریح اور ادب کے جمالیاتی سُرور میں فرق نہیں ہے (ج۔ح۔ج)

کے اُوپر سے ہی نکل جائے اور اگر سر میں گھسے بھی تو کوئی خاص فرق نہ پڑے۔ عامیانہ اور معمولی ہو چاروں چولیں کسی ہوئی نہ ہوں۔ آپ کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے بلکہ یکسانیت اور اُکتاہٹ پیدا کرنے والا ہو وغیرہ وغیرہ لیکن دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ بعض اوقات ایسے معائب نہ رکھنے والا شعر بھی شعر نہیں ہوتا' کیونکہ شعر کے معاملے میں رعایتی نمبر نہیں دیئے جاسکتے اور نہ ہی اس کے ضمن میں ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جاسکتا ہے بلکہ اس کے برعکس شعر ایک بے رحمانہ رویے کا متقاضی ہوتا ہے کیونکہ شعر تو ایک چیلنج کی صورت میں آپ کے سامنے آتا ہے' چنانچہ شعر اگر آپ کو بے دست و پا' اور چت نہ کر دے تو وہ شعر ہی نہیں۔ پھر' شعر کا ایک بہت بڑا جواز اس کے ہمرکاب ہوتا ہے' اور اگر نہیں ہوتا تو ہونا چاہیے۔

میری دانست میں شعر کا ہر لحاظ سے مکمل ہونا اُس کا عیب تو ہوسکتا ہے' خوبی ہرگز نہیں۔ یعنی قاری شعر پڑھ لے اور بات وہیں ختم ہو جائے۔ بُرے شعر میں ابہام نہیں ہوتا۔ سب سے بُرا شعر وہ ہے جس میں کوئی روایتی مضمون روایتی طریقے سے ادا کیا گیا ہو خواہ وہ مضمون کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو۔ پھر بُرا شعر وہ بھی ہے جس میں لفظ کی نسبت معنی پر زیادہ زور دیا گیا ہو۔ چنانچہ زبان کے حوالے سے جس شاعر کا رویہ غیر تخلیقی اور روایتی ہو' اُس سے بُرے شعر ہی کی اُمید رکھنی چاہیے کیونکہ بُرا شعر اور تو سب کچھ ہوسکتا ہے' شعر نہیں۔ شعر کے بارے میں جو گفتگو میں کرتا رہتا ہوں' زیادہ تر لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے' حتیٰ کہ عموماً وہ لوگ بھی' جو مثلاً میری شاعری کے بارے میں ایک باقاعدہ تحسینی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ حالانکہ اگر میں (واقعتاً) شعر اچھا کہتا ہوں تو اچھے اور بُرے شعر کے بارے میں میری رائے کو کوڑے دان میں نہیں پھینکا جاسکتا۔ کیونکہ میں اگر بقول شخصے بُرا شعر نہیں کہتا تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ بُرا شعر کیا ہوتا ہے' یا یہ کہ شعر کیا ہوتا ہے' اور کیا نہیں ہوتا۔ چنانچہ' بس ٹھیک ہے' قسم کا شعر بھی شعر نہیں ہوتا۔ شعر اگر غیر معمولی نہیں ہے تو وہ محض معمولی ہے لہٰذا شعر نہیں ہے۔

بُرے شعر کی ترویج میں ہمارے ہاں سب سے زیادہ حصہ فلیپ نگاروں اور دیباچہ نویسوں کا ہے جو اپنی تحریروں میں بالعموم معمولی کو غیر معمولی گردانتے ہیں۔ تخلیق کار کو اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچتا ہے نیز' قاری متن کو جب کتاب میں دی گئی رائے کے مطابق نہیں پاتا تو اُس کے اندر مایوسی کے ساتھ ساتھ ایک ردِ عمل بھی پیدا ہوتا ہے' جبکہ اس کا سب سے زیادہ نقصان رائے دینے والا اُٹھاتا ہے کہ اس مبالغہ آرائی یا غلط بیانی سے اُس کے اپنے وقار اور اعتبار میں کمی واقع ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں' بلکہ کہیں بھی' اگر شاعری' یعنی خراب اور بُری شاعری قابلِ مواخذہ نہیں تو غلو آمیز آرا پر بھی کوئی پوچھ پرتیت یا سزا مقرر نہیں ہے۔ شاعر ہو یا دیباچہ نگار' یہ کسی کا درد سر نہیں ہے کہ ناشاعری کو شاعری قرار دینے کے جو نتائج برآمد ہوسکتے ہیں' اُس کا ذمہ دار کون ہوگا۔ ایک اور خرابی یہ بھی ہے کہ ماٹھی شاعری ماٹھے نقاد بھی پیدا کرتی ہے جبکہ نقاد بننے کے لیے ہمارے ہاں پہلے ہی کوئی کوالی فکیشن موجود نہیں ہے۔ مشاعرے اور اخبارات کے ادبی صفحے اس بُرائی کو مزید آگے بڑھانے کا باعث بنے ہیں۔ ادب میں گروپ بندی اور دھڑے بازی نے بھی بُرے شاعر اور بُری شاعری پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی اور خوشامدی نقادوں کی ایک کھیپ الگ تیار کر دی ہے۔

بے شک قاری کو یہ حق اور اختیار حاصل ہے کہ وہ ناشاعری اور ناشعر کو رد کر دے لیکن اس کا علاج بھی یہ سوچا گیا ہے کہ کم تر درجے کی شاعری پر مشتمل مجموعوں کے ہمراہ خریدار کے لیے باقاعدہ ایک دلکش پیکج کی بھی اشتہار بازی کی جاتی ہے جس میں گاہک کو ایک جلد کی خریداری پر کتاب کے علاوہ ایک عدد خوبصورت ڈائری اور قلم وغیرہ کی پیش کش کی جاتی ہے۔ چنانچہ عہد جدید میں مارکٹنگ کے فن کو جست بھرنے کا جو موقعہ ملا ہے اس سے اشیاء کے زیب و زینت اور لش پش میں تو خاصا اضافہ ہوا ہے لیکن معیار میں جہاں تہاں گراوٹ ہی آئی ہے اور دو نمبر قاری میں بھی اضافہ ہوا ہے جسے ان حربوں سے باور کرا دیا جاتا ہے کہ یہ (ناشاعری ہی) اصل شاعری ہے لیکن سنجیدہ ادبی حلقوں میں اس بارے کوئی شک وشبہ موجود نہیں ہے کہ ہمارے گردونواح میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ قدرتی طور پر چونکہ دو نمبر شاعری اور شاعروں کا قاری بھی تعداد میں زیادہ ہے۔ اس لیے ناشرین بھی ظاہر ہے کہ کاروباری نقطۂ نظر ہی سے سوچتے ہیں اور چالو مال کی اشاعت میں زیادہ دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ اول تو شوقین مزاج شعراء جو چار پیسے خرچ کر سکتے ہیں اپنا مجموعۂ کلام زیورِ طبع سے خود ہی آراستہ کرا لیتے ہیں' اور ناشر کو بھی زیادہ تر وہی راس آتے ہیں۔

تاہم سنجیدہ قاری کے لیے یہ سوال ہمیشہ جواب طلب رہے گا کہ شعر کیا نہیں ہے۔ ہماری تفتیش کا مرکز بھی وہی شاعری اور شاعر ہیں جو معیاری ادبی رسائل میں شائع ہوتے ہیں اور جن کے بارے میں بالعموم کسی دوسری رائے کی گنجائش نہیں ہے لیکن ہمارا فوکس یہ طبقہ ہے جسے اپنے دل کو ٹٹولنے کی ضرورت ہے کہ جس طرح کی شاعری وہ تھوک کے حساب سے تخلیق کر رہے ہیں' کیا واقعی وہ شاعری کی ذیل میں آتی ہے۔ مثلاً میں اگر اپنی

شاعری کو مسترد کر سکتا ہوں اور اکثر و بیشتر کرتا رہتا ہوں تو بعض بلکہ اکثر دوسرے شعراء کے بارے میں فکر مند ہونے کا حق مجھے کیوں نہیں پہنچتا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ شاعری پر صحیح معنوں میں بُرا وقت آیا ہوا ہے اور یہ بات وہ ہے جو میں پہلی بار نہیں کہہ رہا ہوں چنانچہ یہ دہائی میں ایک بار پھر دے رہا ہوں کہ ہماری شاعری اگر شاعری نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے۔☆ تو مزید وقت ضائع کیے بغیر ہمیں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اس بارے میں غور کرنا چاہیے تا کہ بہتری کی کوئی صورت نکالی جا سکے۔

☆ کیا اس ''شاعری'' میں غزل کے علاوہ دوسری اصناف شعر کو بھی شامل سمجھا جائے؟ (ج۔ح۔ج)

غالبؔ کا ایک شعر سیّد عامر سہیل کی نظر میں

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسا میرے آگے

''۔۔۔یہاں یہ کہہ کر کہ غالبؔ کے یہاں کلیسا تہذیبی تبدیلی کے زیر اثر آیا ہے، بات ختم نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ میرے خیال میں بات یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں میں جس نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ غالب کے شعور کا وہ حصہ ہے جو آنے والے عہد اور اس کے امکانات کے بارے میں سوچتا ہے اور نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ غالب اپنے عہد کا مکمل شعور اور آگہی رکھتا ہے۔ مگر میرے خیال میں تو غالبؔ اس سے بھی آگے ایک ایسا مبلغ اور صوفی بن جاتا ہے جو آنے والے عہد اور اُس کے امکانات کی پیشین گوئی کرتا ہے اور یہ پیشین گوئی سو فیصد درست ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ عصری آگہی کے ساتھ ساتھ غالب آنے والے عہد کے ممکنات کی بھی خبر رکھتا ہے۔۔۔ غالبؔ کو اپنے عہد کے درباری نظام کے زوال کا مکمل یقین تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ نظام کے اندر پائے جانے والے تضادات اور اُن تضادات کے نتیجے میں آنے والی تباہی کا بھی غالبؔ کو مکمل ادراک تھا۔ کلکتہ میں رہتے ہوئے غالب کو صنعتی اور سائنسی ترقی کی رفتار اور مغربی تہذیبی یلغار کا بخوبی اندازہ تھا۔ اپنے اس شعر میں غالب مغرب کی صنعتی، سائنسی اور تہذیبی ترقی کی رفتار دیکھ کر یہ پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اب سائنس اور صنعتی ترقی کا سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور نئی اقدار کی مضبوط ترین تشکیل مغرب میں ہوگی۔ اس کے مقابلے میں غالب اپنی مذہبی اور تہذیبی اقدار کی شکستگی کا اعلان کرتے ہیں۔۔۔''

(''حوالہ'' از سیّد عامر سہیل، ص: ۱۱۰۔۱۱۱ سے مقتبس)

برقیاتی ابلاغ، قاری اور مصنف

احمد سہیل

اردو ادب اب ایسا نہیں پڑھا جاتا جیسے پچاس ساٹھ برس پہلے پڑھا جاتا تھا۔ ادب کے عدم مطالعہ کا سارا الزام ذرائع ابلاغ کے برقیاتی پھیلاؤ کو دے دیا جاتا ہے' جن میں انٹرنیٹ' ڈسک وغیرہ شامل ہیں۔ ادبی کتاب خوانی ختم ہوگئی۔ کتابیں چھپنا اور پڑھنا محض ''عیاشی'' قرار پایا۔ اس سے زیادہ علم و ادب اور کتاب کی اور کیا بے عزتی اور تذلیل ہو سکتی ہے۔ اردو کا عام قاری بھی اس بات سے شعوری یا لاشعوری طور پر متاثر ہوا اور اس نے تسلیم کر لیا کہ ادب ہمارے مسائل نہ ہی حل کر سکتا ہے اور نہ ہی ہمارا پیٹ بھر سکتا ہے۔ کوئی ان کو بتاتا کہ ادب ویسے انسان کے مسائل حل نہیں کرتا جیسے معاشی' معاشرتی اور سیاسی تناظر میں مسائل حل کیے جاتے ہیں۔ ادب فرد کو فکری بساط پر مسائل اور زندگی کے چیلنجوں کو سمجھنے کے لیے فکری خوراک فراہم کرتا ہے۔ جمالیاتی اظہاریت سے بات کہنے کا ڈھنگ وسلیقہ سکھاتا ہے۔ مطالعہ ادب کو چند بنیئے نما بہروپیوں نے بازار کاری کا وسیلہ بنا لیا ہے اور کچھ معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں ایسی ہوئیں کہ اردو ادب کا قاری بھی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا اور اس نے اس بات سے سمجھوتہ کر لیا کہ ادب پڑھنا ''عیاشی'' ہے۔ حالانکہ ادب سلیقہ ذات ہی نہیں سلیقہ حیات بھی ہے۔

اقدار بدلتی ہیں تو ادب کا مزاج بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ سیاسی اور تمدنی وساطت سے نئے رویے سامنے آتے ہیں جس کے سبب انجذاب اور تصادم کی صورتیں بھی اُبھرتی ہیں۔ جب اس قسم کا فکری ماحول ترتیب پالیتا ہے تو ادب کے قاری جو نہ صرف ذہین ہی نہیں ہوتے بلکہ حساس بھی ہوتے ہیں مختلف تناظر میں ادب کو پرکھنے اور سوچنے لگتے ہیں تو روایتی اور جمالیاتی اظہار کے پیکر بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اچھے شاعر و ادیب چاہتے ہیں کہ ہر کوئی ان کی تحریروں کو نہیں پڑھے۔ نااہل آدمی ان کی تحریروں کے ادراک کو اپنے اندر نہیں سمو سکتا' نہ اسے جذب کر سکتا ہے اور ناسمجھی میں اس کی غلط تفہیم وشرح کرتا ہے۔

اب تو زمانہ یہ ہے کہ زمینی حقائق کے حوالے سے شعر و ادب کو پرکھنے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔ کیونکہ نااہل' قاری اپنی نااہلیت کے سبب ادب کو تفریح مجلس سازی' ستائش باہمی کی حد سے زیادہ اور کچھ تصور نہیں کرتے۔ وہ اس صورتِ حال سے گھبرا گیا۔ کیونکہ اس کی مصنوعی دانشوری اور اس کے شعری بھرم اور شعر فہمی کا جنازہ اُٹھ گیا۔ کیونکہ ادب کو سمجھنے اور اس کی آگہی کے لیے جدید تنقیدی اور ادبی نظریات سے انسلاک ضروری تھا مگر نئے حالات و تناظر نے جب اپنا پھیلاؤ کیا تو یہ احساس بڑھا کہ ادب پڑھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں بلکہ سنجیدہ وظیفہ ہے اور ادب پڑھنا اور ہضم کرنا ہر شخص کی بات نہیں۔ زیادہ تر اب ادب وہ نہیں رہا جس پر درباری' نوابی اور مجلسی رنگ نمایاں تھا۔ مگر اب بھی یہ رنگ کسی حد تک اُردو ادب پر کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا ہے۔

اصل اور سنجیدہ ادب وہی لوگ لکھ رہے ہیں جن کا علمی و ادبی تناظر محیط ارض ہے اور وہ دیگر نظریات اور فکری رجحانات کو تقابل کے ساتھ اپنے ادراک میں سمو سکتے ہیں۔ اس میں یہ ملکہ بھی ہونا چاہیے کہ اس میں اپنی بات کو قاری تک پہنچانے کی صلاحیت بھی ہو۔ روایتی تہذیبی رکھ رکھاؤ کا آفاقی دور دم توڑ چکا ہے۔ تاریخ کا موہوم عکس ذہن میں رہتا ہے۔ جغرافیہ آہستہ آہستہ معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ فرد کا ابلاغی رابطہ اب سرحدوں کی بندشوں کا محتاج نہیں۔ چند لمحوں میں فکر و نظر دوڑ کر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہے۔

فی الحال سب سے اہم سوال اردو ادب کی بقا کے لیے یہ تصور کیا جا رہا ہے کہ ذرائع ابلاغ کی رنگارنگی ادب پر حاوی سی ہوگئی ہے۔ دل و ذہن اس قسم کی بات کو قطعی طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں جو طبقہ اردو پڑھتا ہے' اور جو صرف اردو پڑھنا ہی جانتا ہے اردو ادب بھی اس کی ضرورت ہے۔ صبح اُٹھ کر وہ اردو کا اخبار ضرور دیکھتا ہے یعنی کسی نہ کسی طور پر وہ اردو سے متعلق ہے۔ اردو ادب اس کا مسئلہ نہیں مگر وہ اردو سے مکمل طور پر فرار حاصل نہیں کر سکا۔ وہ اردو سے ناتہ نہ توڑ سکا۔ اردو سے تعلق میں کمی بیشی ضرور ہوئی ہے مگر وہ مکمل طور پر اغماض نہیں برت سکا۔ پرنٹ میڈیا اب بھی زندہ ہے اور اُردو

پرنٹ میڈیا کئی دوسری زبانوں سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ اس نے اپنی روایت بھی قائم رکھی ہے اور کسی طور پر سائبر سپیس اور کمپیوٹر کی نئی تکنیک کو بھی اپنائے ہوئے ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو معاشرے سے پکی سیاہی سے لکھا ہوا لفظ اب بھی معتبر ہے۔

میڈیا کا فوبیا خود ساختہ خوف ہے جو اردو معاشرے کے سنجیدہ لوگوں میں بڑا احساس ہے۔ اس خوف کا علاج بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔ یہ مسئلہ تو ہے مگر ایسا مسئلہ بھی نہیں جس کا حل ہمارے پاس نہیں ہو۔ ایسے ہی یہ خوف ہم نے غیر ضروری طور پر اپنے اوپر حاوی کر رکھا ہے۔

اچھا اور معیاری ادب چاہے کسی زمانے میں لکھا جائے۔ اسے ادب عالیہ میں کلاسیک بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ جس طرح مشق و مشک چھپائے نہیں چھپتے اسی طرح سے اعلیٰ اور حقیقی ادب پارے کبھی بھی تاریخ سے اوجھل نہیں ہوتے۔ مگر کبھی کبھار یہ ضرور ہوتا ہے کہ کبھی زیادہ کبھی کم وقت لگتا ہے۔ بے شک کمزور اور نااہل قسم کے ''دانشور'' دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی تاریکی میں رکھتے ہوئے میڈیا سے ادب کی مصنوعی جنگ کے موجد ہیں۔

بے شک یہ برقیاتی میڈیا کا دور ہے مگر اردو والے الیکٹرونک میڈیا پر مکمل کلاسیک اردو کا ادب منتقل نہ کر سکے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اُردو معاشرے سے کتاب خوانی کی روایت اُٹھتی جارہی ہے مگر انٹرنیٹ پر اردو کا جو سائبرس ادب ہے وہ بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ وہ مختصر ضرور ہے مگر اتنا بھی کم نہیں کہ اُردو ادب کا تصویری اور فکری سراپا کا ادراک نہ ہو سکے مگر پڑھے کون۔ عموماً اخبارات و جرائد میں ادبی مجالس کی خبریں پڑھ کر یوں لگتا ہے' اصل ادب یہی تخلیق ہو رہا ہے۔ ادھر اردو کی مغربی اور خلیجی بستیوں میں ادب و شعر کی بازار کاری اپنے عروج پر ہے۔ غیر متعلق لوگ اپنے آپ کو ''شاعر'' تسلیم کروانے کے چکر میں ڈالر' پونڈ' ریال اور دینار پانی کی طرح بہا رہے ہیں اور اردو ادب کے سنجیدہ حلقے یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ یہ غیر متعلق افراد اپنی شعبدے بازی سے میدان مار لینا چاہتے ہیں اور ان ہی کی چال بازیوں کے سبب یہ تاثر ہر سو پھیلایا جارہا ہے۔ کہ اصل ادب کی روایت کا زمانہ گزر گیا اور ہم جو کچھ ''لکھ'' رہے ہیں وہی ادب ہے۔ اب اردو کے ادیب اور قاری میں پہلی والی وہ یگانگت نہیں رہی اور نہ ہی ان کے مابین کوئی فکری اور قلبی رابطہ باقی رہ گیا ہے۔ ادھر بھٹکایا ہوا قاری اپنے اور اپنی تہذیب پر ڈھائے ہوئے ظلم اور فکری و جمالیاتی اذیت کو نہ سمجھ سکا کہ وہ جن تحریروں کو پڑھ رہے ہیں وہ سب کچھ ہے مگر ادب نہیں کیونکہ ان تحریروں میں نہ تو جمالیات ہے اور نہ کمالیات ہے۔ ادب کسی تمدن کا توانا حوالہ بنتا ہے اور انسانی احوال سے ہی محاکمہ و مباحثہ کرتا ہے اور فرد قرأت اور مطالعوں کے بعد اس میں از خود جذب ہو جاتا ہے اور اس سے مزید فکر و جمال کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ادب کی تفہیم و آگہی کے لیے اپنے آپ کو کھرچنا پڑتا ہے جو تکلیف دہ عمل تو ہے مگر اس کے بعد ہی اس کو اپنی اہلیت کا علم اور انکشاف ہی نہیں ہوتا بلکہ تنقید ذات کا عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ جمال' کمال' جلال اور سوال سب کچھ ہی اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

اردو ادب کے متن کو عام قاری قدرے کم دلچسپی سے پڑھتا ہے کیونکہ عام قاری کو اپنے نااہل ہونے کا شعور تو ہوتا ہے مگر متن سے انحراف کر کے یہ ادبی متن اور ادب خوانی سے اغماض برتتا ہے یا یہ وجہ بھی ہوتی ہے کہ تمدنی تناظر سے وہ جان کر کے نظریں چراتا ہے اور اس کی متن شکنی ناعلمی میں تشریح تفہیم و متن شناسی اور متن آگہی کے سنگین مسئلہ سے ادب کو ہی نہیں خود اسے اپنے آپ کو بھی گہرا فکری صدمہ پہنچاتی ہے۔ قاری کی نااہلیت کے سبب بعض دفعہ اعلیٰ سے اعلیٰ ادب پارہ بھی منٹوں میں مٹی میں مل جاتا ہے۔ لہٰذا بہت سے اچھے لکھنے والے اس پریشان کن حقیقت کو جان کر اپنی تحریروں کو ہر کسی کو دیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اس کے بعد صورتحال کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ ادیب یا شاعر کی ایک اور ذمہ داری کا اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اصل قاریوں کو تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ فہرست ترتیب دیتا ہے اور قاری کی اہلیت کی درجہ بندی کرنے کے بعد اپنی تحریروں کو قرأت و مطالعہ کے لیے ان کے پاس بھیجتا ہے تاکہ اس کے علمی اور ادبی کاموں کا جنازہ نہیں اُٹھے اور مٹی پلید ہونے کی گنجائش نہ ہو۔

نااہل قاری کو متن ان کی نظروں سے قریب معلوم ہوتا ہے اور واضح طور پر دکھائی بھی دیتا ہے لیکن درحقیقت یہ ان کی فہم و فراست اور تفہیمی سمجھ بوجھ سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ قاری کو اپنے ذوق اور اہلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے متن کا انتخاب کرنا چاہیے اور اسے اس بات کی آگہی ہونی چاہیے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور وہ متعلقہ متن سے کتنا متعلق ہے۔ متن کو منتخب کرنے کی آزادی مثبت ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی ہے کیونکہ غیر متعلق قاری ہر متن کو ہضم نہیں کر سکتا اور جو چیز اس کے بس میں نہیں ہوتی اس پر بھی حاوی ہونے کی کوشش کرتا ہے اور یہ کھوکھلی کوشش اعلیٰ اور اچھے سے اچھے

متن کو اندھیرے کنوئیں میں دھکیل دیتی ہے اور غیر متعلق قاری اپنی لاعلمی کے سبب غیر ضروری رائے بھی داغ دیتا ہے۔

دنیائے ادب و تنقید میں تنقیدی نظریات ایک مخصوص معاشرتی روایت کو وسعتِ نظر دیتے ہیں اور روایت کی توسیع میں حصہ لیتے ہیں روایت سے قاری کو بھٹکایا نہیں جائے اور قاری کی نظروں سے روایت کا مثبت تصور معدوم نہیں کیا جائے کیونکہ بعض دفعہ ادب کے جمالیاتی اور کمالیاتی پیمانے ہمارے پاس نہیں ہوتے' جس کی ادبی تفہیم و تشریح کے لیے روایت کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔

محیط ارض یا گلوبلائزیشن' سائبر س اسپیس' ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا فوبیا اور اس کی منفی تشریحات۔ اردو کی ماحولیات میں اتنی مصنوعیت پیدا کر کر پسپائیت اور رجعت پسندی کا ملا جلا احساس ہوتا ہے۔ بھائی لوگ خود تو پڑھتے لکھتے نہیں' سوچنے کی عادت ان میں ختم ہوگئی ہے۔ یہ غیر ضروری باتوں میں اپنے آپ کو اُلجھائے ہوئے ہیں۔ خود تو مغالطوں کا شکار ہیں اور دوسروں کو بھی لاسمت کر کے دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر بھائی آپ کو کرنے کو کچھ کام نہیں اور اس سلسلے میں نا اہل ثابت ہوئے ہیں تو اس الاؤ میں کودنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس الاؤ کی تپش بہت اذیت ناک ہے۔ اردو میں ادب و غیر ادب کی سرحدیں متعین ہونی چاہئیں۔ لکھنے والا نہ ہی بکاؤ مال ہے اور نہ ہی اسے شہرت کا جھانسہ دے کر ان سے روپے بٹورے جا سکتے ہیں۔ معاشرتی تناظر میں نئی صدی کا انسان ''بازار'' ہو کر رہ گیا ہے' جس آدمی سے بات کرو تو لگتا ہے کہ اسٹاک مارکیٹ کے آڑھتی سے بات کر رہا ہے۔ ایسی ہی کچھ صورتحال سے آج کا اردو معاشرہ دوچار ہے جو مایوس کن ہی نہیں المناک بھی ہے۔

'لفظ' اور 'شعر' کا رشتہ وزیر آغا کی نظر میں

بدن' خط اور سُر بجائے خود معنی سے محروم ہیں مگر ہر لفظ کے ساتھ مفہوم کی ایک پرچھائیں منسلک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر جب لفظ سے کوئی شعری کیفیت پیدا کرتا ہے تو وہ لفظ کو بدن' خط یا سُر کی طرح استعمال نہیں کرتا۔ پہلے وہ اس سے منسلک کاروباری مفہوم کو توڑتا اور پھر اسے ایک نئے مفہوم سے آشنا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر پہاڑ کے لفظ سے ایک خاص کاروباری مفہوم وابستہ ہے لیکن جب شاعر کہتا ہے۔۔۔ ''غم کا پہاڑ'' تو لفظ ''پہاڑ'' اپنے لغوی مفہوم کو تج کر ایک شعری مفہوم اختیار کر لیتا ہے۔ اس نئے مفہوم کو خلق کرنا مصور' مغنّی اور رقاص کا کام بھی ہے لیکن اُنھیں یہ آسانی ہے کہ وہ اپنے ''ذریعۂ اظہار'' کو براہِ راست استعمال کرنے پر قادر ہیں جبکہ شاعر کو پہلے' لفظ سے وابستہ رائج' پامال اور بندھے ٹکے مفہوم کو مسمار کرنا پڑتا ہے۔ لفظ ہی نہیں' لفظوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والے مفہوم کے منطقی سلسلوں کو توڑنا بھی شاعر کے لیے ازبس ضروری ہے تاکہ وہ لفظوں کی ایک نئی ترتیب سے' اُس وژن کو بیان کر سکے جس کی طرف وہ تخلیقی عمل کے دوران میں رواں دواں تھا۔ لہٰذا شعر میں الفاظ کا صحیح مقام پر فائز ہونا' ازبس ضروری ہے' ورنہ شعر سے اس کا سحر چھن جائے گا۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایک اچھے شعر میں کسی لفظ کے بجائے اگر اُس کا مترادف رکھ دیں تو شعر کا مفہوم تو شاید برقرار رہے لیکن اس کی ساری پُراسراریت غائب ہو جائے گی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہر لفظ کا ایک مزاج ہوتا ہے جو ایک خاص وژن کو پیش کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اور جب اس کے بجائے کوئی مترادف استعمال کیا جائے تو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوتی اور یوں شعر میں جاذبیت برقرار نہیں رہتی۔ چنانچہ ہر اچھا شاعر ایک جوہری کی طرح' الفاظ کے نگینوں میں سے وہی نگینہ منتخب کرتا ہے جو زیور میں نصب شدہ نگینوں کی مجموعی کیفیت سے ہم آہنگ ہو۔ مگر اُسے کس طرح معلوم ہوگا کہ اس کام کے لیے ایک خاص نگینہ (لفظ) ہی زیادہ موزوں ہے' یہ بات تجزیے اور تحلیل سے ماورا ہے کیونکہ لفظ کا انتخاب وہبی اور الہامی ہے' منطقی یا شعوری نہیں! بہرکیف لفظ یا لفظوں کے مروج سلسلوں کو توڑ کر ایک ایسی نئی ترتیب کو وجود میں لانا جو شاعر کے وژن کو زیادہ سے زیادہ گرفت میں لے سکے' کوئی آسان کام نہیں۔ غالباً یہی وہ مشکل ہے' جس کے باعث شاعر' وژن کو سو فی صد کامیابی کے ساتھ خلق کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

(''تخلیقی عمل'' از وزیر آغا' ص ۴۷۔۱۴۶' سے مقتبس)

فکاہیہ

ان ہاتھوں سے

عطاء الحق قاسمی

''بہت افسوس ہوا تمہارے دوست جیرے پہلوان کی وفات کا سن کر' بہت پیارا آدمی تھا!''

''ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی اسے۔ ایک ہی تو اپنا دوست تھا' آج کل ایسے دوست کہاں ملتے ہیں۔''

''اسے ہوا کیا تھا؟''

''ہونا کیا تھا' بالکل ٹھیک ٹھاک تھا' ایک دن پہلے اکھاڑے میں اس کے ساتھ زور کیا' کیسے کیسے استادی ''داؤ'' اس نے سکھائے' مگر اگلے دن پتہ چلا کہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی اسے۔ اللہ کے کاموں میں کسے دخل ہے!''

''لیکن ہوا کیا تھا اسے؟''

''ہونا کیا تھا جی' اکھاڑے میں ہم زور کرنے گئے ابھی پنڈے پر مٹی نہیں ملی تھی کہ کہنے لگا سینے میں درد ہو رہا ہے' میں نے کہا زور کرو' پنڈا کھل جائے گا۔ اس نے ڈنڈ نکالنے کی کوشش کی' دو ہی ڈنڈ نکالے تھے کہ سانس ٹوٹنے لگا' باؤ ارشد اس وقت پاس ہی تھا' وہ اسے سکوٹر پر بٹھا کر ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر ابھی ٹوٹی لگا کر دیکھ ہی رہے تھے کہ اس کا دم نکل گیا۔ نالائق ڈاکٹر ہیں جی! اپنی نالائقی پر پردے ڈالنے کے لیے کہنے لگے' ہارٹ ''اٹیک ہوا ہے!''

''جیرا پہلوان سگریٹ وغیرہ تو نہیں پیتا تھا؟''

''نہیں جی' اس نے تو کبھی خالی سگریٹ کو بھی ہاتھ تک نہ لگایا تھا!''

''کیا مطلب؟''

''زندہ تھا جی' بھرا ہوا سگریٹ پیتا تھا۔ اوہو!!! کتنی خوبیوں والا یار تھا میرا۔ خدا ترس اتنا کہ کسی کی تکلیف دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہفتہ پہلے وہ ٹیکس وصول کرنے کا کا سگریٹ فروش کے کھوکھے پر گیا' کا کا سگریٹ فروش جیرے کے پاؤں پڑ گیا کہ روزوں کی وجہ سے اس کی بکری آدھی ہو گئی ہے۔ گھر میں بچے بھوکے بیٹھے ہیں۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ یہ سن کر جیرے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے اٹھا کر سینے سے لگایا اور کہا دل چھوٹا نہ کر کا کے۔ آج اگر پیسے نہیں ہیں تو کل ادا کر دینا تم پر بے اعتباری تھوڑی ہی ہے!''

''یہ جیرا پہلوان غنڈہ ٹیکس بھی لیتا تھا؟''

''نہیں جی نہیں' میرا یار غنڈہ نہیں تھا جی' وہ تو غریب پرور تھا وہ ان جیبیں کاٹنے والے دکانداروں سے جرمانہ وصول کرتا تھا اور آگے غریبوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ آدھی ہیرا منڈی اس سے پلتی تھی بڑا خوبیوں والا یار تھا میرا۔۔۔ مگر بے وفائی کر گیا ساتھ چھوڑ گیا میرا' ان ہاتھوں سے نہلایا جی اسے!''

''میں نے سنا ہے اس کی ماں بہت روتی ہے۔''

''ماں نے نہیں رونا تو کس نے رونا ہے جی۔۔۔ اور پھر پہلوان ماں کا فرمانبردار بھی بہت تھا۔ جو کماتا تھا اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا تھا' ماں بھی اتنے نصیبوں والی تھی کہ جس روز وہ ماں کی شکل دیکھ کر گھر سے نکلتا اس کے سارے کام خود بخود ہوتے چلے جاتے' پولیس نے اسے مفرور قرار دیا ہوا تھا' مگر وہ پولیس کے سامنے سے گزر جاتا' اور پولیس کو نظر نہ آتا!''

''پولیس نے اسے مفرور قرار دیا ہوا تھا؟ وہ کیوں؟''

''بڑا تجی دار یار تھا میرا۔۔۔ دو چار بندے ''لانے'' دیئے تھے اس نے' بس اس کے بعد پولیس اس کے پیچھے تھی۔ پولیس کے ہاتھ نہیں آیا

جی۔ ڈاکٹروں کی نالائقی سے مرگیا۔ کیسا کڑیل جوان تھا میرا یار۔ پھٹے پر کیسے تیر کی طرح پڑا ہوا تھا۔ ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی اسے!''

''میں نے سنا ہے اسے اپنی بہنوں سے بھی بہت محبت تھی۔''

''محبت تو کوئی لفظ ہی نہیں ہے جی۔ عشق تھا اسے عشق۔ مگر اس کے باوجود بڑا رعب تھا اس کا' گھر میں داخل ہوتا تو وہ کمروں میں چھپتی پھرتیں۔ پورے محلے میں کسی نے ان کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ پہلوان کی زندگی میں اُنہوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا' ان کی ضرورت کی چیزیں ماں بازار سے خرید کر لا دیتی تھی!''

''اب کیا حال ہے ان بچاریوں کا؟''

''بھائی کی موت کا انھیں اتنا صدمہ ہوا ہے کہ دیوانگی کی حالت میں گھر سے نکل گئیں۔ آج تک ان کا سراغ ہی نہ مل سکا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ کپڑا لتا بھی ساتھ لے گئیں ورنہ اللہ جانے ان معصوموں کا کیا حال ہوتا۔ نہ ایسی باتیں چھیڑیں باؤ جی' میرا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے۔ میرا یار اس وقت قبر میں بے چین ہو رہا ہوگا' کیسا کڑیل جوان تھا۔ اس کے نام کی دہشت سے لوگ کانپتے تھے۔ لیکن مرنے کے بعد کیسی بے بسی کے عالم میں پھٹے پر پڑا ہوا تھا۔ اپنے ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی!''

''مرحوم کی بیوہ کا کیا حال ہے؟''

''جیرا پہلوان اپنا یار تھا جی اور یاریاں زندگی تک نہیں' مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہیں' اپنی اس بیوی کے ساتھ اس نے چند مہینے پہلے شادی کی تھی جب یہ اسے اُٹھانے گیا ہے تو۔۔۔''

''اُٹھانے گیا ہے؟''

''ہاں جی' لڑکی کے گھر والے نہیں مانتے تھے' تو جب یہ اسے اُٹھانے گیا ہے جی تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ خود ہی اُچک کر جیپ میں بیٹھ گئی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اس کے نصیب پھوٹ جائیں گے!''

''ہاں' یہ تو اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا!''

''مگر جی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے ہوتے ہوئے میرے یار کی بیوہ ساری عمر روتے گزار دے۔ میں ایک مہینہ پہلے اس کی خیر خیریت پوچھنے اس کے گھر گیا' دیکھا تو گھر میں کھانے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ جیرا پہلوان جو کماتا تھا لٹا دیتا تھا۔ مجھ سے اپنے یار کی بیوہ کی یہ حالت نہیں دیکھی گئی' میں نے اسے اسی وقت نکاح کا پیغام دیا' اب وہ میرے گھر کی مالک ہے جی۔''

''تو جیرے پہلوان کا کوئی بچہ وچہ نہیں تھا۔''

''بچارا اس معاملے میں بدنصیب تھا' اس نے بڑے علاج کرائے مگر بچہ کہاں سے ہوتا جی' ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی اسے۔''

مقروض کے دوست ہزار

عبدالقیوم

مرزا شگفتہ اپنی نظر میں جدید دور کے پکے مسلمان اور کردار کے ''غازی'' ہیں۔ اکثر افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ کاش شاعرِ مشرق علامہ اقبال زندہ ہوتے تو اپنے آپ کو اُن کی خدمت میں پیش کر کے عرض کرتا کہ ''زیادہ نہ سہی تو آٹے میں نمک کے برابر، مجھ جیسے ''کردار کے غازی'' اس مطلبی دنیا میں اب بھی موجود ہیں۔'' شگفتہ عیدین کی نمازیں صفِ اول میں امام کے پیچھے ضرور پڑھتے ہیں۔ وہ بھی اس لیے کہ اگر کل کلاں میدانِ جنگ میں شہید وغیرہ ہو جائیں (اور اس کا امکان نہیں) تو ان کے محلے کا امام مسجد ''بے نمازی ہونے کے ناطے'' نمازِ جنازہ پڑھانے سے انکار ہی نہ کر دے!

البتہ روزے عموماً ماہِ رمضان میں خرابیٔ صحت کی بناء پر ڈاکٹر نے ان پر کبھی ''فرض'' نہیں کیے۔ حج کرنے کے لیے ہمیشہ بے چین رہتے ہیں۔ اس لیے نقد زرائن کی شدید کمی انھیں چین سے نہیں رہنے دیتی۔۔۔ دولت میں کھیلنے والے جان پہچان کے لوگوں کو اُکساتے رہتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو ''حجِ بدل'' کی خدمات کے لیے ہر وقت حاضر ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان لوگوں میں مذہبی و اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے وہ حج کی سعادت سے ہنوز محروم ہیں۔۔۔ جس کا افسوس کے ساتھ ذکر اپنے یار دوستوں میں یوں کرتے ہیں کہ مفت میں گھر بیٹھے حج جیسی نیکی کمانے والے اب ہمارے معاشرے میں ناپید ہو چکے ہیں۔۔۔ ایک زمانہ تھا کہ ''حجِ بدل'' عام تھا۔ بیمار اور ضعیف والدین کے بدلے ان کی مالدار شراب و کباب اور عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی اولادیں کسی بھی غریب کو زادِ راہ مع دال روٹی کا خرچہ دے کر حج پر جانے کے لیے راضی کر لیا کرتے تھے۔۔۔ لیکن سائنسی ترقی نے آمد و رفت کے آسان ذرائع کے میسر آنے پر اس اُمید پر پانی پھیر دیا ہے۔ تاہم شگفتہ زکوٰۃ دینے کی استطاعت سے محرومی کی وجہ سے قرض لینے کو دنیا میں کامیابی کی کنجی سمجھتے ہیں۔۔۔ دوسروں کو بہلا پھسلا کر خود قرض لینے اور جان پہچان کے لوگوں کی تعداد میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر کے، ہمیں قرض لینے کے فوائد پر لیکچر دینا نہیں بھولتے۔۔۔

کہتے ہیں، تم نہ کسی اور سے قرض لیتے ہو اور معمولی سا قرض۔۔۔ کبھی کبھار ہی صرف مجھے دیتے ہو۔۔۔ لیکن تمہیں میرا بے حد مخلصانہ مشورہ ہے کہ بندۂ خدا کبھی کبھار میری بجائے۔۔۔ کسی اور سے اچھا خاصا قرض لے لیا کرو تا کہ اگر کل کلاں تمہارا دم نکلے تو کم سے کم جان پہچان کے چار آدمی تو کندھا دینے کے لیے موجود ہوں۔۔۔ میں اکیلے تمہیں کیسے اُٹھاؤں گا!

عرض کیا: تمہارا یہ نظریہ غلط ہے شگفتہ کہ قرض خواہ تمہارے جنازے کو ہنسی خوشی کندھا دیں گے۔ یہ بات تم خوش خط لکھ لو۔

بگڑ کر بولے: کیسے نہیں دیں گے کندھا وہ۔۔۔ آخر جان پہچان بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں ان کا قرضدار سہی، پھر بھی ایک طرح سے ان کا دوست تو بن جاتا ہوں۔۔۔ ایک اسی اٹوٹ رشتے کے ناطے وہ، تمہارے منہ میں خاک، میرے جنازے کو کندھا ضرور دیں گے!

زچ ہو کر تائید کی: ہاں ضرور دیں گے۔ بلکہ ہر حالت میں دیں گے۔۔۔ مقروض کو تو لوگ۔۔۔ میرا مطلب ہے قرض خواہ قبر تک نہیں چھوڑتے!

مرزا شگفتہ کا پختہ عقیدہ ہے کہ مہمانوں کی گھر میں آمد رزق میں فراخی اور نزولِ رحمت کا باعث ہوتی ہے۔۔۔ اپنے ہاں مہمانوں کے نازل ہوئے لی رحمت کے کرشمے وہ اکثر دکھاتے رہتے ہیں اور ہمیں قرض خواہ بننے کا اعزاز بخشنے کے لیے کچھ اس انداز سے دانت کچکچا کر اور آنکھیں میچ کر ہماری منت سماجت کرتے ہیں کہ پُرانی دوستی کی لاج رکھنی ہی پڑتی ہے۔

اکثر مہمانوں کی آمد سے پہلے ہم سے ہزار بارہ سو روپے ہتھیانے کے لیے، مہمانوں کے نام، ان کی عمریں اور تعداد، مختلف قسم کے ان کے کھانوں کے شوق کی تفصیل، دودھ پیتے اور برتن توڑنے پھوڑنے کے لائق بچوں کی تعداد، یہ سب اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ کسی ملک کا بے رحم اور بے حس وزیرِ خزانہ بھی زائد ٹیکس سسکتے عوام پر لادنے کے بعد کیا توجیہہ کرتا ہوگا۔۔۔

خیر! کبھی کبھار شگفتہ کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوتی ہے اور واقعی مہمان آ جاتے ہیں' تاہم اکثر محکمۂ موسمیات والوں کا رول ادا کرتے ہیں۔۔۔اگر پیسے واپس مانگو کہ مہمان تو آئے نہیں۔تو جواب میں فرماتے ہیں: مَیں نے ان کو خود جا کر آنے سے روکا تو نہیں۔۔۔وہ نہیں آئے تو کیا تمہارا خیال ہے' روپے اُن کی آمدِ جلیلہ کے بعد ہی خرچ کرتا۔۔۔میاں ہوش کی میڈیسن کھاؤ۔آخر گھر کے دیگر اخراجات بھی ہوتے ہیں۔ذرا غور فکر کرو!!!

شگفتہ کے مہمانوں کی عزت کرنے کے انداز بھی نرالے ہیں۔ہم سے قرض لے کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور مہمانوں سے ان کی پسند پوچھ پاچھ کر' بیوی کو احتیاطاً لکھا دیتے ہیں' لیکن صرف اپنی پسند کو ہی مدنظر رکھتے ہیں۔۔۔شگفتہ کی پسند میں' ہمیشہ سے ہاتھ تنگ رہنے کی وجہ سے' ایسی سبزیاں اور دالیں شامل ہوتی ہیں جنھیں شگفتہ کے گھر والے' بھی ناک بھوں چڑھا کر زہر مار کرتے اور شگفتہ کی پسند کو کوستے رہتے ہیں۔۔۔کھانے کی میز پر مہمانوں کے پسندیدہ کھانے نہ سجانے کی تشریح بیوی سے یوں کرتے ہیں کہ اس طرح مہمان میزبان کے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگتے ہیں۔چونکہ وہ پسند کے کھانے اپنے گھر میں کھا کھا کر منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہی تو کسی کو مہمان نوازی کی عزت بخشتے ہیں' اب اگر میزبان بھی ان پر گھر جیسا ظلم شروع کر دے تو؟

شگفتہ کہتے بھی سچ ہیں۔ان کی احتیاطی تدابیر کے باوجود' حیرت ہے کہ مہمانوں کو پہلے ہی دن اپنے گھر کی یاد بے طرح ستانے لگتی ہے۔۔۔مہمان شگفتہ کے پیہم اصرار کے باوجود' ہنس ہنس کر اس کی بھرپور مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلد از جلد رخصت ہو جاتے ہیں۔

مرزا شگفتہ کو قرض خواہوں پر اتنا مان ہے کہ وہ' ہمیں خاطر میں نہیں لاتے۔۔۔اکثر کہتے ہیں کہ تمہیں میرے سوا کون معزز شخص جانتا ہے۔۔۔مجھے دیکھو! اگر کوئی پولیس والا غلطی سے رات کو' مانگے تانگے کی بغیر لائٹ کھٹارا اسکوٹر چلاتے پکڑ کر کچھ لینا چاہے تو میرا پتہ سن کر ٹھٹھک جاتا ہے۔کیونکہ میں احتیاطاً اپنے کسی علیک سلیک اور جان پہچان کے پولیس افسر کے گھر کا پتہ بتاتا ہوں کہ ان کے ہاں مہمان ٹھہرا ہوا ہوں اور پھر اس سے نزدیکی رشتہ داری کا فرفر حوالہ اس پھرتی سے بیان کرتا ہوں کہ سپاہی کے سنجیدہ بلکہ غصیلے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر کر اپنی جان چھڑا لیتا ہوں!

گستاخی معاف! اگر تم دست درازی/اندازی پولیس کا شکار ہو جاؤ تو ٹھنڈے ٹھنڈے شب بسری کے لیے تھانے کے لکڑی کے بنچ پر اُونگھتے نظر آؤ۔۔۔اسی لیے تمہیں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اپنی جان پہچان کا دائرہ میری طرح وسیع کرو!

ہم نے اعتراض کیا: لیکن شگفتہ! مجھے تمہاری تیکنیک پسند نہیں!

بگڑ کر پوچھا: میری تکنیک میں کیا خامی ہے؟

عرض کیا: اگر تم اپنا کرائے کا گھر چھوڑنا چاہو تو نہیں چھوڑ سکتے کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی قرض خواہ تمہاری راہ تکتا نظر آتا ہے۔ہم تو ایسے قرض کے قائل ہیں کہ جو باآسانی' ہضم کر سکیں!

مسکرا کر بولے: تو تمہارا خیال ہے میں آج تک Regularly ہر ایک کا قرض چکاتا آ رہا ہوں؟ اجی حضرت! چھوٹے موٹے قرض خواہوں کو تو میں عموماً نہیں بلکہ خصوصاً کھری کھری سناتا ہوں کہ خواہ مخواہ چند سکوں کے لیے میرے دروازے کی کنڈی زور زور سے کھڑکا کھڑکا کر مجھے میٹھی نیند سے بے آرام مت کیا کرو۔۔۔تم سے زیادہ معزز قرض خواہ بھی تو موجود ہیں جو میری زبان پر بھروسہ کر کے دو دو سال سے میرے آسرے پر بیٹھے' ٹھنڈی آہیں بھرتے رہتے ہیں۔آپ خود اذیتی میں مبتلا رہتے ہیں لیکن آفرین ہے اُن پر' کہ مجھے تنگ کرنے نہیں آتے!

کوٹ عباسی

گل نوخیز اختر

کوٹ عباسی کسی پہاڑی علاقے کا نہیں ایک جیتی جاگتی شخصیت کا نام ہے۔ آپ چونکہ بہت اچھے ویٹر ہیں اس لیے اپنے آپ کو صحافی کہلواتے ہیں' اکثر نابلد لوگ آپ کو معمولی انسان سمجھتے ہیں' حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ آپ معمولی نہیں بلکہ بہت معمولی انسان ہیں۔ آپ کے مکمل تعارف سے پہلے ضروری ہے کہ آپ کا حلیہ مفصل بیان کر دیا جائے۔ آپ کا رنگ آف براؤن۔۔۔ قد پانچ فٹ دو مہینے۔۔۔ آنکھیں کھلی ہوئی۔۔۔ چھاتی 35 ملی میٹر گہری۔۔۔ گردن گملے دار۔۔۔ وزن 20 ماشے۔۔۔ اور بال کہیں کہیں سے بہت زیادہ ہیں۔ آپ بہت منکسر المزاج ہیں' ہر ایک سے جھک کر ملتے ہیں' تاہم آپ کے دشمنوں کا کہنا ہے کہ ایسا آپ صرف اپنے شوق کی وجہ سے کرتے ہیں۔ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں' اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک منٹ میں بتا دیتے ہیں کہ اخبار اُلٹا پڑا ہوا ہے یا سیدھا۔ آپ کو بہت سے شوق ہیں' تاہم آپ کے کچھ شوق وقت کی کمی کے باعث پورے نہیں ہو سکے اور کچھ جگہ کی کمی کے باعث۔ آپ کا پسندیدہ لباس کوٹ پینٹ ہے' اسی لیے حلقہ احباب میں ''کوٹ عباسی'' کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ کوٹ آپ کو آپ کے سب سے چھوٹے بیٹے نے آپ کی پہلی شادی پر گفٹ کیا تھا' آپ یہ کوٹ پہن کر زور زور سے گانے گایا کرتے تھے اور شور کیا کرتے تھے لہٰذا اہلِ علاقہ نے آپ کے اس کوٹ کا نام ''شور کوٹ'' رکھ دیا' تاہم آج کل آپ کی ایک بیماری کی مناسبت سے اس کوٹ کا نام ''سیال'' کوٹ پڑ چکا ہے۔ آپ نے شادی بھی اسی کوٹ میں کی تھی جو بعد ازاں ''کوٹ میرج'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ آپ کا کہنا ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔۔۔ جس نے کراچی نہیں دیکھا اس نے انتقال ہی نہیں کیا۔۔۔ جس نے گوجرانوالہ نہیں دیکھا اُس نے کبھی کھانا ہی نہیں کھایا۔۔۔ جس نے راولپنڈی نہیں دیکھا اُس نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔۔۔ اور۔۔۔ جس نے پشاور نہیں دیکھا۔۔۔ اُس نے اچھا ہی کیا۔ خواتین سے دوستی نبھانا بھی آپ پر ختم ہے' ہر معاملے میں انھیں شریک رکھتے ہیں' ایک لڑکی کو تو اپنے معاملات میں اتنا شریک کر لیا کہ اب وہ آپ کی ''شریکِ حیات'' ہے۔ آپ بہت مذہبی ہیں' چونکہ نماز سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس لیے سب آپ کو نمازی پرہیزی کہتے ہیں۔ آپ کے مذہبی ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اپنی اہلیہ کو بھی ''اہلیہ ماجدہ'' کہہ کر بلاتے ہیں' جب سے آپ کی شادی ہوئی ہے اپنے گھر جانا ہی چھوڑ دیا ہے' بقول آپ کے ''قدر کھو دیتا ہے روز کا آنا جانا۔۔۔!!!'' تاہم آپ چڑیا گھر با قاعدگی سے جاتے ہیں' آپ کا کہنا ہے کہ انسان کو اپنا اصل نہیں بھولنا چاہیے۔ کوٹ عباسی عوام سے بہت پیار کرتے ہیں' اتنا زیادہ کہ باقاعدہ دفتر کا قیام عمل میں لا رکھا ہے' اس دفتر میں وہ اکثر عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ''مانگ پتہ'' کھیلنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ چونکہ دفتر کے اخراجات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں اس لیے آپ کا بال بال قرضے میں جکڑا جا رہا ہے' تاہم معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنا بال بال قرضے سے چھڑوانے کی غرض سے اگلے ہفتے موقع پا کر ٹنڈ کروانے کا سوچ رہے ہیں۔ کوٹ عباسی چونکہ ایک رسالے کے ایڈیٹر بھی ہیں اس لیے کوٹ کی سامنے والی جیب پر جلی حروف میں ''پریس'' لکھوا رکھا ہے' تاہم چند حاسدین کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں ''ڈپریس'' لکھا ہوا تھا جس کا ''ڈ'' بار بار کی دھلائی سے مٹ گیا ہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے کوٹ عباسی جیسی جلیل القدر ہستی کے بارے میں ان صفحات پر کچھ لکھنے کا موقع مل رہا ہے' یہ مضمون تو ایک ابتدا ہے' انشاء اللہ زندگی رہی تو میں انھیں ایسی ایسی جگہ پر لکھوں گا جہاں انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ ہاں تو اب ذرا ذکر ہو جائے کوٹ عباسی کی شب روز کی مصروفیات کا۔۔۔!!!

آپ علی الصبح ساڑھے گیارہ بجے اُٹھتے ہیں' ناشتہ لان میں کرتے ہیں حالانکہ مخالفین بضد ہیں کہ انسانی ناشتہ لان میں نہیں کچن میں ہونا چاہیے۔ ناشتے میں آپ دو اُبلے ہوئے انڈوں کا آملیٹ ہاف فرائی کر کے نوش فرماتے ہیں' چونکہ ہر وقت ریوالور پاس رکھتے ہیں اس لیے چائے پسند نہیں فرماتے' آپ کا موقف ہے کہ زیادہ چائے پینے سے انسان ہتھیار اُٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔ ناشتے کے بعد آپ انگریزی اخبار سے ہاتھ صاف کرتے ہیں اور منہ سے ڈکار مارتے ہیں' آپ بہت صفائی پسند ہیں لہٰذا روزانہ تیمم کرتے ہیں اور آفس آنے کے لیے اپنا تاریخی کوٹ زیب تن

کرتے ہیں، کوٹ کو زمانے کے گرد و غبار سے بچانے کے لیے آپ احتیاطاً اس کے اُوپر لمبا سا شاپنگ بیگ چڑھاتے ہیں اور اپنے ''سہراب ڈیزل'' کی قینچی چلاتے ہوئے آفس پہنچ جاتے ہیں۔ چونکہ آفس تہہ خانے میں ہے اور زمانہ بہت خراب ہے اس لیے آپ مجبوراً اپنی سواری اُٹھا کر ساتھ ہی دفتر لے جاتے ہیں اور اپنی کرسی کے ساتھ ''کس کے'' باندھ دیتے ہیں۔ شام پانچ بجے تک ڈیڑھ ہزار فون کرتے ہیں اور مستحق بن کر اپنے رسالے کے لیے پانچ ہزار کا ریونیو اکٹھا کر لیتے ہیں۔ چونکہ غصے کے بہت تیز ہیں اس لیے چھ بجے سیکرٹری پر گرم ہوتے ہیں اور سات بجے ٹھنڈے ہو کر گھر چلے جاتے ہیں۔ گھر جاتے ہی بیگم پر بھی گرم ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بیگم غصے میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں چنانچہ آپ غصے سے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہیں اور ایک میڈیم سائز ٹکر دیوار میں رسید کرتے ہیں، یہ عمل کرتے ہی آپ کے منہ سے کچھ ایسی لایعنی آوازیں نکلتی ہیں جو عام طور پر عیدالاضحیٰ کے دِنوں میں سننے کو ملتی ہیں۔ رات 8 بجے آپ بیڈروم میں تشریف لے جاتے ہیں اور ٹھیک 8 بج کر دو منٹ پر باہر برآمدے میں آ کر سو جاتے ہیں۔ کوٹ عباسی جیسی شخصیات روز بروز پیدا نہیں ہوتیں، یہ وقوعہ کئی صدیوں بعد رونما ہوتا ہے۔ میں کوٹ عباسی سے بہت محبت کرتا ہوں کیونکہ ارشاد ہے کہ بے زبانوں سے بھی محبت کرنی چاہیے۔

رضوان اللہ، تنقید اور طنز و مزاح ـــــ حقانی القاسمی کی نظر میں

دراصل ایک بڑے تخلیق کار کے پاس ایک آئینہ ادراک ہوتا ہے جس میں اس کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے۔ یہ آئینہ ادراک ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مزاح نگاروں کے پاس ایسا ایک آئینہ ضرور ہوتا ہے جس میں وہ مستقبل کے منظر نامے کو محسوس کرتے ہیں۔ رضوان اللہ صاحب بھی بنیادی طور پر طنز و مزاح کے آدمی ہیں، مگر طنز و مزاح کی تاریخ لکھنے والے عموماً بہت ہی مضحکہ خیز انداز اختیار کرتے ہیں۔ اُن کی تنقید کی مضحکہ خیزیاں اس طور پہ روشن ہوتی ہیں کہ وہ طنز و مزاح کی اصل کو فراموش کر کے فروعات میں اُلجھ جاتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ مزاح وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کے پاس دنیا بھر کی معلومات اور اطلاعات کا وافر ذخیرہ ہو۔ مزاح کی ایک ایک سطر میں معلومات کا سمندر موجزن ہوتا ہے۔ مزاح اور معلومات کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ مزاح کے لیے جس شارپ نیس، جس قادرالکلامی، جس طباعی، خلاقی اور جس توغل کی ضرورت پڑتی ہے وہ کسی اور چیز کے لیے نہیں پڑتی۔ دس بارہ کتابیں سامنے رکھ کر قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' یا حیات اللہ انصاری کے ناول ''لہو کے پھول'' سے زیادہ ضخیم تحقیقی مقالہ آپ تحریر کر سکتے ہیں مگر مزاح کی چند سطریں لکھنا اور اُن سطروں میں سمندر کو کوزے میں قید کر کے قاری کو باندھ لینا جوئے شیر لانے جیسا ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے مزاح میں سب سے زیادہ سنجیدگی نظر آتی ہے۔

میں مزاح میں جتنی سنجیدگی، متانت، وقار محسوس کرتا ہوں اتنی تو تنقید کی سنجیدہ تحریروں میں بھی نظر نہیں آتی۔ مزاح کے لیے پورے وجود کی بیداری ضروری ہوتی ہے۔ حواسِ خمسہ جب مکمل طور پر جاگتے ہیں تبھی مزاح معرضِ وجود میں آتا ہے اور ایک تنقیدی تحریر لکھنے کے لیے ان تمام حواس کی بیداری قطعی ضروری نہیں ہے۔ اسی لیے آج کی بیشتر تنقیدی تحریریں خفتہ اور خوابیدہ نظر آتی ہیں جب کہ مزاح رات کے پُر ہول سناٹے میں جاگتا، ہنستا، کھیلتا طوفان موج حوادث سے لڑتا ہوا نظر آتا ہے۔

(حقانی القاسمی کی تصنیف ''لاتخف'' سے مقتبس)

غزلیں II

اکرام تبسم

جو نہ تھا موجود وہ کردار بھی ڈالا گیا
اس کہانی میں کہانی کار بھی ڈالا گیا

باغبانوں میں چھپے بیٹھے تھے کچھ نمرود بھی
آگ میں ہم کو سرِ گلزار بھی ڈالا گیا

مضحکہ میری غریبی کا اُڑانے کے لیے
میرے ویرانے میں اک بازار بھی ڈالا گیا

قافلے بھی ارتقاؤں کی طرف بھیجے گئے
وہ نور دوں کو پسِ دیوار بھی ڈالا گیا

پاؤں آہستہ اُٹھانے کی اجازت بھی نہ تھی
اور کاندھوں پر تبسّم بار بھی ڈالا گیا

ضیاء الحسن

ہمیں یہاں پہ کوئی اختیار، اگر ہے بھی
بس ایک سانس کا ہے اعتبار، اگر ہے بھی

کہاں خمار، فقط اک خمار سا ہے کچھ
تمہاری چشم سے باہر خمار اگر ہے بھی

حدوحساب سے باہر ہے عالمِ امکاں
حد و حساب میں اس کا شمار اگر ہے بھی

پڑے ہوئے ہیں کہیں پر میانِ بود و نبود
یہیں ہے، ہم کو یہاں کچھ قرار، اگر ہے بھی

بس ایک عکس ہے دُھندلا سا چشمِ حیراں میں
کسی کا ہم کو یہاں انتظار اگر ہے بھی

کسی خیال کے مٹتے ہوئے نشان میں ہے
بنائے ہستی ناپائیدار اگر ہے بھی

سعید اقبال سعدی

مرے عزیزوں کی محفل جمی رہی لیکن
بس اک خلوص کی اس میں کمی رہی لیکن

سنا تھا وقت کا پہیہ کبھی نہیں رکتا
ہمارے وصل کی ساعت تھمی رہی لیکن

نجانے پیار پہ دل کیوں نہیں ہوا مائل
فضا بھی راس تھی رُت شبنمی رہی لیکن

وفا تو اس کی مرے ساتھ ہی رہی برسوں
وفا کے رنگ پہ کچھ برہمی رہی لیکن

یہ اور بات ستارے نہ مل سکے اپنے
ہماری سوچ ہر اک باہمی رہی لیکن

اُداس رُت میں تو آنکھیں بھری رہیں میری
خوشی کے وقت بھی ان میں نمی رہی لیکن

ہمارے رخ پہ خوشی کی جھلک رہی ہر پل
ہمارے دل کی فضا ماتمی رہی لیکن

ہمارے شعر میں گرچہ بیان تھے ذاتی
ہمارے شعر کی دھوم عالمی رہی لیکن

یہ لاکھ بار بھی سعدی اگر مکمل ہو
بشر میں کوئی نہ کوئی کمی رہی لیکن

شناور اسحاق

غنائے رنگ و کلام قلم کا چکّر ہے
ہمارے ساتھ وجود و عدم کا چکّر ہے

سرِ خرابۂ کون و مکاں، پسِ مَن و تو
یہ جو بھی شور ہے مٹّی میں نم کا چکّر ہے

یہ ربط ہائے جلی یہ حجابِ بغضِ خفی
خدا گواہ یہ سارا بھرم کا چکّر ہے

یہ دائرے، یہ لکیریں، یہ احمریں جدوَل
دھرم نہیں ہے یہ تیرے قدم کا چکّر ہے

کمان داروں میں کوئی زمیں پرست نہیں
مَیں جانتا ہوں یہ سارا علم کا چکّر ہے

☆☆☆

درونِ خواب زمان و مکاں سفر میں ہیں
مرے بغیر مرے کارواں سفر میں ہیں

مرے دماغ سے باہر نکلتے جاتے ہیں
زمیں وہیں ہے مگر آسماں سفر میں ہیں

بدن تو ایک سواری کا جانور ہے یہاں
صراطِ دل ہے، یقین و گماں سفر میں ہیں

یہ میرا نام، یہ مَیں، دھول اِن کے قدموں کی
ورائے نام و نشاں بے نشاں سفر میں ہیں

شناور اُن پہ فریبِ ہمیشگی کا فسوں؟
جنھیں خبر ہے کہ نام و نشاں سفر میں ہیں

فہیم شناس کاظمی

میانِ دشت کوئی کربلا سجا ہی نہ ہو
ہماری شام کا منظر کہیں نیا ہی نہ ہو

زمانہ جس کے ٹھہرنے کی دے رہا ہے خبر
یہ ہو بھی سکتا ہے وہ سلسلہ چلا ہی نہ ہو

مَیں جس کے واسطے خود کو تباہ کرتا ہوں
خود اپنے بارے میں شاید اسے پتا ہی نہ ہو

مَیں جس کو دن میں کئی بار پڑھتا رہتا ہوں
وہ نامہ کیا خبر اس نے ابھی لکھا ہی نہ ہو

ہوائیں جس کے کفِ پا تلاش کرتی ہیں
وہ اپنے گھر سے بھی شاید ابھی چلا ہی نہ ہو

ستارہ جس کی خبر دے رہا ہے مدت سے
ہماری آنکھ پہ وہ راستہ کھلا ہی نہ ہو

مَیں جس کے سحر میں اک زندگی گزار آیا
ابھی وہ خواب کسی رنگ میں ڈھلا ہی نہ ہو

مرے وجود کو جس نے بھگو دیا ہے شناس
ابھی وہ اَبر فضا میں کہیں اُٹھا ہی نہ ہو

ناصر بشیر

اُس نے احسان کیا، شہر کے دروازے تک
وہ مرے ساتھ چلا، شہر کے دروازے تک

اتنے محصول دیے مَیں نے بحقِ سرکار
کچھ مرے پاس نہ تھا، شہر کے دروازے تک

اس سے آگے کا سفر میں نے اکیلے ہی کیا
جمگھٹا ساتھ رہا، شہر کے دروازے تک

فاختہ اُڑتی نظر آئی، فصیلوں سے پرے
تھی بغاوت کی ہوا، شہر کے دروازے تک

ایک دن شہر کی گلیوں میں بھی آ جائے گا
اگر آیا ہے خدا، شہر کے دروازے تک

جب مجھے شہر بدر میرے زمانے نے کیا
کیا کہوں کیسے گیا شہر کے دروازے تک

بدن میں درد کا پھیلاؤ لے کے آیا ہوں
تمہارے شہر سے اک گھاؤ لے کے آیا ہوں

وہ اضطراب کہیں کھو گیا ہے رستے میں
دیارِ عمر سے ٹھہراؤ لے کے آیا ہوں

یہ جو ستارے سے آنکھوں میں جھلملاتے ہیں
نہیں بتاؤں گا کس بھاؤ لے کے آیا ہوں

اگر ڈبونے پہ آمادہ ہے کنارا بھی
تو کیوں کنارے پہ مَیں ناؤ لے کے آیا ہوں

ہزار ظلم سہے، پھر بھی مہربان ہوں مَیں
خدا سے مٹی کا برتاؤ لے کے آیا ہوں

شگفتہ الطاف

خوشبو سے کھیلنے کا ارادہ کیا تو ہے
پھر اس پہ اعتبار زیادہ کیا تو ہے

اس پر ہی جل گئے ہیں گلِ تر تو کیا کریں
تزئینِ حسنِ دوست کو سادہ کیا تو ہے

دوہرا سکے گی پھر سے گئی شام کا جمال
اک کہکشاں نظر نے اعادہ کیا تو ہے

ڈرتی ہوں اور میرے سیاست پسند نے
بازو مری طرف بھی کشادہ کیا تو ہے

قائم رکھیں گے ہم بھی اگر یاد رہ گیا
پھر اس کو بھول جانے کا وعدہ کیا تو ہے

اعجاز توکّل

دن میں سورج کی طرح، شب کو ستارے جیسا
اشک نکلا ہے ترے غم میں شرارے جیسا

فاصلے صورتِ اشیاء ہی بدل دیتے ہیں
درد سے دریا لگا مجھ کو کنارے جیسا

یونہی احساس پہ تم چھائے رہے تو اک دن
عین ممکن ہے مَیں ہو جاؤں تمہارے جیسا

خوش نہیں ہونا محبت میں پذیرائی پر
فائدہ عشق میں ہوتا ہے خسارے جیسا

قریۂ عشق میں ہر شخص ملا مجھ کو عجیب
کوئی نظروں کی طرح، کوئی نظارے جیسا

یہ ہمیں ہیں جو تجھے حد سے فزوں چاہتے ہیں
دوسرا ہے تو کوئی لاؤ ہمارے جیسا

☆☆☆

خواب میں سُوئے رہ گزر گیا مَیں
نہیں معلوم پھر کدھر گیا مَیں

اک حویلی کے پاس جانے سے
سب نے روکا مجھے مگر گیا مَیں

کوئی اچھا لگے گا سوئے صلیب
رقص کرتا ہوا اگر گیا مَیں

دی کسی اور کو صدا اُس نے
انتقاماً خوشی سے بھر گیا مَیں

کون خود کو خراب کرتا ہے
اُس کی خواہش تھی سو بکھر گیا مَیں

چند لمحے ہوا سے باتیں کیں
اور پھر بام سے اُتر گیا مَیں

ہجر کو وصل کی طرح جانا
بے وفاؤں سے ہاتھ کر گیا مَیں

اب یہاں راستے جدا ہوں گے
تھامنا مجھ کو ہمسفر گیا مَیں

شبہ طراز

لفظوں سے چھلنی ہوتے ہیں دل، جذبے اور ہم
چوڑی سے بھی لگ جاتے ہیں اکا دکا زخم

میں اور شام کا تنہا تارہ، لمحے گنتے جائیں
جوں جوں یادیں آتی جائیں سجتی جائے بزم

میٹھے بول محبت والے، بند دروازے کھولیں
کیسے کیسے پتھر دل بھی ہو جاتے ہیں نرم

قدرت نے تو رنگ دیے تھے، ہم نے دھوکے بانٹے
بچوں کے ہاتھوں میں تتلی اور کھلونا بم

قصبے کے ملبے سے نکلے برتن ٹوٹے پھوٹے
میری ذات کے ملبے میں کچھ تصویریں اور غم

مرتضیٰ اشعر

مہیب رات کی تاریکیوں سے ڈر جاتا
نہ چاند ہاتھ پکڑتا تو میں کدھر جاتا

مجھے تو ساتھ لیے پھرتی ہے سڑک شب کی
کہ میرا گھر ہی نہیں ہے جو میں بھی گھر جاتا

بچا لیے تھے توقف نے آندھیوں سے پیڑ
کسی سے بور، کسی کا لگا ثمر جاتا

ترا یقین مجھے جو چراغ کر دیتا
میں تیری رات میں دن کی طرح بکھر جاتا

کسی نے باندھ دیے تھے مرے قدم ایسے
اُسی کے پاس ملا خود کو میں جدھر جاتا

وہ عکس ہاتھ جھٹکتا نہ آنکھ سے اشعر
ذرا سی دیر یہ دریا اگر اُتر جاتا

مظہر نیازی

ہجر کے سائے، اندھیری رات اور میرا قلم
میں، مرے ہمراہ اُس کی ذات اور میرا قلم

بعد مُدت کے ملے تو دیر تک روتے رہے
میں، مری آوارگی، حالات اور میرا قلم

ڈھونڈتے پھرتے ہیں اپنی گم شدہ پہچان کو
چاند، شب کی گود، احساسات اور میرا قلم

تبصرہ کرتے رہے ہیں رات بھر انسان پر
موت، آندھی، سر پھرے صدمات اور میرا قلم

آندھیوں کے خوف سے سہمے ہوئے پھرتے ہیں سب
پھول، خوشبو، پیڑ کے ثمرات اور میرا قلم

پانیوں کے شہر کا منظر عجب تھا خواب میں
تیرتے پھرتے تھے خالی ہات اور میرا قلم

بانٹتے پھرتے ہیں سارے شہر میں تنہائیاں
شہر کی پاگل ہوا، کھنڈرات اور میرا قلم

عصر حاضر کی مسلسل آزمائش اور میں
آنے والے وقت کے خدشات اور میرا قلم

کیا کہوں مظہر نیازی کون ہو گا سرخرو
برسرِپیکار ہیں ظلمات اور میرا قلم

کاشف مجید

کیوں تری خاک سے ٹھنی ہوئی ہے
یہی مٹی تو آدمی ہوئی ہے

مَیں اکیلا ہوں رتجگوں کے بیچ
خلق کی خواب سے بنی ہوئی ہے

اِس محبت سے ہاتھ اُٹھا لے تو
یہ محبت کسی نے رکی ہوئی ہے

آگ سے عشق کر رہا ہوں مَیں
آگ بھی وہ کہ جو بجھی ہوئی ہے

سُرمئی رنگ کے سبب مجھ سے
سُرخ اور سبز کی نفی ہوئی ہے

☆☆☆

بن سکتا تھا لیکن نہیں سیلاب بنایا
بس اشک لیے اور ترا خواب بنایا

آغاز تری ذات سے ہوگا مرے معبود
مَیں جب بھی کبھی حلقۂ احباب بنایا

یہ آگ کہیں اور جلی ہے نہ جلے گی
خالق نے مری آگ کو نایاب بنایا

جو بن نہیں سکتا تھا بنایا اُسے مَیں نے
یونہی سا نہیں ہمسرِ مہتاب بنایا

اب اشک ٹھہرتے نہیں آنکھوں میں کوئی دَم
بے تابیٔ دل نے انھیں بے تاب بنایا

احمد فرید

مرا بس اتنا ہی رشتہ ہے کائنات کے ساتھ
اُداس چاند ہو جس طرح سرد رات کے ساتھ

تری طرف جو نہ پلٹوں تو پھر کدھر جاؤں؟
تعلقات کشیدہ ہیں شش جہات کے ساتھ

مَیں ہنستا جاتا ہوں اور زخم کھاتا جاتا ہوں
اُترتے جاتے ہیں سب قرض میرے ساتھ کے ساتھ

غمِ جہاں کو میں یوں بھی برا نہیں کہتا
پلے بڑھے ہیں میرے لفظ حادثات کے ساتھ

جو فن پہ ہے مجھے اصرار، وہ تو ہے لیکن
گلہ نہیں کوئی دنیائے کم صفات کے ساتھ

رفاقتوں میں کوئی ایک رنج ہو تو کہوں
ہزار طرح کے دُکھ ہیں تعلقات کے ساتھ

یہ کم نگاہی مری تجھ تلک نہیں محدود
یہی سلوک ہے میرا خود اپنی ذات کے ساتھ

ہم اپنے مدِمقابل ہیں اور جانتے ہیں
ہماری جیت ہے مشروط اپنی مات کے ساتھ

اگرچہ بجھ گئے سارے چراغ، پھر بھی فرید
ہَوا کو آ تو گیا چلنا احتیاط کے ساتھ

☆☆☆

دست کش ہو کہ غمِ گردشِ افلاک سے ہم
کبھی ڈوبے تو نہ اُبھریں گے پھر اس خاک سے ہم

خود کو جی بھر کے ابھی دیکھ تو لینے دے ہمیں
جانے کس شکل میں اُتریں گے ترے چاک سے ہم

ڈولنے لگتا ہے صحرا بھی سمندر کی طرح
جب اسے دیکھتے ہیں دیدۂ نمناک سے ہم

جس نے یہ دن ہمیں پہنائے، وہی جانتا ہے
کس قدر تنگ ہیں اسی تنگیٔ پوشاک سے ہم

کہکشاں تھک کے کہیں ٹھہرے تو یہ بھید کھلے
کس جگہ بچھڑے تھے کیوں بچھڑے تھے افلاک سے ہم

تب ملا پانچویں درویش کے تکیے کا سراغ
جب نکل آئے فصیلِ زر و املاک سے ہم

حسن کو عشق سے، آئینے کو حیرت سے فروغ
اور نمو یابِ سخن ہیں دلِ غمناک سے ہم

آتشِ عشق! ترے سرمئی شعلوں کے حضور — باندھ کر لائے گئے ہیں خس و خاشاک سے ہم
کوزہ و جام بنانا تو کوئی بات نہیں — دیوتا تک بھی بنا لیتے ہیں اس خاک سے ہم
جس نے رُخ پھیر دیا تھا کبھی دنیا کا فرید — کچھ بھی ہوں، ہیں اسی قومِ شہِ لولاکؐ سے ہم

سیّد نوید حیدر ہاشمی

مدار چھوڑا تو سینے پہ بار کچھ بھی نہ تھا — مگر بدن پہ مرا اختیار کچھ بھی نہ تھا
گیا تو تھا تری آواز کے تعاقب میں — مگر جو دیکھا تو دریا کے پار کچھ بھی نہ تھا
بس ایک رات میں نقشہ بدل گیا گھر کا — مَیں جب اُٹھا تو سرِ ریگزار کچھ بھی نہ تھا
نہ جانے کس کی نظر کھا گئی محبت کو — کہ ہم بھی سوچ رہے ہیں، کہ پیار کچھ بھی نہ تھا
مری رگوں میں لہو کی دھمال تھی اور بس — سوائے اس کے پسِ انتظار کچھ بھی نہ تھا
تماشا گاہ میں تلوار کے سوا، اے دوست — یقین جان مرے آر پار کچھ بھی نہ تھا

☆☆☆

مری ہتھیلی پہ رہ کر بہت جلا مرے ساتھ — تمام رات بھٹکتا رہا دیا مرے ساتھ
کہاں ہے عشق مرے دونوں ہاتھ خالی ہیں — زمانے والو کوئی ہاتھ کر گیا مرے ساتھ
اُتار مجھ میں وہی دشت اور وہی خیمے — بحال کر دے تعلق تُو اب مرا، مرے ساتھ
کٹی زباں یہ کٹے ہاتھ عینی شاہد ہیں — مری دعاؤں کو مروا دیا گیا مرے ساتھ
میں مر چکا ہوں تمہیں موت کیوں نہیں آئی — اس آدھے عشق میں تم بھی تھے مبتلا مرے ساتھ
تری تلاش میں اب خاک اُڑاتا پھرتا ہوں — بھٹکتی پھرتی ہے گلیوں میں اب ہَوا، مرے ساتھ
تمہارے خواب کی اس گھر سے کیوں رہائی ہوئی — یہ قیدی دشت میں بے موت ہی مرا، مرے ساتھ

کنور امتیاز احمد

اُس حسن کا خیال مرے آس پاس تھا — مَیں کتنا خوش تھا اُن دِنوں جب مَیں اُداس تھا
مَیں جانتا تھا تم ہو مرے ساتھ چار دِن — تم جس کو اہم کہتے تھے میرا قیاس تھا
اس بات کی خبر ہے مرے بعد بھی مجھے — جینا ترے بغیر مجھے کتنا راس تھا
چلتا نہیں تھا زور مرا اپنے آپ پر — دراصل اُن دِنوں میں بہت بے حواس تھا
خوابوں میں اُس کے ساتھ گزرتی تھی زندگی — خوابوں میں ہی سہی! وہ کہیں میرے پاس تھا
میں دیکھتا تھا رُوح پہ اُس کی رفو کا کام — جو شخص دیکھنے میں بہت خوش لباس تھا
یوں آسماں زمین پہ آیا نہیں کبھی! — یوں عام ہونا صرف مرے ساتھ خاص تھا

کاشف حسین غائر

خواب تعبیر میں ڈھلا ہی نہیں
وہ دریچہ ابھی کھلا ہی نہیں

خاک پر رہ گئے ہیں نقشِ قدم
اور مسافر کا کچھ پتہ ہی نہیں

نیند ایسی کہ آنکھ کھل جائے
خواب ایسا کہ ٹوٹتا ہی نہیں

اس لیے راستے کو تکتا ہوں
اب کوئی اور راستہ ہی نہیں

یا ہوا تھک چکی ہے غائرؔ
یا کسی گھر میں اب دِیا ہی نہیں

دُرِّ شہوار توصیف

بہت انجان ہوتے جا رہے ہو
مری پہچان ہوتے جا رہے ہو

اب آئے ہو خیال و خواب بن کر
تو کیا مہمان ہوتے جا رہے ہو؟

تمہیں کچھ کچھ سمجھنے اب لگی ہوں
ذرا آسان ہوتے جا رہے!

اب ایسا شعر میں کیا کہہ دیا ہے
جو یوں حیران ہوتے جا رہے ہو؟

تمہارے نام سے سب جانتے ہیں
ہمارا مان ہوتے جا رہے ہو

بہت خوش ہو اگر مجھ سے بچھڑ کر
تو کیوں ویران ہوئے جا رہے ہو

جفا کیا ہے یہ بالکل بھول بیٹھے
وفا کی شان ہوتے جا رہے ہو

ندیم ناجد

سرِ چاک عشق کو یوں نبھانا پڑا مجھے
کفِ کوزہ گر ہی میں ٹوٹ جانا پڑا مجھے

کسی طور سے ترے ہاتھ آئے' پر آئے تو
سو یہ دل درونِ دکاں سجانا پڑا مجھے

دمِ دوپہر جو سیاہ زلف بکھر گئی
دمِ دوپہر بھی دِیا جلانا پڑا مجھے

یہ سنا تھا عشق بلا کا صحرانورد ہے
تبھی دشت مٹھی میں بھر کے لانا پڑا مجھے

جہاں سر کو طشت میں پیش کرنے کی رسم تھی
وہاں لفظ طشت میں رکھ کے لانا پڑا مجھے

میں مجاورِ درِ علم ہوں' سو اسی لیے
یہ چراغِ حرف سدا جلانا پڑا مجھے

ہے اسیرِ تیرہ شبی میں گم یہ زمینِ چشم
سو چراغ زیرِ زمیں جلانا پڑا مجھے

بہ طفیلِ آلِ نبیؐ ہے پیاس عزیز' سو
نہیں پانی آنکھ میں بھر کے لانا پڑا مجھے

علی حسین جاوید

اب کوئی بات سجھائی نہیں دیتی مجھ کو / کوئی صورت ہی دکھائی نہیں دیتی مجھ کو

سچ تو یہ ہے تری تصویر بھی جانِ جاناں! / اب ترے غم سے رہائی نہیں دیتی مجھ کو

میری دن رات کی محنت کا' مشقت کا صلہ / کیوں مری آبلہ پائی نہیں دیتی مجھ کو

اپنی ہی ذات میں محبوس ہوا ہوں ایسے / کوئی آواز سنائی نہیں دیتی مجھ کو

تیری ہی ذات پہ ہے مجھ کو بھروسہ' ورنہ / تیری دُنیا تو بھلائی نہیں دیتی مجھ کو

یادِ ماضی کی رفاقت بھی عجب ہے جاوید / کسی لمحے بھی جدائی نہیں دیتی مجھ کو

شاہین فصیح ربانی

خالی جیب سے کیا نکلے گا' خالی ہاتھ / اپنی قسمت کیا بدلے گا' خالی ہاتھ

اس کی حالت دیکھ کے ہنستے ہیں سب لوگ / کیا کسی خواہش پر مچلے گا' خالی ہاتھ

اپنی بقا کا پھر کر پائے گا سامان! / دن بھر دھوپ میں جب پگھلے گا' خالی ہاتھ!

غمخواری کو ہوں گے اس کے اپنے اشک / غم کی آگ میں روز جلے گا خالی ہاتھ

تب تک کانپتے رہنا ہے اس کا مقدور / بھر گیا جب تو پھر سنبھلے گا' خالی ہاتھ

علم و ہنر کی بھٹی میں تپنے کے بعد / دیکھنا اک دن زر اگلے گا خالی ہاتھ

اس کے لیے تو یہ بھی غنیمت ہوں گے فصیح / ٹوٹے کھلونوں سے بہلے گا خالی ہاتھ

شبّیر نازش

خودداریوں کے ہاتھ میں کاسہ نہیں دیا / ہم مر گئے جنون کو صحرا نہیں دیا

اپنے ہی دل کو پیار سے روکا ضرور ہے / لیکن کسی بھی شخص کو دھوکا نہیں دیا

کل جس کی پرورش پہ جوانی نثار کی / مجھ کو اُسی درخت نے سایا نہیں دیا

یہ انتہا ہے ظلم کی وہ بادشہ بنا / جس نے کبھی فقیر کو سکّہ نہیں دیا

کچھ اور مانگتا تو بتا کیسے مانگتا / تو نے تو مجھ کو ہجر بھی پورا نہیں دیا

مرتے ہوئے کو لوگ کھڑے دیکھتے رہے / اک اجنبی کو بڑھ کے سہارا نہیں دیا

آنسو فصیلِ ضبط سے سر پھوڑتے رہے / لیکن اُنھیں فرار کا رستہ نہیں دیا

نثار ساجد

جیسے گھر کر کوئی طوفان میں رہ جاتا ہے
اک عجب خوف مرے دھیان میں رہ جاتا ہے

کوئی جلدی میں بھلا دیتا ہے ساماں اپنا
اور اک خط اُسی سامان میں رہ جاتا ہے

کیا عجب ہے کہ گھنا پیڑ ہے ہمسائے کا
اور سایہ مرے دالان میں رہ جاتا ہے

ٹوٹ جاتا ہے کوئی عہد کسی موڑ پہ ' اور
دل تڑپتا ہوا پیمان میں رہ جاتا ہے

وقت کی سانس نہیں رُکتی کسی حادثے پر
اور اِک حادثہ امکان میں رہ جاتا ہے

جب بھی سودا ہو کہیں جنسِ وفا کا ساجد
دِل ہمیشہ مرا نقصان میں رہ جاتا ہے

نبیل احمد نبیل

دشمنی میں نئے انداز کے پہلو نکلے
جن کو سمجھا تھا عدو ' وہ مرے بازو نکلے

چاند تارے تو خدا جانے کہاں ڈوب گئے
روشنی بانٹتے کچھ رات میں جگنو نکلے

پابہ زنجیر حسینوں کی خوشی ' کیا کہنا
راحتِ جاں ترے بکھرے ہوئے گیسو نکلے

کل جو بے بھاؤ بکے جھوٹ کے بازاروں میں
آج وہ لوگ مرے دل میں ترازو نکلے

ہر طرف دُھول سی اُڑتی نظر آتی ہے مجھے
سینۂ دشت میں ارمانوں کے آہُو نکلے

وہ تھا اک پھول سو اُس پھول کو چھو لینے سے
یہ ضروری تھا مرے جسم سے خوشبو نکلے

پھر بچھڑنے کی رُتیں لوٹ کے آئی ہیں نبیلؔ
پھر مری آنکھ سے بے ساختہ آنسو نکلے

محمد عدنان خالد

ایسے حالات کا ادراک نہیں تھا پہلے
یوں گریبان مرا چاک نہیں تھا پہلے

کس نے بے آب ہواؤں کو کیا ہے نم ناک
موسمِ زیست تو نمناک نہیں تھا پہلے

جانے اب کیوں ہے مرے غم میں برابر کا شریک
خوں فشاں دیدۂ افلاک نہیں تھا پہلے

یہ ترے بعد ہی احساس ہوا ہے مجھ کو
جینا دُشوار تھا ' غمناک نہیں تھا پہلے

روک کر پوچھتی ہے آبلہ پائی مجھ سے
سفر اتنا تو خطرناک نہیں تھا پہلے

کس نے عدناں بدل ڈالا مزاجِ دوراں
وقت اتنا کبھی سفاک نہیں تھا پہلے

اکرم عتیق

اپنے اپنے نقاب کے اندر
سب چھپے ہے حجاب کے اندر

چوم لیتا ہوں مَیں کتاب اس کی
میں ہوں اس کی کتاب کے اندر

خواب اُترا ہے کوئی مجھ پہ کہ مَیں
آپ اُترا ہوں خواب کے اندر

ہے کسی میں شراب کا دریا
کوئی خود ہے شراب کے اندر

اس کے اندر شباب ہے یا پھر
وہ ہے اپنے شباب کے اندر

خامشی میں خطاب ہے کوئی
خامشی ہے خطاب کے اندر

وہ تو اِک خواب ہے حقیقت میں
جو حقیقت ہے خواب کے اندر

کیوں پریشاں مرے حساب پہ ہو
مَیں ہوں اپنے حساب کے اندر

ختم قصہ نہیں عتیق ابھی
ہے کوئی باب، باب کے اندر

عاکف غنی

زمیں سخت ہے آسماں سنگدل ہے
حقیقت میں سارا جہاں سنگدل ہے

رہِ عشق میں پھونک کر پاؤں رکھنا
کہ اس میں زمین و زماں سنگدل ہے

کڑی دھوپ ہے تو کبھی تیز طوفاں
ہر اِک موڑ پر امتحاں، سنگدل ہے

مرا راز بھی راز رہنے نہ دیوے
کروں کیا مرا رازداں سنگدل ہے

بہت یاد آوے مجھے اس کی جب جب
وہ لمحہ، وہ پل، وہ سماں، سنگدل ہے

کہاں گرد بیٹھے گی ان راستوں کی
کہ عاکف ترا کارواں سنگدل ہے

مسعود چودھری

نفرتیں جب آ گئیں گھر اور دلوں کے درمیاں
فاصلے بڑھنے لگے پھر بھائیوں کے درمیاں

اور کیا ہم کو ڈرائیں گے حوادث دوستو
عمر گزری ہے ہماری حادثوں کے درمیاں

اور کیا بے چارگی ہو گی مسافر کے لیے
منزلیں کھو جائیں جس کی راستوں کے درمیاں

دل میں خوف و درد آنکھوں میں لیے افسردگی
پھر رہے ہیں اب بھی ہم تو قاتلوں کے درمیاں

اُٹھ گئے اک ایک کر کے سب اُجالوں کے سفیر
ہے مقدر میں، رہیں ہم شب زدوں کے درمیاں

ہم سفر سورج، ستارا، کوئی جگنو بھی نہیں
کس طرح جی پائیں گے ہم ظلمتوں کے درمیاں

کس طرف جاتا ہے رستہ کس طرف ہے روشنی
ہم اُلجھ کر رہ گئے ہیں دائروں کے درمیاں

مانگ بیٹھے تھے امیرِ شہر سے ہم خوں بہا
سر بریدہ کھو گئے پھر مقتلوں کے درمیاں

یوں تو گہرے پانیوں نے راستے ہم کو دیے
ایسے ڈوبے پھر نہ اُبھرے ساحلوں کے درمیاں

عزیزاللہ عابد

دیدار کی طلب میں، بصر کی تلاش میں
گزری ہے میری عمر ہنر کی تلاش میں

دل بھی جمود توڑنا چاہے ہے دفعتاً
تیار ہیں قدم بھی سفر کی تلاش میں

آسیب نے جما لیے ہیں ڈیرے جابجا
انسان ہے سکوں کے نگر کی تلاش میں

بیٹھا ہوں ذہن میں نئی ترکیب سوچ کر
نقصاں کے باوجود ضرر کی تلاش میں

چوری ڈکیتی قتل تو ہے عام سی ہی بات
اخبار پڑھ کے بھی ہوں خبر کی تلاش میں

اوجِ کمال سب کو دکھانے چلا تھا میں
گم ہو گیا جمال و نظر کی تلاش میں

عابدؔ یہاں پہ ہر کوئی ہے محوِ جستجو
دن رات بھی ہیں شمس و قمر کی تلاش میں

رفیع تبسم

کس پر رات قیامت بن کر ٹوٹی سوچ بچار
ساری خبریں دے جاتے ہیں چہروں کے اخبار

کیسے کوئی اپنے خوابوں کو تعبیر دلائے
آج بھی رستے میں حائل ہے غربت کی دیوار

یوں تو منزل سامنے ہے پر ایک قدم نہیں اُٹھتا
خود میں اُلجھائے رکھتی ہے گندم کی مہکار

اپنے ہاتھوں انسانیت کی ناموس گنوا کر
کس مشکل میں آج پھنسا ہے مولا کا شہکار

کیسی ایٹمی قوت یارو کیسی آج ترقی
آج بھی ننھے کاندھوں پر ہے مزدوری کا بار

آج تبسمؔ میرے دِل پر ایک قیامت گزری
دیکھی پیاسی مفلس آنکھ میں سپنوں کی اِک ڈار

شارق عدیل

جب ہَواؤں کی سانسیں اُکھڑ جائیں گی
پتیاں شاخچوں سے بچھڑ جائیں گی

پڑھتا رہ اپنے اسلاف کی زیست کو
یہ کتابیں حفاظت سے سڑ جائیں گی

یوں غزل میں نہ جدّت کی حِدّت کو بو
فن کی پھیلی زمینیں سکڑ جائیں گی

اس طرف آئیں گے جب بھی اہلِ یقیں
خود دراڑیں چٹانوں میں پڑ جائیں گی

خشک پتے زبانوں پہ قابو رکھیں
یہ سبک رو ہَوائیں بگڑ جائیں گی

یوں نہ جدّت کی شارقؔ اُڑانیں بھرو
قافیوں سے ردیفیں بچھڑ جائیں گی

ابرار عقیل

تری وفا کا جہاں دل نے اعتراف کیا
خدا گواہ ترا ہر ستم معاف کیا

ہم اہلِ ظرف تھے تیری خطا چھپاتے ہوئے
جو فیصلہ بھی کیا ' اپنے ہی خلاف کیا

زمانہ لاکھ نبردآزما رہا' پھر بھی
ہمیں نے جبر کے موسم سے انحراف کیا

ہماری روح تھی بے چین' اور سکوں کے لیے
تمہاری یاد کے گوشے میں اعتکاف کیا

اٹا ہوا تھا خطاؤں کی گرد سے جو عقیل
وہ چہرا اشکِ ندامت سے ہم نے صاف کیا

ظفر اقبال نادر

پھول اب جو اتنے سارے دے گیا
پھر جدائی کے اشارے دے گیا

آئنے کے روبرو وہ عکس تھا
ایک منظر سو نظارے دے گیا

زندگی دی مجھ غریب شہر کو
خار کے ہاتھوں غبارے دے گیا

اُس کے دُکھ تو ہیں متاعِ زندگی
اپنی جانب سے خسارے دے گیا

ان کو آنسو مت کہو اے دوستو!
چاند چہرہ یہ ستارے دے گیا

نازیہ رحمٰن ناز

پھر آئے نام کیوں اُس کا بھلا میری کہانی میں
کہ بھر دیں تلخیاں جس نے سکونِ زندگانی میں

یکا یک چونک اُٹھا وہ نجانے کس تصور سے
کہ صورت اپنی جب دیکھی مری آنکھوں کے پانی میں

مری ہر ایک خواہش پر رہا ہے سوچ کا پہرہ
خطا جس نے نہ ہونے دی کسی بھی رُت سہانی میں

چھپا رکھی تھی جو اک بات دل میں ایک مدت سے
کہ سب کے سامنے کہہ دی وہی ہم نے روانی میں

ہنسی کے ساتھ اشکوں کے معانی تو یہی ٹھہرے
ستم بھی نازؔ شامل ہے' کسی کی مہربانی میں

کاشف عرفان

اپنی مٹی کی یاد آتی ہے!!
اب بھی ہجرت ہمیں رُلاتی ہے

آئینوں میں تو مسخ چہرے ہیں
روشنی کیا ہمیں دکھاتی ہے

وقت جب ہاتھ سے نکل جائے
زندگی تب سمجھ میں آتی ہے

اک دُعا ہے جو اندھے رستوں میں
روشنی سی بکھیر جاتی ہے

صرف یہ زیست پر نہیں موقوف
موت بھی آئینہ دکھاتی ہے

میری ماں کی زبان کی لوری
میری بیٹی مجھے سناتی ہے

دل کے خالی مکان سے کاشف
ایک آواز اب بھی آتی ہے

اخلاق احمد اعوان

سلسلہ رنجش و آزار تک آ پہنچا ہے
بوالہوس کیفرِ کردار تک آ پہنچا ہے

آج پھر اپنے عزیزوں کی عنایت کے طفیل
کوئی یوسف ہے جو بازار تک آ پہنچا ہے

ہاں مرے بعد بھی صدیوں نے لہو رونا ہے
ہاں مرا فیصلہ انکار تک آ پہنچا ہے

اے خزاں دیکھ رہا ہوں کہ ترا دستِ ہوس
آج پھر دامنِ گلزار تک آ پہنچا ہے

ہے ساعت پہ گراں عدل کی زنجیر کا شور
پھر سوالی کوئی دربار تک آ پہنچا ہے

خوف کیوں ہو مجھے زنداں کے اندھیروں سے، کہ اب
چاند خود روزنِ دیوار تک آ پہنچا ہے

جانے کیا ہو گیا اعجازِ مسیحا اخلاقؔ
موت کا ہاتھ تو بیمار تک آ پہنچا ہے

خان محمد ساجد

موت کا رقص آج جاری ہے
زندگی زندگی پہ بھاری ہے

طاقتوں کا ہے کھیل یہ دُنیا
کب ہماری ہے کب تمہاری ہے

اعترافِ شکست ہے ہر سُو
سوچ صدیوں کی آج ہاری ہے

حرف لب پر تڑپ اُٹھے رو کر
الاماں کیسی بے قراری ہے

کون کہتا ہے مکتبِ دل میں
عشق مضمون اختیاری ہے

تیری باتوں میں زہر ہے ساجدؔ
تو کسی سانپ کی پٹاری ہے

سیّد رضا حسین گیلانی

جو کوئی اس جہاں میں رضاؔ غم اُٹھائے گا
اپنے خلوص و مہر سے پہچانا جائے گا

حق بات کوئی دیکھ زباں سے نکال کر
اپنوں کو اس جہان میں دشمن تو پائے گا

اک بات عام سی تو ذرا کہہ کے دیکھ لے
یہ دور ایک پل میں فسانہ بنائے گا

سورج چڑھے گا جو بھی نیا آسمان پر
رہ میں اسی کی یہ جہاں پلکیں بچھائے گا

اپنی نظر سے آپ گرے گا یقیں کرو
جو بھی نظر سے کوئی کسی کو گرائے گا

اپنوں سے اب تو غیر ہی بڑھ کر ہیں دوستو
اپنا جہاں ملے گا وہیں ظلم ڈھائے گا

ہر سو سلام ہو گا اسی نام کو رضاؔ
جو اس جہاں میں اپنی خودی کو بچائے گا

جاوید انجم لائل پوری

ہمیں یادوں نے بہلایا نہیں ہے
کبھی آئے ہیں، وہ آیا نہیں ہے

کوئی اُس کے سوا جچتا نہیں ہے
و لیکن وہ "قلوپطرہ" نہیں ہے

محبت مضطرب بہرِ زیارت
مگر کچھ حسن کو پروا نہیں ہے

کوئی عزت نہیں اُس کی جہاں میں
کہ جس کے ہاتھ میں پیسہ نہیں ہے

یہ ممکن ہے کہ ہو تجھ سے وہ ارفع
قد و قامت میں جو تجھ سا نہیں ہے

محبت مال و زر سے کیا خریدیں
محبت ہے کوئی سودا نہیں ہے

تمہارے بعد کیا چاہیں کسی کو
ستم سہنے کا اب یارا نہیں ہے

کبھی، کچھ کھو کے پا لیتے ہیں انجم
ہمیں نے کھو کے کچھ پایا نہیں ہے

شہباز رسول فائق

ترے رنگین ہونٹوں کے پیالے زہر لگتے ہیں
مجھے یہ خوبصورت سے اُجالے زہر لگتے ہیں

ہوں میں تو پیار کا پیاسا ذرا تم پیار سے بولو
تمہاری بات میں زر کے حوالے زہر لگتے ہیں

میں جب یہ سوچتا ہوں کتنے بچے بھوکے سوئیں گے
تو اپنے پیٹ میں اُترے نوالے زہر لگتے ہیں

ہمارا چہرہ پڑھ کر بھی نہ جانے حال جب کوئی
تو ہونٹوں پر لگے یہ چپ کے تالے زہر لگتے ہیں

کوئی بھولے سے بھی کرتا نہیں اب پیار کی باتیں
مجھے سب لوگ اپنے منہ میں ڈالے زہر لگتے ہیں

حکیم خان حکیم

ملا نہ شہرِ تمنا میں باوفا کوئی!
کرے تو کیسے محبت کا حق ادا کوئی!

تمام شہر ہے ڈوبا ہوا اندھیرے میں!
کسی بھی در پہ سلامت نہیں دیا کوئی

مری وفا کا چمن ہو ہرا تو کیسے ہو!
زمینِ دل پہ برستی نہیں گھٹا کوئی

گیا وہ خانۂ دل کو اُجاڑ کر ایسے
مکانِ دل میں ہمارے نہ پھر بسا کوئی

ہر ایک شخص ہے دل میں لیے ہوئے نفرت
رکھے کسی سے توقع وفا کی کیا کوئی

ہزار کوششیں کی ہیں حکیم لوگوں نے
بدل سکا نہ مگر بخت کا لکھا کوئی

محمد انور انیق

مجھ کو جینے کی تو ایسی نہ سزا دی جائے
جیسے دیوار تہِ خاک بنا دی جائے

میرا سر ہوتا تو دبتا نہ دبانے سے مگر
بات دب جاتی ہے گر بات دبا دی جائے

تھا یہی ایک سرِ دار تقاضا اپنا
میرے قاتل کی مجھے عمر بتا دی جائے

پیشِ مسجود مری ہستی کا اتنا ہے وجود
بہتے دریا میں کہیں بوند گرا دی جائے

دل میں آتا ہے کہ کھل جائیں سرِ راہ کہیں
جس کو چاہا ہے اُسے آج صدا دی جائے

شام ہوتے ہی انیق اُس کا خیال آتا مجھے
جیسے قندیل اندھیرے میں جلا دی جائے

عمران حیدر تھہیم

خامشی ' چیختے رہنے کی سزا
چیخنا ' سوچتے رہنے کی سزا

وسعتِ دشتِ تحیر کا فسوں
چشمِ دل کھولتے رہنے کی سزا

دھول اُڑتی ہے مری نیندوں میں
عکس کو پوجتے رہنے کی سزا

سر پہ صدیوں کی مسافت کا غبار
منزلیں بھولتے رہنے کی سزا

تیرگی پہنے ہوئے چاند کا تن
روشنی بانٹتے رہنے کی سزا

شعر ہیں سوچتے رہنے کا ثمر
نیند ہے جاگتے رہنے کی سزا

جرمِ آدم پہ ملی ہے عمران
درد و غم بانٹتے رہنے کی سزا

توقیر تقی

سر پہ لٹکی ہوئی تلوار کے گرنے تک ہے
زندگی وقت ہے اور وقت گزرنے تک ہے

ریت بن کر مری مٹھی سے سرکتی خوشیاں
پاؤں نیچے یہ زمیں بھی تو سرکنے تک ہے

لوگ مصروف ہیں تنصیب میں خیموں کی مگر
راہ جذبے پہ پڑی گرد اُترنے تک ہے

شہر کھنڈرات کی بنیاد ہُوا کرتے ہیں
دل کی بستی کا بسے رہنا اُجڑنے تک ہے

خاک کے ٹوٹے مقابر میں بھٹکنا ہے اسے
یہ کبوتر جو ترے ہاتھ میں اُڑنے تک ہے

خواہشیں خضر کے پہلو سے نہیں نکلیں تقی
یہ جھمیلہ تو بدن خاک میں ملنے تک ہے

خاکہ

سفر ہے شرط

سلطان جمیل نسیم

کسی نثر نگار ہی کا قول ہے کہ شاعر اپنے محبوب کا قصیدہ لکھے تو داد سے نوازا جاتا ہے' اگر افسانہ نگار اپنے محبوب کی خوبیاں بیان کرے تو پڑھنے والے پتا پوچھنے لگتے ہیں....اب میں پتا کیا بتاؤں۔۔۔۔قمر علی عباسی کو دیکھ لیجئے۔

آج میں اور قمر عباسی ایک دوسرے کا آئینہ بنے ہوئے ہیں اور اس آئینہ میں جو چہرے نظر آرہے ہیں وہ اپنے ہونے کے باوجود اپنے نہیں لگتے۔۔۔گزرے ہوئے دن' اُن دنوں کی باتیں اور اپنے چہرے۔۔۔اب کہانی لگتے ہیں۔۔۔چلئے کہانی ہی سہی۔

وقت' دن' ہفتہ' مہینہ' سال معلوم کرنے کے لیے کسی جنتری یا حساب داں کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔۔۔یہ سب تو ہمارے چہرے سے ہماری باتوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری دوستی کی عمر جوانی کی حدوں کو پیچھے چھوڑ کر اتنا آگے بڑھ چکی ہے جیسے ایک کامیاب سفر نامہ نگار کی حیثیت سے قمر عباسی کی شہرت پاک و ہند کی اردو دنیا سے نکل کر امریکا و یورپ سے ہوتی ہوئی بنگلہ دیش اور ماریشس تک پہنچ گئی ہے۔ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہیں کہ بہت کچھ بھول بھی گئے ہیں۔۔۔اتنا یاد ہے کہ جب ہم پہلے پہل ملے تھے تو بہت خوش تھے؛ نہ پیٹھ پر یادوں کا پشتارہ تھا نہ دل و دماغ پر اُس نقصان کا بوجھ کہ جوانی کا ریلا اپنے ساتھ بچپن کی معصومیت کو بہالے گیا ہے۔ہم تو بس جوانی سے گلے مل کے ایسے سرشار ہو گئے تھے کہ اپنے سوا کسی کو گردانتے ہی نہیں تھے' کوئی نظروں میں جچتا ہی نہیں تھا۔۔۔میں تو پھر بھی جوانی کے منہ زور گھوڑے پر سنجیدگی کی زین کسے' باگ بھی ہاتھ میں تھامے اور پا بھی رکاب میں جمائے اُس کا رخ ادب کی طرف موڑنے کی کوشش میں لگا تھا لیکن قمر علی عباسی۔۔۔اُف توبہ۔۔۔اس کی جوانی کے شب و روز بیان کرنے کے لیے' اپنی لڑکھڑاتی نثر کا سہارا لینے کے بجائے رواں دواں شاعری کا ہاتھ تھام کے پورا پس منظر بیان کئے دیتا ہوں۔

کیا کیا کروں شباب کی رنگینیاں بیاں
قدموں میں کہکشاں تھی تو رگ رگ میں بجلیاں
پیری کا احتمال نہ اندیشۂ خزاں
دل کو یہ اعتبار' رہیں گے یونہی جواں
دریائے خوں کی تن سے روانی نہ جائے گی
جیسے تمام عمر جوانی نہ جائے گی

(صبا اکبر آبادی)

جیسے تمام عمر جوانی نہ جائے گی۔۔۔اسی یقین کے بل بوتے پر کوئی وقت ایسا نہیں جاتا تھا جب ہنسی مذاق' ٹھٹول' چھیڑ خوانی نہ ہوتی ہو۔کبھی اس کے ساتھ مذاق کبھی اُس کے ساتھ۔۔۔بقول مشفق خواجہ۔۔۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی کلیات نظیر اکبر آبادی سے برآمد ہوا ہو۔۔۔

اسی چنچل پن کے ساتھ ہائی اسکول بھی پاس کرلیا۔۔۔اسی چلبلے انداز کو لے کر کالج میں بھی داخل ہو گیا۔۔مذاق ہی مذاق میں ایک اسکول میں استادی بھی کر لی۔۔۔ہنستے ہنساتے۔۔۔لکھنے لکھانے کی طرف توجہ کی تو اخبارات کے بچوں کے صفحات پر سیکڑوں مضمون اور کہانیاں لکھ ڈالیں۔۔۔بزم نو آموز مصنفین کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔۔۔اچانک دھیان شاعری کی طرف گیا۔۔۔لیجئے شاعری بھی شروع۔۔۔قمر نے اپنا تخلص ''انجم'' رکھا۔۔۔ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے:

کیا قیامت ہے اے قمر انجم
چاند پورا ہے روشنی کم ہے

چٹکی بھر روشنی (نظمیں) قیمت:100روپے ناشر: ''کاغذی پیرہن'' ۷۲ بیڈن روڈ لاہور پاکستان	**زینو (ناول)** قیمت:180روپے ناشر: دعا پبلی کیشنز ۲۵۷ سی لوئر مال لاہور پاکستان	**برائے فروخت (افسانے)** قیمت:140روپے ناشر: مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد	**قلم کہانیاں (افسانے)** قیمت:400روپے پبلشرز: ''خزینہ علم وادب'' الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور پاکستان	**جیون مایا (ناول)** قیمت:160روپے ناشر: دعا پبلی کیشنز ۶۵ سی لوئر مال لاہور پاکستان
زندگی خودکشی کا مقدمہ نہیں (نظمیں) قیمت:120روپے ناشر: 17-16 پلازہ الکرم رانی مارکیٹ نیچ بھابڑہ راولپنڈی پاکستان	**نامعلوم (غزلیں)** قیمت:140روپے ناشر: دستاویز مطبوعات، 9 تھرڈ فلور وحید عالم بلڈنگ، بنگالی گلی، گنپت روڈ لاہور پاکستان	**بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں (خودنوشت)** قیمت:115روپے ناشر: فنون پبلشرز 35 رائل پارک لاہور پاکستان	**امتزاجی تنقید کی شعریات (تنقید)** قیمت:100روپے ناشر: کاغذی پیرہن 72 بیڈن روڈ لاہور پاکستان	**بن باس (شاعری)** قیمت:400روپے ناشر: الحمد پبلی کیشنز رانا چیمبرز سیکنڈ فلور چوک پرانی انارکلی لیک روڈ لاہور پاکستان
نام میں کیا رکھا ہے (انشائیے) قیمت:100روپے ناشر: کاغذی پیرہن 72 بیڈن روڈ لاہور پاکستان	**کچھ نظمیں ایسی ہوتی ہیں (نظمیں)** قیمت:200روپے ناشر: زین پبلی کیشنز A-8 ندیم کارنر بلاک N نارتھ ناظم آباد کراچی پاکستان	**رعنائی خیال (انشائیے)** قیمت:120روپے ناشر: مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد	**کہانی ریت کی سلوٹ (افسانے)** قیمت:120روپے ناشر: دفتر بصارتیں، جناح کالونی، شوگر ملز روڈ ٹیہ، پاکستان	**آئینہ رُت (غزلیں)** قیمت:125روپے ناشر: بیکن بکس، قذافی مارکیٹ اردو بازار لاہور پاکستان
ترلوک (پنجابی نظماں) مُل:100روپئے چھاپن ہار: مقصود پبلشرز سرور مارکیٹ اردو بازار لاہور پاکستان	**گھٹیا آدمی (افسانے)** قیمت:160روپے ناشر: یوسف زئی پرنٹنگ پریس، مردان پاکستان	**وفا آواز دیتی ہے (شاعری)** قیمت:100روپے ناشر: دستاویز مطبوعات، 9 تھرڈ فلور نساء چیمبرز بنگالی گلی، گنپت روڈ، اردو بازار لاہور پاکستان	**عرفان محل (ناول)** قیمت:150روپے ناشر: ادارہ فروغ ادب، 132 پی استقلال آباد سرگودھا پاکستان	**پینگ (پنجابی شاعری)** قیمت:100روپے ناشر: ''پیاس'' K-221 کانگوی سٹریٹ میانوالی پاکستان
دریچے جاگتے ہیں (غزلیں) قیمت:200روپے ناشر: زرناب پبلی کیشنز، دھرم پورہ، میلسی پاکستان	**بیڑی وچ سمندر (پنجابی غزلاں)** مُل:150روپئے ناشر: زرناب پبلی کیشنز، دھرم پورہ، میلسی پاکستان	**صفتاں رب رسول دیاں (پنجابی حمداں نعتاں)** ملن دا پتہ: کتاب ترنجن، ٹمپل روڈ لاہور پاکستان	**نیند بھی جب جاگتی ہو (شاعری)** قیمت:150روپے ناشر: ''خزینہ علم و ادب'' الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور پاکستان	**تنقیدی جائزے (مضامین)** قیمت:200روپے ناشر: قرطاس، پوسٹ بکس نمبر 25 فیصل آباد پاکستان

پس سرورق کی کتابیں

JOGINDAR PAUL KI KAHANIYAN (Short Stories) Price:100 (India Rupees) Publishers:Takhleqkar Publishers, 104/B-Yawar Manzil, I-Block, Laxminagar, New Delhi-110092, India.	**LATAKHAF** (Criticism) Price: 75 (Indian Rupees) Publishers: 53-A, Zakar Bagh, Okhla Road, New Delhi-110025, India.
UMR-E-LAHASIL KA HASIL(14 Books in one Volume) Price: 200 (Indian Rupees) Publishers:Mayaar Publications, K 302/Taj Enclave, Gita Colony, New Delhi-110031, India.	**GHAZALA** (Ghazals) Price: 150 (Indian Rupees) Publishers: Nirali Duniya Publications, 358-A, Bazar Delhi Gate, Daryganj, New Delhi-110002, India.
YAMBARZAL (Short Stories) Price: 250 (Indian Rupees) Publishers: Nirali Duniya Publications, 358-A, Bazar Delhi Gate, Daryganj, New Delhi-110002, India.	**MOORTI** (Novel) Price: 150 (Indian Rupees) Publishers: Nirali Duniya Publications, 358-A, Bazar Delhi Gate, Daryganj, New Delhi-110002, India.

نشاطِ ہجر (غزلیں) قیمت:200روپے ناشر: خالد بی 54 بلاک این، شمالی ناظم آباد کراچی پاکستان	**خامشی جب کلام کرتی ہے** (غزلیں) قیمت:100روپے ناشر: ''بساطِ ادب'' 13A انارکلی کمپلیکس، فیز 1 سیکٹر ای-II نارتھ کراچی	**جدید اور مابعد جدید تنقید** (نظری تنقید) قیمت:200روپے ناشر: انجمن ترقی اردو D-159 بلاک 7 گلشن اقبال کراچی 75300 پاکستان	**شورِ بادباں (غزلیں)** قیمت:100روپے ملنے کا پتہ: بٹر پبلشرز ہاؤس نمبر 2029 سٹریٹ 32 سیکٹر آئی 10/2 اسلام آباد پاکستان	**جہات (تنقید)** قیمت:200روپے ناشر: ارتقا مطبوعات A/10 ولایت آباد نمبر 2، منگھو پیر روڈ کراچی 75300 پاکستان	**دعا کی طرف لوٹتے ہیں** (غزلیں) قیمت:120روپے ناشر: مثال پبلشنگ 20 حبیب بینک بلڈنگ لاہور پاکستان

اِس پورے چاند کی کم روشنی کون سے مہ جبینوں اور کن خورشید شمائلوں کے آنگن تک پہنچی۔۔۔ یہ ایک ان کہی کہانی ہے۔۔۔لیکن قمر اپنی روشنی اور ستاروں کی جھلملاہٹ لیے یونیورسٹی کی کشادہ فضا میں جا پہنچا۔۔۔ کالج ہی کی زندگی کے دوران مقرر بننے کی ٹھان لی تھی سو کالج اور پھر یونیورسٹی کے لیے بے شمار مقابلوں میں اولیت کا سہرا سجائے۔۔۔

ٹرافیاں اُٹھائے۔۔۔ سینے پہ گولڈ میڈل لگائے اپنے تعلیمی اداروں کے وقار میں اضافے کا سبب بنتا رہا۔۔۔ یہاں یہ بتانا شاید بے محل نہیں ہوگا کہ اُن تقریری مقابلوں کے ذریعے قمر علی عباسی کے مراسم جن حضرات سے قائم ہوئے اُن میں کراچی کے ایک سیاسی ستون اور مسلم لیگ کے رہنما' دوست محمد فیضی۔ ایک نہایت اعلیٰ مقرر اور اپنے وقت کے کامیاب صحافی مرحوم ظہور الحسن بھوپالی۔ محرم کی مجالس میں منبرِ حسینؑ سے کفر و ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والے ذاکر' علی رضا نقوی' حیدرآباد سندھ کا ایک شاعر' کراچی کے اردو کالج کا استاد اور امریکا میں گم ہو جانے والا یونس شرر۔ ایک بیوروکریٹ اور کراچی کا سابق کمشنر شفیق پراچہ اور شہر کراچی میں تھنکرز فورم کا بانی جاوید صدیقی شامل ہیں...اور قمر عباسی اپنے مراسم کو سنبھال کر رکھنا ہی نہیں انھیں نبھانا بھی جانتا ہے۔

یونیورسٹی کی روشن فضا سے نکل کر ریڈیو پاکستان سے وابستگی اختیار کی۔۔۔ یہ شاید 67-1966 کی بات ہے' لیکن اپنے دورِ طالب علمی میں کچھ عرصے کے لیے متروکہ املاک (Claims & Settlement Dept) کے دفتر میں بھی اپنی شگفتہ مزاجی کے پھول کھلائے۔۔۔ ایک کالج میں بھی استاد بن کر شاگردوں کے دل جیتے اور سچی بات یہ ہے کہ عباسی کو دل جیتنے میں مہارت حاصل ہے' اس مہارت نے ہی یہ وصف پیدا کیا ہے کہ جس سے ایک بار ملاقات ہو گئی وہ اس کا ہی ہو گیا۔ یہی خوبیاں تحریر میں بھی ہیں۔ بچوں کے لیے ایک ناول لکھا ''بہادر علی''۔۔۔ یونیسکو کی جانب سے انعام بھی ملا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا' وہ ناول بچوں میں ''ہیری پورٹر'' کی طرح آج بھی مقبول ہے۔ پاکستان ٹیلیوژن کے لیے جب اس ناول کی ڈرامائی تشکیل کی تو یہ سیریل چھ مہینے تک ناظرین کی توجہ کا مرکز بنی رہی جبکہ اچھی سے اچھی سیریل بھی تیرہ قسطوں یعنی تین مہینے سے زیادہ نہیں دکھائی جاتی (اگر انڈیا کے کسی چینل پر آتی تو وہ چھے سال سے زیادہ عرصے تک دکھاتے ہی رہتے) پھر یہی ایک سیریل نہیں بچوں کے لیے اور پانچ چھے سیریل لکھے جو پسند کیے گئے۔ اب اگر بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد ہی کو دیکھا جائے تو وہ بھی چار کم چالیس ہے۔

بچوں کے ادیب کی حیثیت سے جب شہرت میں کمال حاصل ہو چکا تھا' بہت سی کتابوں پر بہت سے انعامات مل چکے تھے۔۔۔

اُس وقت ملاقات ہوئی ''نیلوفر علیم'' سے۔۔۔ جس طرح قمر بچوں کے ادیب کی حیثیت سے صفِ اول میں شمار کیا جاتا تھا اُسی طرح نیلوفر علیم ریڈیو پاکستان کی ایک ایسی آواز کی مالک تھیں جن کے بغیر کوئی ڈرامہ مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا بلکہ ڈراموں کے علاوہ جس پروگرام میں آواز شامل ہوتی سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے۔۔۔ پھر ٹیلی وژن کے ایک ڈرامے ''شہزوری'' میں اپنی آواز اور اپنی فنی صلاحتوں کا جو بھرپور مظاہرہ کیا' اُس نے نیلوفر کو ریڈیو پاکستان کے ساتھ ٹیلیوژن کے لیے بھی باعثِ افتخار بنا دیا۔۔۔ نتیجہ۔۔۔ کچھ قمر عباسی کی کشش اور بہت کچھ نیلوفر علیم کی خوبیاں اور جاذبیت۔۔۔ دونوں ایسے ملے کہ ایک ہو گئے۔

جب کبھی بات نکلتی ہے تو قمر عباسی اپنی شادی کے تعلق سے یہ بات بہت ہنس ہنس کے بتاتا ہے کہ ہر اخبار نے شادی کی خبر کے لیے سرخی جمائی۔۔۔ نیلوفر علیم کی شادی قمر علی عباسی کے ساتھ ہو گئی۔۔۔ صرف ایک اخبار نے یوں لکھا۔۔۔ قمر علی عباسی نے نیلوفر علیم سے شادی کر لی۔

جب قمر اور نیلوفر۔ دو سے ایک۔۔۔ پھر دو سے تین۔۔۔ جب دو اور تین مل کر پانچ ہو گئے' اُس ''عالمِ شباب'' میں قمر عباسی کو ریڈیو پاکستان کی طرف سے انگلستان بھیجا گیا۔۔۔ یہ ستمبر 1981 کی بات ہے۔ لندن کے سرد موسم میں اپنے دوستوں' ساتھیوں اور اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریبات کو تین مہینے تک اپنی باتوں اور تقریروں سے گرماتے رہنے کے بعد۔۔۔ واپسی ہوئی تو لندن میں گزارے ہوئے وقت کو زندانِ قرطاس و قلم کے سپرد کر دیا۔۔۔ یوں وقت کے ساتھ یادیں بھی اسیر ہو گئیں۔

لندن کا سفرنامہ ہفت روزہ ''اخبارِ خواتین'' میں مسلسل تین برس تک شائع ہوتا رہا۔۔۔ پھر۔۔۔ بچوں کے ساتھ خواتین میں بھی مقبولیت دیکھ کر لاہور کے ایک ناشر نے کتابی صورت دینے کے لیے مانگ لیا۔ یہ ناشر قمر عباسی کی لکھی ہوئی بچوں کے لیے بہت سی کتابیں بھی شائع کر چکا تھا۔ یوں پہلا سفرنامہ ''لندن لندن'' 1986 میں عوام کے ہاتھوں میں پہنچا۔ ''لندن لندن'' کا پیش لفظ عباسی نے کسی اور سے لکھوانے کے بجائے خود تحریر

کیا جس کے آخیر میں ایک جملہ اپنے اختصار کے باوجود نہایت لطیف و بلیغ ہے اور اسی لیے مجھے تقریباً حفظ ہے۔

''لندن جانے سے نو سال پہلے شادی اور ایک سال پہلے حج کی سعادت حاصل کی۔۔۔جب لندن پہنچے تو بے تکلف دوستوں نے پوچھا۔۔اب کیا کرنے آئے ہو۔۔۔۔''

اب دو باتیں ہوئیں۔۔ایک یہ کہ مروجہ قسم کے سفرناموں کی بھیڑ میں ایک نئے لب و لہجہ کے ساتھ تحریر کی دلچسپی اور لطیف مزاح کی چاشنی پڑھنے والوں کو میسر آئی۔۔کتابت کی بے شمار غلطیوں کے باوجود یہ سفرنامہ قارئین میں نہایت مقبول ہوا۔۔۔۔اس سے پہلے کہ سفرنامہ نگار یا سفرنامے کے بارے میں کچھ اور کہوں' مجھے کتابت کی غلطیوں کے حوالے سے اپنے ایک مرحوم دوست سید ارتضا عزمی یاد آ گئے۔

'لندن لندن' شائع ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ناشر نے رائلٹی کے ساتھ شاید پچاس کتابیں مصنف کو دی تھیں جو عباسی نے اپنے خاص خاص دوستوں کو بطور تحفہ دیدیں۔۔ارتضا عزمی حیدرآباد سے آئے اور قمر سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔۔ہم دونوں ریڈیو اسٹیشن پہنچے۔۔۔حیدرآباد کے حوالے سے عزمی صاحب سے قمر کی بھی شناسائی تھی۔۔۔میرے اشارے پر قمر عباسی نے دراز میں رکھی ہوئی لندن لندن کی آخری کاپی انھیں پیش کر دی۔

اپنے ایک مضمون میں عزمی صاحب کے بارے میں دو باتوں کا تذکرہ کر چکا ہوں۔۔۔ایک تو یہ کہ وہ ہر موضوع پر ہمہ وقت گفتگو کرنے کے لیے مستعد ہو جاتے تھے۔۔۔اُن کی اس عادت کو کچھ لوگ پسند بھی نہیں کرتے تھے اور اسی لیے ملنے سے گریزاں رہتے' دوسری بات یہ کہ وہ عیال دار آدمی تھے' پڑھنے لکھنے کا شوق تھا لیکن کتاب خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے' اُن کو جو کتاب بھی ہاتھ لگ جاتی اُسے نہایت انہماک سے پڑھتے۔۔۔حاشیئے پر لکھتے بھی جاتے۔۔۔میری بہت سی کتابوں کے ساتھ انھوں نے یہی سلوک کیا تھا جو آج بھی اُن کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔۔۔آدمی محبت والے تھے۔قمر عباسی کو بھی چاہتے تھے' اپنے مجموعہ کلام ''چہرہ نما'' پر عباسی کی رائے فلیپ پر دی تھی۔۔۔''لندن لندن'' لے کر بہت خوش ہوئے۔۔۔مہینہ بھر کے بعد حیدرآباد سے آئے تو ''لندن لندن'' ساتھ تھی۔۔۔انھوں نے حسب عادت کتاب نہایت توجہ سے پڑھی تھی۔۔۔کتابت کی ساری غلطیاں درست کی تھیں اور آخر میں رائے دیتے ہوئے یہ لکھا تھا۔''ہم بھی لندن گئے ہی نہیں اس لیے کچھ جانتے ہی نہیں۔قمر علی عباسی صاحب کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ سچے انسان ہیں اس لیے جھوٹ لکھا ہی نہیں ہوگا''

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن اب وہ مُصر ہوئے کہ انھیں کتاب کے بدلے کتاب چاہیے۔۔۔عباسی کے پاس اب کوئی کتاب باقی نہیں تھی' چنانچہ اپنے دفتر کے ایک آدمی کو اردو بازار بھیجا کہ وہ کتاب خرید کر لائے۔۔۔کسی کتب فروش کے پاس کتاب باقی نہیں رہی تھی۔۔۔یہ معلوم ہونے کے بعد عزمی صاحب نے صبر کر لیا۔۔۔اور قمر علی عباسی کو یہ فائدہ ہوا کہ دوسرے ایڈیشن میں ننانوے فیصد غلطیاں راہ پانے سے رہ گئیں۔

''لندن لندن'' کی مقبولیت نے جہاں مصنف کا حوصلہ بڑھایا وہاں ناشر کو اصرار پر مجبور کیا کہ وہ قمر عباسی سے ایک اور سفرنامے کا مطالبہ کرے۔قمر کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ محکمے سے بیرونی ملک کے سفر کا اجازت نامہ حاصل کرنا تھا' مگر ارادے کی پختگی نے ہمیشہ قمر کا ساتھ دیا ہے۔۔یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔اب سفر کرنے کے لیے جب تمام اسباب موجود ہوں تو پھر بقول شاعر۔

سفر میں کوئی شریک سفر بھی ہوتا ہے

حوصلہ بھی تھا' وسائل بھی اور شریک سفر بھی۔۔چنانچہ زندگی بھر کے ہمسفر کو ساتھ لیا اور اپنی ماتر بھومی کا رُخ کیا یعنی امروہہ کے سفر پہ نکل کھڑے ہوئے۔حضرت نظام الدین اولیاؒ کی دلی میں زیادہ وقت گزارا' ورنہ تاج محل دیکھنے آگرہ بھی گئے۔فتح پور سیکری جا کے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کو بھی سلام پیش کیا۔شملہ اور مسوری کے سرد موسم کو بھی جانچا۔۔۔کلیئر شریف جا کے حضرت صابرؒ کے مزار مبارک کی بھی زیارت کی۔۔۔پاکستان واپس آئے تو ایک کسک سی دل میں لیے ہوئے کہ اب ''دلی دور ہے''۔۔۔اس کے بعد تُو چل میں آیا کے مصداق ہر سال ایک نئے ملک کی سیر اور ایک نئے ملک کا سفرنامہ۔۔۔

قمر علی عباسی نے جتنے سفر کئے ہیں اُتنے سفرنامے نہیں لکھے ہیں مثلاً ہندوستان دو مرتبہ جانا ہوا مگر سفرنامہ صرف ایک یعنی ''دلی دور ہے'' لکھا۔سفرناموں کے علاوہ قمر علی عباسی نے تین کتابیں اور تصنیف کی ہیں۔۔۔''ایک عمر کا قصہ''۔۔۔اور ''33 تا آوٹ''

میں ان دونوں کتابوں کو بھی اُس کا سفر نامہ کہتا ہوں۔ ایک زندگی کے ماہ و سال کا سفر نامہ ہے تو دوسرا ملازمت کے سفر کی روداد۔۔۔ لیکن میں ان دونوں کتابوں میں بڑی تشنگی محسوس کرتا ہوں۔۔۔ عباسی کی زندگی دھوپ چھاؤں کا مرقع ہے اُس کو بے پناہ محبت بھی ملی ہے اور اپنوں کی جانب سے دکھوں کا ڈھیر بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ خوشی کے مواقع ملنے پر آپے سے باہر نہیں ہوتا اور پریشانیوں کو بھی اکیلے جھیلنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے' ان کتابوں میں مجھے یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ ہر بات کے بیان میں اس نے بہت اختصار سے کام لیا ہے' جب وہ ایک مہینے یا دو ماہ کے لیے سفر پہ نکلتا ہے تو ایک سفر نامہ لکھ دیتا ہے۔ زندگی کی کتھا تو آدھی صدی سے زیادہ کی تھی' اسی طرح مدتِ ملازمت بھی تیس سال سے زیادہ تھی' عباسی کو اپنے دکھ اور اپنی خوشیوں میں بھی اپنے قارئین کو اسی طرح شریک کرنا چاہئے تھا جس طرح سفر نامہ لکھتے ہوئے سفر کی تمام تر دلچسپیوں میں پڑھنے والے کو ساتھ ساتھ رکھتا ہے' اس بات کو سب ہی جانتے ہیں کہ زندگی دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے اور زندگی یہ کھیل کم و بیش سب کے ہی ساتھ کھیلتی ہے لیکن جو لوگ قوت اظہار رکھتے ہیں اُن کو وہ تمام مرحلے اپنے پڑھنے والوں سے شیئر کرنے چاہئیں تھے جو ناگفتنی رہ گئے ہوں۔ کتاب لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے تجربات میں دوسروں کو شریک کیا جائے وہ تجربات خوشی کے ہوں یا غم کے' دراصل ہم سب نے بڑے لوگوں کی باتوں سے ہی سیکھا ہے۔۔۔ قمر علی عباسی کی شخصیت میں جو صبر و ضبط کا جذبہ فطرت نے شامل کیا ہے' وہ اپنے قریب رہنے والوں تک ہی کیوں محدود رہے۔۔۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ہر لکھنے والا اپنی خوشی کیلئے لکھتا ہے۔ اگر ''ایک عمر کا قصہ'' میں بہت سی باتیں بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا تو ''تھرٹی تھری ناٹ آؤٹ'' میں دفتری ساتھیوں انکی محبتوں اور سازشوں کے علاوہ اُن تمام لوگوں سے بھی اپنی تفصیلی ملاقات کا احوال لکھا ہوتا جو ریڈیو سے ایک فنکار کی حیثیت سے وابستہ تھے۔ یا اپنے شعبہ کی بڑی اہم شخصیت تھے اور اُن سے ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی تھی۔ بہر حال میرے نزدیک یہ کتابیں ذرا تشنہ سہی لیکن ان میں کشش اور دلچسپی اُتنی ہی ہے جو قمر عباسی کی تحریر کا خاصہ ہے۔ اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف پوری طور سے منہمک رکھتی ہیں۔

جس طرح ریل کے سفر میں مختلف اسٹیشن آتے ہیں جہاں انسانی زندگی کے بہت سے مضحکہ خیز یا عبرت انگیز واقعات اہلِ نظر کو دکھائی دیتے ہیں ایسے ہی واقعات کا سفر نامہ ''دل دریا'' ہے۔ جو بظاہر اخبارات میں شائع ہونے والے کالموں کا ایک انتخابی مجموعہ ہے لیکن یہ کتاب بھی سماجی' معاشی اور کبھی کبھی سیاسی زندگی کا ایسا سفر کراتی ہے جیسے ریل کے سفر میں باہر کے منظر نظر آتے ہیں۔

یہ کوئی لگا بندھا اصول یا کلیہ نہیں ہے لیکن دیکھا یہی گیا ہے کہ چھوٹے شہروں سے بڑے آدمی اُٹھے ہیں۔۔۔ ہندوستان میں ایک شہر ہے امروہہ۔۔۔ روایت یہ ہے کہ وہاں آم اور رُہو مچھلی کثرت سے ہوتی تھی اسی رعایت سے شہر کا نام امروہہ پڑ گیا۔ آم اور مچھلی کی شہرت تو پیچھے رہ گئی' ادب آگے آ گیا۔۔۔ اب یہی دیکھئے۔۔۔ مصحفی جیسا شاعر۔۔۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی جیسا عالم اور محقق۔۔۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی جیسا نقاد۔۔۔ اور ہمارے قمر علی عباسی جیسا اعلےٰ پائے کا سفر نامہ نگار کہ وہ بچوں کے لیے کہانیاں لکھے یا سب کے لیے سفر نامہ۔۔۔ لفظ بے مزہ ہوتے ہیں نہ بے حرمت۔۔۔ یہ سب امروہہ کے ہیں۔۔۔ بات کیوں کہ قمر عباسی کی ہو رہی ہے اس لیے یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوا کہ قمر عباسی کی زندگی میں ایک اور چھوٹے شہر کا حصہ ہے۔۔۔ وہ ہے حیدر آباد سندھ۔۔۔ جہاں وہ قمر امروہوی سے قمر عباسی بنا۔

قصہ یوں ہے کہ امروہہ کے قاضی شہر تھے۔ محمود علی عباسی' انھوں اپنے فرزند یعقوب علی عباسی کی شادی اپنے ایک واقف کار ابرالحق عثمانی کی صاحبزادی سے کردی' جنکا نام کنیز فاطمہ تھا۔۔۔ ان کے یہاں ۱۳ر جون ۱۹۳۸ء میں ایک بیٹا ہوا۔۔۔ یہ پہلا بیٹا نہیں تھا بلکہ چار بہن بھائیوں کے بعد ہوا اور اُس سے چھوٹے بھی پانچ بہن بھائی ہوئے۔۔۔ مگر جس کا' کام بڑا اُس کا نام بڑا۔۔۔ والدین کا نام روشن رکھنے کی سعادت قمر علی عباسی کے حصے میں آئی۔۔۔ ابھی عمر دس سال ہی تھی کہ پاکستان کی طرف ہجرت کی۔۔۔ اور پاکستان میں بھی ایک چھوٹے سے پہاڑی مقام پر پڑاؤ ڈالا یعنی ''کوہ مری''۔۔۔ دو برس کوہ مری میں گزرے پھر رزق ریگزار سندھ کے ایک خوبصورت شہر حیدر آباد میں لے آیا۔ یہاں ۱۹۵۰ء میں قمر عباسی نے جامعہ عربیہ ہائی اسکول سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔۔۔ اور اسی شہر کی خاک اوڑھ کر اس کے والدین ہمیشہ کے لیے سو گئے۔۔۔

جب قمر علی عباسی جامعہ عربیہ سے میٹرک پاس کر کے نکلا تو میری ملاقات ہوئی۔۔۔ اس طویل رفاقت کے دوران میں نے یہی دیکھا کہ خوش مزاج و زندہ دل قمر علی عباسی انسانوں سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے اور اس کا سبب یہی ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے سے بھی محبت کرتا ہے خوف نہیں کھاتا۔۔۔ اور محبت اُسی کو کہا جاتا ہے کہ اپنے محبوب کی رضا میں خود کو ڈھال لیا جائے۔۔۔ انتظامی معاملات میں وہ سخت گیر رہا ہے لیکن کسی کے ساتھ

دشمنی کا جذبہ اُس کے دل میں کبھی نہیں رہا۔ انسان ہے۔ بری باتیں بری لگتی ہیں۔ جتنی جلدی روٹھ جاتا ہے اُتنی جلدی من بھی جاتا ہے' جن احباب کے ساتھ برسوں دانت کاٹے کی دوستی رہی ہے اللہ تعالیٰ نے اُن ہی کے سلسلے میں اس کا امتحان لیا ہے۔

اردو زبان کے ایک مشہور و معروف مزاح نگار تھے شوکت تھانوی ان کا ایک افسانہ ''سودیشی ریل'' اردو ادب میں خاصے کی چیز ہے۔ شوکت تھانوی کے بیٹے کا نام تھا رشید عمر تھانوی۔ وہ لاہور میں عباسی سے ملا اور دونوں میں گاڑھی چھننے لگی' میری کبھی رشید عمر تھانوی سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن قمر سے ذکر اتنا سنا اور اتنی بار سنا کہ وہ مجھے بھی اپنا دوست معلوم ہونے لگا۔ ایک اور اس کا ہم عمر اور ہم شہر تھا' جب یہ قمر امروہوی کے نام سے لکھتا تھا تو وہ کوکب عتیق کے نام سے۔ ۔ دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ریڈیو میں ملازمت کی۔ کوکب عتیق نے عتیق اللہ شیخ کے نام سے ریڈیو اور اسٹیج کے لیے بیشمار کامیاب اور مقبول ڈرامے لکھے' عتیق اللہ شیخ سے بھی قمر علی عباسی کی طرح میرے دیرینہ مراسم تھے' وہ ریڈیو پاکستان کی ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر لاہور اور پنڈی اسلام آباد میں رہا' ایک بار تبادلہ حیدر آباد کا بھی ہوا مگر جب میں کراچی میں تھا لیکن 1999ء میں تقریباً دو مہینے میں نے اسلام آباد میں گزارے اُن تمام دنوں میں ہر روز اُس کے ساتھ اور مشہور شاعر ناصر زیدی کے ساتھ ملاقات رہی۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران ہی قمر علی عباسی کی دوستی ایک نہایت سُریلے گلوکار سے ہوئی جس نے بیحد مقبول گانے ریڈیو' ٹی وی اور فلموں کے لیے بھی گائے۔ مجیب عالم۔ ۔ ۔ مجیب کے ساتھ بھی قمر عباسی کے آفس میں اکثر ملنا رہا۔ ریڈیو ہی کے دو اور ساتھی گل حسن پٹھان اور اسلم بلوچ تھے۔ ۔ ۔ یہ سب کے سب قمر عباسی کے بہت قریب رہے۔ ۔ ۔ اور ایک ایک کر کے آنکھ سے اوجھل ہوتے گئے۔ قمر اپنے دوستوں کی دائمی جدائی کو بھی رضائے دوست سمجھ کر قبول کرتا رہا۔ ۔ ممکن ہے چھپ کے رویا بھی ہو' دراصل یہ تو رونے والوں کے آنسو پونچھنے اور گلے لگا کر غم غلط کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنے والا ساتھی ہے۔

ایک مرتبہ ٹیلیوژن پر سکھوں کے عقیدے کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری دکھائی جا رہی تھی۔ ایک گورا۔ ایک سکھ نوجوان کے ساتھ گردوارہ دیکھنے جاتا ہے' سکھ اُسکو سارے آداب بتاتا ہے کہ یہاں ہاتھ منہ صاف کرو' اب سر پہ رومال باندھ لو' اب گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ اور اب متھا ٹیکو۔ ۔ ۔ تو ساری بات متھا ٹیکنے کی ہے۔ ۔ ۔ زندگی گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی ایسا در چاہیئے جہاں آدمی ہاتھ باندھ کر متھا ٹیک دے۔

یہ نکتہ اپنی تمام تر حقیقت کے ساتھ قمر علی عباسی نے سمجھ لیا ہے۔ ۔ ۔ چنانچہ اپنے ہر دن کا آغاز فجر کی نماز سے کرتا ہے۔ ۔ ۔ اسی حوالے سے مجھے ایک پرانی بات یاد آ گئی۔

ایک مرتبہ دسمبر کی آخری شام کو میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس کے گھر بیٹھا تھا جب اٹھنا چاہا۔ ۔ ۔ روک لیا۔ ۔ ۔ رات کا کھانا کھاتے وقت پروگرام بنا کہ نئے سال کا استقبال دیکھنے کے لیے کراچی کے ساحلی علاقے کلفٹن جایا جائے جہاں بیحد رونق ہوتی ہے۔ ۔ اس درمیان قمر کے اشارے پر ایک ایک کر کے اُس کے بیوی بچے اٹھتے اور پھر آ کر بیٹھ جاتے۔ ۔ ادھر نئے سال کی آمد پر سائرن بجا اُدھر سب ایک ساتھ اٹھے۔ ۔ قمر نے مجھ سے کہا۔ ۔ ۔ میں ہر نئے سال کا استقبال۔ ۔ ۔ دو رکعت شکرانے سے کرتا ہوں' آیئے۔ ۔ ۔

اکثر قمر کی باتیں سنتے ہوئے اُس کے بہت سے اعمال دیکھتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ میں بھی اُس جیسا ہو جاؤں مگر یہ ممکن کیسے ہو۔ ۔ ۔؟ ہر آدمی تو بس ویسا ہی ہوتا ہے جیسی اُس کی سرشت بنا دی جاتی ہے' سب ایک جیسے ہوتے تو پھر جنگل کے جانوروں کا ریوڑ ہر طرف دکھائی دیتا۔ انسان نظر ہی نہیں آتے۔ انسان تو پروردگار کی وہ خاص مخلوق ہے۔ جس کو بنانے والے نے بھی 'احسن التقویم' کے خاص اور حسین لقب سے نوازا ہے۔

اُس وقت مجھے حضرت صبا اکبر آبادی کا یہ ایک شعر یاد آ رہا ہے جو میں عباسی کو بھی کئی مرتبہ سنا چکا ہوں۔ ۔ ۔

اپنے بنانے والے کی تعریف کیا کروں
سر تا قدم ۔ کمال کا اُس کے قصیدہ ہوں

قمر علی عباسی کی اتنی باتیں میرے دل میں بسی ہوئی ہیں کہ ان کے بیان کے لیے ایک دفتر بھی ناکافی ہے بس یوں سمجھ لیجئے کہ قمر عباسی میرے دل میں بسا ہے۔

قمر عباسی کو میرے دل نے دو مرتبہ دعائیں دی ہیں۔ ایک مرتبہ 1991ء کے اکتوبر کی آخری تاریخ کو۔ ۔ ۔

عباسی کی ایک عادت یہ ہے کہ وہ سحر خیز ہے۔ اپنے کالم اور سفرنامے بھی علی الصبح لکھتا ہے۔ جب تک ملازمت پر تھا سب سے پہلے ریڈیو

اسٹیشن پہنچے والوں میں شامل تھا۔دفتر کے لوگوں پر بھی وقت پر آنے کی پابندی عائد کردی تھی۔اور اوقاتِ کار ختم ہونے کے بعد پھر نہیں ٹھہرتا تھا۔۔گھر پہنچا اور گھنٹے دو گھنٹے کی نیند لے لی' شام کو پھر چاق و چوبند۔یعنی دوپہر کی نیند وہ کسی قیمت پر قربان نہیں کرتا تھا۔اپنے افسرانِ اعلا تک کو لینے یا چھوڑنے کے لیے ائرپورٹ تک نہیں جاتا تھا اور اس بات سے تمام ہی لوگ واقف تھے۔

میں نے اکتوبر کی تیسویں تاریخ کی رات کو اسلام آباد سے فون کر کے اطلاع دی کہ میں دوسرے دن دوپہر کو اپنے والد کے جسدِ خاکی کو لے کر کراچی پہنچ رہا ہوں' میرے بھائی تاجدار عادل اور بیٹے جنید بختیار کو بتا دو شاید وہ لوگوں کو اطلاع دینے میں مصروف ہیں اور مجھے اُنکے فون نمبر نہیں مل رہے ہیں۔

اسلام آباد سے فلائٹ کراچی دوپہر ساڑھے تین بجے پہنچی۔قمر علی عباسی ائرپورٹ پر موجود تھا۔اسے دیکھ کر میرے دل کو جو ڈھارس ہوئی' میں اُسے ڈھارس نہیں اپنے دل کی دعا سمجھتا ہوں۔

دوسری مرتبہ پھر میرے دل نے عباسی کے لیے دعا کی۔۵/اپریل ۲۰۰۳ء کی دوپہر کو نیویارک سے بھابی نیلوفر نے ٹورنٹو مجھے ٹیلیفون کیا اور بتایا کہ تین دن پہلے قمر کی اوپن ہارٹ سرجری ہوئی ہے ابھی آئی سی یو میں ہیں'

سلطان بھائی آپ صحت کے لیے دعا کیجئے' یہ سن کر۔۔۔میری جو کیفیت ہوئی وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔مگر قمر علی عباسی کے ساتھ۔۔۔جو خوبصورت الفاظ کے ساتھ اِس طرح کھیلتا ہے کہ پڑھنے والوں کے دل خوش ہوتے ہیں اور الفاظ کی عصمت و حرمت بھی قائم رہتی ہے۔ مجھے اپنی محبت کے اظہار کی کوئی نہ کوئی صورت تو نکالنی ہی پڑے گی۔۔۔اظہار بھی ضروری ہے ورنہ لوگ عبادت کیوں کرتے۔۔۔

عِلّتیں' علالتیں

ہر انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں' مجھ میں بھی بہت سی کمزوریاں ہیں۔کسی زمانے میں غصہ جلد آجاتا تھا لیکن میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں اپنے دوستوں پر بہت جلد اعتبار کر لیتا ہوں' میں خود اپنے دوستوں کے تئیں جتنا مخلص ہوتا ہوں' اُن کے بارے میں بھی ویسا ہی تصور کر لیتا ہوں۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب دوست میرے تصور سے کم' بلکہ بہت کم نکلتا ہے تو بجائے اپنے تصور اور اپنے رویے کو غلط سمجھنے کے اپنے دوست کو غلط سمجھ لیتا ہوں۔پوری زندگی اسی طرح گزری ہے اور ابھی بھی میرے رویے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔عزت' شہرت اور دولت کی تمنا ہر کسی کو ہوتی ہے مجھے بھی ہے۔۔۔لیکن عزتِ نفس کو مجروح کر کے ملنے والی ظاہری عزت ہو' شہرت ہو یا دولت ہو' مجھے کبھی اس کی تمنا نہیں رہی۔۔۔

جسمانی لڑائی میرے بس کا روگ نہیں' شاید اسی لیے ذہنی لڑائی لڑنے کی قوت مجھ میں زیادہ ہے لیکن افسوس کہ اب تک مجھے کسی اچھی علمی لڑائی لڑنے کا موقع نہیں ملا یوں پ کی سطح پر ایسے لوگوں نے' جن کے بے وزن شعری مجموعے میں نے بے نقاب کرائے جن کے افسانوں کی چوریاں شواہد کے ساتھ ظاہر کیں' جن کی شعری چوریاں مکمل ثبوت کے ساتھ پیش کیں۔ان لوگوں نے اُن چوریوں اور جعل سازیوں کا جواب دینے کی بجائے میرے خلاف گمنام ''گشتی مراسلہ بازی'' کا نہایت غلیظ سلسلہ شروع کیا۔۔۔

(حیدر قریشی کی کتاب ''کھٹی میٹھی یادیں'' مشمولہ ''عمر لا حاصل کا حاصل'' سے مقتبس)

نظمیں I

زمانہ اک ہوا ہے

زاہد منیر عامر

تمنا خواب کی چادر میں لپٹی ہے
ستارے دُھند میں گم ہیں
اُجالا چاند سے روٹھا ہوا ہے
کسی صحرا میں اک پربت
زمیں پر ایستادہ ہے
بہت سی خواہشوں کا نرم رو سبزہ
دبا ہے حسرتوں کے آہنی قدموں کے نیچے
زمانہ اک ہوا ہے
تند اور بے باک
جس نے پربتوں کے خشک بالوں کو سنوارا ہے
مگر ان کی نگاہوں میں، یہی کاکل کی آرائش
تمنا کی جہانگیری۔۔۔

گلوبل وارمنگ

طاہر شیرازی

اگر وہ دستخط کر دیں
تو ہم اُن کے گناہوں کی سزا سے
اور قیامت خیز زہریلی ہوا سے
بچ بھی سکتے ہیں
یہ موسم جو ہمارے ہیں
یہ مٹی
جس سے خوشبو پھوٹ کر سینہ بہ سینہ ساتھ چلتی ہے
نئی رنگوں میں ڈھلتی ہے
یہ مٹی اور موسم اور ساری مہرباں یادیں
کہیں آنسو نہ بن جائیں
اگر ایسا ہوا تو پنچھیوں کو
آشیانے چھوڑ جانے کا تناؤ مار ڈالے گا
اور آنکھوں کے سمندر میں
صداؤں کا جزیرہ ڈوب جائے گا

تم کو حیرت ہے

علی کمیل قزلباش

ابوذر! تم کو حیرت ہے
کہ وہ جس کو میسر شب کی روٹی آ نہیں سکتی
وہ کیوں تلوار سونتے
اپنے حق کے واسطے راہِ بغاوت پر نہیں چلتا
ابوذر! تیری حیرت ہے بجا لیکن
تیری حیرت میں۔۔۔میں
کچھ اور بھی کر دوں اضافہ
ابھی تو ہاتھ سے چھینی ہوئی روٹی کی خاطر بھی
کوئی تلوار تو کیا چشم کا ابرو
اُٹھانے کی بھی جرأت تک نہیں کرتا
ابوذر! تیری حیرت میں
اضافہ یوں بھی ہوگا کہ
اب ان لوگوں سے کوئی بھی تو آ کر چھین سکتا ہے
لباس اور رنگ و روپ ان کا
تشخص، لفظ اور اقدار بھی ان کے
کہ یہ تلوار تو کیا اب
زباں کو تھوڑی سی جنبش نہیں دیتے
ابوذر! تیری حیرت میں اضافہ اور بھی ہو سکتا ہے
لیکن۔۔۔

نامحرم

ترنّم ریاض

اُس کے ہر مُو سے لپٹا ہوگا اک سانپ
دلکش آنکھیں اُس کی داغی جائیں گی
انگاروں پر ہوگا اُس کا نرم بدن
ایسے جرم کے بعد رحم کی کیا ہوگی اُمید اُسے
حالانکہ ہر دل کا مالک اللہ ہے
اک کی جان اور جسم کا ہے مختار کوئی محرم لیکن
اُس کو اک نامحرم اچھا لگتا ہے

خواب

کرامت بخاری

کوئی خواب تھا کہ خیال تھا
شبِ ہجر وقتِ ظہور تک
سرِ بزم تھا وہ سجا ہوا
کہیں اپنے بامِ غرور تک
جسے دیکھنے جسے ڈھونڈنے
یہ نظر گئی کوہِ طور تک
اُسے سوچتے رہے رات بھر
بڑی دیر تک بڑی دُور تک

کوئی آواز دیتا ہے

رابعہ سرفراز

کوئی آواز دیتا ہے مجھے چپ کے جزیرے سے
عجب جگنو چمکتے ہیں مرے صحرا خیالوں میں
ہوا کے نرم جھونکے کی صدا دل میں اُترتی ہے
نگاہوں میں بچھڑتے موسموں کے عکس روشن ہیں
یہاں سے رَت جگوں کی داستاں آغاز ہوتی ہے

دِیے روشن کروں تو خامشی بھی بول اُٹھتی ہے
اُسی کی یاد کی لَو سے یہ دنیا جگمگاتی ہے
فضا سرگوشیاں کرتی ہے دھڑکن گنگناتی ہے

اُفق کے اُس طرف بھی زیست کے آثار ملتے ہیں
مری آنکھوں میں اُس کے صرف اُس کے خواب پلتے ہیں
اُسی کے نام سے خواہش کے سارے پھول کھلتے ہیں
اُسی اک واسطے سے روشنی سے رابطہ میرا
جہاں میں زندگی کا ' ہر خوشی کا سلسلہ میرا

ہوا کے بھید سنتی ہوں اُسی کی بات کرتی ہوں
میں گہری خامشی میں صرف اک آواز سنتی ہوں
مجھے کیسے خبر ہو رات شبنم پھول پر برسی
میں کیا جانوں؟ ستاروں کا سفر کب تک کہاں تک ہے
مرے اندر کی دنیا ہے عجب اَسرار کی دنیا
حقیقت ' وصل ' حیرت ' بے خودی کی ' سوز کی دنیا
یہ خوشبو کے زمینِ دل پہ بسنے کی کہانی ہے
مرے لفظوں کی ' میری ذات کی سچی نشانی ہے

گزرتے لمحوں کے دامن میں میرے واسطے جگنو
کسی کے لمس سے پھیلی ہوئی ہے چار سو خوشبو
فلک پر چاند روشن ہے مرے ہمراہ چلتا ہے
مرے اشکوں میں اُس کو کھوجتا ہے مسکراتا ہے
یہاں دشتِ محبت میں اُسی کے نام کے آنسو
فضا میں چار سُو پھیلے اُسے آواز دیتے ہیں
یہ کیسا معجزہ ہے؟ جو مری رگ رگ میں اُترا ہے
ستارے یاد کی کشتی میں میرے پاس آتے ہیں
مہکتے خواب اُس کی روشنی سے جگمگاتے ہیں
یہ پلکیں بھیگتی ہیں آنکھ میں اک عکس ٹھہرا ہے

ہوا کو خواہشوں کا علم ہے وہ جانتی ہے سب
نئے موسم کی رسمِ رونمائی کی طلب کیا ہے
نگاہیں خواب کو کیوں کھوجتی ہیں؟ مسئلہ کیا ہے؟

دعاؤں کی قبولیت کے دَر کھلنے لگے ہر پل
کتابِ وقت میں حرفِ یقیں کی تازگی بھی ہے

یہیں سے ملتا ہے اک اور رُخ دل کی کہانی کو
خوشی کی ساعتوں میں دُکھ کے لمحے کیسے آتے ہیں
اُداسی کس لیے بوجھل ہوئی جاتی ہے سانسوں میں
نظر کی وسعتوں سے دُور وہ کیوں آزماتا ہے
یہ کیوں تسکیں نہیں ہوتی کسی لمحے کسی ساعت
یہ اندیشے ہیں کیسے جان میں جو سرسراتے ہیں

یقیں کن سازشوں سے ڈھل رہا ہے بے یقینی میں
رُتوں کے جسم سے کیسے لپٹتی ہیں تمنائیں
تعلق اک تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں رہتا
یہی سچ ہے کہیں پاسِ وفا کچھ بھی نہیں رہتا
اگر خاموش رہتے ہیں سبھی مجرم سمجھتے ہیں
حقیقت کون جانے گا ؟ خموشی کون سمجھے گا؟

ترستے ہیں ' محبت کے تعاقب میں بھٹکتے ہیں
یہ کیسے لوگ ہیں جو جذب کے ڈر سے سمٹتے ہیں

رُتیں ایسے عجب منظر دِکھاتی ہیں ' سبب کیا ہے؟
اگر دل کی حقیقت کچھ نہیں تو یہ سب کیا ہے؟
اُداسی کا سماں بدلے تو مَیں سمجھوں طرب کیا ہے
مرے ہر اک سفر کی ابتدا تم ' انتہا تم ہو
ہتھیلی پر دیا رکھ کے تمہاری منتظر آنکھیں
تمہیں ہی کھوجتی ہیں ان فضاؤں ' میں ہواؤں میں

فقط اک فصل سوکھی ٹہنیوں پر پھلتی جاتی ہے
پگھلتی جا رہی ہے برف بے جا بدگمانی کی

میں اپنے وقت سے آگے نکل کر سوچتی ہوں ' تو
حقیقت کے سفر میں تم مرے ہمراہ چلتے ہو

دیکھنے سے پہلے ٹوٹ جانے والا خواب

شبہ طراز

سمندر خواب میں رہتے تو اچھا تھا
کہ نیندیں ذائقے میں
اور بھی نمکین ہو جاتیں '
۔۔۔سمندر آنکھ میں رہتے تو اچھا تھا
تمنا کے سیاہ گرداب میں
کوئی تھکا ماندہ مسافر
شام کر لیتا۔۔۔ذرا آرام کر لیتا
(کہ یہ جیون تھکاوٹ ہی تھکاوٹ ہے)
مگر۔۔۔بادل۔۔۔!
بہت ضدی۔۔۔کھلنڈرا!!
لے اُڑا آنکھوں کے پانی کو
نجانے اب کہاں برسے
۔۔۔مری آنکھیں ترستی ہیں
سمندر کو۔۔۔!
مری نیندیں۔۔۔مری نیندیں۔۔۔!!

آکاس بیل

عبداللہ عظیم

مجھے اک بات کرنا تھی
اُدھوری بات
جو مجھ کو
وراثت میں ملی تھی
منتقل کرنا تھی آنے والی نسلوں کو
ابھی کچھ اور چلنا تھا مجھے
سوئی ہوئی سطروں کے بیچوں بیچ کے
اور ابھی
آزاد کرنا تھا مجھے مٹھی سے جگنو

حلقۂ آفاق میں
یاروں نے جو بیٹھک سجائی تھی
وہاں جانا تھا مجھ کو
پھول لے کر
اور ابھی تو چومنے تھے وہ نشاں سارے
جو چکّی پیسنے سے
پڑ گئے تھے ماں کے ہاتھوں پر
مگر
چڑیوں نے اِتنا شور ڈالا دِن نکلنے پر
توجہ بٹ گئی میری
اگرچہ
بات رہتی تھی ابھی باقی
مگر خوش ہوں
چلو اک اور شب تو کٹ گئی میری

میرے محبوب ذرا۔۔۔

غائر عالم

میرے محبوب!
ذرا ٹھہر کہ اب تھک سی چلی
نبضِ حیات۔۔۔اور
ہوئی تیز جنوں کی دھڑکن

میرے محبوب!
ذرا دیکھ، کھلی آنکھ کی اوک
اور پتھرائی سی اک لَو کی
سیہ بوند کا اک ریزۂ ضو

میرے محبوب!
ذرا بول کہ یہ کان کے پردے سے لگا بنجارہ
کب سے آواز کی چوکھٹ پہ کھڑا
تیرے دالان سے آتی ہوئی اک چاپ
تکے جاتا ہے

میرے محبوب!
ذرا تھام کہ یہ تن کی دہکتی ہوئی سیپ
دھول سی خاک پہ کنکری
پکی جاتی ہے، صرف اِک لمس کے
خوش خواب کو نم کرتی ہوئی

میرے محبوب!
ذرا سوچ کہ اِک عمر سے گھٹتا ہوا
بے سود وجود
ہے ترے شوق کی تعمیرِ حسیں کا
مزدور
آخری سانس کی اینٹ
آج اُٹھائے ہوئے، کرنے لگا
تکمیلِ حیات

میرے دمساز
قریب آ کہ مبارک ہے گھڑی
اس گھڑی کھلنے کو ہے قفلِ بدن
اِک ''نہ ہونے'' کا دِیا
جلنے کو
روشنی جس کی تری
ہستِ ابد
ہو۔۔۔گویا

یہ سیتل سا مخمور جھونکا

عامر عبداللہ

یہ سیتل سا مخمور جھونکا
مری سمت کیوں آ گیا ہے
مجھے نرم ریشم سروں میں کیوں الجھا رہا ہے
مجھے کیوں یہ میٹھی سی لوری سنانے لگا ہے
ابھی تو یہ پہلا پہر شب کا ہے
رات کی آخری حد تلک جاگنا ہے
نبھانا ہے وہ عہد
شب کے سیہ مخملیں فرش پر
اک ستارے کے نورانی ہاتھوں کو تھامے ہوئے
جو تھا باندھا
ستارے نے مجھ سے کہا تھا:
''ابھی ملگجے میں
میں بجھنے سے پہلے
ترے دل میں آ کر رکوں گا
اگر نیند سے تو گریزاں رہا
روشنی کی کرن دان دوں گا تجھے''

وقت کے بوڑھے برگد سے
ڈھیروں زمانے جھڑے
میں مگر اک اسی عہد کو
اپنے دل میں بسائے ہوئے
آج کی شب
کی دہلیز تک آ گیا
آخری شب ہے ایفائے وعدہ کی یہ
اس سے اتم سرے پہ
مری عمر بھر کی ریاضت کا انعام ہے
آج کی شب اگر آنکھ موندی
تو میں بھسم ہو جاؤں گا
کب یہ مسرور جھونکا بھلا جانتا ہے
کسی اپسرا کے بدن کی مہک کو
سموئے ہوئے آ رہا ہے
مرے دھیان کو توڑنا چاہتا ہے
یہ جھونکا'
مرے امتحاں کا
کڑا مرحلہ ہے
یہ سیتل سا مخمور جھونکا
مری سمت کیوں آ گیا ہے

سفر کے دشمن

شکیل احمد طاہری

ریت سمندر جیسی چمکے
سفر سراب ہے انت
خوف کا جنگل اندر گونجے
دیوار کرے دو چند
شام کھڑی ہے روک کے رستہ
آگے در ہے بند

نظم

اوصاف شیخ

تمہیں پتہ ہے
کہ بے یقینی کے راستے پہ
چلے ہیں دونوں!
تمہیں پتہ ہے
کہ بے یقینی کے اس سفر میں
کہیں پڑاؤ نہیں ملے گا!
تمہیں پتہ ہے

کہ بے یقینی کا راستہ
ایک دائرہ ہے
کہ جس میں منزل نہیں ملے گی!
تمہیں پتہ ہے
کہ بے یقینی کے اس سفر میں
فقط اندھیرے کا راج ہوگا!
تمہیں پتہ ہے
کہ بے یقینی کے گھپ اندھیرے کے
اس سفر میں
بچھڑ گئے تو
نہیں ملیں گے!
تمہیں پتہ ہے
کہ بے یقینی کے گھپ اندھیرے کا یہ سفر
ہم کو مار دے گا!
تو کیوں نہ ہم آج
بے یقینی کے گھپ اندھیرے کے اس سفر کو
یقین کی روشنی سے بھر دیں
دائرے کو دِیا بنا دیں
مجھے یقیں ہے
یقین کے اس سفر کی
منزل ضرور ہوگی

ایک ختم نہ ہونے والا دُکھ

نثار ساجد

عجیب اُلجھن میں زندگی ہے
عجیب احساسِ بے بسی ہے
کہ عمر کی مٹھیوں میں بھینچی
دنوں کی مالا کے سارے موتی بکھر رہے ہیں
انھیں پکڑنے کی سعیِ ناکام کرتے کرتے
ہماری ہمت کی سانس بھی اب اُکھڑ رہی ہے
ہاتھ شل ہوتے جا رہے ہیں
ہتھیلیوں میں گڑی دعائیں بھی
زنگ آلود ہو رہی ہیں
وہ نیند صحرا میں خواب جتنے اُگائے تھے
ریت ہو رہے ہیں
کہ دشتِ ہجرت میں تیز چلنے سے
جسم بھی ٹوٹنے لگا ہے
وہ خواہشوں کے سفر میں ہاتھوں میں' کب سے تھامی
ہماری خوش فہمیوں کی اُنگلی کی
آخری پور چھٹ رہی
بدن میں سانسوں کے بیچ جتنا بھی فاصلہ ہے
سمٹ رہا ہے
ہمارے ہونے کا جو گماں ہے
وہ مٹ رہا ہے
اور ہم کہ اب بھی
کسی سے بس ایک لفظ کہنے کو
تیسرا شخص ڈھونڈتے ہیں!

تخاطب

شارق عدیل

کل رات ہوا یوں بھی
اک چاند بدن لڑکی
تخیل میں جب اُتری
دنیا کے مسائل نے
ہر دل کی مسرت کو
مصلوب بنا ڈالا
اور اس سے مخاطب پہ
محسوس ہوا مجھ کو
جیسے کئی صدیوں کی
بچھڑی ہوئی دو روحیں
آپس میں مخاطب ہوں
بے روح کی قالب ہوں

سنّاٹا

سیّد تحسین گیلانی

لگتا ہے یوں
اندر اک کہرام مچا ہے
خون رگوں میں ماتم کرتا رہتا ہے
یوں لگتا ہے
جیسے اندر سورج جلتا رہتا ہے
ایسا اکثر ہوتا ہے
اور کبھی تو
یوں لگتا ہے
میرے اندر کوئی جیسے برچھی لے کر
اُتر گیا ہے
جیسے اک بھونچال چھپا بیٹھا ہے اندر
جیسے سانسیں آری بن کر
کاٹ رہی ہیں
مجھ میں رہ کر مجھ کو ہی یہ بانٹ رہی ہے
جیسے اندر
''اُس'' کی خواہش
میری قبر پہ آ کے
آج دھمالیں ڈال رہی ہے
اور کبھی تو یوں لگتا ہے
جیسے اک سنّاٹا
سہما خود اپنا ہی
چہرہ دیکھ کے
چیختا دھاڑتا
مجھ میں آ کر ٹھہر گیا ہے

زمیں پوشاک کب بدلے گی

توقیر تقی

کئی نوری یگوں سے
مسلسل اک ڈگر پر چلتے چلتے
وہی صدیوں پُرانی شال اوڑھے
برہ کی ماری جوگن
خدا معلوم کن سوچوں میں گھلتی جا رہی ہے
کسی کو کچھ بتاتی بھی نہیں ہے
یہ ہنستی مسکراتی بھی نہیں ہے
زمیں پوشاک کب بدلے گی آخر؟
یہ سورج کتنا بوڑھا ہو گیا ہے
چلا آتا ہے پھر بھی زندگی کے رنگ بھرنے
فلک بھی اپنی آرائش میں ہے مصروف کب سے
لگے ہیں قمقمے بھی کہکشاں کے
سمے کا پنچھی پل پل گیت گاتا ہے خوشی کے
ستارے چاند کی بارات لے کر آ رہے ہیں
زمیں کو کوئی سمجھائے
کہ ایسی شبھ ملاقاتیں ہیں کم کم
خوشی دستک نہیں دیتی ہمیشہ
یہ سورج آس لاٹھی کے سہارے کب تلک آتا رہے گا!
کسی دن مر ہی جائے گا
تو کیا اس دن زمیں پوشاک بدلے گی؟

پروفیسر نظیر صدیقی کی شخصیت

اکبر حمیدی

1980ء میں یہاں کے ایک بہت مشہور کالج آئی۔سی۔بی میں بسلسلہ ملازمت بحیثیت اردو لیکچرار مَیں مستقل طور پر اسلام آباد میں آ گیا۔تب پروفیسر نظیر صدیقی یہاں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ تھے۔اسلام آباد کے دوسرے اہم شاعروں'ادیبوں سے ملنے کا مجھے شوق تھا اور مَیں جلد ہی سب سے ذاتی رابطہ کرنے میں کامیاب بھی ہوگیا۔نظیر صدیقی صاحب کو مَیں اُن کی تنقید نگاری اور انشائیہ نگاری کے حوالے سے جانتا تھا۔پھر اتفاق یہ بھی ہوا کہ ان کا بیٹا سلمان کالج میں میرا اسٹوڈنٹ تھا۔دوسرا اتفاق یہ ہوا کہ ہم دونوں ایک ہی سیکٹر جی 6 میں رہائش پذیر تھے۔چنانچہ ہمارا میل جول کا آغاز ہوگیا۔

پروفیسر نظیر صدیقی بہت پڑھے لکھے'بہت مہذب' مہمان نواز اور صاحبِ علم انسان تھے۔گفتگو میں دوٹوک'صاف دل'صاف گو'برملا اختلاف کرنے والے مگر بڑے مہذب انداز میں۔دوستوں کے دوست'آزاد مرد'ادبی دنیا کے ہر کیمپ سے بے نیاز'خود رائے اور خوددار انسان تھے۔بے تکلف دوستوں سے کھلتے مگر بھری مجلس میں زیادہ تر خاموش'وسیع مطالعے کے مالک۔

1996ء میں جب مَیں ملازمت سے ریٹائر ہوکر آئی 10/2 سیکٹر میں آن بسا تو یہاں پروفیسر نظیر صدیقی صاحب کی ہمسائیگی میسر آئی۔وہ بھی ریٹائر ہوکر اپنے ذاتی مکان میں رہائش پذیر تھے۔ان سے تعلقات بڑھتے بڑھتے یہاں تک آ گئے کہ وہ دن میں بعض اوقات دو تین مرتبہ بھی میرے ہاں تشریف لاتے۔کبھی چند منٹوں کے لیے کبھی خاصی دیر تک بیٹھتے۔ہم چائے کی پیالیوں پر ادبی موضوعات کو زیرِ بحث لاتے۔کبھی کبھی اختلاف بھی ہوتا اور ہماری آوازیں خاصی بلند ہو جاتیں۔یہ تعلق ان کی زندگی کے آخری ایام تک بڑھتا ہی رہا۔انہوں نے میری بہت سی کتابوں پر ''مُسلم'' اور ''نیوز'' میں کالم لکھے۔

لیکن میرے ان کے مراسم 1994ء میں ہی خاصے قریبی ہو گئے تھے۔1994ء میں وہ ریٹائر ہوکر کراچی کے کسی کالج سے وابستہ ہوگئے۔جہاں سے میری اور صدیقی صاحب کی خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔صدیقی صاحب کے یہ خطوط ان کی شخصیت'ان کی زندگی کے احوال واحساسات'ان کے نظریات'رجحانات اور مزاج یا افتادِ طبع کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔یہ خطوط وسط 1994ء سے دسمبر 1996ء تک محیط ہیں۔گو تعداد میں کم ہیں مگر دیوانِ غالب کی طرح معنی میں بہت وسیع ہیں۔ان میں پروفیسر نظیر صدیقی تقریباً پورے کے پورے دکھائی دیں گے۔وہ نظریاتی اعتبار سے برٹرینڈ رسل سے متاثر تھے۔سوخدا اور کائنات کے بارے میں ان کے نظریات بھی رسل ہی کے نظریات کا عکس ہیں۔ادبی طور پر رشید احمد صدیقی سے متاثر تھے۔چنانچہ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ ''صدیقی'' کا لفظ اسی عقیدت میں لگا رکھا تھا ورنہ وہ ''صدیقی'' نہیں تھے۔ان کا تعلق شیخ فیملی سے تھا۔

ان خطوط سے ان کی زندگی ـــــ خصوصاً زندگی کے آخری چند سالوں ـــــ کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔یوں مَیں سمجھتا ہوں ان خطوط کے حوالے سے پروفیسر نظیر صدیقی کی شخصیت کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔میری نظر میں یہ خطوط صدیقی صاحب کی شخصیت کا بھرپور تاریخی حوالہ بنیں گے اور ان پر کام کرنے والوں کے لیے مددگار ثابت ہوں گے۔

خطوط

(کراچی) ۱۳-۵-۹۲

برادرم اکبر حمیدی صاحب السلام علیکم!

کئی دنوں سے خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن لکھنا ممکن نہ ہوسکا۔سردست مجھے ایک جز وقتی ملازمت اردو کالج میں ایم۔اے کے طلبہ کو پڑھانے کی مل گئی ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ ایک جز وقتی سے گزارا نہیں ہوسکتا۔

'مسلم' میں میرا مضمون آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ آپ نے اسے کیسا پایا۔ باقی باتیں آپ کا خط ملنے پر۔

مخلص، نظیر صدیقی

☆☆☆

۹۲-۶-۶

مجی اکبر حمیدی صاحب السلام علیکم بڑے انتظار کے بعد آپ کا خط ملا۔ مجھے یہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ شاید میرا خط آپ تک نہ پہنچ سکا۔ سردست صرف اردو کالج میں جز وقتی ملازمت کے طور پر ایم۔اے کی کلاسیں لے رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جز وقتی ملازمت سے گزارا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی اور ملازمت مل گئی تو کام چلے گا ورنہ یہاں رہنا کچھ زیادہ سود مند نہیں ہوگا۔

اگرچہ یہاں کا ذہنی ماحول اسلام آباد سے بہتر ہے تاہم کراچی کی سخت تر زندگی سے طبیعت مانوس نہیں ہو پا رہی ہے۔ تمام عمر چھوٹے شہروں کی سہولتوں کا عادی رہا ہوں۔ کراچی جیسے بڑے شہر کی دشواریاں قوتِ برداشت سے باہر معلوم ہوتی ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں مَیں وہی لکھتا ہوں جو محسوس کرتا ہوں خواہ وہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ پڑے۔ انشائیے کے بارے میں بھی میں نے وہی لکھا جو میں نے محسوس کیا۔ مجھے اس کے مستقبل کے بارے میں کچھ زیادہ خوش گمانیاں نہیں ہیں۔

پاکستان ٹائمز کا جو تراشہ آپ نے بھیجا ہے اس میں دو باتوں پر حیرت ہوئی۔ ایک تو یہ کہ ضیا جالندھری جیسے انگریزی کے ایم۔اے جنھوں نے لاہور کے نامی گرامی استادوں سے انگریزی ادب کی تعلیم پائی۔ انشائیہ اور تمثیل (Allegory) میں کوئی فرق نہیں کر پاتے اور محمد حسین آزاد کی کتاب نیرنگِ خیال کو انشائیے کی سب سے بڑی کتاب تصور کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ٹائمز کے رپورٹر نے مجھے اور مشکور حسین یاد کو سرگودھا اسکول کی پیداوار کہا۔ مشکور حسین یاؔد کا سرگودھا اسکول سے تعلق ہو تو ہو میرا تو کوئی تعلق نہیں ہے البتہ وزیر آغا صاحب سے لے کر آپ تک میرے مراسم ضرور ہیں۔ میں تو عہد حاضر کے کسی بھی اسکول سے وابستہ نہیں ہوں۔

بہرحال اچھی بات ہے کہ آپ لوگوں نے انشائیے کی شام منائی۔ کچھ نہ کچھ سرگرمی تو رہنی چاہیے۔

میں نے کراچی کے سمندر کی زیارت کر لی لیکن قدرت کے مظاہر کی طرف میرا ردِ عمل وہ نہیں رہا جو آپ جیسے زندہ دل لوگوں کا ہے۔

آپ کا مرتب کردہ انشائیوں کا مجموعہ تو مجھے نہیں ملا۔ اب دیکھنا ہے کہ آپ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ مجھے ملتا ہے یا نہیں۔ اور حالات بدستور۔ کبھی کبھی یاد کر لیا کیجیے۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۳۰/اگست ۱۹۹۲ء (کراچی)

بھائی اکبر حمیدی صاحب السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۱۶/اگست مجھے ۲۷/اگست کو ملا۔ پاکستان میں وہ دَور گزر گیا جب عام خط تیسرے دن مل جایا کرتا تھا۔ اب تو ارجنٹ میل بھی بعض اوقات چوتھے دن ملتا ہے۔ ہمارے محلے کا ڈاکیہ ہفتے میں مشکل سے ایک دن آتا ہے۔ پاکستان جس نراجیت کا شکار ہے اس کا نقطۂ عروج کراچی ہے۔

آپ کا خط تو ۱۲ دن بعد مل بھی گیا لیکن امین خیال صاحب کے دوہے آج تک نہیں ملے ورنہ میں اپنی مصروفیتوں کے باوجود دیباچہ بھیج چکا ہوتا۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ مجھ سے کسی کام کے لیے کہیں اور مَیں نہ کروں۔

اسلام آباد میں آپ میری جو کمی محسوس کر رہے ہیں یہ آپ کی محبت ہے ورنہ غالبؔ خستہ کے بغیر رونق حیات میں کون سی کمی ہے۔ میں یہاں کے ماحول سے قطعاً مطمئن نہیں ہوں لیکن کیا کروں کہ رزق اسی شہر سے وابستہ ہے۔

اُمید ہے کہ آپ کی تخلیقی سرگرمیاں جاری ہوں گی۔ امین خیال صاحب سے کہیے کہ اپنے دوہے ارجنٹ میل (UMS) کے ذریعے بھیج

دیں۔ ہاں یہ بتائیے کہ آج کل ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کے بڑے افسروں میں کسی سے تعلق ہے یا نہیں۔ اندیشہ ہے کہ یہ خط بھی آپ کو ایک دو ہفتے کے بعد ہی ملے گا۔ بہر حال مراسلت کا سلسلہ رکھیے۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۱۳/ستمبر ۱۹۹۲ء

بھائی اکبر حمیدی آپ کا خط مورخہ ۳ ستمبر ملا۔ خیال تھا کہ امین خیال صاحب کے دوہے آ جائیں تو جواب لکھوں لیکن ان کے دوہے ابھی تک نہیں آئے۔ میں نے سوچا کہ جب ان کے دوہے آ جائیں گے تو ان کی رسید سے آپ کو مطلع کر دوں گا۔ سر دست آپ کے خط کا جواب بھیج دوں۔

آپ اسلام آباد میں جس طور پر میری کمی محسوس کر رہے ہیں اس کے پیش نظر مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے بڑی حد تک اس طرح جانا جس طرح میں چاہتا ہوں کہ جانا جاؤں۔ رواداری' بے تعصبی اور وسیع المشربی بڑی کم یاب خصوصیتیں ہیں۔ اگر مجھ میں کسی حد تک یہ باتیں ہیں تو میں یقیناً آپ کی پسندیدگی کا مستحق ہوں۔ عام طور پر آدمی ان روایات اور تعصبات سے بلند تر نہیں ہو پاتا جن میں وہ آنکھ کھولتا اور پلتا بڑھتا ہے۔ میں بھی ایک روایتی ماحول کا پروردہ ہوں لیکن مَیں بہت سے روایتی خیالات' نظریات اور اندازِ فکر سے سمجھوتہ نہ کر سکا اور نتیجتاً جو کچھ ہوں اور جیسا کچھ ہوں آپ کے سامنے ہوں۔

اِدھر ایک مدت سے اس بات پر غور کرتا رہا ہوں کہ یہ جو ایک عیسائی تلقین ہے کہ Love thy neighbour (اپنے پڑوسی سے محبت کرو) کیونکہ معاشرتی نجات اسی میں ہے تو مجھے محسوس یہ ہوتا رہا ہے کہ ہر پڑوسی سے محبت کرنا ممکن نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایسا کیے بغیر معاشرتی صلح و آشتی اور معاشرتی نجات بھی ممکن نہیں۔ یہاں انسان پھر اسی طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہے جس کے بارے میں حافظ نے کہا ہے کہ ؎

درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ
بازی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

قدرت نے دنیا میں ایک سے ایک نامعقول مرد اور عورت پیدا کر رکھے ہیں۔ پھر یہ جبر بھی عائد کر رکھا ہے کہ ان سے محبت کا تعلق رکھو ورنہ آرام سے نہیں رہ سکو گے۔ یہ تو ایک ناممکن کو ممکن بنانے کے برابر ہے۔ سارتر نے تو اپنے ایک ڈرامے میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ہر دوسرا آدمی جہنم ہے۔ یہ بیان مبالغہ آمیز تو ضرور ہے لیکن بالکل غلط نہیں۔ اس صورتِ حال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پڑوسی یا دوسرا آدمی جس حد تک میرے لیے نامعقول یعنی ناقابل برداشت ہے اُسی حد تک مَیں بھی (اپنے جملہ اوصافِ حمیدہ کے باوجود) دوسروں کے لیے نامعقول یعنی ناقابل برداشت ہوں یا ہوسکتا ہوں کیونکہ دنیا میں بہت کم چیزوں کا کوئی آفاقی معیار ہے۔ ہر معیار بڑی حد تک علاقائی' فرقہ وارانہ اور انفرادی ہے۔ تو دنیا میں امن و امان کی برقراری کے لیے جو شرط رکھی گئی ہے۔ (اپنے پڑوسی سے محبت کرنا) اسے پورا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

آپ کے لیٹر پیڈ پر جو یہ جملہ ہے۔ محبت سب کے لیے نفرت کسی سے نہیں۔ بڑا دل خوش کن اصول ہے لیکن اس میں بھی خاصی قباحتیں ہیں۔ نفرت نہ کرنے کے باوجود ضروری نہیں کہ محبت کی جا سکے۔ سب سے محبت کرنے کا دعویٰ ایک قسم کی ریاکاری ہے۔ اس ناقص دنیا میں یہی بہت ہے کہ ہمیں کسی سے نفرت نہ ہو۔ ملک کی بیرونی پالیسی کے طور پر یہ اصول نہایت عمدہ ہے۔ ہمیں کسی آدمی سے یا کسی ملک سے صرف اس لیے نفرت نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ایک خدا کی بجائے دو یا تین خدا کا قائل ہے۔۔ ان باتوں کی بنیاد پر کسی سے نفرت یا جنگ کرنا انتہائی حماقت ہے کیونکہ ابھی اس بات کو حتمی طور پر ثابت ہونا باقی ہے کہ دنیا کا کوئی خدا (مذہبی معنوں میں نہیں عقلی' منطقی اور سائنٹفک معنوں میں) ہے بھی یا نہیں وغیرہ لیکن اگر کوئی آدمی یا ملک آپ کے درپئے آزار یا درپئے جان ہو جائے تو آپ اس سے کم از کم نفرت تو ضرور ہی کریں گے حالانکہ قدرتی طور پر انسانی خواہش یہاں تک جاتی ہے کہ میرا مخالف یا میرا دشمن نیست و نابود ہو جائے ؎

مرگ دشمن کی آرزو ہی سہی
دل سے نکلے کسی طرح تو غبار

تو بھی آپ اگر میرے نقطۂ نظر سے سوچنا شروع کریں تو بہت سی اچھی باتیں' اچھے اقوال اور اچھے نظریے بھی صرف کلیشز (Cliches) بن کر رہ جاتے ہیں۔ تاہم اتنا تو کرنا ہی ہوگا کہ ہر لمحے تعصب' نفرت اور خواہش قتل کی اُٹھتی ہوئی لہروں کو کنٹرول میں رکھنا ہوگا ورنہ ہر صبح اخباروں میں پڑھنا پڑے گا کہ کل اتنے تصادم' اتنے فساد اور اتنے قتل ہوئے۔ اصل میں دنیا کی عافیت اور نجات صرف اس بات میں ہے کہ یہ دنیا (انسانوں کی دنیا) پیدا نہ کی جاتی لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ اللہ میاں نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کی۔

مجھے آپ کے دونوں شعر (۱۔ وہ نہیں شہر میں ۔۔۔' ۲۔ زمانے کے منافی ہو گیا ہوں) بہت پسند آئے۔

آپ کو شام کی شفٹ میں کلاسیں مل گئیں۔ اچھا ہوا۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کا مقابلہ کبھی کبھار کے ریڈیو پروگراموں سے نہیں ہو سکتا۔

میں نے ابھی تک صابر ظفر کے بارے میں کوئی بُری خبر نہیں سنی۔ ویسے اس دنیا میں کس بات کا امکان نہیں ہے؟ خدا اسے سلامت رکھے۔

ہر چند کہ یہاں کی زندگی آسان نہیں تاہم جیئے جانے کی کوشش کیے جا رہا ہوں۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۶ ستمبر ۹۳

برادر محترم اکبر حمیدی صاحب السلام علیکم

خاصی مدت کے بعد آپ کا خط مورخہ ۲۰ ستمبر مجھے ۲۲ ستمبر کو ملا۔ ڈاک کی یہ مستعدی معجزے سے کم نہیں۔ نیوز انٹرنیشنل میں میرے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ ایک مہینے تین ہفتے بند رہا لیکن ۲۶ ستمبر سے یہ سلسلہ بحال ہو گیا ہے اور حسن اتفاق یہ ہے کہ آپ کی کتاب سے متعلق تبصرے سے بحال ہوا ہے۔ فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔ مگر فوٹو کاپی اچھی نہ بن سکی۔ بائیں طرف الفاظ کے حروف چھوٹ گئے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا ہاتھ سے درست کر دیا ہے۔ تبصرے میں حسب معمول چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد والا انداز موجود ہے۔ اُمید ہے کہ کم از کم آپ اس کا بُرا نہیں مانیں گے۔ شخصی خاکوں کے مجموعے کی طباعت مبارک ہو۔ خدا کرے کتاب جلد آئے۔

میرے نزدیک انسانیت کا صحیح مذہب محبت ہے اور محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

لیکن یہ دنیا تاریخی اعتبار سے جن مذہبی شکنجوں میں گرفتار رہی ہے۔ ان سے نکلنے میں نہ جانے کتنی صدیاں گزر جائیں گی۔

میرے نزدیک دنیا کی تمام خرابیوں اور خباثتوں کی ذمہ داری یعنی Ultimate ذمہ داری خود خالق کائنات پر ہے جس نے قادرِ مطلق ہونے کے باوجود اتنی ناقص اور ہولناک دنیا بنائی۔ اس دنیا کا منطقی مقصد ابھی تک ورائے ادراک رہا ہے۔ لہٰذا ایسی دنیا میں جس فرقے کے ساتھ جو بھی زیادتی ہو رہی ہے وہ حیرت انگیز نہیں ہے البتہ افسوس ناک اور دردناک ضرور ہے۔ کل رفیق سندیلوی کا خط ملا۔ رفیق سندیلوی اور فاروق ملک (شاید یہ نوجوان بھی آپ کا شاگرد رہا ہے) نے میری ایک ایک انگریزی کتاب شائع کرنے کے لیے لے رکھی ہے۔ مگر شائع نہیں کر پا رہے ہیں۔ ان دونوں کی کوشش یہ ہے کہ پاکستان بک کاؤنسل ان کی کتابیں طباعت سے پہلے خریدے تو پھر یہ اپنے پیسے لگا کر کتابیں شائع کریں اور کاؤنسل سے اپنے پیسے فوراً وصول کر لیں۔ فاروق ملک والی کتاب کاؤنسل نے منظور کر لی تھی لیکن وہ اپنی تاجرانہ حماقتوں کے باعث اس منظوری سے فائدہ نہ اُٹھا سکا اور تاریخ گزر گئی۔ اب وہ پھر اس چکر میں ہے کہ کتاب دوبارہ منظور ہو جائے تو وہ اپنے پیسے لگائے۔

اگر آپ ان دونوں کو اس بات پر آمادہ کر سکیں تو کر دیں کہ وہ میری کتابیں پانچ پانچ سو کی تعداد میں شائع کر لیں۔ اس دوران میں اگر کاؤنسل ان پر مہربان ہوگئی تو چار چار سو جلدوں کی قیمت جلد سے جلد مل جائے گی اور اگر مہربان نہ ہو سکی تو بھی چار سو جلدیں بک جائیں گی۔

میں ان دونوں کتابوں کی طباعت کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ آپ رفیق اور فاروق کو بلا کر انھیں کچھ عملی مشورے دیں اور حالات بدستور خط لکھتے رہے۔ ادبیات کا نیا شمارہ کب تک آ رہا ہے۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۹/اکتوبر۱۹۹۲ء

بھائی اکبرحمیدی آپ کا خط مورخہ ۱/۱۷اکتوبر کو ملے ہوئے کئی دن ہوئے۔ادھر مہینے بھرمیں مکان کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں۔آج شام کوایک محلے میں Paying Guest کی حیثیت سے ایک کمرہ ملنے کا امکان ہے۔دیکھئے کیا ہوتا ہے۔اب تک اپنے مرحوم بھائی ذکی کی فیملی کے ساتھ گزارا کرتا رہا۔اب کی بارکراچی آکراعزہ اوراحباب کے معاملے میں بہت Disillusioned ہوا ہوں۔یہاں میرے لیے وہ مسائل نہیں پیدا ہونے چاہئیں تھے جو ہورہے ہیں۔یہاں میرے قریب ترین اعزہ موجود ہیں۔ان میں بعض خاصے خوش حال بھی ہیں۔میں نے سب کے لیے کچھ نہ کچھ کیا ہے لیکن۔۔۔اگرچہ آپ کی نئی مصروفیات Paying ہیں' پھربھی آپ کے لیے ان کا باعث مسرت نہ ہونا میرے لیے قابل فہم ہے۔ادیب اور شاعر صرف پیسے کے سہارے زندگی نہیں گزارسکتا۔

میری ایک اُلجھن یہ ہے کہ مجھے معاشی مصروفیتیں ادبی کام کے لیے ذرا بھی مہلت نہیں دے رہی ہیں۔تھکن اتنی طاری رہتی ہے کہ تخلیقی اور تنقیدی کام تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ایسے میں آپ کے دوست کے دوہوں کے مجموعے کا دیباچہ کس طرح لکھوں۔کوئی بھی اچھا جملہ ذہن میں نہیں آرہا ہے۔اگرممکن ہوتواس ذمہ داری سے میری گلوخلاصی کرادیں۔مَیں آپ دونوں سے بے حد شرمندہ ہوں۔

آپ نے میرے گھروالوں کی خیریت پرسی کی جس کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ان لوگوں نے شاید ہی آپ کو چائے کے لیے پوچھا ہو۔ اس ممکنہ اخلاقی کوتاہی پر مجھے شرمندہ تصور کیجئے۔

مکان کے معاملے میں ذہن اتنا Depressed ہے کہ یہ خط مشکل سے لکھ رہا ہوں۔باقی آئندہ

آپ کا نظیرصدیقی

☆☆☆

۱۶/فروری۱۹۹۳ء(کراچی)

برادرعزیز السلام علیکم آپ کے خط مورخہ ۱/۱۷اکتوبر کا جواب غیرمعمولی تاخیر سے جارہا ہے۔اس اثنامیں میں بھی نسبتاً زیادہ مصروف رہا۔ کچھ ذاتی مسائل نے بھی مضمحل رکھا جوعموماً مضمحل رکھتے ہی ہیں۔صحت مجموعی طور پرغنیمت جارہی ہے۔زندگی کا سفردیکھئے کہاں ختم ہوتا ہے۔اگرچہ آپ کی مصروفیات مغزماری سے خالی نہیں پھربھی چونکہ ان سے مالی منفعت وابستہ ہے لہٰذا ان مصروفیات کومبارک تصور کرنا چاہیے۔ہم لوگ ایک ایسے دَور میں سانس لے رہے ہیں جس میں اپنے لیے جینا تقریباً ناممکن ہوکررہ گیا ہے۔'مسلم' میں میری مضمون نگاری کا سلسلہ جاری ہے لیکن معاوضے کی ادائیگی میں خاصی بے قاعدگی (تاخیر) ہونے لگی ہے۔ممکن ہے اگلے سنیچر (۲۰ فروری) سے'نیوز' میں بھی میرے لکھنے کا سلسلہ شروع ہوجائے۔ اعصاب پراتنا بوجھ ہے کہ بس۔مجھے اسلام آباد آنے کی خاصی ضرورت ہے لیکن میں عید کے موقع پربھی آسکوں گا یانہیں کہنا مشکل ہے۔دشواری اور مجبوری کی نوعیت وہی مالی ہے۔

اس دنیا میں انسانی نفرت کی ہزاروں بنیادیں ہیں۔ان میں سے ایک مذہب بھی ہے۔اگرچہ کوئی مذہب دوسرے مذاہب والوں سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا لیکن اب تک انسان اس فرق کی بناپربھی نفرت کیے بغیر رہ نہ سکا۔نفرت کا سب سے ہولناک پہلواس کی وہ شدت ہے جس کی بناپرانسان انسان کوآگ میں جھونک دیتا ہے۔ہلاک کردیناہی کیا کم تھا کہ انسان ہلاک کرنے کے لیے صرف قتل نہیں کرتا صرف Shoot نہیں کرتا بلکہ آگ میں جھونکنا ضروری سمجھتا ہے۔میری توسمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی ہولناک دُنیا بنانے کی ضرورت کیا تھی۔کیا انسانوں کے بغیر قدرت کا کام رک جاتا؟

میاں سلمان نے بی۔ایس۔سی پاس کرلیا۔انہوں نے I.C.M.A میں داخلہ لے لیا ہے۔کورس بہت مشکل ہے۔دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ میری بڑی بیٹی نے امسال MBBS کرلیا۔اب وہ پنڈی کے ایک اسپتال میں ہاؤس جاب کررہی ہے۔غرضیکہ میرے بچوں کی تعلیم کے مکمل ہونے میں کم ازکم ڈھائی سال اورلگیں گے۔

بسااوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب مجھ سے نہ زندگی چلے گی نہ نوکری لیکن مجبوری گھسیٹے لیے جاتی ہے۔

آپ غالباً ہفتے دوہفتے میں ایک مرتبہ I-10/2 جاتے ہوں گے۔آج کل کن لوگوں کے ساتھ آپ کا ملنا جلنا رہتا ہے؟ادبی فضا کیسی جا

رہی ہے؟ اوپن یونیورسٹی سے کسی قسم کا تعلق ہے یا نہیں۔ لکھنے لکھانے کی رفتاری کیسی ہے۔
کبھی کبھار خط لکھتے رہیئے۔ آپ کے خطوں سے تقویت ہوتی ہے۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۳ جنوری ۱۹۹۴ء

اکبر حمیدی صاحب السلام علیکم

'قد آدم' پر اپنا مضمون اسلام آباد کے انگریزی اخبار پاکستان آبزرور کو دے آیا تھا لیکن چونکہ ان لوگوں نے اس اخبار میں میرے لکھنے کا دن مقرر نہیں کیا۔ اس لیے عملاً میں نے ان سے تعلق ختم کر لیا ہے۔ اب اپنا مضمون دیکھنے کے لیے ہر روز اُس اخبار کے حصول کے چکر میں کہاں تک وقت ضائع کروں۔ یہاں واپس آنے کے بعد میں نے 'قد آدم' سے متعلق مضمون 'دی نیوز' میں بھیج دیا۔ کل وہ شائع ہو گیا۔ اب نیوز مجھے باقاعدگی کے ساتھ ہر ہفتے شائع نہیں کرتا لیکن وہ جب بھی شائع کرتا ہے تو سنیچر ہی کے دن کرتا ہے۔ اس کا ادبی صفحہ سنیچر کو شائع ہوتا ہے۔ Space کی کمی کے باعث ایڈیٹر انچارج نے میرے اس مضمون کے کچھ حصے حذف کر دیئے۔ پھر بھی اہم باتیں محفوظ رہیں پرنٹنگ کی کچھ غلطیاں ضرور ہیں۔

میں بیٹی کی شادی کے سلسلے میں ۴ فروری (جمعہ) کو کسی وقت (ابھی تک ہوائی جہاز کا ٹکٹ نہیں لے سکا ہوں اس لیے معلوم نہیں کہ اسلام آباد کس وقت پہنچوں گا) اسلام آباد پہنچ رہا ہوں۔ بارہ دنوں کی چھٹی مانگی ہے۔ ابھی درخواست منظور ہو کر نہیں آئی۔

غالباً میں نے آپ سے ذکر کیا تھا کہ یکم جنوری ۱۹۹۴ء سے ہمدرد میں میری ملازمت ختم ہو گئی تھی۔ شکر ہے کہ بعض احباب کی کوششوں کی بدولت یہ ملازمت بحال ہو گئی ہے۔ جنوری ۷ دسمبر ۹۴ تک کا کنٹریکٹ مل گیا ہے۔ یہ باتیں اپنے تک رکھیں تو بہتر۔

یقین ہے کہ میرے اسلام آباد آنے سے پہلے تقریب کا کارڈ آپ تک پہنچ جائے گا۔ بیگم کے ساتھ ۸ فروری کی شام کے ساڑھے سات بجے مرگلہ ہوٹل (نزد اسپورٹس کمپلیکس آبپارہ) تشریف لائے گا۔ میری بیگم کا خیال ہے کہ کارڈ بہت پہلے بھیج دینے سے لوگ بھول جائیں گے کہ فلاں تقریب میں شریک ہونا ہے۔

مجھے اوراق کا تازہ شمارہ مل گیا تھا۔ میں اپنی اُلجھنوں اور مصروفیتوں کے باعث وزیر آغا صاحب کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا ہوں اور سب بدستور۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۴/ جنوری ۱۹۹۴ء

برادرم کل شام آپ کا خط مورخہ ۱۸ جنوری ملا۔ میں نے کل ہی آپ کے نام ایک خط روانہ کیا ہے جس کے ہمراہ 'دی نیوز' میں چھپا ہوا 'قد آدم' پر تبصرہ بھی بھیجا گیا ہے۔ 'پاکستان آبزرور' نے اسے شائع کیا یا نہیں خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ اب ہر روز اخبارات کی دکان پر جا کر کون دیکھے کہ تبصرہ چھپا یا نہیں۔ 'دی نیوز' کے ادبی صفحے کا دن مقرر ہے۔ میں نے اسلام آباد سے واپس آنے کے بعد آپ کی کتاب کا تبصرہ 'نیوز' کو بھیج دیا تھا۔ پرسوں (۲۲ جنوری) وہ شائع ہو گیا۔

اسلام آباد سے واپس آنے کے بعد میں ۱۷/ جنوری تک ہمدرد والی ملازمت کے معاملے میں اُلجھا رہا۔ یہ ملازمت ختم ہو گئی تھی۔ بڑی مشکلوں سے بحال ہوئی ہے۔

اس دوران میں میں نے رفیق سندیلوی کو ایک خط لکھا اور ایسا خیال آتا ہے کہ شاید میں نے انھیں لکھا کہ وہ آپ کو مطلع کر دیں کہ آپ کی کتاب کی دونوں جلدیں مجھے مل گئی تھیں۔ میں نے مشفق خواجہ کو آپ کی کتاب پہنچا دی تھی۔ انہوں نے آپ کو رسید نہیں بھیجی۔ اب آپ اپنی کتاب کے حوالے سے ان کے ساتھ رابطہ قائم کر لیں۔

میں نے آپ کی کتاب کی دونوں جلدیں 'ڈان' کو بھی بھجوا دی تھیں اور یہ تجویز بھی پیش کر دی تھی کہ اگر مجھ سے 'ڈان' کے لیے تبصرہ لکھنے کے

لیے کہا جائے تو میں تبصرہ لکھ دوں گا لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا ہے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ۲۹ جنوری کو میرا تبصرہ حلقہ اربابِ ذوق میں پڑھا جائے گا۔ ترجمہ غالباً خود آپ نے کیا ہوگا۔ میں ۴ فروری کو اسلام آباد پہنچ رہا ہوں۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۶/اپریل ۱۹۹۳ء

برادرِ عزیز اکبر حمیدی صاحب السلام علیکم

کل آپ کی تازہ ترین کتاب 'مضامین غیب' ملی۔ کتاب کی طباعت پر دلی مبارکباد۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کے 'مضامین غیب' کے موضوعات بالکل اُبھرتے ہوئے شعرا اور ادبا ہیں۔ بجز میرے کہ میں ڈوبتے ہوئے بلکہ ڈوب جانے والے اہلِ قلم میں سے ہوں۔ آپ نے اپنے خیالات کو مضامین غیب کا درجہ دے کر بڑی ہمت سے کام لیا ہے۔ آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو۔ آپ نے جس خوش اسلوبی سے مجھے انشائیہ نگار ہونے سے بچانے کی کوشش کی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا شکریہ کیونکر ادا کروں۔ آپ نے میری خودنوشت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے لیے تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

مشفق خواجہ صاحب یوں تو بہت سی کتابوں کے دیباچے اور فلیپ لکھتے رہے ہیں لیکن یہ معاملہ بالکل ان کی مرضی کا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں وہ اپنی آزادی اور اختیار دونوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔

آپ اس بات کا قطعی افسوس نہ کریں کہ آپ میرے لیے احباب کو جمع نہ کر سکے۔ بھابی جان کی علالت کا جان کر نہایت افسوس ہوا۔ خدا کرے وہ جلد صحت یاب ہو جائیں۔ میں آپ کی کتاب پر اردو یا انگریزی میں تبصرہ لکھوں گا لیکن اس میں دیر ہوگی۔

یہاں آپ کے لکھنے والے احباب میں جس کو آپ مناسب سمجھتے ہوں کتاب بھیج کر لکھنے کی فرمائش کریں۔

اگر میری خودنوشت مجھے واپس مل جاتی تو عنایت ہوتی۔ یہ طے ہے کہ آئندہ میری جو کتاب بھی چھپے گی وہ آپ تک پہنچتی رہے گی۔

اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

مخلص نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۹/جولائی ۹۳ (کراچی)

بھائی اکبر حمیدی طویل عرصے کے بعد آپ کا خط مورخہ ۷ جولائی ملا۔ دنیا میں ہم خیال لوگ کم ہوتے ہیں۔ تھوڑی بہت ہم خیالی ہر ملنے والے کے ساتھ ہوتی ہے۔ مکمل طور پر ہم خیالی تو میرے آپ کے درمیان بھی نہیں ہے لیکن میرا آپ کا اندازِ فکر یکساں وسعت اور کشادگی رکھتا ہے اور یہ چیز اور بھی کم یاب ہے۔

یہ آپ کی محبت ہے کہ میرے بغیر آئی ٹن ٹو میں آپ کا دل آنے پر آمادہ نہیں ہوتا یا یہ کہ آپ آتے ہیں تو میری کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ ایک شہر میں دو ہم خیال بھی مل جائیں تو غنیمت ہے۔

میں آپ کی کتاب پر تبصرہ لکھ کر نیوز کے پاس بھیج چکا ہوں۔ اُمید ہے کہ اگست میں کسی وقت شائع ہو جائے گا۔ اب زاہد کا ترجمہ کر کے اسے ادبیات کے لیے بھیجنا سو یہ کام محنت طلب بھی ہے اور وقت طلب بھی۔ میں محنت سے تو نہیں ڈرتا لیکن وقت کہاں سے لاؤں۔ بہرحال پہلے آپ یہ دیکھ لیں کہ میرے تبصرے کا اردو میں ترجمہ ہونا بھی چاہیے یا نہیں۔

کیا آپ کا کالج Nationalised ہو گیا؟ اے جی پی آر سے تنخواہ لینے کے معنی تو غالباً یہی ہیں۔ آپ کے داماد کو کوئی معقول ملازمت ملی کہ نہیں؟

دسمبر ۹۳ تک میرا ارادہ اسلام آباد آنے کا نہیں ہے۔ آنے جانے میں بڑا خرچ ہے۔ سفر کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے محنت سے کمائے ہوئے روپے عیاشی میں اُڑا دیئے۔

مشفق خواجہ کو آپ کا سلام پہنچ جائے گا۔

اُمید ہے کہ آپ سب لوگ بخیریت ہوں گے۔ ذرا رفیق سندیلوی سے فون پر کہیے کہ میرے خط کا جواب دیں اور فاروق ملک کے حوالے سے بھی صورتِ حال بتائیں۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۱۷/اگست ۹۳

بھائی حمیدی السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ .... ملا۔ ممنون ہوں کہ آپ نے رفیق سندیلوی کو میرا پیغام پہنچا دیا' مگر ان کا خط ابھی تک نہیں آیا۔ براہِ کرم انھیں ایک مرتبہ اور تاکید کر دیں یعنی ان سے کہہ دیں کہ میں ان کے خط کا بیتابی سے انتظار کر رہا ہوں اور یہ کہ وہ فاروق ملک کے حوالے سے کوئی اطلاع ضرور دیں۔

نیوز والے بعض اوقات کسی بنا پر میرا مضمون شائع نہیں کر پاتے حالانکہ ان سے معاہدہ یہی ہے کہ وہ ہر سنیچر کو میرا مضمون شائع کریں گے۔ بعض اوقات سنیچر کو ان کے ہاں وہ صفحہ نہیں ہوتا جس میں میرا مضمون ہوتا ہے۔ اس صفحے کا نام Book World ہے۔ بہر حال مضمون جوں ہی شائع ہوگا اس کی فوٹو کاپی آپ کے پاس بھیج دوں گا۔

اُمید ہے کہ آپ ہر طرح سے بخیریت ہوں گے۔ میری سہولت کے لیے اپنے ہر خط میں اپنا پتا لکھ دیا کریں۔

بھائی یہ رزمی صاحب کو کون سا مرض لے ڈوبا؟

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۴-۳-۹۴

بھائی اکبر حمیدی السلام علیکم پرسوں میں نے رفیق سندیلوی کو خط لکھا جس میں ان سے آپ کو یہ پیغام پہنچانے کی خواہش کی گئی کہ مجھے جوابی خط لکھنے میں نسبتاً زیادہ سہولت محسوس ہوتی ہے۔ حسن اتفاق سے پرسوں ہی آپ کا خط مورخہ ۲۷ فروری (حیرت ہے کہ اس خط کو مجھ تک پہنچنے میں ایک مہینہ لگا) ملا۔

میرے لیے اس اخبار کا پتا کرنا ناممکن ہے جسے میں نے ہوائی جہاز میں دیکھا تھا۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میری ادھوری اطلاع سے آپ کو اتنی پریشانیاں ہو رہی ہیں۔ کیا اب تک آپ کی کتاب پر انگریزی میں کوئی ایسا مضمون چھپا ہے جس میں آپ کی تصویر بھی ہو؟ اس مضمون میں آپ کی تصویر تو ضرور ہی تھی۔

یہ بات آپ نے اب بتائی ہے کہ افتخار عارف نے آپ کے اس جملے کا بہت بُرا مانا ہے جس میں آپ نے میرے اسلوب کو رشید احمد صدیقی کے اسلوب سے بہتر کہا ہے لیکن آپ نے اب بھی یہ نہیں بتایا کہ اس سلسلے میں افتخار عارف کہہ کیا رہے ہیں۔ براہِ کرم ان کا اعتراض ضرور لکھیے۔

میرا خیال ہے کہ آپ کی اس رائے سے شاید ہی کوئی اتفاق کر سکے۔ خود میں بھی اتفاق نہیں کرتا لیکن میں اس بات کے حق میں ہوں کہ ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔

اسلوب کے اعتبار سے میں رشید احمد صدیقی کو اردو ادب کے پہلے پانچ بہترین اور عظیم ترین انشا پردازوں میں شمار کرتا ہوں۔ بہترین کے معاملے میں ہر شخص کی الگ الگ فہرست ہو سکتی ہے۔ میری فہرست (صرف اسلوب کے اعتبار سے دس کی حد تک سر دست یہ ہے) آئندہ کیا ہوگی

معلوم نہیں: (۱)۔غالب' (۲)۔شبلی' (۳)۔محمد حسین آزاد' (۴)۔رشید احمد صدیقی' (۵)۔نیاز فتح پوری (مکتوبات نیاز کے حوالے سے)' (۶)۔ابوالکلام آزاد (غبار خاطر اور سورہ فاتحہ کی تفسیر کے حوالے سے)' (۷)۔مشتاق احمد یوسفی' (۸)۔مختار مسعود' (۹)۔مرزا رسوا (امراؤ جان ادا کے حوالے سے)' (۱۰)۔سجاد انصاری (ان کی صرف ایک کتاب ہے 'محشر خیال')

ان کے علاوہ اردو ادب نے اور بہت اچھے اچھے نثر نگار پیدا کیے ہیں لیکن میرے نزدیک فی الحال دس بہترین یہی ہیں۔

مشفق خواجہ کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات یہ ہیں کہ (۱)۔ان دنوں وہ Pride of Performance (جس کا ترجمہ حسن کارکردگی ہے۔ادیبوں کا تعلق حسن کارکردگی ہی سے ہوتا ہے نہ کہ حسن اعمال سے) لینے کے لیے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔کل انہوں نے یہ تمغہ لے لیا ہوگا۔(۲)۔۲۳ مارچ کے رسالہ تکبیر سے انہوں نے دوبارہ کالم نگاری شروع کردی ہے۔اب وہ اپنے کالم میں آپ کی کتاب پر تبصرہ بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ انھیں ایسا کرنے پر مجبور کردیں۔اس معاملے میں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا اور اگر دخل دوں گا تو نتیجہ خراب تر ہی ہوگا۔

اگر ممکن ہو تو فون پر رفیق سندیلوی کو بتادیجئے کہ مجھے ان کا خط مل گیا ہے۔جواب لکھوں گا۔باقی آئندہ

ادبیات کے کسی تازہ شمارے میں میرے تبصرے ہوں تو یاسر سے کہیے کہ پرچہ میرے نام کراچی بھیج دیں۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۷نومبر ۱۹۹۴ء

بھائی اکبر حمیدی صاحب السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۲۸/۱۰ اکتوبر مل گیا تھا۔جواب تاخیر سے جارہا ہے۔میں اسلام آباد میں علالت کے باعث اکیڈمی کے پہلے اجلاس کے سوا کسی اور اجلاس میں شریک نہ ہوسکا اور ۱۵/۱۰ اکتوبر کو کسی قدر علالت کے باوجود کراچی واپس آ گیا۔ہاؤس بلڈنگ کی جو مصیبت آئی اسے جھیلتے ہی بنی۔جب تک میں اسلام آباد میں رہا ماہانہ قسط کسی نہ کسی طرح دیتا رہا۔اب وہاں کا معاملہ بیٹے کے ہاتھ میں ہے۔وہ ایک سال تک قسطیں ادا نہ کرسکا۔نتیجتاً سود بہت چڑھ گیا۔نوٹس یہ آیا کہ ایک ہفتے کے اندر واجبات ادا کرو ورنہ مکان نیلام کردیا جائے گا۔ذاتی طور پر خود میں ایک متعلقہ آفیسر سے ملا کہ دو مہینے کی مہلت دے دیں۔میں نے یہ بھی کہا کہ میں اس ملک کا جانا پہچانا Writer ہوں۔وعدہ خلافی نہیں ہوگی لیکن سرکاری دفتروں میں ادیبوں اور شاعروں کا کوئی لحاظ اور احترام نہیں ہے۔زیادہ سے زیادہ رعایت یہ ملی کہ 36 ہزار میں سے 18 ہزار ایک ہفتے کے اندر ادا کردو۔ایسا کرنا پڑا۔آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ 18 ہزار کے انتظام میں مجھ پر کیا کچھ گزر گئی ہوگی۔چونکہ آپ سیالکوٹ چلے گئے اس لیے آپ سے مدد لینا ممکن نہ ہوسکا۔

'نیرنگِ خیال' کا وہ پرچہ جس میں آپ کی کتاب پر میرا تبصرہ ہے ڈاک کی بدنظمی کی نذر ہوگیا۔البتہ ڈاکٹر وحید قریشی نے 'اقبال ریویو' معاوضے (100 روپے) کے ساتھ بھیج دیا۔

حبیب فخری نے ذکی کی شاعری پر جو کچھ لکھا اس کے لیے ان سے باز پرس کی گئی کہ کتاب کی دو جلدوں کے بغیر کیوں لکھا گیا۔ویسے سلطان رشک جب مجھ سے ملتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ پرچہ برابر بھیج رہا ہوں۔اگر آپ ستمبر کا 'نیرنگ خیال' دوبارہ بھیج سکیں تو بھیج دیں۔

انتظار حسین کبھی کبھی ڈان کراچی میں اور غالباً کسی اور انگریزی اخبار میں بھی لکھتے ہیں۔اگر نظر آیا تو ان کا تبصرہ بھیج دوں گا۔

اِدھر وزیر آغا صاحب سے ایک ادبی معاملے میں مراسلت ہو رہی ہے۔کل ان کی کتاب 'ساختیات اور سائنس' آئی ہے۔اُنہوں نے 'قد آدم' میں مجھ سے متعلق آپ کے خاکے پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور حالات بدستور۔ذرا رفیق سندیلوی سے فون پر کہیے کہ مجھے اُن کے خط کا انتظار ہے۔

نظیر صدیقی

☆☆☆

۶/دسمبر ۱۹۹۴ء

بھائی اکبر حمیدی السلام علیکم کل آپ کا بھیجا ہوا 'نیرنگِ خیال' ملا جس میں مجھ پر آپ کا شخصی خاکہ اور مرحوم ذکی آذر کی کتاب' حاصل

سفر' پر حبیب فخری کا تبصرہ ہے۔ آپ نے یہ پرچہ پہلے بھی بھیجا تھا۔ مگر وہ نہیں پہنچا۔ دوبارہ زحمت کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ بہت دنوں سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ غالباً مجھ پر آپ کے کسی خط کا جواب تو باقی نہیں ہے۔

کراچی کے حالات بد سے بدتر کی طرف رواں ہے۔ میں یہ خط لکھ رہا ہوں اور آس پاس سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ دفتر کے لوگ کھڑکیوں سے فائرنگ کرنے والوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہر روز کم سے کم آٹھ دس آدمیوں کو شہادت کے درجے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال حکومت کی کمزوری اور خرابی کا نتیجہ تو ہے ہی لیکن وہ جس نے انسانوں کی 'شرافت' کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود یہ دنیا پیدا کی اس کے بارے میں کیا کہا جائے؟

کیا اس صورتِ حال کے ہوتے ہوئے ہمیں مذہب کا نام لینے کا کوئی حق ہے۔ کیا اسلامی جمہوریہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے؟

مَیں نے اپنے آپ سے متعلق آپ کا خاکہ دوبارہ پڑھا۔ اپنی خصوصیات کو آپ کی تحریر کے آئینے میں منعکس دیکھ کر لطف آیا اور حیرت ہوئی کہ آپ میرے بارے میں کتنی باتوں کو Mark کرتے رہے۔

آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ مصروفیات کا کیا حال ہے؟ کن لوگوں سے ملاقات رہا کرتی ہے؟ ادبیات کا تازہ شمارہ تو آپ کی نظر سے گزرا ہوگا؟ کبھی فرصت ہو تو خط لکھیں۔ مَیں مستقبل قریب میں اسلام آباد آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۶/دسمبر ۱۹۹۴ء

برادرِ عزیز اکبر حمیدی صاحب السلام علیکم پرسوں یعنی ۲۴/دسمبر کو آپ کا خط مورخہ ۱۷/دسمبر ملا۔ چونکہ آپ نے بڑی تاکید کی ہے کہ جواب جلد لکھوں اس لیے جواب لکھ رہا ہوں ورنہ ان دنوں میں کئی طرح کی اُلجھنوں میں مبتلا ہوں اور جواب خط کے لیے اپنے ذہن کو صحیح حالت (Frame) میں نہیں پا رہا ہوں۔ ہمدرد کی ملازمت جو سالانہ کنٹریکٹ (جنوری سے دسمبر تک) کی بنیاد پر چلتی ہے۔ اس کے بارے میں ابھی تک معلوم نہ ہو سکا کہ جنوری ۱۹۹۵ء سے دسمبر تک میرے کنٹریکٹ کی تجدید ہوگی یا نہیں۔ امکانات دونوں طرح کے ہیں۔ پھر کچھ مسائل ایسے رونما ہو رہے ہیں کہ ان کی بنا پر میرا اسلام آباد واپس آ جانا ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مَیں کتنے زبردست ڈرامائی Tension میں ہوں۔

بہرحال یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اپنے نام ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط کا مجموعہ شائع کر رہے ہیں۔ میرے نام انتساب میری عزت افزائی کا باعث تو ضرور ہے لیکن اس کا اندازہ کر لیجیے گا کہ یہ انتساب کسی اعتبار سے آپ کے لیے وجہ نقصان نہ ہو۔ ادھر کچھ مدت سے آغا صاحب اور میرے درمیان بھی مراسلت کا سلسلہ جاری ہے۔ انہوں نے 'اوراق' کا تازہ شمارہ اور دو کتابیں بھی بھجوائیں اور تیسری بھجوانے والے ہیں۔ **'امجد کی حیات معاشقہ'**

جہاں تک آپ کی کتاب کے نام کا تعلق ہے تو نام تو مَیں اپنے بچوں کے بھی ٹھیک سے رکھ نہ پایا۔ آپ کی کتاب کا بھلا سا نام کس طرح بتاؤں؟ دو ایک نام جو فوری طور پر ذہن میں آئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱)۔ ڈاکٹر وزیر آغا بنام پروفیسر اکبر حمیدی (۲)۔ واں سے آیا ہے جوابِ خط کوئی سنیو ذرا

(۳)۔ مکالمہ بذریعہ مراسلہ (۴)۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور اکبر حمیدی کی مراسلاتی گفتگو

مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی نام بھی آپ کو پسند نہ آئے گا۔ اس معاملے میں خود آپ کی کاوش بہتر نتیجہ پیدا کرے گی۔

رفیق سندیلوی کو پیغام پہنچانے کا شکریہ۔ آپ مشفق خواجہ کے رویے سے کیوں اُلجھ رہے ہیں؟ بھول بھی جائیں ان باتوں کو جو ہوا سو ہوا۔

اور سب بدستور۔ آپ کے پاس میری کتاب 'نامے جو مرے نام آئے' ہے کہ نہیں؟

آپ کا نظیر صدیقی

مکاتیبِ نظیر صدیقی بنام تحسین فراقی

تحسین فراقی

ایک اک کر کے ستاروں کی طرح ڈوب گئے
ہائے کیا لوگ مرے حلقۂ احباب میں تھے

ستاروں کی طرح ابھی ڈوب جانے والوں میں میرے بزرگ دوست اور صاحبِ نظر نقاد نظیر صدیقی (م ۲۰۰۱ء) بھی تھے۔ میری ان کی مراسلت جولائی ۱۹۷۸ء میں شروع ہوئی جب مَیں ڈاکٹریٹ کے لیے پر تول رہا تھا۔ مراسلت کا یہ سلسلہ' گمان ہے' کہ اوائل ۲۰۰۱ء تک چلا ہوگا مگر افسوس کہ اپنے ذخیرۂ مکاتیب میں میرے نام ان کا آخری مکتوب ۲۰/دسمبر ۲۰۰۰ء کا ہے۔ اس کے بعد کا کوئی خط نہیں ملا۔ اللہ بخشے مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ دوستوں کے دوست' مجلس آرا' خوش مذاق' مطالعہ بہت عمدہ تھا۔ اردو ادبیات کے علاوہ انگریزی ادب اور علوم مختلفہ پر بڑی اچھی نظر تھی۔ کولن ولسن کے ساتھ ان کی مراسلت شایع ہو چکی ہے۔ ایک مدت تک ''The News'' کے لیے کالم لکھتے رہے۔ ان کالموں کے ایک سے زیادہ انتخاب شایع ہو چکے ہیں۔

مَیں ان کے علمی مقام سے پہلی بار اس وقت آگاہ ہوا جب اپنے زمانہ طالب علمی میں ان کی کتاب ''تاثرات و تعصبات'' میرے ہاتھ لگی خصوصاً اس میں یگانہ پر اُن کا مضمون آج بھی یگانہ شناسی کے باب میں اہم گردانا جا سکتا ہے۔ بعد میں تو جب ان سے باقاعدہ خط و کتابت شروع ہوئی تو انھوں نے کم و بیش اپنی ہر تصنیف سے نوازا اور مَیں ان سے بقدرِ ذوق و ظرف مستفید ہوتا رہا۔

ان سے ملاقاتیں تو بہت رہیں مگر سودا سیمی نار میں شرکت کے لیے ان کے ساتھ دتی کا ایک سفر میرے لیے بیک وقت خوشگوار اور تاسف انگیز یاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سفر میں ڈاکٹر ایوب مرزا ہمارے ہم سفر تھے۔ لاہور سے دتی تک کا یہ سفر اور پھر وہاں آٹھ نو روز کا قیام آج بھی حافظے کے اُفق پر چمکتا ہے تو یادوں کے مصوّر اوراق لَو دینے لگتے ہیں۔ اسی سفر کے دوران وہ شدید بیمار ہوئے اور یہی شدید بیماری بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی۔ تفصیل پھر کبھی۔

میں نے اپنے نام نظیر صدیقی کے تمام خطوط میں سے زیر نظر ۳۲ خطوں کا انتخاب کیا ہے۔☆ یہ خط جہاں ایک طرف اپنے اندر علمی شان رکھتے ہیں وہیں ان سے نظیر صدیقی مرحوم کی شخصیت اور سوانح کے متعدد اہم اور دلچسپ پہلو بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی ان پر مختصر حواشی کا اہتمام کیا گیا ہے۔

خطوط

۲۰/دسمبر ۱۹۸۰ء

فراقی صاحب محترم' تسلیم عنایت نامہ مل گیا تھا۔ 'گلبانگ حرم' کی تقریظ[1] کے لیے آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ نقش جلد دوم کے دیباچے میں بھی آپ کا شکریہ ادا کروں گا۔ آپ کے پاس رشید صاحب کے جو دوسرے مضامین ہیں ان کے عنوانات سے مطلع فرمائیے۔ ممکن ہے ان میں سے بعض پہلے سے میرے پاس موجود ہوں' جو نہ ہوں گے ان کے لیے آپ کو زحمت دوں گا۔

☆۔ کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کے پیش نظر فی الحال ۱۵ خطوط شاملِ اشاعت کیے جا رہے ہیں۔ (ج۔ح۔ج)

(۱)۔ یہ تقریظ رشید احمد صدیقی کے قلم سے ہے۔ مرحوم نظیر صدیقی ان دنوں رشید احمد صدیقی کی متفرق تحریریں جمع کر کے شایع کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں ''نقش ہائے رنگ رنگ'' شایع ہو چکی تھی۔ اسی کو دوسری جلد میں شائع کرنے کے لیے میں نے انھیں زائرِ حرم حمید لکھنوی کی ''گلبانگ حرم' کی تقریظ روانہ کی تھی۔

میں ۲۵/دسمبر کو پی آئی اے (۱/۲-۱-۱۲ بجے دن) کے ذریعے لاہور سے دلّی جارہا ہوں۔ وہاں ۲۶، ۲۷ اور ۲۸ دسمبر کو غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِاہتمام غالب پر بین الاقوامی سیمینار منعقد ہورہا ہے۔ اگر لاہور سے جاتے یا آتے وقت موقع مل سکا تو آپ سے اور عطاء الحق قاسمی صاحب سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اگر ممکن ہو تو آپ نوائے وقت لاہور میں میرے دلّی جانے کی خبر شائع کرادیں۔ واپسی جنوری کے پہلے ہفتے میں ہوگی۔

اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ جواب میں تاخیر کے لیے معافی چاہتا ہوں۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۰/جنوری ۱۹۸۱ء (اسلام آباد)

فراقی صاحب السلام علیکم میں ۸ جنوری کو دلّی سے واپس آیا تو آپ کا خط ملا۔ 'تخلیقی ادب' کا دیدار دلّی میں ہوچکا تھا۔ شہرتِ بخاری سے متعلق آپ نے مجھے جس غلطی سے مطلع کیا ہے۔ اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں اور شہرت بخاری صاحب سے معذرت خواہ۔

میں ابھی تک 'تخلیقی ادب' کا کوئی حصہ ٹھیک سے پڑھ نہیں سکا ہوں۔ بہرحال ورق گردانی ضرور کی ہے۔ آپ نے بڑی محنت سے مضمون لکھا ہے۔ اس کے جامع ہونے میں شبہ نہیں گو اس میں میرا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔[1]

آپ نے رشید احمد صدیقی کے جن مضامین کے عنوانات لکھے ہیں۔ ان میں سے کئی مضامین ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ بعض میری مرتبہ کتاب نقش ہائے رنگ رنگ جلد اوّل میں آگئے ہیں۔ بہت تھوڑے ایسے ہیں جو میری نظر میں ہونے کے باوجود فی الحال میری دسترس سے باہر ہیں۔ آپ کو شریک مرتب بنانے میں ایک عملی نزاکت مانع ہے۔ اگر آپ دیباچے میں شکریے پر قناعت کرسکیں تو میں آپ کے تعاون کے لیے شکرگزار ہوں گا۔

مصروفیت کے باعث جواب تاخیر سے جارہا ہے۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

مخلص نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۴ مئی ۱۹۹۵ء (اسلام آباد)

برادرم تحسین کل خلاف توقع آپ سے بہت اچھی ملاقات رہی۔ مَیں نے محسوس کیا کہ میرے آپ کے اندازِ فکر اور زاویۂ نگاہ میں خاصی مماثلت ہے۔

آپ کے لیے پانچ کتابیں بھیج رہا ہوں۔ دو اردو میں اور تین انگریزی میں۔

'حسرتِ اظہار' پر مَیں آپ کی خاص توجہ چاہوں گا۔ یوں تو مَیں ایک شاعر کی حیثیت سے بھی متعارف اور معروف ہوں لیکن میری تنقیدی شہرت نے میری شاعری کو نقصان پہنچایا ہے۔ اردو نقادوں کی شاعری نے بھی میری شاعری کو نقصان پہنچایا ہے۔ غالباً فراق کے علاوہ اردو کے تمام نقادوں کی شاعری بڑی حد تک مایوس کن ہے اور ان کی شاعری ان کی ادبی شخصیت کا ضمنی پہلو ہے۔ اگرچہ مَیں نے بھی اپنی شاعری کو اپنی خود اظہاریت کا تیسرا وسیلہ (Mediam) قرار دیا ہے لیکن میری شاعری میرا ضمنی مشغلہ نہیں بلکہ میری شخصیت کا ایک بنیادی پہلو ہے اور اگر اسے بے تعصبی کے ساتھ پڑھا جائے تو اس میں کم از کم ساٹھ ستر شعر اوّل درجے کے مل جائیں گے۔ پوری کتاب میں کوئی غیر معیاری شعر شاید ہی ملے۔ میری شاعری بعض ادبی عوامل اور غیر ادبی اسباب کی بنا پر نظر انداز ہوگئی ہے لیکن وہ اس سلوک کی مستحق نہیں ہے۔ مَیں آپ کے ذہن کو زبردستی اپنا طرفدار نہیں بنانا چاہتا کیونکہ آپ خود سخن فہم اور سخن شناس ہیں۔ اس لحاظ سے آپ میرے دعوے کی صداقت کو پرکھنے کے اہل ہیں۔ باقی لوگوں (ظفر اقبال جیسوں) کے متعلق مَیں اپنے دل میں صرف یہ کہہ کر خاموش رہتا ہوں کہ ع سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جاست۔ مَیں نے اپنے آپ کو شاعر منوانے کیلئے (مثال

(۱)۔ نظیر صدیقی کا اشارہ میرے اس مقالے کی طرف ہے جو ''اردو تنقید کے دس سال'' کے زیرِعنوان ''تخلیقی ادب'' (مرتبہ مشفق خواجہ) کی دوسری جلد میں شایع ہوا۔ یہ مضمون بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ بعدازاں یہ میری پہلی تنقیدی کتاب ''جستجو'' میں شایع ہوا۔

کے طور پر) یگانہ کی طرح نہ کوئی جہاد کیا ہے نہ کرنے کا ارادہ ہے۔ البتہ میں یگانہ ہی کی طرح اس بات کا قائل ضرور ہوں کہ ؎

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو

مَیں اپنی شاعری (اپنی دوسری ادبی کارگزاریوں کی طرح) کے معاملے میں حتی الوسع انکسار سے کام لیتا رہا ہوں لیکن اس احساس کے ساتھ کہ ؎

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر
توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

آپ میری کتابیں پڑھتے جائیں اور اپنے ردِعمل سے مطلع کرتے جائیں۔ عنایت ہوگی۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

یکم جولائی ۱۹۹۵ء (اسلام آباد)

برادر عزیز ڈاکٹر تحسین السلام علیکم

عنایت نامہ مورخہ ۲۵ جون مجھے ۲۶ جون کو مل گیا تھا۔ اس تفصیلی خط کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ آپ نے تفصیل کے ذریعے خط میں تاخیر کی تلافی کر دی ہے۔ 'اقبال اینڈ رادھا کرشنن' کو جتنی توجہ اور مثبت نقطہ نظر سے آپ نے پڑھا اس کی کوئی دوسری مثال میرے علم میں نہیں ہے۔[۱] میں نے یہ کتاب عجلت میں صرف اس لیے لکھ ڈالی کہ اس موضوع پر میرے خیالات کسی حد تک محفوظ ہو جائیں۔ میں جس شرح وبسط کے ساتھ یہ کتاب لکھنا چاہتا تھا نہ لکھ سکا۔ آخر میں یہ کرنا پڑا کہ اقبالؔ اور رادھا کرشنن پر مَیں نے مختلف اوقات میں جو مضامین لکھے تھے۔ انھیں کتابی شکل میں جمع کر دیا۔ صرف پہلے اور آخری باب میں کچھ تقابلی مطالعے کی فضا پائی جاتی ہے۔ انگریزی کے ترجمے سے خود مَیں بھی زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ اوّل تو زیادہ تر ترجمے دوسروں ہی کے ہیں۔ پھر یہ کہ یہ اُن لوگوں کے ترجمے ہیں جن کو انگریزی میں اپنے سے برتر سمجھتا رہا ہوں۔ اقبالؔ اور غالبؔ' والے مضمون کی شمولیت کا جواز صرف اتنا ہے کہ اس مضمون سے اردو میں اقبال کے مرتبے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے ذہن میں اس کتاب کے قارئین صرف اردو والے ہی نہیں وہ قارئین بھی تھے جن کا اردو ادب سے کوئی تعلق نہیں۔

اگر یہ کتاب آپ کو رادھا کرشنن کے تفصیلی مطالعے پر اُکساتی ہے تو اسے مَیں اپنی کامیابی تصور کرتا ہوں۔ رادھا کرشنن اپنے سارے محدودات کے باوجود نہایت عمدہ انسان' بہت اچھے مفکر اور انگریزی کے بہترین صاحب اسلوب اہل قلم تھے۔

آپ کو میری کتابوں میں 'میرے خیال میں' کی طلب کیونکر پیدا ہوئی؟ اس کتاب کا پاکستانی ایڈیشن مَیں فراہم نہیں کر سکتا البتہ ایک ہندوستانی ایڈیشن نذر کر سکتا ہوں مگر اس میں خرابی یہ ہے کہ ناشر نے میری اجازت کے بغیر اپنی صوابدید پر دو تین مضامین نکال دیے۔ لاہور میں ڈاکٹر سہیل احمد خاں کے پاس اس کتاب کا پاکستانی ایڈیشن ہو سکتا ہے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ ان سے مستعار لے کر پڑھنا آپ کے لیے ممکن ہوگا یا نہیں۔

آپ نے رادھا کرشنن کا جو پسندیدہ قول نقل کیا ہے وہ میرے علم میں ضرور تھا لیکن اُس وقت بھی یاد نہ آیا اور اب بھی یاد نہیں کہ یہ قول ان کی کس کتاب یا کس مضمون میں ہے۔[۲] اگر مجھے قول ٹھیک سے یاد ہوتا تو اسے ضرور شامل کر لیتا۔

اگرچہ پاکستان اور ہندوستان میں میری تحریروں کے کچھ قدرداں موجود ہیں لیکن عام طور پر مَیں Unrecognized رہا ہوں جس کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ میرا کسی ادبی حلقے یا لابی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ محمد علی صدیقی مجھے ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ حال میں مَیں انھیں اپنی نئی کتابیں

---

(۱)۔ میں نے نظیر صدیقی کی قابل قدر انگریزی تالیف ''اقبال اینڈ رادھا کرشنن'' سے متاثر ہو کر انھیں ایک تفصیلی خط لکھا تھا۔

(۲)۔ میں نے رادھا کرشنن کا یہ قول (جو میں نے معلوم نہیں کہاں پڑھا تھا) انھیں لکھ بھیجا تھا: ''ابن آدم نے پرندے کی طرف فضا میں اور مچھلی کی طرح سمندروں میں تیرنا سیکھ لیا مگر سطح زمین پر اسے انسان بن کے رہنا ابھی تک نہیں آیا۔''

دے کر آیا ہوں لیکن اس بے مروتی اور ناانصافی کا کیا جواب کہ انہیں گزشتہ ۴۵ سال کے تنقیدی مضامین میں میرا کوئی مضمون لائق انتخاب معلوم نہ ہوا۔
بہر حال میرا نقطہ نظر یہ رہا ہے کہ اگر میرے کام میں جان ہے تو آئندہ اس کا اعتراف ہو کر رہے گا اور اگر جان نہیں ہے تو آج بھی اس کا اعتراف نہیں ہونا چاہیے اور حالات بدستور۔ آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

مخلص نظیر صدیقی

مزید: کچھ اپنے نام کی وجہ تسمیہ بتائیے۔ شاید یہ آپ کا اپنا اختیار کردہ نام ہے۔

☆☆☆

۲۰ جولائی ۱۹۹۵ء (اسلام آباد)

بھائی تحسین فراقی اگر آپ کی نظیر نوازی کا یہی عالم رہا تو میں سمجھوں گا کہ میرے تعلقات تحسین سے نہیں فراقی سے ہیں۔
یہ صحیح ہے کہ آپ میری طرح ریٹائرڈ نہیں ہیں لہٰذا میرے مقابلے میں پچاس گنا زیادہ مصروف رہا کرتے ہیں' مگر پھر بھی۔
کراچی سے آئے ہوئے چھ مہینے ہو رہے ہیں۔ اس دوران میں کئی احباب اور شناسا داغ مفارقت دے چکے۔ خیال آتا رہتا ہے کہ مجھے بھی داغ مفارقت دینا ہے اور میری باری قریب آ چکی ہے۔
اس بنا پر خیال آپ کی اس تجویز کی طرف بھی جاتا رہتا ہے کہ آپ کی محبت آمیز نگرانی میں آپ کا کوئی ذہین اور باصلاحیت طالب علم میری بُری بھلی کارکردگی پر پی ایچ ڈی کے لیے کام کر لے۔ ابھی زندہ ہوں۔ معاون بھی ہو سکتا ہوں۔
آپ کی کتاب ماجد دریابادی اتنی اچھی ہے کہ اس پر کالم لکھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔[1] لیکن میری کالم نویسی میرے زندہ رہنے کا ذریعہ ہے لہٰذا اگر میں کسی دن ماجد دریابادی پر ایک بُرا سا کالم لکھ کر تھوڑا سا کسب معاش کر لوں تو آپ اس کا بُرا نہیں مانیں گے۔
اُمید ہے کہ آپ بمع اہلِ خانہ بخیریت ہوں گے۔

مخلص نظیر صدیقی

☆☆☆

۱۹/اگست ۱۹۹۵ء

محب عزیز السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۵/اگست مجھے ۱۷/اگست کو ملا۔ خوشی ہوئی کہ 'ماجد دریابادی' پر تبصرہ آپ کو پسند آیا۔ رشید احمد صدیقی کے صاحبِ اسلوب ہونے کے بارے میں آپ نے جو وضاحت کی ہے اس کے بعد میری شکایت تو جاتی رہی لیکن رشید صاحب کے باقی پرستاروں کی شکایت کیونکر دور ہوگی۔ ٹھیک اسی قسم کی فروگزاشت آپ سے آپ کے اُس تنقیدی جائزے میں بھی ہوگئی تھی جو مشفق خواجہ کے رسالہ 'تخلیقی ادب' میں شائع ہوا تھا۔ اس میں میرا نام تنقید نگاروں میں کہیں بھی نہ آنے پایا۔ آپ ذرا اپنے ذہن کا جائزہ لیں۔ آپ کو خدانخواستہ صدیقیوں سے کوئی لَکی تو نہیں ہے کہ آپ بعض صدیقیوں کو چاہنے کے باوجود ان کا نام لینا بھول جاتے ہیں۔
خیر یہ تو مزاح المومنین والی بات ہے۔ جہاں تک زندوں پر پی ایچ ڈی کی بجائے ایم فل کرانے کا تعلق ہے مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ پاکستان میں ضخامت کے اعتبار سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ اگر کوئی میرے جیتے جی مجھ پر پی ایچ ڈی یا ایم فل کر لے تو ممکن ہے اس کو مجھ سے کوئی قابلِ قدر مدد مل جائے۔ نہ جانے کیوں اب مجھ پر موت سے متعلق خیالات کی یورش رہا کرتی ہے۔

جیسا کہ آپ سے ملاقات کے دوران میں ذکر آیا تھا اردو میں میری کتابیں ایک درجن سے زائد ہیں اور انگریزی میں چار کتابیں چھپ چکی ہیں اور پانچویں (علامہ اقبال سے متعلق) ڈاکٹر وحید قریشی اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع کر رہے ہیں۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ کتاب

(۱)۔ اشارہ میری تصنیف ''عبدالماجد دریابادی — احوال و آثار'' کی طرف ہے جس پر نظیر صدیقی نے بڑا مفصل کالم لکھا۔

پریس کے حوالے ہو چکی ہے۔ اگر آپ کسی کو ناراض کیے بغیر (خصوصاً ڈاکٹر وحید قریشی کو) بقیہ مرحلوں کو Expedite کروادیں تو بڑی عنایت ہو گی۔ بہرحال یہ بات میرے اور آپ کے درمیان رہنی چاہیے۔

اگر آپ اپنی کتاب ''مطالعۂ بیدلؔ' کی ایک جلد میرے پاس بھیج دیں تو ممکن ہے مَیں بھی اس پر ایک تبصرہ لکھنے کی ہمت کروں۔ زینو صاحب کا کیا کہنا۔ عالم فاضل آدمی ہیں۔ ہمیشہ اچھا ہی لکھتے ہیں(۱)

آپ نے میری صحت اور زندگی کے لیے جو دُعائیں کی ہیں۔ ان کے لیے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

اپنی مصروفیتوں کے باوجود کبھی کبھار خط لکھتے رہیے۔ میں تو سفر گریز آدمی ہوں۔ آپ بہت زیادہ متحرک (Mobile) معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی عنوان سے اسلام آباد آنا ہو تو 413584 پر فون کر کے رابطہ ضرور پیدا کیجئے اور اگر ممکن ہو تو غریب خانے پر کسی وقت دال دلیا کھا لیجئے۔

مخلص نظیر صدیقی

☆☆☆

یکم اکتوبر ۱۹۹۵ء (اسلام آباد)

برادر عزیز ڈاکٹر تحسین سلام و نیاز آپ کی کتاب 'مطالعۂ بیدلؔ' اور خط مورخہ ۲۴ ستمبر ایک ساتھ ملے۔ کوشش کروں گا کہ 'مطالعۂ بیدلؔ' پر بھی 'نیوز' میں کچھ لکھ سکوں۔

'اقبال اکیڈمی' میں میری کتاب زیر طبع ہے لیکن ایک مدت سے پتا نہیں چل رہا ہے کہ اب وہ طباعت کی کس منزل میں ہے۔ اگر آپ Informally اپنے طور پر کچھ معلوم کر کے بتا سکیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ اگر مَیں ڈاکٹر وحید قریشی سے براہِ راست معلوم کرنے کی کوشش کروں تو وہ اس کا بُرا بھی مانیں گے اور حسبِ معمول خط کا جواب بھی نہیں دیں گے۔

شہزاد منظر کا مضمون میری نظر سے گزرا تھا۔ محمد علی صدیقی سے میرے ۲۵ سالہ تعلقات رہے ہیں۔ اس پر بھی اگر اُن کو میری خدمات یاد نہ آئیں تو کیا کہا جائے۔ سیاست کی طرح آج کل کے ادب میں بھی دیانت داری کا بڑا فقدان ہے۔

مجھ سے متعلق ایم فل کی جو تجویز آپ کے ذہن میں تھی وہ اب بھی ہے یا ۔۔۔ کام کرانا ہو تو شروع کرا دیں۔ اب زندگی زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔

دو تین دن ہوئے فیصل آباد سے وحید رضا بھٹی کا فون آیا تھا۔ آپ کا بھی بہت محبت آمیز تذکرہ رہا۔ وحید رضا میرے بہت اچھے کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ خدا انھیں ہر جگہ خوش رکھے۔

میرے لاہور آنے کا امکان تو حدِ نظر تک نظر نہیں آتا۔ البتہ آپ اسلام آباد آتے ہی رہتے ہیں:

شہر میں آتے ہی رہتے ہو اِدھر آیا کرو
کچھ عنایت ہم غریبوں پر بھی فرمایا کرو

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ خواجہ صاحب میری تنقیدی بصیرت کے بڑے معترف ہیں۔ ویسے وہ مجھ سے ہمیشہ اختلاف ہی کرتے رہتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ میرا دماغ خراب نہ ہو جائے اور بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ میری تنقید میری دماغی خرابی ہی کا نتیجہ ہے۔

ہاں میرے انگریزی کالموں کی تعداد خاصی ہوگئی ہے۔ Views and Reviews کی طرح پھر ایک کتاب بن سکتی ہے لیکن موجودہ بے روزگاری کی موجودگی میں کتاب کی طباعت کے بارے میں کیا سوچوں۔ کوئی ناشر تو ملنے سے رہا۔

مَیں چاہتا تھا کہ آپ میری کتاب 'حسرت اظہار' (۲) کو کم از کم ایک مرتبہ پڑھنے کی فرصت نکالیں۔

آپ کی اور کون کون سی کتابیں آرہی ہیں؟

مراسلت کا سلسلہ کسی نہ کسی حد تک جاری رہنا چاہیے۔

آپ کا نظیر صدیقی

(۱)۔ جناب صفدر میر نے ''Dawn'' میں میری تالیف ''مطالعۂ بیدلؔ فکر برگساں کی روشنی میں'' پر مقالہ نما کالم لکھا تھا۔ اسی طرف اشارہ ہے۔
(۲)۔ نظیر صدیقی کا شعری مجموعہ مرحوم اپنے اس اکلوتے شعری مجموعے کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور شاکی رہتے تھے کہ اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔

☆☆☆

۱۰/اکتوبر ۱۹۹۵ء (اسلام آباد)

برادر عزیز ڈاکٹر تحسین السلام علیکم

آپ کی کتاب 'مطالعۂ بیدلؔ' کی رسید اور آپ کے خط کا جواب بھیج چکا ہوں۔ اُمید ہے کہ مل گیا ہوگا۔

مَیں نے آپ کو ایک خصوصی زحمت دی ہے کہ اگر ممکن ہو تو آپ اپنے تعلقات سے کام لے کر یہ معلوم کریں کہ اقبال اکیڈمی میں میری کتاب Iqbal: In his varied aspects طباعت کی کس منزل میں ہے۔ یہ بات بالکل بر سبیل تذکرہ معلوم کریں اور جو کچھ معلوم ہو سکے مجھے بتائیں اور اس اَمر کا کسی سے ذکر نہ کریں۔ یہ معاملہ بالکل (سوفی صد) رازدارانہ رہنا چاہیے۔ مَیں نے آپ پر پورے اعتماد کی بنا پر آپ کو یہ زحمت دی ہے۔

رفتہ رفتہ آپ کی بڑی خوبیاں مجھ پر منکشف ہوتی جا رہی ہیں۔ آپ اردو ادب کے ایک ممتاز معلم ہونے کے علاوہ ایک ممتاز محقق اور ایک قابلِ احترام نقاد تو ہیں ہی 'مطالعۂ بیدلؔ' اور 'ماجد دریابادی' کے مطالعے سے مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا ہے کہ قدرت نے آپ کو فلسفیانہ غور و فکر کی صلاحیت سے بھی نوازا ہے۔ آپ کے اندر فلسفے کے مابعد الطبیعیاتی مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ نمایاں ہے۔

کراچی میں میرے ایک بزرگ دوست ہیں محبّ عارفیؔ خاصے جانے پہچانے شاعر ہیں اور شاعر سے زیادہ ایک چھپے ہوئے Metaphysian۔ ان کے فلسفیانہ مضامین کا ایک مجموعہ 'شعریات: مسلک معقولیت' حال میں شائع ہوا ہے۔ مَیں انھیں خط لکھ رہا ہوں کہ وہ آپ کے پاس اس کتاب کی ایک جلد جلد سے جلد بھیج دیں اور آپ سے گزارش ہے کہ آپ اپنی کتاب 'مطالعۂ بیدلؔ' کی ایک جلد ان کے پاس بھیج دیں۔ آپ ان کی کتاب پڑھ کر[1] ایک تفصیلی تبصرہ کریں لیکن اس سے پہلے ان سے خطوں میں کچھ تبادلۂ خیال کریں۔ ان کی معذوری یہ ہے کہ ان کی آنکھوں میں روشنی بہت کم رہ گئی ہے۔ لہٰذا وہ نہ زیادہ پڑھ پاتے ہیں نہ لکھ پاتے ہیں۔ اس خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔

مخلص نظیر صدیقی

☆☆☆

۳۰/اکتوبر ۱۹۹۵ء

محبّ عزیز ڈاکٹر تحسین صاحب السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۲۳/اکتوبر مجھے ۲۷/اکتوبر کو ملا۔ نہایت ممنون ہوں کہ آپ نے میری انگریزی کتاب کے بارے میں مطلوبہ اطلاع فراہم کر دی۔ خدا کرے آپ کے اندازے کے مطابق کتاب ہفتے عشرے میں مجھ تک پہنچ جائے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال اکیڈمی کے دستور کے مطابق اس کتاب کے سلسلے میں مجھ سے جو شرائط منظور کرالی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مجھے حق تصنیف کے طور پر چھ جلدیں ملیں گی۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ چھ جلدوں میں اپنے لیے کیا رکھوں اور مشفق خواجہ اور آپ جیسے عزیز اور محترم دوستوں کو کتابیں کس طرح نذر کروں۔ شاید آپ اپنے تجربے کی بنا پر بتا سکیں کہ اقبال اکیڈمی مصنف کو اس کی کتاب اگر رعایتی قیمت پر دیتی ہے تو وہ رعایتی قیمت مقررہ قیمت کا کتنا فی صد ہوتا ہے۔ مجھے رعایتی قیمت پر کچھ جلدیں خریدنا ہی ہوں گی۔ ویسے اگر قریشی صاحب سے آپ کے تعلقات قدرے بے تکلفانہ ہوں تو آپ ان سے یہ کہہ کر میری کتاب کی ایک جلد جلد سے جلد لے لیں کہ نہ جانے نظیر صدیقی مجھے کتاب کب بھیجیں گے۔ بھیج بھی سکیں گے یا نہیں۔ آپ مجھے ایک جلد پڑھنے کو دے دیں۔ اگر یہ بات آپ کے وقار کے منافی نہ ہو تب کہیں بلکہ اس کا بھی اندازہ کر لیں کہ قریشی صاحب سے کچھ مانگنا مناسب بھی ہوگا یا نہیں۔ چونکہ آپ میری تحریروں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور میری نظر میں آپ کی رائے کی بڑی وقعت ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر جی یہ چاہتا ہے کہ میری یہ کتاب جلد سے جلد آپ تک پہنچے۔ ویسے یہ کوئی بہت اہم تصنیف نہیں ہے۔ تاہم ممکن ہے دو چار مضامین آپ کی توجہ کے مستحق ٹھہریں۔

محبّ عارفی صاحب کی کتاب آپ تک ضرور پہنچے گی اور حتی الامکان جلد سے جلد پہنچے گی۔ غالباً ۷۵ سال ان کی عمر ہے۔ بینائی سے تقریباً

---

(۱)۔ ''شعریات مسلک معقولیت'' پر میرا تبصرہ یاد پڑتا ہے کہ علامت (لاہور) میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ میری کتاب ''معاصر اردو ادب'' (نثری مطالعات) میں شامل ہے۔

محروم ہو چکے ہیں۔ بصد مشکل کتاب پڑھ پاتے ہیں۔ اکیلے راستہ نہیں چلتے۔ اس حالت میں وہ اپنی کتاب کا پیکٹ خود بنا کر بھیج رہے ہیں۔ اس بنا پر کچھ دیر ہو تو ہو۔ ندیم قاسمی صاحب نے انھیں لکھا ہے کہ وہ اس کتاب پر 'فنون' کے دو صفحے (کم از کم) کا تبصرہ لکھوا کر بھیج دیں۔ میں انھیں مشورہ دینے والا ہوں کہ ڈاکٹر تحسین فراقی جو تبصرہ لکھیں گے وہی 'فنون' میں شائع ہونا چاہیے۔

مَیں محبؔ عارفی صاحب کے قدر دانوں اور مداحوں میں سے ہوں لیکن جس طرح آپ کا قدر دان اور مداح ہونے کے باوجود مَیں آپ کی کتاب 'اقبالؔ اور بیدلؔ' پر کچھ لکھنے کی ہمت ہار چکا ہوں۔ اسی طرح محبؔ عارفی کی اس کتاب پر بھی میرے اندر قلم اُٹھانے کی ہمت پیدا نہیں ہو رہی ہے۔ ویسے میرے لیے صفحات سیاہ کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ زندگی میں اس کے سوا کیا بھی کیا ہے۔

مشفق خواجہ کی کتاب 'خامہ بگوش کے قلم سے' پر میرا جو تبصرہ/ کالم 'نیوز' میں شائع ہوا ہے۔ اس کی عکسی نقل بھیج رہا ہوں۔[1] ساتھ ہی حالیہ کالم We should know Karl Popper کی نقل بھی۔ اردو اہلِ قلم میں آپ واحد شخص ہیں جن کی زبان سے مَیں نے Popper کا نام سنا ورنہ گزشتہ پچاس سال کے دوران کمیونسٹوں نے گالیاں دینے کے لیے بھی اس کا نام نہیں لیا۔[2]

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مَیں نے کسبِ معاش کی خاطر 1200 الفاظ پر مشتمل Popper پر کالم تو لکھ دیا لیکن آج تک مَیں نے اس کی کسی کتاب کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ دیکھوں بھی تو کہاں سے؟

سرِ دست اتنا ہی۔ اس وقت بڑے Tension کے عالم میں ہوں۔

اب آپ اندرونِ ملک بھی دو روپے والے لفافے میں ہوائی ڈاک سے خط بھیج سکتے ہیں۔ لفافے پر Air Mail Inland لکھا ہونا ضروری ہے۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۷/اپریل ۹۶

برادرِ عزیز ڈاکٹر تحسین السلام علیکم

ایک مدت کے بعد پرسوں (جمعرات) آپ کا خط مورخہ ۲۴/اپریل ملا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ مَیں آپ کے ذہن سے محو ہو چکا ہوں۔

وِل ڈیوراں سے متعلق میرے کالم کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا اسے پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اس کالم کو لکھتے وقت وِل ڈیوراں کی اصل کتاب پیشِ نظر تھی نہ کہ ڈاکٹر اجمل کا ترجمہ 'نشاطِ فلسفہ' ترجمہ اچھا ہے لیکن اصل سے کیا نسبت رسل، رادھا کرشنن اور ڈیوراں اوّل تو اپنے اسلوب کی وجہ سے مجھے بے حد عزیز ہیں۔ پھر ان تینوں کے خیالات ونظریات میں بھی غضب کی دلآویزی ہے۔ اختلافات اپنی جگہ۔ عالمی مذہب کا جو تصور رادھا کرشنن نے پیش کیا ہے وہ تو ایک مدت تک ممکن العمل نہ ہوگا۔ لیکن نوعِ انساں کا جو Enlightened حصہ ہے وہ اسے قبول کرنے کی طرف مائل ہوتا رہے گا۔ رادھا کرشنن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جہاں تک فرق کا تعلق ہے دو آدمی بھی یکساں نہیں ہوتے اور وہ سچے مذہب کا مفہوم بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ اصل اہمیت اس بات کی نہیں ہے کہ ہم ایک اچھے ہندو ہیں اور آپ ایک اچھے عیسائی ہیں۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم دونوں اچھے پڑوسی ہیں یا نہیں۔

خوشی ہوئی کہ آپ محبؔ عارفی کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے اس پر لکھنے کے وعدے کی تجدید کی۔ مجھے تو پورے ملک میں اس طرح کتاب پر لکھنے کے لیے جو دو ایک آدمی سب سے زیادہ موزوں نظر آتے ہیں' ان میں سے ایک آپ ہیں

(۱)۔ جناب مشفق خواجہ کی مذکورہ کتاب یہ کالم 'From the Pen of Khamabagosh' کے زیرِ عنوان 'دی نیوز انٹرنیشنل' مورخہ ۱۹/اکتوبر ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔

(۲)۔ مجھے کارل پوپر کی بعض تحریروں کو پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ پاپر جس سہولت سے نکتہ آفرینی کرتا ہے۔ وہ قابلِ داد ہے تاہم عالمی تہذیبوں میں مسلم تہذیب کا کما حقہٗ مطالعہ اس کی تحریروں سے نہیں جھلکتا۔ اپنے اسلوبِ تحریر کے اعتبار سے وہ چند بے مثال لکھنے والوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ نظیر صدیقی کا مذکورہ کالم دی نیوز کے شمارہ ۲۵/اکتوبر ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔

اور باقی اگر کوئی ہے تو اسے اس کام پر آمادہ کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ بہر حال اگر آپ لکھ دیں تو میری لاج رہ جائے۔ میں نے محبّ عارفی صاحب سے وعدہ کر لیا تھا کہ آپ سے اس کتاب پر لکھوالوں گا۔ آپ بالکل غیر جانبدارانہ لکھیں۔

بھائی اقبالیات کس پرچے کا نام ہے؟ اقبال اکیڈمی اور بزمِ اقبال کے مجلے کبھی میرے پاس آتے تھے سو ایک سال سے ان کا آنا بند ہو گیا۔ آپ متعلقہ پرچہ بھجوادیں تو کچھ عرض کرسکوں گا۔

میرے لاہور آنے کا تو کوئی امکان نہیں۔ آپ اگر اسلام آباد آئیں تو دو ایک گھنٹے میرے لیے مخصوص کریں۔

یا یہ صحیح ہے کہ ان دنوں پیکنگ یونیورسٹی کے اردو سیکشن کی صدر مسز کھونگ آپ کی یونیورسٹی میں اردو کا کوئی کورس کر رہی ہیں۔ ان کا قیام کب تک رہے گا۔ میں اپنی دو ایک انگریزی کتابیں ان کے پاس بھیجنا چاہوں گا۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۱۴/ مئی ۱۹۹۶ء

برادر عزیز تحسین فراقی صاحب! آپ کے حالیہ خط کا جواب بھیج چکا ہوں۔ آپ کے ہر دو خطوں کے درمیان کا وقفہ اتنا طویل ہوتا ہے کہ اس میں قیامت کے سوا باقی تمام حادثات کے امکانات موجود رہتے ہیں۔

مَیں نے گزارش کی تھی کہ اگر آپ اپنا مقالہ مطبوعہ............ بھیج دیں تو کچھ عرض کرسکوں گا۔

دوسرے مَیں نے یہ دریافت کیا تھا کہ کیا آج کل پیکنگ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی صدر مسز کھونگ آپ کے شعبۂ اردو میں کوئی کورس کر رہی ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو براہِ کرم ان کے پتے سے مطلع کیجیے۔ اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

امیدوار التفات نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۵/ مئی ۱۹۹۶ء

محبی ڈاکٹر تحسین فراقی تسلیم

عنایت نامہ مورخہ ۲۱ مئی نہ جانے کیونکر ۲۲ مئی کو مل گیا۔ اگر آپ کی طرف سے میرے پچھلے خط کا جواب بروقت آجاتا اور مسز کھونگ سے متعلق مطلوبہ معلومات حاصل ہو جاتیں تو میرا کام بن جاتا۔ اس دوران میں وہ اسلام آباد سے ہوتی ہوئی چین واپس چلی گئیں۔ کام صرف اتنا تھا کہ اپنی کچھ نئی کتابیں (جو آپ کی نذر بھی کر چکا ہوں) مسز کھونگ کے ذریعے پیکنگ یونیورسٹی لائبریری کے لیے بھیجنا چاہتا تھا۔ پچھلے سال جب خواتین کی بڑی کانفرنس بیجنگ میں ہوئی ڈاکٹر سلطانہ بخش کے ذریعے مَیں نے کتابیں بھیجیں۔ وہ اس پیکٹ کو واپس لے آئیں۔ کہا کہ مَیں یہاں سے بھیج دوں گی۔ سیکڑوں یاددہانی کے بعد وہ مجھے واپس ملا ہے۔ اتنے معمولی کام میں اتنی تاخیر کے باوجود یہ کام جہاں کا تہاں پڑا ہے۔ اس کے باوجود ہماری قوم کے پیٹ میں مسئلہ کشمیر کے حل کا بڑا درد اور زبان پر یہ ماتم ہے کہ ۴۸ سال گزر گئے اور یہ مسئلہ حل نہیں ہوا۔ کیا عجب کہ انسانی اور قومی رویوں کی بنا پر اس مسئلے کے حل کے لیے ایک ہزار سال بھی ناکافی ثابت ہوں۔

مَیں نے آپ کا مضمون 'اقبال کی اردو شاعری کا مختصر فنی جائزہ' دلچسپی کے ساتھ پڑا۔ آپ بنیادی طور پر ایک محقق ہیں اس لیے جتنی باتیں کہتے ہیں۔ تحقیق کی بنیاد پر کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کے فکر و فن میں اب تک فکر کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ وجہ ظاہر ہے یعنی ہماری قومی ضرورتوں کا تقاضا یہی تھا لیکن خود اقبال نے اپنے تمام شاعرانہ انکسار کے باوجود اپنے فکر و فن کو مساوی توجہ دی تھی۔ وہ جتنے بڑے صاحبِ فکر تھے اتنے ہی بڑے فن کار بھی تھے ورنہ 'مسجد قرطبہ' اور 'ساقی نامہ' جیسی نظمیں وجود میں نہ آتیں۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے روایت یعنی کلاسکیت کے حصار میں رہنے کے باوجود انہوں نے الفاظ کے استعمال' نئی تراکیب کی ایجاد' نظم کی ہیئتوں میں مناسب انتخاب یا تبدیلی' شاعری اور موسیقی کے باہمی رشتے سے متعلق بہت سے تجربے کیے۔ اگر چہ تنقید کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ بڑے فن کاروں کے فنی سحر کا تجزیہ کر کے بتائے کہ کسی بڑے فن کار کے فن

کارانہ اعجاز کا راز کیا ہے لیکن فن کارانہ اعجاز وہ بت ہے۔ جس پر حافظ کا یہ مصرع صادق آتا ہے کہ ع بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست' بڑے فن کار کے معاملے میں بڑے سے بڑے نقاد کی تنقیدی ناکامی یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ وہ کسی بڑے فن پارے کے لیے لغت کے سارے Adjectives استعمال کرنے کے باوجود پورے طور پر نہیں بتا سکتا کہ اُس فن پارے کی قوت' کشش اور دل آویزی کا راز کیا ہے کیونکہ جن فن کارانہ طریقوں (Methods) سے وہ قوت' کشش اور دل آویزی پیدا کی گئی ہے اوّل تو ان میں سے بہتوں کے نام ہی نہیں ہیں اور فن کاران تمام طریقوں کو شعوری سے زیادہ وجدانی طور پر بروئے کار لاتا ہے لیکن بڑے فن پارے کی تخلیق میں شعور اور وجدان دونوں کا حصہ ہوتا ہے۔۔۔ تقریباً مساوی۔۔۔ شاعر پہلے وجدانی طور پر شعر کہتا ہے۔ پھر شعوری طور پر اسے نکھارتا ہے۔

آپ کے مقالے کا وہ حصہ بہت اہم ہے جس میں آپ نے اقبال کی بیاضوں کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ اقبال نے اپنے بعض مصرعوں اور شعروں کو نکھارنے میں کتنی محنت کی۔ یہی بات غالب کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے اشعار پر دونوں کی نظر ثانی نے اشعار کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس لحاظ سے اقبال کی وہ تین شعر والی نظم ہر چند کہ ایجاد معانی ہے خداداد انتہائی تخلیقی تجربے پر مبنی ہے۔

آپ نے مقالے کے ابتدائی حصے میں اقبال کے فن کی طرف توجہ دینے والے نقادوں کے جو نام بتائے ہیں ان میں دو اور اہم ناموں کا اضافہ ہونا چاہیے۔۔۔ (۱)۔ مجنوں گورکھپوری اور (۲) سلیم احمد۔ میرے ناقص علم کے مطابق مجنوں گورکھپوری پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ اقبال ایک غیر معمولی فن کار ہیں۔ ممکن ہے اُن کے اِس ادراک میں اِس بات کو بھی دخل ہو کہ اقبال کے افکار اُن کے لیے زیادہ جاذب توجہ نہیں تھے۔ پھر بہت بعد میں سلیم احمد نے 'ضرب کلیم' پر مضمون لکھ کر اقبال کے فنی معجزوں کی جس طرح داد دی وہ میرے نزدیک اردو تنقید کے بڑے کارناموں میں سے ہے۔ یاد نہیں آ رہا کہ سلیم احمد کا وہ مضمون ان کی کس کتاب میں شامل ہے۔[1] اسے آپ ایک مرتبہ ضرور پڑھیں۔ سلیم احمد نے اقبال کے فنی اعجاز کا ثبوت اُس کتاب سے پیش کیا جسے فنی طور پر ان کی تصانیف میں سب سے کم رتبہ تصور کیا جاتا ہے۔ فنی اعتبار سے 'بال جبریل' یقیناً اقبال کا شاہکار ہے لیکن سلیم کے مضمون کے بعد 'ضرب کلیم' کو بھی اس کے قریب ہی رکھنا پڑے گا۔

کوئی بھی شاعر اپنے تمام اشعار یکساں فنی بلندی سے نہیں کہہ سکتا۔ اقبال اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ 'بانگ درا' جو ان کی اولین اردو تصنیف ہے اس کا نصف سے زائد حصہ خصوصاً ابتدائی حصہ ان کی شاعری کی انتہائی بلندی کی عکاسی نہیں کرتا۔ ویسے ان کی بعض بالکل ابتدائی نظموں میں بھی (جو بانگ درا میں شامل نہیں اور جنھیں شامل ہونا چاہیے تھا) بعض غیر فانی شعر موجود ہیں۔

لیجئے صاحب آپ کے ایک اچھے مقالے کے بہانے کچھ بکواس تو کر ہی دی میں نے اور کیا لکھ رہے ہیں آج کل۔ محبّ عارفی کی کتاب پر لکھنے کا وعدہ پورا کر دیجئے۔ میری کتابیں تو آپ کے مطالعے میں بھی نہیں آتیں۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے۔۔۔

مخلص نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۷ جولائی ۹۶

محب مکرم السلام علیکم

آپ کے مضمون (اقبال) سے متعلق جو طویل خط میں نے بھیجا تھا۔ اس کی رسید سے آج تک محروم ہوں۔ اقبال کے فنی پہلوؤں پر لکھنے والوں میں میں نے مجنوں گورکھپوری اور سلیم احمد کی طرف آپ کی توجہ دلائی تھی۔ بعد میں ایک اور نام حمید نسیم بھی یاد آیا تھا۔

محبّ عارفی صاحب کی کتاب کے سلسلے میں اب مجھے ان سے شرمندگی ہونے لگی ہے۔ معلوم نہیں آپ مجھے اس شرمندگی سے جلد نجات دلانے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔

میں اپنے انگریزی کالموں کا ایک اور انتخاب شائع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس میں ماجد دریابادی سے متعلق کالم بھی شامل ہے۔

اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

(۱)۔ سلیم احمد کا مذکورہ مقالہ ان کی فکر افروز کتاب ''ادھوری جدیدیت'' میں شامل ہے۔

بھائی میر کا وہ شعر کیا ہے اپنا دیوان بغل بیچ لیے پھرتے ہیں[1]۔ براہِ کرم لکھ بھیجئے۔

مخلص نظیر صدیقی

☆☆☆

۱۱/اگست ۹۶

محب عزیز ایک مدت کے بعد کل آپ کا خط ملا تو نہ صرف یہ کہ بڑی خوشی محسوس ہوئی بلکہ بہت سے وسوسے بھی دُور ہوئے۔ پریشان کن اندیشہ یہ تھا کہ کہیں میرا سابقہ خط آپ کے لیے باعثِ آزردگی نہ ثابت ہوا ہو۔ رائے زنی' تنقید وغیرہ انسانی تعلقات کو خطرے میں ڈال دیتی ہیں۔

'ضربِ کلیم' پر سلیم احمد کی وکالت اسے اس سطح پر تو نہ لا سکی جس پر 'بالِ جبریل' نظر آتی ہے لیکن ان کے مضمون کے بعد 'ضربِ کلیم' اس سطح پر بھی نہیں رہی جس پر وہ تصور کی جاتی تھی۔ پتا چلا کہ 'ضربِ کلیم' میں بھی اقبال کا فن کارانہ کمال بڑی بلندی پر ہے۔ وہ 'بالِ جبریل' کے برابر نہ سہی لیکن اب دونوں میں ۱۸' ۲۰ سے زیادہ کا فرق نہیں ہے۔ اقبال کی چاروں اردو کتابیں اپنے بہترین حصوں کے اعتبار سے بالکل برابر تو نہیں ہیں لیکن ان کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔

مجنوں کی چھوٹی سی کتاب اطمینان بخش تو کسی لحاظ سے نہ تھی لیکن اقبال کے فنی کمالات کے اعتبار سے چشم کشا ضرور تھی۔ بہر حال یہ میرا ذاتی Perception ہے۔

میرے لیے یہ اطلاع انتہائی مسرت بخش ہے کہ اس وقت تک آپ محبّ عارفی کی کتاب پر اپنا مضمون مکمل کر چکے ہوں گے۔ اس مضمون کے لیے مزاجاً تو وہ بھی آپ کے شکر گزار ہوں گے لیکن حقیقتاً یہ احسان آپ نے مجھ پر کیا ہے کہ میری خواہش پر یہ زحمت گوارا کی۔ محبّ عارفی عمر کے اعتبار سے ۸۰ کے پیٹے میں ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ کا مضمون جلد سے جلد ان کی نظر سے گزر سکے۔ اردو کے اچھے رسالے چھ چھ مہینے بلکہ سال سال بھر پر شائع ہونے لگے ہیں۔ کیا یہ ممکن اور مناسب نہیں کہ آپ کا مضمون چھپنے کو جس رسالے میں بھی چھپے اور جب بھی چھپے لیکن اس کی ایک کاپی محبّ عارفی تک چھپنے سے پہلے پہنچ جائے؟

ممکن ہے میری انگریزی کتاب ماہِ رواں کے آخر تک آپ کے ہاتھ میں ہو۔ فی الحال تو وہ میری نظر سے بھی کوسوں دُور ہے۔

آپ کے اس خیال سے مجھے پورے طور پر اتفاق ہے کہ ہم مسلمان ہزاروں برس پہلے کے وحشی معاشرے کے باسی بن گئے ہیں۔ علم و حکمت سے ہمارا رشتہ منقطع ہو چکا ہے۔ تہذیب و شائستگی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔

آپ نے کبھی اردو یا انگریزی میں ایسی کتاب دیکھی ہے جس میں دنیا کے بڑے ماہرین ریاضیات مابعد الطبیعیات کی وادی میں گھوم پھر رہے ہوں؟ ممکن ہو تو ایسی کتاب کا پتا مجھے بھی بتائیے۔

بھائی اب لاہور کا سفر بھی میری قسمت میں کہاں رہا۔ اب تو غالباً صرف سفرِ آخرت رہ گیا ہے۔ آپ اسلام آباد آنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ میری آپ کی ملاقات کی یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔ آپ میری تحریروں کو جس طرح توجہ سے پڑھتے ہیں اس کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کا نظیر صدیقی

☆☆☆

۴/ستمبر ۹۶

محب عزیز ڈاکٹر تحسین فراقی السلام علیکم۔ خط اور مضمون دونوں ملے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں آپ کے مضمون کے لیے کس قدر ممنون ہوں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے میری خواہش اور فرمائش کی بنا پر جس کتاب کو موضوع گفتگو بنایا وہ آپ کو بے حد پسند آئی۔ کیا اچھا ہو

(۱)۔ صحیح یوں ہے اور غالباً سودا کا ہے: ؎

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتے ہیں
کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

کہ آپ ان کے نظریۂ شعر کی روشنی میں ان کی شاعری پر بھی کچھ لکھیں۔

آپ کا مضمون آپ کے نام کے مطابق سرتا سر تحسینی ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر شخص محبّ عارفی یا آپ کی ہر رائے سے اتفاق کرے۔ محبّ عارفی صاحب کو علم وادب اور فکر وحکمت کے ہر نئے نظریے میں مسلمانوں کو تباہ کرنے کی صیہونی[1] سازش نظر آنے لگی ہے حالانکہ مسلمانوں کی تباہی میں خود مسلمانوں کا کردار کافی رہا ہے اور صیہونی افکار وخیالات (کارل مارکس، سگمنڈ فرائڈ، برٹرینڈ رسل)[2] سے خود مغربی اقوام کو مسلمانوں سے زیادہ ہی نقصان پہنچا ہے۔ محبّ عارفی صاحب کو ایک طرف تو حقیقت کی جستجو ہے اور دوسری طرف وہ اسلام کے دیئے ہوئے حقائق میں کسی شک و شبہ اور تحقیق کے روادار نہیں۔ اس متضاد رویے کا جواز کیا ہوسکتا ہے؟ آپ نے کتاب کے آخری مضمون کو جس کا شعریات (Poetics) سے کوئی تعلق نہیں بالکل Touch نہیں کیا۔ محبّ عارفی کے دو بنیادی نظریے یہ ہیں کہ ہم انسان خواب کے عالم میں رہتے ہیں نہ کہ بیداری کے عالم میں۔ دوسرے یہ کہ ہم انسان دنیا کے اندر نہیں رہتے بلکہ دنیا ہمارے اندر رہتی ہے۔ وہ سائنس کے پرستار ہونے کے باوجود تصوف کی بھول بھلیوں سے نکلنے پر آمادہ نہیں بہر حال مجھے یقین ہے کہ آپ کا مضمون پڑھ کر انھیں خوشی ہوگی۔

میری انگریزی کتاب جو تقریباً چھپ چکی ہے ماہِ رواں کے اندر کسی وقت آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔

میں نے آپ کا مضمون اور اپنے نام آپ کا خط ان دونوں کی فوٹو کاپیاں محبّ عارفی کے پاس بھیج دیں۔ ان کا پتا یہ ہے:

House 1061 / 1062
Block 8 Federal B Area
Karachi-75950.

اگر ستمبر کے وسط میں خواجہ صاحب[3] لاہور آرہے ہیں تو مجھے اُمید ہے کہ وہ اسلام آباد بھی آئیں گے۔ یہاں ان کے ایک سگے بھائی ٹی وی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ میرے لیے لاہور آنا قطعی ممکن نہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں مَیں کس درجہ پابہ زنجیر ہوں۔

میری تقریباً پانچ چھ کتابیں نایاب ہیں۔ جی ضرور چاہتا ہے کہ وہ دوبارہ چھپ سکتیں لیکن اوّل تو مجھے پبلشر نہیں ملے اور اگر کوئی اتفاق سے مل جاتا ہے تو میں نئی کتاب کی طباعت کو اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ پرانی کتابیں کہیں نہ کہیں موجود اور محفوظ ہیں۔ اگر نئی کتاب وجود میں نہ آئی تو عین ممکن ہے وہ ہمیشہ عدم وجود ہی کا شکار رہے۔ ۱۹۹۴ء سے میری جو کتابیں آئیں ہیں وہ میری پھٹی ہوئی جیب سے چھپتی رہی ہیں۔ اردو ادب میں میری جو گئی گزری حیثیت ہے اس کی بنیاد پر کیا کہوں کہ میری آرزو کیا ہے! اگر کوئی میری منتخب تحریروں کا مجموعہ شائع کرنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا اور سب بدستور۔

مخلص نظیر صدیقی

---

(۱)۔ صحیح: صیہونی

(۲)۔ یہ بات نا قابلِ فہم ہے کہ رسل کا مخصوص معنوں میں صیہونی افکار سے کوئی تعلق رہا ہے۔

(۳)۔ مراد ہیں مشفق خواجہ

نظیر صدیقی کے خطوط ــــ ایک تاثر

رفیق سندیلوی

میرے ذخیرۂ خطوط میں نظیر صدیقی کے لگ بھگ چالیس پینتالیس خط موجود ہیں جو انہوں نے مجھے ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۴ء کے دوران اسلام آباد، کراچی اور چین سے لکھے۔ ان سے میرے مراسم اولاً ادیبانہ نوعیت کے تھے مگر جلد ہی یہ دوستانہ سطح اختیار کر گئے۔ تفاوتِ عمر کے باوجود نظیر صدیقی گفتگو میں حجاب نہیں برتتے تھے۔ میں ان سے ہر موضوع پر تبادلۂ خیال کر لیتا تھا لہٰذا ایک بے تکلفی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک ہی شہر میں رہنے والوں کے ساتھ خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ خط و کتابت کے لطف سے محروم رہتے ہیں۔ یا تو فون پر بات ہو جاتی ہے یا پھر ملاقات کا کوئی نہ کوئی موقع نکل ہی آتا ہے۔ نظیر صدیقی سے مہینے میں دو ایک بار ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔ اسے ایک اتفاق ہی جانیے کہ مجھے سب سے پہلا خط انہوں نے اسلام آباد ہی سے لکھا جو رسّل کی ایک کتاب کی واپسی سے متعلق تھا جو انہوں نے مجھے اوپن یونیورسٹی کے کتب خانے سے لے کر دی تھی۔ میری طرح وہ بھی اس کتاب کی فوٹو کاپی کروانے کے خواہش مند تھے بلکہ وہ اس لائبریری کی دو تین اور نادر کتب کی نقول بنوا کر اپنے پاس محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ موت کے بعد خود ان کی ساری کتابیں اسی لائبریری کی زینت بن جائیں گی۔ بہر کیف ان دنوں وہ اوپن یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں صدر نشین کے عہدے پر فائز تھے اور چند مہینوں میں ملازمت سے سبکدوش ہونے والے تھے۔ سبکدوشی سے قبل انھیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی بھی مل گئی تھی۔ اس کی خبر بھی انھوں نے مجھے خط کے ذریعے دی تھی۔ اتفاق سے ان دنوں میں نے سرکاری طور پر جو گھر کرائے پر لیا تھا۔ اس میں ابھی فون کا بندوبست نہیں ہوا تھا۔ کالج کا فون مسلسل استعمال میں رہتا تھا۔ اس پر رابطہ کرنا محال تھا۔ اس لیے کوئی خاص اطلاع ہوتی تو وہ مجھے خط لکھ دیا کرتے تھے جو اگلے دن موصول ہو جاتا تھا جب انہوں نے میری کتاب ''ایک رات کا ذکر'' پر تبصرہ لکھا تو بذریعہ خط ہی اس کے بارے میں مطلع کیا:

> ''آپ یہ کہہ کر گئے کہ سنیچر یا اتوار تک اپنی کتاب کا تبصرہ اور میری کتاب (نامے جو میرے نام آئے) لے جائیں گے۔ سو یہ دونوں چیزیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ اتفاق سے ریڈیو پاکستان، پنڈی سے ایک کتاب پر تبصرے کا پروگرام آ گیا۔ میں نے آپ ہی کی کتاب سے متعلق تبصرہ ریکارڈ کرا دیا۔ یہ تبصرہ جمعے (۲۱ ستمبر) کو صبح ساڑھے دس بجے نشر ہو گا مگر آپ اپنی وعدہ خلافی کی سزا کے طور پر سننے سے محروم رہیں گے۔'' (خط محررہ ۲۰/ ستمبر ۱۹۹۰ء)

احباب جانتے ہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد نظیر صدیقی بسلسلہ ملازمت چین چلے گئے تھے مگر وہ وہاں زیادہ عرصے تک قیام نہ کر سکے اور ایک برس کے اندر ہی واپس آ گئے، جب دارالخلافہ کی کسی یونیورسٹی، کسی مقتدرہ، کسی ادبیات، کسی بک کاؤنسل، کسی بک فاؤنڈیشن، حتیٰ کہ کسی سکول کالج نے بھی ان کو ملازمت کی پیش کش نہ کی تو انھیں تلاش معاش کے لیے کراچی جانا پڑا۔ میرے نام ان کے زیادہ تر خطوط اسی زمانے کے ہیں اور ضرورتاً لکھے گئے ہیں یعنی یہ محض خط برائے خط کے زُمرے میں نہیں آتے یا یوں کہیے کہ براہِ راست ادبی مسائل ہی ان کا موضوع نہیں ہیں۔ ان خطوط کا مرکزی یا حاوی تناظر یہ تھا کہ انہوں نے اپنی دو کتابوں کے مسودے اشاعت کے لیے اسلام آباد کے ایک ناشر کے سپرد کیے تھے جن میں سے ایک کتاب کی چار سو جلدیں چھاپ کر بک کاؤنسل کو پہنچائی جاتی تھیں مگر انہی دنوں نظیر صدیقی کراچی آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے اپنے ناشر کو یکے بعد دیگرے متعدد خط لکھے مگر جب کوئی جواب نہ آیا تو ان کی بے چینی بڑھ گئی۔ ناچار انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا کیونکہ میں ہی شاید سب سے زیادہ ان کی مدد کر سکتا تھا۔ ایک تو مزاج آشنا ہونے کی وجہ سے میں ان کا مسئلہ سمجھ سکتا تھا، پھر انھیں معلوم تھا کہ میری اوّل دو کتابیں اسی ناشر نے شائع کی تھیں اور یہ کہ اس کی دکان بھی میرے کالج اور گھر کے بالکل قریب تھی۔ کراچی سے انہوں نے مجھے جو پہلا خط لکھا اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

> ''یہ بات تمہارے علم میں ہوگی کہ میں کراچی میں ہوں۔ یہاں رہ کر بھی تم سے رابطہ تو رکھنا ہی تھا لیکن ممکن تھا کہ میں کچھ عرصے کے بعد رابطہ قائم کرتا اگر مجھے ایک اشد ضروری معاملے میں یہ خط نہ لکھنا پڑتا۔'' (محررہ ۱۴/ مئی ۱۹۹۲ء)

یہ معاملہ ان کی کتابوں کی اشاعت کا تھا۔ انہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ اوّلین فرصت میں ان کے ناشر فاروق ملک سے صورتِ حال معلوم کروں اور انھیں اطلاع دوں۔ کراچی سے لکھے گئے بیشتر خطوط اسی معاملے کی پیشرفت جاننے کے بارے میں ہیں اور ان کی ذہنی پریشانی کو ظاہر کرتے ہیں جو انھیں ناشر کی دروغ گوئیوں' بدقماشیوں اور غلط بیانیوں کے باعث اُٹھانا پڑی۔ سچ پوچھیے تو ان خطوط میں فاروق ملک اور نظیر صدیقی ڈرامے کے دو کرداروں کی طرح اُبھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک کردار ناشر کا ہے جو شریفانہ تعلقات کی اہمیت اور کاروبار میں زبان کی پاسداری کے اصولوں کو سمجھنے سے قاصر ہے' جسے دوسروں کی Inconveniences کا مطلق احساس نہیں' جو پاکستانیوں کی اکثریت کی طرح وعدہ خلاف انسان ہے اور ایک ایسا پیچیدہ آدمی ہے جس سے معاملہ کرنا آسان نہیں۔ دوسرا کردار ایک رائٹر کا ہے جو اپنی کتابوں کی طباعت کے معاملے میں مایوسی اور دل شکنی کا شکار ہے' مسلسل ناشر کے سفید جھوٹ سُن رہا ہے اور اس کی بداخلاقیوں' غیر ذمہ داریوں اور حماقتوں کو برداشت کر رہا ہے۔ ایک خط میں بتاتے ہیں کہ فاروق ملک کی موجودہ غیر حاضر دماغی اس کے ابنارمل ہونے کا ایک پہلو ہے۔ یہ لڑکا نہ صرف اپنے کاروبار کو بلکہ اپنی زندگی کو تباہ کرتا نظر آتا ہے۔

نظیر صدیقی ایسے سادہ آدمی بھی نہیں تھے کہ کسی کے فریب کے جال میں فوراً پھنس جاتے۔ انھیں انسان کی عیاریوں اور خودفریبیوں کا ادراک تھا مگر ان کی رنگارنگ عملی شکلوں سے اُلجھ کر سچ اور جھوٹ کی تفریق کرنے میں وہ بڑی دیر لگا دیتے تھے۔ اگر صدیقی صاحب فاروق ملک کی فریب کارانہ چالوں کی تہہ میں جاتے تو سمجھ سکتے تھے کہ وہ سرے سے کتاب چھاپنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا' اگر وہ اس مالی فائدے کو بھی حاصل نہ کر سکا جو بک کاؤنسل کی طرف سے اس کو ملنے والا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ پیشگی طور پر اپنی رقم خرچ کرنا اس کے کاروباری مسلک ہی کے خلاف تھا۔ صدیقی صاحب نے کچھ اپنے طور پر اور کچھ میری وساطت سے کتابوں کی اشاعت کے معاہدے پر عمل درآمد کرانے کی کوشش کی مگر انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ انہوں نے ناشر کو غیرت دلانے کے لیے کئی خط لکھے مگر سب بے سود گئے۔ ایک مرتبہ مَیں نے انھیں لکھا کہ آپ اپنی کتابوں کی اشاعت کی خوشخبری سننا چاہتے ہیں جبکہ یہ خوشخبری ناشر کی نیت سے مشروط ہے جس کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو آپ کو ہو ہی گیا ہے۔ مَیں تو ایک دوست یا خیر خواہ ہونے کے ناطے آپ اور آپ کے ناشر کے بیچ پیغام رسانی کا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔ ناشر کو قائل کرنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ جواب میں انہوں نے لکھا۔

> ''میں نے کب اصرار کیا ہے کہ مجھے کتاب کی طباعت کی خوشخبری ہی ملنی چاہیے۔ میرے لیے تو اتنا معلوم ہونا ہی کافی ہے کہ طباعت کے مسائل کس منزل سے گزر رہے ہیں۔ نئی دشواریاں کیا ہیں اور ان کے دُور ہونے کے امکان کہاں تک ہیں۔'' (محررہ ۵ ستمبر ۱۹۹۳ء)

ایک بار مَیں نے ان کی مایوسی کے پیش نظر انھیں لکھا کہ اگر کتابوں کی اشاعت کے معاملے نے اُن کے دماغ کو بہت مکدر کر رکھا ہے اور دل شکنی انتہا کو پہنچ چکی ہے تو کوئی دوسرا ناشر ڈھونڈنا چاہیے اور اگر اس کی اُمید نہیں ہے تو مَیں اپنے خرچے پر یا کسی نہ کسی طرح آپ کی ایک کتاب شائع کرانے کا بندوبست کرتا ہوں مگر انہوں نے اس پیشکش کو قبول کر کے مجھے امتحان میں ڈالنا پسند نہ کیا۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ ''تم پبلشر نہیں ہو۔ تمہارے پاس وسائل نہ اس کتاب کے چھاپنے کے ہیں نہ اُس کتاب کے چھاپنے کے۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ تم صرف میری محبت یا شر ماحضوری میں خواہ مخواہ زیر بار ہو جاؤ۔'' البتہ وہ اپنے تبصروں کی کتاب مجھ سے مرتب کرانا چاہتے تھے۔

نظیر صدیقی طبعاً حساس آدمی تھے' دل کے اچھے تھے مگر یاسیت ان پر جلد ہی غلبہ جمالیتی تھی اور وہ اس کی رَو میں بہہ کر Nihilism یعنی منکریت کی حدوں تک چلے جاتے تھے۔ میری اور ان کی مراسلت میں کبھی کبھار سخت مقام بھی آ جاتے تھے۔ خط کی ترسیل میں تاخیر ہو جاتی تو وہ بے چین ہو جایا کرتے تھے۔ باقاعدہ گلہ کرتے تھے مگر گلے میں زیادہ تُرشی پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ زوالِ عمر کا احساس انھیں لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ مَیں ان کی زحمتوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ جواب پانے کی عجلت میں یہ بات بھی ان کے ذہن سے نکل جاتی تھی کہ دوسرا آدمی بھی اُنھی کی طرح گوشت پوست کا بنا ہوا ہے اور مسائل کا شکار ہو سکتا ہے۔ ان کی طبیعت کے متذکرہ پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے خطوط میں سے چند ٹکڑے ملاحظہ کیجیے۔

> ''عزیزم تمہارے نام دو خط بھیجے ہوئے مدت ہو گئی۔ اب تک ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔ تم جیسے پڑھے لکھے شاعر اور ادیب بھی اگر اتنی سی ذمہ داری کو محسوس نہ کریں کہ کوئی شخص تم سے دو تین ضروری باتیں جاننا چاہتا ہے۔ اسے جلد

وہ باتیں بتادینی چاہئیں تو پھر یہ اُمید کس طرح کے لوگوں سے کی جائے۔'' (محررہ ۲۰ جون ۱۹۹۲ء)

''آپ نے جس طرح پُراسرار خاموشی اختیار کرلی ہے اس کے پیشِ نظر جی چاہتا ہے کہ اہلِ دنیا پر جو رہا سہا اعتماد رہ گیا ہے اسے بھی ختم کردیا جائے۔'' (محررہ ۲۷ جون ۱۹۹۳ء)

''مجھ سے رابطہ قائم رکھو۔ میں زندگی کے آخری دَور میں ہوں۔ کون جانے جسم و جان کا رابطہ کب ختم ہو جائے لہٰذا مجھ سے متعلق کسی کام میں غیرضروری تاخیر کوراہ نہ دو۔'' (محررہ ۱۱ اپریل ۱۹۹۳ء)

جب خطوط کا سلسلہ بحال ہوا اور انھیں صورتِ حال سے آگاہی ہوئی تو میری بابت ان کا گمان رفع ہوگیا۔ مختلف خطوں کی یہ عبارات ملاحظہ کیجیے جن میں دلجوئی و دلدہی کا عنصر پایا جاتا ہے۔

''تمہاری علالت کی اطلاع سے دلی تکلیف ہوئی۔ آدمی کی زندگی کی طرح اس کی صحت کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔ شکر ہے کہ تم صحت یاب ہوگئے۔ شاید کمزوری باقی ہوگی۔ غذا اور دوا دونوں سے کمزوری دُور کرنے کی کوشش کرو اور صحت کے معاملے میں ذرا بھی لاپروائی سے کام نہ لو۔'' (محررہ ۴ جولائی ۱۹۹۲ء)

''میں آپ کی طویل خاموشی کا مطلب یہ سمجھا کہ آپ میری دی ہوئی زحمتوں سے اُکتا گئے۔ ایسا ہونا فطری تھا مگر ناگزیر نہیں سواب معلوم ہوا کہ آپ سخت بیمار رہے۔ شدید علالت جوانوں کا بھی مقسوم ہے لیکن عام طور پر ذہن اس طرف نہیں جاتا۔'' (محررہ ۵ نومبر ۱۹۹۲ء)

''ایک مدت کے بعد کل تمہارا خط مورخہ ۲۶ جون ملا۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ تم ادھر خاصے بیمار رہے۔ میں تو تمہیں اچھی حالت میں چھوڑ کر آیا تھا۔ بہرحال خوشی ہوئی کہ تمہارے مرض کی صحیح تشخیص ہوگئی۔ یقین ہے کہ اب علاج مؤثر ثابت ہوگا۔ پرہیز علاج کا لازمی حصہ ہے۔ چونکہ آنت کی سوزش تشخیص کی گئی ہے اس لیے موسم کے ٹھنڈے پھل ضرور کھاتے رہو۔ اس سلسلے میں اپنے معالج سے مشورہ کرلینا۔ صحت کی حالت سے مجھے مطلع کرتے رہو۔''

(محررہ ۴ جولائی ۱۹۹۳ء)

کراچی سے فرستادہ خطوط کے حوالے سے جس مرکزی یا حاوی تناظر کو نشان زد کیا گیا ہے اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ یہ خطوط کلی طور پر اس کے حصار میں بند ہیں ان میں نظیر صدیقی کی نجی زندگی کی متعدد جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مالی تنگی، جسمانی کمزوری، بیماری کے تذکرے کے ساتھ شہر کی صورتِ حال، سیاست، فن، سماج اور کائنات کی طرف ان کے رویے کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ کراچی گئے تو یہ شہر پہلے سے بدتر اور زیادہ خطرناک ہوگیا تھا۔ قوم کے پاس کرفیو اور خونریزی کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ حالات میں گرہوں پر گرہیں پڑتی چلی جارہی تھیں۔ اس فضا میں کراچی اور اسلام آباد یعنی اپنے اور اہلِ خانہ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے انھیں ہمدرد فاؤنڈیشن کی کل وقتی نوکری اردو کالج میں ایم۔ اے کے طلبہ طالبات کو پڑھانے اور ''نیوز'' میں ہفتہ وار مضمون لکھنے کی دو جز وقتی نوکریاں کرنا پڑتی تھیں۔ اس طرح تین قسم کی ملازمتوں نے انھیں ادھ موا کردیا تھا۔ اجل کی پرچھائیوں اور وقت کے زیاں کا احساس اس پر مستزاد تھا۔ ان کے حالات خاصے صبرآزما تھے۔ ان کی ادبی زندگی مکمل طور پر ختم ہوچکی تھی۔ اگر وہ صحافت کی حد تک زندہ تھے تو اس میں بھی معاوضے کے حصول کو دخل تھا۔ وہ علم و ادب کی تیز رفتاری کے ساتھ ہمقدم ہونے میں دشواری محسوس کرنے لگے تھے مگر مطالعہ کرنے کی حسرت ان میں اب بھی موجود تھی۔ وہ اب اس منزل پر نہیں تھے کہ محض رسائل میں چھپنا ان کے لیے باعثِ تشفی تھا۔ یہ کام تو اب بھی ان کے لیے آسان تھا۔ دراصل وہ ادب کے بنیادی مسائل سے نکرلے کر کوئی ڈھنگ کی بات کہنا چاہتے تھے جوان سے نہیں کہی جارہی تھی۔ وہ محض اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ یہ دَور اُن کے لیے سخت معاشی جدوجہد کا دَور بن کر رہ گیا تھا۔ اکثر اوقات وہ میرے ادبی سوالات گول کرجاتے تھے یا ان کا جواب دیتے ہوئے اختصار برتتے تھے۔ میں اُن کو ادبی طور پر متحرک کرکے خطوط کے سلسلے کو بارآور بنانا چاہتا تھا مگر صدیقی صاحب زیادہ تر اپنے اشاعتی معاملات ہی سے سروکار رکھتے تھے۔ پھر بھی ایک ادیب کے خطوط میں ادبیت کسی نہ کسی راستے سے داخل ہو ہی جاتی ہے۔ نقد و نظر کی کوئی نہ کوئی بات ان کے قلم سے نکل ہی جاتی تھی۔ یہی دیکھیے کہ ان کے خطوط میں اشارتاً یا ضمناً یا محض نام کی حد تک

جن ادیبوں کا حوالہ آیا ہے' ان میں سرور بارہ بنکوی' رادھا کرشنن' اقبال اثر' فراق' غالب' منیر نیازی' افتخار عارف' ساقی فاروقی' وزیر آغا' ظفر اقبال' ڈاکٹر ذکی' جمیل آذر' صبا اکرام' اکبر حمیدی' رشید احمد صدیقی' احمد فراز' ذکی احمد صدیقی' خاور احمد' رضی حیدر (ہندوستان کے محقق جن کو نظیر صدیقی پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی)' ماجد صدیقی' ڈاکٹر ریاض' پروین شاکر اور محمد علی صدیقی شامل ہیں۔

نظیر صدیقی نے اپنی خودنوشت بھی لکھی ہے اور بعض انشائیوں کے ذریعے اپنے خانگی حالات سے پردہ بھی اُٹھایا ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ خطوط نا صرف زندگی کے آخری دور کے حوالے سے ان کی شخصیت کی تفہیم میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں بلکہ اپنی جہت کے اعتبار سے ان کی سوانح میں ایک نیا گوشہ وا کر سکتے ہیں۔ یہ مطالعے کا ایک رخ ہے' دوسرے رخ میں ان کے تعلق سے خود مکتوب الیہ کی ذات بھی معرض بحث میں لائی جا سکتی ہے۔ میں نے نظیر صدیقی کے آٹھ خطوں کا انتخاب کیا ہے۔ زندگی رہی تو باقی خطوط بھی نذر قارئین کیے جائیں گے۔

خطوط

۲۱ فروری ۱۹۹۱ء (چین)

میاں رفیق خدا تم کو خوش رکھے۔ شکر ہے کہ تمہارا خط آیا۔ تمہیں بھولنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اکثر لوگوں کی طرح میری زندگی میں بھی فراز کم اور نشیب زیادہ ہیں لیکن اپنے دُکھوں کا رونا کیا رویا جائے' جب بھی زباں پر حرفِ شکایت آنے لگتا ہے تو انصاف کہتا ہے ذرا اُن لوگوں پر بھی نظر رکھو جو تم سے لاکھ گنا زیادہ مصائب اور محرومیوں کے ساتھ جی رہے ہیں یا مر چکے ہیں۔

بھائی کی موت نے بڑا صدمہ پہنچایا ہے لیکن اس صدمے کے ساتھ بقیہ زندگی گزارنے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے تم نے ساختیاتی تنقید' غزل کی لفظیات اور نظیر صدیقی کے تنقیدی رویے پر جو پُر لطف گفتگو کی تو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کر کے مجھے بھی اپنے لطف میں شریک کر لیا ہوتا۔ چاہو تو یہ کام اب بھی کر سکتے ہو۔

تمہاری جدید غزل کی تاریخی حدود کیا ہیں اور تنقیدی حدِ فاصل کیا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اُبھرنے والی جدید غزل سے میرے مطمئن ہونے کا سوال اتنا اہم نہیں جتنا یہ سوال کہ اس غزل کے امتیازی نقوش کیا ہیں اور وہ جدید غزل اردو غزل کے سرمائے میں کس کمی کو پورا کر رہی ہے۔ اس غزل کے جو پہلو سب سے زیادہ قابل رد تھے وہ غالباً ظفر اقبال کے غیر شاعرانہ یا غیر شعری تجربے تھے جن کا مظاہرہ ''فنون'' کے غزل نمبر میں ہوا تھا۔ آزاد غزل کا رجحان بھی قابلِ رد تھا سو اپنی موت آپ مر گیا۔ سراہنے والی باتوں میں پروین شاکر اور افتخار عارف نے مہاجرت سے متعلق جو اشعار لکھے اور معاصرانہ صورتِ حال کو جس طرح کربلا کے استعاروں میں بیان کیا وہ سب خوشگوار اور قابلِ قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کی غزلوں میں احمد فراز اور منیر نیازی کی غزلیں بھی قابلِ توجہ اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہائیکو پر یہاں کوئی کتاب نظر سے نہیں گزری۔ لسانیات کے ایک جاپانی پروفیسر ہمارے ہاسٹل میں رہتے ہیں لیکن ان کا شعر و ادب کا خانہ خالی ہے اس لیے وہ ہائیکو پر کسی کتاب کی نشاندہی نہ کر سکے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم ٹی اینڈ ٹی کالج میں آ گئے۔ کوشش کر کے فیڈرل گورنمنٹ کالج میں آ جاؤ۔

فاروق ملک کو آمادہ کرو کہ میرے خطوں کا جواب دیں اور اگر اللہ توفیق نہ دے جب بھی میری کتابوں کو شائع کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

باقی آئندہ اپنے بھائی کو میرا اسلام کہنا۔

خیر طلب نظیر صدیقی

☆☆☆

۲/ مئی ۱۹۹۱ء

ڈیئر رفیق آپ کا خط مورخہ ۱۴/ اپریل ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ 'فنون' کا تازہ شمارہ آ گیا اور اس میں آپ کی دونوں کتابوں پر میرے تبصرے شائع ہو گئے۔ اگر آپ دونوں تبصروں کی فوٹو کاپی بھیج رہے ہیں تو کیا یہ ممکن ہوگا کہ غزل سے متعلق میرے مضمون کی فوٹو کاپی بھی بھیج دیتے۔

یہاں دو ایک صاحبان اسے پڑھنا چاہتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہاں 'فنون' میسر نہیں آ سکتا۔ میرا مضمون قدرے طویل ہے۔ پھر بھی زیادہ سے زیادہ تین روپے کے ٹکٹ میں پاکستان کالج کی معرفت ساری چیزیں آ سکتی ہیں اور ہاں اپنا رجبہ گدھ والا مضمون بھی ضرور بھیجئے۔ کیا 'ادبیات' کے تازہ شمارے میں میرا کوئی انشائیہ بھی ہے؟ اگر ممکن ہو تو اس کی فوٹو کاپی بھی بھیجئے۔

اگر 'ادب لطیف' کے ۵۵ سالہ نمبر کی اشاعت کی خبر ملے تو مجھے ضرور مطلع کریں۔ اس میں بھی میرا ایک مضمون آنے والا ہے۔

'فنون' اور 'ادب لطیف' میں میرے جو مضامین آ رہے ہیں۔ وہ تو یقیناً کچھ نصابی قسم کی چیز ہیں۔ وہ دونوں مضامین آپ کے ایم فل کے کورس میں شامل ہیں لیکن اول تو نصابی چیزوں کو اس درجہ حقارت سے دیکھنا روا نہیں کیونکہ مغرب کے بہت سے تنقیدی شاہکاروں کا محرک نصابی ضرورت ہی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کی حقارت سے دیکھنے کا حق اسی کو ہے جو خود Original and Creative واقع ہوا ہو۔

میں اپنی ادبی اور تنقیدی کارکردگی کے بارے میں کوئی بڑا دعویٰ نہیں کرنا چاہتا لیکن میں اپنی کارکردگی کے معاملے میں ان لوگوں کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتا جن کا سارا سرمایہ ادب میں سیاست پر مبنی ہے۔

افتخار عارف اور پروین شاکر کو شاہی انعام ملنے کے معاملے میں آپ کو میری اور سرکار کی رائے میں حیرت انگیز مماثلت نظر آئی لیکن اس معاملے میں اس بات کو نظر انداز نہ کیجئے کہ میں نے Establishment سے نہیں Establishment نے میری رائے سے اتفاق کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ادب کے معاملے میں Establishment سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر یہ کہ کسی چیز کی اچھائی سے صرف اس لیے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ بُرے لوگ بھی اسے اچھا کہہ رہے ہیں۔

اگر آپ میرے تنقیدی رویوں پر مضمون لکھنا چاہتے ہیں تو میں آپ سے کس طرح کا تعاون کروں؟ کتابوں کے سلسلے میں میرے آپ کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ آپ میری ایک ایک کتاب کی فوٹو کاپی کرواتے جائیں گے لیکن اس معاہدے کے بعد آپ طویل مدت تک مفقود الخبر رہے اور مجھے یہاں آ جانا پڑا۔ میری تقریباً تمام کتابیں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہیں۔ آپ ان سے استفادے کی کوئی صورت نکالیں۔

معلوم نہیں رسالہ صریر کراچی آپ کی نظر سے گزرتا ہے یا نہیں۔ وہ رسالہ جدیدیت کا نمائندہ ہے۔ آپ اسے دیکھتے رہیں۔

ساختیاتی تنقید پر اردو رسائل میں جو بحثیں چلتی رہی ہیں اور جو مضامین لکھے جاتے رہے ہیں ان سے کچھ واضح نہیں ہوتا۔ مغرب میں ساختیات اور پس ساختیات کا شور وغل ختم ہو چکا ہے لیکن ان تنقیدی تحریکات خصوصاً لاتشکیل deconstruction نے ادب میں جو تباہی پھیلائی ہے ابھی اس کی بھنک بھی اردو ادب کو نہیں لگی ہے۔

طویل عرصے کے بعد فاروق کا خط آیا ہے۔ اس لڑکے کی نیت بخیر ہے۔ آئندہ میری قسمت میں فاروق کے نام دو خط بھیج چکا ہوں اور سب بدستور۔

خیر طلب نظیر صدیقی

☆☆☆

۹۲-۸-۵ (کراچی)

عزیز مکرم سلام و دعا

تمہارا خط مورخہ ۱۸ جولائی مجھے ۲۳ جولائی کو مل گیا تھا جس کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ تمہارا اندازہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ فاروق میری کتاب چھاپنے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ مجھے آج تک اس کا کوئی خط نہیں ملا۔ وہ غلط کہتا ہے کہ خط لکھ دیا گیا ہے۔ میں نے کتاب کے بارے میں صحیح صورت حال معلوم کرنے کے لیے نیشنل بک کاؤنسل آف پاکستان کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر محمد خالد چودھری کے نام ۲۶ جولائی کو ارجنٹ میل کے ذریعے خط بھیجا ہے کہ وہ بتائیں کہ انھیں میری کتاب کی ۴۰۰ جلدیں ملیں کہ نہیں اور اگر اب تک میری کتاب نہیں چھپی ہے تو کیا انہوں نے فاروق کو مزید وقت دیا ہے۔ اگر دیا ہے تو کب تک؟

میں نے انھیں لکھ دیا ہے کہ فاروق کتاب شائع نہیں کر سکے گا۔ لہٰذا مجھے تین مہینے کا مزید وقت دے دیں۔

بک کاؤنسل کا دفتر بلیو ایریا کے سعید پلازہ کی تیسری منزل میں ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس خط کے ساتھ خالد صاحب سے جا کر مل لو اور صحیح صورتِ حال معلوم کر کے لکھ بھیجو۔ تم خالد صاحب سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتاؤ کہ مجھے نظیر صدیقی صاحب نے آپ سے ملنے اور صورت حال معلوم کرنے کے لیے کہا ہے۔

اگر فاروق کتاب شائع کر رہا ہے اور اگر اب بھی شائع کر دے تو خیر ورنہ دوسرا قدم اُٹھانا ہی پڑے گا۔

تم پہلے فاروق سے مل کر صورتِ حال معلوم کرنے کی کوشش کرو اور اس کے جوابات سے صورتِ حال کا صحیح اندازہ کرو۔

'صریر' کا سالنامہ میرے پاس آیا تو ہے لیکن وزیر آغا کی شاعری پر تمہارا مضمون نہیں پڑھ سکا ہوں۔ اوّل تو موجودہ ملازمت نے ادھ موا کر رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ مجھے ان کی شاعری سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ پھر بھی کوشش کروں گا کہ تمہارا مضمون پڑھ سکوں۔ تمہارے ایم۔فل کا کیا بنا؟

اخباروں سے معلوم ہوا کہ اسلام آباد اور پنڈی میں شدید بارش ہو رہی ہے۔ یہاں بھی بارش نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔

تمہارے خط کا شدید انتظار رہے گا۔

خیر طلب نظیر صدیقی

☆☆☆

۵/ نومبر ۱۹۹۲ء

عزیز مکرم رفیق سندیلوی صاحب السلام علیکم

مَیں آپ کی طویل خاموشی کا مطلب یہ سمجھا کہ آپ میری دی ہوئی زحمتوں سے اُکتا گئے۔ ایسا ہونا فطری تھا مگر ناگزیر نہیں سو اب معلوم ہوا کہ آپ سخت بیمار رہے۔ شدید علالت جوانوں کا بھی مقسوم ہے لیکن عام طور پر ذہن اس طرف نہیں جاتا۔

مکان کی تلاش اور نئے مکان میں منتقل ہونا یہ بھی ایک سخت مسئلہ ہے۔ خود مَیں گزشتہ مہینے میں مکان کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اب ایک صاحب کے ہاں Paying Guest ہو گیا ہوں' مگر خط و کتابت کے لیے پُرانا پتا برقرار رہے گا۔

مَیں جولائی سے ہمدرد فاؤنڈیشن میں کُل وقتی ملازمت کرنے لگا ہوں۔ دو جگہوں (اسلام آباد اور کراچی) کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کل وقتی ملازمت کے علاوہ بھی مزدوری کرتا رہا ہوں۔

مَیں نے کتاب کے مسئلے کو جہاں کا تہاں چھوڑ رکھا ہے۔ کر بھی کیا سکتا ہوں لیکن مَیں نے کل فاروق ملک کو ایک خط لکھا ہے کہ اگر کتاب کی طباعت کا خیال ہو تو اس میں سے دو مضمون ضرور نکال دیئے جائیں۔ موجودہ حالات کا تقاضا یہی ہے ورنہ سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تمہارا ایم۔فل کس منزل میں ہے؟ اگر ممکن ہو تو مجھ سے رابطہ رکھو۔ کیا ڈاکٹر ذکی (وائس چانسلر) ریٹائر ہو گئے؟

خیر طلب نظیر صدیقی

☆☆☆

۶ مئی ۹۳

عزیزم رفیق پرسوں تمہاری دونوں کتابیں خط کے ساتھ موصول ہوئیں۔ اگرچہ آج کل طبیعت بہت بے کیف ہے پھر بھی چونکہ تمہیں لائبریری کی کتاب واپس کرنی ہے۔ اس لیے کل ضمنی انتخابات کے سلسلے میں دفاتر کے بند رہنے کی وجہ سے جو چھٹی ملی تو مَیں نے تمہاری کتاب پڑھ کر ایک مختصر تبصرہ لکھ ڈالا۔ خدا کرے تمہیں پسند آئے۔ ایک تو کراچی کی گرمی۔ دوسرے مَیں جس کمرے میں رہتا ہوں اس میں دھوپ آتی ہے۔ تیسرے پنکھا ناقص ہے۔ پوری ہوا نہیں دیتا۔ چوتھے کھانے پینے کا نظام درست نہیں۔ ایسی حالت میں آدمی تخلیقی کام کیا کرے۔

تمہاری دوسری کتاب پر اپنے ایک دوست صبا اکرام سے جو جدید شاعروں میں سے ہیں اور 'لیڈر' نام کے انگریزی اخبار میں کالم (ہفتہ وار) لکھتے ہیں ان سے تبصرہ کروا دوں گا۔ محمد علی صدیقی سے میری ملاقات بہت کم ہوتی ہے۔ یہاں لوگوں کے وعدے وعید پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

میری انگریزی کتاب کو حتی الامکان جلد چھپواؤ۔ کسی قسم کی غیر ضروری تاخیر کو راہ نہ دو۔ ایک تو زندگی خود نا قابلِ اعتبار ہے پھر ہم جیسے عمر

رسیدہ لوگوں کا کیا بھروسا۔

جہاں تک میرے تبصروں کا تعلق ہے شاید اس خط کے ملنے سے پہلے تمہیں میرے یہاں سے تبصروں کا پیکٹ مل چکا ہو۔ اگر نہ ملا تو میرے ہاں فون (413584) کر کے وقت مقررہ پر میرے گھر چلے جاؤ اور تبصروں کا پیکٹ وصول کر لو۔ تم جن تبصروں کی شمولیت ضروری سمجھتے ہو وہ اگر اس پیکٹ میں نہ ہوں تو کہیں سے حاصل کر لو۔ ہونے کو میرے ہاں بھی ہو سکتے ہیں لیکن تمہیں ڈھونڈ کر کون دے گا۔ میرے بچوں کو معلوم نہیں کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ ۱۹۹۱ء سے لے کر اب تک 'ادبیات' میں جو تبصرے شائع ہوئے ہیں ان میں سب تو نہیں لیکن کچھ بہت اچھے ہیں۔ کہیں سے ادبیات حاصل کر کے فوٹو کاپی کرا لو اور ان کی فہرست مجھے لکھ بھیجو تا کہ مجھے معلوم ہو کہ تم کن تبصروں کو منتخب کر رہے ہو۔

اگر فاروق ملک' فون پر معلوم کر سکو تو معلوم کرو کہ وہ میری کتاب کے سلسلے میں کیا کر رہے ہیں۔ بک کاؤنسل نے انھیں کون سی تاریخ دی اور کتاب طباعت کی کون سی منزل میں ہے۔

ایم۔ فل کے نتیجے سے آگاہ کرو گے۔ مراسلت کا سلسلہ جاری رکھو۔ خط و طرجسٹرڈ بھیجنے کی بجائے UMS کے ذریعے بھیجا کرو۔ پیسے برابر لگیں گے لیکن چیز جلد پہنچے گی۔

اپنی صحت کا خیال رکھو۔ اس معاملے میں معمولی غفلت بھی روا نہیں۔ باقی آئندہ

خیر طلب نظیر صدیقی

☆☆☆
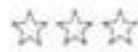
۴ جولائی ۱۹۹۳ء

عزیز مکرم رفیق سندیلوی سلام و دعا ایک مدت کے بعد کل تمہارا خط مورخہ ۲۶ جون ملا۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ تم ادھر خاصے بیمار رہے۔ میں تو تمہیں اچھی حالت میں چھوڑ کر آیا تھا۔ بہر حال خوشی ہوئی کہ تمہارے مرض کی صحیح تشخیص ہوگئی۔ یقین ہے کہ اب علاج مؤثر ہوگا۔ پرہیز علاج کا لازمی حصہ ہے۔ چونکہ آنت کی سوزش تشخیص کی گئی ہے اس لیے موسم کے ٹھنڈے پھل ضرور کھاتے رہو۔ اس سلسلے میں اپنے معالج سے مشورہ کر لینا۔ صحت کی حالت سے مجھے مطلع کرتے رہو۔

مجھے خوشی ہے کہ تم نے نہایت صاف گوئی کے ساتھ میرے تبصرے سے متعلق اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ دراصل خود مجھے اندیشہ تھا کہ تبصرہ شاید ہی تمہیں پسند آئے لیکن موجودہ حالات میں اس سے بہتر لکھنا ممکن نہ تھا۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کراچی میں کس قسم کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ دراصل میں صرف اپنی زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں۔

تین دن پہلے بیٹے کا خط آیا تھا کہ رفیق سندیلوی صاحب تبصروں کا پیکٹ لینے کے لیے آنے والے ہیں۔ اب نہ جانے تم گئے تو پیکٹ مل سکا یا نہیں۔ میں تو ایک مدت سے بیٹے کو لکھتا رہا ہوں کہ رفیق کو گھر بلا کر پیکٹ دے دو۔

ان تبصروں میں 'ادبیات' اور 'فنون' والے تبصرے نہیں ہیں۔ تم خود مہیا کر لو گے۔ ایک تبصرہ سرور بارہ بنکوی (مرحوم) کی کتاب ۔۔۔ 'میتی پر ہے۔ مجھے اس کی ضرورت آ پڑی ہے۔ اس کی ایک فوٹو کاپی بھیج دو۔

فاروق کے بارے میں مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اب کے بھی کامیاب نہ ہوں گے۔ سو اب تک صورتِ حال یہی ہے۔ ان کے حادثے کا افسوس ہے۔ میں ان کو خط لکھ رہا ہوں۔

تم اگر میرے تبصروں سے پہلے میری انگریزی کتاب کی طباعت میں کامیاب ہو جاؤ تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔

تمہیں ایم۔ فل کی ڈگری ضرور مل جائے گی۔ ہر معاملے میں تاخیر قومی تقدیر بن چکی ہے۔ لہٰذا تاخیر سے نہ گھبراؤ۔

مجھے 'اوراق' نہیں ملتا۔ وزیر آغا صاحب کو میرا موجودہ پتا معلوم نہ تھا' جب معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ انہوں نے میرا پتا لاہور بھیج دیا ہے۔ پھر بھی 'اوراق' میرے نام نہیں آتا۔

وزیر آغا کی شاعری پر تمہارا مضمون دوبارہ مل جائے تو پڑھ کر اپنے تاثرات بتاؤں گا۔ دراصل یہاں میری ادبی زندگی مکمل طور پر ختم ہو چکی

ہے۔ نیوز کراچی میں ادبی صحافت کی حد تک زندہ ہوں۔

خط لکھتے رہو اور صورتِ حال سے مطلع کرتے رہو۔ میری شکایتوں کا بُرا نہ مانو۔ میرے حالات و واقعات بہت صبر آزما رہے ہیں۔

'ایک رات کا ذکر' پر تبصرہ آیا کہ نہیں معلوم کر کے لکھوں گا۔ آج کل ان صاحب (صبا اکرام) سے ملاقات نہیں ہو رہی ہے' جن سے میں نے تبصرہ کرنے کے لیے کہا تھا۔

خیر طلب نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۲/اگست ۱۹۹۴ء

ڈیئر رفیق تمہارا خط مورخہ ۸/اگست مجھے ۱۸/اگست کو مل گیا تھا۔ چونکہ ادھر تین دن مسلسل چھٹیاں ہیں لہٰذا جواب آج (۲۲ کو) لکھ رہا ہوں۔

تمہارے خط کے ملنے سے کوئی دو دن قبل مَیں نے تمہارے نام ایک خط بھیجا جس میں تم سے تین باتیں دریافت کیں۔ تمہارے موجودہ خط میں تینوں باتوں کا جواب موجود ہے۔

مجھے یہ بتاؤ کہ افتخار عارف کا جو رویہ میری طرف ہے کیا اس کے پیش نظر اس کی کتاب سے متعلق تبصرے کو اپنے تبصروں کے مجموعے میں شامل کرنا مناسب ہوگا؟ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اب اس تبصرے کو اپنے کسی مجموعے میں شامل نہ کروں گو ایسا کرنے سے ایک حد تک ایک معاصر کی حق تلفی ضرور ہوگی جس کے لیے میرا ضمیر آمادہ نہیں لیکن افتخار کا انسانی طرزِ عمل اس کو اس بات کا مستحق بناتا ہے کہ اسے میں نظر انداز کرتا رہوں۔

تم فاروق ملک کو ۳۸۰۰ سے کم (تین ہزار) قبول کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ ابھی تک میرے اس کے درمیان کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکا ہے۔ وہ اپنے کسی لمحے میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس نے مجھے -/40000 روپے کا نقصان پہنچایا ہے اور اس کے باوجود وہ اپنے -/3800 روپے کے لیے بے چین ہے۔ اگر میری کتاب چھپ کر بک کاؤنسل کو پہنچ گئی ہوتی تو مجھے -/400 جلدوں کی قیمت -/40000 روپے مل گئے ہوتے۔ مگر فاروق کی دروغ گوئی اور کاروباری نااہلیت کی بنا پر مَیں نہ صرف چالیس ہزار روپے سے محروم رہا بلکہ کتاب کے چھپنے میں اس نے مجھے بلا وجہ چار سال انتظار کے کرب سے گزارا۔ اگر تم ان باتوں کو سمجھا سکو تو سمجھاؤ اور احساس دلاؤ کہ اگر میں اسے تین ہزار بھی دے دوں تو یہ میرا احسان ہوگا۔

خدا کرے موجودہ ہفتے میں بک کاؤنسل کی طرف سے اعلان ہو جائے اور میری کتاب کا مسودہ منظوری کے لیے داخل ہو سکے۔

تم نے جو انتخاب کیا ہے یقیناً اچھا ہی ہوگا۔ مَیں نے بعض چھوٹے چھوٹے مضامین بھی اس لیے شامل کر لیے تھے کہ وہ میرے خیالات کی ترجمانی ضرور کر رہے ہیں اور ان موضوعات پر مجھے تفصیل کے ساتھ لکھنے کی مہلت نہ مل سکی۔

اگر ممکن ہو تو ایسے مضامین کو تبصروں والے مجموعے میں ڈال دو گے تا کہ وہ ردّی کی ٹوکری میں نہ جانے پائیں۔ تم ان مضامین کی ایک فہرست بھیج دو جنہیں تم زیرِ ترتیب کتاب میں شامل نہیں کر رہے ہو۔ اگر کسی خاص وجہ سے مجھے دو ایک مضمون کے لیے اصرار کرنا پڑا تو کروں گا۔ ورنہ مرتب کی حیثیت سے تمہارے اختیارات میں دخل نہیں دوں گا۔ تم چاہو تو اپنی کتاب (ایک رات کا ذکر) سے متعلق تبصرے کو بطور مضمون اس کتاب میں شامل کر لو۔ اب اس میں اضافہ کر کے اسے مضمون بنانا میرے بس کی بات نہیں رہی۔ وہ تبصرہ جس رَو میں لکھا گیا اس کی بازیابی ممکن نہیں۔ ویسے تمہاری کتابوں سے متعلق تبصرے میرے تبصروں کے مجموعے میں تو رہیں گے ہی اور میری وہ کتاب بھی میری اچھی کتابوں میں ہوگی۔

تم اپنے دیباچے کی ایک نقل بھیج دو۔ میں تمہاری رائیں بدلوانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ بہ حیثیت مرتب اچھی بُری رایوں کے ذمہ دار خود تم رہو گے۔ اکبر حمیدی کو فون پر ضرور بتا دینا کہ ان کا ارسال کردہ رسالہ (نیرنگِ خیال) مجھ تک نہیں پہنچا۔

تم فاروق ملک کو پھر ایک مرتبہ نرم الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کرو اور اسے احساس دلاؤ کہ مجھے چالیس ہزار کا نقصان پہنچانے کے بعد -/3800 کے لیے اصرار کرنا زیادتی ہے۔ ناانصافی ہے بلکہ یہ ذاتی ہے (خیر یہ لفظ استعمال نہ کرنا)

تمہاری جواب کا انتظار رہے گا۔

خیر طلب نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۳/ نومبر ۱۹۹۳ء

عزیزم رفیق کل تمہارا خط ملا۔ تمہیں بارہ روپے والی بات اچھی نہیں لگی لیکن مَیں کیا کرتا کہ مَیں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا کہ مسودے کا محصول ڈاک میرے ذمے ہوگا۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بارہ روپے کس طرح بھیجوں۔ بہر حال اب گولی مارو اس بات کو۔ حساب دوستاں در دل۔ اس سلسلے میں میرے الفاظ سے تمہیں جو تکلیف پہنچی اس کے لیے مجھے سراپا معذرت سمجھو۔

تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ جو مسودہ تم نے واپس کیا اس کی طباعت کا ایک معقول بندوبست ہو گیا لیکن اس سلسلے کی تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا۔

ماجد صدیقی نے جو بل دیا ہے اس پر اعتراض ضرور ہے۔ غالباً تم نے بھی کہا تھا کہ Charges مناسب نہیں ہیں۔ بہر حال یہ مسئلہ حل ہو رہے گا۔

اگر فاروق ملک بھی مسودہ واپس کر دیتے تو میں اس کی طباعت کے متعلق کسی سے بات کر سکتا۔ ان کے مسودے میں مسائل اور کم ہیں۔ انھیں یہ سمجھا سکو تو سمجھاؤ کہ ایسی صورت میں جبکہ وہ اسے اپنے خرچ سے شائع نہیں کرنا چاہتے اور بک کاؤنسل سے انھیں منظوری ملنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے اگر وہ مسودہ مجھے واپس کر دیں تو ان کا کوئی نقصان ہر گز نہیں کیونکہ کمپوزنگ میں انہوں نے جتنا خرچ کیا ہے وہ تو انھیں واپس مل ہی جائے گا۔ اگر وہ کتاب شائع کر سکتے تو Profit کے مالک ہوتے لیکن چونکہ وہ شائع نہیں کر پا رہے ہیں لہٰذا اگر میں شائع کرا سکوں تو اس سے انھیں کوئی نقصان تو ہر گز نہیں پہنچے گا۔ اس کتاب کی طباعت کے معاملے کو بھی چار سال ہو رہے ہیں۔ اگر وہ مجھ سے خوشگوار تعلقات رکھیں گے تو مَیں انھیں آئندہ کوئی دوسری کتاب بھی دے سکتا ہوں لیکن جو صورت انہوں نے اختیار کی ہے اس میں تو نقصان ہی نقصان ہے۔ اُن کے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔ ان خطوط پر ایک مرتبہ اور انھیں سمجھا کر دیکھو۔

بعض اوقات یا بسا اوقات اگر مَیں تمہارے ادبی سوالات کا تشفی بخش جواب نہیں دے پاتا تو اس کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل تو بسا اوقات خط عجلت میں لکھتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ بسا اوقات تمہارے سوالات مشکل اور غور طلب ہوتے ہیں۔ فوری طور پر کوئی واضح جواب بن نہیں پڑتا۔ مثلاً تم نے کچھ عرصہ قبل پوچھا تھا کہ کیا عمر کے اس موڑ پر آپ کے دل میں اقداری تنقید کے دائرے سے نکلنے کی خواہش اُبھرتی ہے؟

''اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ کی تنقیدوں میں کس طرز کا مطالعہ کارفرما ہے تو آپ کیا جواب دیں گے؟''

میرے ذہن میں ان سوالوں کا کوئی تشفی بخش جواب ہے ہی نہیں۔ ساختیات پر کچھ لکھنے کے باوجود ابھی تک ساختیاتی 'طرزِ مطالعہ میرے قابو میں آیا ہی نہیں۔ میں ہنوز ساختیاتی تنقید کے بنیادی معروضات اور اس کے طریق کار سے مطمئن نہیں ہوں۔ یہاں کی زندگی میں بوجوہ میرا وقت بہت ضائع ہوتا رہا ہے۔ اگر مَیں اس وقت کو کام میں لا سکتا تو میں ساختیات کا مزید سنجیدہ مطالعہ کر کے اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتا۔ میری زندگی کا موجودہ دَور صرف Survival کے لیے سخت معاشی جدوجہد کا دَور بن کر رہ گیا ہے۔ علم (ہر قسم کا علم) اور ادب اس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے کہ اس کے ساتھ ہم قدمی نہایت دُشوار ہو گئی ہے۔ اب میری عمر کا تقاضا صرف رسالوں میں چھپ جانا اور چھپتے رہنا نہیں۔۔۔ یہ کام تو مَیں اب بھی آسانی سے کر سکتا ہوں۔۔۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مَیں بنیادی مسائل سے ٹکر لے کر کوئی کام کی بات کہہ سکوں سو یہ نہیں ہو پا رہا ہے۔

میری تنقیدی تحریروں کے عقب میں کس طرز کا مطالعہ کارفرما ہے۔ اس کا جواب مجھے نہیں میرے نقادوں کو دینا چاہیے لیکن اردو ادب میں نقادوں کے نقاد تو ہیں ہی نہیں۔

ذرا اکبر حمیدی صاحب کی خبر لو۔ وہ اپنی کتاب پر میرا تبصرہ پڑھ کر ناراض تو نہیں ہو گئے۔ اکبر حمیدی جیسے دوستوں کو مجھ سے اختلاف کرنے اور میری باتوں کو بکواس قرار دینے کا حق تو ہے لیکن ناراض ہونے کا حق نہیں۔ تمہارے خط کا انتظار رہے گا۔

فاروق ملک کو کسی طرح مسودے کی واپسی پر راضی کرو۔

خیر طلب نظیر صدیقی

پروفیسر نظیر صدیقی بنام زاہد منیر عامر

زاہد منیر عامر

''مجھے ہندوستان سے بلاوا آیا ہے' سوداؔ پر ایک سیمی نار ہے جس میں مقالہ پڑھنے کا موقع مل رہا ہے' میرا خیال ہے کہ میں سوداؔ کی غزل پر لکھوں' عام طور سے تو سوداؔ کو قصیدے ہی کا شاعر سمجھا جاتا ہے' تمہارا کیا خیال ہے؟'' ۱۰/دسمبر ۲۰۰۰ء کو ہونے والی ملاقات میں نظیر صدیقی صاحب نے مجھے اپنے عزمِ سفر سے یوں مطلع کیا' میں ایک ہی روز قبل یومِ اقبال کے حوالے سے پاکستان ٹیلی ویژن کی خصوصی ٹرانسمیشن میں شرکت کے لیے اسلام آباد پہنچا تھا' عرض کیا گیا کہ عام لوگوں کے اس خیال کا جواب تو خود سوداؔ نے یہ کہہ کر دے دیا ہے ؎

جو یہ کہتے ہیں کہ سوداؔ کا قصیدہ ہے بہت خوب
ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

نظیر صدیقی صاحب نے توجہ سے شعر سنا۔ میں نے عرض کیا اگرچہ سوداؔ اپنی غزل پر فخر کر رہے ہیں اور انہوں نے اس کے علاوہ ہجو' مثنوی' شہر آشوب اور مرثیہ وغیرہ بھی کہا ہے لیکن ان سب کے باوصف سوداؔ کا اصل کمال قصیدے ہی میں ظاہر ہوا ہے۔ فرمانے لگے بھئی میں تو قصیدے کو شاعری نہیں سمجھتا' اس لیے قصیدے میں ظاہر ہونے والا کمال بے کار ہی رہا۔ میں نے کہا اس میں شبہ نہیں کہ قصیدہ بے معنی مبالغہ آرائی کا مظہر بنا رہا لیکن یہ ایک خاص عہد اور تہذیب میں مختلف علوم و فنون سے واقفیت اور فنِ شعر پر دسترس کے اظہار کا ذریعہ بھی تو تھا۔ جہاں تک سوداؔ کا تعلق ہے تو اُس کی غزل بہرحال ایسی نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے مثلاً یہی شعر کہ

سوداؔ جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

اس شعر کی بہت داد دی' اور کہنے لگے کہ ہاں یہ واقعی شاعری ہے' غالباً یہی ایک شعر سوداؔ کی غزلیات کا حاصل ہے۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ اُردو شاعری میں شاید یہ مضمون سوداؔ سے پہلے کسی نے نہیں باندھا' پہلے کیا بعد میں بھی نظر نہیں آتا۔ فراق کا ایک شعر البتہ اس کے برابر ہے ؎

یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی چاند کا ٹکڑا نہ کوئی زہرہ جبیں

نظیر صدیقی صاحب کا خیال تھا کہ ان دونوں شعروں میں مضمون اور تجربہ یکساں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ سوداؔ کا شعر فراقؔ سے کہیں بڑھ کر ہے' سوداؔ کے شعر میں ''اتنا تو نہیں وہ'' اور ''کس آن میں دیکھا'' کہہ کر امکانات کے جو آفاق کھول دیے گئے ہیں اور پھر شعر میں جو کیفیت ہے وہ فراق کے شعر میں نہیں' فراق نے سوداؔ کے شعر کے ایک حصے کو چھونے میں کامیابی حاصل کی ہے' ''یونہی سا تھا'' ''مٹا ڈالا'' اور دوسرے مصرعے کی تردید نے مضمون کو محدود کر دیا ہے۔ بہرحال اُس رات نظیر صدیقی صاحب سے سوداؔ کی غزل پر دیر تک گفتگو ہوئی' وہ سوداؔ کے بارے میں خوش رائے نہیں تھے لیکن انھیں اس پر مضمون لکھنا تھا چنانچہ ان کا ذہن سوداؔ سے ہٹ کر بار بار اپنی پسند کے دوسرے شعرا کی طرف جاتا تھا۔ بعد ازاں انھوں نے جب یہ مضمون لکھ لیا تو اس میں بھی ان کی یہ ذہنی کش مکش ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکی' یہ مضمون ان کی زندگی کی آخری تحریر ثابت ہوا' شاید خود انھیں بھی اس بات کا اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے غالب اور اقبال سے متعلق اپنے مجموعۂ مضامین میں اس مضمون کو شامل کر دیا' اگرچہ گزارشِ احوالِ واقعی میں یہ وضاحت بھی کی کہ اس مضمون کا اصل کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مضمون اس کتاب میں صرف اس لیے شامل کیا جا رہا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ اس کتاب کے بعد میرے تنقیدی مضامین کا کوئی اور مجموعہ میری زندگی میں شائع نہ ہو سکے بعد میں کیا ہوگا کون جانتا ہے' لہٰذا یہ بے قاعدگی معاف فرمائی جائے۔

اس معذرت ہی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ آنے والے وقت کے قدموں کی چاپ سن رہے تھے۔اس رات جب ان سے یہ گفتگو ہو رہی تھی ان کی آخری کتاب کے طابع صاحب تشریف لے آئے' کتاب کا سرورق طے کرنا تھا وہ غالب اور اقبال کی کچھ تصاویر لائے تھے' اقبال کی ایک تصویر میں اقبال کے سر پر ٹوپی تھی' دوسری ٹوپی کے بغیر۔نظیر صاحب ٹوپی والی تصویر کو مسترد کرتے ہوئے کہنے لگے: مجھے مولوی والا اقبال نہیں چاہیے۔پھر انہوں نے طابع کو میری اسی سال چھپنے والی دو کتابیں نکال کر دکھائیں اور کہا کہ کیا میری کتابیں اتنی خوب صورت نہیں چھپ سکتیں' میری تو حسرت ہی رہی کہ کبھی میری کوئی کتاب بھی اتنی خوب صورت شائع ہو۔طابع سے میرا تعارف کروا کر کہنے لگے کہ ان سے پوچھو ایسی کتاب کیوں کر چھپ سکتی ہے۔۔۔؟میں نے ان کے حسب منشا طابع صاحب سے کچھ گفتگو کی اور کتاب کے سرورق کے سلسلے میں بعض باتیں ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی۔طابع صاحب کے جانے کے بعد کہنے لگے اس کتاب کا انتساب کیا ہونا چاہیے' میں نے عرض کیا یہ تو نجی انتخاب کا معاملہ ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔۔۔؟فرمایا میں اس عہد کے دو لکھنے والوں کی نثر سے متاثر ہوا ہوں' سوچتا ہوں کہ اس کتاب کو جو غالباً میری آخری کتاب ہوگی انہی کے نام منسوب کروں لیکن وہ دونوں بہت نک چڑھے (او کما قال) ہیں۔مجھے یقین ہے کہ اس انتساب کا شکریہ ادا کرنا تو ایک طرف وہ رسید تک نہیں دیں گے' انہوں نے ان دونوں محترم اور معتبر نثر نگاروں کے حوالے سے اپنے کچھ تجربات بھی بیان کیے جن میں ناخوشی کا پہلو غالب تھا۔نظیر صدیقی صاحب کی انصاف پسندی کی داد دینی چاہیے کہ جب کتاب چھپ کر آئی تو اس کا انتساب انہی دونوں نثر نگاروں کے نام تھا جن سے انھیں رسید تک کی توقع نہیں تھی۔

اس ملاقات کی ایک یاد یہ بھی ہے کہ انہوں نے میرے دوسرے شعری مجموعے 'تراکس آئنوں' میں پر اپنا تاثر لکھ رکھا تھا اور اس شام یہ تحریر انہوں نے مجھے پڑھ کر سنائی اس کے آغاز میں انہوں نے لکھ دیا تھا کہ ہمارے تعلق کی عمر تیس برس ہے میں نے عرض کیا کہ اتنا عرصہ نہیں گزرا انہوں نے اسے کاٹ کر پچیس کر دیا میں نے عرض کیا شاید یہ بھی زائد ہے انہوں نے اسے ایک بار پھر کاٹا اور بیس برس کر دیا۔۔۔انسان کی نگاہ بھی کتنی محدود ہوتی ہے اس وقت بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تعلق کی عمر کا جو یہ حساب لگایا جا رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ نظیر صدیقی صاحب سے میری آخری ملاقات ہے۔یہ حساب پرندوں کی مثال کی طرح ثابت ہوا جو جدائی کا استعارہ ہوا کرتی ہے۔ان سے میرا رابطہ ۱۹۸۳ء میں ہوا' برادر گرامی ڈاکٹر نثار احمد قریشی صاحب اس رابطے کا سبب بنے۔اس کے بعد ان کی وفات تک یعنی لگ بھگ اٹھارہ انیس برس ان سے تعلق رہا اور ان اٹھارہ انیس سالوں میں آغاز ۱۹۸۹ء تک مسلسل مراسلت بھی رہی۔۱۹۸۹ء میں میرے لاہور آ جانے کے بعد کا زمانہ تغیرات اور دربدری کا شکار رہا۔اس لیے مراسلت بہت کم ہو سکی۔طویل وقفے کے بعد یہ سلسلہ ۱۹۹۸ء میں پہلے سے جوش و خروش کے ساتھ بحال ہوا اور پھر رنگ و بو کے اس جہان سے مرحوم کے رخصت ہو جانے تک جاری رہا۔

وہ عمر' علم اور تجربے میں مجھ سے بہت سینئر تھے لیکن ان کے ساتھ تعلق بے تکلف نوعیت کا رہا۔ان کے خیالات سے مجھے کبھی اتفاق نہ ہو سکا اور ان کی شخصیت سے کبھی دوری نہ ہوئی۔میں نے انھیں ہمیشہ زندگی کا شکوہ سنج پایا' وہ دنیا جہان سے مایوس دکھائی دیتے تھے مایوسی کا نتیجہ عام طور پر بے عملی کی صورت میں نکلا کرتا ہے لیکن ان کی مایوسی انھیں مزید فعال بنائے رکھتی تھی وہ اپنی تحریروں اور کتابوں کی اشاعت کے بارے میں بہت متفکر رہے گو ان کی بیس کے قریب کتابیں شائع ہوئی' بعض کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن نکلے لیکن اپنے ناشرین کے ساتھ ان کے تعلقات کبھی اچھے نہ رہے۔

انھیں زندگی سے دوسرے شکووں کے علاوہ یہ شکوہ بھی تھا کہ اہلِ دنیا نے ان کی قدر و منزلت نہیں پہچانی یا اگر پہچانی تو اس کا اعتراف نہیں کیا وہ اکثر اس بات کا اظہار بھی کیا کرتے تھے' یہ اظہار بجائے خود ان کے باطن میں کروٹیں لیتی تمنائے حیات (Urge of Life) کا مظہر تھا اگرچہ ان کی زندگی میں ان پر ہندوستان سے ایک پی۔ایچ۔ڈی اور پاکستان سے ایم۔اے کی سطح کا تحقیقی کام ہوا اور ان کی خدمات کے اعتراف میں ایک کتاب نذر نظیر بھی شائع ہوئی لیکن ان کی ناشکیبائی اور شکوہ سنجی ختم ہونے والی نہ تھی جس کا نتیجہ غم' مایوسی اور کبھی غصے کی صورت میں نکلا کرتا تھا۔

وہ بقول خود غم و غصہ کو اپنی شاعری اور انشائیوں کے محرکات قرار دیتے تھے لیکن ان کی شخصیت وضع دار اور مہذب تھی۔ان کا کہنا تھا کہ ''میری زندگی جن تلخ حالات سے گزری ہے ان میں میرے ایسے حساس آدمی کا کلبی ہو جانا حیرت ناک نہیں۔کلبیت میری طبیعت اور تحریروں میں

ضرور آ گئی ہے لیکن میری کوشش یہ رہی ہے کہ میرے طرزِ عمل میں نہ آنے پائے۔ مزاجاً اور اصولاً میں انسان دوست آدمی ہوں۔'' یہ بات بہت حد تک درست ہے' زندگی سے ان کی مایوسی فلسفیانہ سطح تک تھی' عملاً وہ ایک زندگی دوست اور زندہ شخص تھے۔

آئندہ صفحات میں نقل کیے جانے والے ان کے خطوط ان کی زندہ شخصیت کے آئینہ دار ہیں' میرا خیال ہے کہ ان خطوں میں ان کی شخصیت کے بہت سے رنگ جھلک رہے ہیں' میں نے ۱۹۹۸ء میں ان سے متعلق ایم۔اے کا ایک تحقیقی مقالہ ''پروفیسر نظیر صدیقی ۔۔۔ حیات وتصنیفات'' لکھوایا تھا' اس مقالے کے حوالے سے مجھے ان کے جو خطوط موصول ہوئے ان میں نظیر صدیقی صاحب کے سوانح اور تصنیفات کے بارے میں ایسی معلومات آ گئی ہیں جو اب کسی اور مآخذ سے نہیں مل سکیں گی۔ زاہدہ عابد حنا (اب زاہدہ ندیم حنا) کے اس مقالے کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں مندرج معلومات کی تحقیق وتصدیق خود نظیر صدیقی صاحب سے کی گئی تھی اور یہ مقالہ تکمیل کے بعد ان کی خدمت میں پیش بھی کیا گیا تھا اور انہوں نیا سے دقتِ نظر سے دیکھ کر باقی رہ جانے والے اسقام کی نشاندہی بھی کر دی تھی' چونکہ ان کے ساتھ ربط وضبط کی عمر طویل رہی اس لیے میرے پاس ان کے خطوط خاصی تعداد میں ہیں لیکن ضخامت بڑھ جانے کے اندیشے کے باعث یہاں محض چند خطوط پیش کیے جا رہے ہیں۔

خطوط

۱۴/ ستمبر ۸۳ء

عزیز مکرم دعائیں پہلے آپ کی کتاب ملی۔ بعد میں آپ کا خط۔ حیرت ہوئی کہ اتنے سال کی غیر حاضری کے باوجود مولانا تاج محمود نے مجھے پہچان لیا اور بقول آپ کے میری تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ یہ ان کی انسانی عظمت ہے کہ وہ اپنے اتنے معمولی نیاز مند کو یاد رکھتے ہیں اور جب اس کا ذکر آ جاتا ہے تو اس کی تعریف میں ڈھیروں کلمات خیر کہہ جاتے ہیں۔

آپ کے ذہن میں جو سوالات ہیں انھیں ضرور لکھ بھیجیں ممکن ہے تشفی بخش جواب نہ دے سکوں لیکن وہ میرے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور سب بدستور۔ بقر عید مبارک۔

مخلص نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۹/ اکتوبر ۱۹۸۳ء

عزیز مکرم السلام علیکم آپ کا خط مورخہ ۲۲/ اکتوبر ملا۔ اس سے پہلے والا خط بھی مل چکا تھا۔ کیا عرض کروں کہ کن حالات اور مسائل کا سامنا ہے۔ تفصیل میں طوالت ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ ہنوز آپ کی کتاب نہیں پڑھ سکا ہوں اور غالباً ایک آدھ مہینہ اور بھی نہیں پڑھ سکوں گا ؎

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

جہاں تک آپ کے دونوں سوالوں کا تعلق ہے مختصراً عرض ہے کہ (۱) نفسِ انسانی میں قدرت نے جو کمزوریاں رکھی ہیں اور اس دنیا میں جسم وجان کے رشتے کو قائم رکھنے کے لیے انسان کو جن حالات سے گزرنا پڑتا ہے ان میں اخلاقی اقدار کی پامالی ناگزیر ہے۔ صرف فرشتہ سیرت لوگ اپنی جان پر کھیل کر اخلاقی اقدار کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور انسانی آبادی میں ان کا تناسب جیسا کچھ ہے ظاہر ہے۔

(۲)۔ اگر یہ بات میں نے کہی تھی کہ کوئی بھی مفکر ذہنی انتشار سے پاک نہیں ہوتا تو یاد نہیں آتا کہ کس سیاق وسباق میں کہی تھی اور اگر یہ بات کسی اور نے کہی ہے تو اس کا جواب یا اس کی جوابدہی مجھ پر فرض نہیں۔

خورشید رضوی صاحب سے حالیہ اہلِ قلم کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا تھا۔

اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ اپنا پتا ہر خط میں لکھ دیا کریں۔

خیر طلب نظیر صدیقی

☆☆☆

۲۲/دسمبر ۱۹۸۳ء (اسلام آباد)

عزیزم زاہد منیر آپ کا خط مل گیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔ میری زندگی طوفانوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہے۔ کبھی سکون نصیب نہیں ہوتا۔ پچھلے چھ مہینے بہت بُرے گزرے ہیں۔ ان کی داستان طویل ہے۔ ان حالات کے باوجود میں آپ کی کتاب کو جستہ جستہ دیکھتا رہا ہوں۔ میں آپ کی تحریری اور تخلیقی صلاحیتوں کا قائل ہوں۔ آپ نے زمانے کی ایک عظیم شخصیت پر بڑے سلیقے سے قلم اُٹھایا ہے۔ مواد کی تلاش و ترتیب اور لکھنے کا انداز بہت خوب ہے۔ ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ یہ باتیں رسمی طور پر آپ سے جان چھڑانے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ علم و ادب کے سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ کریں گے۔

اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں سے کبھی کبھی مطلع کرتے رہیے۔

خیر طلب نظیر صدیقی

نوٹ: 'تخلیقی ادب' کا تیسرا شمارہ دو ہفتے قبل شائع ہو چکا ہے۔ ابھی تک میرے پاس نہیں پہنچا لیکن معلوم ہوا ہے کہ اس میں میرا سفر نامہ 'لندن' بھی شامل ہے۔ کہیں سے حاصل کر کے پڑھیں۔

☆☆☆

۲۰/مارچ ۱۹۸۴ء

عزیز مکرم دعائیں تمہارا خط ملا تو سخت ندامت ہوئی کہ میں مولانا تاج محمود کی وفات پر تمہارے نام تعزیتی خط نہ بھیج سکا۔ ان کی وفات کا مجھے بھی بڑا صدمہ ہے۔ مرنا تو خیر ہر ایک کو ہے لیکن دل چاہتا ہے کہ کاش وہ کچھ دن اور زندہ رہتے۔ تم چونکہ ان سے بہت قریبی رہے اس لیے تمہیں ان کی وفات سے سخت صدمہ پہنچنا ہی تھا۔ خدا مرحوم کو سایۂ رحمت میں جگہ دے اور ان سے محبت کرنے والوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

تمہاری علالت کی اطلاع میرے لیے باعثِ تردد ہے۔ تم اپنے صدمے پر قابو پانے کی کوشش کرو تا کہ تمہاری صحت درست ہو سکے۔ ابھی تمہیں اپنے مدوحین کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔

ڈاکٹر شبلی جرمنی سے واپس آ گئے ہیں۔ ان کے احباب نے ان سے مولانا مرحوم پر مضمون کی فرمائش کر رکھی ہے۔ جہاں تک میرے لکھنے کا تعلق ہے دشواری یہ بھی ہے کہ مولانا سے صرف ایک ملاقات ہو سکی تھی اور اس کی تفصیلات یاد نہیں رہیں۔ اپنی خیریت سے جلد مطلع کرو۔

ہاں میں نے اپنی کتاب 'اردو ادب کے مغربی دریچے' کی ایک جلد ڈاکٹر خورشید رضوی کے نام بھیجی ہے۔ آج تک رسید نہیں آئی۔ اگر ممکن ہو تو تم ان سے کتاب مستعار لے کر پڑھو۔

خیر طلب نظیر صدیقی

☆☆☆

۸/دسمبر ۸۴ء

عزیز مکرم تمہارا خط ملا۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے گفتگو کر کے تمہاری پریشانیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں اپنی عمر بھر کی پریشانیوں میں کسی کو شریک تو نہیں کرنا چاہتا لیکن اس کا کیا علاج کہ گفتگو میں وہی باتیں کہنے پر مجبور ہوں جو تمام عمر سوچتا رہا ہوں۔ میری سوچ غیر صحت مند یا غلط ہو سکتی ہے اور اگر غلط یا غیر صحت مند نہ بھی ہو تو کم از کم پریشان کن تو ضرور ہی ہے۔ میرے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی لیکن میں اپنے ادراک اور احساس کو کس طرح جھٹلاؤں۔ میرے سوچنے سے کائنات کی گتھیاں سلجھ تو نہیں سکتیں لیکن میری بصارت اور بصیرت اس حقیقت سے کیونکر انکار کر دے

کہ کائنات گتھیوں سے خالی نہیں۔ انسان کی تاریخ چاہے ماضی کی ہو یا حال کی ہمیشہ لہولہان رہی ہے اور رہے گی۔ انسان کے اندر جو خباثتیں ہیں وہ دنیا کو کبھی امن و امان کا مرکز نہیں بننے دیں گی۔ بہر حال اسی بُری دنیا میں مجھے بھی جینا ہے۔ تاب لاتے ہی بنے گی غالب۔

سکون مجھے بھی عزیز ہے لیکن وہ سکون نہیں جو حقائق سے چشم پوشی کر کے حاصل کیا جاتا ہے۔ انسانی فکر کے لیے حدود کا تعین ایک لایعنی کوشش ہے۔ کبھی فرصت ہو تو یہ بتاؤ گے کہ تمہیں میرے کون سے اشعار خاص طور پر پسند آئے۔ کتابت کی کچھ غلطیاں یہاں وہاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً آخر کے صفحوں میں (۸۷) پہلے شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے۔

سب گوارا ہے مجھے تیری مروّت کے سوا

گوارا کی جگہ گورا شائع ہو گیا ہے۔ اسی صفحے میں دوسرے شعر کے دوسرے مصرع کو یوں بنا لو غیر ممکن تو نہ تھا اس کو چھپائے رکھنا

چوتھی غزل (۱۱) کے دوسرے شعر کے پہلے مصرع کو یوں کر لو

ع رات سے شکایت کیا بس تمہیں سے کہنا ہے

صفحہ ۳۰ پر جو غزل ہے اس کا ایک یہ مطلع نوٹ کر لو

حالات اب تو اتنے دشوار ہو گئے ہیں
ہم نیم شب میں اکثر بیدار ہو گئے ہیں

تم نے جو دو سوال لکھ بھیجے ہیں ان کے جواب میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ

(۱)۔ آپ صرف نوجوان نسل پر فکری انتشار کا الزام کیوں رکھ رہے ہیں۔ ہماری تو پوری قوم فکری انتشار میں مبتلا ہے۔

(۲)۔ جس طرح کے فکری انتشار سے ہم دوچار ہیں اس کے ہوتے ہوئے ہمارا فکری مستقبل تو ایک طرف زمانی مستقبل بھی کوئی ہے یا نہیں یہ کہنا دشوار ہے۔

میں ان دنوں بڑی مصروفیتوں میں مبتلا ہوں۔ لہٰذا اپنی کتاب کے بارے میں نہایت مختصر رائے پر قناعت کرو۔ تبصرہ لکھنا قطعاً ممکن نہیں۔

خیر طلب نظیر صدیقی

☆☆☆

۲/ فروری ۱۹۸۵ء (اسلام آباد)

ڈیئر زاہد پرسوں آپ کا میگزین اور اس کے ساتھ آپ کا خط ملا۔ اس سے پہلے جو خط آپ نے بھیجا تھا وہ بھی مل گیا تھا۔ میں جنوری کے مہینے میں حسب معمول مصروف ہی نہیں خلاف معمول بیمار بھی بہت رہا۔ شاید فلو ہو گیا تھا جس کے تھوڑے بہت اثرات ابھی تک باقی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے پہلے خط کا جواب نہ دے سکا۔

میگزین آپ نے بہت اچھا نکالا ہے۔ جدید نسل سے متعلق سوالات اور ارباب قلم کے جوابات کا حصہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سوچ کے کتنے مختلف بلکہ متضاد زاویے ہوتے ہیں۔

مولانا تاج محمود سے اپنی طویل گفتگو کی تفصیل یاد نہیں رہی۔ اس تفصیل کے بغیر مضمون بے جان ہوگا۔ ڈاکٹر شبلی نے "اولاکنے" ایڈیٹر صاحب سے براہ راست وعدہ کر رکھا ہے۔ ویسے ایفائے وعدہ پاکستانیوں کا کوئی مضبوط پہلو نہیں۔

چونکہ 'جنگ' لاہور میری نظر سے نہیں گزرتا اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ انور سدید اور سلیم اختر نے میری کتابوں کا تذکرہ کس انداز سے کیا۔ اگر آپ ان کے الفاظ لکھ بھیجیں تو ممنون ہوں گا۔

میری کتاب 'جدید اردو غزل ۔۔۔ ایک مطالعہ' پر آئندہ ایک ہفتے کے اندر ٹی وی پر تبصرہ آنے والا ہے۔ اگر ممکن ہو تو پروگرام دیکھ لیجئے گا۔

اور سب بدستور۔

'حسرت اظہار' کے پسندیدہ اشعار لکھ بھیجئے۔

خیر طلب نظیر صدیقی

آذر زوبی

بشیر موجد

برسوں پہلے کی بات ہے۔ جب زوبی حکومت پاکستان کی جانب سے دو سال کے لیے وظیفے پر اٹلی گئے تھے۔ واپس آئے تو انہوں نے مال روڈ پر روز نامہ ''ہلال پاکستان'' کے دفتر کے قریب دوسری منزل میں اپنا تصویر خانہ (Studio) قائم کیا۔ ان دِنوں لاہور میں بین الاقوامی شہرت کے دو استاد مصور جناب عبدالرحمٰن چغتائی اور استاد اللہ بخش موجود تھے جو اپنے اپنے اسلوب کے آپ ہی خالق تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی بین الاقوامیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب ہمارے ہمسایہ ملک بھارت نے دہلی میں نیشنل آرٹ گیلری قائم کی تو ان دونوں مصوروں کو اپنی گیلری میں نمایاں جگہ دی۔ میرے نزدیک پاکستان کے ان دو قدآور مصوروں کا ذکر کیے بغیر مصوری کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوتی اور نہ نیشنل آرٹ گیلری اور نہ ہی اس بنیادی ضرورت کو آج تک ہمارے ثقافتی اداروں نے محسوس کیا۔ حالانکہ سب سے پہلا کام کرنے کا یہی تھا۔

یہ ثقافتی ادارے اور آرٹ کونسلیں ہر سال لاکھوں روپے کی گرانٹ حکومت سے وصول کرتی آ رہی ہیں لیکن کسی مستقل اور بنیادی کام کی طرح آج تک نہیں ڈالی جا سکی۔

ذکر تو میں زوبی صاحب کا کرنے لگا تھا لیکن آغاز کار ہی میں ایک ایسی تلخ حقیقت سامنے آ گئی جس کا ذکر کیے بغیر نہ رہ سکا مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اس اظہار میں مسرت حاصل ہوتی ہے کہ اس دور میں مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی اور استاد اللہ بخش کے بعد جن چند مصوروں کا نام سامنے آتا ہے ان سب میں نمایاں نام آذر زوبی کا تھا۔

قدیم وجدید آرٹ دونوں میں جن کا برش یکساں صلاحیت سے رواں تھا۔ ان دِنوں وہ کمرشل اور فائن آرٹ کے امتزاج سے ایک نئے اسلوب مصوری کی بنیاد رکھنے میں مصروف تھے اور اپنی اس کوشش میں خاصے کامیاب اور مقبول تھے۔ گو ان کے بعض ہم عصروں نے بھی اس اسلوب کو اپنانے کی شعوری کوششیں کیں، مگر وہ کامرانی کی منزل سے ہم کنار نہ ہو سکے۔

جب کسی رسالے یا کتاب کا سرورق چغتائی صاحب کے نقوش سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آتا تو مہینوں فن کاروں میں اس ڈیزائن کا تذکرہ رہتا۔ اسی طرح جب زوبی صاحب کا کوئی سرورق زوبیت سے مزین ہو کر شائع ہوتا تو وہ بھی خاص و عام سے داد ضرور وصول کرتا۔

زوبی صاحب کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ اسحٰق شور جو ایک خطاط اور مصوّر ہیں اور حضرت احسان دانش اور زوبی صاحب کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ میرا بھی ان سے نیازمندی کا سلسلہ برسوں پُرانا ہے۔ الحمدللہ کہ اس میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔

میں اپنے کام سے فارغ ہوتا تو اکثر استاذی المکرّم حضرت احسان دانش کے ہاں چلا جاتا۔ استاد محترم کا مکتبہ ان دِنوں مال روڈ پر تھا جہاں آج کل لاڈز ہوٹل ہے۔ یہ اس وقت ایک جنرل سٹور تھا۔ اس کے ساتھ والی بلڈنگ کے اُوپر والی منزل پر چشتی برادر کے ساتھ ایک کمرہ جسے دو حصوں میں مساوی تقسیم کیا گیا تھا۔ آدھے میں ''مکتبہ دانش'' اور آدھے میں دوا مزکر تھا۔ احسان صاحب نے اپنے ایک مہاجر حکیم دوست کو از راہِ دوستی نصف کمرہ دے رکھا تھا۔ اگر کبھی احسان صاحب نہ ملتے تو میں اسحاق شور کی طرف چلا جاتا۔

اسحٰق شور کا درویش خانہ موجودہ پنجاب آرٹ کونسل، جو ان دِنوں جادوگر وال بلڈنگ کہلاتی تھی، کے عقب میں ایک چھوٹی سی یتیم سی مسجد کے قریب دو جھونپڑا نما کمروں میں مشتمل تھا۔ جہاں کبھی کبھی لاہور کے چند ادیب شاعر اور مصوّر مل بیٹھتے تھے، جن میں شاکر علی، شمر اقطب شیخ، علی امام، حضرت احسان دانش مرحوم و مغفور اور حکیم حافظ جلیل مرحوم پرنسپل طبیہ کالج کے نام مجھے آج بھی یاد رہ گئے ہیں۔

ایک دن میں اسحاق شور کی طرف جا رہا تھا۔ سخت گرمی کے دن تھے جب میں مال روڈ پر پہنچا تو ایک جگہ شکّر کا شربت پینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ شکّر کا شربت بیچنے والا ایک ہی آدمی تھا جو اپنی پیٹھ پر مشک کا برتن اُٹھائے گرمیوں میں مال روڈ پر شربت فروخت کیا کرتا تھا ان دِنوں اس کا ریٹ ایک آنہ فی گلاس تھا۔

مَیں شربت پی کر ابھی فارغ نہیں ہوا تھا کہ سامنے اسحٰق شور اور ان کے ساتھ ایک خوب رُو نوجوان کھلتے ہوئے گندمی رنگ‘ لمبے سیاہ بال‘ تیکھے نقش‘ آنکھوں پر چشمہ‘ پینٹ اور شرٹ میں ملبوس۔ ملاقات کی رسمی علیک سلیک کے بعد شور صاحب نے کہا ہم حکیم جلیل صاحب کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر تم فارغ ہو تو ہمارا ساتھ دو۔ مَیں ان دونوں کے ساتھ ہولیا۔ ہمیں پیدل بیڈن روڈ سے گزر کر گوالمنڈی کے راستے چوک برف خانہ پہنچنا تھا۔ چوک برف خانہ سے فلیمنگ روڈ کی طرف چند قدم چلیں تو دائیں ہاتھ دواخانہ اور بائیں ہاتھ دوسری منزل پر حکیم صاحب کا مطب تھا۔ جب ہم چوک برف خانے کے قریب پہنچے شور صاحب نے ایک دم چونکتے ہوئے‘ جیسے کوئی بات اچانک یاد آ گئی ہو‘ کہا: ''معاف کیجیے تعارف کروانا میں تو بھول ہی گیا ان سے ملیے یہ مشہور مصوّر زوبی صاحب ہیں۔ دو برس بعد اٹلی سے واپس لوٹے ہیں۔ ان تاریک گلیوں میں سے گزرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ کچھ علیل بھی ہیں۔ مَیں انھیں دکھانے کے لیے حکیم صاحب کی طرف لے آیا ہوں۔'' اسحٰق صاحب مجھ سے مخاطب تھے۔

''کیا یہ گلیاں دو برس پہلے ایسی تاریک نہ تھیں؟'' مَیں نے کہا۔

''یہ گلیاں تو پہلے بھی ایسی ہی تاریک تھیں۔ اس وقت مجھ میں ایسی روشنی نہ تھی۔'' زوبی بولے۔ یہ میری زوبی صاحب سے پہلی بالمشافہ گفتگو تھی یا اسے پہلا تعارف کہہ لیجیے۔

مطب پہنچ کر اسحٰق شور نے حکیم صاحب سے زوبی کا تعارف کروایا۔ حاضر ہونے کی وجہ بتائی حکیم صاحب نے نسخہ تجویز کیا۔ دواخانہ نیچے تھا۔ حکیم صاحب نے نسخہ ملازم کے ہاتھ نیچے بھیجتے ہوئے کہا ''چائے والے کو چائے بھی کہتے آنا۔'' چائے آنے تک حکیم صاحب زوبی صاحب سے اٹلی کے مصوروں اور آرٹ گیلریوں کے بارے میں معلومات آفریں سوالات کرتے رہے۔ زوبی صاحب کے اندازِ گفتگو اور فنی معلومات سے‘ جس کا اظہار وہ اپنی گفتگو میں فرما رہے تھے‘ حکیم صاحب خاصے متاثر نظر آ رہے تھے۔

حکیم صاحب ایک نامور طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ شعر وادب اور فن مصوری پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اتنے میں چائے آ گئی‘ سلسلۂ کلام منقطع ہو گیا۔

حکیم صاحب دھان پان قسم کے آدمی تھے اور دمے کے مریض تھے‘ باتیں کرتے کرتے ان کی سانس پھول گئی‘ کھانستے کھانستے نڈھال ہو گئے۔ کھانسی ذرا سی رُکتی تو حکیم صاحب معذرت کرنے لگ جاتے‘ پھر کھانسی آ جاتی۔ دوسری یا تیسری دفعہ جو وقفہ ہوا‘ ہم نے اسے غنیمت جان کر اجازت چاہی‘ جو بخوشی مل گئی۔

ہم جس وقت تینوں مطب سے نیچے اُترے‘ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ اس لیے پیدل واپس جانے کی بجائے تینوں ایک دوسرے سے رخصت لے کر تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

زوبی صاحب سے اس تعارف کے بعد اب مَیں دوسرے چوتھے روز زوبی صاحب کے (Studio) تصویر خانے‘ مال روڈ پر جانے لگا۔ گھنٹوں زوبی صاحب کو کام کرتے دیکھتا رہتا اور دل ہی دل میں کہتا کہ کاش میں بھی کبھی ایسا کام کر سکتا۔

یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا زوبی صاحب بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے رہے۔ کبھی کوئی ٹیکنیکل بات پوچھ بیٹھتا تو پُرانے فنکاروں کی طرح چھپانے کی بجائے‘ بڑی فراخ دلی سے مذکورہ نقطہ سمجھا دیتے۔ مَیں ان کی شخصیت کے اس پہلو سے بے حد متاثر تھا۔

ایک دن میرا ایک سرورق ڈیزائن زوبی صاحب کی نظر سے گزرا ہلکی سی داد دی‘ پھر فرمانے لگے تم کل ڈرائنگ بورڈ پوسٹر کلر اور برش وغیرہ لے کر آ جاؤ تم سے بھی معاملہ رہے گا۔

'معاملہ رہے گا' سے مَیں یہ سمجھا کہ چند لڑکیاں اور لڑکے‘ جو اُن کے یہاں مصوری سیکھنے آتے ہیں‘ مجھے بھی شاید ان میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ان کی اس فیاضانہ پیش کش نے میرے دل کو بہت متاثر کیا۔ چند ہی دن بعد حسبِ ارشاد کلر برش وغیرہ لے کر مَیں پہنچ گیا۔ جب مَیں تصویر خانے پہنچا تو زوبی صاحب اس وقت علامہ اقبال کا آئل میں پورٹریٹ بنا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے: ''میرے پاس آپ کے لیے فی الحال کوئی جگہ نہیں‘ جو تمہارے لیے جگہ تھی وہ پُر ہو گئی ہے جب کبھی جگہ خالی ہوئی مَیں تمہیں ضرور بلواؤں گا۔''

مَیں ان کے اس غیر متوقع اندازِ کلام سے چکرا گیا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں خاموش کھڑا رہا۔ زوبی صاحب تھوڑی دیر خاموش رہنے

ہے۔ بعد فرمانے کے چغتائی صاحب کو ایک پین ورک کرنے والے لڑکے کی ضرورت ہے۔ میرا رقعہ لے کر وہاں آج ہی چلے جاؤ۔ تمہارے لیے وہ جگہ بہتر رہے گی۔

زوبی صاحب کی یہ باتیں سنتے ہوئے مجھے اپنے کانوں اور آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ کیا یہ مجھ سے شفقت و محبت سے پیش آنے والے وہی زوبی صاحب ہیں۔ یا کوئی اور؟ بالآخر میں نے کلر برش اُٹھائے اور اپنی آنکھوں کے سامنے چھا جانے والے اندھیرے میں سیڑھیوں کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

میں ابھی سیڑھیوں تک پہنچا بھی نہ تھا کہ زوبی صاحب کی آواز نے میرا راستہ روکا اور کہا:

''چغتائی صاحب کے نام رقعہ تو لیتے جاؤ۔'' واپس ہوتے ہوئے میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رقعہ چغتائی صاحب کے نام لوں یا نہ لوں اتنے میں زوبی صاحب کے تیز قدم سیڑھیوں تک آ پہنچے مجھے رقعہ دیا اور فرمایا: ''تم چغتائی صاحب کے پاس جانا ہو تو آج ہی چلے جاؤ۔''

میں کئی دن تک زوبی صاحب کے اس لب و لہجے کی گرد کو اپنے ذہن سے جھاڑتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ آخر ایسا ہوا کیوں۔ یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو یہ بات سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ جن شخصیتوں کا دل میں احترام ہو ان کی چھوٹی موٹی باتوں کو بھول ہی جانا بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا میں چند دن بعد اس واقعے کو بھولنے میں کامیاب ہو گیا۔

کچھ دن بعد مصورِ مشرق عبدالرحمن چغتائی صاحب کی خدمت میں زوبی صاحب کا رقعہ لے کر حاضر ہوا چغتائی صاحب کے بھائی رحیم چغتائی صاحب کمال مہربانی سے پیش آئے۔ مجھ سے رقعہ لے کر چغتائی صاحب کو دیا۔ چغتائی صاحب نے مجھے اُوپر کی منزل پر بلوا لیا جہاں وہ کام کرتے تھے۔

سب سے پہلے مجھ سے یہ وعدہ لیا کہ میں ان کے کسی بھی کام کی نقل اپنے پاس نہیں رکھوں گا دوسرا یہ کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ میں ان کے ساتھ کام کر رہا ہوں اور تیسرا یہ کہ جو کام بھی ہو گا وہ گھر سے مکمل کر کے لے آیا کروں گا۔ یہاں بیٹھ کر کام کرنے کی جگہ نہ ملے گی اور اُجرت جو مناسب ہو گی وہ ادا ہو جائے گی۔

میں تقریباً دو سال چار ماہ تک چغتائی صاحب کی فنی خدمت بجا لاتا رہا۔ اُس زمانے میں چغتائی صاحب علامہ اقبال پر کام کر رہے تھے۔

ان کے یہاں کام کرنے سے مجھے Wash Painting واش پینٹنگ کی ٹیکنیک کو سمجھنے میں خاصی مدد ملی اس زمانے کی داستان بھی بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ وقت نہیں۔

زوبی صاحب کے متذکرہ رویے کے بعد میں نے ان کے Studio میں جانا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد دو چار بار ملاقات بھی ہوئی لیکن نہ انہوں نے کبھی مجھ سے نہ آنے کی وجہ پوچھی اور نہ میں نے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات کی۔ حتیٰ کہ وہ لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے۔ اب جب بھی وہ مجھ سے ملتے ہیں تو میں اسی احترام سے ان کا استقبال کرتا ہوں۔

جب کوئی واقعہ یا حادثہ انسانی زندگی میں رونما ہوتا ہے تو حساس انسان پر اس کا شدید ردِعمل ہوتا ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرے لیے یہ بہت ہی برا ہوا لیکن مشیت ایزدی کا منشا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ برسوں بعد آج یہ نکتہ میری سمجھ میں آیا ہے۔ اگر زوبی صاحب مجھے اس طرح چغتائی صاحب کے پاس نہ بھیجتے تو جو فیض چغتائی صاحب کی صحبت سے مجھے حاصل ہوا میں اس سے محروم رہ جاتا اور نہ مجھے اس دور کے نامور مصور کو قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوتی۔

زوبی صاحب نے کراچی جا کر ایک مالدار آرٹسٹ خاتون سے شادی کر لی تھی۔ زوبی کے قریب ترین دوست اسحٰق شور میرے بھی مہربان دوستوں میں سے تھے ایک دن تشریف لائے تو بہت دُکھی دکھائی دے رہے تھے۔

چہرے پر کرب کی کیفیت دیکھ کر میں نے پوچھ لیا کہ بھائی گھر بار تو خیریت سے ہے نا۔ ''سب خیریت ہے'' اسحٰق شور نے قدرے دُکھی لہجے میں کہا پھر کہنے لگے زوبی میرے قریب ترین دوستوں میں سے ایک ہیں۔ انسان دوستی کا پرچار کرتا رہتا تھا محبت و شفقت اس کی شخصیت میں رچی بسی تھی لیکن کراچی جا کر اس کی شخصیت میں تبدیلی آ گئی ہے لاہور والا زوبی کہیں گم ہو گیا ہے۔ کراچی والے زوبی نے اپنی پہلی بیوی جس نے غربت

کے ایام میں اس کا ساتھ دیا تھا وہ اٹلی گیا تو دو سال تک اس کی راہ دیکھتی رہی ایسی وفا شعار بیوی کو اس نے طلاق دے دی ہے۔

''زوبی ایک حساس انسان تھا یقیناً دوسری طرف سے بھی کوئی نا قابل برداشت فروگزاشت ہوئی ہوگی جس کا یہ انجام ہوا۔''

''پھر یہ زوبی صاحب کا ذاتی معاملہ ہے۔'' میری بات کاٹتے ہوئے شور ذرا تلخ لہجے میں کہنے لگے: ''یہ انسانی معاملہ بھی تو ہے۔ میں زوبی کے گھریلو حالات سے واقف ہوں اور اس نیک فطرت خاتون کو بھی جانتا ہوں اس لیے دُکھی ہو رہا ہوں۔''

میں ایک بار کراچی گیا تو زوبی صاحب سے تعلق دیرینہ کی بنا پر صدر بازار جہاں پر ان کا دفتر اور پرنٹنگ پریس تھا' ملنے چلا گیا گیٹ پر پہنچ کر میرے ہاتھ Bell دبانے کے لیے اُٹھے پھر نہ جانے میرے اندر ایک فوری تبدیلی کا عمل شروع ہو گیا۔ میرے اُٹھے ہاتھ وہیں کے وہیں رُک گئے۔ میں نے واپس ہوتے ہوئے اپنے اندر کی آواز پر کان دھرا تو مجھے بتایا گیا کہ کراچی آنے سے چند روز پہلے ایک دن اسحٰق شور' جرمنی سے آئے ہوئے قطب شیخ اور شاکر علی میرے دفتر آئے۔ باتوں باتوں میں جب زوبی کا ذکر ہوا تو اسحٰق شور نے ایک تکلیف دہ خبر بتائی جس نے سب کو دُکھی کر دیا۔ شور خبر کی تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگے کہ زوبی کی سابقہ بیوی ہیڈن روڈ کے جس محلے میں ایک باوقار بیوی' ایک گھر کی مالکن بن کر کئی برس تک رہائش پذیر رہی گردشِ زمانہ دیکھئے کہ آج وہ اسی محلے میں انہی محلے داروں کے گھروں میں ملازمت کر کے ان کے کپڑے اور برتن دھو کر زندگی کے دن گزارنے پر خود کو مجبور پا رہی ہے۔

اس دردناک تفصیل سے سب افسردہ خاطر ہوئے تھے اس واقعہ کے یاد آتے ہی میرے ہاتھوں میں عمل کی قوت ساکت ہو گئی تھی اور میں زوبی کو ملے بغیر واپس آ گیا تھا۔

نثری نظمیں

کرۂ عنقا

احمد ہمیش

جب زمین پر آسمان کے ستاروں بھر بھی روشنی نہیں رہ جائے گی
تو کیا ہوگا!
صرف اندھیرا ہوگا اور اندھیرے میں روتی ہوئی بلیوں کی
آنکھیں چمک رہی ہوں گی
جب روتی ہوئی بلیوں کی چمکتی ہوئی آنکھیں بھی نہیں ہوں گی تو کیا ہوگا!
محبت سے لمس جدا ہو جائے گا
یا جب خیال ہی خیال میں سبز گھاس اُگے گی تو کیا ہوگا!
محبت بیر بہوٹی بن جائے گی
مگر لمس کے بغیر بیر بہوٹی کا مخمل کس کام آئے گا!
خدا کے نادیدہ ہاتھ کو تھام کے اندھیرے میں چلنے کی کوشش ہی تو دعا کا
نظام ہے
اس نظام میں پانی کی گہرائی جانے بغیر اُس میں اترنے کی کوشش ہی تو
محبت کا نظام ہے
خیال ہی خیال میں کوئی کتنے دن مہم جوئی کرے گا
زندگی کو جانے بغیر تو موت بے نام ونشان ہوگی
راستہ اپنا بتانے کے لئے تو کبھی کسی مسافر کے پاس نہیں آیا
سفر اور مسافر کے درمیان کبھی زندگی ہوتی ہے تو کبھی موت
جب یہ کہا جاتا ہے کہ پڑاؤ آجائے تو ٹھہر جاؤ
بس وہیں سانس لینا یاد نہیں رہتا
چہرہ چہرے سے گزر رہا ہوتا ہے
جب یہ کہا جاتا ہے کہ عمر تمام ہو جائے تو الٹی گنتی گنو
بس وہیں گزری ہوئی زندگی یاد نہیں آتی
سوائے اس کتبہ کے جس پہ نام کے حروف اور تاریخ کے ہندسے تو درج
نظر آتے ہیں
مگر کسی تمام کا ناتمام نظر نہیں آتا

میں تمہاری ہتھیلیوں میں زندہ رہوں گا

احمد سہیل

میں تمہاری ہتھیلیوں پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں
مجھے معلوم ہے
شام کی گلی سے جنازہ گزرے گا
انجان مردے اس کو کندھا دیں گے
تمہاری آنکھیں دھوئیں کے بادل ہیں
جو روح نہیں بن سکتی
میری روح
تمہارے جسم میں اُگ آئے گی
مگر روح کے پودے کو
درخت بننے سے پہلے
تمہاری اُنگلیاں چاٹ لیتی ہیں

بادل زمین پر آ کر
پھر اُڑ گیا
چاندنی کے ساتھ اڑیں گی
اور سنگھار کرتی لڑکیاں
چکنی مٹی سے چہرہ پوتیں گی
درختوں کے پتے
میرا نوحہ گاتے ہوئے
بادل کے ساتھ اُڑ جائیں گے
اور مَیں
زمین پر مر کے بھی نہ مر سکوں گا
مَیں تمہاری ہتھیلیوں میں زندہ رہوں گا

پانیوں میں سانس

احمد سہیل

پانیوں میں سانس نہیں لیا جاتا
مَیں زندگی کو آواز دیتا ہوں
قاتل میرے سینے میں خنجر چھپا دیتا ہے
ہمیں سنہری انار رکھنے کے جرم میں جلا دیا جاتا ہے

لڑکی دھوپ سے اُلجھ کے گر پڑتی ہے
زندگی کو نوک دار
دانتوں سے کُتر کے پھینک دیا گیا ہے
لڑکی پانیوں پر پھول بناتی ہے
لڑکی کے خوابوں کو
لاک اپ میں بند کر دیا گیا ہے
سیاہ عقاب
اسے پنجوں میں جکڑ کر اُڑ جاتا ہے
لڑکی پگھل جاتی ہے

میں آگ پر قدم رکھتے ہی اپنا نام بھول جاتا ہوں

ہزاروں سال بعد

سلیم آغا قزلباش

ایک بار پھر
روشنی کی ڈور سے
بندھے چلے آئے ہو
آؤ ذرا میرے پاس بیٹھو
لگتا ہے طویل مسافت'
طے کرتے کرتے تھک گئے ہو
کچھ دن میرے پاس رکو
تم سے ہزاروں باتیں کرنا ہیں
عجیب بات ہے
تم آج بھی پہلے کی طرح
روشن و تاباں ہو
لگتا ہے اپنا خوب خیال رکھتے ہو

نہیں ایسی کوئی بات نہیں
تم جانتی ہو' میں ہوں ہی ایسا
ہزاروں سال پہلے
جب میں یہاں سے گزرا تھا
تم کتنی تازہ دم تھیں
پھولوں' پیڑوں' جھرنوں کے جلو میں
گنگناتی 'لہلہاتی پھرتی تھیں

مجھے یاد ہے' اچھی طرح یاد ہے
تم نے کتنے چاؤ سے کہا تھا:
یہیں میرے قریب ہی بس جاؤ
خوب گزرے گی
مگر مجھے جانا تھا
میں ٹھہرا ایک بنجارہ
میرے پاؤں میں سدا کا چکر ہے
میں کیسے ٹھہر سکتا تھا!
آج ہزاروں سال بعد
تم کو دوبارہ دیکھا ہے
تو جی بھر آیا ہے
کتنی بدل گئی ہو تم
خدارا! اپنے آنسوؤں کو روکو
مجھ سے تمہارے آنسو دیکھے نہیں جاتے
کیا کہا:
مَیں تم کو بھی اپنے ساتھ لے چلوں
پگلی کہیں کی بھلا یہ کیسے ممکن ہے!

بُت شکن

سلیم آغا قزلباش

ہر کھڑی عمارت
ہر مربوط سلسلے
ہر ثابت و سالم شے کو
وہ اکھاڑ پچھاڑ رہا ہے
خود کو وہ ایک
بت شکن سمجھتا ہے
مگر جوڑنے' بنانے اور پرونے کا ادنیٰ کام
اس نے دوسروں کے لیے
چھوڑ دیا ہے

"كُلُّ نفسٍ ذائقة المَوت"

عبداللہ عظیم

میں ہر اُس بات پر رو پڑتا ہوں
جس بات پر
شاید کوئی افسوس بھی نہیں کرتا
بھلا یہ کیا بات ہوئی
صبح کے وقت
جب ابھی سورج
اُفق کی منڈیر پر اپنے پر بھی نہیں کھولتا
مجھے اگر فضا کی وسعتوں میں
پرندے اُڑتے ہوئے نظر نہ آئیں
تو میں رو پڑتا ہوں

بے چینی کا "Climax"
شاید صرف مجھے ہی خوفناک حد تک بے چین کرتا ہے
بھلا یہ کیا بات ہوئی
کہ مجھ سے بے خبر
اگر مرا محبوب مجھے پلٹ کر نہ دیکھے
تو میں رو پڑتا ہوں
کتنی معمولی بات ہوتی ہے بارش
کسی بھی موسم کی بارش
آسمانی باپ اور دھرتی ماتا کے بیچ
نمو اور روئیدگی کا یہ پانی
کیا یہ محض پانی ہوتا ہے؟
یہی سوچ کر میں بارش میں
بچوں کی طرح خوش اور بڑوں کی طرح ہمیشہ رو پڑتا ہوں
اور یوں
آسمانوں کا میٹھا رس' سمندر کے کھارے پانی سے مل جاتا ہے

ماورا

نجم الدین احمد

پہلی بار جب
زبان تکلم بھول جائے
الفاظ اپنا وجود کھودیں
بدن سے بدن گفتگو کرے
بند فضا میں جھنکار گونجے
سانس میں سانس اُلجھنے لگے
تنفس کی گرمی سے بدن پگھلنے لگے
مزہ مدہوشی اور اضطراب
خواب میں نیند' نیند میں خواب
کیف میں درد' درد میں کیف
نہ کوئی اُلجھن' نہ خوف
کسی کی بانہوں میں بدن ٹوٹے
رگ وپے میں خمار بن کے آبشار پھوٹے
کیا ہمسفر کے ہمراہ
زیست کی پہلی رات کا لمحہ
امر ہوتا ہے
سوچ سے اس قدر حسیں
تصوّر سے اس قدر ماورا۔۔۔؟

تیتری

محمد قیصر الاسلام

ساتوں رنگ کی دھنک تھی
اُس کے پَروں میں
وہ پوری جان سے بھاگا تھا
اُسے پکڑنے کو
ہر بار وہ اُس کے ہاتھ آتے آتے رہ جاتی
اُس کے پَروں کے لمس کو
اس کی اُنگلیوں کی پوریں

سارى زندگى ترستى رہيں

وہ بھاگتا رہا۔۔۔

وہ طرح دیتی رہی۔۔۔

اب وہ اُس کی ٹھنڈی آنکھ پر بیٹھی

کہہ رہی تھی۔۔۔آؤ۔۔۔

مجھے چھولو۔۔۔

چھو نہیں سکتے تو پکڑنے کی تمنا

آخری بار

روشن ہوتی پتلی میں

اُجاگر کرلو

کہ تمہارے بعد اس کا عکس

تمہاری آنکھ کے پردے پر

نقش ہو کر رہ جائے۔۔۔

بینک کرپسی

سیّد ثروت ضحیٰ

خلوص اور پیار کی

ناکافی سرمایہ کاری سے

کارِ محبت بگڑتا رہا

وصال جو فرض تھا

قرض ہوتا رہا

اور کھاتہ ہجر کا بڑھتا رہا

حسابِ آرزوئے دوست پہ

فاصلوں کا برابر سُود چڑھتا رہا

اور اب آرزوؤں اور اُمیدوں کے تمام

اثاثوں کو میں

اگر جمع بھی کرلوں تو

محبت کی واجب الادا رقم

ادا نہیں کرسکتا

اور کیا کروں کہ میں

کتابِ زیست سے تمہارا نام

محبت کی بینک رپسی

ناممکن محصولات کے خانے میں

لال روشنائی سے بھر نہیں سکتا

تو چلو ہم

دِل کی عدالت میں

جمع کراتے ہیں

کہ اس سے، معاشیات کی رُو سے

تجدیدِ وفا کے

فریش اسٹارٹ کا امکان نظر آتا ہے

مجھے توڑ دو

سیموئل فضل حباب

چلو ہم یوں کرتے ہیں

کچھ مٹی محبت کی لے کر

وفا کے آنسوؤں سے

اُسے ہم گوندھ لیتے ہیں

پھر رکھ کے چاک پہ اُس کو

نئی تخلیق کرتے ہیں

مگر کیا یہ ممکن ہے؟

اگر ہم بنالیں کچا گھڑا!

اُس سے تو کچھ حاصل نہیں!

بھلا کچی مٹی اور بپھری لہریں

کیوں کر جدا رہ سکتی ہیں

اُنھیں تو مدغم ہونا ہے!

تو یوں کرو!

محبت کی مٹی اور وفا کے آنسوؤں سے

تم میرا اک بت بناؤ!

اُسے پھر ہجر کی دُھوپ میں سکھا کر!

تم اپنے ہاتھوں میں پکڑ وا

فضا میں بلند کرو اور!

پھر چھوڑ دو!

مجھے توڑ دو!

سمپوزیم

محرّک: ناصر عباس نیرّ

سوالات

1۔ موجودہ اردو تنقید کے اہم قضیے کون کون سے ہیں؟

2۔ کیا موجودہ اردو تنقید ادب کی تفہیم، تعبیر اور تجزیے کے لیے کچھ ایسے پیراڈائم رکھتی ہے جو جدیدیت (ہیئتی تنقید) اور ترقی پسندی (مارکسی تنقید) کے پیراڈائم سے مختلف اور ممیّز ہوں؟

3۔ اس دعوے میں کتنی سچائی ہے کہ مابعد جدید تنقید نے جدید اور مارکسی تنقید کو بے دخل اور غیر مؤثر کر دیا ہے؟

4۔ تازہ تنقیدی مباحث میں نظری مسائل کو اہمیت دینے کا کیا جواز اور کیا معنویت ہے؟

5۔ مابعد جدید تنقیدی نظریات ہماری ثقافتی اور ادبی صورتِ حال سے کس حد تک متعلق ہیں؟

6۔ اس وقت مختلف اور متعدد تنقیدی نظریات برسرِ عمل ہیں آپ کے نزدیک عمومی طور پر ادب کے لیے اور خصوصی طور پر موجودہ ادب کے لیے کون سا تنقیدی نظریہ زیادہ مفید اور کارگر ہے؟

محمد علی صدیقی

1۔ میرے نزدیک موجودہ اردو تنقید کے اہم موضوعات وہی ہیں جو ہونے چاہئیں اس دور میں ادب کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر کیا ادب مستقل بالذات ''محاسن و معائب'' کے معیارات پر عامل رہنے پر اصرار کرتا ہے یا یہ مادر پدر آزاد ڈسپلن ہو چکا ہے میرے خیال میں ادب انسانی زندگی کو زیادہ متموّل زیادہ بامعنی بنانے کی سعی کرتا ہے۔ یہ اعلیٰ سے اعلیٰ تر اور ارفع سے ارفع تر کی طرف گامزن رہنے کے خواب دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے۔ ہر وہ خطرہ جو انسانی زندگی کو درپیش ہے ادب اس سے پیش آگاہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ حسّی یا فکری طور پر زیادہ آگاہ افراد کا انتخاب ٹھہرتا ہے۔ ہر وہ مسرت جس کا احساس شاعر یا ادیب کو پہلی بار ہوا اُس پر ہم سب کا حق ہو جاتا ہے۔ ہم ادیب کی آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ زندگی کے اہم مسائل پر انسان اُس وقت سے سوچتا آ رہا ہے جب سے اُس کی معلومہ فکر کی تاریخ ہمارے سامنے ہے یہ اور بات ہے کہ پہلے ادب مابعد الطبیعاتی مسائل پر زیادہ غور و فکر کرتا تھا اور اب بھی بعض ادیب مابعد الطبیعات کو بہت اہمیت دیتے ہیں لیکن فی زمانہ مابعد الطبیعات کا دائرہ سکڑتا چلا جا رہا ہے۔ جدیدیت کا ''واحد متکلم'' مابعد الطبیعات کا بڑا دشمن ثابت ہوا ہے اور اٹھارویں صدی کے امپیریلزم (Emperialism) یا Enlightenment کے بعد مادہ اور روح کے مابین بڑھتی ہوئی واضح خلیج نے پہلے ڈیکارٹ I think, therefore i am اور پھر نیطشے کے فکر بھی کیا' اب ہم اِس درجہ اضافیت Relativism کی طرف چلے جا رہے ہیں کہ میرے لیے صرف میری فکر ہی سب کچھ ہے۔ بہر حال انسان مابعد الطبیعاتی سہاروں کو کھو کر تنہا ہو چکا ہے اور اسے سیاسی نظاموں میں کسی بہتر نظام کی تلاش ہے۔ ادب انسانوں کے لیے بہتر سے بہتر نظام کی تلاش میں بھی شریک و سہیم ہے اور ادب اسی تلاش میں جمالیاتی قدر کی اہمیت پر اصرار کا دوسرا نام ہے۔

2۔ ظاہر ہے کہ فکر کا اپنا پیراڈائم ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعاتی فکر کا اپنا پیراڈائم ہے۔ (پیراڈائم سے میری مراد ایک ایسا فکری دائرہ ہے جس کے اپنے مخصوص اصول اور ضوابط ہیں۔ اس میں حقیقت تک رسائی انہی متفقہ علیہ اصول و ضوابط کے مطابق ہوتی ہے۔) اس طرح آج کے فزوں تر غیر مابعد الطبیعاتی فکر کا دوسرا پیراڈائم ہے۔ ہر فکر کے ساتھ ایک متجانس Paradigm ہوتا ہے۔ اب جدید اور ترقی پسند فکر کے لیے پیراڈائم کا فرق

زیادہ اہم نہیں رہا۔ان دونوں میں Reason کی عملداری تھی اور رہے گی۔ نئے پیراڈئم میں یہ قدرِ مشترک بھی نہیں ہے۔

3۔میراخیال ہے کہ اگر ''کلر بلائنڈ'' حضرات اضافیت Relativism کے دَور میں بھی دوسرے مکتبِ فکر کی موجودگی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے مکتبِ فکر کی بے دخلی کے بھی اُسی قدر مرید اور وکیل ہیں جس قدر کہ دوسرے مکاتب۔ میراخیال ہے کہ ہمارے منطقے میں مکاتبِ فکر کی بے دخلی کا خیال ہی بڑا عجیب ہے۔مَیں سمجھتا ہوں کہ ہمارے منطقے میں ابھی جدیدیت بھی پوری طرح نہیں آئی۔ جدیدیت اور ترقی پسندی کا اپنا سلوجزم Sylogism ہے' اپنے صغریٰ اور کبریٰ ہیں اور وہ جن نتائج تک پہنچتے ہیں اُن کے پیراڈائم مفید مطلب نتائج فراہم کرتے رہیں گے۔

4۔تازہ تنقیدی مباحث سے مراد اگر Post-Structuralism یا Postmodernism ہے۔۔۔ جدید ترقی پسندی اور روایتی مکاتبِ فکر کے علاوہ۔۔۔تو میراخیال ہے کہ اوّل الذکر مدرسانہ ضرورت ضرور ہیں۔بعض فروعی مسائل کی اہمیت تسلیم کرنا بڑی بات نہیں ہے لیکن یہ خیال کہ بنیادی سوالات۔۔۔بعض حضرات کی خواہشات کے مطابق۔۔۔ راندۂ درگاہ ہو گئے ہیں' خام خیالی ہے اب مغرب میں اخلاقی انتقادیات Ethical Criticism کی بات ہونے لگی ہے اور یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ادب۔۔۔انسانی اظہار کے بہترین جمالیاتی پیکر ہونے کے سبب۔۔۔ انسانی زندگی کے ہم عصری تقاضوں سے انکار نہیں کرسکتا اور یہ خیال بھی کہ نظریہ اور ادب میں اِس درجہ بُعد ہے کہ نظریاتی ادب غیر ادب ہے۔ ناقابل قبول داعیہ ہے۔میرے لیے مابعد جدیدیت اور ردِ ساختیت فکر اور عمل کے لازمی رُخ ہیں۔کیا یہ ہمارے سماج میں۔

اور ہمارا سر دست اس قدر ست رَو ہوسکتا ہے کہ شاید ابھی پچاس سال تک ہمارا بنیادی مسئلہ عادلانہ معاشی زندگی ہی رہے گا اور اگر ایسا ہے تو پھر ادب بھی اس فکر کے تحت لکھا جاتا رہے گا لیکن ادب کے ساتھ محاسن و معائب کے ساتھ لزوم سے اس سوال کا جواب ملتا رہے گا کہ ہر نظریاتی ادب' ادب ہیں ہوسکتا اور ہر غیر نظریاتی ادب' لازمی طور پر ادب ہوسکتا ہے۔کسی تخلیق کے ادبی اور غیر ادبی ہونے کا نظریہ سے زیادہ فنی Perfectionism کو دخل ہے اور دخل رہے گا۔ میں پوسٹ ماڈرنزم کو مغربی دُنیا کی حد تک ایک سامراجی ضرورت خیال کرتا ہوں۔ظاہر ہے کہ معاملہ اس قدر گھمبیر ہے تو پھر اس کے ثقافتی اور ادبی متعلقات بھی ہیں۔ ہمارے منطقہ نے مغرب کی منڈی بنے رہنے کا پروگرام بنا رکھا ہے تو پھر ہم مغربی Intellectualism کی منڈی بھی بنے رہیں گے اور جو ہمارے شہروں اور قصبوں سے چند کلومیٹر فاصلے کی دنیا کے مسائل ہی نہیں ہیں۔

5۔ بہت بڑی حد تک یہ مدرّسانہ ضرورت ہیں۔ان کے بارے میں بحث وتمحیص ہوتی رہنی چاہیے لیکن یہ مسائل ہمارے سماج کے مخصوص مسائل کے ساتھ متعلق Relevant نہیں ہیں اور پھر یہ سوال کہ ہمارے سماج کیلئے کیا ضروری ہے' وہ میرے گزشتہ جوابات میں پوری صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

6۔ ہمارے یہاں روایتی مکتبِ فکر' ترقی پسندانہ مکتبِ فکر' جدید مکتبِ فکر اور ادب پوسٹ ماڈرنزم جس کے اطلاقی نمونے سامنے نہیں آ پائے' سوائے چند نمونوں کے جو صرف ایک شعر کے ایک سے زیادہ تشریحات پر مشتمل ہیں جیسے کہ ڈاکٹر مغنی تبسم کی کتاب ''تحسینِ شعر'' سے عیاں ہیں۔میراخیال ہے کہ سماجی' معاشی اور سیاسی تناظر میں ادب پاروں کی تفہیم جو ایک طرح Inter-disciplilinary فریضہ ہے' سب سے اہم اور موزوں مکتبِ فکر ہے اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں سماجی' معاشی اور سیاسی فکر سے کام لیں اور صرف ادب اور فنونِ لطیفہ کو اس تناظر سے محروم کر دیں۔اگر ایسا ہوا تو یہ بڑی حد تک نامناسب فیصلہ ہوگا۔البتہ یہ شرط کہ ادبی تخلیقات بنیادی طور پر ادب کی کسوٹی پر پورا اُتریں' صحیح خیال ہے۔خواہ یہ کسی بھی مکتبِ فکر کی طرف سے پیش کی جائے۔

ناصر عباس نیر

1۔میری نظر میں موجودہ اُردو تنقید کے اہم قضیے وہ ہیں جو ماسبق اردو تنقید میں نہیں تھے یا جن کے بارے میں ثانی الذکر نے ایک مختلف مؤقف اختیار کیا تھا۔گویا موجودہ اردو تنقید ماقبل تنقید سے کہیں انحراف کرتی ہے' کہیں انقطاع اور کہیں اُس کی توسیع و تقلیب کرتی ہے مثلاً ماسبق اردو تنقید کا موقف تھا کہ ادب ذات کا اظہار ہے مگر موجودہ تنقید اس موقف کو ہی تحلیل کرتی ہے جسے ذات سمجھا جاتا رہا ہے۔وہ بڑی حد تک ثقافتی تشکیل (Cultural

Construction) ہے۔ فرد کا اپنے بارے میں اپنی ذات کے بارے میں تصور خود اُس کا وضع کردہ نہیں ہے بلکہ یہ تصور اُن Discursive حدود کے اندر قائم کیا جا سکتا ہے جو ثقافت نے کھینچ رکھی ہیں' لہٰذا ادب میں ذات کا نہیں ثقافتی تشکیلات کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ادب کا مطالعہ ایک فرد کے تجربے کے طور پر نہیں کرنا چاہیے بلکہ ادب کے تجزیے میں اُن ثقافتی حدود کو دریافت کرنا چاہیے جن کے اندر تخلیقی تجربہ واقع ہوتا ہے۔ یہ موقف ماسبق اردو تنقید سے انحراف وانقطاع سے عبارت ہے۔

ماسبق تنقید (ہیئتی تنقید) متن کو خود مختار گردانتی تھی مگر موجودہ تنقید اسے واہمہ خیال کرتی ہے۔ متن کو خود مختار سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ متن جن اجزا کا کل ہے اور ان اجزا کی تنظیم کے لیے جو ضوابط ہیں وہ کہیں سے مستعار نہیں ہیں۔ متن کسی طرح بھی خود سے باہر کی اشیا اور حقائق پر منحصر نہیں ہے۔ موجودہ تنقید متن کے اس تصور کو منسوخ کرتی ہے یہ دلیل دے کر کہ متن ایک لسانی اور ثقافتی تشکیل ہے۔ متن کے اندر متعدد لسانی عوامل اور ثقافتی حکمت عملیاں کارفرما ہوتی ہیں۔ یوں متن کے عناصر دراصل مستعار ہیں' دیگر ادبی اور ثقافتی متون سے ایک متن کے اندر کئی متون باہم ٹکرا رہے ہوتے ہیں اور بے شکل ہو رہے ہوتے ہیں۔ اس طور دیکھیں تو موجودہ تنقید ہیئتی تنقید کی طرح ہی متن اساس ہے مگر یہ متن کے ہیئتی و خود مختار تصور کی تقلیب وتوسیع کرتی ہے۔

2۔ موجودہ تنقید کے معیارات ہیئتی تنقید کے پیراڈائم سے کتنے مختلف ہیں' ان کی طرف اشارہ پہلے سوال کے جواب میں کیا جا چکا ہے۔ موجودہ تنقید مارکسی تنقید (بالخصوص کلاسیکل مارکسی تنقید) سے بھی مختلف پیراڈائم کی علمبردار ہے۔ کلاسیکل مارکسی تنقید ادب کو اُس حقیقت کا ترجمان قرار دیتی ہے جو باہر موجود ہے۔ اصل میں اس تنقید کا زور دو باتوں پر ہے ایک یہ کہ ہیئت اور مواد دو اکائیاں ہیں۔ مواد پہلے اور باہر موجود ہے۔ ہیئت اسے پیش کرنے پر مامور ہے۔ دوسری بات یہ کہ مواد یا باہر وجود رکھنے والی حقیقت ایک مادی' سماجی اور تاریخی حقیقت ہے جو جدلیات پر استوار ہے جب کہ موجودہ تنقید نہ تو مواد کو ہیئت سے الگ قرار دیتی ہے (ہیئتی تنقید کی مانند) اور نہ حقیقت کو محض جدلیاتی رشتوں سے عبارت سمجھتی ہے۔ اس کا موقف ہے کہ حقیقت دراصل ایک ہیئت ہے یعنی ادبی متن کسی آزاد اور خود مکتفی حقیقت کا عکاس نہیں بلکہ حقیقت متن کے ذریعے متشکل ہوتی ہے۔ نومارکسیت اور نو تاریخیت نے اس زاویہ نظر کو بہ طور خاص اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ متن آئیڈیالوجیکل ضرور ہوتا ہے مگر یہ آئیڈیالوجی متن سے باہر آزاد حالت میں موجود نہیں ہوتی بلکہ متن کے اندر لکھی ہوتی ہے۔ یہ ایک نازک نکتہ ہے جسے کلاسیکل مارکسی تنقید گرفت میں نہیں لے سکی تھی۔ اردو میں چونکہ ابھی تک کرسٹوفر کاڈویل اور جارج لوکاچ کا مارکسی تنقیدی ماڈل ہی Valid سمجھا جاتا ہے' اس لیے یہ بات بہت سوں کے پلّے نہیں پڑ رہی کہ حقیقت متن کے ذریعے اور متن کے اندر قائم ہوتی ہے اور آئیڈیالوجی متن سے الگ اور باہر وجود نہیں رکھتی۔

3۔ یہ دعویٰ بڑی حد تک سچائی پر مبنی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس دعوے کی سچائی کو ثابت کیسے کیا جائے؟ ظاہر ہے دلائل اور مشاہدے کے ذریعے ہی کسی دعوے کے جھوٹے یا سچے ہونے کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں بعض دلائل اُوپر دیے جا چکے ہیں اور یہ بات بھی ہمارے مشاہدے میں ہے کہ ہیئتی اور مارکسی تنقید سے زیادہ مابعد جدید تنقید علمی' ادبی اور اکیڈمک حلقوں میں زیر بحث ہے۔ موضوع میں اگر عصری موزونیت نہ ہو تو اسے زیادہ دیر تک اور بڑے پیمانے پر زیر بحث رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ بات قبول کر لینی چاہیے کہ ہیئتی اور کلاسیکی مارکسی تنقید اپنا برا بھلا اثر دکھا چکیں اب دیگر تنقیدی حربوں کو اپنا اثر آزمانے کی اجازت اور آزادی ہونی چاہیے۔

4۔ اس کے لیے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ تازہ تنقیدی مباحث کی جڑیں کہاں ہیں؟ اور پھر یہ جانچنے کی ضرورت ہے کہ نظری مسائل پر مرتکز ہو کر تنقید (اور ادب) کو حاصل کیا ہوا ہے؟ تو اس ضمن میں عرض ہے کہ تازہ مباحث کی جڑیں ساختیات اور پس ساختیات میں ہیں اور نظری مسائل (بلکہ تھیوری کہنا چاہیے) کو موجودہ اہمیت ساختیات سے ملنا شروع ہوئی ہے۔ ساختیات خود ایک تھیوری ہے جو آرٹ کے براہ راست تجزیے سے حاصل نہیں ہوئی مگر آرٹ کو سمجھنے کا ایک نیا نظری زاویہ ضرور دیتی ہے۔ (اس بات پر کافی بحث ہو چکی ہے کہ آرٹ کے بطن سے جنم نہ لینے کے باوجود ساختیات کیوں کر آرٹ کی تفہیم میں معاون ہے) پس ساختیات میں ادب کی تفہیم اور تجزیے میں کارآمد متعدد نظری زاویے جیسے ڈی کنسٹرکشن' نومارکسیت' نوتاریخیت' تانیثی تنقید' مابعد نوآبادیاتی تنقید وغیرہ شامل ہیں۔

اکثر لوگوں کا خیال بلکہ اعتراض ہے کہ تھیوری ادب سے دوری پر منتج ہوتی ہے' لہٰذا تھیوری غیر ضروری ہی نہیں بلکہ مضر بھی ہے۔ یہ اعتراض

کچھ تو غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور کچھ طرزِ کہن پر اڑے رہنے کی خواہش کا شاخسانہ ہے۔ یہ سراسر غلط فہمی ہے کہ تھیوری ادب سے دُور اور غیر متعلق ہو جاتی ہے۔ اصل میں بیشتر لوگ تنقید سے مراد کسی ایک فن پارے کا تجزیاتی مطالعہ لیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ تنقید ہے مگر اسے بھی تنقید ہی کہا جائے گا جو کسی ایک اور مخصوص متن کی بجائے عمومی طور پر متن اور اس کے داخلی نظام سے متعلق کوئی نظریہ وضع کرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب کسی خاص متن کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی نظری بنیاد لازماً ہوتی ہے اور نظری بنیاد تھیوری فراہم کرتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس امر کا احساس نہ ہو! لہٰذا اصولی طور پر تھیوری کو اہمیت ہی نہیں اولیت بھی حاصل ہے۔ اگر تھیوری سے بے اعتنائی برتی جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ادب جیسی علامتی حقیقت کے مطالعے کے لیے کسی ایک نظریہ پر قناعت کی جارہی ہے۔ ظاہر ہے یہ صورتِ حال ادب کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہے۔ تھیوری ہر رائج اور بزعم خویش مستحکم نظریے کی بنیادوں کو چیلنج کرتی ہے یعنی اگر کوئی تنقیدی نظریہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فقط وہی ادب کے تجربے اور تعین قدر کا حق اور اختیار رکھتا ہے تو تھیوری اس دعوے کی صداقت کو چیلنج کرے گی اور یہ دکھانے کی کوشش کرے گی کہ کوئی دوسرا نظریہ بھی اتنا ہی اہم ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس طور تھیوری مسلسل فکری بیداری کا سامان کرتی ہے اور ''مسلسل فکری بیداری'' چوں کہ اس Stablity کو تہ و بالا رکھتی ہے جو کسی ایک نظریے یا زاویۂ نظر کی اجارہ داری کا دوسرا نام ہے' اس لیے کئیوں کو یہ بیداری وحشت میں مبتلا رکھتی ہے' خاص طور پر انھیں جو اپنی رائے' یا نظریے کو حتمی سمجھنے کے زعم میں مبتلا ہوتے ہیں۔

5۔ اس میں شک نہیں کہ مابعد جدید تنقیدی نظریات مغرب میں پیدا ہوئے ہیں مگر دیکھنے اور سوچنے والی بات یہ ہے کہ تنقیدی نظریات سے ان کا ثقافتی پس منظر کس حد تک چپکا ہوتا ہے؟ کیا تنقیدی نظریات درآمد کرنے اور ان پر بحث مباحثہ کرنے سے ان نظریات کی متعلقہ ثقافتوں کے وائرس کے پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے؟ یہ سوال اُٹھانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ ہمارے ہاں جب بھی کسی نئے تنقیدی نظریے کا شہرہ ہو رہا ہوتا ہے' ہمیں اپنے ثقافتی بچاؤ کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ کیا ہماری ثقافت اتنی نازک ہے کہ ذرا سے نئے خیال کی آنچ سے اس کے تڑخنے کا خطرہ ہو؟ اصل بات یہ ہے کہ ثقافت نازک نہیں' ثقافت سے متعلق ہمارے تصورات نازک ہیں اور شاید اس لیے نازک ہیں کہ یہ نوآبادیاتی نظام کی سختیاں جھیل کر پلے بڑھے ہیں۔ نئے نظریات پر بحث مباحثے سے ایک نفسیاتی خوف وابستہ کرنے میں ہمارے ترقی پسند دوست بھی شامل ہیں جو ہر عالمی اور تنقیدی نظریے کو (جسے مغرب نے پیش کیا ہو) مغربی سامراجی سازش کا حصہ قرار دیتے ہیں اور اُن لوگوں کو اس سازش میں شریک Declare کرنے میں ذرا نہیں جھجکتے جو نئے نظریات پر گفتگو کرتے ہیں۔ بہرکیف پہلے ذہن کو خوف سے آزاد کرنا اور ثقافت سے متعلق نام نہاد نازک مزاجی کو ترک کرنا ضروری ہے۔ کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ نئے نظریات کا مطالعہ اور تجزیہ کرنا چاہیے' اس کے بعد ہی یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ یہ نظریات ہماری صورتِ حال کو سمجھنے یا بدلنے میں کس حد تک معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ویسے مابعد جدیدیت مقامیت پر زور دیتی ہے۔ وہ ہر صورتِ حال کو منفرد' خصوصی اور مقامی قرار دیتی ہے۔ اسے سمجھنے کا کوئی مخصوص فارمولا نہیں دیتی۔ فارمولا سازی مابعد جدیدیت کی سرشت میں ہی نہیں۔ لہٰذا مابعد جدیدیت کو قبول کرنے کا مطلب کوئی مخصوص نظریاتی پیکج قبول کرنا اور اسے اپنی ثقافتی ادبی صورتِ حال پر مسلط کرنا نہیں بلکہ ایک مخصوص ''فکری مزاج'' کو قبول کرنا ہے جو کسی بھی ثقافتی مظہر اور متن کو کسی انوکھے اور منفرد زاویے سے سمجھنے کی روش سے عبارت ہے۔ اس فکری مزاج کے تحت بعض نظریات ضرور سامنے آئے ہیں (جیسے ڈی کنسٹرکشن) جو ہر معنی' نظریے (اور عقیدے) کی آخرانفی کر دیتے اور اس عمل کو ''آزاد کھیل'' قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ خود کو حتمی قرار نہیں دیتے۔ اس فکری مزاج میں جو آزادی اور مسلمات کو توڑ ڈالنے کی جو بے خوفی ہے وہ ہمارے اس ثقافتی رویے سے ضرور متصادم ہے جو مسلمات کو باقی رکھنے پر بضد ہوتا ہے۔ تاہم مقامیت اور اضافیت پر زور دے کر مابعد جدیدیت ہمارے لیے قابل قبول ہونے کا امکان رکھتی ہے کہ اس طور ہم اپنی مقامی صورتِ حال کو خود اپنے' مقامی تناظر میں' خود اپنے زاویہ نظر سے سمجھ سکتے ہیں۔ ویسے یہ مشکل کام ہے کہ ہمیں اس صورت میں کوئی بنا بنایا فارمولا دستیاب نہیں ہوگا اور ہم بحیثیت مجموعی بنے بنائے نظریات اور فارمولوں کے تحت زندگی گزارنے اور زندگی کی تفہیم کے عادی ہیں۔

6۔ ایک سے زائد تنقیدی نظریات اس لیے وضع اور رائج ہوتے ہیں کہ ایک نظریہ ادبی متن کی سب جہات کو روشن کرنے سے قاصر ہوتا ہے یا پھر وہ بعض متون کی تفہیم میں معاون ہوتا ہے اور بعض کے تجزیے کا اہل نہیں ہوتا' لہٰذا یہ کہنا نامناسب ہوگا کہ عمومی طور پر ادب کے لیے اور خصوصی طور پر موجودہ

ادب کے لیے کوئی ایک خاص تنقیدی نظریہ مفید اور کارگر ہے۔ نو تاریخیت اگر ادب کی تاریخی جہات اور تاریخ کی علامتی جہات کو سمجھنے میں معاون ہے تو تانیثی تنقید مرد تخلیق کاروں کے تصورِ زن اور عورت کے حقیقی سیلف کی تفہیم میں مددگار ہے۔ اسی طرح نومارکسیت ادبی متن کی ان آئیڈیالوجیکل جہات کو منور کرتی ہے جو متن میں ان کہی کی صورت موجود ہیں۔ لہٰذا امتزاجی تنقیدی رویے کو قبول کرنا مناسب ہے جو پہلے ہر نظریہ کی مخصوص جہت کا شعور حاصل کرتا اور پھر مختلف نظریات کی ہم آہنگی کی تدبیر کرتا ہے' جس کے نتیجے میں متن کی ایک سے زائد جہات کو نہ صرف منور کرنا ممکن ہوتا ہے بلکہ اس روش کا بھی قلع قمع ہوتا ہے جو بعض متون کو اس لیے مسترد کرتی ہے کہ وہ کسی مخصوص نظریے کی رُو سے سمجھ میں نہیں آتے۔ ☆

رفیق سندیلوی

1۔ تنقید سوالوں اور قضیوں سے مبرا نہیں ہوتی۔ البتہ ہر زمانے میں قضیوں اور سوالوں کی نوعیت اور سطح بدلتی رہتی ہے۔ یوں آگہی کے اندر نئی آگہی جنم لیتی ہے اور نمو کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو تنقید ایک ہی نقطہ پر رُکی رہتی۔ موجودہ اُردو تنقید کا منظر نامہ اگر ماقبل تنقید سے مختلف و متنوع اور وسیع و منقلب نظر آ رہا ہے تو اس کے عقب میں آگہی اور نمو کی یہی قوت کار فرما ہے۔ اب تنقید سیدھا سادا معاملہ نہیں رہی۔ یہ ایک مشکل ڈسپلن ہے۔ متن میں معنی کے سائے پورے ادب اور پوری ثقافت کے رموزی نظام میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے تنقید کو اپنے طریقۂ ادراک سے متنوع و منظم ہونے کا احساس دلانا ہوتا ہے اور فن پارے کے جمالیاتی اثر کے راز کو بھی اسی وسیلے سے آشکار کرنا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ساختیات کا یہ داعیہ کہ ادبی تحریر بین المتونیت کے زیر اثر وضع ہوتی ہے' اسے اختراعیت اور مطلقیت کا نمونہ نہیں کہا جا سکتا' وہ بنیادی قضیہ ہے جس نے موجودہ تنقید اور ماقبل تنقید کے مابین خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے۔ اب متن مصنف کی زمین نہیں ہوتا کہ وہ جس طرح کی فصل اُگانا چاہے' اُگا لے' اب لکھنے والا متن کو پیدا نہیں کرتا' متن کے ہمراہ پیدا ہوتا ہے۔ متن از خود منکشف نہیں ہو سکتا۔ متن اور متن ساز دونوں ایک دوسرے کے امکانات کے اندر عمل آرا ہوتے ہیں۔ اسی طرح متن اور متن کا قاری بھی ایک دوسرے کی کیفیات کے اشتراک و تفاعل سے قرأت کے عمل کو انجام دیتے ہیں۔

ساختیات و پس ساختیات سے قبل اُردو تنقید اقداری و نفسیاتی لکیر پر گامزن رہنا پسند کرتی تھی' فن پارے کی ہیئتی و وجودی حیثیت و اہمیت دیتی تھی' لیکن جب تنقید کو سوسیور کے لسانی ماڈل کے تحت زبان کے افتراقی نظام کا شعور حاصل ہوا تو الفاظ کے ذریعے صداقت کی ترسیل پر سوالیہ نشان لگ گیا' زبان کی غیر شفافیت اور ساخت کے گرہ در گرہ تعلق کے نظریے نے ثقافت کو فرد اور تاریخ پر تقدم دے دیا' فن پارے کی قرأت کا طریقہ ہی بدل گیا۔ فنکار جو اپنی اکبری تحریر پر ناز کرتا تھا اور اسے کُلّیہم اپنے باطن کی تشکیل گردانتا تھا' اسے جب یہ معلوم ہوا کہ لسانی اور ثقافتی قوت کس کس انداز میں متن کو وضع کرتی ہے تو اس کی حیرانی دیدنی تھی۔ یہاں مجھے اپنے ہی کچھ اشعار یاد آ رہے ہیں:

ہر ایک بُعد میں اک اور بُعد شامل ہے
یہاں کوئی نہیں جس کی نگاہ کامل ہے

اے میری اکبری تحریر خود پہ ناز نہ کر
میں تجھ میں ہوں تو کوئی اور مجھ میں شامل ہے

کسی تعلقِ شے کے سبب ہی ہر شے میں
عجب طرح کی چمک ہے' عجب جھلمل ہے

نظر جو درزِ بدن سے نکل کے مجھ پہ رُکی
کچھ اس میں دھوپ ہے کچھ اس میں گرد شامل ہے

میری نظر میں موجودہ اُردو تنقید کی پہچان اسی قضیے میں ہے۔ یہی وہ قضیہ ہے جس سے Creation اور Production کی بحث چلی۔ روایتی نقاد پریشان ہو جاتا ہے کہ کیا فنکار ثقافتی تشکیل یا لسانی ساخت کے تابع ہوتا ہے یا اس کی قوت کے آگے بے بس ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ فن کار کا تفاعل لسانی ثقافتی منبع سے جُڑا ہوتا ہے جس کے تحت تخلیق کا تقلیبی آہنگ وجود میں آتا ہے۔ فنکار دال اور مدلول کو زبردستی نہیں جوڑتا' اپنے ارادے یا ابلاغ کی خواہش کے تحت فن پارے کو اپنی مرضی کا ملبوس معنی فراہم نہیں کرتا یا اسے مصدقہ طور پر بامعنی بنا کر پیش نہیں کرتا۔ بلکہ وجدان و القا' تصور و تمثال اور جمال و اسرار کے سہارے صناعی کا مظاہرہ کرتا ہے اور ذہنی انہماک اور حسی مشغولیت سے اسے ایک منفرد حیثیت دیتے

☆ یہ خود امتزاجی تنقید بھی بعض متون کو "جو جہات اور ابعاد کی کثرت سے عبارت نہ ہوں" کو مسترد نہیں کرتی؟ (بحوالہ ماہنامہ "اوراق" فروری/مارچ ۲۰۰۳ء ص ۱۲) اگر ایسا ہے تو پھر ان سب میں فرق کیا باقی رہ جاتا ہے (ن۔ ج۔ ب)

میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ منفرد ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ فن پارہ بین التونیت سے کٹ کر کسی خلا میں وضع ہوا بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ بین التونیت کے عمیق رموز کی آ گہی کی منزل پر وجود میں آیا' یعنی وہ متحرک ومنقلب ہو کر خود کو انوکھی شکل دینے کے قابل ہوگیا۔ فن پارے کی انوکھی شکل مصنف کی شعریات فہمی پر دال ہوتی ہے یا شعریات کو وسعت دینے کی قابلیت کا ثبوت ہوتی ہے جسے پہلے Originality سے موسوم کر دیا جاتا تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فن پارہ مکمل طور پر خود مکتفیت کا حامل ہو ہی نہیں سکتا البتہ سٹرکچرنگ کا عمل ایک خود مکتفی زبان یا اسلوب کا احساس ضرور دلاتا ہے۔ جس کے ریشے مصنف کی ذاتی اور مخفی مائتھالوجی کے اندر پیوست ہوتے ہیں۔ آج کا نقاد قرأت کرتے ہوئے تنقید کے انہی قضیوں سے نبرد آزما رہتا ہے۔ وہ معنی کی اختراعی حیثیت پر بضد نہیں ہوتا' فن کار کے اندازِ اسلوب' ادب کی بین التونیت اور ثقافتی نشانات کے اندر مطالعے کی بساط بچھاتا ہے اور معنی کی سیمابیت کا نظارہ کرتا ہے۔

2۔ تنقید میں پیراڈائم یعنی مطالعۂ ادب کے طریقے بدلتے اور توسیع پاتے رہتے ہیں۔ پیراڈائم دراصل ایک پیٹرن' مثال یا ماڈل ہوتا ہے جو بطور ایک ادبی منہاج کے اپنی مشابہتوں کی طرف اشارہ کناں رہتا ہے۔ اُردو میں مارکسی تنقید اور ہیئتی تنقید کے پیراڈائم بالکل فنا نہیں ہوئے۔ طرز ذہن کی سطح پر روایتی مارکسی تنقید اور آئین نو کی سطح پر ہیئتی تنقید عمل پیرا نظر آتی ہے۔ مگر فضا صاف بتا رہی ہے کہ نئی تھیوری کے مباحث نے موجودہ اُردو تنقید کو ادب کی تفہیم اور تعبیر و تجزیہ کے لیے ایک نئے پیراڈائم کی طرف موڑ دیا ہے۔ ہیئتی تنقید نے' جوئی تنقید اور روسی ہئیت پسند تنقید پر مبنی اور جدیدیت سے منسلک ہے' توسیع و تغیر کو قبول کیا ہے۔ مگر افسوس کہ اُردو کے مارکسی نقادوں اور ان کے حامیوں نے اپنے اندر کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی۔ وہ ابھی تک ہئیت پر مواد کو ترجیح دیتے ہیں۔ متن کو بالائی سطح کے سماجی اور تاریخی تناظر میں قید رکھتے ہیں۔ اقتصاد اور سیاست کو ثقافتی نظام کے کُل سے کاٹ کر دیکھتے ہیں۔ تاریخ کے سکون و ظاہر پر تو ان کی نظر جاتی ہے' تاریخ کے تحرک و غیاب پر ان کی نظر نہیں جاتی۔ وہ طے شدہ منطق کے اسیر ہیں۔ ان کے تخیل کا محدود نظام اس منطق کو عبور نہیں کر پاتا۔ جارج لوکاس کی غلط تعبیر کی تقلید میں مارکس ان پر بند ہوگیا ہے۔ سماجی حقیقت نگاری ان کے لیے ایک بُت بن کر رہ گئی ہے حالانکہ کشادہ مارکسیت کی حدیں ساختیات وپسِ ساختیات سے آملی ہیں۔ روس سے باہر کے مارکسی نقادوں نے مارکس کے مکانِ بصیرت میں متعدد کھڑکیاں کھول دی ہیں۔ رولاں بارتھ اور دریدا نے کئی مارکسی اصطلاحوں کو نیا تناظر عطا کر دیا ہے۔ اب نو مارکسی نقاد فن پارے کو نظریے اور منشور کی یا محبوس ومحصور قسم کے معاشرتی ماحول کی پیش کش کا ذریعہ نہیں سمجھتے' وہ جان گئے ہیں کہ ثقافتی نظام میں نظریے کے خلاف جنگ بھی ہوتی ہے اور یہ کہ نظریہ بذاتِ خود تضادات وافتراقات میں گھتا ہوا ہوتا ہے اور اسی باعث اسے کسی سماجی طبقے کا راست مظہر نہیں کہا جاسکتا' یہ ایک اسطورہ کی مثل ہوتا ہے۔ جس میں سماجی عقائد کو حقیقت کے التباس کے طور پر برتا جاتا ہے۔ آئیڈیالوجی خود کو انسانی زندگی کے عکس کا درجہ دے کر فرضی تقسیم اور جعلی تحدیدات میں کس طرح اسیر کر دیتی ہے' ہمارے ترقی پسندوں نے اس پر غور ہی نہیں کیا' ان کے ہاں نظریے اور آئیڈیالوجی کی بحث کو کبھی گہرائی اور باریک بینی کے ساتھ ثقافت اور ادب کے مشترکہ اور وسیع تر تفاعل کے اندر رکھ کر زیر بحث ہی نہیں لایا گیا' اور ایسا نئی تھیوری اور ادب کے بدلتے ہوئے پیراڈائم سے دُوری کے سبب ہوا ہے۔ تھیوڈور اڈورنو اور لوسیئن گولڈمن نے مارکس کی تشریح نو کر کے ساختیات اور مارکسیت کے درمیان جو اشتراک پیدا کیا ہے۔ لوئی التھیوسے نے ژاک لاکان کی مرکز گریز نفسیاتی تحلیل اور مارکس کی جدلیات کو ملا کر جو مطالعہ پیش کیا ہے۔ گرامسکی نے Hegenoory تھی جال نما مغالطوں اور مفروضوں کی تھیوری اور مشل فوکو نے علم اور قوت کی مشترکہ عمل آرائی کی تھیوری سے جو ذہنی ہلچل پیدا کی ہے' پیئر ماشیرے اور ٹیری ایگلٹن نے ادب اور سماج کے منطقوں میں کارفرما آئیڈیالوجی کی متغیرہ شکلوں کو جس طرح پس ساختیات کی روشنی میں نشان زد کیا ہے۔ اُردو کے ادعائیت پسند مارکسی نقادوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے' ان کی رسائی اینگلو امریکی تنقید کے معارف تک بھی ڈھنگ سے نہیں ہوسکی جس کے بنیادی مفروضوں کو تھیوری کے تنوعات نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ادبی تھیوری کی ناگزیریت مسلم ہے۔ اس لیے کہ وہ عصری تھیوریاں جو سماجیاتی اور بشریاتی میدانوں میں اپنا اثر ورسوخ بنائے ہوئے ہیں' بے حد متنوع اور سوال انگیز ہیں' ان کا سامنا کیے بغیر ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں کو سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ نارتھ روپ فرائی نے تھیوری کو تنقید کا صحیفہ مانا ہے۔ ٹیری ایگلٹن نے تعبیر ادب کے حوالے سے اسے حیات بخش آ گہی کا بدل قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ ادبی تھیوری کے مخالفین بھی اس کی تشکیلی حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسے درسی ضرورت یا مغرب کا ایجنڈا کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا۔ دُنیائے انسانی میں علوم جس بحران' تصادم اور کایا پلٹ کی زد پر ہیں اور مسلمات کی دیواریں جس طرح کھوکھلی

ہوگئی رہی ہیں اس تناظر میں تھیوری سے خوف زدہ ہونے کے بجائے دائرۂ تفہیم میں داخل ہوکراس پر سوالات قائم کرنے ضروری ہیں۔ موجودہ اُردو تنقید کے پیراڈائم جس امتزاج کا مطالبہ کر رہے ہیں ہمارے عہد کے وسیع النظر ترقی پسند اور جدید ناقدوں کی بصیرت اس سے زیادہ دیر تک غافل نہیں رہ سکتی۔ اصلاً Sign کے تصور کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو استقرار کے بجائے اضطراب کا حامل ہے۔ منضبط نہیں بلکہ غیر منضبط ہے یعنی Stable نہیں Unstable ہے جس طرح ایک اینٹ کے سرکنے سے ساری اینٹیں سرکنے لگتی ہیں اسی طرح Sign کے تصور کے بدلنے سے پورا تناظر ہی بدل گیا ہے اور ادب کے ثقافتی کوڈز اور کنونشنز کے مطالعے میں ثقافت کی آئیڈیالوجیکل اور سٹرٹیجیکل جہت بھی اُبھر آئی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو ترقی پسند اور جدیدیت کے حامل نقادوں اور تخلیق کاروں کو مابعد جدید منظر نامے سے جوڑ سکتا ہے۔

3۔ ترقی پسند و جدید تنقید میں اتنی قوت نہیں رہی کہ وہ خود کو ادبی منظر نامے پر حاوی رکھ سکے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے موثر اور قابل دخیل اجزا تنقید کی مابعد جدید آگہی میں تحلیل ہو گئے ہیں جو کچھ بچ رہا ہے اگر بعض حضرات اسے کسی مکتبہ فکر کے طور پر منجمد رکھنے کے آرزومند ہیں تو درحقیقت وہ اصول تغیر سے انحراف کر رہے ہیں۔ کسی تنقیدی ڈسپلن یا طریقۂ نقد کے بے دخل یا غیر موثر ہو جانے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کی آگہی کا زور ٹوٹ گیا یا اطراف میں آگہی کا میدان وسیع ہو گیا۔ ضروری نہیں کہ جدیدیت کے اکمل یا مضمحل ہو جانے کے بعد ہی مابعد جدیدیت کی بات کی جائے۔ بات شروع ہی اس وقت ہوتی ہے جب اس کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ زمانی سطح پر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی رخصت و آمد کا تعین دوطرفہ شاہراہ کی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ آگہی کے دائرے ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہیں۔ یہ کہنے کے بجائے کہ ابھی جدیدیت بھی پوری طرح نہیں آئی یہ کہنا زیادہ صائب ہوگا کہ ابھی مابعد جدیدیت پوری طرح نہیں آئی۔ جدیدیت کے اثرات بھی موجود ہیں اور مابعد جدیدیت پر مکالمہ بھی جاری ہے۔ خود اختلافی اور پردہ داری کے وہ عناصر جو جدیدیت کی تہہ میں پوشیدہ تھے اب سطح پر آ رہے ہیں اور ایک فطری جدلیات کے تحت ان کا تجزیہ بھی ہو رہا ہے یہی تجزیہ ہماری ادبی حسیت' آدرشی تصور اور موضوع کی مرکزیت میں تبدیلی لا رہا ہے۔ اسی تبدیلی سے نئے پیراڈائم کا اندازہ ہوتا ہے۔ موجود تنقید کا رُخ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے انقطاع و اتصال کی تفہیم کی طرف کھلا ہوا ہے۔

4۔ تازہ تنقیدی مباحث میں نظری مسائل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نظری مسائل سے مراد ادبی تھیوری ہے جس میں ساختیات بھی شامل ہے اور پس ساختیات بھی۔ اس کا ایک جواز تو اس کے مزاج کا Cognitive یا وقوفی ہونا ہے۔ روایتی تھیوری میں فلسفے کی نظری تحدیدات کو علمیاتی منہاج کے طور پر الگ الگ برتا جاتا ہے جبکہ تنقیدی تھیوری ان تحدیدات کو مسمار کر کے وقوف کی کشادگی پر اصرار کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ تھیوری یا تنقید کے پس ساختیاتی زاویوں کی نظری اور اطلاقی صورت کیا ہے؟ بلاشبہ گزشتہ دو دہائیوں سے تھیوری پر گفتگو جاری ہے اور اطلاقی سطح پر اس کی مجموعی آگہی سے فائدہ بھی اُٹھایا جا رہا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہماری علمیاتی صورتِ حال کے پیش نظر ابھی تھیوری کی بحث کو مزید عمق میں جا کر کھولنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر نومارکسیت' نوتاریخیت' تانیثیت اور بعد نوآبادیت جیسے پس ساختیاتی نظریات کو زیادہ مس کیا جانا چاہیے تاکہ آئیڈیالوجی' اقتصاد' تاریخ' سماج اور سماج کے اندر رچے بسے ہوئے اشرافی اور مرکز مائل تصورات کی تمام فریب کارانہ شکلیں نمایاں ہو جائیں اور جب ہم اطلاقی طور پر ادب کے تجزیے کی طرف رجوع کریں تو کسی فن پارے کے غیر ادبی اور ادبی ہونے کے ادراک سے غافل نہ رہ سکیں۔ دیکھئے غیر ادبی متن جدیدیوں کے ہاں بھی موجود ہے جو فیشن کے طور پر پروان چڑھا اور ترقی پسندوں کے ہاں بھی موجود ہے جو سیاست کی متابعت اور صحافت کی روداد نگاری ثابت ہوا۔ کلچر مطالعات میں جب ہر قسم کے متون کو تہذیبی یا ثقافتی متون کے زمرے میں رکھا جا رہا ہو تو نظریاتی اور غیر نظریاتی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر کیا ہر قسم کا متن بشمول نظریاتی و غیر نظریاتی متن' ادب ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں' کیونکہ اس میں عقل اور وجدان کی وہ کثیر الصوتیت اور تہہ نشیں حرکیت نہیں ہوتی جو ادب کو ادب بناتی ہے اور اسے دیگر متون کی Pragmatic سطح سے بلند کرتی ہے۔ ہر چند کہ ادب کی تشکیل پذیری میں وسیع و عمیق ثقافتی ماحول ہی کارفرما ہوتا ہے۔ مگر ساری بات اتصال و آمیزش کے اس درجے کی ہوتی ہے جہاں ادب تہذیبی یا ثقافتی متون میں شامل ہو کر بھی اور ان کے اجزا کو استعمال کر کے بھی اُن سے رفیع تر ہو جاتا ہے۔ اباب حسن نے اسے ادب کی ''بدمعاش قوت'' کا نام دیا ہے۔ غور کریں تو غیر ادبی اور ادبی ہونے میں وہی فرق ہوتا ہے جو دکھانے اور مظاہرہ کرنے میں ہوتا ہے' جو انفراسٹرکچر اور سپر سٹرکچر میں ہوتا ہے۔ فن پارہ جگہ گھیرنے والا منجمد مواد نہیں ہوتا' جہات میں گردش کرنے والا متن ہوتا ہے۔ متن کی اسی گردش کے باعث تھیوری اہم ہو جاتی ہے۔ ترقی پسند مارکسی نقاد ذرا آگے بڑھیں تو تجزیہ (

ارتقائے فہم کا سامان پیدا کر کے ان کو ادب کے اصل منصب سے آشنا کر سکتی ہے۔ سیاسی اور معاشی مسائل یا پانی' بجلی' سوئی گیس' روزگار' ٹیکس اور بجٹ کے معاملات پر برقی میڈیا اور صحافتی حلقہ بحث کرتا رہتا ہے۔ ادیب بھی اپنی دانشورانہ حیثیت میں اس پر رائے زنی کر سکتا ہے مگر تخلیقی عمل بھی اس کے تابع نہیں ہوتا۔ متن کی ادبی آئیڈیالوجی کی صداقت سماج کی سیاسی یا معاشی آئیڈیالوجی کی صداقت سے بلند تر ہوتی ہے اور چونکہ یہ کثیرالجہت ہوتی ہے' لہٰذا تھیوری کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قاری ایک معنی پر اکتفا نہیں کرنا چاہتا' فعالیت کے ساتھ متن کے پورے میدان کو دیطہ نگاہ میں لانا چاہتا ہے۔

5۔ مابعد جدیدیت موجودہ انسانی صورتِ حال اور ساخت کی لامرکزیت پر ایک زبردست مباحثہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے دائرۂ آگہی میں ادب بھی شامل ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ادب کے تنقیدی نظریات پر مابعد جدیدیت نے اپنے اثرات مرتب نہ کیے ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مغرب میں مابعد جدیدیت لرزہ اندامی پیدا کر کے اپنی مقامیت اور فکری تناظر میں رچ بس گئی ہے۔ ہماری ادبی' عصری اور ثقافتی صورتِ حال اپنی ایک مقامیت' اپنا ایک تناظر بھی رکھتی ہے اور عالمی فضا سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ اب اسے کیا کہیں گے کہ ایک طرف DNA ٹیسٹ کی بات ہو رہی ہے تو دوسرے طرف بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے انگاروں پر چلنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ سیاسی اور قبائلی سروکار کس طرح راہ میں حائل ہیں؟ ایسے میں عقلیت اور مابعد الطبیعات کے رد و قبول کو کس نظر سے دیکھا جائے۔ دنیا کے نوع بہ نوع انسانوں پر کوئی مطلق یا مستقل نظریہ منطبق نہیں ہو سکتا۔ بالآخر جہالت اور روشن خیالی دونوں کا پول کھلنا ہے۔ دراصل مابعد جدید نظریات کا رشتہ پس ساختیات سے ہے جو کسی چیز پر قفل نہیں لگاتی۔ ہر چیز کو الٹاتی پلٹاتی رہتی ہے۔ حد بندیوں' اصولوں' مفروضوں اور فارمولوں کو قبول نہیں کرتی۔ یقین کے بجائے شک کو ترجیح دینا' مدلول کے بجائے دال کو ابھارنا اور اسے ثقافتی ہالے میں لے جانا' فطری حقیقت اور سماجی ساخت کے مابین فرق کرنا اس کا شیوہ ہے۔ مابعد جدیدیت اپنی نہاد ہی میں High اور Low کی قائل نہیں ہے اور اتھارٹی اور تھیوری کے خلاف ہے۔ اس کا سرسری مطالعہ گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ عام قاری اس کے انحرافی اور اثباتی دونوں رُخوں کو خلط ملط کر کے یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ اپنی نہاد ہی میں اینٹی تھیوری ہے تو تھیوری کی وکالت کیوں؟ تھیوری سے مراد وہ تمام تر تھیوریاں ہیں جن کی نشوونما سے اس بحرانی صورتِ حال کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے جو علوم انسانیہ کو درپیش ہے۔ مابعد جدیدیت اس لیے اینٹی تھیوری ہے کہ کسی ایک تھیوری' متعدد تھیوریوں یا تمام تر تھیوریوں پر اکتفا نہیں کرتی کیونکہ صداقت کو جاننے کے لیے جو بھی طریقہ وضع کیا جاتا ہے' وہ کلیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے مابعد جدیدیت تھیوری کو تسلیم بھی کرتی ہے اور تھیوری کی صداقت پر سوالیہ نشان بھی لگاتی ہے۔

6۔ گزشتہ جواب کے تسلسل میں رہتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترمیم و تغیر اور تنسیخ و تجدد کو اپنائے بغیر کسی ادبی' ثقافتی یا انسانی صورتِ حال کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ کوئی ایک تنقیدی نظریہ متن کے حاضر و غائب حصوں اور ان کے پیچ در پیچ پرتوں کو منور نہیں کر سکتا۔ اس وقت متعدد تنقیدی نظریات برسرِ عمل ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ وفاداری کا مطلب یہ ہے کہ تجزیے کی باقی جہات سے کنارہ کشی اختیار کر لی گئی' جُز کو چن لیا گیا اور متعدد اجزا کو فراموش کر دیا گیا۔ درست ہے کہ کلیت کے ساتھ تخلیقی تجربے کے امکانات کو گرفت میں نہیں لایا جا سکتا مگر اس عدم رسائی کے اپنے ذہنی و عقلی مضمرات ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ فن پارے کے سالم ہونے کا احترام ہی نہ کیا جائے اور تنقیدی نظریات کے تنوع ہی سے بیگانگی اختیار کر لی جائے۔ میرے خیال میں امتزاجی تنقید اپنی لچک داری اور گوناگونی کی وجہ سے زیادہ قابلِ قبول دکھائی دیتی ہے۔ یہ فن پارے کو انھی شعاعوں میں لا کر دیکھتی ہے جو اس کے اندر سے پھوٹ رہی ہوتی ہیں جس طرح مابعد جدیدیت تھیوری کی ضرورت کو مانتی بھی ہے اور اس کی صداقت کو حرفِ آخر کا درجہ بھی نہیں دیتی' اسی طرح امتزاجی تنقید بھی تھیوری اور متھاڈولوجی کے متعینہ معنی کو قبول نہیں کرتی۔ خود کو Define نہ کرنے اور حد بندی کو مسترد کرنے کی بدولت اس کا مزاج ہی مابعد جدیدی ہے۔ امتزاجی تنقید کو مابعد جدیدیت کے اثباتی نقوش کا نعم البدل قرار دیا جا سکتا ہے۔

عملی تنقید

سواری اُونٹ کی ہے

رفیق سندیلوی

سواری اُونٹ کی ہے
اور میں شہرِ شکستہ کی
کسی سنسان گلی میں سر جھکائے
ہاتھ میں بدرنگ چمڑے کی مہاریں تھام کر
اُس گھر کی جانب جا رہا ہوں
جہاں اِک غمزدہ عورت
مرے وعدے کی رسّی
ریشۂ دل سے بنی
مضبوط رسّی سے بندھی ہے
برہنہ سر کئی راتوں
کئی صدیوں سے آنکھوں میں
کسی کُہنہ ستارے کی چمک لے کر
مرے خاکستری ملبوس کی
مخصوص خوشبو سونگھنے کو
اور بھورے اُونٹ کی دُکھ سے لبالب بلبلاہٹ
سننے کو تیار بیٹھی ہے

وہی سیلن زدہ اوطاق کا گوشہ
جہاں میں ایک شب اُس کو
لرزتے، سنسناتے، زہر والے
چوبی تیروں کی گھنی بارش میں
بے بس اور اکیلا چھوڑ آیا تھا

مجھے سب یاد ہے قصہ
برس کر اَبر بالکل تھم چکا تھا
خلا میں چاند
یوں لگتا تھا جیسے
تخت پر نوعمر شہزادہ ہو کوئی
ہوا چہرے کو مَس کر کے گزرتی تھی
کہ جیسے ریشمیں کپڑا ہو کوئی
گلی سوئی ہوئی تھی
اپنے ٹھنڈے اور گیلے خول کے اندر
مکاں ایسے نظر آتے تھے
جیسے نرم اور باریک کاغذ کے بنے ہوں
وہی سیلن زدہ اوطاق کا گوشہ
جہاں مہتاب کی بُرّاق کرنیں
اُس کے لانبے اور کھلے بالوں میں اٹکے
تازہ ترانجیر کے پتے کو روشن کر رہی تھیں
وہ اُس کی گندمی کہنی کا بوسہ یاد ہے مجھ کو
نہیں بھولا ابھی تک
سارا قصہ یاد ہے مجھ کو
اُسی شب
مَیں نے جب تلوار اُس کے پاؤں میں رکھ دی تھی
اور پھر یہ کہا تھا:
یہ میرا جسم اور اس جسم کی حاکم

یہ میری باطنی طاقت
قیامت اور قیامت سے بھی آگے
سرحدِ امکان ولا امکاں تلک
تیری وفا کا ساتھ دے گی
گواہی کے لیے آکاش پر یہ چاند
اور بالوں میں یہ انجیر کا پتا ہی کافی ہے!

خداوندا وہ کیسا مرحلہ تھا!
خداوندا یہ کیسا مرحلہ ہے:
گلی سنساں
کسی ذی روح کی آہٹ نہیں ہے
یہ کیسی ساعتِ منحوس ہے جس میں ابھی تک
کوئی ننھا سا پرندہ یا پتنگا
یا کوئی موہوم چیونٹی ہی نہیں گزری
کسی بھی مرد و زن کی
مَیں نے صورت ہی نہیں دیکھی
سواری اُونٹ کی ہے
اور مَیں شہرِ شکستہ کی
کسی سنساں گلی میں سر جھکائے
ہاتھ میں بدرنگ چمڑے کی مُہاریں تھام کر
اُس گھر کی جانب جا رہا ہوں
یا کسی محشر
خموشی کے کسی محشر کی جانب جا رہا ہوں
کسی کی ہچکیوں اور سسکیوں کے بعد کا محشر
کوئی منظر
کوئی منظر کہ جس میں اِک گلی ہے
ایک بھورا اُونٹ ہے
اور ایک بُزدل شخص کی ڈھیلی رفاقت
سفر نامختتم
جیسے ابد تک کی کوئی لمبی مسافت

سواری اُونٹ کی ہے
یا تھکے اعصاب کی ہے
اُس کے ہونے کا نشاں ملتا نہیں
کب سے گلی میں ہوں
کہاں ہے وہ مری پیاری
مری سیلن زدہ اُوطاق والی
زمینوں پانیوں اور انفس و آفاق والی
بہت کوشش کی آنکھوں نے
مگر رونا نہیں آتا

سبب کیا ہے
گلی کا آخری کونا نہیں آتا
گلی کو حکم ہُوا اب ختم ہو جائے
میں بھورے اور بوڑھے اُونٹ پر بیٹھے ہوئے
ایامِ پیری گن رہا ہوں
گلی میں رہنے والا
کوئی اُس کے عہد کا زنبور ہی گزرے
مَیں اُس کی بارگہ میں
معذرت کی بھیک مانگوں
اور اپنا سر جھکاؤں
مَیں اُس کے عہد کے زنبور کے صدقے
تھکے اعصاب والے اپنے بوڑھے جسم کو
اور اُونٹ کو لے کر
گلی کی آخری حد پار کر جاؤں!

سواری اُونٹ کی ہے

ستیہ پال آنند

گوتم بدھ جو سدھارتھ تھا' ایک شب یشودھرا اور اپنے ننھے بچے کو سوتے ہوئے چھوڑ کر اکیلا جنگلوں کی طرف نکل گیا تھا۔ سالہا سال کی کڑی ریاضت کے اور گیان کے حصول کے بعد وہ لوٹا تو اس کی بیوی اور بچے نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کی اور بچے نے بھکشو بننا قبول کیا۔ روایت ہے کہ اپنے چیلے آنند بھکشو کے اصرار کے باوجود گوتم بدھ نے اپنے بیٹے کو ''سنگھ'' میں شامل کرنے سے انکار کر دیا اور اعتراف کیا کہ اس کی وجہ اُس کی اپنے خون کے تئیں وہ ''موہ مویا'' ہے جس سے وہ گیان کے حصول کے باوجود چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا جیسا کہ آپ جانتے ہیں' زین بدھ ازم کے اقوال کے مطابق رد و قبولیت کی کوئی حد نہیں ہے۔

یہ نظم مجھے اس واقعے کی یاد دلاتی ہے' یشودھرا ایک Archetypal کردار ہے جو ایک بیوی یا محبوبہ بھی ہو سکتی ہے' ایک نصب العین بھی' رفاقت کا ایک یُگ بھی' ایک سیاسی اعتقاد بھی' ایک مُلک بھی' شاعر کی اپنی نجی زندگی یا اُس کی قوم یا ملت کی تاریخ کا ایک دور بھی۔۔۔ جو چھوٹ گیا بلکہ بزدلی کے ایک لمحے کے کرائسس میں چھوڑ دیا گیا۔ نظم میں جا بجا اس مصلحت کوشی کے استعارے تتلیوں کی طرح اُڑتے ہوئے ملتے ہیں لیکن تلوار کا سوئی ہوئی عورت کے قدموں میں رکھنا اور مناظر قدرت کی شہادت سے اپنے وعدے کے قول اور ایفائی نہ کرنے کے فعل سے تفاوت پیش کرنا' اس کی ایک اہم علامت ہے۔ ''سدھارتھ کی واپسی'' کو زمان و مکاں کی کلچرل بیک گراؤنڈ کے سیناریو میں تبدیل کر کے دیکھیں تو جو تصویر ملتی ہے' وہ اُونٹ' بدرنگ چمڑے کی مہاریں' دشت نوردی' خاکستری ملبوس' زہریلے چوبی تیروں کی بارش یعنی اسلامی' عربی' عجمی یا وسط مشرق کی روایت سے عبارت ہے۔ اس روایت سے یہ استعارہ مستعار لیا گیا ہے' اور دشت نوردی یا طویل لامتناہی سفر اُردو کے شعری ادب میں ضرب المثل بنا زندگی کی گونا گوں صعوبتوں کا۔ اس لحاظ سے یہ نظم اپنے منظر نامے کے ساتھ ایسے جُڑ گئی ہے کہ متن اور مضمون کو Thematic Compulsions کو تصویر کشی' بیانیے اور Fable کے چوکھٹے سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔

اب سفر کو لیں' یہ سفر خارجی بھی ہے اور ذہنی بھی' وقت میں پھیلا ہوا Chronological بھی ہے (جوانی سے پیری تک' حوصلے سے پسپائی تک' تازہ دم ذاچی سے بوڑھے اُونٹ تک) اور Spatial بھی ہے (شہر شکستہ کی سنسان گلی سے لامتناہی فاصلوں تک) لیکن ابتدا سے انتہا تک کا یہ سفر اختتام سے پھر آغاز تک پہنچتا ہے یعنی Roots کی وہی تلاش جس نے عظیم فن کاروں سے Epic لکھوائے ہیں۔ بہر حال شاعر زمان و مکان کی کئی منزلیں طے کر جاتا ہے۔ اب حالت یہ ہے:

برہنہ سرکی راتوں' کئی صدیوں سے۔۔۔
بھورے اُونٹ کی دُکھ سے لبالب بلبلاہٹ
سننے کو تیار بیٹھی ہے

پہلے یہ حالت تھی:

جہاں مہتاب کی بُرّاق کرنیں
اُس کے لانبے اور کھلے بالوں میں اٹکے
تازہ تر انجیر کے پتے کو روشن کر رہی تھیں

لانبے اور کھلے بالوں سے سر کی برہنگی' گندمی کُہنی کے بوسے سے خاکستری ملبوس کی مخصوص خوشبو تک' ایک لمبا مرحلہ ہے۔ شاعر واپس تو آیا ہے لیکن کیسے۔۔۔ شکستہ پا بہ رکاب' بوڑھے اُونٹ کی سواری' ہاتھ میں بدرنگ چمڑے کی مہاریں' ملبوس خاکستری ہے' گلی سنسان ہے' جانے والے تو کب کے جا چکے ہیں' اُسے احساس ہے کہ وہ ایک بزدل شخص ہے' جس کی رفاقت ڈھیلی ہے کیونکہ وہ جب اسے بے بس اور اکیلے چھوڑ آیا تھا تو عہد یہ تھا کہ اُس

کی باطنی طاقت' اُس زمان و مکاں میں تو کیا' سرحد امکان ولا امکاں تک اُس کی وفا کا ساتھ دے گی' لیکن ہوا یہ ہے کہ بوڑھے اُونٹ کی بے ہنگم ہچکولے کھاتی ہوئی سواری (جو تھکے اعصاب کا Objective Correlative ہے) ایام پیری میں زوال عمر کے احساس کو لے کر لمحہ بہ لمحہ مرنے کا دوسرا نام ہے۔

جب ''اوراق'' میں یہ نظم میں نے پڑھی تھی' مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ نظم بہت بڑی ہے' لیکن عام قاری یا سطحی نقاد اسے سمجھ نہیں پائے گا۔۔۔

اب اسے ایک بار پھر غور سے پڑھا ہے تو میری پہلی رائے پختہ تر ہو گئی ہے۔ اس نظم میں رفیق سندیلوی کے اُسلوب کے وہ سارے ''گن'' موجود ہیں جنہیں سنسکرت شعریات میں ''گن وردھک'' کہا گیا ہے۔

رفیق سندیلوی کی بیشتر دیگر نظموں کی طرح ''سواری اُونٹ کی ہے'' میں بھی تاریخ اور لوک قصص کے Allusions روزمرہ کے امیجز کی صورت میں رونما ہوئے ہیں' اس نظم میں جو وظائف استعمال کیے گئے ہیں' وہ از خود اہم ہیں۔ زیڈ زیڈ پولک (1856-1788ء) نے The Sublimiting of Nature میں شاید سب سے پہلے شاعری میں وظائف کی تشریح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وظائف بذاتِ خود لوک گیتوں' لوک ریت یا رواجوں اور جادوئی کمالات کا عنصر شاعری میں سموتے ہوئے اسے حد درجہ معنی خیز بنا دیتے ہیں۔ ماحول اور معاشرتی اقدار اپنی جمالیات خود تشکیل دیتے ہیں لیکن قارئین ان وظائف کو اپنی زندگی' ریت' رواج' بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں سے جوڑ کر معانی خود اخذ کر لیتے ہیں۔ اس حوالے سے ''سواری اُونٹ کی ہے'' میں برتے گئے وظائف کی تفصیل دیکھیے:

- ☆ نظم کا واحد متکلم 'شہرِ شکستہ' کی ایک 'سنسان گلی' میں اونٹ پر سوار بد رنگ چمڑے کی مہاریں' تھامے ہوئے ایک گھر کی جانب بڑھ رہا ہے۔
- ☆ اس گھر میں ایک 'غم زدہ عورت' اقرار باللسان کی رسّی سے بندھی ہوئی بے تاب ہے کہ وہ شخص آئے' جس کی مخصوص 'خوشبو سونگھنے' اور اُونٹ کی 'لبالب بلبلاہٹ' سننے کے لیے ہی شاید اس کے سانس اٹکے ہوئے ہیں۔
- ☆ واحد متکلم بیانیہ کے فارم ایٹ میں Flash Back کا سہارا لیتا ہے اور اس رات کو یاد کرتا ہے' جب 'زہریلے تیروں کی بارش' ہو رہی تھی اور وہ اس عورت کے رُو برو' سر جھکائے کھڑا تھا۔
- ☆ کب یہ واقعہ ہوا تھا' اس کی تصویر کشی شعری اظہار کے خوبصورت ترین لہجے میں دیکھے بھالے ہوئے امیجز سے کی جاتی ہے۔ یعنی چاند' ہوا' گاؤں یا قصبے کے مکان کا نقشہ' سیلن زدہ اوطاق کا گوشہ' انجیر کا پتہ۔۔۔ جو اس تصویر کے نمایاں پہلو ہیں۔
- ☆ اس Locale کی شناخت اور تصدیق بالقلب یہی امیج کرتے ہیں۔ وہ لمحہ زندہ ہے' جس میں اس نے غم زدہ عورت کی 'گندمی کہنی' کا بوسہ لیتے ہوئے اپنی تلوار اس کے پاؤں کے پاس رکھ دی تھی۔ اُس کے بالوں میں انجیر کا ایک پتہ ٹانک دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ 'قیامت تک' بلکہ قیامت سے بھی آگے سرحد امکان ولا امکاں تک' اس کا ساتھ دے گا۔
- ☆ واحد متکلم ایک بار پھر حال کے لمحے میں لوٹتا ہے۔ گلی سنسان ہے۔ کوئی پرندہ یا پتنگا تک نہیں ہے۔ ''کسی بھی مرد و زن کی میں نے صورت تک نہیں دیکھی۔''
- ☆ ''سواری اُونٹ کی ہے'' کا Refrain اُبھرتا ہے اور واحد متکلم کا بیانیہ جو بیک وقت Soliloquy بھی ہے اور قبولِ جرم بھی' ایک بار پھر اسی حزیں لہجے میں شروع ہو جاتا ہے۔ وہ اس خموشی کے محشر کا اشارہ دیتا ہے جو ہچکیوں اور سسکیوں کے بعد کا محشر ہے۔

یہاں پہلی بار وہ خود کو 'بزدل شخص' کہتا ہے۔

- ☆ وہ آیا تو ہے لیکن جیسے یہ لمحہ ہمیشہ کے لیے جامد و ساکن ہو گیا ہے۔ صرف ایک سنسان گلی ہے۔ ایک بھورے اُونٹ پر بیٹھا ہوا وہ خود ہے۔ اُونٹ چل رہا ہے لیکن گلی کا کونہ نہیں آتا۔ اس کا سفر نا مختتم ہے۔
- ☆ آخری موومنٹ میں 'تھکے اعصاب والے بوڑھے جسم' کو لیے ہوئے وہ معذرت کی بھیک کا خواہاں ہے' لیکن 'سیلن زدہ اوطاق' والی نہیں ہے۔ گلی میں اس کے ہونے کا نشاں ملتا نہیں ہے' اپنے اونٹ کے کوہان پر بیٹھے ہوئے وہ 'ایام پیری کن رہا ہے۔' کب گلی کا کونہ آئے' اور وہ اس عذاب سے چھوٹ جائے جو وعدہ فراموشی نے اُس کو دیا ہے۔

یہ نظم عہد حاضر کے قاری کے لیے نامانوس نہیں ہے۔ قاری اپنے بچپن میں سُنی ہوئی کہانیوں' تاریخ و ثقافت کے رشتے سے استواری اور

اردو فارسی' عربی کی ادبی روایت سے انسلاک کی بنا پر اس نظام کو مانوس پاتا ہے۔ تاریخیت Historicism سن ولادت یا سن تخت نشینی یا فتوحات کا نام نہیں ہے۔ جدیدیت کی مہم نے گزشتہ صدی کے وسط میں تاریخیت کو بے معنی قرار دینے کی جو مہم شروع کی تھی وہ تو 1969ء کے آس پاس ہی ختم ہوگئی تھی' جب Neo- Historicism کی تصدیق مکرر امریکن ہسٹاریکل سوسائٹی نے اپنے کنونشن کے دوران اپنی قراردادوں میں کی اور اس امر پر زور دیا کہ ماضی اور حال خود میں مربوط ہونے کے علاوہ مستقبل میں بھی' موجود ہوتے ہیں اور موجود رہتے ہیں۔

لیکن واحد متکلم کون ہے اور یہ عورت کون ہے؟ اس نظم میں عبارت لوک قصے کو عہد حاضر کے ساتھ ساتھ متوازی خط کی طرح رکھ کر یا اس پر مُہر کی طرح ثبت کر کے اس کے معانی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ حرف و معنی کے انسلاک کی مہم جوئی میں اگر چند لمحوں کے لیے بالفرض اس عورت کو آج کا سماج سمجھا جائے' جو ظلم و ستم' سیاسی' سماجی اور دولت کی ناہموار تقسیم کی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے' تو کیا نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔

اسی رو میں بہتے ہوئے آیئے' واحد متکلم کو وہ بے باک شاعر سمجھیں' جو حکمراں طبقے کی اس چیرہ دستی کے خلاف ایک بے خوف بغاوت کا عزم لے کر اُٹھا تھا۔ اس کا احتجاج پُر جوش تھا' اُس کی تلوار (وہی تلوار جس کو اس نے سیلن زدہ او طاق والی یعنی صدیوں سے مظلوم خلقت کے پاؤں پر رکھ کر دوبارہ واپس آنے کا وعدہ کیا تھا) ساعقہ پاش تھی۔ اُس کی آواز میں ہم ہمہ تھا' لیکن ایک لمحہ ایسا آیا جب وہی جبر و تشدد کے خلاف اپنی پکار کو جاری رکھنے میں خود کو ناتواں پاتا ہے۔ زہریلے تیروں کی بارش ہے' اور وہ عاقبت اسی میں سمجھتا ہے کہ فی الحال راہِ فرار اختیار کرے لیکن روانہ ہونے سے پہلے وہ اس بات کا اقرار باللسان کرتا ہے کہ وہ قیامت تک بلکہ قیامت سے بھی آگے سرحد امکان و لا امکان تک اپنے اقرار کو نبھائے گا اور واپس آئے گا۔

قطعیت اور سکہ بند تاریخیت (جس کے خلاف جدیدیت نے مہم جوئی کی تھی) شاید یہ گوارا نہیں کرتی' لیکن ہمارے اپنے معاشرے میں ایسی سینکڑوں مثالیں مل جائیں گی جنہیں سیاسی یا سماجی Expediency سمجھا جاتا ہے۔ یہ اَمر واقعی ہے کہ لوک قصوں میں بھی بارہ یا چودہ برسوں تک اپنی رفیقِ حیات کو نہ معلوم کس کے سہارے چھوڑ کر شوہر نامدار دُور دراز کے ملکوں سے 'کمائی' کر کے واپس آتا ہے۔ شاعر کے ہاں ماضی ایک بند کتاب نہیں ہے' ایک کھلا ورق ہے اور وہ اس سے براہِ راست استفادہ کرتا ہے۔ ماضی ایک پیر تسمہ پا کی طرح اس کے شانوں پر سوار ہے' اور اس ماضی کی حکایات میں بُزدلانہ رموز و حقائق بھی اسی طرح کارفرما ہیں' جس طرح شجاعت اور وسیع المشربی کے حوصلے ہیں۔۔۔

واحد متکلم چلا تو گیا' لیکن دُور دراز کے سفر کی طوالت' وقت' بے سمتی' بے جڑنی' اور ہزیمت خوردگی شاید اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتی رہی اور وہ لوٹ نہ سکا۔ یہ ایک سفاک طنز ہے' جو شاعر کا واحد متکلم ان سبھی اہل قلم پر کرتا ہے' جو برصغیر میں ایک Vocal Force بن کر اُبھرے تھے لیکن اب شکست خوردہ ہیں اور کسی روشن مستقبل کی اُمید نہیں کر سکتے۔ یعنی اب اگر وہ واپس بھی آئیں' تو واحد متکلم کی طرح سکڑے ہوئے؛ کمزور' ایام پیری گنتے ہوئے اشخاص ہوں گے۔۔۔ نظم کا Protagonist اپنی گلی میں لوٹ کر جو منظر دیکھتا ہے' وہ قدرت اور انسانی بستی کے مابین تضاد و منافرت کا ہے۔ مکان ایسے نظر آتے ہیں جیسے ٹھنڈے اور گیلے خول میں کاغذ کے بنے ہوئے ہیں لیکن جس کے لیے وہ واپس آیا ہے' نہ معلوم کہاں ہے۔

کہاں ہے وہ مری پیاری
مری سیلن زدہ اُوطاق والی
زمینوں' پانیوں اور انفس و آفاق والی

یہ ''زندگی'' تھی' پانی' زمین' انفس' آفاق والی زندگی تھی' جسے وہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب وہ لوٹا ہے' تو ''زندگی'' کہیں نہیں ہے۔ وہ تو ایک ایسی گلی میں سے گزر رہا ہے' جس میں کسی ذی روح کی آہٹ نہیں ہے' اکیلا وہ ہے' سنسان گلی ہے اور اس کا بھورا اُونٹ ہے۔

اللہ خیر! یہ مماثلت Far-Fetched بھی ہو سکتی ہے۔ وظائف کی سطح پر اس قسم کے امیج' تلوار اس کے پاؤں پر رکھ کر' اور انجیر کے پتے کو اس کے بالوں میں اڑس کر وعدہ کرنا' بائبل میں Ruth کی کہانی اور گوتم بدھ کا اپنی بیوی یشودھا کو چھوڑ کر چلے جانے کی کہانی بھی کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر کا عندیہ بالکل مختلف ہو۔ ممکن ہے وہ ایک الگ سطح پر چودہ صدیاں پہلے کے وعدے' یعنی مہدیٔ موعود یا مسیح موعود کے Allusions کو برت رہا ہو۔ جنہیں آنا تھا وہ نہیں آئے اور جب آئیں گے' تو شاید اُمت کی ایک اور ہی تصویر پائیں' جس کا خدشہ شاعر کو ہے۔ ممکن ہے' نظم دیگر جہات کی حامل ہو اور شاعر ایک لوک کہانی کی آڑ میں خود کو First Person Protagonist کے طور پر سمو کر کچھ اور ہی کہنا چاہتا ہو۔

منشایاد کے افسانوں میں مشرقی تہذیب کے نسائی حوالے

محمد حمید شاہد

میں منشایاد کے افسانے کی عورت پر بات کرنا چاہتا ہوں اور راجندر سنگھ بیدی کی عورت یاد آنے لگی ہے۔ بیدی کی عورت سے منشا کی عورت کا کیا سمبندھ؟ آپ حیران ہو کر حرف گیر ہو رہے ہیں' آپ کا متعجب ہونا یقیناً اس صورت واقعہ سے پھوٹا ہے کہ بیدی اور منٹو کے افسانوں میں عورتوں کے کردار بنیادی حوالے کے طور پر آتے ہیں' اس طرح کہ وہ ان دو فن کاروں کی شناخت بن جاتے ہیں۔ منٹو کو اگر چھلکے والی اور گناہ میں پڑی ہوئی عورت کے ذریعے تہذیب و تمدن کی چولی اتارنے والے کے طور پر پہچانا جاتا ہے تو بیدی کو اس گرہستن اور خاندان سے جڑی ہوئی عورت کے ذریعے جو اپنے صبر سے اپنا اور کٹھور معاشرے کا سر پھوڑتی ہے۔ منشایاد کے افسانوں میں اس کی دیہی عورت کا خاطر خواہ حصہ بجا سہی مگر اس کی فکشن کے دیگر لوازم سے یہ تناسب میں بہت کم بنتا ہے۔ وہ لوازم جو موضوعات' فضابندی اور منظر نگاری سے شناخت ہوتے ہیں۔ کرداروں کی اٹھان اور باہمی کشاکش کے علاوہ متنی و تخلیقی خواص کے امتزاج سے جمالیاتی پیکر بناتے ہیں۔ ان سب نے اس کے افسانوں کو ایک خاص سطح پر پہنچا دیا ہے۔ تجسس' کشش اور سحر' آپ منشایاد کے افسانے پڑھ رہے ہوتے ہیں تو یہ تینوں الفاظ بھی کیفیت بن کر آپ کے تخیل کے اندر حلول کر رہے ہوتے ہیں۔ وقت تیزی سے ماضی حال اور مستقبل کے بیچ سعی کرتا ہے اور دیہی دانش کہیں انہونی کو ہونی کا سا بنا دیتی ہے اور کہیں ہونی شدنی وہ شکنجہ بن جاتی ہے جس میں جکڑی ہوئی انسانیت کراہ رہی ہے۔ منشایاد کے ہاں ایسے موضوعات کی کمی نہیں ہے جو زندگی کی عام شاہراہ سے اٹھائے گئے ہوں لیکن ہوتا یوں ہے کہ روزمرہ کا دیکھا بھالا موضوع اس کے قلم اور تخیل کا لمس پا کر بھیدوں بھرا فن پارہ ہو جاتا ہے۔۔۔ مگر صاحب ابھی منشایاد کی شناخت کے نمایاں نشانات پر بات نہیں ہو رہی کہ اس نشست میں مجھے صرف اس کے افسانوں کی عورت پر بات کرنا ہے۔

منشایاد کے ہاں' تصویرزن سے کائنات میں رنگ والی عورت ہو یا وہ جسے حالی نے ''ماؤں' بہنو' بیٹیو'' کہہ کر مخاطب کیا تھا' ہر دو صورتوں میں عورت زمین کے ساتھ جڑ کر آتی ہے۔ حافظ شیرازی کا ایک شعر ہے:

اگر شراب خوری جرعہ ای فشاں بر خاک
ازاں گناہ کہ نفع رسد بہ غیر چہ باک

یعنی شراب پیئو تو گھونٹ بھر شراب زمین پر بھی ڈال دو کہ اس گناہ سے کیا باک جس میں کسی کا بھلا ہو رہا ہو۔ اور منشایاد کا معاملہ یہ ہے کہ وہ سارا لطف اپنے حلقوم میں اور ساری کی ساری شراب زمین پر پھینکتا رہا ہے۔ بدلے میں زمین یوں مست ہو کر مہکی کہ اس کے افسانوں کا دامن معنویت اور جمال کی مستی سے کناروں تک بھر گیا۔ منشایاد کی عورت بھی اسی شراب میں گوندھی ہوئی مٹی سے معتبر ہے۔

معاف کرنا صاحب' کہ میں باتوں ہی باتوں میں آپ کا سوال اپنے پہلو میں رکھ کر بھول گیا تھا۔ آپ کا سوال کچھ ایسا ہی تھا نا۔۔۔ بیدی کا حوالہ کیوں آیا؟۔۔۔ ہاں سوال مزے دار ہے۔ دیکھئے جی' یہ بات تو طے ہو چکی' کہ جب جب کسی نے فکشن میں جنس اور عورت کا مطالعہ کرنا چاہا تو منٹو اس کے اعصاب پر سوار ہو گیا اور جس نے دیہی پس منظر کے افسانوں میں عورت کو حزن کے کیف کی جھمر جھمر میں جانچنا چاہا' اس کی سب سے پہلے بیدی سے ملاقات ناگزیر ہو گئی۔۔۔ اور ہاں' اس سے کون انکاری ہو گا' یہ اس امر واقعی کے باوصف ہو رہا ہے کہ منٹو محض جنس نہیں ہے اور نہ ہی بیدی کو حکیم نے اس سے پرہیز کی تلقین کر رکھی تھی۔ اپنے موضوع کے تعین کے ساتھ ہی میرا بیدی کا ذکر لے بیٹھنا ایک تو اس مجبوری کا شاخسانہ تھا' کہ وہ خود ہی میرے سامنے آ بیٹھا تھا۔ اور دوسری وجہ جو میں جان پایا ہوں وہ یہ بنتی ہے کہ میں نے منشایاد کی عورت کو ایک ایسے حزن کے ابتلا میں پایا ہے' جس کا سلسلہ احساس کی سطح پر اگر کسی کے نسوانی کرداروں سے جوڑا جا سکتا ہے تو وہ بیدی کے افسانوں کے نسوانی کردار ہیں۔ یہاں یہ وضاحت لازم ہو گئی ہے کہ یہ بات میں اس تناظر میں قطعاً نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں نے اس معاملے میں منشایاد کو بیدی کے مقلد کے طور پر شناخت کیا ہے بلکہ یوں ہے کہ دونوں

کا اپنا اپنا دیہی ماحول' کرداروں کے نین نقش' قد کاٹھ چال ڈھال' زبان اور موضوعات میں اتنے رخنے ہیں کہ مناسبتیں اور مشابہتیں تلاش کرنے نکلو تو کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ تاہم دونوں کے افسانوں میں ایک چیز ہے جو میں نے بطور خاص محسوس کی ہے اور وہ ہے دکھ کی ایک شدید لہر۔ دونوں کے ہاں یہ دکھ' جدائی اور تاہنگ والا گیت بن جاتا ہے۔ بیدی نے جب ''لاجونتی'' لکھتے ہوئے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ ''ہتھ لائیاں کملان نی لاجونتی دے بوٹے' تو ہمارے دلوں کو ایک پاکیزہ اور روشن حزن سے بھر دیا تھا۔ منشایاد کے ہاں بھی یہی دکھ یوں ہی ہلورے دیتا ہے'' ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں' مینوں لے چلے بابلا لے چلے'' (افسانہ: تیرھواں کھمبا) میں سمجھتا ہوں کہ دکھ اور جدائی کے احساس کی یہ لہر' جو دونوں کے ہاں شدت سے ظاہر ہوئی ہے' اس کا سبب ان دونوں کا پنجاب کی لوک روایات سے آگہی اور اس کی مٹی سے مانوس ہونا ہے۔ صوفیانہ روایات کی امین اس دھرتی سے جو دل سے وابستہ ہوتا ہے حزن کا خزانہ اس کے ہاتھ آ ہی جاتا ہے۔

بیدی اور منشا دونوں کے ہاں ایک اور بات جو میں نے بطور خاص شناخت کی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں نے اپنے اپنے تخلیقی عمل کے آغاز سے ہی عورت کو بٹر بٹر تکنا شروع نہیں کر دیا تھا' دونوں جھجکے اور ٹھٹکے تھے اور دونوں نے اسے رشتوں اور روایات کے ساتھ جوڑ کر دیکھا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ عورت کو لکھتے ہوئے' دونوں کو اپنی تخلیقی زندگی کے شروع میں حسی کی بجائے فکری سطح پر زیادہ متحرک پایا گیا ہے تاہم بعد میں دونوں کے ہاں فکری دھارے اور اک حسیات میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ بیدی نے اپنے مضمون ''افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل'' میں خود بتایا تھا کہ منٹو نے اس پر گرفت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''بیدی' تمہاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو' معلوم ہوتا ہے لکھنے سے پہلے سوچتے ہو' لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو''۔ اور منشایاد نے اپنی پہلی کتاب ''بند مٹھی میں جگنو'' کی دوسری اشاعت پر اپنے افسانوں میں موجود شدت کو جذباتیت قرار دیا تھا۔ منشایاد کے اسی شدت پسندی والے رویے کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا دوسرا افسانہ ''جزیں'' کا مطالعہ مفید رہے گا۔ تاہم اس سے پہلے کارل گستاو یونگ کی وہ بات' جس کے مطابق' لاشعور میں نہاں باتوں سے کلی طور پر کنا ممکن ہی نہیں ہے تاہم وہ یہ بھی کہتا تھا کہ شعوری سطح پر ان سے دامن کشاں ہوا جا سکتا ہے' ان سے پیچھا چھڑانے' ان کو اندر کہیں دبا لینے یا اپنے بدلے ہوئے تہذیبی مزاج سے کچھ اور معنی بھی پہنائے جا سکتے یا پھر یوں کہہ لیں کہ ان کا حیلہ کیا جا سکتا ہے۔ جوں جوں لکھنے والا آگے بڑھتا ہے شاطر ہوتا جاتا ہے' بچپنے کی معصومیت اور بے ساختگی پر مہارت اور فن کارانہ ساختگی تہیں جمانے لگتی ہے۔ میں ایک اچھا لکھنے والے کے لیے شاطر اور چالاک ہونا بہت ضروری گردانتا ہوں مگر اس ساری چالاکی کو اس کی معصومیت اور بچپنے جیسی لپک اور بے ساختگی کے اندر چھپا ہوا ہونا چاہیے منشایاد کے لاشعور کی تشکیل میں یقیناً اس کے بچپن اور گھر کے ماحول کا اثر اس وقت بہت گہرا تھا جب وہ افسانہ ''جزیں'' لکھ رہا تھا۔ یہ ماحول' میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں' کہ منشایاد کو منٹو والی عورت' (جو چکلے والی تو ہو سکتی تھی چکی پینے' ابیات گانے اور اپنے خاندان کے دکھ جرنے والی نہیں ہو سکتی تھی) سے دور لے گیا جبکہ اس نے عورت کے وجود کو رشتوں کی پاکیزگی اور تعلق کے خلوص کی ''شدت'' میں دیکھا۔ اس کہانی میں تین عورتیں ایک ساتھ آئی ہیں جو دوسری تین عورتوں کے پیکروں میں ڈھل کر کہانی کے مرکزی کردار جاوید پر قیامت ڈھا گئی ہیں۔ نیک نہاد نوجوان جاوید جو ہاسٹل میں آنے سے پہلے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا مگر کالج میں پہنچ کر اس کا شمار رجعت پسندوں اور دقیانوسی خیالات والوں میں ہونے لگا تھا۔ یہاں تک پہنچ کر افسانہ نگار بین السطور یہ بتا چکا ہے کہ جاوید دیہات کے مصفا اور تہذیبی ماحول سے نکل کر شہر کے اس آلودہ ماحول میں پہنچ گیا تھا جہاں عورت کے حوالوں سے رشتوں اور تعلق کی وہ تمیز تیزی سے دھندلا رہی تھی جو اس کی سرشت اور لاشعور کا حصہ تھی۔ کہانی میں یوں ہوتا ہے کہ جاوید کو اس کے دوست' بندے کا پتر' بنانے کے لیے شراب پلاتے ہیں' چرس کے سوٹے لگواتے ہیں اور زبردستی تھیٹر لے جاتے ہیں۔ یہیں اس کے سامنے تین عورتیں لائی جاتی ہیں۔ تھیٹر کی اسٹیج پر آنے والی عورتوں کو آپ منٹو کی عورت کہہ لیں اور جس روپ میں جاوید نے انہیں شناخت کیا اسے منشایاد کے ہاں کی وہ عورت جان لیا جائے جس سے' اپنے جذباتی پن پر قابو پا کر بھی' وہ دامن کشاں نہ ہو سکا۔ لگ بھگ یہی کچھ بیدی کے ساتھ ہوا تھا۔ یہی سبب ہے کہ بیدی جب ''لاجونتی'' لکھ رہا تھا یا منشا نے ''سزا اور بڑھا دی'' لکھا تو اس کے پیچھے وہی تہذیبی شعور کا دھارا بہر حال کام کر رہا تھا تاہم یہاں تک آتے آتے فکری شدت کی جگہ احساس کی شدت نے جمالیاتی آہنگ میں چلنا سیکھ لیا تھا۔ خیر اس پر بات آگے چل کر ہوگی کہ فی الحال تو ہم منشایاد کے افسانے ''جزیں'' پر بات کرنا چاہ رہے ہیں۔

او ہ' اب اس کا کیا کیا جائے کہ خدا خدا کر کے ''جزیں'' پر بات کرنے کا ماحول بنا تھا کہ تہذیبی جزوں نے اپنی مٹی سے مہکتی میری چھاتی کو

جکڑنا شروع کر دیا ہے۔ معاف کیجئے کہ منشایاد کے ہاں پائے جانے والے عورت کے تصور کو Crude صورت میں دیکھنے اور دکھانے سے پہلے مجھے اپنی چھاتی کی جکڑن سے نمٹنا ہے۔ صاحب کرم کیجئے اور اس عورت کی بابت سوچئے جو اپنی ہی تہذیب کی جڑوں کو کھود ڈالنا چاہتی ہے۔ جی آپ نے درست گمان باندھا' میری مراد اسی عورت سے ہے جو نئی اور مستعار تہذیب کی چکا چوند میں ہمارے ہاں کے جنس زدہ مرد کو محبوب اور مرغوب ہو گئی ہے۔ اندھی روشن خیالی اور مغرب زدگی میں بپا کی گئی عورتوں کی آزادی کی نام نہاد تحریکوں کے بارے میں Barbra Sheterman نے جو کہا' صاحب وہ تو پلو میں باندھنے کے لائق ہے' تاہم یاد رکھنا چاہئے کہ باربرا کی یہ بات تب پلے پڑے گی جب ہم لمحہ بھر کو پیروی افرنگ کی اندھی خواہش سے الگ ہو کر سوچنے کے لائق ہو پائیں گے۔۔۔ کاش کہ ہو پائیں؟۔۔۔ مگر کیسے؟۔۔۔ مجھے تو اب اس کی ہر صورت معدوم ہوتے دکھنے لگی ہے۔ عجب ہوا چلی ہے کہ تہذیب کی ساری امی جمی اکھڑتی چلی جاتی ہے۔ باربرا کی وہ بات جو میں ایک بار پھر نقل کر رہا ہوں محمد سلیم الرحمٰن کے ترجمہ مطبوعہ سویرا سے نقل در نقل ہوتے چلی آتی ہے اور سچ جانو تو ہے بھی اس لائق کہ اپنے ہاں کی بلا سوچے سمجھے feminism کا پھریرا سر بلند کرنے والیوں کو بار بار سناؤں۔ باربرا شیٹر مین نے ایک فیمنسٹ بٹی فرانڈن کی کتاب پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس نے مغربی خواتین کو اصل سمت سے ہٹا کر آوارہ خرامی اور بے راہ روی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ اس کے مطابق' مغربی جمہوریت میں آزادی کے معنی حسن کی نمائش اور عورت کو رونق محفل بنائے رکھنا ہیں۔ اس رویے نے پورے سماج کو Consumerism کا غلام بنا دیا ہے۔ اور اسی رویے کے تحت عورت کا جسم اس کا اپنا نہیں رہا' نمائش کی شے ہو گیا ہے۔ قصاب کی دکان پر لٹکے لذیذ گوشت کے پارچوں اور زندہ تھرکتے نسوانی وجودوں کا منڈی میں ایک ہی طرح سے بھاؤ تاؤ ہونے لگا ہے۔ جی' اب عورت نمائش کی شے ہے' تسکین والی گولی ہے' نشے والی بوتل ہے اور اس کی منڈی میں دیگر اجناس کی طرح قیمت لگتی ہے۔ لہٰذا صاحبو خاندانی نظام معدوم ہو رہا ہے اور جدید عورت رشتوں سے آزاد ہو رہی ہے۔ عورتوں کی آزادی زندہ باد۔ مگر اس بے بصیرتی کی ارزانی پر داد کے ڈونگرے کیسے برساؤں کہ جس کی بدولت آزادیٔ نسواں کی لے کے پر جوش حامیوں کو' عورت کو اپنی جاگیر سمجھنے اور اسے رشتوں سے لائق توقیر بنانے والوں کے بیچ تمیز کرنا نصیب ہی نہیں ہو رہا ہے۔ خود مغرب والوں کو اتنی پر جوش خواتین کہاں میسر ہیں جو گھر پھونک تماشا دیکھنے اور دکھانے کو گلیوں اور سڑکوں میں کودتی پھرتی ہوں گی۔ لہٰذا اُدھر کی ساری این جی اوز ان پر بہت مہربان ہو گئی ہیں۔ جب سستے نعرے مہنگے داموں بک رہے ہوں تو جڑوں کی بات عجیب لگتی ہے۔ مگر صاحب' میں بتا چکا ہوں کہ جس ماحول سے منشایاد کی اپنی سائیکی تشکیل پائی تھی وہاں عورت کا وجود "شے" نہیں تھا' اور اس وجود کا تصور رشتے ناطے کے بغیر ممکن ہی نہ تھا۔ اسی ماحول نے ان رشتوں کو اتنا خالص کر دیا ہے کہ عشق یا جنس کی بات بھی سچے جذبوں کے پانیوں سے دھل کر پاکیزہ اور محترم لگنے لگتی ہے۔ منشایاد کے افسانوں نے بتایا ہے کہ خلوص' سچائی اور پھر جذبوں کی بے پناہ شدت کے ساتھ عورت کو اسی طرح محسوس کیا اور کرایا جا سکتا ہے اور ہاں یہ جو منشایاد کے افسانوں کا مرد عورت کی ناموس کے لیے لڑنے مرنے اور مارنے کو تیار ہو جاتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ ان رشتوں اور تعلق کی ریشمیں ڈور میں بندھی عورت پر تسلط چاہتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی مثبت سماجی اقدار کو بچانا چاہتا اور ان پر اعتماد رکھتا ہے۔

منشایاد کے افسانہ "جزیں" کے جاوید نے تھیٹر کی اسٹیج پر لوگوں کی تالیوں اور سیٹیوں کے درمیان جس نوخیز لڑکی کو ناچتے گاتے دیکھا تھا وہ اسے ہو بہو زبیدہ لگی تھی۔ کرسیاں اور سیٹیاں بجانے والوں میں سے کسی نے کوئی جملہ کسا تو وہ ناچتے ناچتے ہنس دی تھی۔ اس کا ہنسنا بھی زبیدہ جیسا تھا۔ جاوید نے زبیدہ کو تین سال سے نہیں دیکھا تھا۔ تاہم یہ ہنسی جاوید کو تین سال پیچھے لے گئی اور اس نے اپنی آنکھوں سے اسے ہنستے دیکھا۔ یہ تب کی بات ہے جب وہ اپنے والد کی پشاور تبدیلی سے پہلے ان کے ہاں اکثر آتی جاتی تھی۔ وہ اس کی چھوٹی بہن کی کلاس فیلو تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے خوب صورت قہقہے لگاتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا وہ بہن کی بجائے اس سے باتیں کرے اور چھوٹے چھوٹے خوب صورت قہقہے لگائے لیکن وہ اس سے شرماتی تھی۔ وہ بھی اس سے شرماتا تھا لیکن چھپ چھپ کر اس کے چھوٹے چھوٹے خوب صورت قہقہے سنتا اور ہمیشہ یہ آرزو کیا کرتا کہ وہ ایک لمبا خوب صورت قہقہہ لگائے جسے وہ اپنی یادداشت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لے۔ ایسا سوچتے ہوئے اسے یقین ہو چلا تھا کہ اگر آج اس کے ذہن میں وہ لمبا خوب صورت قہقہہ محفوظ ہوتا تو وہ اندر سے اس قدر کھوکھلا اور ویران نہ ہوتا۔ وہ کبھی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ زبیدہ کا حسن اس کے چھوٹے چھوٹے قہقہے تھے یا اس کے سیاہ گھنے بال۔ بہت جلد تالیوں اور سیٹیوں کے شور میں زبیدہ کے چھوٹے چھوٹے قہقہے دب جاتے ہیں۔ پھر جاوید نے دھمال کے دوران جو منظر دیکھا وہ اس کے اوسان خطا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کے بال کھل چکے تھے۔ اس منظر میں محبت کے ابتدائی نقوش سے عورت کا وجود متشکل ہوتا ہے جو فورا

بعد ایک باقی رہ جانے والی تانگ اور حسرت کا حصہ ہو جاتا ہے۔

افسانہ نگار نے اپنی ہی تہذیب سے برگشتہ ثقافتی مظاہر سے دل بستگی کو شعار کرنے والوں کے لیے ایک اور طمانچے کا یوں اہتمام کیا کہ پروین اختر کو اسٹیج پر لے آیا جسے جاوید نے اس بار رخشندہ کے طور پر شناخت کیا تھا۔ رخشندہ جاوید کی ماموں زاد تھی۔ اس کے جسم سے ایسی مقناطیسی لہریں نکلتی تھیں کہ وہ دور چلے جانے کے بعد بھی اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر جوئے شیر لانے، زہر پھانکنے، سانپوں سے ڈسوانے اور ران چیر کر کباب بنانے کی داستانیں سچی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ مگر جاوید نے رخشندہ کو تھیٹر کی اسٹیج پر دیکھا اور وہ بھی یوں کہ وہ تماشائیوں سے نوٹ وصول کر رہی تھی۔ اسے ویل دینے والوں میں سے ایک شخص نے جب اس کی کلائی پکڑ لی تو جاوید آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ ہجوم پھلانگتا اس شخص تک پہنچے اور اس کے دانت توڑ کر رکھ دے۔ مگر اسے پکڑ کر بٹھا لیا گیا تھا اور رخشندہ بڑی بے ہودگی سے ناچ رہی تھی۔

پہلی عورت کے ساتھ جاوید کا محبت کا رشتہ تھا، دوسری عورت محبت اور رشتے کے مخلوط تعلق سے سامنے آئی جب کہ تیسری عورت کو اسٹیج پر لاتے ہوئے افسانہ نگار نے ایک اور دھچکا دینے کا اہتمام کیا۔ آنے کو تو اسٹیج پر چاند بی بی آئی تھی مگر وہ جاوید کو یوں لگ رہی تھی جیسے وہ چاند بی بی نہ تھی اس کی چھوٹی پھوپھی شازیہ تھی۔ اس پھوپھی کی شادی چند ماہ پہلے ہی ہوئی تھی۔ عورت کے پاؤں میں پڑے گھنگھروؤں کی آواز، سارنگی اور طبلے کی آواز میں گھلنے ملنے کے دورانیے میں جاوید نے گمان باندھا تھا کہ ہو نہ ہو تھیٹر والوں نے عجب چالا کی دکھائی ہے کہ تماشائیوں کو ناچنے والیاں اپنی ہی مائیں بہنیں نظر آتی ہے۔ تو صاحب کہانی کا خلاصہ تب تک لطف نہ دے گا جب تک میں یہ نہ بتا دوں کہ افسانہ نگار نے آخر تک پہنچتے پہنچتے جاوید کو لوگوں سے تھپڑ مروائے، پاگل اور دیوانہ کہلوایا، پتھر پڑوائے مگر اس سے یہ بھی کہلوا دیا کہ کہ اسٹیج پر پیشہ ور گانے والیاں سب کو اپنی مائیں بہنیں نظر آتی ہیں مگر وہ ایسا ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اس پوری کہانی کو علامتی سطح پر اٹھا لیجئے اور تھیٹر کی تہذیب کو فرنگیوں کا ناٹک جان کر اپنے ہاں کے رشتوں سے معتبر ہونے والی اس عورت کا تصور کیجئے جو بنیاد پرستی کے طعنے سے بچنے کے اس تماشے میں رشتوں اور تعلق سے محروم ہو رہی ہے تو منشایاد کی شدت پسندی کے جواز اور خلوص کو بہت سہولت سے سمجھا جا سکتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ منشایاد نے جو پہلی کہانی سوچی ہوگی اس میں عورت کا کیا روپ ہوگا۔ تاہم اس کی پہلی کتاب کی پہلی کہانی یعنی "دل کا وجھ" اور کئی دوسری کہانیوں مثلاً "تیسرا شخص"، "دوپہر اور جگنو" اور "سانپ اور خوشبو" وغیرہ میں بھی سگے رشتوں کے حوالے سے عورت موجود ہے اور یہ رشتے ہیں، ماں، بیوی یا بیٹی۔ تاہم بجا کہ یہ کہانیاں عورتوں سے زیادہ انسانی کے رویوں کی کہانی بنتی ہیں۔ کہنے کو تو "کالک" بھی بدلتے مرد کی کہانی ہے مگر عورت کا اس تبدیلی سے کیا تعلق بنتا ہے اس کا مطالعہ بہت دلچسپ ہو جاتا ہے۔

> "آخری بار میں کب رویا تھا مجھے اچھی طرح یاد نہیں مگر میرا خیال ہے کہ اس وقت میں ابھی شہر نہیں آیا تھا۔ گاؤں کی کسی لڑکی کا بیاہ تھا، ہاں مجھے یاد آ گیا، فتح دین تیلی کی بیٹی کی ڈولی نکلی تھی اور بینڈ باجے والوں نے بابل سے بچھڑنے سے متعلق کسی گیت کی دھن بجائی تھی اور مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ فتح دین تیلی کی بیٹی نہیں میری سگی بہن ہے۔۔۔"

تو دیکھا آپ نے کہ دیہی معاشرت میں عورت محض عورت ہوتی ہی نہیں کوئی سگا رشتہ نہ ہو تو بھی کسی نہ کسی رشتے میں جڑ کر محترم ہو جاتی ہے۔ یہیں منشایاد کے پنجابی ناول "ٹانواں ٹانواں تارا" کے عبدل کے آنسو یاد آتے ہیں۔ ناول میں ایک مرحلے پر باراتی جب کھانا کھا چکتے ہیں اور دلہن کی رخصتی کا مرحلہ آ جاتا ہے تو دلہن کی رشتہ دار عورتیں رو رو کر اسے رخصت کر رہی ہوتی ہیں۔ عبدل لڑکے والوں کے ساتھ آیا ہے مگر اس دیہاتی کے معصوم دل کا نقشہ منشایاد نے یوں کھینچا ہے:

> "خالد دا دھیان پیا تے کیہ ویکھدا اے، میاں عبدل پنڈ دیاں اتھرو پونجدیاں زنانیاں تے روندے پئے ماں پیؤ نیڑے کھلوتا روندا پیا اے۔ اوہ گھبیا، اوہنوں کسے کجھ آکھ دتا اے۔ انو نوں کھلیوس، پتہ کرے ہمیں عبدل نوں کیہہ ہویا اے۔ انو تھلے اتر کے آیا۔
>
> میاں کیہ ہویا اے؟
>
> کجھ نئیں، میاں عبدل آکھیا، ایہو جے ویلے اتے رون نے آ ای جاندا اے،

پرتوں نے جانچی ایں؟

جانچی آں پر بنداوی تاں آں''

تو یوں ہے صاحب کہ دیہاتی ہر حال میں بندہ رہتا ہے مگر شہر آدمی کی نفسیات کو کس طرح مسخ کر دیتا ہے کالک' میں موجود عورت کے آئینے میں اسے بھی دیکھ لیجئے:

''پچھلے تیرہ برسوں میں (یعنی شہر میں آنے کے بعد) میں نے کتنے ہی نشیب وفراز دیکھے ہیں' کتنے ہی دل چیر دینے والے مناظر آنکھوں کے سامنے آئے ہیں جنہیں دیکھ کر دل کو کچھ ہوتا بھی رہا ہے مگر آنکھ سے آنسو کبھی نہیں ٹپکا' یہاں تک کہ ایک مرتبہ میری سگی خالہ فوت ہوگئیں' مجھے معلوم ہوا کہ خاندان کے لوگ مجھ سے رونے کی توقع رکھتے ہوں گے' اس لیے میں نے کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے دوسروں کو خالہ کی میت پر بین کرتے اور پچھاڑیں کھاتے دیکھ کر عبرت حاصل کرنے اور خالہ کو اپنی ماں فرض کر کے خود پر رقت طاری کرنے کی بہت کوشش کی مگر ایک بھی آنسو میری آنکھ سے نہ ٹپکا۔۔۔''

اور ہاں' یہ بتانے کی ضرورت تو ہے نہیں کہ شہر بڑی تیزی سے نئی تہذیب میں ڈھل رہے ہیں اور اس کہانی میں گاؤں اس ہند مسلم تہذیب کی شناخت بن کر آیا ہے جس میں عورت اور مرد سچے رشتوں میں بندھ کر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے آئے ہیں جس کا اعلیٰ انسانی قدروں پر پختہ ایمان ہے۔اسی افسانے کا ایک اور مقام:

''میں نے جس لڑکی سے پہلے پہل اظہار محبت کیا تھا مجھے اس سے سچ مچ محبت تھی۔ میں اُسے جو کچھ کہتا تھا سب سچ ہوتا تھا۔ مجھے اس کی آنکھیں اچھی لگتی تھیں اور میں صرف اس کی آنکھوں کی تعریف کرتا اور سوچتا تھا۔ مگر اب کسی شاعر لڑکی کا جسم اچھا لگے تو اس کی غزل کے مجموعی تاثر کی تعریف کرتا ہوں اور افسانہ نگار خاتون اچھی لگیں تو بات افسانے کے عنوان کی تعریف سے شروع ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ محض اس لیے ہے کہ مجھے روئے ہوئے بارہ تیرہ برس ہو گئے ہیں اور میرے اندر معصومیت اور سادگی کا قحط پڑ گیا ہے۔''

صاحب یہی وہ سادگی اور معصومیت کا قحط ہے جو تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی نے ہماری جھولی میں ڈال دیا ہے۔ پنجابی کی ایک کہاوت ہے مردہ پلید اور قبر چونے گچ' یہی معاملہ ہمارے دلوں کا ہوتا جارہا ہے اور دلوں کی اسی کالک میں عورت کے ساتھ رشتے بھی گم ہو رہے ہیں۔ منشا یاد نے ایک اور افسانے ''دیمک کا گھروندہ'' میں انہی معدوم ہوتے رشتوں کی محسوسات کی سطح پر تصویر کشی کی ہے۔ (یاد رہے اوپر وہ ذہنی ساخت دکھائی جا چکی جس میں ایک کامی کی بیٹی کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی رشتوں میں جڑی ہوئی محسوس ہوتی تھی):

''میں قریبی مارکیٹ سے ارشد کی پسند کے بسکٹ لینے چلا گیا۔ واپس آیا تو شکیلہ ڈرائنگ روم میں چائے کے برتن رکھنے گئی ہوئی تھی۔ میں اسے اندر بھیجنے پر امی سے خفگی کا اظہار کرنا چاہتا تھا کہ اندر سے اس کی چیخ سنائی دی۔ میں بھاگ کر اندر پہنچا تو دیکھا چائے کے برتن ٹوٹے پڑے تھے۔ شکیلہ منہ چھپائے ایک طرف کھڑی رو رہی تھی اور ارشد کہیں نہیں تھا۔ مگر اسی دم میری نظر نالی میں غائب ہوتی سانپ کی دُم پر پڑی۔ میں ہاکی لے کر اس کا سر کچلنے نکلا مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔''

مان لیجئے صاحب کہ تہذیب کی ساری رونق اور چہل پہل رشتوں اور تعلق کی محتاج ہوتی ہے۔ یہ رشتے ہند مسلم تہذیب کا امتیاز ہیں اور انہیں کے سبب خاندان کا انسٹی ٹیوشن مضبوط رہا ہے مگر جارح ثقافت کی چکا چوند میں سب کچھ بکھر رہا ہے اور اسی کا شاخسانہ ہے کہ اب انسان اشرف المخلوقات نہیں رہا' رذیل سانپ بن گیا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ رذالے کی جورو کو سدا طلاق' تو صاحب سچ ہی کہتے ہیں' بھلا کمینوں اور سفلوں کو اپنے عہد کا اور اپنے رشتوں کا پاس کیوں ہوگا اور کیسے ہوگا۔ منشا نے اس صورت کو گرفت میں یوں لیا ہے:

''میں خود بھی انسان کی جون میں کوئی سانپ ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر کسی دن پتہ چلا کہ میں سچ مچ اصل میں سانپ ہوں تو مجھے مختلف لوگوں کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔ مثلاً وہ بڑھیا جو میری ماں کہلاتی ہے۔۔۔

لیکن کیا خبر وہ بڑھیا یعنی میری ماں دراصل انسان کی جون میں کوئی ناگن ہو اور عورت بن کر اس نے میرے باپ سے شادی کر لی ہو۔ اور کون جانے ایک روز اس نے اسے ڈس لیا ہو اور وہ مر گیا ہو لیکن یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ میرا باپ سانپ نہیں تھا۔ ممکن ہے ماں سے اکتا کر اس نے مرنے کا بہانہ کیا ہو اور قبر سے نکل کر اپنے پرانے بل یا غار میں چلا گیا ہو۔''

''میں نے ماں اور شکیلہ کو اپنے گھر میں نظر بند کر رکھا ہے اور ان کا پہرہ دے رہا ہوں۔ ماں میری شادی پر مصر ہے اس نے میرے لیے پہلے سے ایک لڑکی چن رکھی ہے مگر میں نے ابھی تک اس لڑکی کو نہیں دیکھا اور نہیں کہہ سکتا کہ وہ لڑکی ہی ہوگی۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ جب ڈولی کا پردہ سرکایا جائے تو وہ کنڈلی مارے بیٹھی ہو یا پھر میرے پہلو میں لیٹی لیٹی اچانک ناگن بن کر میرے سینے پر چڑھ جائے۔''

رشتوں کی مکمل شکستگی کے بعد عورت اور مرد کا تعلق کتنا پست اور گھناؤنا ہو جائے گا منشا یاد کے ہاں یہ موضوع پلٹ پلٹ کر آتا رہا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ موضوع انسانی نفسیات کا انتہائی باریک بینی اور دردمندی سے کیا گیا مطالعہ ہو جاتا ہے۔ قومی اہمیت کے امور پر مرد اور عورت کے بیچ رشتوں سے تہی تعلق کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اس کا انتہائی سلیقے، مہارت اور بے دردی سے کیا گیا تجزیہ منشا یاد کے افسانے ''چھتیں اور ستون'' میں ملتا ہے۔ قومی اہمیت کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے اور جس کی نگرانی میں عمارت کو تعمیر ہونا ہے وہ چند شوخ اور حسین لڑکیوں کے تعاقب میں مری پہنچ گیا ہے۔ اس کہانی میں مس نجمہ سمیت کئی اور لڑکیوں کی سمت اشارے بھی ہوتے ہیں۔ ان لڑکیوں کی سمت جن میں رشتے مقدس نہیں رہتے لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ادھر بہکے پھرنے والی لڑکیوں کے ساتھ اٹکھیلیوں میں مکمل ہونے والی قومی اہمیت کی عمارت کی چھت ٹپکنے لگتی ہے۔

رشتوں ناطوں اور گہرے سماجی تعلقات کی تکرار سن سن کر جب آپ کے دھیان میں منشا کی کہانی ''شجر بے سایہ'' آئی ہوگی تو آپ مجھ پر خوب ہنسے ہوں گے۔ ہت تیرے کی' کہتے آپ کے چہرے پر میں تمسخر کی جھلک دیکھ رہا ہوں۔ آپ کا اصرار ہے کہ ''شجر بے سایہ'' میں رشتوں کی اوقات ہے ہی کیا؟۔۔۔ ڈیڑھ بکائن میاں باغ میں' رشتوں کی اس پونجی پر اتنا بھی کیا اترانا۔ آپ کا کہا بلا سبب نہیں لہذا سر آنکھوں پر' میں بھی تو شاید اس افسانے سے اسی وجہ سے کنی کاٹ رہا تھا۔ مگر اب جو آپ کے ماتھے کی چنٹ دیکھی اور ایک بار پھر اس افسانے کے کرداروں پر غور کیا تو کھلا کہ میں اپنی سہولت کو عزیز جان کر پہلو بچا رہا تھا' جی صرف سہولت نہیں۔۔۔ بے پناہ سہولت' وہی جو اس افسانے کے باب میں ایک کلیشے سا تنقیدی جملہ لکھ کر آگے گزر جانے والے مظفر علی سید کو میسر آئی تھی۔ ''شجر بے سایہ'' کو ایک طرف رکھ کر اور اپنی اندر بے اعتنائی بھر کر میں نے جو سہولت ہتھیائی تھی' وہ مداری کا بخت بننے والی وہ سہولت نہیں تھی کہ جس میں وہ اپنی ٹوکری یا ٹوپی سے وہ چیزیں نکال دکھاتا ہے جو اس میں ہوتی ہی نہیں' یا پھر اس میں اوپر سے ڈال دی گئی ہوتی ہیں۔ بلکہ یوں ہے کہ اب تک جن افسانوں کا تذکرہ ہوا ان میں سہولت یہ تھی کہ ان کا متن خود میری مدد کرتا رہا ہے۔ مجھے نہ ان میں سے وہ چیز نکال دکھانے کا شعبدہ دکھانا پڑا جو اس میں نہیں تھا نہ اس میں اپنی طرف سے معنی ڈالنے پڑے۔ یہ افسانے تو اس عطر کی شیشی کی طرح تھے جو باہر سے بھی بھیگی ہوئی ہوتی ہے۔ سطر سطر معنوں کی ایسی خوشبو امنڈتی رہی جو انسانی تہذیبی رشتوں سے معتبر ہوتی۔۔۔ ''شجر سایہ دار'' میں یہ سہولت نہ تھی' یہاں منہ بند شیشی کے باہر کچھ نہ تھا' کارک کھولنا ضروری تھا کہ اس کہانی کی عورتوں سے سیدھے سبھاؤ ملا ہی نہیں جا سکتا تھا۔۔۔ اور اگر ایسا کیا جاتا تو عین ممکن وہی ٹھوکر کھانے کا احتمال تھا جو مظفر علی سید نے یہاں کھائی۔ اس کہانی کی ساری فضا سے سرسری گزرنے اور سطحی نتیجوں میں لپیٹنے کا یہی شاخسانہ نکلنا تھا۔ مظفر علی سید کا کہنا ہے کہ اس کہانی میں عشق پر روایتی معاشرے کا جبر پوری شدت سے محسوس کرایا گیا ہے اور میرا کہنا ہے' ہونہہ عشق؟ مگر کون سا عشق؟؟؟ وہ جو غفوراں نے کیا تھا یا وہ جو صغری نے کیا؟۔۔۔ اب رہی بات ''روایتی معاشرے'' اور اس کے ''جبر'' کی' تو صاحب اس ضمن میں بھی مجھے مظفر علی سید کی بات تو بڑی اچنی ہوئی لگی ہے۔ کیسے؟؟۔۔۔ پہلے افسانے کی جزیات پر بات ہو لے تو اس پر بھی آؤں گا اور جو توفیق ہوئی ضرور کہوں گا۔

''شجر بے سایہ'' اس حویلی کی کہانی ہے جو گاؤں سے قصبے کو جانے والی کچی سڑک پر واقع تھی اور جسے کتوں والی حویلی کہا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں دو خونخوار قسم کے بولی کتے (بل ڈاگ) اور دو مردار کا مواد وریا مور بتے تھے۔ کتوں کے نام لوگوں نے مالکوں کے نام پر رکھ دیئے تھے۔ دونوں بھائی نہایت اجڈ اور ظالم سمجھے جاتے کہ انہوں نے اپنی سگی بہن کو قتل کر دیا تھا اور گاؤں والوں سے ہر قسم کا تعلق توڑ کر اور گاؤں کی سکونت ترک کر

کے یہاں سب سے الگ اس حویلی میں رہنے لگے۔ دیہی معاشرے میں یوں الگ تھلگ ہونے کی ایک اور وجہ بھی افسانے میں موجود ہے' لگتا ہے مظفر علی سید کا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں۔ یہ سطر پڑھئے' حویلی کے مکین خود بخود کٹ کر گاؤں والوں سے الگ ہو جائیں گے:

''گاؤں کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ یہ خاندان پرانے زمانے کے کسی غیر ملکی حملہ آور قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔''

لیجئے صاحب وہ جو مظفر علی سید نے اوپر'' روایتی معاشرے والے جبر'' کا مصرعہ اٹھایا تھا وہ تو یہاں تک آتے آتے کلی طور پر ناموزوں ہو گیا ہے۔ ہاں تو جب یہ طے ہو گیا کہ یہ دیہات سے الگ تھلگ واقع حویلی کی کہانی ہے اور ایسے مردوں کی' جو کتوں کی طرح خونخوار' ظالم تھے' گاؤں میں ان کی کوئی برادری نہ تھی جس کے ناطے سے وہ اس روایتی معاشرے کے نمائندہ کردار کہے جا سکتے تو سوچا جانا چاہیئے کہ مظفر علی سید نے اوپر والا فتویٰ کیوں لگایا؟ اجی کہہ لیجئے سہولت کی خاطر۔۔۔ مگر وہ جو پنجابی میں کہتے ہیں کہلی اگے ٹوئے' تو ہوا یوں ہے کہ اس جلدی اور سہولت میں انہیں آگے کا گڑھا نظر ہی نہیں آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منشایاد نے ان کرداروں کو نفسیاتی عارضے میں مبتلا اس محدود طبقے کا نمائندہ بنا دیا ہے جو معاشرتی اقداری وجود کی روشن پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ مظفر علی سید کے اٹھائے ہوئے جھیڑے میں' میں بھول ہی گیا کہ بات منشایاد کے افسانوں کی عورتوں کی کرنا تھی۔۔۔ تو یوں ہے کہ اس کہانی میں چار عورتیں ہیں۔ اور بتا تا چلوں کہ چاروں کا مطالعہ افسانہ نگار نے نہایت چابک دستی سے کیا ہے۔ دونوں ظالم بھائیوں نے اپنی بہن غفوراں کو قتل کر دیا تھا۔ جس حویلی میں وہ رہتے تھے وہ کسی زمانے میں مویشیوں کا باڑا تھی۔ وہاں کبھی ایک کنواں بھی ہوا کرتا تھا جس کے بارے میں لوگوں کا ایک گمان یہ بھی تھا کہ غفوراں کو قتل کر کے اس میں پھینک دیا گیا اور بعد میں اسے پاٹ دیا گیا۔ اصل بات کوئی نہ جانتا تھا کہ غفوراں روپوش ہوئی یا قتل کی گئی' کنوئیں ڈالی گئی' نہر یا دریا میں بہائی یا کسی کھیت میں دبا دی گئی۔ افسانہ نگار نے بہت سے گمان باندھے' اور یہ ثابت کیا کہ گاموا اور ریاموا تنے شقی القلب تھے کہ بہن کو کھا گئے مگر منہ سے کچھ نہ پھوٹے۔ سارے گاؤں کو غفوراں کی روح کسی نہ کسی موقعے پر نظر آ جاتی تھی مگر ان شیطانوں کے قریب بھی نہ پھٹکتی تھی۔ یہ سب کچھ بتانے کے باوصف جس طرح اس کردار کو بنایا سنوارا گیا ہے وہ اپنی جگہ بہت اہم اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔ پڑھنے والا ہر دم موت کی سرسراہٹ سنتا رہتا ہے:

''وہ گھر میں رہتی تھی مگر گھر کا کوئی فرد اس سے بات نہ کرتا تھا اس نے ماں سے کئی مرتبہ بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر ماں جواب نہیں دیتی تھی۔ سوائے ننھی صغریٰ کی ہوں ہاں کے وہ بات کرنے کو ترس گئی تھی۔ ایک رات اس نے ماں کے پاؤں پکڑ لئے اور روتے ہوئے کہنے لگی۔

''ماں مجھے مار، مجھ پر تھوک، مجھے گالیاں اور طعنے دے خدا کے لیے کچھ تو کہہ''

''میں تیری ماں نہیں ہوں تو کسی کتیا کی اولاد ہے۔''

ماں نے گالی دی تو نا امیدی کے اندھیرے میں امید کا چمکتا ہوا جگنو دکھائی دیا۔۔۔ مگر دوسرے ہی لمحے ماں نے ایک ایسی بات کہہ دی جسے سن کر وہ سناٹے میں آ گئی۔

''تو اس گھر میں مہمان ہے پتہ نہیں کتنے دن' کتنی گھڑیاں۔''

''نہیں ماں۔۔۔ خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔''

''اپنی ناپاک زبان سے خدا رسول کا نام مت لے۔''

''میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

''کچھ فائدہ نہیں۔''

''تو کیا سچ مچ ماں؟''

''ہاں''

''کب؟''

''یہ مجھے نہیں پتہ۔''

مارے خوف کے اس کا حلق خشک ہوگیا' ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا۔''

گامو' دریامو اور ان کی ماں پر'' روایتی معاشرے'' نے کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ بیٹے شیطان تھے تو ان کی بوڑھی ماں چڑیل۔ یہ بات سارا گاؤں جانتا تھا مگر' حیرت ہے مظفر علی سید کا دھیان ادھر نہیں گیا: گاؤں کے لوگوں نے اس خاتون کی اپنے اپنے ذہنوں میں کیا تصویر بنا رکھی تھی اس کے لیے کہانی کی طرف رجوع کرتے ہیں:

'' وہ اپنی بیٹی کی حفاظت نہ کر سکی تھی اور ماں ہو کر اسے بدسلوکی سے تنگ آ کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر اس کے عیبوں پر پردہ ڈالنے کی بجائے قتل ہو جانے دیا تھا۔ وہ گاؤں میں بہت کم آتی تھی مگر جب بھی آتی، جدھر سے گزرتی سہاگنیں' حاملہ عورتیں اور نوجوان لڑکیاں اس کے سائے سے بچنے کے لئے راستہ بدل لیتیں۔ ان کا خیال تھا وہ جسے چھولے گی یا جس سے بات کرے گی اس کی کوکھ کبھی ہری نہ ہوگی یا گود خالی ہو جائے گی۔ اس کے بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ وہ جس درخت کے نیچے بیٹھ جاتی تھی وہ بے سایہ ہو جاتا تھا۔ گاؤں میں جب بھی کوئی غیر معمولی واقعہ یا حادثہ رونما ہوتا بوڑھی سکینہ اور اس کے خاندان کو اس میں ضرور ملوث کر لیا جاتا۔ بڑی بوڑھیوں نے تو گامو کے ہاں نرینہ اولاد نہ ہونے کو بھی غفوراں کی روح کا انتقام ہی سمجھا تھا اور جب دریامو کا نوعمر بیٹا سانپ کے ڈسنے سے مر گیا تو اسے بھی اسی انتقامی کارروائی کا حصہ سمجھا گیا جو غفوراں اپنے گھر والوں سے لے رہی تھی۔''

اب ذرا کہانی کے آغاز کی طرف چلتا ہوں کہ مظفر علی سید نے اپنی ہی دھن میں جو کہہ دیا تھا اس نے میرا کام خاصا کٹھن کر دیا ہے ۔افسانہ نگار نے اس افسانے کو یوں شروع کیا ہے:

'' سہ پہر کا وقت تھا جب نمبردار کی بیوی ست بھرائی اسے اپنے ساتھ لے کر اس کے گھر پہنچانے نکلی۔''

یہ کہانی ست بھرائی کی نہیں ہے' غفوراں کی ہے' میلے میں لٹ جانے اور خالی ہاتھ واپس آنے والے بچے کی طرح آنکھیں جھکائے کھوئی کھوئی پیچھے پیچھے چلی آنے والی غفواں کی۔ اسے ست بھرائی بار بار تسلیاں دیتی ہے مگر وہ سوکھے پتے کی طرح لرزتی ہے کہ اس سے جو غلط فیصلہ ہو گیا تھا اس نے اسے اندر سے منہدم کر دیا ہے۔ شاید یہی وہ غلط فیصلہ ہے جسے وہ عشق سمجھ لیا گیا ہے' جس کے برتے پر رشتوں سے احترام پاتے معاشرت پر روایتی جبر کی پھبتی کس دی گئی ہے۔ کہانی بہر صورت عشق کی نہیں بلکہ معاشرے سے کٹے ہوئے ان کرداروں کی ہے جو نفسیاتی کجی کے ابتلا میں ہیں۔ اسی نفسیاتی کجی میں مبتلا ماں کا رویہ آپ ملاحظہ فرما چکے اب ذہن میں یہ نقشہ بھی جما لیجیے کہ ست بھرائی غفواں کو چھوڑ کر جا چکی یوں کہ کسی نے غفوراں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ ماں صحن میں چارپائی پر بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی وہ اسی طرح چپ چاپ چاول صاف کرتی رہی۔ چھوٹا بھائی لکڑیاں چیر رہا تھا وہ بدستور لکڑیاں چیرتا رہا' بڑا بھائی صحن کے ایک کونے میں چارپائی کی ادوائن ٹھیک کر رہا تھا وہ بھی اپنے کام میں لگا رہا۔ صرف بھابی نے اس پر ایک نظر ڈالی تھی مگر وہ بھی یوں کہ جیسے گھر میں گھس آنے والے پلے پر ڈالی جاتی ہے۔ اب آگے کی کہانی منشا یاد ہی کے لفظوں میں:

'' وہ سیدھی پسار میں چلی گئی تھی اور دروازے کے ساتھ لگ کر ایسی جگہ بیٹھ گئی تھی جہاں سے سب کی حرکات و سکنات نظر آ سکیں وہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہنا چاہتی تھی اسے ڈر تھا کہ لکڑیاں چیرتا ہوا بھائی کلہاڑا لے کر اس کی طرف بڑھے گا اور اسے سوکھی لکڑی کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔۔۔ اس کا دل بیٹھنے لگا اسے لگ رہا تھا۔۔۔ کہ وہ اندر آ جائیں گے اور وہ ان سے اپنی زندگی کی بھیک بھی نہیں مانگ سکے گی۔ کچھ مانگنے اور بخشوانے کے لئے الفاظ ضروری تھے اور اس کے پاس پچھتاوے کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مگر جب۔۔۔''

اس اقتباس میں غفوراں کے'' پچھتاوے کے آنسوؤں'' نے عشق کی حقیقت کھول دی ہے یوں کہ کہانی کا اصل تنازع بھی کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ اب تک کہانی کی چار عورتیں سامنے آ چکی ہیں

۱۔ دو ظالم بھائیوں کی بہن سہمی ہوئی غفوراں جسے اپنی غلطی کا اعتراف ہے' جو اپنے کیے پر نادم ہے مگر جانتی ہے کہ اس کے ظالم بھائی اسے قتل کر دیں گے۔

۲۔ ڈائن جیسی ماں سکینہ' جو بیٹی کی غلطی معاف کرنا جانتی ہی نہیں' جس کے سینے میں شاید دل ہی نہیں ہے کہ دل ہوتا تو اس میں ممتا کا روایتی جذبہ بھی ہوتا ہے۔

۳۔ نمبردار کی ریاکار بیوی ست بھرائی' جو اپنا فرض ادا کر کے اور جتا کر جا چکی ہے۔
۴۔ گاموکی بیوی رابعہ یعنی غفوراں کی بھابی' وہی جس نے اوپر والے اقتباس میں غفوراں پر یوں نظر ڈالی تھی جیسے کتیا کے پلے پر ڈالی جاتی ہے۔

تو صاحب کہانی کی ان چار عورتوں سے ست بھرائی کو یوں منہا کر لیا گیا ہے کہ اس کے بعد وہ کہانی میں پلٹ کر نہیں آئے گی۔ غفواں ماردی گئی یا غائب ہوگئی یوں کہ اس کا نام نشان تک نہ ملتا تھا تاہم وہ کہانی میں آخر تک موجود رہتی ہے۔ باقی ایک ماں رہتی ہے اور ایک بھابی۔۔۔ نہیں صاحب نہیں' میں بہک گیا ہوں۔ جب غفوراں ہی نہ رہی تو رابعہ کس کی بھابی ہوئی؟ تو یوں ہے کہ بھابی کا کردار بھی تمام ہوا۔ تو پھر رابعہ کی حیثیت باقی بچ جانے والی کہانی میں کیا رہ جاتی ہے؟ ایک سوال ہے۔۔۔ آپ کہہ سکتے ہیں ایک بیوی یا ایک بہو۔ مگر صاحب کہانی کے متن میں ایک بیوی یا بہو کے طور پر اسے فعال نہیں دکھایا گیا ہے۔ تو پھر ایک عورت؟۔۔۔ محض ایک عورت؟؟؟۔۔۔ یہ عورت والی بات بھی خوب پوچھی آپ نے۔۔۔ کہیے' وہ جو سکینہ ہے' ڈائن سکینہ۔۔۔ کیا وہ عورت نہیں تھی اور وہ جو غفوراں تھی' سہی ہوئی' جس کی خطا معاف نہ کی گئی اور وہ غائب کر دی گئی' وہ بھی تو عورت تھی۔ صرف ایک عورت ہونا یا مرد ہونا ایک تہذیبی معاشرے میں لایعنی سی بات لگتی ہے۔ اس کا وجود رشتوں ہی سے معتبر ہوتا ہے۔ سکینہ ڈائن نہ ہوتی ماں ہوتی تو اس کا دل تب ممتا کے جذبے سے بھر ہی جانا چاہیئے تھا' جب اس کے گربھ استھان سے جنم لینے اور اس کی چھاتی کا دودھ پینے والی اس کی اپنی بیٹی اس کی پائنتی پر بیٹھی زار و قطار روتی رہی تھی مگر وہ تو ضد کی پکی نکلی تھی' اس کا دل پگھل ہی نہیں رہا تھا۔

۔۔۔ اوہ صاحب' ایک لحہ کو ٹھہریئے کہ مجھے اپنی غلطی کی دست بستہ معافی طلب کرنا ہے۔ یہ جو میں اوپر چار عورتوں کی گنتی کر آیا ہوں تو یوں ہے کہ افسانے کے اقتباس میں منشایاد نے پانچ عورتوں کی جانب اشارے کیے تھے میں رابعہ کی گود والی ننھی صغریٰ کو بھول ہی گیا تھا۔ بھول چوک معاف صاحب کہ باقی کہانی تو اسی صغریٰ کی ہے جو جوان ہو کر وہی غلطی کرتی ہے جو غفوراں نے کی تھی اور اپنی جان گنواں بیٹھی تھی۔۔۔ ہاں تو یہ سچ ہے کہ اس بچی کے حوالے سے رابعہ ماں بھی ہے۔ کہانی کے آخر میں ایک نہیں دو مائیں ہو جاتی ہیں اور ایک باپ کو بھی ہم صاف صاف دیکھ سکتے ہیں۔۔۔ میرا اتاولا پن دیکھیے کہ ایک ہی سانس میں وہ بات کہہ دی جو دم لے کر' اور کہانی کے کچھ اور حصوں کی طرف آپ کی توجہ حاصل کر کے کہنی تھی۔

کہانی کے آخری حصے تک پہنچنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ایک تہذیبی معاشرے میں میل جول رویوں کو کتنا بدل دیتا ہے۔ بہت سا وقت گزر چکا ہے۔ صغریٰ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ لیے ہیں اور اس کے حسن کی دھوم آس پاس کے دیہاتوں میں خوب مچی ہوئی ہے۔ وریامو اور گاموکا ایک دوسرے سے جھگڑا ہو گیا ہے اور وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور ایک دوسرے سے بات تک کرنے کے روادار نہیں۔ گاموکو نرینہ اولاد نہ ہونے کے صدمے نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ سکینہ بوڑھی اور کمزور ہوگئی ہے اور اگرچہ وہ وریامو کے پاس رہتی ہے مگر وہ ماں سے زیادہ صغریٰ کا خیال رکھتی ہے۔ ان کے بولی کتے مر کھپ گئے ہیں ایک بیمار پڑ گیا تھا دوسرے کو کسی نے زہر دے دیا۔ کتے اب بھی حویلی کی رکھوالی کرتے ہیں مگر وہ بھونک کر چپ ہو جانے یا تھوڑی دور تک پیچھا کر کے ہانپ جانے والے عام سے کتے ہیں۔ ان لوگوں کے گاؤں والوں سے تعلقات بھی بہتر ہو رہے ہیں اور وہ شادی غمی کے موقعوں پر گاؤں میں آنے جانے لگے ہیں۔ صغریٰ اکیلی کہیں نہیں جاتی مگر ماں یا دادی کے ہمراہ کبھی کبھار گاؤں چلی جاتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے کہ ایک رات وہ اپنے بستر میں نہیں ہوتی اور اس کا باپ گامو بپھر کر کہتا ہے کہ اب وہ اس کتیا کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ رابعہ روتے روتے اپنی ساس سے لپٹ گئی' عورت' عورت کے لیے عورت کی مدد چاہتی ہے۔

''اب کیا ہوگا ماسی؟''

مگر اس کی ساس عورت کہاں ہے' عورت ہوتی تو ایک عورت پر بیتنے والے دکھ کو محسوس کرتی' بغیر توقف کے جھٹ کہتی ہے:

''وہی جو اس گھر میں ہوتا چلا آیا ہے۔''

''نہیں ماسی۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔۔۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔''

''میرے کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے میری اس گھر میں کون سنتا ہے۔''

یہ ایک ماں کا تڑپنا ہے جو اپنی ساس سے مسلسل کہہ رہی ہے کہ وہ اس کے پیچھے جائے کہ کہیں اس کا باپ اسے مار ہی نہ ڈالے۔ مگر وہ شقی

القلب بات الٹا کر کہتی ہے کہ نہیں وہ نہیں جاسکتی کہ یہ غیرت کا معاملہ ہے اور ایسے معاملے میں وہ اس کی بھی نہ سنے گا۔ آگے کی کہانی ہو بہو نقل کرتا ہوں:

''وہ اسے ساتھ لئے آ پہنچا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اس کے بال الجھے ہوئے تھے معلوم ہوتا تھا اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا ہے وہ ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔

حویلی کا صدر دروازہ بند کر کے گامو اس کے قریب آیا اور اسے لاتوں اور مکوں سے پیٹنے لگا وہ زمین پر گر گئی تو وہ دھاڑا۔

''ٹوکا کہاں ہے میں اس کے ٹکڑے کر دوں گا''

صغریٰ ماں کے پاؤں پڑ گئی۔

''مجھے بچالو ماں۔ ابا مجھے مار ڈالے گا''

''ٹوکا تمہارے پاس پڑا ہے گامو'' سکینہ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

رابعہ نے غصے اور نفرت سے اور صغریٰ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ گامو ٹوکا اٹھانے کے لیے مڑا تو رابعہ نے اسے روک دیا اور بولی۔

''ہوش کرو غصے میں تم پاگل ہو جاتے ہو''

پھر اس نے ٹوکا پکڑ کر دور اندھیرے میں پھینک دیا اور زمین پر گری ہوئی صغریٰ کو سہارا دے کر اندر لے گئی۔

سکینہ اپنے کتے کی طرح چیر پھاڑ کر رکھ دینے والے اپنے بیٹے کو بے بس ہوتے دیکھ رہی تھی اسے اس پر طیش آ رہا تھا' اس پر برستے ہوئے کہا:

''گامو یا تو تم بوڑھے اور کمزور ہو گئے ہو یا بے غیرت''

بوڑھا تو ہر ایک کو ہونا ہوتا ہے' خود سکینہ بھی بوڑھی تھی مگر اس میں زہر ویسے کا ویسا تھا۔ گامو کی بے بسی سے اور پھر نادم سا ہو کر اندر چلا جانا اس کی بے غیرتی کو بھی ظاہر نہیں کرتا۔ افسانہ نگار نے یہ بات اگلے سطروں میں بتا دی ہے اور وہ کچھ یوں ہے:

''جب وہ اپنے اپنے بستروں میں لیٹ گئے تو انہیں چبوترے کی طرف سے بلند آواز میں بین کرنے کی آواز سنائی دی۔

''کرماں مار یئے غفورو۔۔۔ اس رات تیرا باپ بھی زندہ ہوتا تو تیری فریاد سن لیتا۔''

پھر اس کے دوہتڑوں سے چھاتی پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں جیسے غفورا ابھی ابھی قتل ہوئی ہو۔''

ہاں کہہ لیجئے ایک ماں کے لیے غفورا عین اس وقت ہی قتل ہوئی' عین اس وقت جب سکینہ کے اندر ایک ماں نے کروٹ لی تھی اور اس کا دل ممتا کے جذبوں سے بھر گیا تھا۔ صاحبو یہی تو وہ بات ہے جو افسانہ نگار بتانا چاہتا ہے۔ عشق' روایتی معاشرہ' جبر' غیرت اور قتل سب کچھ پیچھے رہ جاتا ہے اور رشتے جیت جاتے ہیں۔ ایک تہذیبی معاشرے میں یہی تو وہ رشتے ہیں جو افسانہ نگار کے ہاں بہت اہم ہو جاتے ہیں' یہی انسان کی پناہ گاہ ہیں اور انسانیت کی بقا بھی۔

عورت کے مختلف روپ منشا کی کہانیوں میں آئے چلے جاتے ہیں۔ انہیں پڑھتے ہوئے اور پوری کہانی کے اندر رکھ کر انہیں محسوس کرتے ہوئے کہیں بھی بدن میں سنسنی نہیں دوڑتی' وہاں بھی جہاں وہ اپنے پورے بدن کے ساتھ آتی ہے۔ یہ ''پانی میں گھرا ہوا پانی'' کی عورت ہو یا ''بند مٹھی میں جگنو'' ''جیکو پچھے'' ''ببول سے لپٹی بیل'' ''سارنگی'' ''نظر آ لباس مجاز میں'' ''ساجھے کا کھیت'' ''الف جمع ب کا مربع'' اور ''جھڑ بیری'' والی عورتیں کہیں بھی مردوں کے اندر لذت کے ابال کو بڑھانے اور عورت کی توقیر داؤ پر لگا کر انہیں مردوں کے لیے مرغوب نہیں بناتیں۔ انتہائی خلوص سے اپنے سماجی تناظر میں عورتوں کے یہ کردار تخلیقی اور جمالیاتی سطح پر بہت کچھ سجھاتے ہیں۔

اور اب موضوع کی مناسبت سے منشا یاد کے دو افسانوں اور حسن عسکری کی ایک بات کا ذکر کہ یہ تینوں ایک ساتھ ذہن میں کلکلی کھیلنے لگے

ہیں۔ تاہم اپنی سہولت کے لیے حسن عسکری کی بات کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر رہا ہوں۔ منشایاد کے جن افسانوں کی جانب میں اب آپ کو لے چلا ہوں' ان کا ذکر یوں ضروری ہو گیا ہے کہ اوپر جن افسانوں کی بات آئی تھی ان میں وہ خاص تعلق جو خاندانی رشتوں کے مترادف ہو جاتا ہے یا پھر خود سگے رشتے' کسی نہ کسی صورت میں موجود تھے۔ کہیں کہیں ان دونوں صورتوں سے الگ ہو کر صورت احوال کی تفہیم بھی ملتی ہے مگر ان دو افسانوں میں انتہائی مضبوط اور انتہائی کمزور رشتے کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی بے وفائی' تھوڑی سی بے ایمانی' تھوڑا سا بہکاوا اور بے پناہ پچھتاوا اور خوف در آیا ہے۔ پھر یوں بھی ہے کہ اپنی تکنیک اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے بھی یہ دونوں افسانے منشایاد کی اہم ترین تخلیقات میں سے گردانے جاتے ہیں۔ دونوں میں محبت کے انتہائی نازک معاملات کمال فنی مہارت سے نبھائے گئے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ یہ محض عورت کی کہانیاں نہیں ہیں مگر انہیں پڑھتے ہوئے دونوں افسانوں کے نسوانی کرداروں کے دلوں کو دھڑکتا ہوا صاف محسوس کیا جا سکتا ہے' یوں کہ آخر تک پہنچتے ہوئے پڑھنے والے کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے' اور وہ بھی اتنے زور سے کہ دوسرے ہی لمحے دھڑکنیں اچھل کر سینے سے باہر جا پڑنے کا گمان ہوتا ہے۔ اوہ صاحب' میں افسانوں کی نشان دہی کیے بغیر بے تکان بولے چلا جاتا ہوں۔ یہ نسیان نہیں ہے صاحب' سب عجلت کی کارستانی ہے' ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالنے کی للک۔ لیجئے' دونوں کے نام ایک ساتھ لکھ رہا ہوں'' تیرھواں کھمبا'' اور'' سزا اور بڑھا دی''۔ ان دونوں کہانیوں کو صرف عورتوں کی کہانیاں نہیں کہا جا سکتا ہے مگر انہیں بار بار پڑھتے ہوئے میں نے خود کو ہر بار کہانی کی عورتوں کے قریب پایا ہے۔ ان کہانیوں کا ذکر بطور خاص اس لیے بھی لے آیا ہوں کہ ان میں بظاہر محبت کی روایتی مثلث بنتی ہے مگر ان کی بنت ہرگز روایتی نہیں ہے۔ دونوں میں ایک ایک عورت اور ایک ایک شوہر ہے اور تیسرا وہ شخص ہے جو کوئی رشتہ نہ رکھتے ہوئے بھی نسوانی کرداروں کے دلوں میں بھونچال برپا کر سکتا تھا اور یہ بھونچال اٹھا گیا ہے۔ '' تیرھواں کھمبا'' ریل کار میں سوار نو بیاہتا جوڑے کی کہانی ہے۔ اور یہ کہانی گارڈ کے وسل دیتے ہی چستی اور سرعت سے آگے بڑھتی ہے' غیر ضروری تفصیلات اور فالتو پن کو لائق اعتنا نہ جانتے ہوئے۔ بالکل اسی طرح جیسے راہ میں آتے ہوئے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن زن کر کے پیچھے رہ رہے تھے۔ یہ کہانی صرف اس نو بیاہتا جوڑے کی نہیں ہے اس میں ایک تیسرا کردار بھی موجود ہے' بلکہ مجھے یوں کہنا چاہیئے کہ وہ تو پہلے سے موجود تھا' گاڑی میں۔۔۔ اور انجی کی زندگی میں۔۔۔ مگر ریل کار میں اسے اپنے شوہر کے ساتھ اپنے سامنے والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دیکھ کر اسے یوں لگا تھا جیسے وہ ریل کار کی سیٹ پر نہیں' ریل کی پٹڑی پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ عین اسی لمحے مشرقی تہذیب کا حسن کہانی پر پھوار کی صورت برس پڑتا ہے۔ محبت جو دلوں کے اندر خوشبو کی طرح بسی ہوئی تھی سطر سطر سے آشکار ہونے لگتی ہے مگر انجی تو شوہر کے ساتھ ہے۔ ایک نئی زندگی کا آغاز کر چکی ہے۔ اب جو ماضی تھا وہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ محبت جو اسے ہو گئی تھی اسے اس نے ایک ایسی محبت سے پچھاڑنا تھا جو اب وہ سیکھ رہی تھی اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں انتہائی پرخلوص تھی۔ سامنے مرد تھا' پہلی محبت مگر غیر اور اجنبی ہو جانے والا مرد' اپنی ران چیر کر کباب پیش کرنے والا مرد:

'' چناب آ گیا انجی'' اس کے شوہر نے کہا۔ '' اور چائے بھی' چکن سلائس اور شامی کباب۔''

'' اونہہ یہ کیسی باس ہے' میں نہیں کھاتی۔''

'' بھئی مچھلی کے کباب ہیں' آج گوشت کا ناغہ ہے نا۔''

'' بڑی خراب سی بو ہے' شاید باسی مچھلی کے ہیں''

اس کی ران میں درد ہونے لگا۔ اس کا جی چاہا چیری ہوئی ران سے ساری پٹیاں اتار کر اسے دکھائے اور کہے:

'' طوفان کی وجہ سے مجھے آج کوئی مچھلی نہ ملی اور میں نے اپنی ران چیر کر تمہارے لیے کباب تلے' مگر تمہیں بو آتی ہے' تم اسے باسی کہتی ہو۔''

یہ اپنی ران چیرنے کی بات انجی کے شوہر نے نہیں کہی تھی یہ تو اس کے دل میں گونجی تھی جس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ یا پھر شاید اس مہینوال نے کہی تھی جس نے کچے گھڑے پر چناب کے پانیوں پر نکل جانے والی سوہنی کے لیے اپنی ران کی مچھلیاں چیر ڈالی تھیں۔ مگر وہاں کوئی سوہنی تھی نہ مہینوال' چناب کی لہریں تھیں نہ کچا گھڑا' بظاہر کسی نے ران چیری تھی اور نہ ہی کسی کا کلیجا حلقوم تک اچھلا تھا مگر اندر ہی اندر کے سوہنی مہینوال کہانی کے مناظر پر اپنے بھید کھول رہے تھے۔

جب انجی کا شوہر کسی اسٹیشن پر کچھ لینے اترا تو یہ وہ مرحلہ تھا جس پر وہ دونوں بہک کر ماضی میں کود سکتے تھے' ایک دوسرے سے گلے شکوے کر سکتے تھے اور اس کا احتمال تو بہت زیادہ تھا کہ خود افسانہ نگار بہک جاتا اور سوچ سوچ کر رقت آمیز مکالمے لکھتا اور اپنے قاری کو رقیق القلب بنا ڈالتا یوں ممکن ہے نرم دل والوں کے قوائے حیوانی پر خوب خوب چوٹ پڑتی اور ان رونی صورتوں سے اسے خوب داد بھی ملتی۔ اگر ایسا ہوتا تو یقین جانئے یہ سستی قسم کی داد تو اس کے حصے میں آ جاتی مگر یہ جواب تک کہانی کا چست بہاؤ بنا ہے' اس کا ناس مارا جاتا۔ منشایاد کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا اور لطف یہ ہے کہ اس نے ایسا کیا بھی نہیں۔ ایک طرف تو اس نے اپنے موضوع اور کہانی کے فطری بہاؤ میں رخنے ڈالنے سے اجتناب برتا اور دوسری طرف اس نے مشرقی تہذیب کے اس وصف خاص کو بھی اجاگر کر دیا جس میں شادی کے بعد اپنے مرد سے وفاداری سب سے مقدم ٹھہرتی ہے:

''اس کا شوہر آیا تو وہ الجھ پڑی۔ ''اتنی دیر لگا دی آپ نے؟''

''او ہ انجی۔۔۔ تم تو بچوں کی طرح پریشان ہو جاتی ہو؟''

وہ بچوں کی طرح پریشان نہیں تھی وہ تو اپنے آپ سے اس سارے عرصے میں جنگ کرتی رہی تھی۔ شوہر کو دیکھتے ہی اس کے اندر تانت بھرنے والے تناؤ کو پرے پھینک دینے کا لمحہ آیا تو اس نے ایک معصوم بچی کی طرح مچل کر بدن ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ مگر جس دھیان کو اس نے باہر دھکیلا تھا اور دھم سے پھر اس کے اندر کود گیا تھا۔ افسانہ اپنی آخری سطروں میں عورت کا دل چیر کر دکھا دیتا ہے:

''ریل کار پوری تیزی سے اندھیرے کے عفریت کو کچلتی اور سیٹیاں بجاتی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ڈبے میں شور اب بہت کم تھا۔ ہر شخص ہر بات سے اکتا کر اونگھ رہا تھا یا پھر تھکے تھکے لہجے میں ہمراہیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اچانک ریل کار ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی' لوگ ایک دوسرے پر گر پڑے۔

''کیا ہوا؟''

''سگنل نہیں ملا ہوگا؟''

''کوئی نیچے تو نہیں آ گیا؟؟؟''

کسی کے نیچے آنے کی بات سن کر وہ لرز گئی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا اور منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

''ہائے میں مر گئی۔۔۔ اس نے خودکشی کر لی۔''

''کس نے خودکشی کر لی' اور تمہیں کیا ہوا ہے انجی''

وہ تھر تھر کانپ رہی تھی' دروازے کی طرف اشارہ کر کے اور سسک کر رہ گئی۔ اس کے شوہر نے پلٹ کر دیکھا وہ دروازے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور ہوا کے جھونکوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔''

منشایاد نے مرد اور عورت کی نفسیات کو جس خوبی سے آخری سطروں میں برتا ہے وہ اپنی جگہ اہم ہو جاتا ہے۔ ''سزا اور بڑھا دی جائے'' میں یہ دوسرا امر یوں اشارہ کر کے دکھایا نہیں جا سکتا۔ وہ کہانی میں اس تواتر سے آیا ہی نہیں ہے تاہم واقعہ یہ ہے اس کہانی کا دوسرا مرد بہت سی حدیں پھلانگ چکا ہے۔ ''تیرہواں کھمبا'' میں جوڑا نو بیاہتا تھا جب کہ اس کہانی میں میاں بیوی ایک عمر گزار چکے ہیں۔ بچے جوان ہو چکے بہوئیں آ چکیں' بیوی نڈھال اور شوہر موت کے بستر پر پہنچ چکا ہوتا ہے۔

''ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا اور صاف کہہ دیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ اسے ہسپتال میں رکھیں یا گھر لے جائیں''

ہسپتال کی ایمبولینس اسے گھر چھوڑ گئی تھی اور ساتھ ہی اس کے بدن پر وہ تکان بھی چھوڑ گئی تھی جس سے علی احمد کی حالت بہت بگڑ گئی۔ اس کی سانسیں اکھڑ گئیں اور [illegible] بانے کلام پاک کی تلاوت ہونے لگی۔ تب کسی لمحے میں اس کی حالت کچھ سنبھل گئی تو روتے بلکتے بیٹے بیٹیاں اور تلاوت کرنے والے آنسو پونچھنے لگے تو اس کی بیوی صحت [illegible] غرت [illegible] تھی اور اس کا جی چاہنے لگا تھا کہ چلا کر کہے:

''اب مر بھی چکو علی احمد۔

ایک مشرقی بیوی ایسا کہہ نہیں سکتی تھی' لہٰذا اس نے ایسا کہا نہیں تھا۔ وہ کئی روز سے ہسپتال کے چکر لگاتے لگاتے' مہمانوں کے لیے ڈھیر سارا کھانا پکاتے پکاتے اور علی احمد کے لیے یخنیاں اور ساگودانہ بناتے بناتے تھک گئی تھی لیکن ایسا لگتا تھا وہ مرے گا نہیں۔ کئی بار اس کی حالت غیر ہوئی مگر ہر بار سنبھل گیا۔ دنیاداری کے تقاضے تھے' اور بچوں سے بھی بہت کچھ چھپانا تھا' لہٰذا اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ہسپتال میں رکنا پڑتا تھا۔ دیکھئے صاحب افسانہ نگار کس طرح صباحت کے دل کے اندر اتر گیا ہے اور وہاں ابلی پڑتی شدید نفرت کو کتنی سفاکی سے بیان کر دیا ہے۔ مشرق کی عورت کبھی یوں اپنے مرد کے مرنے کی خواہش نہیں کرتی مگر کچھ تھا کہ وہ اس بے پناہ نفرت میں ڈھل گیا تھا۔ وہ کیا تھا بہت جلد کہانی میں اس کو بتانے کا موقع نکل آتا ہے اور یہ موقع تب نکلتا ہے جب علی احمد پر غنودگی کے دورے پڑتے ہیں۔ وہ بے جان سا پڑا رہتا ہے اور سب اس کی تیمارداری کرتے کرتے نڈھال ہو جاتے ہیں' حتیٰ کہ صباحت بھی حوصلہ چھوڑ بیٹھتی ہے اور سیدھا علی احمد کے سرہانے جا پہنچتی ہے۔ سارے کمرے میں علی احمد کی اکھڑی اکھڑی سانسیں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ رشتہ دار اور عزیز جو اس وقت کمرے میں موجود تھے باہر نکل جاتے ہیں اور صباحت پھٹ پڑتی ہے:

''تم آسانی سے نہیں مرو گے علی احمد۔ بڑی ڈھیٹ چیز ہو۔ کیا ہم سب کو مار کر مرنے کا ارادہ ہے۔''

علی احمد گلا کٹے بیل کی طرح بجھی بجھی آنکھوں سے اسے دیکھتا ہے اس میں اس بدلی ہوئی عورت کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا لہٰذا آنکھیں بند کر لیتا ہے' یوں کہ آنکھوں کے کنارے آنسوؤں سے بھیگ جاتے ہیں مگر عورت کے اندر سے ابلتی نفرت اسی طرح ابلتی رہتی ہے:

''میرے لیے تو تم پندرہ برس پہلے مر چکے تھے علی احمد۔ میری ایک چھوٹی سی بھول کی تم نے مجھے اتنی کڑی سزا دی۔ اس سے اچھا تھا تم مجھے طلاق دے دیتے لیکن تم مجھے اذیت دینا چاہتے تھے۔''

آگے چل کر افسانہ نگار نے صباحت سے اس کی اس چھوٹی سی بھول کا اعتراف کرایا جو پندرہ سال سے انہیں ایک دوسرے سے کاٹے ہوئے تھا۔ صباحت ہی کے لفظوں میں:

''ٹھیک ہے یہ میری غلطی تھی۔ میں نادان تھی۔ اس حرام زادے کی چکنی چپڑی باتوں کے سحر میں آ گئی لیکن اس کے ذمہ دار بھی تم خود تھے۔ تم نے اسے گھر میں کیوں رکھا۔ کیوں اس پر اعتبار کیا۔ کیوں مجھے آزمائش میں ڈالا۔ تم نے خود ہمیں ڈھیل دی۔ وہ میرے لیے نت نئے تحائف لاتا اور مجھے لمبی ڈرائیو پر لے جاتا مگر تمہاری پیشانی پر کبھی بل نہ آیا۔ مجھے تو لگتا ہے تم نے جان بوجھ کر ایسا کیا کہ مجھ سے کوئی خطا سرزد ہو جائے اور تم مجھے ایکسپلائٹ کر سکو اور میں باقی ماندہ زندگی تمہاری اطاعت اور قید میں گزار دوں لیکن میں نے اگر یہ طویل عذاب جھیلا تو محض بچوں کی خاطر۔ ورنہ مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہو گئی تھی۔''

کہانی نے اس حصے میں مرد و زن کے آزادانہ اور بے باکانہ اختلاط پر شدید گرفت کی ہے اور ان حدوں اور فاصلوں کو برقرار رکھنے پر اصرار کیا ہے جو مشرقی تہذیب کا حسن ہیں۔ عورت کا اپنے آپ پر اعتماد اپنی جگہ اور اس کی نشوونما بہت اہم سہی' مگر جنس کی لپک کی بھی اپنی ایک حقیقت ہے۔ جس نے مغرب کی پر اعتماد عورت کا اپنا گھر بکھیر کر رکھ دیا اور اسے ننگا کر کے رسوا بھی کیا ہے۔ کہانی کا کہنا ہے کہ خاندان کے انسٹی ٹیوشن کی بقا اور استحکام ہی مشرقی عورت کو دلدل میں دھکیلنے سے بچا سکتا ہے۔

صاحب' ایک بار پھر محبت اور قربانیوں کے پانی سے گندھی عورت کی اس نفرت کی طرف جس نے اس کے وجود کو جہنم بنا رکھا ہے۔ ایک عورت ایسی صورت حال میں نہیں رہ سکتی' صباحت بھی نہیں رہنا چاہتی تھی مگر خود پر جبر کر کے نبھا رہی تھی۔ اس نے اپنے نہ مر چکنے والے مرد کو بتایا کہ اگر وہ چاہتی تو اسے زہر بھی دے سکتی تھی مگر اس نے ایسا بچوں کی وجہ سے نہیں کیا تھا اور اسے زہر نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگر اس کا مرد اسے بری عورت قرار دے کر تعلق توڑ سکتا تھا تو ایک عورت ہو کر اس میں بھی حوصلہ تھا کہ وہ اپنے مرد کے بغیر رہ سکے۔ سو وہ رہی اور یوں رہی جیسے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر رہی ہو۔

آہ ایک مشرقی عورت؟ ۔۔۔ مگر مجھے کہنے دیجئے واہ مشرقی عورت۔ مشرقی عورت کے ساتھ ''آہ'' کی آواز مجھے عورت کی آزادی کا ڈھنڈورا پیٹتی وومن ایکٹی وسٹ خواتین کے بری طرح کھلے حلقوم کو چیر کر نکلتی صاف دکھتی ہے۔ جس میں سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے جب کہ ''واہ'' اس مشرقی

عورت کے لیے میرے دل سے نکلی ہے جو عمر قید جتنے اذیت والے دکھ میں بھی اپنا گھر بچانا چاہتی ہے۔ ایک مرد کا ستم سہہ کر سارے مردوں پر نہیں چڑھ دوڑتی ان کے بیچ تمیز کرتی ہے۔ اس کے بیٹے بھی تو اب تک مرد بن چکے ہیں جن سے اسے محبت ہے۔ یہ وہ محبت ہے جو اپنے خالص پن کے ساتھ جس طرح ہمارے سماج میں ملتی ہے اور کہیں نہیں ملتی۔ لہٰذا مغرب سے عورت کی مادر پدر آزادی کا ایجنڈا لینے والی اور ''بری عورت' بری عورت'' کی پکار سے چونکانے والیاں کیا جانیں کہ اپنی اولاد کے لیے بڑے بڑے دکھ سہہ لینے کے کیا معنی بنتے ہیں۔

ہاں' تو میں بتا رہا تھا کہ منشا کی کہانی کا ظالم مرد مر نہیں رہا تھا جب کہ اس کی عورت تہیہ کیئے بیٹھی تھی کہ اسے مر جانے میں مدد دے گی لہٰذا وہ اپنی نفرت کے زہر کا ایک ایک قطرہ اس کے بدن میں اتار رہی تھی اور ہچکیاں لیتے اپنے مرد کو بتا رہی تھی کہ اسے اس سے کبھی محبت نہیں رہی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس سے کبھی شادی بھی نہ کرتی۔ منشایاد نے اس مرحلے پر اپنے سماج کی اس قبیح روایت پر شدید چوٹ لگائی ہے جس میں عورت سے اس کی مرضی پوچھی ہی نہیں جاتی اور اسے ایک ایسے مرد سے نبھاہ پر مجبور کیا جاتا ہے جس سے وہ محبت نہیں کر سکتی۔ تاہم ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جھا دیا ہے کہ جوانی کے جوش میں ہم جسے محبت سمجھ رہے ہوتے ہیں' وہ فقط جنس کا زور ہوتا ہے اور ایسا منشا نے اس کردار کے ذریعے بتایا ہے جس کے ساتھ صباحت پھسل گئی تھی۔

صباحت نے پندرہ برس خود پر جبر کیا مگر اس کے مرد پر نزع کا عالم طاری ہوا تو صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور جب وہ ساری نفرت کا زہر اس کے جسم میں اتار چکی تو وہ کر مر گیا۔ مگر کہانی اس کے مرنے پر کہاں تمام ہوتی ہے۔ منشایاد کے ہاں یہ وصف بطور خاص دیکھا جا سکتا ہے کہ کہانی کی ٹیل میں ایک ٹوسٹ ضرور ہوتا ہے' ایک ایسا موڑ جو کہانی پر ایک نیا منظر نامہ کھول دیتا ہے۔ اس کہانی میں یہ موڑ تب آیا جب صباحت نے اس پورٹ ایبل کیسٹ پلیئر کی طرف دھیان دیا تھا جو اس کا بیٹا یہ کہتے ہوئے دے گیا تھا: ''ابو کی آواز''۔ مرنے کے بعد بھی اس کے مرد کی آواز اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ اس نے بوکھلا کر بیٹے کی بات کو دہرایا تھا۔ تو بیٹے نے بتایا تھا کہ اس میں اس کے لیے ایک میسیج تھا' ریکارڈ کیا ہوا اور اس کا خیال تھا کہ جب ابو ہسپتال میں تھے' آخری بار' تب انہوں نے کیسٹ پلیئر منگوایا تھا' شاید تب ہی پیغام ریکارڈ کیا گیا ہو۔ صباحت کا دل دھک سے رہ گیا' پتہ نہیں اس نے کیا کہا تھا' کہیں بچوں نے سن نہ لیا ہو۔ مگر مہذب بچے نے بتایا کہ جونہی اس نے ابو کی آواز میں ماں کے نام پیغام سنا وہ کیسٹ پلیئر بند کر کے ماں کو دینے آ گیا۔ اور کہانی اسی ریکارڈ کیئے گئے میسیج کے ذریعے نیا بھید کھولتی ہے۔ صباحت نے کیسٹ پلیئر آن کیا تو اس کا مرد جس سے وہ شدید نفرت کرتی آئی تھی اظہار تشکر کے الفاظ کہہ رہا تھا۔ جس طرح اس نے اس کی تیمارداری کی تھی' اس کے احسان کے نیچے وہ دبا جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

''مجھے اندازہ نہیں تھا تمہیں مجھ سے اتنی محبت ہے۔ افسوس ہمارے درمیان غلط فہمیاں اور جھجک سی پیدا ہو گئی۔ کاش میں اسے دور کر سکا ہوتا۔ لیکن صباحت میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی۔ تم جب بھی آتی ہو کچھ کہنا چاہتی ہو میرا رؤاں رؤاں ہمہ تن گوش رہتا ہے لیکن تم ہر بار نہیں کہہ پاتی ہو۔ تمہارے منہ سے محبت کے دو بول سننے کے لیے میری جان اٹکی ہوئی ہے' ورنہ میں کب کا مر چکا ہوتا۔''

جسے عورت کی محبت کے بول سن کر مرنا تھا وہ اس کی ابلتی نفرت میں ڈوب کر مر گیا۔ جس نے اتنی شدید نفرت کی تھی وہ اس پر کھل کر رو بھی نہ سکی تھی مگر بعد از مرگ جوں ہی اس کا میسیج تمام ہوتا ہے عورت تکیئے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے جیسے اس کا مرد پہلے نہیں اب مرا تھا۔ یوں ہم پندرہ برس نفرت کرنے والی عورت کے دل سے محبت کو امنڈتا دیکھ سکتے ہیں اور اس کی شدت کو بھی محسوس کر سکتے ہیں۔

اور آخر میں مجھے عسکری کی بات کی طرف آنا ہے مگر پہلے یہ تو یاد دلا دوں کہ منٹو کو عورت کی نفسیات سمجھانے کے لیے ایک خاص قسم کی عورت کی جانب رجوع کرنا پڑا تھا یہ احمد علی کے گھر میں پڑی ہوئی عورت نہیں ہو سکتی تھی۔ ''امتل جان'' ''بالا خانہ'' اور ''رام پیاری'' والے رحمان مذنب کو بھی خوشبودار عورت سے رغبت رہی۔ آغا بابر کے ہاں زیادہ تر عورت جنس کی لذت دینے آتی ہے اور حسن عسکری۔۔۔ رکیئے صاحب خود عسکری ہی کی زبان سے سن لیتے ہیں:

''مجھے خود پتا نہیں کہ کہ یہ خالص ہندوستانی عنصر ہے کیا چیز' لیکن میں اس کا وجود تسلیم کرتا ہوں اور اس کا احترام کرتا ہوں۔ میرے افسانوں میں یہ احترام اس شکل میں ظاہر ہوا ہے کہ میرے کرداروں کے نام عیسائی ہیں۔'' (اختتامیہ: جزیرے)

اس کا یہ قطعاً مطلب نہیں ہے کہ ہندیا مسلم کریکٹرز کو قابل اعتنا نہ جان کر عسکری ہندوستانی عورت کے شعور کو سمجھنے میں ناکام ہوا' نہ ہی اس سے یہ معنی برآمد ہوتے ہیں کہ اس باب میں منٹو اور دوسروں کو ناکامی ہوئی بلکہ مجھے محض یہ بتانا ہے کہ منشایاد کے ہاتھ وہ تکنیک اور سینے میں وہ حوصلہ آ گیا ہے کہ وہ عام گھر کی رشتوں سے عبارت عورت کو سبک دستی سے لکھ کر تہذیبی شعور کی پرتیں کھولتا چلا جائے اور کہیں بھی اسے جھجک محسوس نہ ہو۔ اسی بے باک سلیقے نے مجھے منشایاد کی عورت کی طرف راغب کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ منشا بھی بیدی کی طرح جنس کی تقدیس کا قائل ہے۔ عورت کو جنسی اور سفلی جذبات کی تطہیر کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ اسے معاشرے کی انتہائی ضروری اور اہم اکائی گردانتا ہے۔ منشایاد نے عورت کو صرف خوش بودار اور لذیذ ہی نہیں بنایا' اسے بیدی کی طرح باوقار بھی بنا دیا ہے۔ یوں اپنی تہذیب کو عورت کے کرداروں سے سمجھنے کے لیے خاص قسم کی عورتوں کے علاقوں میں جانے کی ضرورت ہے نہ کوٹھے چڑھنے کی کہ منشایاد نے اس کا اہتمام آس پاس کی لپٹی لپٹائی' اپنی تہذیب میں رچی بسی اور اپنی معاشرت سے جڑی ہوئی عورت کو لکھ کر کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ منشایاد کے یہ نسوانی کردار بہت سے مقامات پر انتہائی سفاک اور بے رحم ہو جاتے ہیں اور بظاہر صحت مند نظر آنے والے معاشرتی وجود کے اندر کی رسولیوں کو پھوڑ کر متعفن مواد کو بہہ جانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

خیالات ــــ نظیر صدیقی

☆ صحیح راستے پر چلنے کے لیے توفیقِ ایزدی ضروری ہے۔ غلط راستے پر چلنے کے لیے انسانی کمزوریاں کافی ہیں۔

☆ مشاہیر وہ لوگ ہیں جو زندہ رہنے کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ زندۂ جاوید ہونے کو اپنا نصب العین جانتے

☆ ایک بڑا فن کار آئندہ فن کاروں کے بڑے ہونے کی دشواری کو بڑھا دیتا ہے۔

☆ مَیں پیدائشی ناکام ہوں۔ اس لیے ناکامیاب رہنے میں ہمیشہ کامیاب رہتا ہوں۔

☆ حیات اور شریکِ حیات دونوں بڑی مشکل چیزیں ہیں۔

☆ مَیں ہم رنگی کا نہیں' ہم آہنگی کا قائل ہوں۔

☆ اگر اپنے گھر کی عورتیں پردہ کریں تو یہ شرافت ہے' اگر دوسرے گھروں کی عورتیں پردہ کریں تو یہ قدامت ہے۔

☆ کچھ لوگوں کی پوری زندگی موسم گرما یا موسم سرما کی تعطیل لگتی ہے۔

☆ سادگی زندگی کو آسان بناتی ہے' زندگی سادگی کو دشوار بناتی ہے۔

☆ دِلوں کو چھونے والی شاعری انسانی دُکھوں سے کشید کی جاتی ہے۔

☆ موت کا ناگزیر ہونا' اس کے نہایت الم ناک اور دردناک ہونے میں کوئی کمی نہیں کرتا۔

☆ رجائیت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی خلاف توقع باتوں کی توقع رکھے اور قنوطیت کا مطالبہ یہ ہے کہ ممکن کو بھی محال سمجھا جائے۔

☆ نئی نسل کے لیے ہیرو بننا ممکن نہیں رہا' ہر شخص یا تو شہید ہے یا باغی۔

مرثیہ کے موضوعاتی چہرہ نگار، شاعر اہلِ بیت صبا اکبر آبادی

تسلیم الٰہی زلفی

مرثیے کو مسدس کی شکل دینے کا سہرا میر وسودا کے سر جاتا ہے۔ اس طرح مسدس کا نام طویل رزمیہ نگاری کے لیے مناسب ٹھہرا اور مرثیے کا حجم بڑھا' اور جب یہ ہوا تو اس کے ترکیبی لوازمات بھی بڑھے لیکن اُس وقت تک مرثیے کے اجزاء محض واقعات' روایات' رخصت' جنگ اور بین تک محدود تھے یہی وجہ ہے کہ ''چہرہ'' محض دو ایک مرثیوں ہی میں ملتا ہے لیکن جب میر ضمیر نے مرثیے کا نیا خاکہ تیار کیا تو چہرے کو سب سے پہلے جگہ ملی' پھر سراپا آیا' اس کے بعد گھوڑے اور ہتھیاروں کی تعریف' جنگ کا رزمیہ اور بین۔

اردو نے عربی سے مرثیہ قبول ضرور کیا ہے' لیکن اردو میں مرثیہ سیّدنا حسینؓ اور شہدائے کربلا سے مخصوص کر دیا گیا ہے' اور اس میں مرثیہ گو شعراء کوشش کرتے ہیں کہ سیّدنا حسینؓ کے اعلیٰ کردار کے حوالے سے اپنی سیاسی' تہذیبی اور معاشرتی اقدار کو بلند کریں' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اردو میں جو مرثیہ ہے وہ دنیا بھر کے حزنیہ یا رسائی نظموں سے بالکل مختلف ہے' یہ صنف اگر کسی سے تھوڑی بہت ملتی ہے تو وہ رزمیہ ہے' لیکن رزمیہ سے یوں مختلف ہے کہ رزمیے میں کردار خیالی ہوتے ہیں' جبکہ مرثیے کے کردار اصلی ہیں اور ان کی عقیدے کے اعتبار سے بڑی اہمیت ہے۔۔۔ البتہ واقعات نگاری میں بیشتر مرثیہ گو شعراء نے بڑی حد تک غلو سے کام لیا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مرثیے کا بنیادی موضوع واقعاتِ کربلا' مصائب حسینؓ وانصارِ حسینؓ ہی ہے' البتہ اگر مرثیہ کہنے والا شاعر مشاق' اور فکر رسا کا مالک ہو تو وہ اپنی جولانی طبع سے مرثیے میں بھی سلام' قصیدے اور غزل کا حسن پیدا کر دیتا ہے۔ صبا اکبر آبادی کی فکرِ رسا' قادر الکلامی اور کہنہ مشقی نے مرثیے کو ایک نئی معنویت' جہت اور اشاریت دے دی ہے' ان کے مرثیے پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تشبیہات اور تراکیب آلِ محمد ﷺ کی تعریف کے لیے ہی بنی ہیں۔ صبا صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ تشبیہات اور الفاظ کے استعمال میں حفظِ مراتب کا بے حد خیال رکھتے ہیں' وہ جہاں جس کے لیے جو لفظ استعمال فرماتے ہیں' وہ اس شخص کے لیے خاص معنویت رکھتا ہے' اور اس ماحول وفضاء میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے۔ اس ضمن میں صبا صاحب نے سانحۂ کربلا کی کچھ نہایت ہی کڑی اور تکلیف دہ ساعتوں کی کیفیت اور شدت کو بیان کرنے کے لیے اس کے نفسیاتی پہلو تلاش کیے ہیں' جو نہ صرف اس کے تاثر اور دردانگیزی میں اضافہ کرتے ہیں' بلکہ اس طرح وہ واقعے کی تفصیل بیان کیے بغیر ہی محض اشاروں اور استعاروں کی مدد سے' اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتے ہیں۔

جیسا کہ سطورِ بالا میں ہم عرض کرر ہے تھے کہ میر ضمیر نے جب مرثیے کے اجزا ترتیب دیئے تو تشبیب کو سب سے پہلے جگہ ملی اور شعراء نے مناظر فطرت کے بیان کو مرثیے کا ابتدائیہ ٹھہرایا۔ لہٰذا تمام ہی مرثیوں میں بطور تمہید مناظرِ فطرت کو نہایت خوبصورتی اور شوکتِ الفاظ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے لیکن حضرت صبا اکبر آبادی وہ یکتا شاعر اہلِ بیت ہیں' جنہوں نے اس ضمن میں روایت شکنی کرتے ہوئے مرثیے کے ''چہرے'' کو مناظرِ فطرت کے بیان کے حصار سے نکال کر اسے موضوعاتی تمہید بنا دیا' یعنی جس موضوع پر مرثیہ لکھا گیا ہے' اس کے چہرے میں اسی موضوع کی تمہید باندھی ہے۔ مثلاً یہاں صبا صاحب کے چند مراثی کے موضوعات دیکھیے: تخلیقِ کائنات' شباب' انقلاب' زورِ یداللّٰہی' کشمکش' ہجرت' لفظ' خاک' قلبِ مطمئن' منبر' زندگی' بصارت وبصیرت' کشمکش اور ہوا وغیرہ' یہ وہ موضوعات ہیں جو کیفیات کی مدھم لہروں پر بہے جا رہے ہیں' جو چیزیں ہمیں اپنی گرفت میں لیتی ہیں وہ اخلاقیات کے سیاق وسباق سے قطع نظر بھی انسانی زندگی کے ہر پہلو کو اُجاگر کرتی ہیں' جس میں رنج ومسرت' کشمکش واضطراب' جوش وولولہ' غم وغصہ' عشق ومحبت' وفا وجاں نثاری' بے بسی اور مظلومی کی ایسی ایسی کیفیات کا آئینہ بن کر سامنے آتی ہیں جو شاید کسی ایک شاعر کے کلام میں مشکل سے نظر آئیں گے۔

صباصاحب کے کلام سے خواہ ہم ایک منظر کا انتخاب کریں یا کسی ایک کردار کا' دونوں صورتوں میں ہمیں نفسیاتِ انسانی کے وہ مدو جزر نظر آئیں گے جوان کی محض قادرالکلامی کی ضمانت نہیں بلکہ ان کی گہری وجدانی آگہی کے آئینہ دار بھی ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ جدید اردو مرثیے کے فکری رویے میں تبدیلی اور فن برائے فن کے تصور کو توڑنے میں نمایاں اور اہم کارکردگی کا مظاہرہ چار شعراء کرام نے کیا ہے' جنہیں اہلِ نقد ونظر جدید اردو مرثیے کے چار ستون بھی گردانتے ہیں' اور وہ ہیں حضرتِ نجم آفندی' حضرتِ جوش ملیح آبادی' حضرتِ آلِ رضاء اور حضرتِ صبا اکبرآبادی۔

صباصاحب کے مراثی کے چہرے ایک دلِ گداز کی بے ساختہ آواز ہیں جس کے لیے کائنات کے مظاہر کا بھرپور احساس خود ایک عبادت ہے' جس کا دل تخلیقِ کائنات پر غور کر کے از خود یادِ خدا میں محو ہو جاتا ہے۔ جو مظاہر فطرت کو زیبِ تن کے لیے لفظوں کے ملبوس عطا کرتا ہے اور انھیں بنا سنوار کر رونمائی کی دعوت دیتا ہے۔ آیئے اب ذرا صبا صاحب کے کچھ چہرہ ہائے مراثی کا جائزہ لیتے ہیں۔۔۔ اور اس ضمن میں سب سے پہلے ہم ان کے مرثیے ''زندگی'' کا چہرہ پڑھیں گے۔۔۔

اک بے بہا عطیۂ یزداں ہے زندگی — بندوں پہ کردگار کا احساں ہے زندگی
کیا دیکھئے کہ خواب پریشاں ہے زندگی — حالانکہ ایک صبحِ درخشاں ہے زندگی
جو صبحِ زندگی ہے وہی شامِ زندگی
مرضی کارساز کا ہے نام زندگی

مٹی میں زندگی ہے' ہواؤں میں زندگی — شعلوں میں زندگی ہے' گھٹاؤں میں زندگی
کانٹوں میں اور گلوں کی اداؤں میں زندگی — صحراء میں اور چمن کی فضاؤں میں زندگی
معمورِ زیست سلسلۂ شش جہات ہے
یوں کہئے سانس لیتی ہوئی کائنات ہے

جس سمت دیکھئے ہے اُدھر زندگی کا نور — شاخ و شجر' شگوفہ و گل' ماہی و طیور
سنگ و شرار و برف و غبار و قریب و دُور — ہر شے میں زندگی کی تجلی کا ہے ظہور
اس کی حدوں کو چھو نہیں سکتا ہے دھیان تک
ہاں زندگی زمین سے ہے آسمان تک

ہر ایک آشکار و نہاں میں ہے زندگی — بالائے کوہ و ریگِ رواں میں ہے زندگی
ایک اِک جگہ بساطِ جہاں میں ہے زندگی — آتش فشانِ شعلہ دہاں میں ہے زندگی
احساس پتھروں کے جو کروٹ بدلتے ہیں
ہوتا نہیں ہے ضبط تو لاوا اُگلتے ہیں

جس طرح اردو غزل کو میر و غالب نے ایک ایسا پیٹرن اور مواد دے دیا ہے جس کے حصار سے تا حال کوئی غزل گو شاعر نہیں نکل سکا ہے۔ اسی طرح انیس نے مسدس کے پیٹرن میں مرثیے کو وہ مواد دے دیا ہے' جس کے قاموسی صفحات کو اُلٹے پلٹے بغیر کسی مرثیے کی تکمیل ہی نہیں ہو پاتی! اب علامہ اقبال ہی کو لے لیجئے ان کا ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' صرف مسدس ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ مجموعی طور پر انیس کی بوقلمونی سے متاثر ہے! اسی طرح جوش صاحب اپنی مسدس اور بالخصوص واقعۂ کربلا سے متعلق منظومات میں' فکرِ جدید کو انیس کی ہیئت میں ڈھالتے ہیں' اور جوان کی رسائی منظومات ہیں وہ مرثیے کے تمام لوازم کو پورا نہیں کرتے لیکن اسی حوالے سے جب ہم صباصاحب کے مراثی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ حیرت انگیز طور پر خود کو سب سے الگ تھلگ رکھ کر' اردو زبان کو سب سے بہتر شکل میں استعمال کرتے نظر آتے ہیں' اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی فنکاری نے ایک خاص

طرح کے لسانی ذوق کی ترویج کی اور جمالیاتی شعور کو جلا بخشی' انہوں نے اردو زبان میں سمیٹے ہوئے اس خوابیدہ حسن کو بیدار کیا جو عرصے سے کسی فنکار کے لمس کا منتظر تھا اور صبا صاحب کے اس وصف کا مظاہرہ آپ نے ان کے نمائندہ مرثیے ''زندگی'' کے ابتدائی پانچ بندوں میں دیکھ لیا کہ جس قادر الکلامی اور فکرِ رسا کے ساتھ انہوں نے ''زندگی'' کے ہر رنگ' ہر روپ اور ہر شکل کی تصویر کشی کی ہے وہ ان ہی پر ختم ہے۔ جوش صاحب کی مشہور اور معرکتہ الآراء نظم ''زندگی'' تو یقیناً آپ کے ذہن میں ہوگی۔۔۔ کہ جسے پڑھتے ہوئے اور پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ''زندگی'' کی اتنی مکمل اور بھرپور تصویر کشی تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن صبا صاحب کے مرثیے ''زندگی'' کا چہرہ پڑھنے کے بعد ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جوش صاحب کی موضوعاتی طویل نظم صبا صاحب کے موضوعاتی مرثیے کے چند ابتدائی بندوں کے مقابلے میں ہلکی کیوں لگتی ہے!

آیئے اب ذرا حضرتِ صبا کے ایک اور اہم مرثیے ''بصارت اور بصیرت'' کے کچھ ابتدائی بند دیکھتے ہیں۔۔۔

آنکھیں عطائے خاص ہیں پروردگار کی — تصویر دیکھتے ہیں 'خزاں کی' بہار کی
کرتے ہیں سیر دشت کی اور لالہ زار کی — اُمید اُنھیں سے رکھتے ہیں دیدارِ یار کی
ساغر کے منتظر ہیں نہ جامِ سفال کے
پیتے ہیں ان سے ہونٹ شرابِ جمال کے

آنکھوں سے خیر و شر کی فضاء دیکھتے رہیں — ہنگامہ ہائے امن و وغا دیکھتے رہیں
کس رخ پہ چل رہی ہے ہوا دیکھتے ہیں — ان کھڑکیوں سے ارض و سما دیکھتے ہیں
کرنے کو امتیاز صواب و گناہ کا
پھیلا ہے کائنات میں دامن نگاہ کا

آنکھیں ہی سیر بین ہیں آنکھیں ہی جامِ جم — محتاج ان کے زیست میں ہیں ہر قدم پہ ہم
وہ راستہ ہو دَیر کا یا جادۂ حرم — آنکھیں نہ ہو تو ٹھوکریں کھائیں بہر قدم
صحرا میں پُر کشش ہے نہ کچھ بوستاں میں ہے
آنکھیں نہ ہوں تو ہیچ ہے جو کچھ جہاں میں ہے

آنکھیں کھلیں تو رنگِ زمانہ ہو آشکار — آنکھیں اُٹھیں تو اُٹھنے لگے خود حجابِ یار
آنکھیں کہیں جو قصۂ دل آئے اعتبار — آنکھیں ملیں تو دل کے تعلق ہوں استوار
آنکھیں صلاح کار ہیں جوشِ شباب کی
دو کٹنیاں ہیں یہ دلِ خانہ خراب کی

گزرا شباب آ گیا ضعفِ بصر کا دَور — ایک ایک نقشِ صاف پہ کرنا پڑا ہے غور
دنیا بدل گئی ہے جو بدلا نظر کا طور — اب دیکھنا ہے کیا ہمیں آنکھیں دکھائیں اور
کیا غم جو سیر و دید کے قابل نہیں رہے
لیکن دُعا یہ ہے کہ بصیرت یونہیں رہے

بیشک بصارت اور بصیرت میں فرق ہے — جیسے حکایت اور حقیقت میں فرق ہے
زخموں میں اور دردِ محبت میں فرق ہے — الفاظ کے معانی و صورت میں فرق ہے
آنکھیں تو صرف لفظ کی صورت شناس ہیں
مطلب تمام اہلِ معانی کے پاس ہیں

صباصاحب کے مندرجہ بالا بندوں کی روشنی میں ہم یہاں ان کے مرثیوں کے ابتدائیے (ہر بند کے پہلے چار مصرعوں میں) قوافی اربعہ کے اہتمام کا جائزہ لیں گے اور مسدس کے فارم میں کہنے والے دیگر اساتذہ کے اہتمام قوافی سے موازنہ بھی کریں گے۔

اس ضمن میں پہلے ہم میر انیس کے مسدس کا موازنہ مرزا دبیر سے کریں گے۔ میر انیس کا مرثیہ ''نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری'' دیکھیں' اس میں پابند اور آزاد بندوں کا تناسب کچھ یوں ہے:

کُل بند: ۱۰۲   پابند قوامی والے بند: ۵۵   آزاد قوامی والے بند: ۴۷

اب ذرا مرزا دبیر کا مرثیہ ''ذرہ ہے آفتاب دربوتراب کا'' ملاحظہ ہو:

کُل بند: ۸۱   پابند قوافی والے بند: ۳۱   آزاد قوامی والے بند: ۵۰

اب ہم حالی اور چکبست کا موازنہ پیش کریں گے' کہ ان دونوں نے مسدس کے فارم کو جس کامیابی سے برتا ہے اس کی بالعموم دوسری مثال نہیں ملتی۔ مسدسِ حالی مسلسل نظم ہے جس کے بندوں کی تعداد ۶۰ ہے' جن میں سے پابند قوافی والے بند ۱۹ ہیں' یعنی اوسط ۳۲ فیصد۔ اب چکبست کو لیتے ہیں' ان کے یہاں ''رامائن کا ایک سین'' سے بہتر مسدس نہیں' چنانچہ اسی کو لیا گیا ہے' جس میں کُل بند ۳۳' پابند قوافی والے بندوں کی تعداد ۲۴ اور ۳۳ بیتوں میں سے سوائے ایک کے سب آزاد اور کھلی ہوئی ہیں۔

اور اب ہم آتے ہیں صباصاحب کی جانب' جن کے زیرِ نظر مرثیے ''بصارت اور بصیرت'' میں کل ۱۱۸ بند ہیں اور سارے کے سارے پابند قوافی ہیں!!

ہم سمجھتے ہیں کہ مسدس کے فارم میں لکھنے والے چار سینئر شعراء کے تجزیۂ فن اور اپنے عہد کے سینئر شاعر صباصاحب کے زیرِ نظر مرثیے کے اعداد و شمار مزید کسی وضاحت کے محتاج نہیں ہیں۔ اصل میں صبا اکبرآبادی کی جس فصاحت' بلاغت اور قادرالکلامی کو ہم ان کے کلام میں دیکھتے ہیں اس کا گہرا تعلق مسدس کے فارم کو انتہائی فن کاری کے ساتھ برتنے سے بھی ہے' غزل اور مرثیے کی شعری روح کو جذب کر کے اس کی تقلیب کرنے سے بھی۔ حضرتِ صبا کی فصاحت قدمایا متوسطین کے یہاں ملنے والی فصاحت کے مروجہ مفہوم میں نئی وسعت پیدا کرتی ہے' جس کی مثال ان کے تمام مراثی کے ابتدائی بند ہیں جن کے پہلے مصرعوں میں قصیدے کے زورِ بیان اور دبدبے اور بیتوں میں غزل کی لطافت اور نرمی کو باہم مربوط کر کے مرثیے کو جو نیا اسلوبیاتی پیکر دیا وہ ان کے فن سے مخصوص ہے۔

مرثیہ ہائے صباصاحب کے چہروں کے ضمن میں تیسرا مرثیہ جو ہم نے منتخب کیا ہے وہ ''کشمکش'' ہے' آئیے اس کے کچھ ابتدائی بند دیکھتے ہیں۔

آئی شبِ عاشور جو میدانِ بلا میں   اک خامشی و یاس کا عالم تھا فضا میں
تھی تیرگی شامل مہِ تاباں کی ضیاء میں   آثار سے ظلمات کے تھے ارض و سما میں
اک آگ سی بھڑکی ہوئی محسوسِ نظر تھی
وہ رات تھی یا آتشِ دامانِ سحر تھی

کیا رات تھی وہ رات بھی دن جس سے گریزاں   ہر نجمِ فلک تیرگیٔ دہر کا عنواں
آسودۂ راحت نہ ملائک تھے نہ انساں   بیدار تھی بے خواب تھی چشمِ مہِ تاباں
وہ روشنی پھیلی تھی نویں چاند کی بن میں
یا دن کے جنازے کو لپیٹا تھا کفن میں

وہ دشتِ بلا اور وہ فضاؤں کی خموشی   مایوس لبوں میں وہ دعاؤں کی خموشی
بے برگ درختوں میں ہواؤں کی خموشی   فریاد پہ مائل تھی صداؤں کی خموشی
جیسے کسی مظلوم کا دم ٹوٹ رہا ہو
جیسے کوئی فطرت کا گلہ گھونٹ رہا ہو

وہ رات تھی جس رات کے دن پاس نہ آئے ساعت تھی وہ ایسی جو کبھی راس نہ آئے
اظہار سے کیوں قلب میں وسواس نہ آئے انفاس میں کیفیتِ انفاس نہ آئے
اُس شب لبِ فطرت پہ کوئی بات نہیں تھی
تمہید قیامت کی تھی وہ رات نہیں تھی

تھی شمع کہیں اور نہ چراغوں کا اُجالا صحراء پہ نظر پڑنے سے دل تھا تہہ و بالا
اک حلقۂ تاریک تھا یا چاند کا ہالہ تھا کوئی نگہباں نہ کوئی دیکھنے والا
موت ایک طرف اور حیات ایک طرف تھی
دشت ایک طرف نہر فرات ایک طرف تھی

مرثیہ ''کشمکش'' کے ابتدائی بند دیکھنے سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ان کا خاتمہ یا تو امدادی فعل پر ہوتا ہے یا محض فعل پر یا پھر حروفِ جار پر۔ یہ سب الفاظ (افعال ہوں یا حروفِ جار) کھلی اصوات پر ختم ہوتے ہیں۔ صبا اکبرآبادی کے ہاں غیر مردّف بیتیں اکا دُکا ہی ہیں۔ اسی طرح اکا دُکا پابند ردیفیں آئی ہیں۔ مثال کے طور پر زیرِ نظر مرثیے ہی کو لے لیں' اس میں ۱۱۷ بند ہیں' جس کا مطلب یہ ہوا کہ ۳۵۱/ابیات۔ اب اگر ہم انھیں مربع کی شکل میں شمار کریں تو ہر بند میں چار چار مردّف قوافی ملتے ہیں' یعنی ۲۳۴/ابیات میں ۴۶۸ قادر الکلامی کا شاہکار قوافی!! قادر الکلامی کا ایسا بھرپور مظاہرہ' ہم دعوے سے تو نہیں البتہ پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ کسی اور مسدس گو شاعر کے ہاں نہیں ملے گا! آپ خود دیکھیں کہ بیتوں کا صوتی رجحان بندوں کے صوتی رجحان کے بالکل برعکس ہے' ہر چار مصرعوں کے بعد جب قافیہ بدلتا ہے تو ایک زبردست اندرونی موسیقیت اور ڈرامائیت پیدا ہوتی ہے۔ بندوں میں شوکت' دبدبہ' بلند آہنگی اور جلال ہے تو بیتوں میں جمال' رس اور لطافت ہے۔ بند میں اُٹھان اور بیان ہے تو بیت میں تکملہ اور خاتمے کی کیفیت ہے اور بھرپور تغزل ہے۔

اس ضمن میں ہم نے جن محاسن کا احاطہ کیا ان ہی محاسن کا بھرپور مظاہرہ آپ کو حضرتِ صباؔ کے ہر مرثیے کے سراپا' آمد' رجز' رزم اور شہادت کے باب میں بھی ملے گا۔

حسینؓ

وہ شام' صبحِ دو عالم تھی جب بہ سرحدِ شام رُکا تھا آ کے ترا قافلہ' ترے خیام
متاعِ کون و مکاں تجھ شہید کا سجدہ زمینِ کرب و بلا کے نمازیوں کے امام
یہ نکتہ تو نے بتایا جہان والوں کو کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسبیل اِک گام
سوارِ مرکبِ دوشِ رسولؐ --- پورِ بتولؓ
چراغِ محفلِ ایماں ترا مقدس نام

(مجید امجد)

مستنصر حسین تارڑ کی خودنگاری اور ''قربتِ مرگ میں محبت''

نجم الدین احمد

مستنصر حسین تارڑ ایک کہنہ مشق' نامور اور بلند پایہ ادیب ہیں۔ اس مضمون میں ہم ان کی تخلیقات کا دو پہلوؤں سے تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ اوّل ان کے سفرناموں' ڈراموں اور ناولوں میں خودنگاری (Self-depiction) اور دوم ''قربتِ مرگ میں محبت'' کی چند نمایاں خامیاں۔

خودنگاری (Self-depiction) مصنف کی ذات کے وہ عیاں اور نہاں پہلو ہوتے ہیں جو شعوری یا لاشعوری طور پر اس کے تحریر میں در آتے ہیں۔ مصنف جس طور کی ذاتی زندگی بسر کرتا ہے' غیر محسوس طریقے سے اس زندگی کے ایسے پہلوؤں کو' جنھوں نے اُس کی ذات اور شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہوتے ہیں' اپنے ناول' افسانہ یا ڈرامہ وغیرہ میں بیان کر جاتا ہے۔ اپنی ذاتی صفات سے اپنی تخلیق کے ہیرو' ہیروئن یا کسی دیگر کردار کو متصف کر دینا خودنگاری کہلاتا ہے۔ خودنگاری کی مثالیں انگریزی اور دیگر زبانوں کے ادب میں بدرجۂ اُتم ملتی ہیں مگر اردو ادب میں بدقسمتی سے یا تو اس کا فقدان ہے یا پھر نقاد حضرات نے اس کی طرف بہت ہی کم توجہ کی ہے۔ اکثر ناقدین نے مصنفین کی تحریر کے گوناگوں پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لینے کی بجائے ہر تصنیف کو اعلیٰ پائے کی تخلیق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ تصنیف پر جائز تنقید کی بجائے مروّت اور مصنف سے اچھے ذاتی تعلقات پیشِ نظر رہے ہوں۔ مخلص تنقید وہ ہوتی ہے جو تخلیق کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا احاطہ کر کے انھیں اُجاگر کرتے ہوئے اصلاح کی طرف رہنمائی کرے تاکہ مصنف آئندہ ان خامیوں سے اجتناب کرنے کی سعی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو تنقید اپنا جائز مقام حاصل کرنے میں ہنوز ناکام نظر آتی ہے۔ انگریزی ادب اور دیگر زبانوں کے ناقدین نے جہاں دیگر خوبیوں اور خامیوں کو کسی تحریر/ تخلیق میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے' وہاں پر خودنگاری کو بھی مدِنظر رکھا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز سفرناموں سے کیا اور سفرنامے کو اردو ادب میں اُس بلند مقام پر لا کھڑا کیا کہ ان کے بعد کئی مصنفین نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور اس کے ذریعے سے وہ شہرت حاصل کرنے کی کوشش کی جو مستنصر حسین تارڑ کو نصیب ہو چکی ہے مگر وائے قسمت اکثریت ناکام رہی۔ دوسری طرف نامور ادباء نے بھی سفرنامے تحریر کیے مثلاً اشفاق احمد نے افسانوی انداز میں ''سفر در سفر'' اور کرنل محمد خاں نے ڈرامائی انداز میں ''بسلامت روی'' تحریر کیے۔ مگر بحیثیت سفرنامہ نگار کے کوئی بھی مستنصر حسین تارڑ جیسی مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ گو مذکورہ کتب کو ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے سفرناموں سے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے ٹی وی ڈرامے تحریر کرنا شروع کیے۔ ان کا پاکستان ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والا ڈرامہ ''سورج کے ساتھ ساتھ'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے' جسے ناظرین نے بے حد پسند کیا تھا۔ مستنصر حسین تارڑ کی اگلی منزل ناول نگاری ٹھہری۔ سو انہوں نے ناول لکھے' بہت اچھے اور خوبصورت ناول۔ ایسے ناول جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیں کہ ختم کیے بنا چین نہ آئے۔ مختصراً مستنصر حسین تارڑ کے ادبی سفر کو تین منزلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی منزل میں وہ بطور سفرنامہ نگار نظر آتے ہیں' دوسری میں ڈرامہ نگار اور آخری منزل ناول نگاری کی سامنے آتی ہے۔

چونکہ سفر ہجرت کو ظاہر کرتا ہے اور سفرنامہ نگار ہجرت کے عمل کو الفاظ کا پیرہن پہناتا ہے۔ یہ ہجرت مستنصر حسین تارڑ کے لاشعور میں ایسی بیٹھی کہ ان کے تقریباً ہر ڈرامے اور ناول میں در آئی۔ ڈرامہ ''سورج کے ساتھ ساتھ'' میں تین دوست ہجرت کر کے روزگار کی تلاش میں شہر آتے ہیں۔ ناول ''دیس ہوئے پردیس'' جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے' ہے ہی مبنی بر ہجرت۔ ناول کا ہیرو ''برکت علی'' اس غلط فہمی کی بنا پر پاکستان سے ہجرت کے عازمِ لندن ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ ناول ''بہاؤ'' کا ہیرو ''ورچن'' بھی عادی ہے ہجرت کا' سفر کے بعد سفر کا۔ دریائے گھاگھرا کے

کنارے بسی اپنی بستی سے ہرنئے سفر کا آغاز کرتا ہے' کبھی موہنجوداڑو کی طرف اور کبھی ہڑپہ کی طرف۔

''پھر ورچن نے پوٹلی باندھ لی۔ وہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ جیسے ساری بستی پانی کے دنوں میں گھروں میں بیٹھ جاتی ہے اور لوگ سوتے ہیں' کھاتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چلنا پھرنا چاہتا تھا اور تبھی وہ پانی کے دنوں میں بھی باہر نکل جاتا۔ اس کے تلوؤں میں کھجلی تھی جو اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔۔۔'' (بہاؤ۔ صفحہ 50)

تلوؤں کی اس کھجلی نے مستنصر حسین تارڑ کو ساری عمر چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ دیس دیس گھومتے رہے' دنیا دیکھتے رہے۔ وہ چلتے رہے کہ انھیں چلنا آتا تھا۔ اپنی اس فطرت کا اظہار خودنگاری کی صورت میں ''ورچن'' کے منہ سے ان الفاظ میں کروایا:

''دیکھ پاروشنی' رکھوں' جنوروں اور پانیوں میں ہماری طرح ہی سانس ہے اور جان ہے پر وہ ہماری طرح اپنی من مرضی سے چل پھر نہیں سکتے۔ تو ہم جو چل پھر سکتے ہیں ہمیں ایک جگہ ایک بستی میں ایک کنارے پر نہیں بیٹھنا چاہیے' چلنا پھرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے' پتہ نہیں کیا کیا ہے دیکھنے کو اور ہم نہیں دیکھتے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' (بہاؤ۔ صفحہ 50)

ناول ''راکھ'' جس کی بنیادیں 1947ء کے فسادات کی راکھ سے اُٹھائی گئی ہیں' میں ہیرو'' مشاہد'' اور اس کا بھائی ''مردان'' دونوں ہی ہجرت کے عادی ہیں۔ ناول ''قربتِ مرگ میں محبت'' کا ہیرو'' خاور'' اپنے گھر' اپنے شہر اسلام آباد سے ہجرت کر کے مرنے کے لیے سندھ ساگر میں ڈولتی کشتی میں آ کر بسیرا کر لیتا ہے۔

اس طرح یہ ناول صرف ناول ہی نہیں' سفرنامے بھی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے ماضی سے اپنا رشتہ توڑنے میں ناکام رہے اور ناولوں میں بھی سفر کی خواہش پوری کرتے رہے' جس کے زیر اثر وہ ساری عمر دنیا بھر میں سرگرداں رہے ہیں۔ گویا انہوں نے اپنے ناولوں اور ڈراموں میں بھی ہجرت کے عنصر کو کارفرما رکھ کر شعوری و لاشعوری طور پر خود کو ہی صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو اپنی مٹی' اپنے وطن سے ہمیشہ کے لیے جدا نہیں کر پائے' جس طرح ''بہاؤ'' کا ''ورچن'' اور ''راکھ'' کے ''مشاہد'' اور ''مردان'' ہر سفر کے بعد واپس لوٹ آتے ہیں' اسی طرح مستنصر حسین تارڑ بھی دنیا گھومنے اور ہر سفر کے بعد واپس لوٹ کے آتے رہے۔ ان کی لاشعور میں بیٹھی' یہ وہ خوبی ہے جو لائق تحسین ہے۔ ''دیس ہوئے پردیس'' کا ہیرو ''برکت علی'' خود تو پاکستان نہیں لوٹ سکا لیکن اپنے بیٹے اور بیٹی پر وصیت کے ذریعے پاکستان کا سفر شرط کر دیتا ہے۔ پاکستان میں ایک مہینہ گزارنے کی صورت میں ہی انھیں لندن میں موجود ''برکت علی'' کا ترکہ مل سکتا تھا۔

''قربتِ مرگ میں محبت'' جو مستنصر حسین تارڑ کے تادم تحریر آنے والے ناولوں میں سے سب سے آخری ناول ہے' مصنف کی خودنگاری کے بے شمار عکس لیے ہوئے ہے۔ اس ناول میں ان کی خودنگاری عروج پر نظر آتی ہے۔ ایک طرح سے مستنصر حسین تارڑ کا کردار ''خاور'' نے ادا کیا ہے۔ ناول کا ہیرو ''خاور'' تیزی سے ڈھلتی عمر کا شخص ہے' جو ٹیلی ویژن سے وابستہ ہے اور اس کا ادب سے بھی تعلق ہے۔ اس کی کمائی کے یہی دونوں واحد ذریعے ہیں۔ وہ تیزی سے آنے والے بڑھاپے اور موت کے قربت کے احساس سے خوفزدہ ہے۔ ملاحظہ کیجیے ''قربتِ مرگ میں محبت'' سے ذیل کے چند اقتباسات:

''۔۔۔ ڈاکٹر طاہر درست ہی کہتا تھا: تمہیں اپنے بدنی زوال سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے۔۔۔ یو ہیو ٹو لوو اٹ!''
(صفحہ نمبر 46)

''۔۔۔ اور اس کے اندر زندہ رہنے' بدن میں زوال کی گھنٹیوں کے بجنے کے باوجود اس زندگی کے لیے ایک کشش پیدا ہوئی۔۔۔''
(صفحہ نمبر 48)

''میں اتنا بوڑھا بھی نہیں کہ باہر سونے سے بدن اکڑ جائے۔۔۔'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔۔۔ (صفحہ نمبر 50)

''میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔۔۔'' اگرچہ اس نے بھی خوش مزاجی سے ہی انکار کیا تھا لیکن ایک بار پھر لاشعوری طور پر اس میں عمر کا سفر در آیا تھا۔''
(صفحہ نمبر 52)

''یہ عمر کا بہاؤ اور زوال ہے' جس میں وہ کچھ سنائی دیتا ہے جو بولتا نہیں۔۔۔ اور وہ کچھ دکھائی دیتا ہے جو ہوتا

نہیں۔۔۔'' (صفحہ نمبر 63)

''۔۔۔سوجی ہوئی بے روح آنکھیں اور ان کے گرد کوے کے پنجے ایسی بے جان جھریاں' گال وہاں سے پچکے ہوئے جہاں سے اس کی داڑھیں نکل چکی تھیں۔۔۔اور چہرے کی جلد کو چٹکی میں بھر کر چھوڑنے سے وہ اپنی اصلی حالت کو نہیں لوٹتی تھی۔۔۔تادیر وہیں اسی مقام پر پڑی رہتی تھی۔۔۔

اُسے ٹیلی ویژن پر نمودار ہونے کے لیے اب گھنے میک اپ کی ضرورت پیش آتی تھی۔لائٹ میک اپ میں اس کے چہرے کی جھریاں نمایاں ہو کر اس کی عمر کے ہر برس کی منادی کرتی تھیں۔۔۔'' (صفحہ نمبر 91)

''اگر ٹیلی ویژن کے لیے کوئی کھیل لکھتے ہوئے اُسے پروڈیوسر یہ اطلاع دے دیتا تھا کہ فلاں کردار کے لیے میں نے طاہرہ کو منتخب کیا ہے تو۔۔۔'' (صفحہ نمبر 82)

''اور پھر ہم دونوں خاور صاحب کے لکھے ہوئے ڈرامے میں کام کریں گی۔۔۔تم اچھی ہو جاؤ گی۔(صفحہ نمبر 84)

''وہ یہ جوا نہ کھیلتا تو ٹیلی ویژن اور ادب کی قلیل آمدنی سے۔۔۔'' (صفحہ نمبر 93)

مندرجہ بالا چند مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ مصنف نے خودنگاری سے کام لیا ہے۔مستنصر حسین تارڑ بڑھاپے کی دہلیز پر ہیں اور شاید اس سے خائف بھی۔ٹی وی ڈرامہ رائٹر اور ادیب ہیں۔''خاور'' ہی کی طرح ان کے چہرے اور گردن کی جھریوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔بڑھاپے کی سنگت میں موت سے قربت کا احساس فطری طور پر بڑھتا جا رہا ہے۔

عام طور پر ڈرامہ نگار ٹیلی ویژن پر جلوہ گر نہیں ہوتا۔مگر ناول کی ایک ہیروئن ''غلافی آنکھوں والی'' ناول کے ہیرو''خاور'' کو ٹی وی اسکرین پر دیکھ کر اس پر عاشق ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناول کا ہیرو یا تو خود اداکار ہے یا پھر ناول کے مصنف کی طرح سٹیج کمپیئر یا مخصوص وقت کی نشریات کا کمپیئر۔یہ بھی مصنف کی خودنگاری کا ایک پہلو ہے۔ملاحظہ کیجئے:

''جب میں کالج میں تھی۔۔۔ایم۔اے انگلش لٹریچر کے آخری سال میں تھی۔۔۔جب مَیں نے تمہاری پہلی کتاب پڑھی تھی۔۔۔جب مَیں نے پہلی بار تمہیں ٹیلی ویژن کے ایک ادبی پروگرام میں دیکھا تھا۔۔۔'' (صفحہ نمبر 88)

''۔۔۔کالج کے دنوں میں جب تمہاری پہلی کتاب پڑھی تھی' تمہیں پہلی بار ٹیلی ویژن پر باتیں کرتے دیکھا۔۔۔''

(صفحہ نمبر 107)

''۔۔۔میرے بچے بھی جانتے ہیں کہ ٹیلی ویژن پر تمہارا کوئی پروگرام چل رہا ہو تو ممی کیسے اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ جاتی ہیں۔۔۔چپک جاتی ہیں۔۔۔وہ اکثر مجھے چھیڑتے ہیں اور مَیں جواب میں انھیں ڈانٹ دیتی ہوں لیکن دِل ہی دِل میں ان کی شکر گزار ہوتی ہوں کہ انہوں نے تمہارا تذکرہ کیا۔۔۔وہ تمہاری ہر نئی کتاب خرید کر میرے لیے لاتے ہیں کہ ممی آپ کے خاور صاحب۔۔۔'' (صفحہ نمبر 108)

اس ظاہری مماثلت یا خودنگاری کے علاوہ مصنف کی ذات کے چند ایسے پہلو بھی ہیں جو ان کی تخلیقات کے عمیق مطالعے سے سامنے آتے ہیں کہ ان میں مصنف ہے۔مثلاً موہنجوداڑو' ہڑپہ کی قدیم ثقافت سے دلچسپی' وادیٔ مہران (دریائے سندھ) اور وادیٔ گھاگھرا (چولستان) کی قدیم تہذیبوں یعنی تاریخ' خاص طور پر قدیم تاریخ سے گہری دلچسپی۔اپنے سفرناموں کے ذریعے انہوں نے ہمیں جو دنیا دکھائی اس میں تاریخی عمارتیں' قدیم معبد اور آثارِ قدیمہ نمایاں صورت میں سامنے آتے ہیں جس شہر' جس ملک گئے' اس شہر اس ملک کی تاریخ و روایات کو روانی اور سلاست سے ایسے پیرائے میں بیان کیا کہ قاری کو قطعاً بار محسوس نہیں ہوتا بلکہ اُسے وہ سب بے حد دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔یہی صورت ناولوں میں بھی موجود ہے۔''بہاؤ'' جسے ''ایک قدیم تہذیب کی بازیافت'' قرار دیا گیا ہے' میں دریائے گھاگھرا کے کنارے بسی بستیوں اور موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی قدیم تہذیبوں کو دکھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور ''قربتِ مرگ میں محبت'' میں سندھ ساگر (وادیٔ مہران) کی تہذیب کو سامنے لایا گیا ہے۔

اس بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ اپنی ہر تخلیق میں خودنگاری کو کام میں لاتے رہے ہیں۔یہ تحریر کا وہ پہلو ہے جسے اگر احسن طریق سے برتا جائے تو تحریر نہایت پُراثر ہو جاتی ہے۔''بہاؤ'' اور ''قربتِ مرگ میں محبت'' کی کامیابی ثابت کرتی ہے کہ مستنصر حسین تارڑ نے

اس پہلو کو خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

جیسا کہ ہم نے مضمون کے شروع میں تحریر کیا ہے مخلص تنقید وہ ہوتی ہے جو تصنیف کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ خامیوں کا احاطہ کر کے انھیں اُجاگر کرتے ہوئے اصلاح کے پہلو کی طرف رہنمائی کرے تا کہ مصنف ان خامیوں سے آئندہ اجتناب کرنے کی کوشش کرے۔ اس مختصر مضمون میں ہم مستنصر حسین تارڑ کی جملہ تصانیف کے کمزور پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈال سکتے اس لیے صرف ان کے آخری ناول ''قربتِ مرگ میں محبت'' کی چند نمایاں خامیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اس ناول کے مطالعے کے دوران ہمیں جگہ جگہ احساس ہوتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ اپنے ناول ''بہاؤ'' کے اثر سے نکل نہیں سکے اور آئندہ اُن کا کوئی نیا ناول اشاعت پذیر ہوتا ہے تو خدا جانے اس اثر سے نکل چکے ہوں گے یا نہیں۔ ''بہاؤ'' کے زیر اثر ''قربتِ مرگ میں محبت'' میں لکھے گئے سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

''اس نے اسوار پر سوار اونچی ناک والے آریاؤں کی نظروں سے بچ کر اُدھر سندھ ساگر کے کناروں پر تین ہزار برس گزار دیئے تھے۔۔۔'' (صفحہ نمبر 10)

''یہ اُونچی ناک والے جدھر دیکھتے تھے۔۔۔ ہڑپہ یا موہنجو کو جدھر دیکھتے تھے اُسے کھنڈر کر دیتے تھے۔'' (صفحہ نمبر 11)

''ہزاروں برس پیشتر جانے وہ کس سرسوتی کے کناروں پر آباد تھے جس کے سوکھنے پر۔۔۔ وہ ادھر آ نکلے تھے۔۔۔ اونچی ناک والوں کی نظر بد سے بچ کر۔۔۔'' (صفحہ نمبر 12)

''اپنے دیسوں کو لوٹنے والے ہمیشہ شتابی میں ہوتے ہیں رُکتے نہیں۔'' (صفحہ نمبر 42)

''بہاؤ'' کے ''مامن ماسا'' کی عمر ہزاروں برس کی ہو جاتی ہے اور وہ ''صدیوں کا بیٹا'' بن کر دریائے سندھ کے کنارے آباد دورِ حاضر کے غریب ملاحوں کا روحانی پیشوا بن کر دوبارہ ہمارے سامنے ''قربتِ مرگ میں محبت'' میں آ کھڑا ہوتا ہے اور اُسے گھاگھرا کے کنارے اپنی رہن سہن اب بھی یاد ہے۔

''تو ہمارا ایک بڑا ہے مہانوں کا۔۔۔ اس کو سب مامن ماسا بولتے ہیں۔۔۔ پتلا چھمک ہے بہت وڈیرا ہے پر ابھی تک جھکا نہیں ہے۔۔۔ وہ کبھی خشکی نہیں اُترا سائیں ہمیشہ کشتی میں رہتا ہے۔۔۔ تو جب وہ خشخاش اور کالی مرچ والی خاص بوٹی پیتا ہے جو منہ اندھیرے سے جب سویر کا تارا ابھی آسمان پر کھڑا ہوتا ہے گھوٹی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ ہم سدا سے سندھ کے باسی نہیں ہیں۔۔۔ اُوپر ادھر چولستان کی ریتوں میں کسی زمانے میں سرسوتی نام کا دریا تھا جس کے کناروں پر ہماری بستیاں تھیں۔۔۔ بوٹی زیادہ پی لیتا ہے ناں مامن ماسا تو ایسی باتیں کرتا ہے۔'' (صفحہ نمبر 70)

فرق پڑا ہے تو صرف اتنا کہ ''بہاؤ'' کا ''مامن ماسا'' رکھوں کے ساتھ رکھ بن کر رہتا تھا اور اب سدا کشتی میں رہتا ہے۔ ''مامن ماسا'' کی باتوں کا یقین اس کی بستی کے لوگوں کو بھی نہیں ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ''مامن ماسا'' بوٹی کے نشے میں دُھت ایسی انہونی باتیں کرتا ہے، تبھی تو وہ کہتے ہیں۔ ''بوٹی زیادہ پی لیتا ہے نا مامن ماسا تو ایسی باتیں کرتا ہے۔''

''پکھی'' ''خاور'' کو ''پاروشنی'' دِکھتی ہے۔ موری ''می آوَں۔ می آوَں'' گھاگھرا کنارے کے جنگل سے نکل کر ''خاور'' کے من میں بولنے لگتی ہے:

''لیکن سرسوتی کی پاروشنی اب سندھ کے کناروں پر آ کر بس چکی تھی۔۔۔'' (صفحہ نمبر 74)

''سومرو کے بیج سے پھوٹا تھا۔۔۔'' (صفحہ نمبر 74)

''اسے دیکھ کر وہ بھی ایک سومرو میں بدلتا تھا جو ہزاروں برس پیشتر سرسوتی کی شادابی کے زمانوں میں مہریں اور منکے بناتا تھا۔۔۔ جس نے ایک شام پہلی بار یہ دیکھا تھا کہ سرسوتی کے پانی ایک کچھوے کی پشت کو نہیں ڈھانپ رہے وہ کناروں سے سمٹتے جاتے ہیں اور کم ہو رہے ہیں اور یہ بستی ویران ہونے کو ہے۔۔۔'' (صفحہ نمبر 145)

''می آوَں۔۔۔ می آوَں۔ ایک مور اس کے کان میں بولتا تھا اس کے اُونگھتے بدن اور بھیتر میں بولتا تھا۔'' (صفحہ نمبر 63)

''اسی طرح ''راکھ'' میں دبی چنگاریاں بھی کہیں کہیں لو دیتی دکھائی دیتی ہیں:

''اس لیے کہ کسی ایک مرغابی کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں۔'' (صفحہ نمبر 37)

''خوشی کا چار مرغابیوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔۔۔'' (صفحہ نمبر 65)

''راکھ'' کے ان مکالموں کا ''قربتِ مرگ میں محبت'' کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر اچانک ''راکھ'' کا ہیرو ''مشاہد علی'' سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

''۔۔۔ایک مشاہد علی سے دوچار تھا۔۔۔ جو راوی کے پانیوں کے اُترنے اور کامران کی بارہ دری کی ان اینٹوں کے ننگے ہونے کا گواہ تھا جو پہلے زیرِ آب آتی تھیں۔'' (صفحہ نمبر 145)

ایسا قاری جس نے ''راکھ'' اور ''بہاؤ'' کو نہیں پڑھ رکھا سٹپٹا جاتا ہے۔ ''مامن ماسا۔۔۔ پاروشنی۔۔۔ سومرو۔۔۔ ورچن۔۔۔ چار مرغابیاں۔۔۔ خوشی۔۔۔ مشاہد علی۔۔۔'' یہ سب کیا ہے؟ کون ہیں یہ؟

ان چند مثالوں سے یوں لگتا ہے جیسے ''بہاؤ''، ''راکھ'' اور ''قربتِ مرگ میں محبت'' ایک ہی سیریز کے ناول ہیں جیسا کہ عام طور پر جاسوسی ناول ہوتے ہیں اور یہ ناول اسی طور پر ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں نظر آتے ہیں۔ یہی بات ناول نگار کو بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ وہ ناول میں ''بہاؤ'' اور ''راکھ'' کے کرداروں کے بے جاذکر سے قاری کو بلکہ خود کو یوں مطمئن کرتا نظر آتا ہے۔

''وہ انہی کا ایک تسلسل تھا لیکن اس تسلسل سے آگاہ نہیں تھا۔۔۔ جیسا کہ پنکھی بھی آگاہ نہیں تھی کہ وہ پاروشنی کی ایک مورت ہے۔۔۔'' (صفحہ نمبر 145)

قاری تو مطمئن نہیں ہو پاتا لیکن خود شاید مطمئن ہو جاتے ہیں۔ قاری کے عدم اطمینان کی وجہ یہ ہے کہ ہر ناول کا پس منظر، پلاٹ، کردار، مکالمے، کرداروں کا لہجہ، سبھی کچھ علیحدہ ہے، ایک دوسرے سے یکسر مختلف۔ ''بہاؤ'' قدیم ترین تاریخ ''راکھ'' 1947ء کے فسادات کے پس منظر سے اُٹھائی گئی کہانی پر مبنی اور ''قربتِ مرگ میں محبت'' جدید دور کا ناول یعنی ہر ایک کے پس منظر میں طویل زمانی بُعد۔ ہر ناول ایک Separate Entity ہوتا ہے جس کا اپنا مزاج، ماحول اور اپنے کردار اور ان کی تعلیم وتربیت و ماحول کے اعتبار سے اپنی زبان و مکالمے ہوتے ہیں۔

ناول، افسانہ یا ڈرامہ کے کرداروں کی زبان، مکالمے اور لہجہ غیر حقیقی اور غیر فطری نہ ہوں تو تخلیق کا رُتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے، آفاقی بن جاتا ہے۔ ''قربتِ مرگ میں محبت'' کی ایک دوسری ہیروئن ''عابدہ سومرو'' جو کانونٹ کی تعلیم یافتہ ہے اچانک حسین بن منصور حلاج کا ذکر ''سرمد'' کہہ کر کرتی ہے اور فارسی کے اشعار پڑھتی ہے، فارسی بولتی ہے۔ ایک بڑے سیاستدان اور وڈیرے کی بیٹی، بہو اور بیوی، آکسفورڈ اور ہارورڈ کی تعلیم یافتہ، جس کے اکاؤنٹ میں لاکھوں، کروڑوں پڑے سڑتے ہیں، جس کے ڈریسز ماڈلز کو مات کرتے ہیں، کے منہ سے ''سرمد'' اور اہلِ فارس کے لہجے میں اسے فارسی بولتا سن کر بے حد غیر حقیقی اور غیر فطری لگتا ہے۔ منصور حلاج کو ''سرمد'' کے نام سے کانونٹ لہجے میں انگریزی بولنے والی، برطانیہ و امریکہ کی یونیورسٹیوں کی تعلیم یافتہ تو کیا عربی و فارسی کی گہری شدھ بدھ رکھنے والے بھی نہیں جانتے۔ ہیرو جو کہ ادیب ہے خود بھی منصور حلاج کا یہ نام نہیں جانتا۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ منصور حلاج کی عرفیت، لقب یا خطاب کوئی بھی ''سرمد'' نہ تھا اور ''اناالحق'' کا نعرہ صرف اسی نے لگایا تھا۔ لہٰذا ذہن سیدھا ان کی طرف جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی شاید انھیں ہی ''سرمد'' کا نام دیا ہے، جو کہ ایک فاش غلطی ہے۔ تذکرۃ الاولیاء سے لے کر کشف المحجوب تک کسی ایک کتاب میں بھی حسین بن منصور حلاج کو ''سرمد'' کے نام سے پکارے جانے کا کوئی ذکر نہ ہے۔

''تو ہماری ذات آپ سے الگ تو نہیں ہے سائیں۔۔۔ من تو شدی والا معاملہ ہے۔۔۔ تو من شدی کا انحصار آپ کی نظرِ کرم پر ہے۔۔۔'' (صفحہ نمبر 171)

''آنکھیں بچھائے منتظر ہیں سائیں۔۔۔ سرمد کی طرح۔۔۔''

''سرمد؟''

''ہاں سائیں۔۔۔ وہ بھی اناالحق کہتا تھا۔۔۔ اور ہم بھی یہی کہتے ہیں۔۔۔

آنکس کہ ترا کارِ جہانبانی داد   مارا ہم اسباب پریشانی داد
بخشانہ لباس ہر کرا عیب داد   بے عیباں را لباسِ عریانی داد   (صفحہ نمبر 172)

''اس کا لہجہ اہلِ فارس کی مانند تھا۔''

''وہ بھی یقیناً کا نونٹ سٹف تھی بلکہ اس سے بھی کہیں آگے کا نسخہ تھا۔'' (صفحہ نمبر 176)

''گرنڈلیز[2] کا ایک اکاؤنٹ صرف میرے نام تھا اور میں صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اس میں کتنی رقم جمع ہے چیک کاٹتے ہوئے خواہ مخواہ دو تین صفر بڑھا دیتی تھی اور تب بھی وہ کیش ہو جاتا تھا۔۔۔'' (صفحہ نمبر 177)

''میرا باپ بھی وڈیرہ ہے آدھے سندھ کا مالک ہے۔۔۔اس کی لینڈ کروزر ہماری زمینوں پر چلتی ہے تو اس کے ٹائروں کے نیچے سے جو دھول اُٹھتی ہے تو۔۔۔

۔۔۔لینڈ کروزر کا ڈیزل ختم ہو جاتا ہے پر میرے بابا سائیں کی زمین ختم نہیں ہوتی۔۔۔

۔۔۔میں آکسفورڈ میں تھی۔۔۔

۔۔۔پھر میں ہارورڈ میں چلی گئی سائیں۔۔۔'' (صفحہ نمبر 177)

''اس کے لیے تو میں ایک آب جیکٹ ہوں۔۔۔نمائش کے لیے۔۔۔وڈیروں کی بیٹیاں کہاں اتنی پڑھی لکھی ہوتی ہیں۔۔۔آکسفورڈ اور ہارورڈ۔۔۔اور کہاں ایسے ڈریس کرتی ہیں کہ لوگ ماڈلز کو بھی بھول جائیں اور انھیں دیکھتے رہیں۔۔۔'' (صفحہ نمبر 178)

مناسب ہوتا اگر مستنصر حسین تارڑ ''عابدہ سومرو'' کی فارسی زبان میں خصوصی دلچسپی کا اظہار اس کردار کے اپنے منہ سے کروا دیتے۔ ان کے پاس اس کا موقع بھی موجود تھا۔ ناول کے ہیرو ''خاور'' نے اس کے فارسی زبان کے علم رکھنے اور لہجہ اہلِ فارس کی مانند ہونے پر کسی حیرت کا اظہار نہ کیا جبکہ ایسا کرنا فطری ہوتا اور اس سے مصنف کو ''عابدہ سومرو'' کی زبانی اس کے فارسی زبان میں خصوصی دلچسپی رکھنے اور اُسے سیکھنے کے پس منظر کو بیان کرنے کا موقع مل جاتا۔ اسی طرح اگر ''راکھ'' کے کردار ''مشاہد علی'' اور ''خوشی کا چار مرغابیوں سے تعلق'' جیسے چند فقرے ناول میں نہ شامل ہوتے تو ناول کا قد مزید بلند ہو سکتا تھا۔ وہیں پر ''بہاؤ'' کے کرداروں خصوصاً ''مامن ماسا'' کا ذکر نہ کرنے سے ناول کی عظمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اگر مصنف کے نزدیک اس کا ذکر ضروری تھا تو ''مامن ماسا'' ایک روایتی کردار کی بجائے ملاحوں کے قبیلہ کا سردار ہوتا یعنی ''مامن ماسا'' نام ہوتا ایک عہدے کا کہ جس کے حامل کے پاس ان کی سرسوتی کنارے بودوباش کی تاریخ پُرکھوں کے ذریعہ سینہ بہ سینہ پہنچتی ہے' تو زیادہ بہتر تھا۔ مورکی ''می آؤں۔۔۔می آؤں'' بلا حوالہ ''بہاؤ'' بھی بہتر طور پر استعمال ہو سکتی تھی۔ پاروشنی' ورچن اور سومرو کے اذکار نہ صرف غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں بلکہ ناول کو بوجھل بناتے نظر آتے ہیں۔

---

۱)۔ تذکرۃ الاولیا، از فرید الدین عطار' کشف المحجوب از حضرت علی ہجویریؒ المعروف حضرت داتا گنج بخشؒ' دیوان منصور حلاج عربی سے اردو ترجمہ مظفر اقبال' وحدت الوجود تے پنجابی شاعری از علی عباس جلال پوری' دیوان منصور حلاج میں ان کے کئی نام لکھے گئے ہیں جن میں ابوالمغیث الحسین بن منصور الحلاج' ابوعبداللہ' ابوعمارہ وغیرہ شامل ہیں مگر ''سرمد'' نام کا کوئی حوالہ موجود نہ ہے۔ تاہم تاریخ بتاتی ہے کہ ''سرمد'' نام کے ایک مجذوب برصغیر پاک و ہند میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں تھے جنہیں اورنگ زیب نے زنداں میں رکھنے کے بعد شہید کروا دیا تھا۔

۲)۔ Grind Lays.

مجلسی تنقید

علی محمد فرشی کی نظم ''ایک، دو، تین، ایک'' کا مطالعہ

عامر سلطان

پروین طاہر

یہ نظم '' خدا، مرد اور عورت'' کی ازلی تکون اور اس سے وابستہ نفسیاتی اور فلسفیانہ سوالات سے متعلق ہے جو صدیوں سے انسانی ذہن کی رسائی اور دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ نظم کے پس منظر میں ماں کی بیماری کا ڈپریشن ہے لیکن اس ڈپریشن کا تعلق محض ماں کی بیماری سے نہیں بلکہ اس کے ساتھ سلسلہ کلام کے رُک جانے سے ہے۔ ایک شاعر کا آواز کے ساتھ گہرا جذباتی رشتہ ہوتا ہے اس لیے چپ اور Coma کی کیفیت کو وہ معمول سے زیادہ محسوس کرتا ہے۔ یہاں ماں کی خاموشی شاعر کے لیے شدید ذہنی اذیت کا باعث ہے۔ یہ اذیت مزاج کی وہ کیفیت پیدا کرتی ہے جہاں انسانی ذہن میں ہر چیز لاسمت اور بے معنی ہو جاتی ہی۔ شاعر کے ہاں اس کیفیت سے نکلنے کی خواہش اس نظم کی تخلیق کا باعث بنی ہے۔ ماں کی خاموشی نے شاعر کے اندر ناسٹلجیا کا طوفان برپا کر دیا ہے۔ وہ اپنی پُرانی Associations کو یاد کرتا ہے۔ 'آنسوؤں سے سیاہی کا دریا بننا'، 'دریا کا سمندر بن جانا'، 'دنیا بھر کے درختوں کی شاخوں کا قلم بن جانا' اور پھر اس روشنائی سے محبوب کی مدح لکھنا اس نظم کے بنیادی Contents ہیں۔ اس طرح ایک محبت کے معدوم ہو جانے کے خوف سے دوسری محبت کی تلاش جس قدر قدیم ہے اتنی ہی قدرتی بھی اور اس طرح وہ تکون کی تکمیل بھی کرتی ہے۔ نظم میں بہت اچھی شعری سطور ہیں لیکن Punch line 'ماں تو بیمار ہے/اب کئی روز سے بولتی بھی نہیں' ہے۔

منظر نقوی

اس نظم کا بنیادی موضوع محبت ہے جس کے تین ادوار ہیں۔ پہلا بچپن، دوسرا جوانی اور تیسرا وہ جب انسان سب کچھ دیکھ چکنے کے بعد تنہائی کے مقابل ہوتا ہے۔ ایسے میں اسے ایک چھپی ہوئی محبت سہارا دیتی ہے۔ آخر میں شاعر پر کھلتا ہے کہ جو Force تھی وہ ماں کی تھی۔ امر محبت ماں ہی کی ہوئی ہے۔ باقی سب Reciprocal ہے۔ کیونکہ ماں کی محبت میں Total Surrender کی کیفیت ہے۔ اس نظم کی کئی Dimensions ہیں اور علامتیں اپنے کلچر سے لی گئی ہیں۔

ارشد معراج

اس نظم میں تین بنیادی حقائق ہیں خدا، عورت اور موت۔ کتابوں سے نظم شروع ہوتی ہے، کتابوں سے زینہ بننا خدا کی تفہیم کا عمل ہے۔ وہ کوئی Totality نہیں بنا رہا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ خدا تک کتابوں کے ذریعے سے نہیں پہنچ سکا۔ اس کا تصورِ خدا ممتا کے تصور کے مماثل ہے۔ یہاں وہ ماں کے تصور کو خدا کی سطح پر لے جاتا ہے۔

جلیل عالی

اگر ماں اور خدا کو اس تناظر میں دیکھیں تو ہم کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ یہ جو'' جانیاں'' کا تخاطب ہے، بھلے محبت کا کوئی بھی درجہ ہو، تلاش حق کی نسبت سے اس کی منزل بہر طور خدا ہے۔ نظم کا ابتدائی حصہ معصومیت سے لبریز ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس عہد میں انسان کتابیں پڑھتا ہے۔ حصولِ علم کی خواہش میں آگے بڑھتا ہے لیکن اسے علم نہیں ہوتا کہ کتابیں اس کے لیے عذاب لائیں گی یا ثواب۔ بچپن کے گیت میں برابری کے

آدرش کی روایت اور زندگی کو میٹھا رس بنانے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے۔''کاغذی عمر کی ناؤ/ کروٹ بدل کر اُلٹ دیتی ہے خواب سارے۔'' یہ زندگی کی تلخ حقیقت کا اظہار ہے۔ یہاں سے کتابوں کا تلخ پہلو شروع ہوتا ہے۔ آنسوؤں سے سمندر کی تشکیل والی سطور روایت سے انسلاک رکھتی ہیں یعنی سارے ذرائع صرف ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت ہماری گرفت میں نہیں آتی۔ ساری کتابیں پڑھ لینے کے باوجود وہ حقیقت تک نہیں پہنچ سکا۔ وہ کہتا ہے کہ Intellectual اور Metaphysical سطح پر تو میرا اور تمہارا تعلق موجود ہے لیکن اب وہ چاہتا ہے کہ اس کا Physical سطح پر بھی خدا ہو۔ ماں کے حوالے سے Abstract کو Concrete سے اور Metaphysical کو Biological سے جوڑا گیا ہے۔

آذر تمنا

نظم کا کردار اجتماعی شعور کو Represent کرتا ہے۔

یٰسین آفاقی

نظم کا صوتی آہنگ بہت متاثر کرتا ہے۔ قوافی کا فنی استعمال معنویت اور تاثر میں اضافے کا باعث بنا ہے۔ بچپن کی یادیں عجیب کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ اس نظم میں بہت خوبصورت سطریں ہیں۔ بچپن کا گیت آدمی کا رشتہ زمین کے ساتھ جوڑتا ہے' کتابیں اسے علم کا زینہ فراہم کرتی ہیں۔ اسے انسان کا مرتبہ دیتی ہیں اور آسمانی وسعتوں سے ہمکلام ہونے کے قابل بناتی ہیں۔ نظم کے بڑے متن کے ساتھ چھوٹے متون بھی جڑے ہوئے ہیں۔ نظم کا پھیلاؤ قابلِ داد ہے۔ یہ نظم علینہ کے ساتھ بھی ایک تعلق رکھتی ہے۔ وہاں علینہ نہیں بولی تھی پوری نظم شاعر کی آواز میں ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔ یوں مابعد الطبیعاتی سوالات زیادہ اہم دکھائی دینے لگتے ہیں۔

کرنل شرافت علی

نظم کا کردار ہر محبت میں ماں کی محبت کا عکس دیکھتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ کتابوں کے ذریعہ سے روزی تو حاصل ہو سکتی ہے حقیقت نہیں مل سکتی۔

چوہدری اعجاز

بچپن معصوم تھا اس لیے آسان تھا جوں جوں شعور بڑھتا گیا مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ انسان کو سکون کے لیے معصومیت اپنانی ہوگی۔

ڈاکٹر سرور کامران

اس نظم میں قرآن اور بائبل کے کئی حوالے آئے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بچپن میں پانی کے ایک پیالے میں ہاتھ ڈالا تو پانی شراب بن گیا۔ نظم میں بچپن کی شیرینی کی حلاوت ہے لیکن بڑے سوالات کی تلخی بھی موجود ہے۔ ایک' دو' تین Trinity کا حوالہ ہے' جب کتاب اور الفاظ مدد نہیں کرتے تو انسان آ کر تھک کر خدا ہی کو پکارتا ہے۔ سمندروں کی سیاہی اور درختوں کی قلموں کا حوالہ قرآنی ہے۔ عظمتوں کی وسعت کی طرف اشارہ ہے جو اسے سمو لیتی ہے۔ انسانی زندگی کا سفر آگے کی طرف بڑھتا ہے اور اس کا بچپن اس کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ کتابوں کے ذریعہ سے حقیقت تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تلاش بھی ایک طرح کی محبت ہے لیکن آخر ایک ایسا مقام بھی آ جاتا ہے جہاں کتابیں معاونت نہیں کر سکتیں۔ حقیقت مطلقہ تک رسائی کتابوں کے ذریعہ ممکن نہیں۔ یہ بہت اچھی نظم ہے اور اس کی کئی جہتیں ہیں۔

(۲۷ مئی ۲۰۰۵ء' حلقہ اربابِ ذوق' اسلام آباد)

معروف ادیب رشید امجد کے جوابات ایک سوال نامہ کے جواب میں

محرّک: جاوید حیدر جوئیہ

سوال: ڈاکٹر رشید امجد صاحب، آپ نے افسانہ، تنقید اور آٹو بیوگرافی لکھی اور تحقیقی مقالہ بھی تحریر کیا۔ کس صنفِ ادب نے آپ کو سب سے زیادہ لطف دیا اور اس کا سبب کیا رہا؟

جواب: میں خود کو بنیادی طور پر افسانہ نگار سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میری پہچان افسانہ نگار ہی کی حیثیت سے ہو، سبب یہی کہ میری طبیعت کہانی سے وابستہ ہے اور کہانی لکھنے میں مجھے لطف آتا ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب، افسانہ علامت اور تجرید کے پیرایوں سے نکل کر کیا واقعی دوبارہ ''کہانی'' کے روایتی مفہوم میں لکھا جانے لگا ہے؟ آپ کے خیال میں اس تبدیلی کے عوامل کیا کیا ہیں؟

جواب: میں اسے درست نہیں سمجھتا کہ افسانہ دوبارہ حقیقت نگاری کی طرف لوٹ آیا ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ ساٹھ کی کہانیوں کی علامتیں غیر مانوس تھیں، کچھ لکھنے والے کا عجز بیاں بھی تھا اور قاری بھی ان سے مانوس نہ تھا کہ اس کی تربیت جس کہانی سے نسل در نسل ہوئی تھی، یہ کہانی اس سے متعلق انداز میں بیان ہو رہی تھی۔ اتنے برسوں میں قاری کی تربیت ہوگئی ہے اور لکھنے والوں کو بھی اپنے فن پہ دسترس حاصل ہوگئی ہے۔ ''کہانی'' کی واپسی کا شوشہ ان لوگوں نے چھوڑا ہے جو ساٹھ میں بھی زبردستی محض فیشن کی وجہ سے علامتی کہانیاں لکھنے لگے تھے۔ اس طرح کے لوگ ہر بڑی تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کہانی نہ کہیں گئی تھی نہ کہیں سے واپس آ گئی ہے۔ ہوا صرف اتنا ہے کہ اب ہمارا قاری نئے افسانے سے مانوس ہو گیا اور ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو رہا۔

سوال: موجودہ عالمی صورتحال میں، جبکہ ایک نئی Sensibility جنم لے رہی ہے اور مسائل حیات پر سوچنے اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے گلوبلائزیشن کا نظریہ مقبول ہو رہا ہے تو کیا اُردو افسانے کے موضوعات میں آپ ا[illegible] تبدیلی کو محسوس کرتے ہیں؟

جواب: افسانہ کیا پورا ادب زندگی سے وابستہ ہوتا ہے۔ معاشرے میں جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ خود بخود ادب کا حصہ بن جاتی ہیں۔ دائرہ در دائرہ معاشرے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ گلوب پر جو تبدیلیاں آ[illegible] گی وہ کہیں تیزی اور کہیں آہستگی سے تمام معاشروں کا حصہ بنیں گی۔ ادب بھی ان سے متاثر ہوگا۔ کوئی بھی صنف اگر روحِ عصر کے ساتھ نہیں تو خود بخود مر جائے گی۔

سوال: بالعموم لوگ سعادت حسن منٹو صاحب کو [illegible] سب سے بڑا افسانہ نگار قرار دیتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے نقاد بیدی صاحب کو یہ درجہ دیتے ہیں۔ آپ کا خیال کیا ہے اور کس بنیاد پر ہے؟

جواب: منٹو افسانے کا ایک بڑا نام ہے۔ مجھے ذاتی طور پر منٹو پسند ہے۔ کوئی شک نہیں کہ بیدی بھی بڑا افسانہ نگار ہے، پھر غلام عباس کیا کسی سے کم ہے، دراصل یہ دَور ہی بڑے بڑے افسانہ نگاروں کا دَور تھا۔ ان کی ترتیب مشکل ہے یوں بھی ادب میں [illegible] سٹینڈ نہیں ہوتے۔

سوال: خودنوشت لکھنے کا محرک کیا تھا؟

جواب: میں نے جدوجہد کی زندگی گزاری ہے۔ پھر میری خودنوشت میں محبتوں اور قربانیوں کی کئی مثالیں ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ ان یادوں میں دوسروں کو بھی شریک کروں۔

سوال: اردو میں تنقید اور تنقیدی رویوں کی موجودہ رفتار، عملی سے زیادہ نظری ہے۔ آپ نئے ناقدین کو عملی تنقید کی طرف پیش رفت کے لیے کیا تجاویز دینا پسند فرمائیں گے؟

جواب: مجھے آپ کی رائے سے مکمل اتفاق ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ عملی تنقید کے لیے پڑھنا پڑتا ہے۔ یہ زبانی کلامی نہیں ہو سکتی اور ہمارے نقاد نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ نظری تنقید کی اُس وقت تک کوئی حیثیت نہیں جب تک اس کی روشنی میں عملی مطالعہ نہ کیا جائے۔

سوال: فکشن میں ہمارے ہاں افسانہ جبکہ مغرب میں ناول مقبول ہوا اس کی وجہ آپ کے خیال میں کیا ہے؟ کیا یہ صورتِ حال ہمیں عالمی ادب کی مین سٹریم سے الگ نہیں کر رہی؟

جواب: ہمارے ناول نہ لکھے جانے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ادیب پارٹ ٹائم ادیب ہے جبکہ ناول کے لیے ہمہ وقت ادیب ہونا ضروری ہے۔

سوال: کیا یہ سچ ہے کہ آپ تخلیقیت کے اعتبار سے افسانے پر انشائیے کو فوقیت دیتے ہیں۔ براہِ کرام اپنے موقف کی وضاحت فرمادیں۔

جواب: میری بات کو سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے دیکھا گیا ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ اپنی لطافت کی وجہ سے انشائیہ مستقبل میں اور زیادہ مقبول ہوگا۔

سوال: اسلام آباد کی ادبی فضا کے بارے میں آپ کی تفصیلی رائے؟

جواب: وہی جو ملک کے باقی شہروں کی ہے۔

سوال: کیا معاصرین ادب کے درمیان موجود کشمکش ایک صحت مندرویہ ہے؟ بعض لوگ اس صورتحال کو Diversity is unity کہہ کر Justify کرتے ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اگر کشمکش اور اختلاف نظریاتی اور اصولی ہے تو یہ صحت مند ہے کہ اس سے بحث کے نئے دروازے کھلتے ہیں' لیکن اگر یہ شخصی ہے تو افسوسناک ہے۔

سوال: دنیائے ادب میں کس شخصیت کے کام سے آپ سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور اس کی کیا وجہ رہی؟

جواب: وزیر آغا سے' اس لیے کہ وہ ایک ایسے درویش ہیں جو خاموشی سے اپنا کام کر رہا ہے۔ مستقبل تو بعد کی بات ہے۔ بہت سے از خود عظیم لوگوں کا زوال ان کی اپنی زندگی میں ہی شروع ہوگیا ہے۔

سوال: قدرت اللہ شہاب صاحب کی خودنوشت ''شہاب نامہ'' اور آپ کی تصنیف ''تمنا بے تاب'' میں اندازِ تحریر کے لحاظ سے فرق یا مماثلت کا کونسا رشتہ ہے؟

جواب: خود مختلف ہیں کہ دونوں لکھنے والے' ان کے تجربات' زندگی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

سوال: لوگ آپ کو اچھا دوست سمجھتے ہیں' یا اچھا اُستاد اور والد یا خاوند؟

جواب: اس کا جواب تو لوگ ہی دے سکتے ہیں۔

کچھ انشائیہ کے بارے میں۔۔۔ڈاکٹر رشید امجد

''۔۔۔سلیم آغا کے انشائیوں کے مجموعہ ''سرگوشیاں'' پر بات کرتے ہوئے مَیں نے کہا تھا کہ انشائیہ' آج کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ اظہار ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انشائیہ مستقبل میں اظہار کا سب سے اعلیٰ ذریعہ ہوگا تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں' وجہ یہ کہ جدید عہد میں جو اُلجھاؤ اور باریکیاں زندگی کا حصہ بن گئی ہیں۔ ان کا اظہار ہیئت کے جبر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ شاعری' افسانہ اور دوسری اصناف میں خیال کو تکنیک کے اتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات اس کی اصلیت اور نزاکت ہی غائب ہو جاتی ہے انشائیہ میں خیال تکنیک کو بہاؤ میں لے کر چلتا ہے اور خیال نہ صرف اپنی نزاکتوں کے ساتھ اپنی اصلیت برقرار رکھتا ہے بلکہ پڑھنے والے کو ایک ازلی مسرت اور سچائی سے بھی ہمکنار کر دیتا ہے۔۔۔''

[مضمون: ''کچھ انشائیہ کے بارے میں'' مطبوعہ ''انشائیہ اور جدید اُردو انشائیہ'' مرتبہ اکبر حمیدی سے مقتبس ستمبر ۱۹۹۱ء' ص: ۵۰' ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان]

اردو فکشن: سمت و رفتار

(اردو کے مشہور افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی اور اقبال جمیل سے ایک مختصر گفتگو)

پروفیسر مشتاق احمد

سوال: ان دنوں ہندستان میں جو فکشن لکھا جا رہا ہے، کیا وہ تسلی بخش ہے؟

ذوقی: تسلی بخش؟ کہیں سے بھی نہیں۔ سب سے پہلا سوال تو یہی ہے کہ ہندستان میں 'اردو میں انگلیوں پر گنے جانے والے چند لوگ ہی ہیں' جن کی بمشکل سال' دو سال میں ایک یادو کہانیاں' وہ بھی کمزور کہانیاں منظر عام پر آ جاتی ہیں۔ نئی نسل کا آنا' اردو فکشن میں کب کا رک چکا ہے۔ لے دے کر ابھی بھی کچھ پرانے لوگ ہی ہیں جو ڈھنگ کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ نئے لوگوں میں سیاست زیادہ ہے۔ اور آپ بخوبی واقف ہیں کہ سیاست کبھی کسی کو بڑا فنکار نہیں بناتی۔

اقبال جمیل: میں آپ سے معذرت کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے خیال میں آپ کا سوال کچھ نامناسب سا ہے۔ 'تسلی بخش' کس معنی میں؟ کس کے لیے؟ کس پیمانے سے؟ میں کسی پر فیصلہ سنانے کا کیا حق رکھتا ہوں؟ صرف اپنی ناقص رائے کا اظہار کر سکتا ہوں' اور وہ یہ ہے کہ جس زبان کو بولنے' پڑھنے اور لکھنے والوں کی اکثریت کا شمار ملک کے سب سے پسماندہ اور کم تعلیم یافتہ طبقوں میں ہوتا ہے اس زبان کے فکشن لکھنے والوں کی اکثریت میں معیار کی تلاش گھوڑے کے آگے گاڑی لگانے جیسا ہوگا۔ اگر اردو اور اردو ادب کے خیر خواہ ہیں تو اردو والوں کے معاشی' سیاسی اور تعلیمی Environment پر دھیان دیں اور یہ بالکل سیاسی مسئلہ ہے۔

سوال: ابھی آپ نے ادبی سیاست کا ذکر کیا؟ تو آپ بتائیں گے' کس نوعیت کی سیاست؟

اقبال جمیل: ادب کی سیاست زیادہ خطرناک ہے۔

ذوقی: وہی عرض کر رہا ہوں۔ سن ۲۰۰۴ء سے میں نے سیمناروں میں جانا بہت کم کر دیا۔ اب تو سن ۲۰۰۵ء میں' میں کسی بھی ادبی سیمنار میں شامل نہیں ہوا۔ یہ 'سیاسی' چہرے سرکس کے مسخرے ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ ہم ادبی سیاسی چہرے شاطر اور خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ میں ان سب میں' نام نہیں لوں گا' جارج اُرویلی کے بگ برادر کو دیکھ رہا ہوں۔ سوچتا ہوں۔ ہم کس عہد میں آ گئے ہیں۔ یہاں اچھا لکھنے کے لیے ریس نہیں ہے۔ ریس اچھا لکھنے کے لیے ہوتی تو مزہ آتا لیکن یہاں تو منٹوں میں خود کو شہرت کی بلندیوں پر دیکھنے کا نشہ ہے۔ غضنفر سے می نار کے بہانے سرکاری پیسوں کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ اکادمیاں' ساہتیہ اکادمی اپنے اپنے رول اور بھومیکاؤں کا مذاق اڑا رہی ہے۔ لیکن کون روکے گا انہیں؟ جو بڑے عہدے پر ہے' وہی بڑا فنکار ہوگا' اس جھوٹ کو عام قاری میں مسلط کرنے کی ناجائز کوشش کی جا رہی ہے۔

اقبال جمیل: یہ صحیح ہے لیکن مجھے کہنے دیجئے۔ ہندستان میں اردو زبان اور ادب کا المیہ ہے کہ یہ باہر اور اندرونی دونوں طرح کی سیاست کے مارے ہوتے ہیں۔ باہر والے تقسیم ہند کے بعد سے اردو کو مسلمانوں کی زبان مان کر اس کا تقریباً گلا گھوٹ چکے ہیں۔ اور اندر والے اپنی ذاتی مادی اور نفسیاتی تسکین کے لیے اردو کے تعلیمی اور ادبی بہبود کو سولی چڑھانے سے لمحہ بھر کے لیے نہیں ہچکتے۔ جس دن اردو کا کوئی کہانی کار اردو پڑھنے والوں (جن کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے) اس اپنی تھوڑی بھی پہچان بنا لیا ہے وہ اپنی اوقات کے مطابق یا تو ناخدا بن بیٹھتا ہے اور اپنا گروہ بنا لیتا ہے یا کسی کو اپنا ناخدا بنا کر اس کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے اور اپنے اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے حصول کی جدو جہد ہی نصب العین رہتا ہے۔ اردو کے مستقبل کے لیے مگر مچھ کے آنسو بہانے کا سلسلہ صرف پبلک میٹنگوں اور سیمناروں تک ہی محدود رکھا جاتا ہے۔

سوال: آپ کی باتیں سر آنکھوں پر۔ کیا اس سے باہر امید کی کوئی کرن آپ کو نظر آتی ہے۔

ذوقی: امید۔ ہارتے ہارتے۔ کہیں ایک Positine سا احساس رہ جاتا ہے۔ ایسا ہوگا۔ ایک دن ایک دن یہ دنیا بدل جائے گی۔ اردو کا نظام ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ایسی کسی خوشگوار تبدیلی کی امید کسی یوٹو پیا سے زیادہ نہیں لگتی۔ کیونکہ یہاں سارے خوش فہمیوں کے پل پر سوار ہیں۔ اور حیرت سی بات پر ہوتی ہے کہ جیسا آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے' آپ تہی دامن ہیں تو پھر یہ خوش فہمیاں کیسی؟ نئی نسل میں کچھ لوگ بہت آرہے تھے۔ صغیر رحمانی' شمین حیات' زیب اختر' یہ لوگ بھی اپنی اپنی مصروفیت کا شکار ہو گئے۔ ہاں' امید کے چراغ بالکل مدھم نہیں ہوئے ہیں عبد الصمد کے نئے ناول دھمک نے ایک نئی جوت جگائی ہے۔ دراصل اس ناول کو آزادی' بابری مسجد' گودھرا سانحہ کے پرسپیکٹو میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ بلیغ اشارے ہیں۔ یہ ناول دو گز زمین سے بلاشکر و شیہ آگے کا سفر ہے۔ پروفیسر جابر حسین نے ادبی ڈرائی کی صورت میں فکشن میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ میرا جیسا آدمی جو دولت ورش' مسلم ورش اور استری مرش سے خوف کھاتا ہے' اس نے بھی پروفیسر جابر حسین کی ان کہانیوں کے آگے سر جھکایا۔ چھوٹی چھوٹی زندگیاں چھوٹے چھوٹے خوبصورت اشارے۔ خوشی اس بات پر ہوئی کہ ہمارے دوست رار دھاری سنگھ دوا کرنے ان کہانیوں کی از سر نو شناخت کی اور جابر کے فن پر ایک مربوط و مبسوط کتاب کا حق ادا کر دیا۔ سلام بن رزاق' علی امام نقوی' خالد جاوید' اشرف' شوکت حیات' آپ فہرست سازی کرتے ہیں تو بمشکل چند نام انگلیوں پر آکر ٹھہر جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ کہانیوں کے نام پر اردو قارئین کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی حال میں ناوک حمزہ پوری کا ایک خط غضنفر کے ناول کے بارے میں پڑھا خود میرا بھی یہی خیال ہے۔ زبان میں مکالمہ ہونا چاہئے' اس لیے کہ ہمارے درمیان زیادہ تر لوگ جو زبان لکھتے ہیں وہ سرے سے فکشن کی زبان ہے ہی نہیں۔ اب ایک نئی روایت اور شروع ہوئی تو پیغام آفاقی اپنے مکان کو لے کر دلی سے بمبئی تک اپنے خرچ پر سے می نار کرتے رہتے ہیں۔ ان سے آپ بھیشم ساہنی کی موت پر بولنے کو کہیں گے تو وہ مکان کا ذکر اٹھا کر لے آئیں گے۔ مکان ایک کمزور سا ناول ہے جسے یار دوستوں نے پیغام کی محبت میں اچھال دیا۔ اب ان خوش فہمیوں سے باہر نکل کر آئینہ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ آپ سچائی کی بات کریں گے تو پھر آپ اکیلے رہ جائیں گے۔ تمام دوستوں سے آپ کے رشتے منقطع ہو جائیں گے۔ کیونکہ سچ کوئی بھی سننا نہیں چاہتا۔ جبکہ یہ سچ یقیناً اُن کی بھلائی کے لیے بولا جارہا ہے۔ امید کی کرن یہ ہے کہ اکادمیاں اپنا اپنی کھیل' کھیل رہی ہیں۔ ساہتیہ اکادمی اپنا کھیل' اور اردو اکادمی اپنا کھیل۔ دلی اردو اکادمی جوکروں کا اڈا بن گئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ م۔ افضل جیسے سیاسی لوگوں کو ایسی کرسیاں کیوں دی جاتی ہیں جہاں ارتضیٰ کریم جیسے لوگ اُن کی خوشامد میں صرف اپنے حصہ کی روٹیاں سینکنے میں لگ جاتے ہیں۔ آپ کوئی بات برداشت نہیں کرسکتے' کچھ بات سن نہیں سکتے اور محض اپنی من مانی کیے جارہے ہیں۔ ایسی صورت میں جب دلی کا یہ حال ہے تو آپ اردو کے لیے اکادمیوں سے بھی کوئی امید نہیں کرسکتے۔ زیادہ ضروری ہے کہ ہم اس فالتو سیاست سے الگ صرف اور صرف اچھا لکھنے پر دھیان دیں۔ کیونکہ بس یہی چند باقی اور زندہ رہے گی۔

اقبال جمیل: میرا خیال ہے کہ اردو کا مستقبل اگر آپ اردو کی روٹی کھار ہے مافیاؤں' گروہوں اور سیاست دانوں میں تلاش کریں گے تو بہت ناامیدی ہوگی۔ یہ بہت جلد اردو کو پوری طرح دفن کرنے کے بعد اس کا مزار بنا کر اس پر مجاور بن کر بیٹھ جائیں گے اور اردو سے جڑا نیا اور زیادہ منافع بخش پیشہ اپنالیں گے۔ اردو کا مستقبل اردو کو آج کے تقاضوں کے مطابق ایک زندہ اور عوامی زبان بنانے کے عمل کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جو عام آدمی کی تعلیمی' اقتصادی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ مگر آج کے زمینی حالات ان مقاصد کے حصول کے لیے کافی ناسازگار نظر آتے ہیں کیونکہ بھی زبان ایک تہذیب اور تمدن کی پیداوار ہوتی ہے اور اگر وہ ملک اور سماج کے بدلتے ہوئے حالات سے قدم نہ ملا سکے تو اسے مصنوعی طور سے زندہ نہیں رکھا جاسکتا۔ اردو کی امیدیں صرف اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر کسی لائحہ عمل کی تشکیل سے جوڑی ہوئی ہیں۔

سوال: اچھا یہ بتائیے' ان دنوں آپ نے جو کچھ پڑھا' اُس میں آپ کو کچھ تو اچھا لگا ہوگا یا پسند آیا ہوگا۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے آپ Entremist ہیں لیکن اردو دنیا کے تمام لوگ یہ بھی قبول کرتے ہیں کہ آپ اپنے چھوٹوں کو بھی باقاعدہ پڑھتے رہتے ہیں۔ تو ان دو برسوں' پانچ برسوں میں آپ نے کچھ تو نہیں پڑھا ہوگا۔

ذوقی: اس طرح امتحان مت لیجئے۔ دنیا بھر کی خیریت ذہن پر حاوی رہتی ہیں۔ جوگندر پال کو یا میرے نے متاثر کیا۔ ابھی حال میں دنیا زاد میں خالد جاوید کی ایک نئی کہانی آئی ہے۔ کاش اچھے ٹریٹمنٹ کے وقت خالد کے دماغ میں شمس الرحمٰن فاروقی حاوی نہ ہوتے۔ میں خالد کو دوست مانتا ہوں۔ اور ہم عصروں میں ہیں سے باوزن افسانہ نگار۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ انہیں کمروں میں بٹھانا چاہیں تو سب سے پہلے مخالفت کا سر بھی' میں ہی بلند کروں گا۔ خالد کے یہاں امکان کی ایک بڑی فضا ہے۔ وہیں اپنی کہانیوں میں وہ ایک ہی طرح کے ٹریٹمنٹ کا شعار ہو رہے ہیں۔ کہانیوں کا دائرہ بھی سمٹ سمٹ کر ایک ہی دائرے میں گھوم رہا ہے۔ کاش کہ وہ اپنے آپ کو سمجھیں تو ہمیں ایک اچھا اور بڑا افسانہ نگار ملے گا۔ ان کی اب تک کی کہانیوں میں تفریح کی ایک دولہر مجھے سب سے زیادہ پسند آئی ہے۔ ترنم ریاض کی طویل کہانی سورتی کا خیال بہت عمدہ ہے اور اس کہانی کو خوبصورت ٹریٹمنٹ اور زبان کی فنکاری بھی نصیب ہوئی ہے۔ سلام بھائی اور علی امام نقوی کا میں شروع سے مداح رہا ہوں۔ اشرف کی کئی کہانیاں مجھے بے چین کرتی ہیں۔ میں نے لکھا بھی ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ غلط طریقے سے استعمال نہ ہوں۔ اپنے آپ کو غلط طریقے سے ادب کا سوپر ماڈل بننے کے لیے پراجیکٹ نہ کریں۔ پرانے لوگوں میں ابھی شفیع جاوید کا ایک خوبصورت مجموعہ آیا ہے۔ کئی کہانیوں کے جملے نے مجھے ہر طرح متاثر کیا۔ شفیق حیات کو ایک کہانی گودھرا میں مباحثہ پر پڑھی تو جو مجھے پسند آئی۔ علیم کا ناول اچھا تھا۔ کئی نام اس وقت ذہن میں محفوظ ہیں مگر یاد نہیں آرہے ہیں۔ میں پڑھتا سب کو ہوں۔ میں دشمن کسی کو نہیں سمجھتا۔ چاہتا ہوں' کوئی بھی آکر اپنی کسی نئی کہانی مجھے خوش کردے۔ کوئی اچھی چند پڑھ لیتا ہوں تو بچوں کی طرح خوش ہو جاتا ہوں۔ اور ساری دنیا میں اس کا ڈنکا بھی پیٹتا رہتا ہوں۔ مگر بتایئے ایسی چند ہی اب کہانی آرہی ہیں۔ صغیر اعجاز کے ایک ناول ہند میں لکھا۔ اردو میں بہت آیا۔ ہند میں نوٹس نہیں لیا گیا۔ اردو میں آتا تو ایک معرکہ کی چیز ہوتی۔ مشتاق احمد نوری کی کہانی لمبے قد والا بونا اور مچھر دانی' شمائل احمد کی کئی کہانیاں۔ حسین الحق کے آتم کتھا' لیکن یہ برسوں پرانی بات ہوگئی۔ اس کہانی کا مجھ پر آج تک اثر ہے۔

اقبال جمیل: میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہ سوال اٹھایا۔ میری باتوں سے یہ قطعی اندازہ نہ لگائیں کہ میں اردو سے ناامید ہوں۔ اردو میں اچھا فکشن لکھا جارہا ہے۔ مگر پچھلے سالوں میں لکھے گئے فکشن کے تنقیدی جائزے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے اس معیار کا تعلق سیدھی طرح سے لکھنے والوں کی تعلیمی قابلیت اور فکری بلندیوں سے جڑا ہوا ہے ذوقی نے جن لوگوں کے نام لیے وہ بلاشبہ اردو کے موجودہ دور کے اہم اور لگاتار لکھنے والے ہیں۔ مگر شاید جو بات وہ کہنے سے چوک گئے ہیں وہ میں جوڑنا چاہوں گا کہ ذوقی ہندوستان میں اردو ادب کے وہ فکشن لکھنے والے ہیں جو سب سے زیادہ منظر عام پر رہے ہیں اور خوب رہے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتانا چاہتا ہوں ہندوستان سے باہر شاید اردو والوں کا تعلیمی اور شعوری معیار زیادہ بہتر ہے خاص طور سے وہ لوگ جو برصغیر سے باہر بس گئے ہیں جن میں اشرف شاد اور مصطفی کریم یہاں پر قابل تذکرہ ہو سکتے ہیں۔

سوال: آخر میں' اردو ادب کی اس سمت و رفتار کا تعین کرتے ہوئے ہم ایک بار پھر آپ سے جاننا چاہیں گے کہ کیا حقیقتاً امید کی کوئی کرن روشن نہیں۔ یا سمجھ لینا چاہیے کہ اردو ادب مر چکا ہے۔

ذوقی: بالکل نہیں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ صورتحال افسوسناک ہے تو ایسا کہتے ہوئے خود مجھے بھی صدمہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اسی اندھیرے سے میں اپنے ادب کا چراغ روشن کرنے میں مصروف ہوں۔ لینڈ اسکیپ کے گھوڑے سے پوکے مان کی دنیا اور پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی تک۔ ابھی میں ہوں۔ اور بھی دوسرے دوست اور ساتھی ہیں۔ شمائل' شوکت حیات' حسین الحق' مشتاق احمد نوری' اشرف' خالد جاوید' محسن کھو گئے۔ ایک اچھا افسانہ لکھنے والا گم ہوتا جارہا ہے۔ سہیل کو سیاست سے الگ ادب کرنے کی ضرورت ہے۔ ممبئی کے کئی لوگ ہیں۔ ادھر شاعر میں انور قمر کی ایک اچھی کہانی پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ممبئی کو نئی نسل سامنے آئی ہے۔ ایم حسین' اشتیاق سعید' اور کئی اچھا لکھنے والے۔ ادھر ایک نام ...... سے اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ رحمان عباس' امتیاز کے ذہین اور اور بڑا سوچنے والا۔ کمال کا ناول لکھا۔ ممبئی میں ہنگامہ مچ گیا۔ مگر باقی اردو دنیا خاموش رہی۔ اور جہاں تک روشن مستقبل کا سوال ہے' اردو پرنٹ میڈیا سے گم ہو رہا ہے' انٹرنیٹ کے آسمان پر چھا گئی ہے۔ ہندی کی دوا میں ادبی سائٹ سے زیادہ میری معلومات نہیں ہے۔ شاید ہی ...... مگر اردو۔ ایک سے بڑھ کر ایک ادبی رسالہ۔ اس لیے امید کا

چراغ جلاتے رہیے۔اردو کو بار بار شیریں زبان ہونے کی گالی مت دیجئے۔اسی ستیہ رہنیت نے اسے زمانے اور اپنی ممبئی سے کاٹ دیا ہے۔ اسے جابر حسین کی طرح .... مٹی سے جوڑیے۔ فاروقی کی طرح اردو کو ابھی تک فارسی کے دائرے میں محدود مت رکھیے۔ اردو کو کھلا آسمان دیجیے اور یقیناً نئے دھماکے ہوں گے۔ابھی ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں۔طوفان ذرہ موسم بس گزرنے والا ہے۔ہم پھر ایک روشن مستقبل کی ضمانت بن جائیں گے۔

اقبال جمیل: جناب جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ زبان اور ادب کی موت ثقافتوں اور تہذیبوں سے جڑی ہوئی ہے۔اردو ہماری تاریخ میں ایک ملی جلی' گنگا جمنی تہذیب کی دین ہے۔ جہاں پر آپسی میل جول' ثقافتی لین دین اور ایک عوامی تال میل بغیر کسی روک ٹوک کے تایا۔مگر بدقسمتی سے پچھلی نصف صدی سے زیادہ عرصے سے یہ قدریں لگاتار سکڑتی جا رہی ہیں اور افراد میں ذہنی کشادگی اور سماج میں آپسی برداشت کا مادہ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔مثالیں برصغیر کے تعلق سے ہر روز اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ایک سیکولر اور مہذب سماج جو مختلف ثقافتی اور تہذیبی دھاروں برابری اور باہمی عزت کے یک جا کر سکے اردو کی بقا کی پہلی شرط ہے۔

مشرف عالم ذوقی صاحب نے یہ انٹرویو خود کمپوز کرا کے / کر کے ہمیں بذریعہ انٹرنیٹ بھیجا تھا' جسے سعادت سمجھتے ہوئے من وعن پیش قارئین کیا گیا ہے۔متن میں بعض اغلاط کمپوزنگ کی ایسی ہیں کہ مفہوم واضح نہیں ہوتا۔اس سلسلے میں ذوقی صاحب کی خدمت میں بذریعہ ای میل یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ ان اغلاط کی درستی کے بعد فائل بھیجیں لیکن وہ درست دستاویز ہمیں موصول نہیں ہوئی۔ بیرونِ ملک رہائش پذیر قلمکاروں سے خاص طور پر درخواست ہے کہ ''حریم ادب'' کے لیے ارسال کرنے سے پہلے وہ اپنی تحریروں کو اچھی طرح پڑھ لیا کریں' تاہم اگر وہ کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکتے ہوں تو ہمیں درج ذیل ای میلز میں سے کسی ایک پر اسی ای میل ایڈریس سے درستگی کے لیے کہیں' جس سے اُنہوں نے فائل بھیجی تھی۔تحریریں ''اُردو ان پیج'' سوفٹ ویئر سے خطِ نستعلیق میں کمپوز کرا کر بھیجیں۔شکریہ

hareem_e_adab2@yahoo.com

hareem_e_adab2@hotmail.com

hareemeadab@gmail.com

''ترا عکس آئنوں میں'' پر ایک نظر

ناصر عباس نیر

''ترا عکس آئنوں میں'' ڈاکٹر زاہد منیر عامر کا شعری مجموعہ ہے' جس میں چند غزلیں اور بیشتر نظمیں ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے مطالعے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کے شعری وجدان کو غزل سے زیادہ نظم سے مناسبت ہے۔ ان کا شعری وجدان حقیقت کو قاشوں میں منقسم کر کے دیکھنے کے بجائے' حقیقت کے کل کو گرفت میں لینے پر مائل زیادہ نظر آتا ہے' اور اس کے لیے نظم کا پیرایہ ہی موزوں ہے' غزل حقیقت کا تصور اجزا کی صورت کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ہر جزو کو کل یا اس کے قائم مقام کے طور پر دیکھتی ہے' جب کہ نظم حقیقت کا ایک ایسا کلی تصور قائم کرتی ہے جو ہر چند اجزا سے عبارت ہوتا ہے' مگر جن میں نامیاتی ربط ہوتا ہے۔

حقیقت کے دو رُخ ہیں: ظاہری اور باطنی یا حسی اور تجریدی۔ یہ بنیادی سوال ہے کہ آیا حقیقت واقعی اسی ثنویت کا شکار ہے یا ہمارے ادراک کا عمل اور آلہ اسے اس طور گرفت میں لیتا/لے سکتا ہے؟ فلسفے میں تو حقیقت کو ثنویت میں مبتلا تسلیم کیا گیا ہے۔ مثلاً افلاطون نے ایک کو اعیان اور دوسرے کو مظاہر کہا' کانٹ نے ایک کے لیے Being اور دوسرے کے لیے Becoming کی اصطلاحات استعمال کیں اور سارتر نے In-itself اور For-itself کی مدد سے حقیقت کے دُورخوں میں امتیاز کیا۔۔۔ جب کہ جدید لسانی فلاسفہ اور ادبی نقادوں (بالخصوص اے۔ جے۔ گریماس) کا خیال ہے کہ ہمارا لسانی شعور شے کا ادراک اس کی ضد قائم کر کے کرتا ہے۔ گویا ثنویت شے میں نہیں' ہمارے لسانی ادراک میں ہے۔ زبان اشیا' اسما' صفات اور کیفیات کو اضدادی جوڑوں میں تقسیم کرتی ہے۔ تاکہ ان میں فرق کیا جا سکے۔ فرق کے بغیر شناخت ممکن نہیں۔ یوں بھی نئی لسانی اور فلسفیانہ فکر افتراق کو بنیادی اہمیت دیتی ہے اور اسے معنی یابی کی لیے لازم قرار دیتی ہے۔ یہاں اس بحث کو اُٹھانا مناسب ہے' نہ ممکن کہ جدید لسانی فلاسفہ درست کہتے ہیں یا دیگر فلسفیوں کا خیال ٹھیک ہے۔ اس بحث کو اُٹھانے کے لیے اوّلاً یہ طے کرنا ضروری ہے کہ شے اور اس کے ادراک میں کیا رشتہ ہے اور ادراک کتنا خالص اور کتنا 'لسانی' ہوتا ہے؟ اور اس کا متحمل یہ تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وجہ خواہ کوئی بھی ہو حقیقت ہمارے روزمرہ شعور اور روزمرہ تجربے میں ثنویت کی صورت میں آتی ہے۔

زاہد منیر عامر کا بنیادی شعری مسئلہ حقیقت کے دونوں رُخوں میں ہم آہنگی کی تلاش ہے اور یہ تلاش دو سطحوں پر ممکن ہوتی ہے۔ ایک سطح پر حس اور ورائے حس میں ہم آہنگی دریافت کی جاتی ہے۔ دونوں کے بیچ حایل نقاب کو اُلٹ دیا جاتا ہے' جس کا ثمر مسرت ہے اور دوسری سطح وہ ہے جب ہم آہنگی پیدا کی جاتی ہے اور یہ اس وقت ممکن ہوتا ہے' جب تضادات حل ہو جاتے ہیں۔ تھیسس اور اینٹی تھیسس ایک نئے سنتھیسس کو جنم دیتے ہیں۔ اس کا صلہ حیرت ہے۔ اس طور فن کی بھی دو سطحیں ہیں۔ مسرت اور حیرت!

زاہد منیر عامر کی نظموں میں بالعموم پہلی سطح ظاہر ہوئی ہے اور انہوں نے اپنے نظموں میں اُس چمکتے لمحے کو علی العموم گرفت میں لینے میں کامیابی حاصل کی ہے' جس میں ظاہر اور باطن کے درمیان حائل پردہ ہٹ گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ صوفیانہ تجربہ نہیں' شاعرانہ/جمالیاتی تجربہ ہے۔ صوفی اپنے تجربے کے اظہار میں دلچسپی نہیں رکھتا' مگر شاعر کا تو تجربہ ہی اظہار سے مشروط ہوتا ہے۔

زاہد منیر عامر کی نظم اندر اور باہر میں جس ہم آہنگی کی دریافت سے عبارت ہے۔ وہ استعارہ سازی کے ذریعے ممکن ہوئی ہے۔ شاید اس لیے کہ استعارہ غیر عمومی مماثلتوں کو دریافت کرنے کا نام ہے۔ نیز اگر شاعر کا تجربہ ہو ہی روزمرہ سے ہٹ کر تو استعارے کے بغیر چارہ نہیں۔۔۔ زاہد منیر عامر حقیقت کے ظاہری/حسی رُخ کے لیے کئی استعارے لاتے ہیں (کہ یہ رُخ تنوع اور کثرت کا حامل ہے) مگر مرکزی استعارہ' ستارہ ہے جب کہ حقیقت کے داخلی رُخ کے لیے وہ تمنا کا استعارہ لاتے ہیں۔

ان استعاروں کے انتخاب کا معاملہ بڑی حد تک لاشعوری ہے۔ پیش نظر رہے کہ لاشعوری انتخاب کا مطلب اتفاق نہیں بلکہ ان میں ایسے

منطقی روابط ہوتے ہیں‘ جواز خود پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ روابط ان دونوں استعاروں کے ضمن میں اور ان کے درمیان بھی موجود ہیں۔

چند نظموں کے ٹکڑے دیکھئے‘ جن میں مذکورہ استعارے آتے ہیں۔

ذرا دیکھو گزرتے روز و شب کو

ہر اک لمحہ ستارہ ہے

اگر تسخیر ہو جائے تو ہر لمحہ تمہارا ہے

تمہارے خوبصورت ہاتھ میں کتنے ستارے ہیں

انھیں تسخیر کر لو تو تمہاری مانگ میں یہ سب ستارے جگمگائیں گے

ستارے اور آئیں گے

(محبت امتحاں ہے)

آسمانوں پہ ستاروں نے کہا

برسر خاک یہ کیسی ہے کرن؟

کوئی افتادہ ستارہ ہے‘ ارم ہے کہ چمن؟

کون ہے‘ جس کی چمک ماند کیے دیتی ہے

سر افلاک ہمارا جوبن

(کون ہے تو۔۔۔؟)

مری تمنا کی انجمن میں

تمہاری خوشبو بسی ہوئی ہے

ستارے تو جھلملا رہے ہیں

مگر میں بارش میں بھیگتا ہوں

(مری تمنا کی انجمن میں)

تمنا نارس خوشبوو۔۔۔ تم بھی حسیں ہو

کئی آنگن تمہارے منتظر ہیں

تمہیں نارس تمناؤں کی مٹی میں بہت سے خواب بونے ہیں

تمہیں آکاش سے اُترے ہوئے روشن ستارے بن کے اب

اپنے دریچوں میں۔۔۔ مہکنا ہے

لہکنا ہے

(تمنا نارسیدہ خوشبوؤں کے نام)

ستارے میرے مُونس ہیں

بہت تاریک راتوں میں مرے ہمراہ چلتے ہیں

مری افسردگی کو دیکھ کر‘ افسردہ ہوتے ہیں

مجھے جب قعرِ غم میں ڈوبتا دیکھیں

تو مجھ پر مسکراتے ہیں

مجھے باہر بلاتے ہیں
اندھیرے لاکھ ہوں لیکن
ستارے جگمگاتے ہیں
مجھے رستہ دکھاتے ہیں

(ستارے میرے مُونس ہیں)

طوالت کے ڈر سے مزید اقتباسات نہیں دیے، وگرنہ متعدد دوسری نظموں میں بھی ستارے اور تمنا کا ذکر بہ تکرار آیا ہے۔ جس کا صاف مطلب ہے کہ شاعر کا کوئی گہرا تخلیقی رشتہ ان دونوں سے ہے اور تخلیقی عمل کا مطلب اگر کسی گہری تاریک غار سے باہر آنے کی جدوجہد ہے تو یہ دونوں استعارے' چراغ بن کر شاعر کی رہبری کرتے ہیں۔ نفسیاتی زاویے سے دیکھیں تو ہر استعارہ' بنیادی طور پر ایک امیج ہوتا ہے' کسی ناقابلِ بیان کیفیت/ حالت کی تجسیم ہوتا ہے۔ ناقابلِ بیان کیفیت ذہن کی بحرانی حالت ہوتی ہے' استعارہ اس حالت سے نجات کا سبب ہوتا ہے کہ یہ زندگی کی 'جسمیت' سے آدمی کا رشتہ جوڑتا ہے اور ہر اوریجنل شاعر تخلیقی عمل کے دوران میں' حالتِ بحران سے گزرتا ہے۔ لہٰذا استعارہ سازی (اور اس سے آگے بڑھ کر علامت سازی) کا عمل اس کے یہاں ضرور واقع ہوتا ہے' مگر مخصوص استعاروں کا انتخاب شاعر کے انفرادی طرزِ احساس پر روشنی ڈالتا ہے۔۔۔ زاہد منیر عامر کے یہاں ستارے اور تمنا کے استعارے ان کے جس طرزِ احساس پر دلالت کرتے ہیں' وہ دراصل باہر اور اندر میں ہم آہنگی کی جستجو سے عبارت ہے۔

گزشتہ صفحے پر دیے گئے نظمیہ اقتباسات کو غور سے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ان میں ستارے کا ذکر مختلف تناظرات میں ہوا ہے' کہیں یہ آسمانی ستارہ ہے' کہیں آنسو ہے' کہیں (ایک چمکتا) لمحہ ہے' کہیں ایک رومانی تخیلی منظر کی روشنی ہے۔ ہر جگہ یہ استعاراتی مفہوم میں آیا ہے۔ بعض مقامات پر اس کا استعاراتی مفہوم وہی ہے جو اردو شاعری میں عام طور پر لیا گیا ہے' یعنی رہبر و رفیق کا مفہوم۔ تاہم اکثر مقامات پر شاعر نے اسے نئے (استعاراتی) مفہوم میں برتا ہے اور یہ نیا مفہوم وہیں پیش (بلکہ تخلیق) ہوا ہے' جہاں اسے تمنا سے جوڑا گیا ہے۔ اس ضمن میں ''ستارے ٹوٹتے کب ہیں'' اہم نظم ہے۔

اس نظم میں ستارے کو ہمیشگی کی ''علامت'' بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ستارہ اندر بھی ہے اور باہر بھی اور دونوں کو باہم منسلک کرنے والا بھی ستارہ ہے! ستارہ آنکھ میں ہے' دورِ فلک میں ہے' دشت و صحرا میں ہے' صحنِ گلشن میں ہے' محبوب کی آنکھ میں محبت کی جو چمک ہے' وہ ستارہ ہے اور دل میں تمنا کا جو بہتا دھارا ہے' وہ بھی ستارہ ہے۔ دوش و فردا تو اک فریب ہیں' ریگِ امروز حقیقت ہے' جس میں (امکانات) کے کتنے ستارے ہیں اور محبوب کی مانگ میں اور تمناؤں کی خوشبو سے مہکتی چاندراتوں میں بھی ستارے ہیں! لہٰذا ستارے ٹوٹتے ہیں (جیسا کہ کہا جاتا ہے) ستارے تو ہر جگہ ہیں اور ہمیشہ ہیں!۔۔۔ مگر اصل بات تو ستارے کو ہر جگہ دریافت کرنا اور اسے ہمیشہ تصور کرنا ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب یہ نظم دیتی ہے۔ اس حوالے سے نظم کے یہ مصرعے قابلِ توجہ ہیں۔

''تمناؤں کا دھارا بھی
کہ جس سے جزو وکل میں زندگی ہے
مسلسل رقص ہے' تابندگی ہے
رگِ جاں میں فروزاں ہے
فریبِ دوش و فردا ساعتِ امروز میں گم ہیں
ذرا دیکھو تو ریگِ ساعتِ امروز میں کتنے ستارے ہیں''

یعنی آدمی کے دل میں جب تمنا کا دھارا بہنے لگتا ہے تو اس پر کشف ہوتا ہے کہ جزو (آدمی) اور کل (کائنات) میں زندگی تو اسی کے سبب ہے اور زندگی کے اس نئے مفہوم کا کشف ایک زبردست تجربہ ہے' زندگی ایک رقصِ مسلسل اور تابندگی جاوداں لگتی ہے۔ ایک جشنِ فراواں اور روشنیِ مسلسل! اور اس کشف کی تجسیم' ستارے کے علاوہ اور کس امیج میں ہوسکتی ہے!

''نشاطِ ہجر'' ___ خوبصورت شعری تمثیل

اختر ہاشمی

ممتاز روسی دانشور ''چیخوف'' ادب کے حوالے سے تنقید کرنے پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تنقید گھوڑے کی ناک پر بیٹھنے والی ایسی مکھی کی طرح ہے جو اسے آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ شاید اس کا یہ خیال درست ہے کہ عموماً تنقید میں تنقید نگار کی جب پسند اور ناپسند شامل ہو جاتی ہے تو یقیناً ایسا ممکن ہے۔ مگر کسی شعری یا نثری تصنیف پر اظہار خیال کرتے وقت یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ تنقید کرنے والا شخص تنقید کی اصل یا بنیادی اصولوں سے واقف ہے یا نہیں۔ ایک تنقید نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی تصنیف سے متعلق معاشرتی' معاشی' سماجی اور اخلاقی حوالوں کے تناظر میں تصنیف کے تخلیقی ارتقاء کی منازل کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے کہ نہیں۔ کیونکہ مخلصانہ تنقید ادب کے نکھارنے سنوارنے اور مزید ثمر آور بننے کا سبب بنتی ہے جبکہ ذاتی پسند ناپسند کے جانبدارانہ اصول کی پیروی میں کی گئی تنقید دل شکنی اور حوصلہ فرسائی کا سبب بنتی ہے یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ ایسی تنقید دشمنی کے زمرے میں آتی ہے یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ ہر شخص خواہ وہ کسی بھی میدانِ عمل میں ہو انفرادیت ایک ایسا جبلی جذبہ ہے جو اس کے اندر موجود ہوتا ہے اور اس کے وجودی تشخص کا جواز بنتا ہے اکثر ہوتا ہے کہ بعض دفعہ جو بات ہم نے اپنے انداز سے کہی ہوتی ہے وہی بات کسی اور نئے اسلوب یا ڈھنگ سے کی ہوتی ہے یہی نیا انداز' نیا ڈھنگ' نیا اسلوب ہی جدت قرار پاتی ہے اور یہی اس شخص کو امتیاز بخشتی ہے اور اُسے یکتا کر دیتی ہے یہ عہد ''نشاطِ ہجر'' کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت اس لیے ضروری سمجھی گئی کہ شہناز نور شعری ادب کے حوالے سے خواتین شعراء میں ایک بڑا اور منفرد نام ہے جس نے طویل شعری ریاضت سے یہ مقام بنایا ہے یہ الگ بات ہے کہ ان کا شعری مجموعہ میرے خیال کے مطابق بہت پہلے چھپ جانا چاہیے تھا خیر نشاطِ ہجر کی مصنفہ شاعرہ شہناز نور نے مجھے اپنی کتاب بہت پیار سے عنایت کی چونکہ وہ حکومت سندھ میں ڈائریکٹر اطلاعات کے عہدہ پر فائز ہیں لہٰذا کتاب کا طباعت کے حوالے سے خوبصورت ہونا ایک قدرتی امر ہے تاہم جب مَیں نے شہناز کے اس شعری مجموعہ کی ورق گردانی شروع کی تو اس کی شاعری کے سحر نے مجھے یوں باندھ لیا کہ ایک ہی نشست میں کتاب پڑھ کر ہی دم لیا اور بیشتر اشعار تو ایسے چونکا دینے والے تھے کہ بار بار پڑھتا رہا اور ان کی معنویت کے اسرار تلاش کرنے میں سرگرداں رہا۔ آپ کو ایک بات اور واضح کرتا چلوں کہ شاعر اپنے خیالات اور فکر کے زاویوں کا تعین کرتے وقت کسی قسم کی شعوری کوشش نہیں کرتا بلکہ یہ خود بخود اس کی ذہن پر بارش کی طرح اُترتے ہیں اور شاعر کے ہر شعر کو نئے آہنگ اور نئے لسانی سانچوں میں ڈھالتے ہوئے اور نئی تراش خراش سے تخلیقی جذبہ سے ہمارے اندر نئے راستے بناتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس کی شعری شخصیت کے نکھار کا خوبصورت حوالہ بنتے جاتے ہیں اور یہی وہ اصل مقام ہے جب شاعری میں تاثیر پیدا ہوتی ہے اور یہی تاثیر شاعری کا سحر بن کر قاری کو اپنا اسیر بنا لیتی ہے ''نشاطِ ہجر'' کی شعری کیفیات بھی قطعاً اس سے مختلف نہیں ہیں۔ شہناز نور نے اپنی شخصیت اپنے وجود کو شاعری میں شامل کر کے ہی ایسا مجموعۂ کلام تخلیق کیا ہے جس میں دل' دماغ' روح' جذبہ اور فکر نے ایک آئیڈیل شخصیت کی تجسیم کی ہے۔ اس کی شاعری میں بے ساختگی' ادا' حُسنِ تخیل' نازکی تصور' وارداتِ قلبی کے ساتھ ساتھ تعمقِ جذبات کا خوبصورت امتزاج بھی موجود ہے اس حوالے سے ان کے چند اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

خود کو چھپا کے رکھا نہیں راز کی طرح — خوشبو کی طرح نُور بکھر بھی نہیں گئے

عجیب خوف ہے اندر کی خامشی کا مجھے — کہ راستوں سے گزرتی ہوں گنگناتے ہوئے

☆☆☆

کہہ رہا ہے یہ خوف اندر کا — بھول جاؤں نہ راستہ گھر کا

عجیب حال ہے اب نُور خانۂ دل کا — نا آشنا کوئی' نہ آشنا ٹھہرتا ہے

اور ایسے ہی سینکڑوں خوبصورت اشعار حسن لطافت کی مہک بکھیرتے ہوئے اس کے مجموعۂ کلام میں موجود ہیں جن کا اصل لطف ''نشاطِ ہجر'' کے مطالعہ سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جا بجا اس کی شاعری میں اس کے بیان کا بے ساختہ پن ہمیں نئے شعری تنوع اور نئے آہنگ سے متعارف کراتا نظر آتا ہے چند اور اشعار دیکھیے اور ان کی معنوی ہمہ گیریت کا مزہ لیجیے:

دستور محبت میں ترمیم سے پہلے — میں خوش تھی بہت اپنی تقسیم سے پہلے

دشوار تھا رہنا بھی سرِ شاخ تمنا — خوشبو کی طرح مجھ کو بکھرنا بھی نہیں تھا

لپٹی ہوئی قدموں سے تھی زنجیر انا کی — بے سمت مسافت تھی، ٹھہرنا بھی نہیں تھا

شہناز نور کا بے سمت سفر بھی اُسے اپنی انا کے خول سے باہر نہ لا سکا اور اس کے راستہ کی رکاوٹ بھی نہ بن سکا وہ اپنے دھیان میں آگے کی طرف اپنی منزل کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے اور موجودہ تاریخ شعر و ادب میں ایک معتبر اور مضبوط روایت کے طور پر سامنے آئی ہے اس کی شاعری اپنی معنویت اور موضوعات کے اعتبار سے اپنے اندر لامحدود جہتیں لیے ہوئے ہے اور نہ صرف خلوصِ جذبات کی آئینہ دار ہے بلکہ جدید و قدیم ادبی روایات کا ایک خوبصورت گلدستہ نظر آتی ہے شہناز اپنے کلام میں انسانیت کی بنیادی معاشرتی اقدار اور روایات کا اظہار اور ابلاغ جس خوبصورت پیرائے میں کرتی ہے میں سمجھتا ہوں اس سے انسانی معاشرتی مسائل کے منصفانہ اور مساویانہ حل کی راہ کا تعین آسان ہوا ہے بصورتِ دیگر روشن اور بہتر امکانات کا ظہور پذیر ہونا ممکن نہ تھا اور انسانی اصلاح کے فریضہ کی ادائیگی سے انصاف نہ ہو پاتا۔ کیونکہ کوئی شاعر یا ادیب ہی انسانی ذہن کو جلا بخش کر خودنگری اور خودشناسی کی منزل تک پہنچاتا ہے اور یہی خودشناسی انسان کو خداشناسی کے اسرار و رموز سے آگہی بخشتی ہے نشاطِ ہجر کی شعری روش بھی ایک مستقبل روشن کی آرزومند نظر آتی ہے اس کے خوبصورت خیالات آسمانِ شعر و ادب کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلی ہوئی نئے لہجوں، نئے فکری حوالوں کے چمکتے دمکتے ستاروں کی روشنی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ست رنگی قوسِ قزح کا روپ دھار لیتے ہیں۔ میں شاعری کے شعری رویہ میں کوئی فلسفہ فکر تلاش کرنے کی شعوری کوشش بھی نہیں کر رہا تصنیف کے فنی محاسن و معائب سے ہٹ کر ایک سچی اور کھری شاعرہ کے سچے دل کے اندر سچے جذبوں کی شعری کیفیات کو سمجھنے اور جانچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شاعرہ نے اپنی کتاب میں کسی بڑی تنقیدی شخصیت کی رائے کی بیساکھی بھی استعمال نہیں کی جب اس کا کلام اپنے قارئین سے بے ساختگی سے ہمکلام ہو سکتا ہے تو بھلا مانگے کے تیل سے دِیا جلانے کی کیا ضرورت ہے اور پھر پرتو ذات میں اس نے بخی بہادر شاہؒ جیسے اپنے جدِ امجد بزرگ کا ذکر کر کے بتا دیا ہے کہ جس گھر میں صدیوں سے ایسا دِیا روشن ہو وہ کسی اور روشنی کا محتاج کیسے ہو سکتا ہے پرتوِ ذات کی نثر بھی کسی طور شاعری سے کم اثر انگیز نہیں یہاں میں پرتوِ ذات سے بھی آگے کا مقام دیکھ رہا ہوں اور وہ ہے شعورِ ذات کا مقام۔ شعورِ ذات کا مقام حاصل کرنے کے لیے بڑے محتاط انداز میں دھیان کی سیڑھیاں چڑھنے کی ضرورت ہے ذرا دھیان اِدھر اُدھر ہوا دھڑام نیچے اور برسوں کی تپسیا ایک پل میں برباد لیکن شہناز نے دھیان کی ہر سیڑھی پر بہت سوچ سمجھ کر قدم رکھا ہے اور ذات کے ان رموز سے آگہی حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جہاں شعورِ ذات کی معراج اس کے لیے چشم براہ ہے اور اس نے بقولِ شاعر ''رانجھا رانجھا کردی نی میں آپ رانجھا ہوئی'' کی روحانی اور وجدانی کیفیات میں گزرگاہ بنالی ہے اور تن تنہا اس رزم گاہ مکر و فریب میں حوصلہ مندی سے مقابلہ پر اُتر آئی ہے شہناز اپنے اشعار میں جس طرح اپنی ذاتی زندگی کے تجربات کا نچوڑ بیان کرتی ہے اس سے زندگی کی بے ثباتی پر اس کا یقین اور گہرا ہو جاتا ہے کبھی کبھی تو وہ درد و کرب سے کراہتی ہوئی ایک عام سی حوا کی بیٹی محسوس ہوتی ہے مگر جب اس کے اشعار کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کریں تو وہاں وہ ایک جرأت رندانہ لیے ہوئے ایک ایسی شاعرہ نظر آتی ہے جو حوا کی بیٹی کی ترجمان ہو جسے طاقتور سماجی اور معاشرتی قوتوں نے ہمیشہ سے اپنے استحصالی ظلم کا شکار بنا رکھا ہے جو آج بھی مصائب اور ناانصافیوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنا سفرِ حیات جاری رکھے ہوئے ہے' یہ حوا کی بیٹی پر شخصی' اجتماعی' معاشرتی یا مذہبی حوالے سے ہونے والے مظالم کے خلاف ایک صحت مند اور توانا آواز ہے اور آسمانِ جبر پر حالتِ خوف میں ٹمٹمانے والے ستاروں کے لیے نئی روشنی کا سندیسہ ہے ''نشاطِ ہجر'' کی شاعری پڑھنے کے بعد دل و دماغ کے پنہاں گوشوں میں نئی فکری کمندیں پھینکنے کو جی چاہتا ہے اور ایک ایک شعر کی معنوی تفسیر کرنے کو جی چاہتا ہے مگر یہ بھی خیال سامنے ہے کہ آج کے قاری کے پاس صرف کمپیوٹر ڈسکس یا سی ڈیز دیکھنے کا وقت ہے مگر کوئی کتاب یا مضمون پڑھنے کے لیے وقت نکالنا جوئے شیر لانے سے ہرگز کم نہیں لہٰذا میں انہی نیک تمناؤں کے ساتھ ''نشاطِ ہجر'' کے بارے میں تنقیدی بحث سمیٹتے ہوئے کہوں گا کہ بلاشبہ یہ شعری مجموعہ شہناز

نور کا ایک ایسا روحانی اور وجدانی تجربہ ہے جو اُسے ہجر و وصال کے خطِ تفریق تک لے آیا ہے اور جہاں ڈوبتے سورج کو دیکھ کر زمین و آسمان کا فرق مٹ جاتا ہے نشاطِ ہجر کی ایک صحیح اور سچی تفسیر کے لیے اس منظر کا مشاہدہ بھی ضروری ہے اور یہی وہ اصل مقام آگہی ہے جہاں ہجر اور وصال کی تمام تر لذتیں ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔

طوفانوں میں ایک مَوج' ناصر شہزاد

''۔۔۔ناصر شہزاد کی یہ عجیب کیفیات سے بھرے ہوئے شعر غزل کی نئی نویکلی پھبن ہیں اس غزل سرا نے بڑی یکسوئی اور لگاوٹ کے ساتھ اس بارے میں برسوں سوچا ہے اور اس لہجے کو ڈھالا ہے' اس دوران میں انہوں نے اپنے گاؤں کی فضا سے باہر بھی جھانکا ہے' راولپنڈی اور مری کی خوبصورت پہاڑیوں اور شاداب وادیوں میں اس کی صبحیں جاگی ہیں اور شامیں آوارہ رہی ہیں۔ نئے حالات اور تغیرات پر بھی ان کی نظر ہے' غزل کے صد سالہ ادوار کا اُنہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے' جدید و قدیم اردو ادب پر بھی اُنہوں نے تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ شعر کے ساتھ ان کا دلچن عمر بھر کا ہے۔ شعر ہی ان کے دل کی دھڑکن اور ان کی روح کی طلب ہے۔ ادب کے نام پر مادی راحتوں کے لالچ کو بڑھاوا دینے والوں کے جمگھٹ ان دنوں قریہ قریہ لگے ہوئے ہیں' یہاں یہ ایک شاعر ہے جو اپنے شعر کے ساتھ ہمیشہ صادق رہا ہے اور اس قسم کی کوئی آلائش اس کے دامن کو داغدار نہیں کر سکی۔

مجید امجد ۲۸ اپریل ۱۹۶۸ء (ناصر شہزاد کے مجموعہ کلام ''بن باس'' سے مقتبس)

چھپن چھری

اس نے خود سچ کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ دیکھ سکتی تو سچ کی تلاش چھوڑ دیتی۔ مگر یہ تلاش اس کی زندگی کا محور ہے جو سچائی اس کو زندگی میں ملی ہے' اس نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے سچائی کا ایک ہیولا بنا رکھا ہے جس کو سچائی سے کوئی واسطہ نہیں وہ پوری عمر اسی ہیولے کی آرتی اُتارنے میں صرف کر رہی ہے۔ اس کی زندگی اس کے ایک تجربے کے گرد گھومتی ہے۔ اس کو محبت میں دھتکارا گیا۔ اور وہ زندگی کے ہر تجربے کو اسی کے سانچے میں ڈھال کر دیکھتی ہے مگر اس کا اس کی اپنی ذات سے انکار ہے' جس نے اس کو محبت کی نجی ملکیت سے محروم رکھا۔ وہ کسی بھی نہیں اس لیے سب کی ہے۔ اس لیے کسی کی بھی نہیں۔ وہ ایک زلیخا ہے جو خیال یوسف میں اُنگلیاں کاٹنے اور سوت کاتنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اگر وہ جمال یوسف میں شریک ہو سکتی تو اس کو چھوڑ کر بھاگ چکتی ہوتی۔ وہ روشن دیے جلانا چاہتی ہے۔ وہ ایک درانتی ہے جو اپنی فصل نہیں کاٹ سکتی وہ ایک گلاب کی ٹہنی ہے کہ جس کا جی چاہے اس سے اُلجھ کر اپنا دامن پھاڑ لے۔ وہ اکیلی اُداس اور غمگین عورت ہے مگر نسائیت کا بھر پور پیمانہ ہے جو چھلک کر خالی ہو جانے کی بجائے شیشے میں آئے ہوئے بال میں سے رس رس کر خالی ہو رہا ہے۔ وہ اُبلتی ہے' اُچھلتی ہے۔ مگر خالی خالی۔ وہ پلیٹ فارم پر پڑی ٹھڑی ہے جس کو چھوڑ کر جانے والے مسافر کو یاد بھی نہیں کہ وہ اس میں کیسے کیسے رنگین خواب چھوڑ کر چلا آیا۔۔۔''

(احمد بشیر کی کتاب ''جو ملے تھے راستے میں'' میں شامل کشور ناہید کے خاکہ سے اقتباس)

''شورِ بادباں'' پر ایک نظر

جاوید حیدر جوئیہ

شعری مجموعوں کے نام بالعموم شاعروں کی شعوری کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر انھیں شاعر کے کسی تخلیقی دور کا حاصلِ کُل قرار دیا جائے تو شاید کچھ غلط نہ ہو۔ اکبر حمیدی نے اپنے مجموعۂ غزلیات کا نام ''شورِ بادباں'' رکھا ہے جو اُن کے ایک شعر سے مستنبط ہے:

آندھیوں کو تو سہہ گیا ہوتا

قہر تھا شورِ بادباں سہنا

غزل کی ساخت جن عناصر سے متشکل ہوتی ہے وہ انفرادی سطح پر چاہے کتنے ہی پھیلے ہوئے کیوں نہ ہوں جب بحر، قافیہ اور ردیف کی سیمابی مرکزیت کے تابع ہو کر سمٹتے ہیں تو گویا رنگا رنگ اور نوع بہ نوع موتیوں کی مالا وجود میں آ جاتی ہے۔ غزل کے شعر کی بُنت کائناتِ اکبر کے شعور کو کائناتِ اصغر میں سمونے کا فن ہے۔۔۔ اور کائناتِ اصغر کے مطالعہ کے لیے خوردبین نگاہ درکار ہوتی ہے۔ غزل تجربے اور احساس کو نامیاتی اکائیوں میں بانٹتی اور پھر انھیں ایک ''زندہ وجود'' عطا کرتی ہے۔ زندگی کی پیچیدگی کو کوڈ کرنا کار سہل نہیں ہوتا۔۔۔ واضح رہے کہ میں اُن غزل گو شعراء کی بات کر رہا ہوں، جو حقیقت کے براہِ راست اظہار کے بجائے اس کے آفتاب آسا وجود کو چاندکی چاندنی میں ڈھال کر تخلیقِ حسن کا فطرتی عمل بروئے کار لانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ''شورِ بادباں'' کی بیشتر غزلیں اس معیار پر پوری اُترتی ہیں۔

''سفر'' اکبر حمیدی کی غزلوں میں اپنے تلازمات کے ساتھ، جلی اور خفی صورتوں میں بار بار جھلک دیتا ہے۔ ''سفر'' سکون کا جزوِ لاینفک ہے۔ دیکھا جائے تو زندگی کی پوری معنویت ہمیں اِسی ایک استعارے کے التزامات میں مل جائے گی 'تند و تیز ہوا' نے خشکی پر آندھی بن کر تو آبی سفر میں شورِ بادباں کی صورت میں شاعر کے ساتھ رہا ہے۔ ارضی قیام کی صعوبت تو شاعر کو حوصلہ اور تیقن دیتی ہے اور وہ ہوا کی تندی اور گرد و غبار سہنے کے لیے تیار اور اُس کے ذیلی اثرات سے کسی حد تک آگاہ ہے، لیکن پانی (جو خود زندگی کا استعارہ ہے) کی بے کراں وسعت و گہرائی میں وہ جس سہارے اور اُمید پر آمادۂ سفر ہوا تھا، وہاں بھی طوفان (زمانے، وقت) نے اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ اُس کی سمت و رفتار پر بُری طرح اثر انداز ہوا ہے۔

سمت میسر ہو تو سفر کی معنویت کا اثبات ہوتا ہے جو بالآخر حوصلے اور گاہے انتہائے تمنا پر (عارضی ہی سہی) منزل کے نشان اُبھار دیتا ہے لیکن تعینِ سفر کا جو انداز ان غزلوں میں نظر آتا ہے، اُس کے عقب میں انتہائی خود اعتمادی کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے:

مَیں اُس کی سمت میں خود راستہ بناؤں گا	وگرنہ اُس کی طرف راستے بنے ہوئے ہیں
مَیں اپنی سمت کے اِک راستے سے آتا ہوں	تمہاری سمت کے سب راستے رُکے ہوئے ہیں

لیکن سفر کی تمنا کا بلیک ہول کبھی نہیں بھرتا اور ہر مقامِ قیام پر ایک نئے سفر کی سفید لکیر راہی کو اپنی سمت آنے کی دعوت برابر دیتی رہتی ہے لیکن یہ تجربہ صوفیانہ بھی تو ہو سکتا ہے:

یہ کس مقام پر اکبرؔ مَیں آ کے ٹھہرا ہوں

یہاں سے چاروں طرف راستے نکلتے ہیں

اس سمت میں یہ کھیل کوئی ہارتا نہ تھا

اکبر کمالِ شوق سے ہارا ہے جس طرف

اور ''پانی کے سفر'' کا استعارہ روپ بدل بدل کر ان غزلوں سے جھانکتا ہے۔

ایک دریا سا رواں ہے میرے اندر اکبرؔ

اکثر اوقات یہاں غوطہ لگا دیتا ہوں

ہر طرف پانی نظر آتا ہے
میرے اس خواب کی تعبیر کریں

ہر روز نیا دِن' نیا سورج' نئے منظر
ہم ایک ہی دریا میں اُترتے نہیں رہتے

اس کنارے پہ رہتے ہیں لیکن
روز دریا کے پار جاتے ہیں

کائناتی فضاؤں میں ایک فرد کو تنہائی کا شدید احساس ہوتا ہے اور اگر اِس احساس کو کوئی سہارا نصیب نہ ہو سکے تو انجام نہایت بھیانک بھی ہوتا ہے۔ شاعر نے اس وژن کو کس طرح بیان کیا ہے۔ ذرا دیکھئے:

اک کاغذی کشتی ہے کہ طوفاں میں رواں ہے — میں کاغذی کشتی کے کنارے پہ کھڑا ہوں
یہ عالم اسباب و علل ہے' مگر اس میں — مَیں ہوں کہ مقدر کے ستارے پہ کھڑا ہوں

اب اک '' کاغذی کشتی'' اور مقدر کے ستارے کی وہ کنکریٹ (Cencrete) صورت وہ زمین بھی دیکھئے' جس پر انسان کا سفر مختصر' مقدر کر دیا گیا ہے۔ اثباتِ ذات کی قوت نے ہی یہ ہمت دی ہے۔

اِس گردشِ افلاک میں ذرّہ ہے مری خاک
لیکن اسی ذرّے کے سہارے پہ کھڑا ہوں

لیکن پھر وہی خواہشِ سفر اپنی جانب کھینچتی ہے' تو قناعت کی رسّی ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے:

یہ کیا ضرور ہے یہیں عمریں گزار دیں
اِک حادثے نے ہم کو اُتارا ہے جس طرف

'' شورِ بادباں '' کی شاعری کا مجموعی تاثر رجائی ہے۔ مایوسی کے اندھیرے کا سامنا ہوتے ہی ایک خوشگوار ہَوا کے جھونکے کی طرح' اگلا شعر' اُمید' بلند حوصلگی اور اعتماد کی ان دیکھی مگر موجود منزلوں کی طرف لے جاتا ہے۔

زبان کا استعمال نہایت سادہ مگر پُر تاثیر ہے۔ فارسیت زدہ اور عربیت مآب الفاظ کی مصنوعی جیولری' اس شاعری کی دُلہن نے نہیں پہنی ہوئی۔ بلکہ زبان کا فطری امتزاج' آہنگ کی دھمال پر رقصاں نظر آتا ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ غزلیں' لغت سامنے رکھ کر '' مرتب'' نہیں کی گئی ہیں۔ متنوع موضوعات نے جس ملکہ مکھی کی معیت میں اِس عسلِ مصفّیٰ کو سینچا ہے' وہ شاعر کی اپنی ذات نہیں تو اور کیا ہے؟ ہر شعر کا لباس '' موسم'' کے مطابق استعمال کیا گیا ہے لہٰذا طرح طرح کے حالات میں یہ شاعری زندہ رہنے کا پورا جواز رکھتی ہے۔

'' شورِ بادباں '' کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس مجموعۂ غزلیات میں کوئی دیباچہ' فلیپ ' بیک فلیپ یا روایتی پیش لفظ شامل نہیں ہے۔ صرف ایک مختصر سا نوٹ لکھاری کی طرف سے ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ ان تکلفات کی ضرورت اس بات کے پیشِ نظر محسوس نہیں کی گئی' کہ قارئین کی رائے کسی اور رائے کے پس منظر میں نہ ہو۔

پنجابی زبان کے بعض الفاظ اشعار میں استعمال ہوئے ہیں جنھیں اگر بصورت فٹ نوٹس وضاحت دے دی جاتی تو غیر پنجابی دان طبقہ قارئین بھی ان الفاظ سے زیادہ لطف لیتا۔

جدیداور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اُردو تناظر میں) ایک مطالعہ

جاوید حیدر جوئیہ

ناصر عباس نیرؔ اُردو کے اُن معدودے چند نقادوں میں سے ہیں جنھوں نے تنقید نگاری کو نہایت سنجیدگی سے لیا ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف اُردو تنقید کی تاریخ پڑھی ہے اور یوں روایت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ بلکہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے موضوعات پر لکھی گئی انگریزی تنقیدی کتب کا بالاستیعاب مطالعہ بھی کیا ہے۔ اُنہوں نے عجلت میں کوئی ایسا نظریۂ تنقید نہیں اپنایا ہے جس کے بارے میں بعدازاں اُنھیں دفاعی پوزیشن اختیار کرنا پڑے۔ اُن کا یہ رویہ قابلِ فہم ہے کیونکہ تنقید کے میدان میں تبدیلیاں، اتنی سُرعت سے اور اس قدر زیادہ آتی ہیں کہ کسی بھی اوریجنل نقاد کے لیے ایسا کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات فطری بھی ہے کیونکہ تنقید سے اصل میں دوسرے بہت سے علوم بھی وابستہ ہوتے ہیں جنھیں تنقید اپنے اندر جذب کرتی رہی ہے اور اب تک کر رہی ہے۔ یوں تنقید پڑھنا اور تنقید لکھنا ایک مسلسل مطالعے کا متقاضی ہے، جو ناصر عباس نیر کے ہاں موجود ہے۔

وہ نقاد ہی نہیں، بہت اچھے انشائیہ نگار بھی ہیں۔ اسی لیے اُن کی تنقید میں، خواہ وہ نظری ہو یا عملی، رواں اور قابلِ مطالعہ نثر کے ساتھ ساتھ لطافت اور تازگی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ اُن کی تنقید نہ صرف سمجھ میں آنے والی ہوتی ہے بلکہ جمالیاتی سطح پر قاری کو متاثر بھی کرتی ہے۔ وہ لفظوں کا انتخاب اپنی تنقید میں لغت سامنے رکھ کر نہیں کرتے۔۔۔ اور یوں ادق الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ Superlatives کے ذریعے قاری کو مرعوب بھی نہیں کرتے اور نہ ہی کڑوے کسیلے انداز میں تنقیص محض اُن کا شیوہ ہے۔ وہ ''شئے تنقید'' کو اپنے بطون میں جذب کرنے کے بعد اپنی رائے دیتے ہیں۔ یہ وہ خوبی ہے جو انھیں ایک طرف ''تنقیدی قصیدے'' لکھنے سے روکتی ہے تو دوسری طرف ''منثور ہجوگوئی'' کی طرف بھی نہیں جانے دیتی۔۔۔

اُردو میں ساختیات، پسِ ساختیات اور مابعد جدیدیت کی تفہیم و ابلاغ پر بہت مباحث ہوئے ہیں۔ مخالفت بھی ہوئی ہے اور اندھا دھند حمایت بھی۔ ناصر عباس نیر نے کھلے ذہن اور گہری تجزیاتی بصیرت سے انھیں پرکھا، تولا اور نتائج اخذ کیے ہیں۔ ''تھیوری'' پر اُن کی رائے سطحی مطالعے اور وقتی جوش و خروش کا نتیجہ نہیں ہے۔ اُنہوں نے اِس باب میں صرف اور صرف اُردو کے نقادوں کو ہی نہیں پڑھا ہے بلکہ اِن افکار کے ماخذات تک رسائی کی کوشش کی ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اُنہوں نے بعض شوقیہ نقادوں کی طرح 'انگریزی کتابوں کے ''بامحاورہ اُردو ترجمے'' نہیں کیے ہیں۔ بلکہ ماخذات کے تناظرات کو (حتی المقدور) پیشِ نظر رکھ کر اپنا مؤقف بیان کیا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

یہ بات اُن کی تازہ تصنیف ''جدید اور مابعد جدید تنقید — مغربی اور اُردو تناظر میں'' سے بھی مترشح ہے، جو اصل میں ایم۔ فل کے لیے لکھا گیا اُن کا تحقیقی مقالہ ہے۔ کتابی سائز کے 503 صفحات پر مشتمل یہ کتاب پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے Thesis معلوم ہوتی ہے لیکن تحریر کی تازہ کاری، تجزیے کی بصیرت اور توازن کی عمل داری نے تحقیق کے خشک پہاڑ سے چشمۂ تنقید جاری کر دیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس کتاب کو اُردو کی جدید اور مابعد جدید تنقید میں ایک حوالہ کی کتاب Reference Book کے طور پر لیا جانا چاہیے، جن موضوعات پر قلم اُٹھا کر اُنہوں نے اُردو تنقید کو مالا مال کیا ہے۔ وہ اتنے گہرے اور دقیق مسائل ہیں کہ بڑے بڑوں نے ان کی تشریح و توضیح میں ٹھوکریں کھائی ہیں، ایسے موضوعات کی کتاب تو خیر کوئی بھی Perfect نہیں ہوتی یا ہوسکتی اور کہیں نہ کہیں ناکملیت اور نارسائی کا احساس ضرور ہوتا ہے، اس لیے دیکھنے کی بات یہ ہونی چاہیے کہ مصنف نے نکات پیدا کرنے اور ان نکات کی ''صداقت'' تک پہنچنے کی کوشش کتنی کی ہے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو یہ کتاب، اپنے موضوع کے اعتبار سے اُردو میں اب تک لکھی جانے والی سب سے مختلف اور منفرد تصنیف قرار پاتی ہے۔۔۔ تاہم ایک کمی کے ساتھ! وہ یہ کہ ناصر عباس نیر ''امتزاجی تنقیدی رویے'' یا امتزاجی تنقید کے پُرزور حامیوں میں سے ہیں، لیکن ''امتزاجی تنقید'' پر اُن کا الگ سے کوئی مقالہ/باب اس کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ بات کھٹکتی ہے۔

کتاب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں اُنہوں نے ''جدیدیت'' سے چل کر ''مابعد جدیدیت'' تک آنے والی انگریزی میں لکھی گئی مغربی تنقید کو خود مغربی تاریخ و علوم کے تناظر میں دیکھا ہے۔ جبکہ حصہ دوم میں وہ ان مباحث کے حوالے سے اُردو تنقید کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ کتاب کا آخری باب ان موضوعات سے ہٹا ہوا ہے۔ ہر چند کہ نہایت اہم موضوع پر لکھا گیا ہے۔

حصہ اوّل میں کل 13 ابواب ہیں۔ پہلے باب ''جدیدیت'' میں اپنی بات کا آغاز وہ یوں کرتے ہیں:

''۔۔۔لفظ جدیدیت جس قدر مانوس اور ''عام'' ہے' اس کے بنیادی اور ضمنی مفاہیم' اسی قدر مبہم' پیچیدہ اور متعدد ہیں۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ جدیدیت کا تعلق محض ادب سے نہیں ہے۔ تمام معاشرتی علوم میں اسے ایک ''جدید'' اور مستقل موضوع کا درجہ حاصل رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہ معاشرتی ارتقاء اور تہذیبی رجحانات کی نمائندہ بھی ہے اور ایک تاریخی تناظر بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ جب ادب میں جدیدیت کو زیر بحث لایا جاتا ہے تو مذکورہ عناصر اور اُن کی پرچھائیاں بھی درآتی ہیں اور ادبی جدیدیت کو واضح کرنا آسان نہیں رہتا۔۔۔''

ان 18 صفحات میں وہ اجمال کے ساتھ اُنیسویں اور بیسویں صدی میں ''جدیدیت'' کے پس منظر' تاریخ اور اس کا بطور ایک ادبی تحریک جائزہ لیتے ہیں نیز اسے اس دوران اُبھرنے والی دوسری ادبی تحریکوں سے تقابل کرتے چلے جاتے ہیں۔

''نئی تنقید'' کا آغاز وہ جان کرورین سم John Crowe Ransom کی کتاب The New Criticism سے مانتے ہیں اور پھر آئی اے رچرڈز' ٹی۔ ایس ایلیٹ' ولیم ایمپسن اور کینتھ بروکس کے کنٹری بیوشن پر نظر ڈالتے ہوئے' وِمساٹ تک آتے ہیں۔ نئی تنقید میں متن (کی ظاہری ہیئت) پر جو زور دیا گیا ہے۔ اُسے بیان کرتے ہوئے وہ اسے رُوسی ہیئت پسندی (Russian Formalism) کے مقابل رکھتے ہیں اور اسے تنقید کی تاریخ میں ''نئی تنقید'' سے اگلا ارتقائی مرحلہ قرار دیتے ہیں جس سے آخر آخر میں ساختیاتی تنقید نے جنم لیا۔

''روسی ہیئت پسندی'' کتاب کا تیسرا باب ہے جس میں وہ ایک طرف تو اس مکتبِ تنقید کو جدیدیت کی تحریک سے منسلک دِکھاتے ہیں تو دوسری طرف اسے ادب کو سائنٹفک بنانے کی تحریک بتاتے ہیں اور The doninant, Literariness, Artfulness, Defamiliarization اور Foregrounding کے اصطلاحی تصورات کو ساختیاتی تنقید کا پیش رو ثابت کرتے ہیں۔ اس مقالے کی خاص اور نئی بات یہ ہے کہ مصنف نے روسی ہیئت پسندی کو دریدا کی ڈی کنسٹرکشن کا پیش رو بھی کہا ہے جو ایک تازہ اور نیا نکتہ ہے۔

''ساختیات اور ساختیاتی تنقید'' میں ''ساختیات'' کو ایک شعبہ علم قرار دیتے ہوئے اسے ساختیاتی تنقید سے متمیّز کرتے ہیں۔ ''ساخت'' کے تصور نے فرڈی ناں دی ساسئر کے ''تصورِ نشان'' تک آتے آتے جو صورتیں اختیار کی ہیں' وہ اُن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ساختیاتی تنقید کے بنیادی تعقلات بتاتے ہیں اور پھر ساسئر اور وِٹ گنسٹائن کے زبان کے بارے میں تصورات کا موازنہ کرتے ہیں۔ وہ مختلف ساختیاتی نقادوں کے نقطہ ہائے نظر بیان کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ

''۔۔۔رومن جیکب سن کی راہ دیگر ساختیاتی نقادوں سے بڑی حد تک الگ ہے۔۔۔''

بعدازاں مختلف ساختیاتی نقادوں کے افکار میں مماثلت بھی بتاتے ہیں۔ ''وجودیت'' Existentialism اور ''انسان دوستی'' (Humanism) سے ساختیات کی ٹکر کا مختصر ذکر بھی ہمیں یہاں ملتا ہے۔

ژاک لاکاں نے فرائڈ کی ''تحلیل نفسی'' کو ساسئر کی نشانیات کے حوالے سے جس طرح پڑھا اور لاشعور کو Structured like language قرار دیا ہے اور Mirror Stage کے حوالے سے The other کا جو نیا تصور دیا ہے' اس سب کی تفصیل ''ساختیاتی نفسیاتی تنقید'' سے معنون باب میں بیان کی گئی ہے۔ نیز اُنہوں نے فرائڈیت کے زیر اثر ادبی تنقید کی چار کروٹوں پر لکھا ہے۔

مصنف کے بقول کارل مارکس کے فلسفیانہ تصورات کے تحت کلاسیکی مارکسی تنقید نے کرسٹوفر کاڈویل اور جارج لوکاچ کے تصورات سے سب سے زیادہ اثر لیا ہے۔ سوشلسٹ حقیقت نگاری اور تنقیدی حقیقت نگاری کا فرق' فرینکفرٹ سکول کے زیر اثر نومارکسیت کا طلوع اور اس کے لیے والٹر بنجامن اور گولڈ مان کی خدمات' ساختیات اور مارکسزم کی مشترک خصوصیات' آلتھوسے' ماشیرے' ٹیری ایگلٹن' اور فریڈرک جیمی سن کے آئیڈیالوجی کے حوالے سے تصورات۔۔۔ یہ سب کتاب کے چھٹے باب میں آئے ہیں' جس کا عنوان ''مارکسیت' نومارکسیت اور ساختیاتی مارکسیت'' ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

''۔۔۔مارکسی تنقید اور نومارکسی تنقید اپنی ساری رواداری' وسعتِ قلب اور کشادہ نظری کے باوجود ادب کی

حقیقت کے ایک رخ کی زیارت ہی میں کامیاب ہوئی ہے۔۔۔''

''قاری اساس تنقید'' کے زیرِعنوان 'ریسیپشن تھیوری اور Reader's response theory میں قاری کی اہمیت اور اس کے فعال کردار کو مظہریات Phenomenology اور تعبیریات (جسے اُنہوں نے ''تعبیریت'' کا نام دیا ہے) کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ فریڈرک شلائر ماخر کے Hermenutic Circle تک پہنچتے ہیں اور اس عمل کو تین مراحل پر مشتمل قرار دیتے ہیں۔ تعبیریات کے دو اور اہم مفکرین ولہم ڈلتھے اور جارج گدامر سے ہوتے ہوئے وہ تعبیریاتی تنقید کے بانی رومان انگارڈن کے نظریات بیان کرتے ہیں اور پھر جارج پولے' ژاں پیری رچرڈ' ژاں سٹاروبنسکی' اور ژاں روسو کے بارے میں بتاتے ہیں کہ کس کس طرح اُنہوں نے قاری کو اپنی تنقید کا محور بنایا۔ قاری اساس تنقید اور ریسیپشن تھیوری کا فرق بھی بتایا گیا ہے۔ جاز اور وولف گینگ آئزر کے نظریات سے ٹیری ایگلٹن نے جو اثرات قبول کیے وہ بھی عیاں کیے گئے ہیں۔

''مابعد جدیدیت'' بظاہر بھول بھلیوں کا کھیل ہے۔ عام طور پر اس سے دُوری اور احتراز کی وجہ بھی یہی ہے کہ لوگ باگ اُن تمام حالات' واقعات اور تاریخی پس منظروں کا ادراک نہیں رکھتے جو اس ''صورتحال اور تھیوری'' پر منتج ہوئے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے یکسر رد کر دینے کی آسانی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ مصنف نے اپنے اِس مضمون میں مابعد جدیدیت کو بطور ''فکر'' بطور ''صورتحال'' اور بحیثیت ''اینٹی تھیوری'' فہم میں لا کر پیش کیا ہے نیز Modernism اور Modernity میں فرق کیا ہے اور مابعد جدیدیت کو ان کا ناقد کہا ہے۔ ''خود شعوریت''؛ ''عدم تسلسل''؛ ''لامرکزیت''؛ ''ادنیٰ اور اعلیٰ میں عدم تفریق'' 'میشل فوکو کے نظریات' ژاک دریدا کی ساخت شکنی (Deconstruction) 'متن بطور سماجی تشکیل' اور نو مارکسی نقاد فریڈرک جیمی سن کی مابعد جدیدیتی تعبیر۔۔۔ یہ سب کچھ ۱۹ صفحات میں قابلِ فہم طور پر بیان کیا گیا ہے۔

ژاک دریدا کی پیش کردہ ردِتشکیل / ساخت شکنی / Deconstruction 'ایک ایسا عجیب ہتھیار ہے جو متن کے متخالف متن در متن پیدا کرتا ہوا' خود اپنے آپ (کے متن) کو بھی معرضِ التواء میں ڈال دیتا ہے۔ ناصر عباس نیر نے وزیر آغا کے اِس خیال سے اتفاق کیا ہے کہ یہ 'اصول' طبیعات کے اصولِ لایقینیت (Uncertainty Principle) کے مماثل ہے۔ 'لفظ مرکزیت'؛ 'موجودگی'؛ 'فرق'؛ 'التواء' اور 'درجہ وار فوقیتی ترتیب'؛ 'دریدا کی فلسفیانہ موشگافیوں کے ساتھ'' ساخت شکنی کیا ہے'' کے زیرِعنوان باب میں موجود ہیں۔ مصنف نے معانی کی کثرت کے تصورات کو رولاں بارتھ اور ژاک دریدا کے افکار میں الگ الگ صورتوں میں دکھایا ہے۔ تاہم ایک اعتبار سے یہ باب تشنہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ مصنف نے Deconstruction کو ایک ''اصولِ قرأت'' اور ''فلسفۂ معنیٰ'' کے طور پر تو بجا طور پر دیکھا ہے' لیکن Deconstruction کا جو رشتہ تحریر (Writing) کے ساتھ ہے وہ اُنہوں نے یہاں نہیں بتایا۔

میشل فوکو کے متون کے بارے میں عمومی خیال یہ ہے کہ یہ اس قدر اُلجھے ہوئے ہیں کہ عام قاری کے گویا سَر پر سے گزر جاتے ہیں لیکن ناصر عباس نیّر کا مضمون ''میشل فوکو کے نظریات'' اس اُمید کو تقویت دیتا ہے کہ قاری اگر صاحبِ علم و بصیرت ہو تو دریائے معانی کا کوئی موتی اُس کی نظر اور رسائی سے دُور نہیں ہوتا۔ اُنہوں نے فوکو کے ڈسکورس کو نطشے کی عدمیت (Nihilism) کے متوازی قرار دیا ہے اور پھر پاگل پن (Madness) جنسیت (Sexuality) آرکیالوجی' جینیالوجی کے ڈسکورسز نے فوکو کے مجموعی ڈسکورس پر جس طرح اپنے اثرات ثبت کیے ہیں' وہ بتائے ہیں اور فوکو کی چار Epistemes کی خصوصیات بیان کی ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

> ''۔۔۔ پس جدید مفکرین کی جو فکر انسانی انا (Ego) اور موضوع (Subject) کو بے دخل کرتی ہے' وہ فوکو تک آتے آتے جسم کو بھی بے دخل کر دیتی ہے اور اِسے ثقافتی ڈسکورس کے تابع قرار دے ڈالتی ہے۔۔۔ فوکو نے وہی کچھ کہا ہے جو اُس کے عہد کی مجموعی فکر نے اس سے کہلوایا ہے۔۔۔''

نو تاریخیت۔۔۔ ادب اور تاریخ کا باہمی انسلاک۔۔۔ 'افلاطون کا تاریخ کو برتری دینا' ارسطو کا اِسے ادب سے کم تر سمجھنا' ساختیات' روسی ہیئت پسندی اور نئی تنقید کی تاریخ سے بیزاری' مارکسیوں کی تاریخ پرستی' تاریخ کے فہم اور سائنس کے فہم کا امتیاز' ادبی مطالعے میں مطالعہ تاریخ کے تین مقاصد اور نو تاریخیت کا پس ساختیاتی اصطلاحوں پر انحصار' نو تاریخیت کا کولاژ (Collage) سے مماثل ہونا' تاریخی ڈسکورس کی لامرکزیت۔۔۔ یہ سب کچھ اپنے نقطۂ نظر سے بیان کرنے کے بعد اُنہوں نے شیکسپیئر کے King Lair اور ہرزنیٹ کی کتاب Egregious Popish

Imposition پر نو تاریخیت کے اطلاق اور اس کے نتائج نقل کیے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''۔۔نئی تاریخیت جب ادبی متن اور تاریخی/ ثقافتی متن کی ہم رشتگی کو نشان زد کرتی ہے تو بلاشبہ ایک نئی بصیرت کا چراغ روشن کرتی ہے۔ ادب و ثقافت کے ربط کی مخفی پرتوں کو منکشف کرنے کا ایک نیا تنقیدی حربہ ثابت ہوتی ہے مگر جب وہ ادبی اور ثقافتی متن کے رشتے کے تجزیے سے حاصل ہونے والے نتائج کی تعمیم کر کے انھیں ادب کی ماہیت پر منطبق کرتی ہے تو بعض ادبی صداقتوں کو دبانے یا مسخ کرنے کی مرتکب ہوتی ہے۔۔۔''

''نسوانی تنقید'' کتاب کے حصہ اوّل کا طویل ترین باب ہے جو ۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ ''نسائی تنقید'' کا ''مابعد جدیدیت'' سے اتفاق اور اختلاف بیان کرنے کے بعد وہ اس مکتب میں موجود مختلف تعقلات' مثلاً عورت کا تاریخ کے حاشیہ پر رکھا جانا اور عورت کی شناخت کا مرد کے حوالے سے اور اُس کے زیر اثر قائم ہونا' وغیرہ بتاتے ہیں اور پھر اس تنقید کے زیر اثر عورت کے ''شعور ذات'' کو Feminism سے متعلق وضاحت سے دکھاتے ہیں۔ جان سٹوارٹ مل کے لبرل فیمینزم کے حوالے سے ''بہشتی زیور'' اور ''مراۃ العروس'' میں ''مردانہ اقدار کی مرکزیت'' اُنہوں نے بیان کی ہے۔ بیسویں صدی میں حقوقِ نسواں کی تحریک اور اس کے ثمرات بیان کرنے کے بعد وہ نسوانی تنقید کو تین بڑے سوالات پر مرتکز دیکھتے ہیں اور ان کے نتیجے میں تمثالِ نسواں (Feminist Critique) اور انتقادِ نسواں (Gynocritics) کا فرق بتاتے ہیں۔ ''نسائی زبان'' اور اس کی مارفالوجی پر سیر حاصل گفتگو کے بعد وہ کہتے ہیں:

''۔۔۔نسائی کلچر (جواب تک حاشیے پر اور ذیلی کلچر تھا) کو ''مردانہ ثقافت'' کے مرکزی دھارے کے جبر سے گویا آزادی ملی ہے۔ یہ زاویہ نظر نسوانی تنقید کی نظری بنیادوں کو مضبوط کرتا اور اس کے عملی اطلاق کے امکانات کو بڑھاتا ہے۔۔۔''

شر لے اور اینڈرین آرڈنز کا نسوانی کلچر کا تصویری Figure بنانے اور اس کی تشریح کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''۔۔۔نسوانی تنقید کا عمومی مزاج ''نظر ثانی'' سے عبارت ہے۔ یہ پوری ادبی تاریخ اور ثقافت کو ازسرِ نو نسائی زاویوں سے جانچنے اور مرتب کرنے کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے اور متن کی تعبیر و تشریح کے اصولوں پر صدیوں پرانے مردانہ اجارے کو چیلنج کرتی ہے۔۔۔''

''بین المتونیت'' کتاب کا نہایت اہم باب ہے (اس مضمون کا انگریزی ترجمہ بھی راقم نے کیا ہے) اس میں ایک طرف ''بین المتونیت'' کے تصور کو اُردو ادب کی تاریخ میں پہلے سے موجود تصورات مثلاً ''استفادہ''؛ ''سرقہ''؛ ''توارد''؛ ''نقل''؛ ''ترجمانی'' اور ''مضمون آفرینی'' وغیرہ سے الگ اور مختلف دکھایا گیا ہے اور دوسری طرف ''متن'' کا مفہوم ساختیات کی رُو سے پیش کر کے بتایا گیا ہے کہ کس طرح مصنف کا لاشعور Condensation اور Displacement کے ذریعے مختلف متون کی تقلیب Transformation کر کے بین المتونیت کو بروئے کار لاتا ہے۔ اُنہوں نے اس سلسلے میں جولیا کرسٹیوا کے اقوال سے رہنمائی لی ہے۔

اور اب کتاب کا حصہ دوم

اس حصے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب ''اُردو تنقید (ابتدا سے اُنیسویں صدی تک) ہے جو 32 صفحات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کتاب کا سب سے بڑا باب ہے۔ ابتداء وہ تنقید کی دو جہتوں سے کرتے ہیں' داخلی (Intrinsic) اور خارجی (Extrinsic) پہلی جہت کو خود تخلیق کار کی تحویل میں بتاتے ہیں جبکہ ثانی الذکر کو ''قاری'' کے تصرف میں ثابت کرتے ہیں اور یہی وہ تنقید ہے جو بطور ایک Discipline کام کرتی ہے۔ ایسی تنقید کا اُردو میں آغاز وہ انیسویں صدی کے اواخر سے مانتے ہیں۔ اُنہوں نے ''تذکروں'' کو اُردو تنقید کی کہانی کا پہلا Episode کہا ہے اور شعر کے بارے میں (نثر کے نہیں) لکھے گئے آٹھ فارسی اور چھ اُردو تذکروں کا ذکر کیا ہے۔ اُن کا موقف ہے کہ ان تذکروں پر عربی کی نسبت فارسی کے اثرات زیادہ ہیں۔ تاہم اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود انھیں رد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ''ذوقِ سلیم کے حامل اشخاص کے تاثرات'' ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس دَور میں لفظ پر

غیر معمولی زور دیا گیا ہے جبکہ اس کے استعمال میں احتیاط اور ذمہ داری سے کام نہیں لیا گیا نیز اس سارے دور میں استقرائی طرز خیال عنقا ہے۔

''۔۔۔تذکروں کا عہد اپنے مدلول (Signified) سے محروم ہے دال (Signifier) پر گزر بسر کر رہا ہے۔۔۔''

اُنیسویں صدی کے آخر میں چار ناقدین کا تفصیلی تنقیدی جائزہ اُنہوں نے لیا ہے جو یہ ہیں: محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی اور امداد امام اثر۔ پہلی تین شخصیتوں کا تنقیدی شعور ایک جیسی دُنیا سے تشکیل پایا ہوا دکھایا ہے جبکہ امداد امام اثر: ''حالی اور شبلی کے برعکس انگریزی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے'' تاہم ''وہ بھی اپنی عملی تنقید میں کئی مقامات پر سطحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں'' تاہم بقول مصنف:

''۔۔۔اُنہوں (اثر) نے اُردو میں کثیر الثقافتی ادبی لین دین کا شعور پیدا کیا اور یہ اُس وقت کیا جب روح ادب مقصدیت اور مادیت کے سایوں میں گھری تھی، محدود اور پابند تھی۔۔۔''

حصہ دوم کا دوسرا باب ''اُردو میں جدیدیت کے مباحث'' ہے اس میں انہوں نے ایک بار پھر ''جدیدیت'' کو معرضِ فہم میں لانے کی کوشش کی ہے اور ''جمالیاتی جدیدیت'' کو ''جدیدکاری'' سے متمیز کیا ہے:

''۔۔۔حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت کسی باقاعدہ مینی فیسٹو کی حامل نہیں ہے۔''

جن ادباء کی آراء کو شامل کیا گیا ہے اُن میں سے چند نام یہ ہیں: سرسیّد احمد خاں، مولانا عبدالرحمٰن، ڈاکٹر عنوان چشتی، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد محسن، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر محمد خاں اشرف، علامہ اقبال، میراجی، ن۔م۔راشد، وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر سلیم اختر، فتح محمد ملک، جیلانی کامران، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، سراج منیر، غلام حسین اظہر، افتخار جالب، محمد علی صدیقی، جمال پانی پتی، تحسین فراقی اور جمیل جالبی۔

''اُردو میں ساختیات کے مباحث'' میں اُنہوں نے حسن عسکری، محمد علی صدیقی، لنڈا وینگ، باربرا ڈی منکاف، ڈاکٹر سلیم اختر، ریاض صدیقی، احمد ہمدانی، وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر فہیم اعظمی، ضمیر علی بدایونی، قمر جمیل، قاضی قیصر الاسلام، ڈاکٹر احمد سہیل، مناظر عاشق ہرگانوی، جمیل آذر، رفیق سندیلوی، اسلم حنیف اور دیوندر اسر کے کاموں/ناموں کو کسی ایک یا دوسرے حوالے سے ان مباحث میں جگہ دی ہے۔

''اُردو میں مابعد جدیدیت کے مباحث'' کتاب کے نصف ثانی کا چوتھا باب ہے جو 30 صفحات پر مشتمل ہے۔

اِن مباحث میں شامل ہونے والی جن شخصیات کا تذکرہ ہے۔ اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: گوپی چند نارنگ، دیوندر اسر، ضمیر علی بدایونی، فہیم اعظمی، وزیر آغا، نظام صدیقی، وہاب اشرفی، مغنی تبسم، حامدی کاشمیری، محمد صلاح الدین پرویز، ابوالکلام قاسمی، عتیق اللہ، احمد سہیل، حقانی القاسمی، قاضی افضال حسین، اسلم حنیف، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، شین کاف نظام، رؤف نیازی، مناظر عاشق ہرگانوی، اقبال آفاقی، رفیق سندیلوی، جمیل جالبی، انور سدید، سلیم اختر، نصیر احمد ناصر، ستیہ پال آنند، حامدی کاشمیری اور افتخار امام صدیقی۔

''جمالیاتی مسرت اور تفریحی حظ کا مابہ الامتیاز'' کتاب کا آخری باب ہے۔ ہر چند اس کا تعلق کتاب کے دوسرے مندرجات سے براہِ راست نہیں ہے، یہ ایک اہم موضوع کی فلسفیانہ اور نفسیاتی توضیح وتشریح کرتا ہے۔ مصنف کم وبیش ۲۶ صفحات کے اس باب میں پہلے چودہ ۱۴ صفحات میں تفریح اور جمالیاتی احساس کا فرق بیان کرتے ہیں اور اس درمیانی راہ پر آتے ہیں:

''۔۔۔جب رنج اور غصہ شخصی جذبات کو الگ کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور ایک علامتی انسانی وژن تک پہنچ جائیں تو ظرافت آرٹ بن جاتی ہے۔۔۔ایک اور مقام بھی آتا ہے جہاں مزاح آرٹ بن جاتا ہے، جب انسان اپنی اور کائنات کی تہہ میں موجود بے معنویت اور بے ڈھنگا پن دریافت کرتا ہے تو ہنس دیتا ہے۔۔۔''

اگر مصنف یہ منصفانہ فیصلہ نہ دیتے تو خدانخواستہ غلام جیلانی اصغر صاحب کے انشایے اور مشفق خواجہ صاحب کے کالموں سمیت بہت سی طنزیہ ومزاحیہ تحریریں (اور کالم) درجۂ فن سے ہمیں گرانا پڑتے۔ مصنف کی اس بات سے بھی اتفاق کیا جانا چاہیے کہ جب طنز ومزاح، پھکڑ پن کے اسفل درجے پر پہنچ کر طنز برائے طنز اور مزاح برائے مزاح بن جائیں تو اُن سے آرٹ کا جمالیاتی احساس معدوم ہو جاتا ہے۔

اب ایک آخری بات جو سب سے پہلے کیے جانے کے قابل تھی۔ مگر اس طرح راقم کو کتاب پر تبصرہ کے بجائے مقالہ تحریر کرنی کی ضرورت

پیش آ جاتی۔۔۔

کتاب کے مقدمہ میں (جو مصنف نے خود تحریر کیا ہے) تنقید اور تخلیق کے مختلف رشتے بیان کرنے کے بعد یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ آیا تنقید' تخلیق سے الگ اور جداگانہ Self کا درجہ رکھتی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اُنہوں نے ان الفاظ میں دیا ہے:

''۔۔۔سو تنقید آزادانہ سوچ سکتی ہے اور فیصلے کر سکتی ہے اور اپنے فریم ورک سے اپنے فیصلوں کا جواز بھی فراہم کر سکتی ہے۔۔۔ کیونکہ (تنقید کے) استقرائی اور استخراجی طرزِ فکر کو تنقید کی ''میٹالنگویج'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔۔۔''

مبصر یہاں یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہے کہ مگر رولاں بارتھ سے جب اسی طرح کا سوال کیا گیا تو اُس نے کہا:

"That literature was itself a critique of language, and that criticism had no "matalanguage capable of describing or accounting for literature... The relation of the critical text to its object of study was to be conceived in terms no longer of subject-object but of subject- predicate."

یوں ''تخلیق'' اور ''تنقید'' کا فرق صرف تخلیقی متن کی نقل Simulacrum قرار دیا گیا۔ میٹالنگویج کا مطلب یہی ہے' یا کچھ اور' مبصر اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہے۔

وہ قارئین جو نئے تنقیدی مباحث کی فہم میں دلچسپی رکھتے ہوں نیز جو اپنی فکر کو روشن تر کرنے کے جویا ہوں' اُن کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی علمی تحفہ ثابت ہوگی۔

آغا سہیل کے افسانوی کردار' محمد علی صدیقی کی نظر میں

آغا سہیل اپنے کرداروں پر اپنا نظریۂ زندگی تھوپتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ ان کے کرداروں میں ہر طرح کے افراد ہیں۔ ان میں سے بہت سے کردار قاضی عبدالستار کو مرغوب ہونے چاہئیں اور بہت سے انتظار حسین کو کچھ سکہ بند ترقی پسندوں کے لیے وسیلۂ اظہار بننے کی بے پایاں صلاحیت رکھتے ہیں لیکن آغا سہیل ان تمام کرداروں سے اس طرح سے برتاؤ کرتے ہیں جیسے کہ وہ سب اُن کی توجہ کے یکساں طور پر مستحق ہیں۔ ان کا سیاسی نظریہ ان تمام کرداروں میں بٹا ہوا ہے اور یہی اُن کی خوبی ہے کہ وہ کسی ایک کردار کے ساتھ کلی یا جزوی طور پر یک جان ہوتے ہوئے ہوئے بھی آزاد ہیں اور نتیجہ آفرینی کی منزل میں نسبتاً زیادہ سچی صداقتوں کے طرفدار نظر آتے ہیں۔ وہ ایک ایسا فنکار ہے' جس کے لیے فن اور زندگی کے بارے میں ہمدردی اور ترحم کے احساسات تلے رقم کی گئی تحریریں زبردست تخلیقی قوت ہی سے ممکن ہو پاتی ہیں۔ مصنف جس لمحے اپنے جذبۂ ہمدردی کو بے نقاب کر دیتا ہے اُس لمحے ''جذباتیت'' ٹپکنے لگتی ہے اور آغا سہیل نے ایسے مواقع پر زبان و بیان پر اپنی قدرت سے ممکنہ فائدہ اُٹھایا ہے اور وہ کم سے کم الفاظ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض جگہ وہ ضرورت سے زائد وضاحت سے کام لینے پر مائل نظر آتے ہیں اور یہ غالباً اُس داستانی ماحول کی بدولت ہے جو اُن کی گھٹی میں پڑا ہے اور جسے وہ شعوری طور پر ہی جھٹک سکتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں آغا سہیل نے جدیدیت کی ٹیکنیک کا سہارا لیا ہے وہ بہت کامیاب رہے ہیں۔ اگر بیانیہ کی سادہ اور پُرکار ٹیکنیک پر قدرت حاصل ہو سکے تو پھر ''جدیدیت'' کی ٹیکنیک بیک وقت غیر ضروری تفصیلات سے پہلو تہی اور قاری پر بھرپور اعتماد پر منتج ہوتی ہے۔

(''جہات'' سے مقتبس)

آؤ۔۔۔دُعا کی طرف لوٹتے ہیں

سید حسین گیلانی

''لوٹنا'' آخری عمل ہے۔۔۔اور یہ عمل تب بائمل ہوتا ہے جب ناظر کسی انتہا کا نظارہ کرنے کے بعد یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ سب 'اُس' کے سامنے خاک ہے۔۔۔وہ۔۔۔جو''تھا'' وہی اصل تھا۔۔۔یہ مَیں کیا کر بیٹھا۔۔۔اسی کشمکش میں اندر سے کچھ صدا غوغا بن کے نکلتی ہیں اور ناظر کو انتہا سے ابتدا کے سفر پر روانہ کر دیتی ہیں یہی اُس گیانی کی اصل منزل ہے وہ آنکھیں بند کیے بس یہی پکارتا جاتا ہے۔۔۔دُعا کی طرف لوٹتے ہیں۔

''دعا'' عاجزی کی علامت ہے۔۔۔اور دُعا کی طرف لوٹنے کی صدا عجز کی انتہا ہے۔شاعر اپنے اندر کی طویل مسافت کے بعد اپنے اندر نئی کونپلیں پھوٹتی محسوس کر رہا ہے اُسے یوں لگ رہا ہے جیسے پُرانی ٹہنیاں ایک ایک کر کے گر رہی ہیں اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے اسی کی کشش ہے جو شاعر کو لوٹنے پر مجبور کر رہی ہے''دُعا'' کی طرف لوٹنے کی خواہش ہی اصل میں وہ روشنی ہے جس سے شاعر کے ذہن و دل دونوں منور ہیں اور جو الفاظ کا سہارا لے کر شعروں کے روپ میں ڈھلتے رہے ہیں'اچھا شعر اور اچھا خیال اس دورِ جدید میں نعمتِ خداوندی سے کم نہیں جبکہ کاشف مجید کی غزلیات میں آپ کو کثیر تعداد میں عمدہ اشعار میسر آئیں گے۔اُن کے ہاں آپ کو اشعار کے چھتنار درخت پر فکر کی چڑیا چہکتی ہوئی سُنے گی۔وہ جو مسافت طے کر کے آئے ہیں اب وہ اپنے اندر کی کشمکش اور اُلجھنوں کو نیست و نابود کرنے کے بعد سب کو اپنے نئے حاصل شدہ تجربے میں شریک کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسی لیے تو کہتے ہیں:

ہمیں آگے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے
سو ہم لوگ تیری صدا کی طرف لوٹتے ہیں

ہوائیں پھر اُن کے دِیوں کو جلاتی ہیں کاشف
ہماری طرح جو دُعا کی طرف لوٹتے ہیں

''آگ'' اور''ستارے'' کا استعارہ کاشف مجید کی شاعری میں نمایاں ہے''آگ'' خوف کی علامت اور ستارہ تنہائی کا استعارہ ہے۔اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ''آگ'' کو اپنے شعروں میں اس ڈھنگ سے استعمال کرتے ہیں کہ کہیں بھی خوف کا عنصر غالب نہیں آیا بلکہ انہوں نے''آگ'' کو ایک دوست کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور انسان اور آگ کے تعلق کو ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے قریب سے قریب تر دِکھانے کی کوشش کی ہے اور کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

جدید کار شعراء میں اُن کی جداگانہ حیثیت یہ بھی ہے کہ وہ''ستارے''؛''آسمان''؛''آفتاب''؛''پرندے''؛''تیر''؛''کمان''؛''پانی'' اور ''آنکھیں'' جیسے عام استعاروں کو اس خوبی سے اشعار میں استعمال کرتے ہیں کہ سادگی میں بھی بڑی بات کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ تو یہ تک بتاتے ہیں کہ جلانا تو آگ کا صرف ایک روپ ہے''آگ'' کا دوسرا چہرہ ضیا بھی تو ہے اسی لیے تو وہ کہتے ہیں:

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے حکم پر کاشف
کبھی چراغ کبھی چاندنی میں ڈھلتی ہے آگ

کبھی کبھی تو وہ آگ کی حمایت میں اس قدر نظر آتے ہیں کہ حالتِ وجد میں خود کو آگ بھی کہہ جاتے ہیں یعنی کسی کے عشق میں ''شعلہ''۔۔۔حرارت کا منبع ایک وجود جو خود کو اُس انسان سے لاکھ درجے بہتر جانتا ہے جو کہتا کچھ ہے راستہ کوئی اور دکھاتا ہے اور خود ساتھ چلنے کا وعدہ کر کے دوسری جانب چل دیتا ہے اسی لیے تو وہ کہتے ہیں:

غلط کہ تیری طرح راستہ بدلتی ہے آگ
جہاں بھی جاؤں مرے ساتھ ساتھ چلتی ہے آگ

شاعر ابھی بھی چپ نہیں ہوا وہ مانگ رہا ہے اور اپنی اس خواہش میں جل رہا ہے کہ

خدائے ارض و سما اب اک ایسا رستہ بھی
کہ جس پہ چل کے ملے آگ بھی ستارہ بھی

یہ اُن کے منہ سے اچانک نکلی ہوئی وہ بچی بات ہے جس میں وہ خود پورے کے پورے چھپ کر بیٹھے ہیں شاعر کی یہ حسین شعری واردات اُن کے لاشعور کی بھرپور ترجمانی کر رہی ہے وہ خود اپنی منزل متعین کرنے کے بعد مانگ رہے ہیں حالانکہ "دینا" دینے والے پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ کیا دے گا۔۔۔ یہی اُن کی معصومانہ پکار ہے اور اُن کی سادگی تمام تر اُس میں موجود ہے۔۔ لیکن پھر اپنی دُعا کے پوری ہونے کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر یوں کہتے ہیں:

آگ ہے تُو یہ بات مان بھی لے
کب تلک تیرے ساتھ پانی رہے

اُن کی شاعری میں حیرانی کا عنصر نمایاں ہے۔ کبھی تو یوں لگتا ہے کہ وہ آنکھ بند کرتے ہیں تو خود کو آسمان کی وسعتوں میں ستاروں سے کھیلتا ہوا پاتے ہیں اور آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں جستجو اپنی پوری طاقت کے ساتھ دھکیلتی ہوئی اُن کو اُوپر سے اُوپر ہی لیے جاتی ہے لیکن یہ کیا؟ یہ کیسا راستہ ہے کہ ختم ہونے کو ہی نہیں آ رہا اور یہ سفر کیسا ہے کہ جس کی کوئی منزل ہی نہیں۔۔۔ اور پھر یہ کہ اُن کی سوچ اگلا قدم رکھنا چاہتی ہے لیکن کیا کیا جائے آگے تو دھرتی ہی ختم ہو جاتی ہے، تو اگلا قدم کہاں رکھا جائے۔۔۔ اسی حالتِ حیرانی میں شاعر لوٹنے کی بات کرتا ہے۔۔۔ تو کیا یہ غلط ہے؟

زمیں کی آخری سرحد پہ آسماں سے اُدھر
مَیں جی رہا ہوں ترے حلقہ اماں سے اُدھر

اک اور روپ میں اب کے طلوع ہوں گے ہم
غروب ہوتی ہوئی ساعتِ زماں سے اُدھر

بس اک تمہارے سوا کچھ سنائی دیتا نہیں
عجیب شور سا ہے میرے جسم و جاں سے اُدھر

شاعر نے کتاب میں چند ایک نظمیں بھی شامل کی ہیں لیکن وہ غزل میں اس قدر کھو گئے ہیں کہ حصہ نظم کو وہ اُس طمطراق اور ڈھنگ سے نہیں سجا سکے جس طرح انہوں نے غزل کے باغیچے کو مہکایا ہے۔ نظم بھی اُن کے لیے اظہار کا بہترین ذریعہ بن پائے گی اگر وہ غزل جیسی حیرانی اور جستجو کو شریکِ سفر بنا لیں۔

اُمید ہے اُن کا یہ مجموعۂ کلام اُردو شاعری میں بلند مقام بنانے میں کامیاب ہوگا۔

''خامشی جب کلام کرتی ہے''

توقیر تقی

فَتَکَلَّمُوْ تعرَفُوْا. (حضرت علیؓ) ''کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ۔''

درونِ ذات برپا تلاطم کا شہود کی سطح پر آنا کلام کہلاتا ہے۔ شاخِ زبان سے پھوٹنے والا ہر لفظ صاحبِ کلام کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے جس کی ہر شعاع دروِ ذات وا کرتے ہوئے اندر کی وادیوں کی سیر کراتی ہے اب یہ دیکھنے والے پر منحصر ہے کہ اس کی آنکھیں کیا دیکھنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ کلام کا تعلق تخلیق سے ہے اور تخلیق کی بہترین مثال بیج سے دی جاسکتی ہے کہ پہلے مٹی تلے کچھ عرصہ قیام' پھر زمین کو چیرتے ہوئے اس کی کونپل کا پھوٹنا پھر پودا بننا اب یہاں سے مالی کے کام کا آغاز ہوتا ہے جو اس کی بہتر طور پر تراش خراش کرتا ہے تا کہ یہ صحیح رخ پر پروان چڑھے اور تناور درخت بنے یعنی باغبان اسے جمال بخشنے میں مدد فراہم کرتا ہے اور یہی جمالیات شاعری ہے۔ کائنات میں کتنے رنگ ہیں۔ سورج' روشنی اور حرات کا منبع' چاند جمالیات کا آئینہ' ستارے دُکھ کی علامت' زمین تخلیق کا استعارہ یہ سب کائنات کے رنگ ہیں اور یہی تنوع اسے حسن فراہم کرتا ہے کسی ایک رنگ کو مسلسل دیکھنے سے آنکھیں اُکتا جاتی ہیں۔ تصویر کا سارا حسن مختلف رنگوں کے ہم آہنگ ہونے سے ہے ابرار عابد کی شاعری انہی مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے اور ہر رنگ اپنا بھرپور تاثر لیے ہوئے ہے۔ اس مجموعہ کا عنوان ''خامشی جب کلام کرتی ہے'' ہی یارانِ نکتہ داں کے لیے صلائے عام ہے۔

ابرار عابد مجموعی طور پر غزل کے شاعر ہیں ہر چند انہوں نے کچھ نظمیں چند قطعات اور جاپانی صنفِ سخن ہائیکو میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن محض طبع آزمائی کی حد تک۔ اہلِ علم کے لیے تو ابرار عابد کا فن کسی تعارف کا محتاج نہیں لیکن جو انھیں نہیں جانتے وہ ان کے فن کی پختگی اور الفاظ پر گرفت کا اندازہ حمد و نعت کے حوالے سے کہے گئے اس شعر سے کرسکتے ہیں:

یارب ترے کمال کی حد تو نہیں مگر
تخلیقِ مصطفیٰؐ تری حدِ کمال ہے

ابرار عابد نے روایت کی پاسداری کے لیے غزل جیسی صنف کو چنا جو اس خطے کی ہم مزاج صنفِ سخن ہوتے ہوئے قدماء کا مرغوب اظہار یہ رہی ہے اردو غزل کی روایت میر و غالب جیسے لیجنڈ سے جڑی ہوئی ہے۔ میر کے ہاں سے تاثر اور غالب کے ہاں سے تفکر کی کیفیت ''خامشی جب کلام کرتی ہے'' میں جا بجا نظر آتی ہے۔ ابرار عابد کی غزل میں تاثر کی کیفیت (جو کہ شاعری کی بنیادی شرط ہے) ان کی قدرتِ بیان کی غمازی کرتی ہے شعر جس قدر حقیقت کے قریب رہ کر کہا جائے اس میں تاثر اسی قدر زیادہ ہوتا ہے۔

بے سبب آئے نہیں آنکھ میں آنسو اے دوست
شیشۂ دل کے درکنے کی صدا آئی ہے

سب دیکھتے ہیں چشمِ ترحم سے میری سمت
کیا میرے دُکھ کا اب کوئی چارہ نہیں رہا

ایسا بھی نہیں ہے کہ مرا گھر نہیں کوئی
آوارہ تو یوں ہوں کہ پتہ بھول گیا ہوں

تاثر کے ساتھ ساتھ شعر اپنے خالق سے تفکر کا تقاضہ بھی کرتا ہے شعری صفات میں جہاں تاثر کی اہمیت ہے وہاں تفکر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ شعر شاعر کی فکر ہی کا نتیجہ ہوتا ہے دنیا کو ہر شخص دیکھتا ہے لیکن اپنی اپنی نظر سے۔ شاعر کسی بھی چیز کو اس زاویے سے دیکھتا ہے جہاں عام ناظر کی نظر نہیں جاتی پھر شاعر کی فکر اس میں نئے رنگ بھر دیتی ہے ابرار عابد اسی نظریے سے خوب واقف ہیں اور ہر چیز کو اپنی نظر منفرد سے دیکھتے ہیں' یہی انداز

نظران کے کلام کو اُچھوتا رنگ عطا کرتا ہے اس کے اظہار کے لیے اس مجموعہ میں اشعار کی کمی نہیں جابجا ایسے اشعار مکمل شعری اُپج اور پوری فنی پختگی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ کہیں کوئی ایک شعر جس سے محض خانہ پُری کا گمان ہو ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔

ہم اِک اکائی تھے جب تک تھے آسمانوں میں
زمیں نے بانٹ دیا ہم کو خاندانوں میں

اپنی بصیرت سے ہوں خائف کاش نہ ہوا یسا
حال کے آنسو دیکھ رہا ہوں دیدۂ فردا میں

اِک آئنہ ہوں فضا ڈھل گئی تو چمکوں گا
انا ہوا میں ابھی گردِ ماہ و سال میں ہوں

پہلے عرفانِ ذات کا تھا جنوں
اب یہ غم ہے کہ آگہی کیوں ہے

ہر چند نئی بات شاذ ہی ہوتی ہے مگر اسے کہنے کا ڈھب اسے نیا بنا دیتا ہے۔ ابرار عابدؔ اسی نظریے کے مقلد نظر آتے ہیں مگر اس تقلید میں بھی وہ اجتہادی روش اختیار کرتے ہیں اور عام رستے سے ہٹ کر چلتے ہیں اس ضمن میں وہ خود کہتے ہے:

غمِ حیات و غمِ عشق کو بہم کر کے
ہم اہلِ درد نے راہیں نئی نکالی ہیں

تخیل نئی ہو یہ ضروری تو نہیں ہے
کہہ بات پُرانی مگر آہنگ نیا دے

یہی نئی راہیں انھیں کلیشے سے بچاتی ہیں اور انھیں ایک الگ انداز عطا کرتی ہیں۔ ابرار عابد کا کمال یہ ہے کہ وہ روایت کی زمین پہ رہتے ہوئے نئی فضاؤں میں پرواز کرتے اور نئے آسمانوں کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری کی روایت سنگِ درِ جاناں پہ پیشانی رگڑتے دکھائی دیتی ہے لیکن انھوں نے ایک اور ہی زاویے سے عشق کو دیکھا ہے اور انسانی وقار مجروح نہیں ہونے دیا بلکہ اپنی خودداری اور انا کو بچاتے ہوئے سوختہ ہو کے بھی اکسیر رہے ہیں۔ وقت کے آگے جھکنا گوارہ نہیں کیا' چاہے دنیاوی فائدوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔

ہیں سوختۂ شمعِ محبت سو ہیں اکسیر
ہم گردِ رہِ کوچہ و بازار نہیں ہیں

رِ محبت کا بھرم رکھتے ہیں عابدؔ
عاشق ہیں سگِ کوچۂ دلدار نہیں ہیں

ہم کہ امینِ حرمتِ فن تھے وقت کے آگے جھک نہ سکے
اپنی شہرت کے رستے میں، ہم خود ہی دیوار ہوئے

میں ابرار عابدؔ کے فن کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے، خارج کے واقعات کو داخل کا تجربہ بنا کر پیش کیا ہے اور اس تجربے میں ان کا فن کہیں بھی لرزش کا شکار نہیں ہوا بلکہ اس خوبصورتی کے ساتھ غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہوا ہے کہ اس پہ خارج کا گمان تک نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے اسلوب کی تازہ کاری سے مضامین جس نئے انداز سے پیش کیے ہیں وہ ان کی فنی مہارت پر دال ہے۔

کہاں ممکن پھر اس کی بازیابی
جسے دنیا نے اغوا کر لیا ہے

دُکھ اپنے چھپاؤ کہ ستم گر ہے زمانہ
نکلا نہ کرو چہرے کو اخبار بنا کے

یہ سانحہ تو میرا جگر چاک کر گیا
جو مجھ میں جی رہا تھا وہ انسان مر گیا

کربلا کا حوالہ اردو غزل میں قریب قریب ہر بڑے شاعر کے ہاں ملتا ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ اردو غزل میں کربلا کو غم، ظلم اور ناانصافی کے خلاف فتح حق کے مضبوط استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ابرار عابد نے کمال فنی پختگی سے انسان کے بطون میں خیر وشر کی لڑائی (جس میں شر کی ظاہری فتح ضرور ہے) کو کربلا کے حوالے سے داخل کا حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔

خاک اُڑ رہی ہے اب عرصۂ حیات میں
قتل ہو گا ہوں مَیں کربلائے ذات میں

عابدؔ شکستہ حالی کا اپنی سبب یہ ہے
ہم دستِ ظلم پر کبھی بیعت نہ کر سکے

سنگ دلی حساس شاعر کی خاصیت نہیں یہی سبب ہے کہ معاشرے کے منفی رویے اسے خاموش نہیں رہنے دیتے چنانچہ معاشرے کا ظلم، ناانصافی اور استحصال کا عفریت اس کے اندر بھرپور احتجاج کو جنم دیتا ہے جو کہ نوکِ قلم تک آتے آتے شدید طنز کا روپ دھار لیتا ہے ابرار عابدؔ بھی چونکہ اسی آب وہوا میں سانس لیتے ہیں اور معاشرے کی منفی تبدیلیوں سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے احتجاج کا راستہ اختیار کرتے ہیں جو کہ نظم ہوتے ہی بھرپور طنز کی کیفیت پیدا کرتا ہے اور اس مجموعہ کے عنوان ''خامشی جب کلام کرتی ہے'' کو بھی ایک زاویے سے روحِ معنی عطا کرتا ہے۔ ابرار عابدؔ اس عہد کے انسان کو اپنے داخل میں جگہ دیتے ہیں لہٰذا خود کو اس معاشرے سے کٹا ہوا نہیں رہنے دیتے:

پل بھر کو جو سرنگوں ہوا تھا
مَیں روح کی چیخ سُن رہا تھا

آنکھیں ہیں کھلی ذہن ہیں خوابیدہ ہمارے
بیدار نظر آتے ہیں بیدار نہیں ہیں

اللہ رے یہ وسعتِ دامانِ احتیاج
انسان کا ضمیر بھی نیلام گھر میں ہے

عیب چہروں کا ہے یا نقص ہے آئینوں کا
لوگ کیوں آئنہ خانوں سے حذر چاہتے ہیں

ابرار عابدؔ کی شاعری کے دیگر رویوں میں اہم ترین رویہ محبت ہے جو انسان کے خمیر میں گندھا ہوا ہے اور شاید انسان کی تخلیق کا مقصد بھی یہی ہے۔ ابرار عابد ہجر و وصال کی باتیں کرتے ہیں۔ اس دیار میں اپنے مشاہدے اور تجربے بھی بیان کرتے ہیں لیکن ذرا الگ لہجے میں۔ ان کی غزل میں کہیں محبت میں منفی رویے رونما نہیں ہوتے بلکہ ایک پاکیزگی خیال ہر وقت ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ ہر چند عاشقانہ خیالات اردو غزل کا روایتی رنگ ہے لیکن روایتی رنگوں سے نئے رنگ اُجاگر کرنا ابرار عابد کا خاصہ ہے۔ ان کے فن نے عشقیہ خیالات میں انسانی نفسیات اور جذبات کی تصویر کھینچنے میں محض تخیلاتی فضا' پٹے ہوئے مضامین اور کھوکھلی مبالغہ آرائی کے بجائے سچے رنگوں کا انتخاب کیا ہے اور اپنے اسلوبِ بیان اور اندازِ فکر سے حقیقت پسندی اور فنی پختگی کا بین ثبوت دیا ہے:

جب بھی آتا ہے اس بدن کا خیال
روح میں روشنی اُترتی ہے

کیمیا کرتا ہے یا راکھ بنا دیتا ہے
دیکھنا ہے کہ ترا غم ہمیں کیا دیتا ہے

جونک پتھر میں بھی لگتی ہے یقیں آئے مجھے
میری فرقت میں کسی رات اگر تُو جاگے

اس سے بچھڑ کر بھی ہم عابدؔ اس کی آگ میں جلتے ہیں
سورج ڈوب چکا ہے لیکن اس کی تمازت باقی ہے

عشق اعزاز ہے عابدؔ اسے تہمت نہ سمجھ
تمغۂ عشق کو سینے پہ سجا رہنے دے

علی محمد فرشی کی شاعری

علی محمد فرشی **امیجسٹ** ہے لیکن اس کے ہاں حقیقت یک رنگی نہیں اسی لیے وہ لفظ کی کئی معنوی سطحیں دریافت کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس کی نظموں میں موجود لفظوں کے شیڈز سے ان کہی باتوں کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ وہ پُراذیت روح کو ساتھ لے کر چلتا ہے لیکن اپنے تجربے کو تخلیقی عمل سے یوں گزارتا ہے کہ نظم قاری کے لیے ایک خوبصورت اور پُرکیف تخلیقِ مکرر کا درجہ اختیار کر لیتی ہے "علینہ" ان نظموں میں سے ایک ہے جن کے ساتھ آپ Live کرتے ہیں اور جو آپ کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ بیک وقت ایک نظم بھی ہے اور کئی نظمیں بھی۔ اس طرح یہ مستقبل کی طویل نظم کی ایک نئی جہت بھی معلوم ہوتی ہے جب ہم لوگ اپنے زمانے میں نظم کو پانچ کینوزیں تقسیم کرتے تھے تو اس زمانے کا نقاد اسے ایک نظم ماننے سے انکار کرتا تھا' بعدازاں اسے تسلیم کر لیا گیا لیکن علی محمد فرشی اس سے بھی آگے نکل گیا ہے' اس نے چوبیس اکائیوں کو جوڑ کر ایک بڑی اکائی بنائی ہے۔ یوں زندگی کی مختلف حقیقتوں اور صداقتوں کے مختلف رنگوں کو یکجا کر کے ایک منفرد نظم تخلیق کی ہے۔ "علینہ" ایسی شاہکار نظم ہے جو تخلیق نہیں کی جاتی بلکہ ہو جاتی ہے۔۔۔ اس کے لفظوں میں ایک روشنی ہے جو مفہوم اور معنی سے بالا ہے جسے یہ نعمت مل جائے اُسے اور کیا چاہیے۔

تحریر: ضیاء جالندھری ("زندگی خودکشی کا مقدمہ نہیں" از علی محمد فرشی کے بیک فلیپ سے)

ربط پارے

ڈاکٹر جمیل جالبی / کراچی

''حریم ادب'' کے ملنے کی رسید تو میں نے دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط گم ہو گیا۔ اللہ ہم سب کی مدد کرے۔

اب یہ لکھ بھیجئے کہ ''حریم ادب'' کا تازہ شمارہ کب تک آ رہا ہے تاکہ میں کوئی تحریر بروقت بھیج سکوں۔ اصل میں مَیں تاریخ ادب اُردو کی جلد سوم و چہارم میں لگا ہوا ہوں۔ سارا وقت اسی کی نذر ہو جاتا ہے۔ میں کسی سے خفا نہیں ہوتا۔ خفا ہونے کیلئے تو فرصت چاہیے جو اس وقت میرے پاس نہیں ہے اور پھر یہ کہ میں آپ سے کیوں اور کس بات پر خفا ہوں گا۔ آپ محبت کرتے ہیں کیا یہ میرے لیے کافی نہیں ہے؟ دُعا ہے یہ خط آپ کو مل جائے۔

شمس الرحمان فاروقی / انڈیا

جیسا کہ مَیں نے آپ کو E-mail پر اطلاع دی تھی ''حریم ادب'' کی کتاب اوّل جب آپ نے مجھے دوبارہ بھجوائی تو ملی۔ کتاب اس وقت یہاں پہنچی جب میں بہت بیمار تھا۔ اس لیے جواب یا رسید فوری نہ لکھ سکا تھا۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ کتاب دوم مل جائے تو اسے بھی دیکھ کر اپنے تاثرات بھیج دوں لیکن کتاب دوم مجھے اب تک ملی نہیں ہے۔ کتابیں اور رسالے دوستوں کی محبت کی بنا پر بہت کثرت سے مجھے ملتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی میں بھول بھی جاتا ہوں کہ کون کتاب کب آئی اور کب میں نے اس کی رسید بھیجی۔ فی الحال تو یہی عرض کرنا ہے کہ ''حریم ادب'' مجموعی حیثیت سے بہت کامیاب معلوم ہوا لیکن یہ ضرور ہے کہ ابھی تک یہ نہیں دکھائی دیا کہ اس رسالے یا کتاب کی کوئی خاص جہت یا پالیسی ایسی ہوگی جو اسے اس کے معاصروں میں ممتاز کرے گی۔ بہر حال ابھی تو روزِ اوّل ہی ہے۔ یقین ہے کہ جلد ہی ''حریم ادب'' اپنی انفرادی شان پیدا کر لے گا۔

میں آپ کی یہ بات پڑھ کر دیر تک ہنستا رہا کہ آپ نے حریم ادب کتاب اوّل کے نسخے مناظر عاشق اور صلاح الدین پرویز کو بھجوائے تھے کہ مجھے بھیج دیئے جائیں اور ان لوگوں نے آپ کو تصدیق بھی کر دی کہ یہ امانت مجھ تک پہنچا دی گئی ہے۔۔۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی / انڈیا

''حریم ادب'' کا پہلا شمارہ ملتے ہی میں نے آپ کو خط لکھا تھا اور دو تخلیق بھی بھیجی تھیں۔ غالباً وہ لفافہ ڈاک کی نذر ہو گیا۔ یہاں ڈاک کا نظم بے حد خراب ہے۔ ''حریم ادب'' احباب کو رجسٹرڈ ڈاک سے میں نے یہاں بھیج دیا تھا۔ مظہر امام اور اسلم حنیف نے ملتے ہی اطلاع مجھے دی تھی۔

آپ نے اتنا معیاری اور اتنا متنوع رسالہ شائع کیا ہے کہ بے اختیار مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے۔

اسلم حنیف / انڈیا

کچھ یوم قبل ادارہ کی جانب سے براہِ راست ''حریم ادب'' کا افتتاحی شمارہ ملا ہے' پیکٹ میں آپ کا مکتوب بھی موجود تھا' پڑھ کر احساس ہوا کہ ڈاکٹر مناظر صاحب نے یہ شمارہ مجھے بروقت روانہ کر دیا تھا لیکن میرے جواب نہ دینے کی وجہ سے آپ کو مغالطہ بھی ہوا اور رسالہ بھیجنے کی زحمت بھی اُٹھانی پڑی۔ دراصل مَیں بے حد صبر آزما معاملات سے دوچار ہوں۔ ان دنوں بچے کی صحت زیادہ خراب چل رہی تھی جس کی وجہ سے جواب نہیں دے سکا۔ معذرت خواہ ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ آئندہ کم از کم ضروری اطلاع دینے میں کوتاہی نہیں برتوں گا۔۔۔

آپ نے پہلا شمارہ ہی اتنا خوبصورت اور معیاری نکالا ہے کہ مستقبل کے شماروں کے بارے میں کسی قسم کی کمزور رائے قائم نہیں کی جا سکتی اس کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے۔☆ آپ کو خط لکھنے بیٹھا ہوں تو ڈاکٹر فہیم اعظمی کی یاد آتے ہی اچانک آنکھیں ڈبڈبا گئی ہیں۔ پاکستان کے محسنین میں

☆ کتاب II ڈاک سے بھیجی جا چکی ہے (جس میں معزز مکتوب نگار کا مقالہ بھی شامل ہے) گمان ہے کہ اُنھیں نہیں ملی۔ ممکن ہو تو اسے درج ذیل ویب سائٹ پر ملاحظہ فرمالیں۔ http://www.urdustan.net/hareem-e-adab/kitaab/2

ان کا کام میرے لیے بے حد قابلِ احترام رہا ہے۔ اُنہوں نے مجھے شائع ہی نہیں کیا بلکہ وقتاً فوقتاً شفقت سے بھرے خطوط بھی لکھے اور آج اسی ملک کے جاوید حیدر جوئیہ صاحب سے مخاطب ہوتے ہی مرحوم کیوں یاد آ گئے ہیں؟ مَیں خود بھی اس راز کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں رسالے کے مشمولات پر اظہارِ خیال کرنا چاہتا تھا لیکن مرحوم ڈاکٹر فہیم اعظمی صاحب کی تکلیف نے دماغ کو بوجھل کر دیا ہے۔ اس لیے اللہ حافظ

بھگوان داس اعجاز / انڈیا

پرچہ کی ورق گردانی کی تو طبیعت خوش ہوگئی۔ مشرف عالم ذوقی کا افسانہ 'ایک گاؤں ابھی ابھی شہر میں ہے' پڑھا' اچھا لگا اور افسانے بھی پڑھوں گا۔ غزلیات میں امین خیال' سیّد قاسم جلال' خاور اعجاز' کرامت بخاری' ناصر بشیر' سعید اقبال سعدی' محمد مظہر نیازی' شگفتہ الطاف' رابعہ سرفراز اور جاوید حیدر جوئیہ کے بیشتر اشعار اچھے لگے نظمیں بھی تقریباً سبھی اچھی لگیں۔ صفحہ ۲۶۰ پر علی حسین جاوید کا یہ شعر:

لذت ہجر کی تجھ پر بھی حقیقت کھلتی
تو بھی اے کاش پرندوں سے محبت کرتا

شعر اچھا ہے معاف کیجئے میری ناقص رائے میں اے کاش کی جگہ آ کاش ہوتا اور ممکن ہے یہ سہو کتابت ہو؟ اکبر حمیدی سے آپ کا لیا گیا انٹرویو بھی دلچسپ ہے اور یہ شعر متوجہ کرتا ہے:

ظلمتیں دنیا میں ایسی چھا گئیں
طاقتوں سے طاقتیں ٹکرا گئیں

حمد میں بھی خورشید بیگ میلسوی کے کچھ اشعار نے دل پر چھاپ چھوڑی' جیسے:

وہی جو ماں کی دُعاؤں کو رد نہیں کرتا ‏‏ ‏ وہی جو سر سے بلاؤں کو ٹال دیتا ہے
جب آفتابِ تخیّل گہن میں آ جائے ‏ ‏ ‏ وہ ذہن و دل کے دریچے اُجال دیتا ہے

ستیہ پال آنند اور خورشید بیگ میلسوی کا نعتیہ کلام بھی بہت اچھا لگا۔ پرچہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔

نصیر احمد ناصر / راولپنڈی

''حریم ادب''2 مل گیا تھا' خرابیِ صحت اور مصروفیت کے باعث رسید نہ بھجوا سکا۔ اس دوران کئی بار آپ نے فون بھی کیا۔ شرمندہ ہوں کہ مناسب پذیرائی نہ کر سکا۔ دراصل میں بہت کم لکھتا ہوں ورنہ آپ کی فرمائش ضرور پوری کرتا۔ ''حریم ادب 2'' بہت معیاری ہے اور ''تسطیر'' کی طرح خاصا متنوع بھی!

ظفر اقبال / لاہور

میرے کچھ شعر غلط چھپ گئے ہیں۔ آپ کی پروف ریڈنگ تو بے حد معیاری ہے' غالباً مَیں ہی غلط لکھ گیا تھا۔ صحیح شعر اس طرح تھے' اگر اگلے شمارے میں چھاپ دیں تو ممنون ہوں گا۔

کسی لرزتے ہوئے ستارے پہ جا رہا تھا ‏ ‏ ‏ میں نصف تھا آپ' اور' سارے پہ جا رہا تھا
نظر میں تھے میری دُور کے تابناک اندھیرے ‏ ‏ ‏ جو روشنی کے سیاہ دھارے پہ جا رہا تھا

پرچہ آج ہی ملا ہے' اور' ابھی صرف سُونگھا ہے۔ پہلے شمارے سے بہر حال بہتر ہے۔
مضامین میں آپ نے جگہ جگہ جو سوال اُٹھائے ہیں' اُن سے ڈائیلاگ کی ایک مستقل صورت بھی نکلنی چاہیے۔

دیوندر اسّر / انڈیا

آپ کا خط ملا۔۔۔ اور ''حریم ادب'' کی دونوں کتابیں بھی۔ اس عنایت کے لیے از حد شکر گزار ہوں۔ کچھ حصہ پڑھا ہے۔۔۔ اور کچھ باقی

ہے، جسے اوّلین فرصت میں پڑھنے کی کوشش کروں گا۔ آپ نے بڑی لگن، محنت اور سوجھ بوجھ سے مواد کا انتخاب کیا ہے اور اُسے قارئین تک پہنچایا۔

حالانکہ میری ذاتی خواہش رہی ہے کہ ہماری کوشش یہی ہونی چاہیے کہ ہم مستقبل کی جانب فکری ارتقا کے لیے نئی اور تازہ طریق فکر کی اشاعت کریں۔

مجھے کچھ ایسا احساس ہوا کہ ہم کہیں Stuck up ہو گئے ہیں۔ پس ساختیات یا مابعد جدیدیت یا ایسے ہی ڈسکورس اب نہ صرف پُرانے پڑ گئے ہیں۔ بلکہ قریب قریب وہی باتیں بار بار دُہرائی جا رہی ہیں جو اس کے قبل کئی برسوں میں کہی جا چکی ہیں۔ سوال صرف اصطلاحات اور اُس کی Reinforcement کا نہیں بلکہ ارتقا اور نئے سوالات اُٹھانے کا ہے۔ اس جانب بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

فی الحال کچھ نئی چیز موجود نہیں۔ حالانکہ کچھ ایسی مطبوعہ تحریریں ہیں جو ہندوستان میں تو چھپ چکی ہیں لیکن پاکستان میں نہیں چھپیں۔ اردو رسائل جو سرحد کے آر پار آتے ہیں وہ عام طور پر ادیبوں تک ہی محدود رہ جاتے ہیں۔ عام قارئین تک نہیں پہنچتے۔ لہٰذا اس جانب بھی اشاعتی پروگرام میں توجہ دینے کی ضرورت ہے۔☆

وہاب اشرفی صاحب کا پتہ حاصل کرنے کے بعد دوسری کتاب ان کو بذریعہ ڈاک بھجوادی جائے گی۔ مطمئن رہیں۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند/امریکہ

''حریم ادب'' کے شمارے کی دو کاپیاں موصول ہوتے ہی ایک ای میل بھیجی تھی/جو ڈیلور نہیں ہوئی اور لوٹ آئی☆☆ وجہ نامعلوم۔ پھر ایک ڈیڑھ ماہ تک نامساعد حالات سے لڑتا بھڑتا رہا۔ میرا اور بیگم آنند کا ایک پاؤں ہسپتال کے اندر رہا تو ایک باہر۔ ایک پیری و صد عیب' والا معاملہ ہے۔ یہ خط بھی لکھ رہا ہوں تو احساس ہو رہا ہے کہ آپ جانے کیا میرے بارے میں سوچتے ہوں گے۔

تفصیل سے خط پھر لکھوں گا۔ فی الحال صرف اتنا ہی کہ۔۔۔ یہ شمارہ میری توقعات سے بڑھ کر ہے۔

ڈاکٹر احمد سہیل/امریکہ

کل ''حریم ادب نمبر 2'' ملا، شکریہ۔

مضامین اور نظمیں شائع کرنے کا شکریہ! مصاحبوں نے پرچے کی منزلت میں مزید اضافہ کر دیا تمام کے تمام مندرجات خوب تھے۔ جدید ترین علمی اور فکری نظریات پر آپ کا پرچا ئی شناخت بنائے گا۔

پرچے میں تازہ کاری بہت ہے جو اچھا شگون ہی نہیں بلکہ پرچا سنجیدہ قارئین میں مقبول ہوگا۔ علمی اور تخلیقی مواد کے علاوہ اچھا خاصا تحقیقی کام بھی پرچے میں نظر آتا ہے۔ اس سے کئی لوگوں کا بھلا ہوگا۔

جمال اویسی/انڈیا

آپ کے بھجوائے ہوئے رسالہ ''حریم ادب'' کا ابھی ابھی مطالعہ کر کے اُٹھا ہوں۔ تین انٹرویو، ڈھیر ساری غزلیں اور بہت ساری نظمیں، ساتھ میں راشد پر دو عدد مقالات اور ان کے علاوہ اسلم حنیف کا تجزیاتی مضمون بہت خوب ہیں۔ آپ کی دوسری غزل کی ردیف بہت پسند آئی اور یہ اشعار بھی پسند آئے۔

☆ اس سلسلے میں اقدام اوّل کے طور پر ''حریم ادب'' کو انٹرنیٹ پر آن لائن کر دیا گیا ہے اور درج ذیل لنک پر اہلِ ادب دُنیا کے کسی بھی حصے میں رہتے ہوئے ہمارے ساتھ ''شریکِ محفل'' ہو رہے ہیں۔ http://www.urdusfan.net/hareem-e-adab۔ (ج۔ح۔ج)

☆☆ براہ کرم نوٹ فرمالیں کہ ''حریم ادب'' کے فی الحال صرف تین (3) ای میل ایڈریس ہیں:

hareem_e_adab2@yahoo.com, hareem_e_adab2@hotmail.com, hareemeadab@gmail.com

ان کے علاوہ کوئی ایڈریس نہیں ہے۔ ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کچھ لوگ ملتی جلتی ID بنا کر نہ صرف قارئین کو دھوکا دے رہے ہیں۔ بلکہ اُن سے ''حریم ادب'' کے نام پر اپنے رسالوں کے لیے مواد بھی منگوا رہے ہیں۔ براہ کرم مرتبین تک پیغامات (اور مواد) صرف انہی ID پر بھیجیں جو لکھی گئی ہیں۔ (ج۔ح۔ج)

یہاں وہاں مرے اندر سے بولتا ہے کوئی
مَیں ہوں کہ ہاں مرے اندر سے بولتا ہے کوئی

تجھے پھلانگ کے اگلا قدم کہاں رکھوں
اے آسماں مرے اندر سے بولتا ہے کوئی

(بلکہ یہ پوری غزل بہت خوب ہے) اتنا خوبصورت، علمی اور معیاری رسالہ (کتابی سلسلہ) بھجوانے کے لیے بے حد شکر گزار ہوں لیکن ''حریم ادب'' کا پہلا شمارہ (نقش اوّل) بھی تو بھجوایئے۔ (اگر ممکن ہو سکے) حضرت سیّد تحسین گیلانی صاحب کو میرا اسلام کہیے۔

امجد اسلام امجد/لاہور

''حریم ادب'' کا تازہ شمارہ ملا، شکریہ

اب میرے خیال میں یہ سنتے سنتے آپ کے کان پک گئے ہوں گے کہ بورے والا جیسی جگہ سے ہر طرح کے نامساعد حالات کے باوجود آپ نے یہ ادبی رسالہ نکال کر بہت بڑا جہاد کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو میں بھی اس کی تائید کرتے ہوئے اتنا عرض کروں گا کہ یہ زمانہ Presentation کا ہے۔ سوئی نسل کو اور اُن لوگوں کو جو ادب سے دلچسپی تو رکھتے ہیں مگر بوجوہ اس سے دُور ہیں، قارئین کے حلقے میں لانے کے لیے آپ کو ''ادبی مواد'' کی پیش کش کے لیے کچھ نئے طریقے بھی سوچنے ہوں گے کہ بقول حالؔی

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی

آپ کے مسائل اور وسائل کے پیش نظر یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ آپ نے غیر مطبوعہ کلام کی فرمائش کی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ اگلا پرچہ چھ ماہ بعد آئے گا کوشش کروں گا کہ چھ ماہ تک یہ غزل کہیں اور نہ چھپے اس کے بعد کا ذمہ شائد نہ لے سکوں۔

پروفیسر محمد افضل مجید شہیر اٹو بہ ٹیک سنگھ

آغاز میں حمدیں پڑھیں بہت اچھا محسوس ہوا عقیدت آمیز محبت اور احساس تشکر کے جذبات قلب ونظر پر وارد ہوئے بالخصوص خورشید بیگ میلسوی صاحب کا شعر

میں اُس سے قطرۂ شبنم کی بھیک مانگتا ہوں
وہ میری سمت سمندر اُچھال دیتا ہے

جو دیزداں کا بڑا خوبصورت اظہار ہے۔

نعتوں میں جناب ستیہ پال آنند صاحب کی آزاد شاعری کے انداز میں لکھی گئی نعت بہت متاثر کن تھی۔ پڑھ کر ایک سکھ نعت خواں کا شعر یاد آیا

صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں
عشق ہو جائے کسی کو کوئی چارہ تو نہیں

بالخصوص نعت کا یہ حصہ ''پھول اگر ہوتا/ تو اپنی خوشبو، اپنا رنگ، مبارک قدموں پر بکھراتا، آقا اور اگر میں پنچھی ہوتا/ تو اپنے سنگیت کی سنگت میں نعتوں کی برکھا کر دیتا۔'' بہت پسند آیا۔

محمد امین صاحب کی صنعت غیر منقوط میں لکھی گئی نعتوں نے سیرت کی غیر منقوط کتاب ''ہادی عالم'' کی یاد تازہ کر دی۔ جناب ناصر زیدی صاحب کی نعت عشق وعقیدت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خصوصاً مطلع نے میری ایک نعت کے ایک شعر کی یاد تازہ کر دی جو کچھ یوں ہے:

وہ دل کے حال کو کیسے نہ جانتا ہو بھلا
جو بن بتائے سمجھتا ہو مُدّعا میرا

مطلع کے علاوہ جناب ناصر زیدی صاحب کی نعت کے تیسرے اور پانچویں شعر نے بہت متاثر کیا۔غزلوں میں جناب مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کی غزل کا دوسرا شعر

دیکھنے والو اِسے میری نظر سے دیکھو
یہ مرا چاند سامُنا بھی غزل جیسا ہے

روایتی اشعار سے کچھ ہٹ کر تھا بہت پسند آیا۔
جناب ظفر اقبال صاحب کی غزلوں میں سہل ممتنع کے ساتھ جس طرح جذبات کا اظہار کیا گیا وہ انہی کا خاصہ ہے۔خصوصاً یہ شعر

یوں تو اپنا نکال سکتا ہے
آپ کا ایک ہی اشارہ کام

زندگی کے زمینی حقائق سے کس قدر قریب ہے اور اندازِ بیاں کتنا سادہ اور زود فہم اور پُر تاثیر۔اب ایسے قادر الکلام شاعر کے کلام پر تبصرہ ویسے بھی سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔
افتخار عارف صاحب کی پہلی غزل کا دوسرا، چھٹا اور آٹھواں شعر بہت پسند آئے۔مرتضیٰ برلاس صاحب کی غزل کے مطلع نے نصرت صدیقی صاحب کے شعر

سچ کی آواز کو سینے میں دبا رکھا ہے
مصلحت نے ہمیں بُزدل سا بنا رکھا ہے

کی یاد دِلائی جناب عطاالحق قاسمی صاحب کی پہلی غزل کا شعر

مرے خدا مجھے تو نے عطا کیا سب کچھ
دل حزیں ترے غم کا سرا نہیں ملتا

دل کو چھو کے گزر گیا۔اس میں کرب اور یاسیت کی عجیب آمیزش ہے۔مطلع بھی قابلِ قدر تھا۔
جناب حیدر قریشی صاحب کی دوسری غزل کے چھٹے شعر کے دوسرے مصرعے نے بہت متاثر کیا جو کچھ یوں ہے۔

آسماں ہو گئے تخلیق قفس کے اندر۔

مقطع میں ''انٹرنیٹ'' کا استعمال غزل میں نئے تجربات کی نشاندہی کرتا ہے۔غزل کا مطلع بھی قابلِ قدر تھا۔جناب صابر ظفر صاحب کی غزل کا چوتھا شعر بہت متاثر کن تھا۔مقطع بھی بہت اچھا تھا جو کچھ ایسے ہے۔

ہے رسم جاری و ساری شہادتوں کی ظفر
مگر حسینؑ کہاں ہے کہاں ہے اسماعیلؑ

جناب معین تابش صاحب کی پہلی غزل میں لفظ ''زنبیل'' کا استعمال خوب ہے۔دوسری غزل میں پانچواں شعر

شاخِ بے برگ توقُّف تجھے کرنا ہو گا
شہرِ گل سے نئے موسم کا گزر ہونے تک

بہت پسند آیا۔جناب خورشید بیگ میلسوی صاحب کی غزل کے دو اشعار (دوسرا اور پانچواں) بہت پسند آئے۔جناب صفدر سلیم سیال صاحب کی غزل کا دوسرا، پانچواں اور ساتواں شعر پسند آیا۔محترمہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ کی غزل کے پہلے دو اشعار بہت اچھے لگے۔جناب اعزاز احمد آذر صاحب کی غزل کا مقطع بہت اچھا لگا اور اس نے ''مقابلہ تو دِلِ ناتواں نے خوب کیا'' کی یاد بھی تازہ کی۔جناب اعجاز توکل صاحب کی پہلی غزل کا پہلا، چوتھا اور پانچواں شعر پسند آئے۔
دوسری غزل کے تیسرے شعر:

اُس نے مڑ کر نہیں دیکھا تو کوئی بات نہیں
یہ میاں عشق ہے اور عشق میں عزت کم ہے

میں طنز کا انداز پسند آیا۔ قطعات میں ڈاکٹر خیال امروہوی صاحب کے پہلے اور آخری قطعے نے اور آپ کے دونوں قطعات نے بہت متاثر کیا۔

جناب سیّد معراج جامی صاحب کے ''خامہ انگشت بدنداں ہے'' میں اصغر خاں کا کردار بڑا بھرپور، پُر زور اور Vivid تھا۔ ''بکھری ہوئی کہانی'' میں ڈاکٹر رشید امجد صاحب نے انسانی کم فہمی، خود پسندی اور منفیت کے رجحانات کو ایک منفرد انداز سے پیش کیا ہے۔ مشرف عالم ذوقی صاحب کے ''اک گاؤں جو ابھی ابھی شہر میں ہے'' میں چھیدی کے کردار نے بڑا متاثر کیا۔ گاؤں سے آئے ''نئے آدمی'' نے شہر میں آنے کے بعد جس طرح شہریوں کے دوغلے پن اور اخلاقی پستی کو بے نقاب کیا اور جس خوبصورتی سے ذوقی صاحب نے کردار کو پیش کیا وہ قابل تحسین ہے۔ Diction میں رمز، طنز، اور جدید افسانہ نگاری کی ایجاز و اختصار والی تکنیک اور اس کے علاوہ صیغۂ متکلم اور غائب کے امتزاج نے کہانی میں چار چاند لگا دیئے لیکن شروع کے 15 صفحات کا کھو جانا اور کہانی کی تخلیق کے 19 سال کے بعد بھی تر و تازہ دکھائی دینا اور اس میں کسی چیز کی کمی اور تشنگی کا نہ ہونا اور کرشن کانت اور اشونی پرساد کے ڈبل پلاٹس کا متوازی چلنا دونوں پر حقیقت کا انکشاف ہونا اور شکھا اور انل والی کہانی کا ذکر سب عورت کی بیوفائی کے مرکزی خیال کی طرف Converge ہوتے ہیں لیکن تہذیب یافتہ کرشن کانت کا ردِ عمل اشونی پرساد جیسے اَن پڑھ آدمی سے مختلف ہے جسے '' کچھ مضبوط ہاتھوں نے مل کر مردہ کر دیا ہے۔'' تخیلاتی سچائی جب اس شدت سے قاری پر حاوی ہو کہ کسی چیز کی کمی یا ادھورے پن کا احساس نہ ہو تو اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ایسا فن پارہ جس کے ذریعے وہ سچائی دوسروں تک پہنچی ہے ہر لحاظ سے مکمل ہے۔

انگریزی کے شاعر کولرج جب اپنی شہرہ آفاق نظم ''قبلا خاں'' لکھ رہے تھے تو کسی ملاقاتی کے آنے کی وجہ سے نظم کو پورا نہ کر سکے لیکن نظم ادھورے پن کے باوجود ایک ادبی شاہکار اور ایک اعلیٰ درجے کا نمونہ فن ہے۔ اس لحاظ سے جناب ذوقی صاحب کا ''اک گاؤں، ابھی ابھی شہر میں ہے'' اُس سے مماثل ہے۔

جناب حامد سراج صاحب کا ''آخری آئس کیوب'' 2 فلیش بیکس کے ساتھ اور جدید Stream of Consciousness کی تکنیک کے ساتھ متاثر کرنے میں کامیاب رہا۔ ایک مرد اور عورت Pre-Marital اور Post-Marital افیئر خواہش گناہ اور احساسِ گناہ کے درمیان Oscilate کرتی ہوئی کہانی دَورِ جدید کے انسان کی عکاسی کرتی ہے جو ایک عجیب سی Metaphysical Tension میں مبتلا ہے اور اُس کو یہ نہیں پتا کہ اس Spiral یا چکرویو سے نکلنے کا رستہ کیا ہے۔ مرد عورت کے تعلقات اگر ثمر آور ہیں تو شادی کے Context میں۔ اگر شادی سے پہلے ایسے معاملات ہوں بھی تو شادی کے بعد اُن کو دُہرانا یا اُس کی خواہش کرنا ایک عجیب احساسِ جرم میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کہانی کے دو لیول یا Context ہیں ظاہری مرد اور عورت کے ناآسودہ جنسی تعلق کا اور باطنی، روحانی ناآسودگی کا۔

خالد قیوم تنولی صاحب کا ''نارسائی کا رشتہ'' جس میں Epistolary Tech اختیار کی گئی اُس نے بابائے ناول رچرڈسن کی تکنیک کی یاد تازہ کر دی لیکن ایک فرق کے ساتھ رچرڈسن کی ہیروئن پامیلا کسی جاننے والے کو خط میں مخاطب کرتی ہے جس کا براہِ راست کہانی میں کوئی دخل نہیں ہوتا جبکہ ''نارسائی کا رشتہ'' میں ''حرماں نصیب'' طوائف براہِ راست اُس شخص سے مخاطب ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ ایک عجیب سی وابستگی محسوس کرتی ہے۔ بعد میں پتا چلتا ہے کہ وہ شخص منصور شیرازی زیرِ زمین دنیا کا بدنام غنڈہ ہے اور ایک ایسی دُنیا میں جہاں ایک مولوی صاحب کا ایمان بھی ایک نوخیز طوائف کے توبہ شکن حسن کی گرمی میں مثل موم پگھل جاتا ہے۔ وہاں ایک غنڈہ اُس کے خانۂ حسن سے '' بے فیض ''لوٹ جاتا ہے بلکہ اُسے بادامی رنگ کے کوٹ کے کالر میں سجا گلابی پھول اُسے تحفے میں دیتا ہے۔ دوسری ملاقات بھی یہ بتاتی ہے کہ

''آپ کی کوئی بھی صفت عام انسانوں بلکہ مَردوں سے قطعی مختلف تھی۔ میری حیرت بجا تھی۔۔۔ آپ نے ذرہ برابر التفات نہ کیا۔ آپ سدا کے تونگر تھے۔''

تیسری ملاقات میں بھی ''میں آپ کے گرد اُجلے پن کے دائرے کو نہ پھلانگ پائی۔''

چوتھی ملاقات ایک فائیوسٹار ہوٹل میں ہوتی ہے۔جس میں کہانی اپنے کلائمکس تک پہنچ جاتی ہے اور انکشاف یہ ہوتا ہے کہ ''میں تو نئے سر ے سے آپ کی عظمت کی قائل ہو چکی تھی ۔''

آخری سطور میں زہرہ نامی وہ طوائف جو منصور شیرازی سے بے پناہ محبت کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کو کچھ دیئے بغیر اُس سے بہت کچھ کی متمنی رہی ۔''بہت سستی محبت کرنے کے جرم میں مَیں لائق سزا ہوں ۔۔۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا ۔'' کچھ آگے چل کر کہتی ہے'' میں اپنی موت سے پہلے اپنے مرنے کے دن کی تاریخ نہیں لکھوں گی تاکہ آپ ہر سال کے اس دن میرے لیے ہاتھ اُٹھا کر دُعا نہ کر سکیں ۔''

زہرہ کی منفرد محبت Pathos سے معمور ہے۔ کہانی 'پڑھنے والے کے دل کو اس طرح چھوتی ہے کہ وہ اس کو بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے کسی پُر تاثیر شعر کو پڑھ کر یا سُن کر انسان پر ایک عجیب بے خودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے'' نارسائی کا رشتہ'' پڑھنے سے بھی اس قسم کے جذبات طاری ہوتے ہیں۔ آخر اس کہانی میں ایسی کون سی چیز ہے۔جس نے زہرہ بائی کے کردار کو محبت کی ایک جیتی جاگتی تصویر بنا دیا ہے اور لفظ محبت کو از خود ایک نئی رفعت سے ہمکنار کیا ہے تو وہ ہے انسانی روح کا اپنے خالق و مالک سے ابدی تعلق اور اُس سے جدائی کا احساس اور اپنے مخرج کی طرف لوٹ جانے کی شدید تمنا جو اس کہانی کے ہر لفظ ہر سطر سے جھانکتی ہوئی دکھائی ہے۔

کہانی کا یہ رنگ جس میں صوفیانہ محبت کی آمیزش ہے۔ اسے نہ صرف ظاہری طور پر ایک پُر تاثیر ادبی تخلیق بناتا ہے۔ بلکہ قاری کو ایک ایسے جہاں میں لے جاتا ہے جہاں سے لوٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ زہرہ نے جس طرح اپنی ذات کی نفی کی ہے وہ درویشانہ محبت کا خاصہ ہے

من تو شدم ' تو من شدی　　　　من تن شدم تو جاں شُدی
تاکس نگوید بعد ازاں　　　　من دیگرم تو دیگری

وہ اپنی محبت کا اظہار کچھ ایسے کرتی ہے'' تب مَیں' میں نہ رہی آپ ہو گئی۔ مَیں آپ کی ذات کے حصار میں یوں گھری کہ احاطہ نہ کر سکی زمان و مکان کے قیاسات سے بری الذمہ ہو گئی ۔''

• درویشانہ محبت کا خاصہ یہ ہے کہ درویش جب حقیقت کا پرتو دیکھ لیتا ہے عام آدمی کی سطح پر وہ مُلمع لگی زندگی کے لیے نااہل ہو جاتا ہے۔''

جدائی کا احساس اور وصل کی شدید خواہش اُس کو ایک عجیب باطنی سلگاؤ کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ خاکسار کا ایک شعر ہے

یوں ترے وصال کی آرزو میں تمام عمر گزر گئی
کئی سال قلزم وقت میں کسی لہر جیسے سما گئے

پروانے کی شمع سے ملنے کی تڑپ خطرے کی دجلے میں مدغم ہونے کی خواہش تر کی فضا میں تحلیل ہونے کی تمنا یہ سب کیفیات زہرہ کی محبت میں پائی جاتی ہیں۔ گہرے روحانی کرب اور سرشاری وصل کی تڑپ اور اس کے ساتھ والہانہ خود سپردگی اور ابطال ذات کے علاوہ تطہیر باطن یا تزکیۂ نفس جو ہونے اور نہ ہونے کے برزخ میں سے گزرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یہ بھی زہرہ کی محبت کی عکاسی کرتے ہیں۔ زہرہ محبت کی دیوی وینس بھی ہے اور وہ طوائف بھی جس کے زہد شکن حسن نے فرشتوں کو بھی بہکا دیا تھا اور پھر وہی زہرہ آسمان کا سیارہ بن گئی تھی تا کہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔ اسی طرح افسانے کی زہرہ بھی اپنے گناہوں کا اعتراف کرتی ہے۔

''جس شے کی عمر بھر حفاظت کرنی تھی اُسے ارزاں داموں نیلام کرتی رہی۔۔۔ مَیں نے بارہا آپ کی قربت کی شدید خواہش کی' حالانکہ ایسا ہونا غلط تھا۔۔۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا''

افسانے کی رمزیت کے بعد چند الفاظ اس کی موسیقیت کے بارے میں یہ بات شوپنہار سے منسوب ہے کہ'' تمام فنون موسیقی کی سطح پر پہنچنے کی تمنا کرتے ہیں۔۔۔'' ہربرٹ ریڈ نے لکھا ہے کہ موسیقار ہی وہ واحد ہستی ہے جو اپنے شعور کے بطون سے فنی تخلیق کو جنم دیتا ہے۔۔۔ مقصد اس کا صرف یہ ہوتا ہے کہ شے یا مظہر کو اوپر اُٹھا کر غنائیت کی سطح تک پہنچا دیا جائے۔۔۔ یہی بات کہانی لکھنے والوں کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے کہ چاہے وہ کردار کے نقوش کو اُجاگر کریں یا ٹائپ Type کو بروئے کار لائیں۔۔۔ وہ ہر حال میں مجبور ہیں کہ'' کہانی کی سطح'' پر پہنچنے کی کوشش کریں۔۔۔ افسانے کا فن بنیادی طور پر کہانی کہنے کا فن ہے۔

مگر کہانی محض ہوا میں تخلیق نہیں ہوجاتی اس کے نقوش کو اُجاگر کرنے کے لیے سب سے پہلے کینوس درکار ہوگا۔''

اس بحث میں اُلجھے بغیر کہ کردار ٹائپ Type ہے یا Individual اس بات کی طرف آتے ہیں کہ افسانہ نگار نے ''کہانی کی سطح'' پر پہنچنے کی کوشش کیسے کی ہے اور کس طرح خط کے ذریعے کہانی سناتی ہوئی قریب المرگ عورت کے کردار کو Convincing بنایا ہے۔ ''فنکار اگر اپنے افسانے یا ناول میں کسی واقعے' مسئلے' کردار یا انسانی زندگی پر کئی زاویوں سے روشنی ڈال کر شبیہ پیش کرے تو وہ مصور سے آگے بڑھ کر بُت تراش بن جاتا ہے اور ہیئت Three dimentional نکل آتا ہے۔'' پہلی ملاقات میں زہرہ خوش فہمی میں مبتلا ہوتی ہے دوسری ملاقات کے آخر پر ''میں پھر سے اُمید کے بلند بام پر ٹھہر گئی چوتھی ملاقات میں وہ یہ محسوس کرتی ہے کہ ''عورت ہوتی تو اپنی قیمتی ترین متاع برضا و رغبت لٹا دیتی وہ متاع جو طوائف کے پاس نہیں ہوتی'' اور چوتھی ملاقات میں وہ اُس جاگیردار سیاست دان کو طمانچہ مارتی ہے جس نے اُس کے محبوب کو گالی دی تھی۔ کردار کے مختلف پہلو اُس کی ذات کی پیچیدگی کو اُجاگر کرتے ہیں اور اُس کے دروں میں واقع ہونے والے نفسیاتی ارتقا کی نشاندہی کرتے ہیں اور آخر میں تمام چیزیں مل کر اُس المیے پر مرتکز ہوجاتی ہیں جس کے بارے میں وہ یہ کہتی ہے کہ ایک المیہ ہر بار سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہا اپنی شناخت کروانے کا خیال اس المیے کے سامنے ہیچ معلوم ہونے لگتا تھا مجھے آپ کی ناشناسی سے زیادہ اپنی نارسائی کی اذیت بھلی معلوم ہونے لگتی تھی۔۔۔ آپ اس انوکھی رمز کی تہہ میں چھپی کیفیت کو کبھی نہ سمجھ پائیں گے۔''

فنکار کے لیے اپنی ذات کی نفی کر کے اپنے کردار کو اپنے اُوپر طاری کرنا بہت مشکل ہوتا ہے بالخصوص ایسے کردار کی تخلیق کے دوران جس کی جنس متضاد ہے یعنی مرد کے لیے عورت کے کردار کی تخلیق اور عورت کے لیے مرد کے کردار کی تخلیق۔ ایک عورت کا کردار اتنے Convincing طریقے سے پیش کرنا ایک بڑی کامیابی ہے۔ خاکسار نے بھی اپنی نظم ''تجھے کیا خبر'' (جو اتفاق سے اسی شمارے میں چھپی ہے) میں ایک نسوانی کردار کو پیش کیا ہے۔ ایک مرد تخلیق کار کا اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر ایک عورت کے کردار کو اپنی ذات پر طاری کرنا اور بھرپور طریقے سے پیش کرنا فنکار کے جینیئس کی غمازی کرتا ہے۔ آخر میں چند الفاظ اسلوب کے بارے میں۔

جب افسانے کو پڑھا جاتا ہے تو یہ لگتا ہے کہ افسانہ ایک طرح کا نغمہ ہے کیونکہ جابجا خوبصورت اور موزوں الفاظ اور جملے اور علامتیں' استعارے اور تشبیہات اس کو شاعری کا رنگ دے دیتے ہیں۔ بالخصوص جب شاعرانہ حسن کے پہلو کو وحدت تاثر والے پہلو کے ساتھ Juxtapose کر کے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ افسانہ ایک غنائیہ نظم کی رفعت کو چھونے لگتا ہے۔ خوف طوالت کی وجہ سے اس پہلو کی تفصیل میں جانا راقم الحروف مناسب نہیں سمجھتا۔

ڈکشن کے حسن کو دوبالا کرنے والے بے شمار جملوں اور لفظوں میں سے چند ایک مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ جو کہانی کی تاثیر اور مجموعی تاثر میں اضافہ کرتے ہیں مثلاً

''میرے بدن پر بے شمار مہریں اور کئی ہاتھوں کے میلے لمس چسپاں تھے مجھ پر کوئی پتہ درج نہ تھا کوئی سرنامہ نہ تھا۔''

ایک اور جگہ ''آپ سَر دو شمن سے نکل کر ذلت اور غلاظت کے پاس آ پہنچے۔ ایک اُجڑی روح میلے جوہڑ کے کنارے آ پہنچی تھی۔''

پھر یہ ''آپ بڑی تمکنت سے بیٹھے تھے اور اس بندی نے نگاہوں کے کتنے ہی سجدے وار دیئے۔''

اسی طرح آخر میں یہ جملہ ''اب عمر کے کشکول میں چند سانسیں باقی ہیں'' اور ''فصیل جان کے کنگرے ایک ایک کر کے گرتے جا رہے ہیں'' شعر کے مصرعوں کی مانند ہیں جنہوں نے افسانے کے مجموعی حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور اس کے اجتماعی تاثر کو Reinforce کیا ہے۔

غرضیکہ افسانہ داخلیت' خارجیت' واقعیت' کردار نگاری' ڈائیلاگ' پلاٹ Deeper content, surface content' Sub-Text رمزیت' شاعرانہ حسن' موسیقیت یا غنائیت وحدت تاثر Thematic unity ہر لحاظ سے بے مثل ہے اور جناب خالد قیوم تنولی صاحب اتنی اچھی تخلیق پر مبارکباد کے مستحق ہیں جسے ''حریم ادب II'' کا سب سے خوشبودار پھول کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جناب اسلم قریشی صاحب کی سرائیکی تخلیق ''بارش بھی دھوپ بھی'' جس کا اردو میں ترجمہ جناب قاسم جلال صاحب نے کیا ہے ایک ایسی لطیف سی تخلیق ہے جس میں المیہ اپنی گرفت قاری پر مضبوط کرنے سے پہلے حیرت آمیز مسرت کو جگہ دے دیتا ہے۔

جناب بیدل حیدری صاحب کا انٹرویو جو جناب حامد سراج صاحب نے لیا ہے بہت بصیرت افروز ہے جس کے ذریعے مندرجہ ذیل بیزوں کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

جیسے کہ شاعری میں علم عروض کی اہمیت' غزل کی انفرادیت' ادب کے دو معنی' ادب کے معاشرے پر اثرات اور سب سے بڑھ کر ادب کی تخلیق کا بنیادی مقصد جس کا جواب جناب بیدل حیدری صاحب کے الفاظ میں کچھ یوں ہے:

ادب کا بنیادی مقصد'' دراصل تخلیق فطرت ہے۔ جب ادب تخلیق ہوتا ہے اس وقت ادیب نہ سویا ہوا ہوتا ہے نہ جاگتا ہوا ہوتا ہے۔ ادب کے لیے ملگجی لمحات میسر آئیں تو اعلیٰ ادب تخلیق ہوتا ہے۔''

نظموں میں گیارھواں طاعون نے'' سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اس کے علاوہ'' چلو اک بار پھر ہم'' اور'' کہاں گئے آفتاب چہرے'' بھی اچھی نظمیں تھیں۔'' خط الحاق'' کا اختتام ایک Paradox پر ہوتا ہے اور نظم مختصر ہونے کے باوجود ایسے ہے جیسے کوزے میں دریا انشائیوں میں جناب شفیع ہمدم صاحب کا'' آئینہ'' اور سیّد تحسین گیلانی صاحب کا'' ہونا نہ ہونا زیادہ پسند آئے'' آئینہ میں صاحب تحریر کی تخلیق کے بارے میں یہ رائے کہ ''تخلیق بھی ایک آئینہ ہے اور خواب کے آئینے کی طرح دُھندلا ہے۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کے آئینے جتنے زیادہ دُھندلے ہوتے ہیں پارکھوں کی نظر میں اتنے ہی زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔'' بہت پسند آئی۔

''ہونا نہ ہونا'' میں درویش کے بارے میں گیلانی صاحب کی رائے کہ

درویش۔۔۔ نہ ہونے کے نشے میں مست' خوف سے بے نیاز' اپنے آپ میں قید۔۔۔ اپنی تلاش میں محو سفر رہتا ہے۔۔۔ مکان و لامکان کی قید سے آزاد ہر جگہ پر تصرف رکھتا ہے۔۔۔'' نہ ہونے'' کی بے زبانی اُسے لامحدود کر دیتی ہے۔''

درویشی کی کنہ پر دلالت کرتی ہے۔ صاحب تحریر کا مشاہدہ' محسوسات اور اظہار رائے سب قابلِ تحسین ہیں۔

جناب اکبر حمیدی صاحب کے انٹرویو میں انشائیے اور افسانے کے بارے میں مصنف کا فکر انگیز تجزیہ' انشائیے کا بدلتا ہوا آہنگ انشائیے کے افسانے پر اثرات' ادب پر مقامی کلچر اور تہذیب کے اثرات' غزل کا تنوع اور وسعت شعری صداقت اور فلسفیانہ صداقت کا فرق' گلوبلائزیشن کے حوالے سے مختلف تقاضوں کا ایک دوسرے پر اثر اور حمیدی صاحب کی یہ رائے کہ'' ہم سمندر میں ڈوب کر کیوں مر جائیں بلکہ سمندر میں رہتے ہوئے بھی اپنی پیراکی اور تیور کیوں نہ دکھائیں۔'' قاری کے فکر کو مہمیز کرتی ہیں اور ان نقاط پر سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

جہاں تک افسانے پر انشائیے کے اثرات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں جناب گوپی چند نارنگ کی رائے قابلِ قدر ہے۔'' میرے نزدیک کہانی سے کہانی پن کا اخراج غیر افسانوی عمل ہے اور اس کی مذمت کرنی چاہیے۔۔۔ علامت یا تمثیل۔۔۔ فن کی ایک سطح ہیں کل فن نہیں۔۔۔ علامتی' استعاراتی کہانی صرف اُن فنکاروں کے لیے ہے جس کے تجربے یا حسی رویے بالواسطہ Oblique پیرائیہ بیان کا تقاضا کرتے ہوں یا جن کے پاس کہنے کو کچھ ایسی بات ہو جو بیانیہ کے کسی دوسرے انداز میں نہ کہی جا سکتی ہو۔''

غزلوں میں جناب خاور اعجاز صاحب کی غزل کا آخری شعر' ناصر بشیر صاحب کی پہلی غزل کا تیسرا شعر' شاور الحق صاحب کی غزلوں میں ''آرے'' اور'' گھڑیال'' کا استعمال' طاہر شیرازی صاحب کی پہلی غزل کا مطلع اور چوتھا شعر مظہر نیازی صاحب کی غزل میں'' مٹی اور گارے'' کا استعمال اور اُن کی دوسری غزل کا مطلع اور اُنہی کی تیسری غزل کا چھٹا شعر اور جناب کاشف مجید صاحب کی غزل کا آخری شعر' شہناز نور صاحبہ کی غزل کا مطلع اور پانچواں شعر دوسری غزل کا تیسرا شعر شگفتہ الطاف صاحبہ کی پہلی غزل کا تیسرا شعر قابلِ قدر ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ تمام غزلوں کا سرتاج شعر موصوفہ کا یہ شعر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

جو بھی مانگا خدا سے حد کر دی
یہ نہ سوچا کہ مستجاب ہے کیا

ن۔م۔راشد کی غیر روایتی شاعری جس نے ایک نئے ٹرینڈ Trend کو Set کیا اور جس طرح افلاطونی محبت کو رد کرتے ہوئے جسمانی تعلق پر مبنی محبت پر زور دیا اور ذات کے مادی پہلو پر تدبیر و تفکر کیا اور اُس کو پیش کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس طرح جناب ناصر عباس نیر صاحب نے

ان پہلوؤں اور دوسرے بہت سے پہلوؤں کا جائزہ اپنے مقالے میں لیا وہ قابلِ قدر ہے۔ (اور اگر صاحبِ تحریر کی اجازت ہو تو خاکسار اس تحریر کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی جسارت کرے) راشد پر لکھا تحسین زہرا صاحبہ کے مقالہ ''راشد کا نیا انسان'' میں جس طرح راشد کی شاعری میں پائے جانے والے انسان کے زینیت (اگر لفظ استعمال کرنے کی اجازت ہو) والے پہلو کی تشریح کی گئی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ اس کے علاوہ راشد پر لکھے گئے دونوں مقالوں کو پڑھ کر جو ایک اجتماعی تاثر اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر اپنی کچھ خاص Values کو اپنے ہی انداز میں Create کرتا ہے اور خود کو اور دوسروں کو اُن کا سہارا لینے کی تلقین کرتا ہے۔ خوفِ طوالت کی بنا پر اس پہلو پر مزید اور وجودیت اور Nihilism اور مادیت اور Alienation اور کشاکش درمیانِ جسم روح کے بارے میں زیادہ کچھ لکھنا راقم الحروف مناسب نہیں سمجھتا۔

انٹرنیٹ کے ذریعے لیا گیا انٹرویو جس میں حیدر قریشی صاحب کے خیالات کی خوشہ چینی کی گئی ہے۔ اُس نے ذرائع ابلاغ کی اس سہولت کے عملی پہلو کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے اور اس کے علاوہ ''حریم ادب'' کے انٹرنیٹ پر آن لائن ہونے کے لیے ڈاکٹر جاوید حیدر جوئیہ صاحب آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو بہت بہت مبارکباد ہو۔

مزید نظموں میں سے رفیق سندیلوی صاحب کی نظم ''غار میں بیٹھا شخص'' Theme اور Imagery محاکات کے حوالے سے متاثر کن تھی۔ خاور اعجاز صاحب کی نظم ''بابِ قفس کھلنے لگا ہے'' محمد فیروز شاہ کی نظم ''عہد مفارقت کے دُکھ'' سجاد مرزا کی نظم ''کبھی ایسا نہ تھا جاناں'' عبداللہ عظیم کی مختصر لیکن مؤثر نظم ''آبِ حیات'' زبیر کنجاہی صاحب کی ''فرضیت'' اور انہی کی Elegy کے رنگ میں لکھی نظم ''آہ! صدف بیٹی'' قابلِ ذکر ہیں'' اور کنول جھیل'' بھی جسے کرامت بخاری صاحب نے لکھا ہے۔ نثری نظموں میں نجم الدین احمد صاحب کی ''محبت اپنے اندیشوں سمیت زندہ رہے گی'' اور شہلا صدیقی صاحبہ کی ''ناامیدی گناہ ہے'' بھی قابلِ ذکر ہیں۔

طنز و مزاح میں گل نوخیز اختر صاحب کا ''انچارج نقوی'' زیادہ دلچسپ تھا۔ عمران نقوی کے بارے میں یہ رائے کہ وہ ''ادب کا نیلسن منڈیلا کہلائے جانے کا حقدار ہے'' Refiend Sense of humour کی عکاسی کرتا ہے اور اس کے علاوہ اچھے اسلوب پر بھی دلالت کرتا ہے۔

فکری مباحث بڑے فکر انگیز ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے ''نئی فکر کے امتیازات'' میں Automation کی تشریح اور فنکار کا ایک ساختیاتی فریم ورک میں کام کرنا اور ارادے کا نظام کے تابع ہونا اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ جدید لسانیاتی نظریہ کہ "Words gain their meaning from how they are used in a language game." اس امر کا متقاضی ہے کہ ہمیں معروضی طور پر Empirically اس بات کا تجزیہ کرنا چاہیے کہ زبان کے استعمال کے طریقے الفاظ کے آئیڈیل معانی سے ضروری ہیں☆ کیونکہ یہی اُس کے اصل معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہی طریقہ کار سائنسی اور معروضی ہے۔ بہر حال نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو یہ بات ضروری ہے کہ خارجی محرکات اور تخلیق کا حسن ان میں ایک توازن ہونا چاہیے، جو ایک بنیادی شرط ہے ورنہ ڈاکٹر سہیل احمد صاحب کی یہ رائے کہ اردو کا فکری تنور اب ٹھنڈا ہو چکا ہے اور یہ کہ اردو زبان کے تخلیق کار کا اجتماعی شعور گم شدہ ہے ایک وارننگ کی شکل اختیار کر لے گا۔

بات خواہ Deconstruction کی ہو یا Modernism کی یا Structuralism کی فن پارہ Aethesthetically satisfying اور Artistically compelling ہونا چاہیے۔

انہی مباحث کے ساتھ اگر ''Intertextuality'' کو ملا کر پڑھا جائے تو مفید ثابت ہوگا جس میں اس بات کی وضاحت قابلِ ذکر ہے کہ ہر Cultural phenomenon کی بنیاد میں ایک Inherent system of signification ہوتا ہے اور جس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پُرانا سسٹم شکست و ریخت کا شکار ہوتا ہے نیا جنم لیتا رہتا ہے اور ایک ارتقائی عمل جاری رہتا ہے۔ ایک بات بہر کیف قابلِ غور ہے کہ اس قسم کے سسٹم میں فرد کی انفرادیت کے لیے سکوپ اگر بالکل ختم نہیں ہوا تو کم سے کم ضروری ہو گیا ہے (یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری میں مکمل یورپین Literary Tradition تخلیق کار کے Individual Talent کو خود میں ضم کر لیتی ہے اور آرٹ ذات کے اظہار کی بجائے

☆ متذکرہ مضمون میں ساختیاتی فکر کے بارے میں بات تو کی گئی ہے لیکن زبان کے Empirically تجزیہ کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ شاید مکتوب نگار ساختیات کے بجائے وٹ گنسٹائن کے اُس قول کی تشریح کر رہے ہیں، جو انہوں نے یہاں نقل کیا ہے۔ (ح۔ ح۔ ج)

ذات کے فرار کا نام بن جاتا ہے کیونکہ تخلیق کار کی ذات مقصود بالذات نہیں رہتی اور تخلیق کا تجربہ ایسی ماورائی یا Surrealistic Forces کا پروڈکٹ بن جاتا ہے جن پر انسان کا ارادی اختیار بہت کم ہوتا ہے۔ حسنِ عمل شعوری نہیں رہتا اور حسنِ تخلیق بھی متاثر ہوتا ہے۔☆

امین جالندھری / حیدر آباد سندھ

''حریم ادب'' بھیجنے کا شکریہ۔ آئندہ آپ رسالہ VP کر دیا کریں۔ انشاء اللہ آپ ہمیں اپنا معاون پائیں گے۔

''حریم ادب'' کی شکل میں آپ نے ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ واقعی آپ کی محنت سراہے جانے کے قابل ہے۔ آپ کی محنت' محبت اور مشقت کو دیکھتے ہوئے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اگر آپ دلجمعی سے (ستائش کی تمنا کیے بغیر) کام کرتے رہے تو انشاء اللہ کوئی بڑا ادبی کام سرانجام دے جاؤ گے۔ بلاشبہ ہمیں یہ کہنے میں قطعی ''عار'' نہیں ہے کہ پنجاب سے ''فنون'' اور ''اوراق'' کے بعد ''حریم ادب'' ان دونوں کے درمیان اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ حصہ غزل خوب ہے مگر ابھی بھی ایک آنچ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کا اعتراف بجا کہ ''جہاں پہ میں تھا وہاں شاعری بہت کم تھی'' کیا خیال ہے ناصر کاظمی نے بھی اسی ''سوکھی کھیتی'' کی طرف اشارہ کیا تھا ناں! سیّد معراج جامی کا ''خاکہ نما'' قیامت کی چیز ہے۔ سربسر سچائی۔ خاں صاحب سے ملاقات کے لیے ''خان کی ڈائری'' ہمارے پاس ہے اور ہم بارِ نشاط کے مزے لے رہے ہیں۔ تخلیق وہ کہ جو ''بارِ نشاط'' کا مزہ دے۔ مشرف عالم ذوقی کا افسانہ ''توشہ خاص ہے'' حامد سراج کا ''بیدل حیدری'' کا انٹرویو بہت سے ادبی معاملات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ بھرتی کی دو چار چیزیں جنھیں ''جدیدیت' مابعد جدیدیت' نئی فکر کے امتیازات'' سخت بوریت کا سبب ہیں۔ فاضل مقالہ نگاروں سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں ''عملی تنقید'' کا کوئی کرشمہ دکھائیں۔ ٹیڑھی میڑھی اِدھر اُدھر سے مستعار لی ہوئی باتیں دُہرانے سے کیا فائدہ۔ کوئی تو اللہ کا بندہ ثابت کرے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی نظمیں کون سے خانے میں رکھی جائیں۔ جدید یا مابعد جدیدیت' ان نظموں میں متن سے تخلیق کار کو خارج کرنے کا ''مستند طریقہ'' کون سا ہے☆☆

ان مضامین سے دلچسپ مضمون تو ''انچارج نقوی کا ہے۔ یقین نہ آئے تو پڑھ کے دیکھ لو۔ فکری مباحث وہ اچھی کہ جو ہمارے ادبی تخلیقی عمل کو تیز کرے۔ یہ کون سا رحمانہ سلوک ہے کہ ماں سے بچہ چھین لیا جائے اور اُسے اُس کا نام بھی لینے نہ دیا جائے۔ ہم ممنون ہوں گے۔ اُن ناقدین کے جو اپنی Theories کو ہمارے ادب پر لاگو کرکے دکھادیں ورنہ سب کھیل تماشہ ہے۔ پنجابی زبان والے حصے میں تخلیق کاروں نے کون سی پنجابی زبان میں شاعری کی ہے۔ اس کی ہمیں سمجھ نہیں آئی جو لفظ بھی ان کے سامنے لائے یا آئے۔ آنکھ بند کرکے استعمال کر لیے۔ یہ دیکھے بغیر کہ یہ پنجابی زبان کے الفاظ ہیں بھی یا نہیں۔☆☆☆

(حد ادب کہ بہت سے الفاظ لکھے جا سکتے ہیں) پھر بھی بشریٰ رحمٰن کی ''زاریاں'' لاجواب اور بے مثال ہے' سجاد مرزا' سلطان کھاروی' حنیف حنفی' قیصر نجفی کی تخلیقات پُراثر اور عمدہ ہیں۔ آخر میں ایک اور تاثر کا اظہار ضروری ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''حریم ادب'' کے ذریعہ سے آپ دانستہ / غیر دانستہ ایک گروپ کی خفیہ طور سے Projection کر رہے ہیں۔☆☆☆☆ یہ بیساکھیاں اور اُن کا زور کب تک نااہل سنبھال سکیں گے؟؟؟

☆ تاہم یہ فرق پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ intertextuality کی فکر میں ذات (Self) کا روایتی تصور پارہ پارہ ہو کر ختم ہوگیا ہے۔ (ج۔ح۔ج)

☆☆ وزیر آغا ہوں یا کوئی اور تخلیق کار اس کی تخلیق / تخلیقات پر اس طرح کا فیصلہ یقیناً دیا جانا چاہیے او. یہ نقادوں کی ذمہ داری ہے لیکن مکتوب نگار کے جملوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ وزیر آغا صاحب کو اس بات کا الزام دے رہے ہیں کہ اُنہوں نے مابعد جدیدیت کے لیے کام کیا ہے اور خود اپنی نظموں سے بطور تخلیق کار خارج ہوگئے ہیں۔ اول تو یہ بات کہ وزیر آغا ہی کیوں؟ دوسرے یہ کہ وزیر آغا مابعد جدیدیت کے بجائے ''امتزاجی تنقید'' کے مؤید ہیں اور مصنف کی موجودگی کے قائل بھی۔۔۔ اس سلسلے میں اُن کا ایک مضمون اس شمارے میں موجود ہے اور یہ سب باتیں اس سے اضافی ہیں کہ خود ''امتزاجی تنقید'' سے پوچھا جائے کہ وہ مصنف کا اثبات کیونکر کرتی ہے۔ سب تخلیق کاروں کی طرح وزیر آغا صاحب ایک قابلِ احترام تخلیق کار ہیں۔ تاہم علمی و ادبی مسائل پر مباحثہ کے دروازے وزیر آغا صاحب سمیت کسی بھی مفکرِ ادب کی بات پر بند نہیں کیے جانے چاہئیں۔ (ج۔ح۔ج)

☆☆☆ بدلتی ہوئی دنیا میں ثقافتوں (جن میں زبان کی حیثیت مسلم ہے) کے مابین بڑی سُرعت سے لین دین ہو رہا ہے۔ پنجابی زبان کے خالص الفاظ پر زور دینا بھی ایک سوال ہے تو اُردو کے خالص الفاظ پر زور دینا بھی اتنا ہی ضروری ہوگا۔ خود مکتوب نگار نے اپنی تحریر میں انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں اور اس کے باوجود ابلاغ ہو ہی جاتا ہے۔ تاہم اس بات سے اتفاق ضروری ہے کہ لکھاری کو زبان پر عبور اور قدرت حاصل ہونا چاہیے۔ (ج۔ح۔ج)

☆☆☆☆ اگر ایسا کوئی ''گروپ'' موجود ہے تو ہم ایک بار پھر اس سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ وہ بات ہے جو ''حریم ادب'' میں پہلے ورق پر لکھ دی گئی تھی۔ اب اگر کچھ لوگ ایسا تاثر لے رہے ہیں تو اس پر اظہارِ افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ ''حریم ادب'' ادبی گروہ بازی کے خلاف آزادانہ مگر شائستہ علمی بحث و مباحثہ کا داعی ہے اور اپنے اس موقف کے سلسلے میں کوئی حلفیہ بیان پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم مکرر وضاحت کی جاتی ہے کہ ''حریم ادب'' کسی بڑی / چھوٹی شخصیت کا پیرا ہن نہیں ہے۔ (ج۔ح۔ج)

''حریمِ ادب''اس کے باوجود آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ایک مضافاتی شعر تو سنیے۔

اُس نے کہا کہ آج ہَوا کتنی تیز ہے!
مَیں نے کہا کہ دیکھ یہ جلتا دِیا' گیا

اتنا خوبصورت شعر کہنا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور''حریمِ ادب'' جیسا خوب صورت رسالہ نکالنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اللہ آپ کو''زیاں'' کی استقامت دے۔ہم تو''سود'' کے مارے ہوئے ہیں۔آپ کو اور تحسین گیلانی کو آداب۔

نجم الدین احمد / بہاولپور

''حریمِ ادب' کتاب II'' آپ کی محبتوں کے طفیل میرے سامنے ہے۔''موجد'' کا خوبصورت رنگوں سے مزین سرورق آنکھوں کو عجیب سی تسکین بخش رہا ہے۔

''اطراف''میں آپ کا سوال'' آیا ہمارے ہاں کے ایسے ادارے مثلاً نقدِ ادب' رسائل و جرائد' کالج' یونیورسٹیاں' اکادمیاں' میڈیا' ادبی تقریبات' ادبی انجمنیں اور استادی شاگردی وغیرہ اردو ادب کے قاری کی ایسی تربیت کا کام بحسن وخوبی کر رہے ہیں؟ نیز ان میں بہتری کی صورت کیا ہے اور یہ کس طرح ممکن ہے؟'' قابلِ توجہ ہے۔اس سوال کے دوسرے حصہ کا جواب کسی حد تک آپ نے خود ہی اگلے ہی پیراگراف میں دے دیا ہے کہ''حریمِ ادب''اب انٹرنیٹ پر بھی Online ہوگا۔

محترمی! یہ سوال اور اسی نوع کے دیگر سوالات مثلاً قاری ادب سے دُور کیوں ہوتا جا رہا ہے؟ اور قاری کا ادب سے دوبارہ رشتہ کیونکر اور کیسے استوار کیا جائے؟ وغیرہ مختلف فورموں سے اُٹھتے رہتے ہیں۔مختلف جرائد کے اداریوں اور اسی قبیل کے مضامین پڑھنے میں آتے رہتے ہیں۔ہر لکھاری اپنی استعداد کے مطابق جواب بھی دیتا ہے۔مگر آپ کا''حریمِ ادب'' کو انٹرنیٹ پر Online کرنا اس کی عملی کوشش ہے جیسے جیسے میڈیا و انفارمیشن ٹیکنالوجی ترقی کرتے جا رہے ہیں' قاری تحریری ادب (کتب' رسائل وغیرہ) سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔سب سے پہلے ریڈیو کی ایجاد ہوئی' جس نے قاری سے ادب کے مطالعے میں گزرنے والے وقت میں سے اپنا حصہ حق سمجھ کر چھین لیا۔ٹیلی ویژن ظہور پذیر ہوا' اپنے حصے کا وقت اور ایک بہت بڑے حلقہ کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ٹیلی فون نے مصروفیت میں اضافہ کیا۔خطوط لکھنے کا سلسلہ بہت کم رہ گیا۔خطوط نہ لکھنے سے (خطوط بھی تو ادب کا حصہ ہیں' جیسے مرزا غالب کے خطوط اور آپ نے بھی تو''چودھویں کی چاندنی کے سے چودہ خطوط'' شائع کیے ہیں) ادب کی ایک جہت زوال پذیر ہوئی۔اب کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا زمانہ ہے۔دنیا گلوبل ویلج (Global Village) بن چکی ہے۔ایک''حریمِ ادب''ہی کیوں؟ دیگر رسائل و کتب کو بھی انٹرنیٹ پر Online کرنے کی مساعی ہونا چاہیے تاکہ انٹرنیٹ کے Players بھی ادب' بلکہ جدید ادبی رجحانات سے بھی' کماحقہٗ روشناس ہو سکیں۔صرف انٹرنیٹ ہی نہیں جوں جوں ٹیکنالوجی ترقی کرتی جائے توں توں ادب کو جدید ٹیکنالوجی پر متعارف کروایا جاتا رہے تاکہ ادب اور قاری کے درمیان یہ دُوری مزید نہ بڑھ سکے اور خلیج کو پاٹا جا سکے۔''حریمِ ادب' کتاب II''ہی میں شامل معین تابش کی غزل سے ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

گرچہ مربوط نہیں قاری و راقم پھر بھی
ذہن مصروف مضامین کی ترسیل میں ہے

''آج آکھاں وارث شاہ نوں۔۔۔''میں محترم سیّد تحسین گیلانی کی دُہائی پڑھی۔دِل دُکھا۔پنجابی لکھاریوں کی بے حسی پر محض افسوس کا ہی اظہار کر سکتا ہوں۔''حمد'' کی کیا تعریف کی جائے کہ یہ تو خود تعریف ہے۔

جب سے رمز آشنائے حمد ہوا
ہمہ پیکر برائے حمد ہوا (ریاض مجید)

اور نعت کی نسبت خورشید بیگ میلسوی کے اس نظریہ سے مکمل اتفاق ہے:

خورشید وہی مرکز و محور ہے سخن کا
اس فکر سے ملتی ہے جلا دیدہ وری کو

شاعر معاشرے کا حساس رکن ہوتا ہے۔ معاشرے میں جہاں کہاں غلط رویہ پنپتا دیکھتا ہے' بے اختیار کرب بھری آواز میں چیخ اُٹھتا ہے:

دھرم کے نام پہ یہ قتل کی سازش کچھ سوچ
تیری ہمسائے کا بچہ بھی غزل جیسا ہے (مناظر عاشق ہرگانوی)

آپس کے اختلاف سے بنجر ہوئی زمیں
زورِ نمو وگرنہ بہت خاکِ نم میں ہے (مرتضٰی برلاس)

مسکراہٹ ہے فقط عارضی بنیادوں پر
آپ اس شہر کے لوگوں کو نہیں جانتے ہیں (اعجاز توکل)

سروں کو کاٹ کر اُونچا کریں قد
عجب سودا سروں میں رکھ دیا ہے (صابر آفاقی)

اور اسی طرح کے کئی اشعار شمارہ ہذا میں شاملِ اشاعت غزلوں میں شامل ہیں۔

سیّد معراج جامی کے خاکہ نما ''خامہ انگشت بدنداں ہے'' میں قدرے بے جا طوالت کا احساس ہوا۔ افسانوں میں سے سب سے زیادہ ڈاکٹر رشید امجد کے افسانہ ''بکھری ہوئی کہانی'' نے متاثر کیا۔ اندازِ بیاں بھی خوب ہے۔ ''بیدل حیدری کے ساتھ ایک زندہ دوپہر'' دل و دماغ میں زندہ جاوید رہنے کے لیے مرتسم ہوگئی ہے۔ نظمیں سبھی خوبصورت اور پُر تاثیر رہیں۔ اکبر حمیدی کا انشائیہ ''جادونگری'' تجرباتی انشائیہ معلوم ہوتا ہے۔ شاید وہ انشائیے کو نئی جہتوں سے متعارف کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اکبر حمیدی نے خود بھی اس کا اعتراف اپنے انٹرویو میں کیا ہے۔ بقیہ انشائیے بھی اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔

''طنز و مزاح'' ادب کی صنف ہے جس میں لکھاری معاشرہ/افراد کے کمزور پہلوؤں کو کبھی مزاحیہ اور کبھی طنزیہ انداز میں نمایاں کرتے ہوئے قاری کے سامنے لاتا ہے کہ سُدھار کی صورت پیدا ہو۔ اکثر ادبی رسائل میں اس صنف کے لیے جگہ دیکھنے میں نہیں آتی۔ قطع نظر اس کے کہ مضامین کیسے تھے' آپ نے اس گوشے کی طرف توجہ دے کر بہرحال ثابت کر دیا ہے کہ ادب کا شاید ہی کوئی پہلو آپ سے پوشیدہ ہو اور آپ ہر صنفِ سخن کو ''حریم ادب'' میں جگہ دیں گے۔

''فکری مباحث'' کے مضامین پڑھنے کے بعد صرف یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ ''جدیدیت'' کے بعد تو ہم نے ''مابعد جدیدیت'' کی اصطلاح استعمال کر لی ہے مگر اس کے بعد کونسی اصطلاح استعمال کریں گے؟ کیا ہر آنے والی چیز پہلے والی چیز کے مقابلے میں صرف ''جدید'' نہیں کہلا سکتی☆

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن آبائی طور پر میرے ہی شہر کے باسی ہیں یعنی ''گرائیں'' ہیں۔ مجموعی طور پر ''حریم ادب'' کی دوسری کتاب' پہلی کتاب سے زیادہ متاثر کن رہی۔ اللہ آپ کو مزید کامرانیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

☆ مکتوب نگار کا یہ نکتہ یقیناً قابلِ غور ہے۔ تاہم کچھ مسائل ایسے ہیں جو ''مابعد جدیدیت'' کی ترکیب ہی کو جواز دیتے ہیں۔ مثلاً ''جدید'' سے مراد وہ ادب ہے جو جدیدیت (Modernism) کے زُمرے میں داخل ہوا اور جدیدیت کی تاریخی حیثیت' بطور ادبی تحریک' اٹھارہویں صدی عیسوی کی مغربی روشن خیالی کی تحریک (Enlightenment Movement) (جسے روشن خیالی کا منصوبہ (Project) بھی کہا گیا ہے) سے طے ہوتی ہے۔ تاہم وہ سب کچھ جو جدیدیت کے بعد رُونما ہو رہا ہے/ ہوگا' محض ''مابعد جدید'' نہیں کہا جا سکتا۔ مغرب والوں نے اس اصطلاح کو غالباً اس لیے بھی مبہم رکھا ہے کہ مابعد جدیدیت میں ہر قسم کے مہابیانیہ (Metanarrative) پر سوالیہ نشان لگا دیا گیا ہے۔ اگر اس کو کوئی ''مخصوص نام'' دیا جائے گا' تو وہ خود مابعد جدیدیت کی روح اور مزاج کے برخلاف ایک Metanarrative ہوگا۔۔۔ دوسرے لفظوں میں مابعد جدیدیت خود اپنی Nomenclature کے لیے بھی کوئی مخصوص پُرشکوہ بیانیہ (Grand Narrative) نہیں دیتی۔ بلکہ Mini-Narratives کو بھی برابری کی سطح پر ساتھ لے کر چلتی ہے۔ (جس میں 'جدیدیت' بھی شامل ہے) راقم کی رائے میں ہر 'نیا' 'پرانے' سے مختلف ہی اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے اپنے مقدمات اور قضایا ہوتے ہیں' اس لیے جب اس کے اصطلاحی مفہوم پر اتفاقِ رائے ہو جائے تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔ (ج۔ ح۔ ج)

فہیم شناس کاظمی / کراچی

''حریم ادب'' شمارہ دوئم ملا بلاشبہ آپ نے شاندار اور دلکش ادبی کتابی سلسلے کا اجرا کیا ہے اور آپ کی کاوش لائق تعریف ہے میں نے ''حریم ادب'' پر ''جسارت'' سنڈے میگزین کراچی میں تبصرہ کیا ہے جو میں آپ کو ارسال کروں گا۔ آپ نے تین زبانوں میں کتابی سلسلے کا اجرا کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ زبانیں کسی سے نفرت نہیں کرتیں یہ اہل سیاست ہیں جو زبان جیسی لطیف چیز کو بھی دو دھاری خنجر بنا دیتے ہیں۔

آپ نے اداریے میں دو مختلف (پنجابی' اردو) معاملات کو چھیڑا ہے جن پر اگر تفصیلی گفتگو کی جائے تو پھر باقی تمام باتیں رہ جائیں گی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ابھی تک ایسی کوئی یونیورسٹی یا ادارہ وجود میں نہیں آیا جو شاعر یا تخلیق کار پیدا کر سکے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے ادب کا قاری اس فارسی طریقے سے نمود پذیر ہو۔☆ ادب سے لو وہی لگاتے ہیں جن کی روح میں جستجو کی آگ ہو اور مادیت سے زیادہ جن کا رجحان روحانیت (اندرون) کو سمت ہو ایک خاص زمانے اور دل میں درد جاگنے تک اپنی اور کائنات کی بے ثباتی کا احساس ہونے تک سب عام سی زندگی عام سطح پر گزارتے ہیں اور پھر خود بخود ان کی زندگی کی سمت متعین ہو جاتی ہے اور وہ تخلیق کار یا ادب کے قاری بن جاتے ہیں۔☆☆

آپ نے پنجابی کی ترویج اور ترقی کے لیے جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے دل کی آواز ہے اور اب تو پنجابی ادب میں خاصا کام ہو رہا ہے انڈیا اور پاکستان کے نامور لکھاری پنجابی میں لکھ رہے ہیں ضیاالحق کی مارشل لا تک وہ دَور تھا' جب استاد دامن اور احمد راہی کے علاوہ تیسرا پنجابی نظر نہیں آتا تھا مگر اس کے بعد سے صورتحال مسلسل بہتری کی سمت رواں دواں ہے۔ آپ ایک کام کر سکتے ہیں ملتان بورے والا اور اس کی آس پاس کی بستیوں کے ان پنجابی شعرا کے گوشے اور کلام شائع کر سکتے ہیں جن کا ابھی تک عوامی سطح پر تعارف نہیں ہوا۔

میں 'تخلیق' میں پنجابی نظمیں بھیجتا تھا مگر کوئی ان پر تبصرہ نہیں کرتا تھا جس کی وجہ سے میں نے بھیجنا ہی بند کر دیں اچھی یا بُری جو بھی رائے ہو' دینی ضرور چاہیے تاکہ تخلیق کار اپنی تحریر میں بہتری لا سکے۔

پروفیسر ڈاکٹر سرفراز ظفر / اسلام آباد

''حریم ادب'' کی نگارشات کا مطالعہ کیا۔ حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ بورے والا جیسا علاقہ جو ہر سننے والے کے لیے ایک قصبہ' وہ بھی شاید تمام زندگی کی سہولیات سے عاری' کس قدر صاحبانِ ذوق وعلم وادب کی سرزمین ہے۔ نظم ونثر دونوں کو معیاری پایا۔ علم وادب سے آپ کا والہانہ عشق قابلِ صد تحسین ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے۔ آپ کی کاوشوں میں یقیناً سیّد تحسین گیلانی صاحب ودیگر معاونین حضرات برابر کے شریک ہیں اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کے شریک کار نہایت صاحبِ ذوق اور ادب دوست ہیں۔ انھیں بھی میرے احساسات سے مطلع فرمادیں۔

حیدر قریشی

حریم ادب شمارہ نمبر۲ ملا۔ موجد کا سرورق دیکھ کر ہی جی خوش ہوا۔ انتساب موجد کے نام کیا اور بھی اچھا کیا، آج کے سارے اچھے انسانوں کی اچھائی سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ''عظیم انسان'' کے الفاظ بہت زیادہ لگ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ موجد صاحب نے بھی اسے محسوس کیا ہوگا۔ آپ کا اداریہ اس لحاظ سے اچھا لگا کہ آپ نے قاری کی اقسام کی طرف توجہ دی ہے۔ میرا سوال بالکل سادہ سا ہے ہمارے اردو کے جو مابعد جدید ناقدین لگ بھگ گزشتہ دو دہائیوں سے لکھ رہے ہیں کیا انہوں نے قاری کے علمی معیار اور سوجھ بوجھ کو کبھی بیان کیا؟ اگر بیان کیا تو کیا

☆ مذکورہ تحریر میں تخلیق کار یا قاری ''پیدا'' کرنے کا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ قاری اور تخلیق کار کے ذوقِ قرأت کی تربیت کے لیے ہمارے ہاں کے جو ادارے موجود ہیں' کیا وہ اپنا کام بحسن وخوبی ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔۔۔ اور ان میں بہتری کے لیے اہلِ دانش کے پاس کیا تجاویز ہیں۔ (ج۔ح۔ج)

☆☆ ہمارے خیال میں کلچر اور معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں فرد کے شعور (اور لاشعور) کی تشکیل کرتے ہیں۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ ان کی مجموعی حیثیت کی تشکیل بھی خود افراد کے ذریعے ہوتی ہے۔۔۔ یوں فرد' معاشرے اور کلچر پر اور یہ دونوں خود فرد پر منحصر ہیں۔ لہٰذا دونوں کی تشکیل میں عمل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور یہ عمل خود بخود ہونے کے باوجود اس بات کا متقاضی رہتا ہے کہ اسے بہتری کی طرف گامزن رکھا جائے۔ (ج۔ح۔ج)

اتنے تواتر سے بیان کیا جتنے تواتر سے مصنف کی زبان بندی پر زور دیا؟

ڈاکٹر سعادت سعید کے ماہیے اچھے لگے۔ان کی ماہیا نگاری کی طرف توجہ کرنا ماہیے کے لیے سودمند ثابت ہوگا۔بشریٰ رحمٰن تو بہت اچھی ماہیا نگار ہیں لیکن ان کے بعض ماہیوں میں مجھے گڑبڑ محسوس ہوئی ہے۔میرا اندازہ ہے کہ یہ سب کمپوزنگ کی غلطی کا نتیجہ ہوگا۔میرے آخری ماہیے''اک پوتی اور آئی''میں''اک'' کی جگہ''ایک'' لکھا گیا ہے(پوتی کا نام بھی علیشا ہے'علینا' نہیں)۔اسی طرح میری دوسری غزل کے تیسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ''زیست''چھپا ہے جبکہ میں نے لفظ''زندگی'' لکھا تھا۔اس غلطی کو دیکھتے ہوئے خود مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ میں نے کبھی بھی لفظ ''زیست''اپنی کسی غزل میں استعمال نہیں کیا☆

رشید امجد کا افسانہ''بکھری ہوئی کہانی''بہت اچھا لگا۔خالد قیوم کا افسانہ میں نے بے دلی سے دیکھنا شروع کیا تھا لیکن میں آغاز میں جیسا محسوس کر رہا تھا افسانہ اس سے مختلف نکلا اور اچھا لگا۔بیدل حیدری کا انٹرویو محمد حامد سراج نے محبت کے ساتھ تحریر کیا ہے۔غزلوں کے حصہ میں بہت سارے ایسے شعراء ہیں جنہیں میں اشتیاق سے پڑھتا ہوں اور یہاں بھی انہیں پڑھنا اچھا لگا۔بعض شعراء کو پہلے کم پڑھا یا اب پہلی بار پڑھا لیکن وہ بھی اچھے لگے۔ایسے شعراء میں سے بطور خاص یہ نام یہاں لکھنا چاہوں گا۔ظفر اقبال'افتخار عارف'عطاء الحق قاسمی'صابر ظفر'معین تابش'خورشید بیگ میلسوی'اعجاز توکل'امین خیال'خاور اعجاز'ناصر بشیر'عابد خورشید'کاشف مجید'شہناز نور'شگفتہ الطاف'جمیل حیدر قریشی(ارے بھائی یہ کون صاحب ہیں؟ مجھ سے فوراً رابطہ کریں)اور جاوید حیدر جوئیہ۔۔۔نظموں میں وزیر آغا کی نظموں کے بعد رفیق سندیلوی نے باندھ لیا۔ویسے امین راحت چغتائی کی نظم ''کہاں گئے آفتاب چہرے''کا عنوان پڑھ کر جوابی طور پر اپنا ایک پرانا شعر یاد آ گیا۔

نئی رُتوں کے جو منتظر تھے اجڑ گئے وہ گلاب چہرے
عذاب کی ایسی آندھیاں تھیں کہ بجھ گئے آفتاب چہرے

میں نے یہ غزل جنرل ضیاء الحق کے''بابرکت دور''میں تب کہی تھی جب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت دی گئی تھی۔یہ غزل میرے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں ہے لیکن ایک مرتب کردہ انتخاب''کرنیں''میں شامل ہے۔ناصر عباس نیر کا مضمون''راشد کا نیا آدمی''راشد کی تفہیم میں عمدہ پیش رفت ہے۔تحسین زہرا نے بھی چونکہ راشد کے حوالے سے اسی موضوع کو چھیڑا ہے اس لیے دونوں مضامین میں نظموں کے اقتباسات پیش کرنے میں توارد جیسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔اکبر حمیدی کا انٹرویو بہت عمدہ اور بھرپور ہے انہوں نے آپ کے ساتھ کھل کر مکالمہ کیا ہے اور اپنے موقف کی بعض عمدہ وضاحتیں بھی کی ہیں۔انہوں نے''پورے آدمی'' کی جو بات کی ہے،ان کے دل کی آواز ہے۔اچھے شاعر اور ادیب دنیا کو جنت ارضی کی صورت میں دیکھنے کے لیے ایسی توقعات باندھتے رہتے ہیں۔راشد کا نیا آدمی،اکبر حمیدی کا پورا آدمی اور مابعد جدیدیت کی جنرل تھیوری بھی شاید ایک ہی خواہش کی مختلف صورتیں ہیں۔اگرچہ ایسا ہو جانا قابلِ عمل دکھائی نہیں دیتا پھر بھی اچھے دنوں کے خواب دیکھنا بھی اچھی بات ہے۔خود بقول اکبر حمیدی ؎

ہم اچھا وقت نہیں لا سکے نئی نسلو!
مگر تمہارے لیے اچھے خواب لے آئے

جب انڈیا اور پاکستان نے باری باری ایٹمی دھماکے کئے تھے تب ۱۹۹۸ء میں'میں نے اپنی مختصری کتاب''ایٹمی جنگ''کے پیش لفظ میں لکھا تھا:

''اس دنیا میں ساری جغرافیائی اکائیاں اپنی اپنی جگہ ایک سچ ہیں،لیکن کرۂ ارض خود ایک بڑی جغرافیائی اکائی بھی ہے۔اس دھرتی کے سارے انسان اپنے قومی،علاقائی اور مذہبی تشخص کے ساتھ۔۔۔اپنے اپنے تشخص کو قائم رکھتے ہوئے پوری دھرتی کو ایک ملک بنالیں اور اس ملک کے باشندے کہلانے میں خوشی محسوس کرنے لگیں تو شاید ایٹمی جنگ کے سارے خطرات ختم ہو جائیں لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟پوری دنیا کو ایک ملک بنانے کا خواب اور وحدتِ نسلِ انسانی کی آرزو شاید بہت دور کی منزل ہے۔یہ دوری قائم رہے یا ختم ہو جائے اس کا انحصار تو ساری دنیا کے ملکوں کے باہمی اعتماد اور یقین پر ہے۔ایک عام آدمی کے لیے شاید یہ کسی دیوانے کا خواب ہو۔پھر بھی آیئے ہم سب مل کر دعا کریں۔دنیا میں محبت کے فروغ کی

☆ کمپوزنگ کی مذکورہ اغلاط کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔(ج۔ح۔ج)

دعا! دھرتی پر نسلِ انسانی کے قائم رہنے کی دعا!''

ڈاکٹر احمد سہیل نے اپنے مضمون میں مابعد جدیدیت کو''انسان دوستی'' کا علمبردار قرار دیا ہے۔ ایسا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ احمد سہیل نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اردو معاشرے کا مزاج رجعت پسندانہ ہو گیا ہے جس کے نتیجہ میں ہم فکری اور ذہنی کشادگی سے محروم ہو گئے ہیں۔ عمومی طور پر یہی تکلیف دہ صورتحال ہے تاہم علی عباس جلالپوری سے لے کر وزیر آغا تک لکھنے والوں نے سلیقے سے بہت کچھ لکھ بھی دیا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے خطوط کا نایاب انتخاب پیش کیا ہے۔ ہر خط کی اہمیت ہے مگر میں انور سدید کے خط کے اس جملہ کا مزہ لے رہا ہوں ''وہ اُن ترقی پسندوں سے مختلف مزاج کے ادیب تھے جن کا اثاث البیت مخیّر دوستوں کی تعریف و تحسین ہے''۔۔۔ اب تو مخیّر حضرات کو شاعر اور ادیب نہ ہوتے ہوئے بھی شاعر اور ادیب بنا دیا جاتا ہے اور انہیں لکھ کر دینے والے ہی پھر ان کی توصیف میں مضامین بھی پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر احمد سہیل اس حوالے سے چند اہم مضامین لکھ چکے ہیں۔ سید معراج جامی کا خاکہ نما'' خامہ انگشت بدنداں ہے'' پڑھنا شروع کیا تو ان کے خامہ کی طرح میں خود بھی انگشت بدنداں رہ گیا۔ رواں دواں یا بے رس نثر تو خیر اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے، خدا جیسے کسی کو عطا کر دے۔ تاہم مجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ خاکہ نما اصغر خان صاحب کا ہے یا شاہینہ فلک صدیقی صاحبہ کا؟ میں نے اس خاکہ نما کو پڑھنے کے بعد یہ دیکھنا شروع کیا کہ اس میں خان صاحب کا نام کتنی بار آیا ہے اور شاہینہ صاحبہ کا کتنی بار۔۔۔ پہلے تین صفحات تک میں نے دونوں ناموں کی گنتی کی تو شرمندگی سی ہوئی پھر مزید گنتی بند کر دی۔ میں ذاتی طور پر ایسی کیفیت میں کسی کی ایسی قلمی تصویر کھینچنے کی بجائے ڈائریکٹ تصویر کھچوا لینا بہتر سمجھتا ہوں۔ مجھ سمیت سارے دوستوں کی تحریروں کا انتخاب کرتے وقت اپنے رسالے کے مزاج کا پاس رکھا کیجئے۔ امید ہے کہ ''حریم ادب'' کا اگلا شمارہ اپنے معیار اور مزاج میں مزید پیش رفت کرے گا۔

انجلاء ہمیش

''حریم ادب'' میں اس کے گیٹ اپ سے مواد تک آپ کی محنت نظر آ رہی ہے۔ اتنے کم عرصہ میں ''حریم ادب'' کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اُسے دیکھ کر خوشی ہوئی۔

خالد قیوم تنولی کا افسانہ'' نارسائی کا رشتہ'' ایک خط کی صورت میں بڑی بھرپور کیفیت لیے ہوئے ہے۔ بہت حساسیت سے لکھا گیا افسانہ ہے۔

البتہ اکبر حمیدی صاحب سے لیے گئے انٹرویو میں انشائیے اور افسانہ کے حوالہ سے ان کے اور رشید امجد کے خیالات پڑھنے کے بعد میں یہ کہوں گی کہ غیر ذمہ دارانہ باتوں پہ حد لگنی چاہیے۔ ٹھیک ہے یہ کہا جا سکتا ہے موجودہ دور میں انشائیہ کے صنف کو خاصی مقبولیت ملی ہے۔۔۔ مگر یہ دعویٰ کہ ''انشائیہ تخلیقی نثر کی دوسری تمام اصناف پر غالب آ جائے گا'' سراسر بے بنیاد ہے۔ انشائیہ اور تخلیقی نثر کی دوسری اصناف کا کوئی مقابلا ہی نہیں کیونکہ انشائیہ تخلیق کے زمرے میں آتا ہی نہیں۔ کسی موضوع پر ایسا مضمون لکھنا جس میں ادبی چاشنی ہو اُسے ''انشائیہ'' کہتے ہیں یا Light essay☆۔ بات دراصل یہ ہے کہ افسانہ خلق کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے اور ایسے افسانہ نگار موجود ہیں جو کہانی لکھنے کے ڈھنگ سے واقف نہیں۔ اب ایسی صورت حال میں یہ اعتراف نہیں کیا جا سکتا کہ دراصل تو وہ خود افسانہ لکھنے کی تکنک سے واقف نہیں اس کے برعکس وہ یہ شور مچاتے ہیں کہ'' باقی اصناف (افسانہ) تو تکنیکی سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر اب بری طرح ہانپ رہی ہیں'' اور حمیدی صاحب کی یہ بات کہ ''افسانہ اپنے بیانیہ کے بھی اسلوب تقریباً ختم کر چکا ہے'' بالکل ہی لاعلمی پر مبنی بات ہے۔ یہ اتنی آسان بات نہیں ہے کہ بنا تحقیق کیے کوئی بھی بیان دے دیا جائے۔ میری رائے میں افسانہ ایک ایسی صنف ہے جس میں نئے نئے اسلوب وضع کرنے کے بڑے امکانات پائے جاتے ہیں۔ آپ مطالعہ کیجئے احمد ہمیش اور اقبال متین یا اور بھی صاحب اسلوب افسانہ

☆ مکتوب نگار کے نقطہ نظر سے اتفاق یا اختلاف تبھی ممکن ہے جب تخلیق اور نا تخلیق (ادب اور نا ادب) کے متعلق اُن کی رائے / نظریہ معلوم ہو جو اس تحریر سے واضح نہیں ہے۔ جہاں تک ادبی چاشنی کا تعلق ہے تو یہ بعض اخباری آرٹیکلز (Articles) اور ٹیلی ویژن کی رپورٹوں میں بھی موجود ہوتی ہے۔ تو کیا یہ سب ''افسانے'' یا ''انشائیے'' ہوتے ہیں؟ مقصد انشائیے اور افسانے میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ تخلیقی ادب کی اصناف کو ادبی چاشنی کے حامل مضامین اور ایسی ہی واقعات نگاری سے متمیز کیا جانا چاہیے کیونکہ جس طرح انشائیے کے نام پر لایعنی تشبیہات سے معمور غیر تخلیقی نثر پاروں کی سنچریاں کی گئی ہیں اسی طرح افسانے کے نام پر لکھی گئی ہزاروں تحریریں بھی افسانے نہیں ہیں۔ چاہے ان ''انشائیوں'' اور ''افسانوں'' کے مصنفین کو کتنے ہی دیباچہ نگاروں اور فلیپ نویسوں کے سرٹیفکیٹ حاصل کیوں نہ ہوں۔ (ج۔ ج۔ ج)

نگاروں کے آج تک لکھے گئے افسانوں کا تو آپ کو معلوم ہوگا اس دور میں لکھے گئے افسانہ میں بیانیہ کے کچھ اور ہی اسلوب سامنے آئے ہیں۔ ویسے بھی یہ ایک فطری عمل ہے۔ تخلیق تو چاہے افسانہ کی صورت ہو یا شاعری کی وہ اپنے راستے خود بہ خود کھولتی جاتی ہے اور افسانہ اپنے مزاج میں اتنی مضبوط صنف ہے کہ کوئی بھی غیر تخلیقی تحریر چاہے وہ انشائیہ ہو یا تنقید نہ تو افسانہ پر حاوی ہو سکتے ہیں اور نہ ہی افسانہ پر اتنا زوال آ سکتا ہے کہ وہ انشائیہ کے رنگ میں رنگ جائے۔ اب اسے آپ فیصلہ سمجھ لیں یا فتویٰ! مگر ہے یہی بات۔

اب حیدر قریشی صاحب کی یہ بات کہ ''نثری نظم میں وہ سارا شعری مواد تو ہوتا ہے جو شاعری کی بنیاد ہے لیکن یہ صرف ایک ڈھیر ہوتا ہے' جب تک نظم نگار کا تخلیقی پروسیس اسے پابند یا آزاد نظم کی صورت میں نہیں لاتا تب تک اس مواد کو شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ بس ڈھیر کو ہلاتے رہیے۔۔۔ اور ہلاتے ہی رہیے۔'' اس حوالے سے آپ کا سوال قابلِ غور ہے کہ ''کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ با قاعدہ علم عروض کے آغاز سے پہلے شاعری کا وجود نہیں تھا؟'' اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ شاعری مروجہ قواعد کے تحت ہی کی جائے بلکہ بڑی شاعری تو نئی قواعد ترتیب دیتی ہے۔ جیسا کہ گوئٹے نے کہا ہے کہ ''بڑا خیال گرامر توڑ دیتا ہے''۔ نثری نظم کی پابند اور آزاد نظم سے الگ اپنی ایک قواعد ہے اس کا اپنا ایک آہنگ ہے۔ آپ ذرا احمد ہمیش کی نثری نظمیں یا ذیشان ساحل اور سارہ شگفتہ کی نثری نظمیں پڑھیے۔ آپ اس کو 'ڈھیر' ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ میری رائے میں یہ نثری نظمیں ہر لحاظ سے مکمل اور بھرپور شاعری کا لطف دیتی ہیں۔

جوگندر پال/انڈیا

۔۔۔آپ کا رسالہ ''حریم ادب'' مجھے مل گیا تھا۔ شکر گزار ہوں۔ جواب میں عمر کی ہنگامی ناسازیوں کے باعث تاخیر واقع ہوگئی ہے جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ یہ بھی سوچتا رہا کہ آپ کو کچھ بھیج پاؤں۔ اب اپنی بیٹی سکرتیا پال کا میری کہانی ''عفریت'' کا انگریزی ترجمہ ہاتھ لگا ہے' جسے آپ کے ''حریم ادب'' کے لیے حاضر کر رہا ہوں۔ ملنے پر مطلع کر دیجیے' ''عفریت'' اور یجنل اردو میں میری کہانیوں کے ایک نئے حالیہ انتخاب میں شامل ہے' یہ کتاب میں نے چند روز پیشتر آپ کو بذریعہ رجسٹرڈ بک پوسٹ ارسال کی تھی۔ اُمید ہے مل گئی ہوگی۔۔۔ مجھے آپ کا عالمی ادبی کتابی سلسلہ ''حریم ادب'' بہت پسند ہے۔ اس طرح اردو کا کوئی اچھا رسالہ یا کتاب کہیں سے آ جاتی ہے تو زندگی میں بارونق سرگرمی کا احساس ہونے لگتا ہے اور اس عمر میں بھی جیتے جھیلتے جانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ خدا آپ کو خوش و خرم اور سلامت رکھے۔۔۔! محبت!

ناصر عباس نیر/لاہور

آپ نے ''حریم ادب'' کو نئے مباحث کا ترجمان بنا کر اہم ادبی خدمت سرانجام دی ہے۔ اس سے پہلے 'صریر' اس ضمن میں ایک فعال ادبی رسالہ تھا۔ مگر وہ اپنے مدیر' ڈاکٹر فہیم اعظمی کی وفات کے ساتھ ہی ''مرحوم'' ہو چکا ہے۔ ''اوراق'' بے قاعدگی سے شائع ہوتا ہے اور دوسرا کوئی پاکستانی جریدہ نئی فکر کی تفہیم و تعبیر کے سلسلے میں متحرک نظر نہیں آتا۔ بلکہ بیشتر رسائل تازہ مباحث کو کار لا حاصل خیال کرتے اور ان سے بے زاری کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ علم و فکر میں نئے منطقوں کی جستجو کا چراغ سدا روشن رہتا ہے۔ آپ نہ صرف اپنے اداریوں میں بلکہ مضامین کے ذریعے بھی نئے فکری' ادبی اور تنقیدی مباحث کو پیش کر رہے ہیں۔ تازہ شمارے کے اداریے میں آپ نے اجمال کے ساتھ قاری اور عمل قرأت کے حوالے سے عالمانہ گفتگو کی ہے' نئی تھیوری میں قاری اور قرأت پر جو زور دیا گیا ہے' اس کا علمی پس منظر آپ نے اختصار کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے نئی تنقیدی فکر اور ہماری کلاسیکی مشرقی تنقید میں قرأتِ ادب کے حوالے سے جو مماثلت ہے' اس کی بھی مختصر اً نشان دہی کی ہے۔

نئی تھیوری کا مطالعہ کریں تو یہ بات بہ طورِ خاص محسوس ہوتی ہے کہ اب تنقید صحیح معنوں میں عالمانہ اور نہایت ذمہ دارانہ سرگرمی کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ تنقید اب سادہ اور سرسری تاثر نہیں رہی۔ اب ادبی متن کی تفہیم و تعبیر کے کئی حربے میسر ہیں اور ہر حربہ ایک با قاعدہ علمی نظریے کی مانند ہے' جو اپنی جہت کے دفاع کے لیے دلائل کا ایک با قاعدہ نظام رکھتا ہے۔ ان نظریات سے عدم دلچسپی اور بے زاری کے اظہار کو ہماری بد قسمتی کہنا چاہیے۔ کسی نظریے کو اس لیے مطعون کرنا کہ وہ مغرب میں پیدا ہوا ہے' افسوس ناک بات ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ نئے نظریات کو رد کرنے کا باعث

بالعموم یہی رہا ہے۔ مغربی فکر کو ہم علمی سطح پر رد کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ یہ مشکل کام ہے۔ اس کے لیے مغربی نقادوں کی سطح کی آ گاہی' قوت استدلال اور وسعت مطالعہ درکار ہے۔ ہاں ان نظریات کے خلاف ایک جذباتی فضا ضرور پیدا کر لیتے ہیں۔ اطمینان کی بات ہے کہ آپ اس جذباتی فضا سے اثر پذیر ہوئے بغیر علمی و ادبی خدمت انجام دینے پر مائل نظر آتے ہیں۔ خدا آپ کو استقامت سے نوازے!

ادیب سہیل / کراچی

آپ کے اداریے کو پڑھ کر اور اس میں شامل نئے ادبی رجحانات و تحریکات کے حوالے سے جو مضامین و مباحث شائع ہوئے ہیں۔ وہ ماہنامہ ''صریر'' کراچی کا ایک عرصے تک اختصاص رہا۔ ''صریر'' بند ہو چکا ہے اور اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر فہیم اعظمی اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ یہ خلا ایسا لگتا ہے کہ ''حریم ادب'' پُر کرتا رہے گا۔ اس وقت ''حریم ادب'' کی یہی Speciality ہے' اس حوالے سے آپ کا اداریہ مارننگ شوز دی ڈے کے مترادف ہے' یہ سلسلہ جاری رکھیے۔ اب یہ کام نئی نسل ہی کو کرنا ہے' اور ''حریم ادب'' نئی نسل کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے مندرجات کے تیور یہی بتاتے ہیں۔

ایک بات اور گرہ میں باندھ رکھیے' مغرب میں نئے نئے ادبی رجحانات وقتاً فوقتاً معاشرہ اور قلم کے رشتے کے ادراک کے بیچ بے طور دھند چھوڑے جاتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی ہر بات پر صاد کرنے کے بجائے پیشانی پر سوچ کے بل پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس سے آگے یہی کہوں گا کہ ''حریم ادب'' کا کارواں۔ استقامت سے آگے بڑھے اور نظرِ بد سے بچا رہے۔

گلِ نوخیز اختر / لاہور

''حریم ادب'' میں ''انچارج نقوی'' شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔ ایک نیا خاکہ آپ کی محبت کے نام۔ آپ نے بڑی محنت سے ''حریم ادب'' کو ممتاز ادبی جرائد کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ میں نے بے شمار معتبر ادبی محافل میں ''حریم ادب'' کو ڈسکس ہوتے سنا ہے اور یہی ایک معیاری جریدے کی کامیابی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نسیم اختر / بنارس' انڈیا

''حریم ادب'' کا کتابی سلسلہ نمبر ۲ آپ کی خصوصی شفقت و بے کراں نوازش سے فردوس نظر بنا ہوا ہے۔ سرحد پار سے یہ عظیم و رفیع' جذبۂ محبت سے معمور خوبصورت شعری و ادبی گلدستہ پا کر جہاں دلِ سرشار ہوا تھا وہیں پلکوں پر خوشیوں کے اشک جگمگا اُٹھے۔
سرورق پر پاکستان کے مقبول و ممتاز آرٹسٹ موجد صاحب کا جاذب نظر' دل نشیں اور گلشن مثال آرٹ دیکھ کر بے اختیار دل سے دعائیہ کلمات نکل گئے۔ خدا مصور موصوف کو تادیر سلامت رکھے۔ قبل بھی ان کی مصوری کے نمونے ''روشنائی'' کے صفحات پر نظر نواز ہو چکے ہیں۔ آپ نے پاکستان کے دُور افتادہ مقام سے بیک وقت اُردو' پنجابی اور انگریزی زبانوں کی تخالیق / نگارشات کے انتخابات ''حریم ادب'' کی وساطت سے قارئین تک پہونچانے کی جو مساعی جمیلہ کی ہے۔ وہ لائق تحسین و لائق صد احترام ہے۔ ادبی پرچوں کا شائع کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اُردو اداریہ آپ کی عمیق علمی و ادبی بصیرت کا آئینہ دار ہونے کے پہلو بہ پہلو دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ سید تحسین گیلانی کا پنجابی اداریہ اگر چہ میں سمجھ نہ سکا کیوں کہ پنجابی زبان سے واقف نہیں ہوں' تاہم پاکستانی رسائل' بالخصوص ماہیوں کے مطالعے سے کچھ الفاظ کے معانی و مفاہیم سے ضرور آگاہ ہوا ہوں۔ میں ''حریم ادب'' کے پنجابی اداریہ اور پنجابی تخالیق کو یہاں کے پنجابی داں حضرات کو پڑھ کر سناؤں گا اور معانی و مفاہیم سے باخبر ہونے کی کوشش کروں گا۔ اردو ادب کے شہ پاروں کو انگریزی زبان میں منتقل کر کے آپ نے مستحسن کام کیا ہے۔ یہ اہم کام عین وقت کا تقاضا ہے۔ مغرب کے انگریزی داں طبقہ کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مشرقی زبانوں میں بھی معیاری ادب تخلیق کیا جا رہا ہے۔ مشرقی علوم و فنون میں ہمارے اجداد و اسلاف نے کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب یوروپ اور امریکہ کے خواص بھی علوم و فنون اور سائنسی ایجادات کے ابجد سے واقف نہ تھے تو ہمارے اسلاف کے ہاتھوں قابلِ ذکر ایجادات وجود میں آ چکی تھیں۔ ہمیں اپنے ماضی کے کارناموں سے دنیا کو واقف کرانے کے پہلو

بہ پہلو جدید علوم وفنون کے کمالات سے بھی آشنا کرانا ہوگا۔ ''اقراء'' کی حرمت قائم رکھنی ہوگی۔

''حریم ادب'' کے آکاش میں غزلیات، ماہیے، تنقیدات، افسانے، طنزومزاح، انٹرویوز، ادبی مباحث، تبصرے، نعتیں، کافی اور تاثرات (ربط پارے) ماہ ونجوم کی مانند جگمگا رہے ہیں۔ جناب سیّد تحسین گیلانی کا عارف کے مجموعۂ غزلیات پر تبصرہ متوازن و مستحسن ہے۔ تبصرہ پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ عارف کے ''یقین'' کا مطالعہ کروں اور اپنی لائبریری کی زینت بناؤں۔ اس حوالے سے شاید آپ کی اور عارف صاحب کی مجھ پر نوازش ہو جائے۔ اقبال جمیل نے مشرف عالم ذوقی کے ناول ''پوکے مان کی دنیا'' کا مختصر مگر جامع تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ''حریم ادب'' کی تمام غزلیں یوں تو معیاری اور عصری مسائل سے مکالمہ کرتی ہیں تاہم چند اشعار بطورِ خاص پسند آئے۔

موسموں کے جھولنے میں جھولتا اک جسم تو
بارشوں کے خوف سے سہما ہوا میرا بدن (سیّد تحسین گیلانی)

ہم سفر کر کے اندھیروں کو تو منزل پا گیا
روشنی کی گود میں سویا ہوا میرا بدن (سیّد تحسین گیلانی)

بے تیغ فوج کو یہ دلاسا دیا گیا
لوہا فصیلِ شہر میں ڈھلوا دیا گیا (جاوید حیدر جوئیہ)

کیا حرفِ حق کی بات کریں، کیا ہوا اسے
پیغمبر اپنے شہر میں جھٹلا دیا گیا (جاوید حیدر جوئیہ)

جہاں جہاں مرے باہر پہ زخم آتا ہے
وہاں وہاں مرے اندر سے بولتا ہے کوئی (جاوید حیدر جوئیہ)

تجھے پھلانگ کے اگلا قدم کہاں رکھوں
اے آسماں، مرے اندر سے بولتا ہے کوئی (جاوید حیدر جوئیہ)

مَیں زمیں زادہ سہی پر آسماں ہونے لگا
کیا بتاؤں یہ مجھے کیسا گماں ہونے لگا (ایم۔اے۔عاصم)

موجود ہے آس پاس ہی تو
ہر سو، ہیں جبھی مرے اُجالے (بشارت علی تنہا)

چارہ سازی رہی محدود بیانات تلک
خوں میں تر ہوتے رہے شہر کے منظر اپنے (نوید صدیقی)

شوق تھا اُونچی اُڑانوں کا بہت ہم کو نویدؔ
دنیا والوں نے مگر کاٹ دیئے پَر اپنے (نوید صدیقی)

تماشا ابتدا کرنے سے پہلے سوچ لینا
مجھے بے دست وپا کرنے سے پہلے سوچ لینا (شہناز نور)

کسی ترنگ میں ہونٹ اس نے رکھ دیے تھے کبھی
گلاب کوئی نہیں پھر کھلا ہتھیلی پر
نصیب ہی سے مہکتی ہے زندگی کوئی
ہزار نور رچا لو حنا ہتھیلی پر — شہناز نور

دیکھنے والو! اسے میری نظر سے دیکھو
یہ مرا چاند سا مُنّا بھی غزل جیسا ہے (مناظر عاشق ہرگانوی)
دھرم کے نام پہ یہ قتل کی سازش کچھ سوچ
تیرے ہمسائے کا بچہ بھی غزل جیسا ہے (مناظر عاشق ہرگانوی)

نئی فکر کے امتیازات/ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی' اچھا سلسلہ ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔ جناب اسلم حنیف نے مابعد جدیدیت اور ''لاتحریک'' کے حوالے سے جس بحث کا آغاز کھلے دل و دماغ سے کیا ہے' اس میں اہلِ قلم کو سنجیدگی سے حصہ لے کر بحث کو نتیجہ خیز منزل تک پہونچانا چاہیے۔ براہ کرم ''حریم ادب'' میں لکھنے والوں کے پتے بھی شایع کیا کریں۔ خوبصورت شہر بتاں اور ریشمی ساڑیوں کے سورگ بنارس میں آپ کے جہد و عمل کے سندر سجیلے ''حریم ادب'' کی پذیرائی ہورہی ہے۔ بنارس کے بتان ادب نے ''حریم ادب'' کے حرف حرف کو سرمہ نظر بنانے کے پہلو بہ پہلو شوالۂ دل میں بھی سجالیا ہے۔ آپ سے استدعا ہے کہ ''حریم ادب'' کے خوبصورت تحفہ کو پابندیٔ وقت کے ساتھ ضرور ارسال کیا کریں۔ اس گراں قدر تحفہ کے لیے میرے ساتھ ہی اہلِ بنارس بھی آپ کو دُعائیں دیں گے۔

افتخار عارف/ اسلام آباد

بے حد احسان مند ہوں کہ آپ نے کرم فرمایا اور ''حریم ادب'' کا شمارہ عنایت کیا۔

ادبی رسالوں کے ضمن میں پریم چند کے حوالے سے آپ کا اقتباس پڑھ کر طبیعت اُداس ہوئی' مگر بات وہی ہے جو آپ نے شعر میں نقل کی۔ ادب زیاں کا معاملہ ہے مگر اہلِ عشق جب خسارے پر بہ رضا و رغبت خود آمادہ ہوں اور مطمئن بھی' تو دل سے اُن کے لیے دُعا نکلتی ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ فہرست میں' شاعری میں بھی اور انشائیے میں بھی' ایسے نام شامل ہیں جن کی تحریریں میں شوق اور توجہ سے پڑھتا ہوں۔ انشاءاللہ ''حریم ادب'' کے ساتھ کچھ وقت گزارا جائے گا' فیض یاب ہوں گا اور آپ کو دُعائیں دُوں گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

عبدالقیوم/ اٹک

''حریم ادب'' نومبر' دسمبر ۲۰۰۴ء کا خوبصورت ٹائٹل سے مزین شمارہ نظر نواز ہوا۔ شکریہ

نظم و نثر کے حوالے سے تقریباً ہر زاویے پر مشتمل اچھی تحریریں پڑھ کر آپ کی محنت کی داد دینی پڑتی ہے کہ آپ نے زیر نظر شمارے کو یادگار بنادیا ہے۔ سب سے پہلے انٹرویوز میں نے پڑھے۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ تینوں انٹرویوز بھرپور اور پُر مغز جوابات کے حامل ہیں' جن کے ذریعے سے تخلیق کاروں کی ذہنی کشادگی سے آشنائی ہوتی ہے۔ بیجا نہ ہوگا اگر ان انٹرویوز میں سے مختصراً چند سطور نقل کی جائیں۔۔۔ بیدل حیدری کے انٹرویو میں سے یہ جواب متشاعروں کے لیے تنبیہ کا درجہ رکھتا ہے:

شاعری کے لیے علم عروض ضرور نہیں ہے۔ وہ اس لیے کہ شعر وجدانی اور الہامی کیفیات میں کہا جاتا ہے۔

اکبر حمیدی کے انٹرویو میں سے چند سطور:

۔۔۔ یہ درست ہے کہ وقت معاشرتی ڈھانچوں کو اور ان کی اخلاقیات کو تبدیل کرتا چلا جاتا ہے مگر انسانی اخلاقیات کو' انسانی جبلتوں کو یا

انسان کے بنیادی جذبوں کو تبدیل نہیں کر پاتا۔۔۔

۔۔۔سو اعلیٰ ادب سب سے پہلے ایسا ادب ہے جن کا تعلق ہماری اپنی زمین سے ہے۔ ہمارے اپنے لوگوں سے اور اپنے دُکھ سکھ سے ہے۔۔۔ جس کا کھائیں اُس کا گائیں۔۔۔ ہاں پھر اس کے بعد دنیا کے آفاق کی بھی باتیں کریں کہ تمام انسان ایک برادری سے متعلق ہیں۔۔۔

حیدر قریشی کے انٹرویو میں ان کی اپنی شاعرانہ اور افسانوی قابلیت کے بارے میں اندیشہ/ توقعات ملاحظہ ہوں:

۔۔۔اگرچہ اپنے اظہار کے لیے میں اس حد تک مطمئن ہوں کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں کسی نہ کسی رنگ میں کہہ لیتا ہوں۔ تاہم مجھے کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ طبیعت کی موزونیت کے باوجود مجھے کوئی اچھا رہنما مل جاتا تو عروض کی تھوڑی سی سوجھ بوجھ میرے لیے مفید ثابت ہوتی۔۔۔ مجھے کبھی کبھی اپنی اس کمی کا احساس ہوتا ہے۔

۔۔۔میں تو اتنا جانتا ہوں کہ میں افسانہ لکھتے ہوئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کرتا۔۔۔ بس جیسے کہانی نے ہونا ہوتا ہے ہوتی چلی جاتی ہے۔ کبھی کہانی کہیں اٹک جاتی ہے تو میں اسے رستہ سجھا دیتا ہوں اور کبھی میں اٹک جاتا ہوں تو کہانی خود میری مدد کرتی ہے۔۔۔ نہ میں اکیلا کہانی لکھتا ہوں نہ صرف کہانی مجھے لکھتی ہے۔۔۔ ہم دونوں مل کر سفر طے کرتے ہیں۔ جیسا سفر ہوگا ویسا ہی افسانہ سامنے آئے گا۔

''خامہ انگشت بدنداں ہے'' (سید معراج جامیؔ) خاکہ نما تحریر کیا ہے۔۔۔ لگتا ہے جیسے جادوئی اثر جامیؔ صاحب نے اپنی تحریر میں بھر دیا ہے۔ مزاح کے چھینٹوں نے اس تحریر کو ناقابلِ فراموش بنا دیا ہے۔۔۔

پانچ افسانوں میں سے محمد حامد سراج کا افسانہ ''آخری آئس کیوب'' دلچسپ ہے۔ تاہم ''نارسائی کا رشتہ (خالد قیوم تنولی) بہت ہی خوبصورت اسلوب کا حامل اچھا افسانہ ہے۔۔۔ ترجمہ شدہ افسانہ 'بارش بھی دھوپ بھی'' (قاسم جلال) بھی اچھا افسانہ ہے۔۔۔

اسی طرح پانچوں انشائیے اچھے ہیں لیکن اکبر حمیدیؔ کا انشائیہ ''جادونگری'' بے حد دلکش انشائیہ ہے اور اس کا شمار اردو کے بہت اچھے انشائیوں میں ہوگا۔۔۔ اکبر حمیدیؔ کے انشائیے تجربات کے مختلف سانچوں میں سے گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل ارتقا پذیر ہیں۔۔۔

ن۔م۔ راشدؔ کے بارے میں مقالہ ''راشد کا نیا آدمی'' (ناصر عباس نیر) متوازن تنقید کی عمدہ مثال ہے۔ ناصر عباس نیر اکثر اپنے مقالوں کو مختلف پرانی تحریکوں اور نظریوں کے پس منظر میں سے گزار کر نئے اور جدید نظریوں کی کسوٹی پر کس کر نتائج اس طرح اخذ کرتے ہیں کہ قاری کی ذہنی گرہیں کھلنے لگتی ہیں۔ دوسرا مقالہ ''راشد کا نیا انسان'' تحسین زہرا صاحبہ نے سیدھے سادے انداز میں تحریر کیا ہے اور اچھا ہے۔۔۔ اس میں کیا شک کہ راشدؔ مغربی اقدار اور عیش و عشرت کی زندگی کا رسیا تھا۔۔۔

تقریباً ایک سو غزلوں میں سے بہت سے اشعار دل و دماغ کو روشن کرتے ہیں۔ صرف چند ملاحظہ ہوں۔

اسے پتا ہی نہ تھا زندگی کی وسعت کا
جسے گلا یہ رہا زندگی بہت کم تھی
(عطاء الحق قاسمی)

بات کرتے ہو سخت لہجے میں
یوں کوئی محترم نہیں ہوتا
(نذیر اذفر)

تمہارے شہر کی تاریخ لکھنے کا ارادہ ہے
میں جس چہرے کو پڑھتا ہوں وہ چہرہ کچھ نہیں کہتا
(شکیل ملتانی)

خشک پیڑوں کو کتنا بڑتا ہے
اپنے ہی اشک پی' ہرا ہو جا
(توقیر تقی)

پہلے تمام شہر کو پتھر دیئے گئے
پھر جستجو کی لاش کو لٹکا دیا گیا
(جاوید حیدر جوئیہ)

ربط پارے میں کچھ خطوط توجہ کھینچتے ہیں البتہ مرتضیٰ برلاس (لاہور) کے خط کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال شاید نامناسب نہ ہو۔۔۔ کیونکہ ان کے خط میں کچھ زیادہ ہی تلخی راہ پا گئی ہے۔۔۔

سب سے پہلے رسالے کے باریک پرنٹ سے شکایت ہے۔۔۔ اگر ان کا مطالبہ مان لیا جائے تو پھر یہی شمارہ چھ سو صفحات سے زیادہ گھیرتا' جس سے اخراجات کافی بڑھ جاتے۔۔۔ میرے خیال میں زیرِ نظر شمارے میں جدید ادبی مباحث اور انشائیے قطعاً حاوی نہیں ہیں۔۔۔ ویسے بھی ادبی مباحث تو کسی پرچے میں وقتاً فوقتاً شائع کرنا مدیر کی ذہنی کشادگی کا مظہر ہوتے ہیں۔۔۔ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات میں سے گیارہ صفحے انشائیے کے حصے میں آئے ہیں' جس پر اعتراض جائز نہیں۔۔۔ انشائیے کے بارے میں مرتضیٰ برلاس صاحب کچھ الرجک لگتے ہیں۔۔۔ پھر یہ اعتراض تو درست نہیں کہ مدیر رسالے میں اپنی تحریروں کی شمولیت سے احتراز کرے۔ میرے خیال میں مدیر کی علمیت اور مختلف اصناف ادب پر اس کی 'گرفت' پڑھنے والوں کو مثبت انداز میں متوجہ کرتی ہے۔۔۔ اور رسالے کا وقار بلند ہوتا ہے۔۔۔ ہاں! تخلیق میں دم ہونا ضروری ہے! علاوہ ازیں انگریزی حصے پر اعتراض کا مدلل جواب تو آپ نے فٹ نوٹ میں دے دیا ہے۔ اگر رسالے کے ۳۴۴ صفحات میں سے ۲۲ صفحے انگریزی حصے کے لیے وقف کر دیئے گئے تو اس پر اعتراض کچھ جچتا نہیں! حقیقت تو یہ ہے کہ مرتضیٰ برلاس کا خط پڑھ کر یوں لگا جیسے ایک بزرگ ایک ناسمجھ بچے کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد اسے بڑے پیار سے سر پر ہاتھ پھیر کر منانے کے لیے میٹھے میٹھے لفظ اس کے کان میں اُنڈیل رہا ہو۔۔۔ خط میں کہیں کہیں یہی انداز نظر آتا ہے!

بحیثیت مجموعی زیرِ نظر شمارہ زیادہ تر گراں قدر تحریروں سے مزین ہے' جسے پڑھ کر ہر کوئی آپ کی محنت و لگن کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے بے لوث محبت کی داد دے گا!!!

''اطراف'' کے ذیل میں اداریہ ''عملِ قرأت اور علم و ذوق'' سوچ کو مہمیز کرتا ہے۔ اس میں صاحبِ علم کی آراء کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔۔۔ اس سلسلے میں Hans Robert Jauss کی یہ رائے بلاشبہ صائب ہے:

> ''دراصل قاری ہی متن کو اپنے زمانے کے جمالیاتی اُفق مہیا کرتا ہے اور یوں مختلف زمانوں میں ایک ہی متن کے جمالیاتی اُفق بدلتے رہتے ہیں۔۔۔''

اب یہ سوال کہ ہمارے ہاں کتنے ادارے اردو ادب کے قاری کو ایسی تربیت کا کام بحسن و خوبی کرتے ہیں تو اس کا جواب مایوس کن ہے۔ جب تک یہ کام ذوق و شوق سے پورا نہیں کیا جائے گا' اس میں بہتری کی صورت ممکن نہیں ہو سکتی!

قیصر نجفی / کراچی

''حریم ادب'' کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ آپ ایسے فاضل قلمکار کی زیرِ نگرانی مرتب ہوتا ہے۔ میرے نزدیک کسی بھی علمی و ادبی جریدے کو موقر بنانے میں مشمولات کا کڑا انتخاب کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ جبکہ کڑا انتخاب مدیر کے علم و آگہی پر موقوف ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ ''حریم ادب'' کے دونوں شمارے آپ کے وسیع مطالعے کے ساتھ ساتھ آپ کی علمی بصیرت کے بھی مظہر ہیں۔ بلاشبہ ادب کے قدیم و جدید' ہر نوع کے نظریات پر آپ کی نگاہ ہے۔ خاص کر یہ اَمر باعثِ مسرت و اطمینان ہے کہ آپ ایک روشن خیال صاحبِ علم ہیں اور ''حریم ادب'' کے لسانی ہی نہیں' فکری و نظری کینوس کو بھی وسیع سے وسیع تر کرنے میں کوشاں ہیں۔ ہر چند ''حریم ادب'' اپنے سفر کے ابتدائی مراحل میں ہے' لیکن دُور رس نگاہیں ابھی سے اس کے جلو میں شاندار منازل کو دیکھ رہی ہیں۔۔۔

سعید اقبال سعدی / گوجرانوالہ

میں آپ کی ہمت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ نے ادبی مراکز سے دُور بیٹھ کر اتنا بھرپور اور دلآویز مجلّہ شائع کیا ہے کہ بڑے مراکز کے نہ صرف ناقدین بلکہ ٹی وی سٹیشن بھی اسے سراہنے پر مجبور ہوئے ہیں آپ نے اداریے کو بھی جو زبردست رنگ دیا ہے وہ بھرپور اور معلوماتی رنگ کبھی ڈاکٹر فہیم اعظمی (مرحوم) اپنے ماہنامے ''صریر'' کو دیا کرتے تھے اور ان کا اداریہ دُور دُور تک سراہا جاتا تھا اب ماشاء اللہ آپ نے نہایت جامع اور

معلومات سے بھرپور منفرد انداز میں اداریہ لکھا ہے جو اس وقت کے اداریوں میں یقیناً ممتاز حیثیت کا حامل ہے اور مختلف علوم پر آپ کی دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہے میں اس پُرمغز اداریے پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

جہاں تک ''حریم ادب'' میں شامل مواد کا تعلق ہے تو دونوں اصناف یعنی نثر اور نظم دونوں حصے اپنا جواب آپ ہیں حضرت بیدل حیدری اور جناب اکبر حمیدی کے انٹرویوز بہت پسند آئے جناب حیدر قریشی کا انٹرنیٹ انٹرویو بھی اپنی مثال آپ ہے اور مینارِ علم جناب ڈاکٹر معین الرحمان صاحب کا خطوط کا انتخاب بھی خاصے کی چیز ہے اور بلاشبہ ایک قابلِ تحسین حصہ ہے جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے جہاں تک حصہ غزل و نظم کا تعلق ہے تو شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جہاں پر شعراء کا کلام پڑھ کر واہ کہنے کو دل نہ کیا ہو اس خوبصورت حصے پر آپ کے حسن انتخاب کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ نے یقیناً بہت محنت اور دلجمی سے شاعری کا انتخاب کیا ہے اور ہم جیسے ادب کے پیاسوں کی پیاس بجھانے کا اہتمام کیا ہے۔ نظم اور غزل دونوں حصوں نے متاثر کیا ہے دونوں حصے پُرلطف مواد پر مشتمل ہیں۔

پیارے برادران! زندگی بہت تیز رفتار ہوگئی ہے پتہ ہی نہیں چلتا کب دن چڑھا اور کب شام ڈھل گئی اس تیز رفتار زندگی میں اگر کوئی آپ جیسا ایک مضافاتی علاقے میں رہ کر ادب کی آبیاری کا کام سرانجام دے رہا ہے تو یہ اس شخص کی ہمت اور جوانمردی ہے اس کا خلوص اور ایثار ہے۔ جس کی داد ہر سچے اور سچے اہلِ دل کو دینی چاہیے اور اس بلا منافع کے سودے کو سراہنا چاہیے جس میں جیب سے جاتا بہت کچھ ہے آتا کچھ نہیں۔۔۔ مگر اہلِ قلم کی محبت اور عقیدت سے تو جھولیاں بھر جاتی ہیں۔

ڈاکٹر صابر کلوروی/پشاور

''حریم ادب'' کا شمارہ ۲ موصول ہوا۔ اس اعزازی نسخہ کے لیے میرا شکریہ قبول کیجئے۔ پہلے شمارہ کی اشاعت پر میرا خیال تھا آپ دوسرے شمارے کی اشاعت پر رسالہ نکالنے سے توبہ کرلیں گے۔ آپ نے استقامت دکھا کر میرے خیال کو خیالِ خام ثابت کردیا۔ پاکستان میں ادبی رسائل سب سے زیادہ گھاٹے کا سودا ہے۔ آپ ثواب کا کام کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ہمت عطا کرے تاکہ ادب کی مزید خدمت کرسکیں۔

اس شمارے کا تمام مواد معیاری ہے کیا تخلیقی کیا تحقیقی' تاہم فہرست مضامین میں مضمون نگاروں کے نام بھی درج ہوں تو کیا ہی اچھا ہو۔ نذر خلیق اور ناصر عباس نیر سے بڑی توقعات ہیں' خدا کرے ادب سے ان کی وابستگی ہمیشہ قائم رہے۔

پروفیسر انور جمال/ملتان

پرچہ ''حریم ادب'' کتاب نمبر II ملا۔ اس کے مندرجات پر نظر ڈالی' بڑی طمانیت ہوئی آپ نے اسے نہایت سلیقے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اردو' پنجابی اور انگریزی ہر سہ زبانوں پر مشتمل یہ کتاب نہایت خوبصورت ہے۔ ''اطراف'' میں عملِ قرأت اور علم ذوق۔۔۔ خوبصورت تحریریں' غزلوں' نظموں کا شعبہ اردو شاعری کی مضبوط روایت کا نمائندہ ہے۔ پنجابی حصے میں نثر کی کمی کا شدید احساس ہوا۔ انگریزی میں جناب افسر ساجد کی تحریر The Redress of Poetry:an overview نہایت بلیغ اور بصیرت افروز ہے۔ اس شاندار کتاب کی اشاعت پر آپ کی سعی مشکور لائق تحسین ہے۔

شیراز طاہر/ گوجر خان

ماہ نومبر' دسمبر کا ''حریم ادب'' بوساطت آلِ عمران پڑھنے کو ملا۔ اس کے بعد جنوری' فروری کا ''حریم ادب'' کیسا ہے۔ نہ دیکھا ہے' نہ پڑھا ہے لیکن یوں لگا ہے کہ ادب کے پیاسے صحرا میں ادب کی جوئے شیر بہہ نکلی ہے۔ اتنا خوبصورت ٹائیل' تین زبانوں کی تخلیقات' کتابوں پر تبصرے' انشائیے' جدید شاعری' افسانہ' غزل۔ کہ میں آپ اور آپ کی ٹیم کو مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اتنے اچھے' پڑھے لکھے اور ٹیم ورک میں کام کرنے والے دوستوں کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ مل کر میں بھی کام کروں۔ آپ کی ریاضت' کوشش' ہمت اور حوصلے کی داد دیتا ہوں۔ ''حریم ادب'' کا مطالعہ کیا ہے۔ چونکہ میں بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں۔ اس لیے پہلے تو افسانہ ہی پڑھتا تھا۔ لیکن ''اطراف'' کے کیا کہنے بہت ہی پسند آیا۔ آپ کی باتیں دل میں اُتر گئیں۔ جن باتوں کو آپ نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُس

کے لیے' کس سے کہیں' کس سے گلہ کریں۔ شاید یہی ہماری بدقسمتی ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد میرے اور احمد داؤد کے بھائی اور استاد بھی سمجھ لیجئے اُن کا افسانہ ''بکھری ہوئی کہانی'' کافی عرصہ کے بعد پڑھنے کو ملی۔ میرے پیارے شہزواہ کینٹ سے خالد قیوم تنولی کا افسانہ ''نارسائی کا رشتہ'' بہت ہی پسند آیا۔ شاید اس لیے کہ میں نے بھی اپنے افسانے کا سفر اُسی شہر سے شروع کیا تھا۔ ''کتب خانے'' میں بھی بہت عرق ریزی کی گئی ہے۔ خاص کر آپ کی محنت اس میں بہت شامل ہے جس جاں فشانی سے آپ نے کام کیا ہے۔ کتاب کا معیار بڑھ گیا ہے۔

شناور اسحاق/لاہور

آپ نے قارئین کی آراء کے پیش نظر شمارہ ہذا کو بہت Improve کیا ہے۔ یہ آپ کا بڑا پن ہے کہ آپ نے مختلف لوگوں کی تلخ وشیریں باتیں نہ صرف بہت حوصلے سے سنیں بلکہ اُنھیں شائع بھی کر دیا۔ خالص علمی اور ادبی مباحث کے لیے آپ نے ''حریم ادب'' میں جو فضا قائم کی ہے۔ وہ بہت حوصلہ افزا، اور قابل تحسین ہے اور یہ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ فطرت ویکیوم برداشت نہیں کرتی۔

کچھ باتیں مندرجات کے بارے میں' ستیہ پال آنند کی نعت بہت پسند آئی لیکن گزشتہ دو چار برسوں کے دوران میں میں نے محسوس کیا ہے کہ اُن کی نظموں کے نیچے فٹ نوٹ بہت زیادہ اُگ رہے ہیں۔ اُن کا علم اور مطالعہ ان کے Poetic Self پر بوجھ بڑھاتا جا رہا ہے۔ میں اُن کے ایک مخلص قاری کی حیثیت سے اُن کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ وہ اپنی نظموں سے شاعری کو رخصت ہونے سے باز رکھیں☆

رفیق سندیلوی کی ساری نظمیں بہت اعلیٰ ہیں۔ میں اُن کے بارے میں یہی کہوں گا کہ رفیق سندیلوی صرف اچھی نظم کہنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ عظیم ہیں یہ لوگ کہ اپنے خونِ جگر سے اہل دل کے تزکیۂ باطن کا فرض ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی نظمیں بھی اُن کے تخلیقی استقلال کی گواہی دے رہی ہیں۔ حیرت ہے کہ وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ کر بھی ہم سے کہہ رہے ہیں۔

چلو اک بار پھر ہم/کچے رستے پر سفر آغاز کرتے ہیں/چلو پھر خاک سے کہتے ہیں/اُٹھ اور ساتھ دے ہم خستگاں کا/جو تجھے ہمراہ لے کر/دُور تک جانے کا اک پختہ ارادہ دل میں رکھتے ہیں۔

حصۂ غزل میں افتخار عارف' اعجاز توکل' احمد سلیم رفی' کاشف مجید اور مظہر نیازی کی غزلیں بہت پسند آئیں۔

مضامین میں ناصر عباس نیر کا مضمون ''راشد کا نیا آدمی''، عملی تنقید کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اُردو کے تنقیدی اُفق پر ناصر عباس نیر وہ ستارہ ہے جس کی تابندگی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں ان کی درازیٔ عمر کے لیے دلی دُعا کرتا ہوں۔

آپ نے اکبر حمیدی کا انٹرویو بہت اچھا کیا ہے۔ آپ دونوں بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ آپ نے سوالات بہت اچھے کیے حمیدی صاحب نے جوابات بہت اچھے دیئے۔

ناصر شہزاد اپنے خط میں رقمطراز ہیں' ''سید تحسین گیلانی کے لیے آداب! اُن کے ساتھ میرا جسمانی اور روحانی رشتہ ہے۔'' یہ جسمانی رشتہ کیا ہوتا ہے؟ اگر روحانی کے ساتھ قافیہ ملانا اور گیلانی صاحب کے ساتھ رشتہ بتانا بیک وقت ضروری تھا تو لفظ ''خاندانی'' سے بھی کام چل سکتا تھا☆☆ ناصر شہزاد صاحب اس زمانے میں جس قسم کی نثر لکھ رہے ہیں وہ اُنھی کا حصہ ہے۔ مستقبل کا مؤرخ اُن کے خطوط کو بامعنی کہے یا نہ کہے غیر مقفیٰ نہیں کہہ سکے گا۔

ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ تعریف سُن کر بھول جانا چاہیے۔ تنقید یاد رکھنی چاہیے۔ پنجابی حصے میں سلطان کھاروی اور عبدالقدوس کیفی

☆ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ نظم میں نامانوس' اصطلاحی' اسطوریاتی یا دوسری زبان کے لفظ/الفاظ کی وضاحت بصورت فٹ نوٹ کرنے سے شاعری رخصت ہو جاتی ہے۔ راقم کے خیال میں ایسا کرنے سے بعض اوقات قاری کو نظم کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لیے اس میں ہرج کی کوئی بات نہیں۔ تاہم ایسا کرنا شاعر کا اختیاری معاملہ ہے ناگزیر امر نہیں۔ (ت۔ ت۔ ج)

☆☆ ناصر شہزاد صاحب نے ''جسمانی رشتہ'' کو ''روحانی رشتہ'' کے متخالف جوڑ (Binary Opposite) کے طور پر استعمال کیا ہے۔ صنعت مجاز مرسل کو پیش نظر رکھیں تو اس کا مفہوم مجوزہ الفاظ ''خاندانی رشتہ'' سے الگ نہیں ہے۔ (ت۔ ت۔ ج)

سر فہرست ہیں!

حمیدہ شاہین/ لاہور

''حریم ادب'' پڑھ کر سب سے پہلا خیال یہ تھا کہ مرتبین تک اپنی رائے پہنچائی جائے' تا کہ ان کے حوصلے بلند رہیں۔ بڑے شہروں کے کام بے شک چھوٹے ہوں' ان کے غرور بڑے ہوتے ہیں لیکن ''حریم ادب'' اپنی گواہی آپ ہے کہ مرتبین نے کس قدر محنت کی ہے اور اسے بجا طور پر بڑے اور اہم پرچوں کے برابر رکھا جاسکتا ہے۔

آپ کو یقیناً بہت تحسین و توصیف موصول ہوئی ہوگی لیکن میں نے رائے دینا ضروری سمجھا۔

محمد فیروز شاہ/ میانوالی

''حریم ادب II'' نے ثابت کر دیا ہے کہ محنتیں اور محبتیں سچی ہوں تو نقش ثانی۔۔۔ نقش اول سے بازی لے جاتا ہے۔ ''حسن سیرت'' اپنی جگہ اہم سہی حسن صورت کی اہمیت ہر دور کے مزاجی طور میں شامل رہی ہے۔۔۔ رعنائی کی اپنی ایک توانائی ہوتی ہے' جس کی تاثیر دلوں کو اپنی جاگیر بناتی چلی جاتی ہے۔۔۔ آپ شاید تسخیر قلوب کا یہ اسم جان گئے ہیں بلکہ یقیناً!

اداریہ میں آپ نے بڑا اہم سوال اُٹھایا ہے۔ مستند آراء کی رفاقت میں تخلیقی' تہذیبی' تعلیمی اور تدریسی روایت کی ثقافت کا احیاء' آپ کے دردمند لفظوں میں ایک پُر جوش تمنا کی صورت ظہور کرتا ہے۔۔۔ میں سمجھتا ہوں۔۔۔ تخلیق' مصنف اور قاری کے معیار کو بہتر بنانے کی کوئی بھی خواہش اس وقت تک نوید تکمیل حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ ہمارے موجودہ رویوں میں تخلیقی اخلاص اور صادق احساس کی مہک شامل نہ ہو جائے۔۔۔ ایسا تبھی ممکن ہے کہ جب نقد ادب کے منظر نامے سے دوست نوازیوں اور دشمن داریوں کو خارج کر کے تخلیقی عمل کی تحسین و تردید سچی تنقید کے جذبے سے کی جائے۔ رسائل و جرائد اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر و احباب پر توجہات مرکوز کر رکھنے کی بجائے فقط ادب کو اولین ترجیح بنائیں۔ کالجز اور یونیورسٹیاں ادبی سرگرمیوں کو دیس نکالا دینے کی بجائے انھیں اپنی فضا اور اپنے ماحول کا لازمہ بنائیں۔ اکادمیاں اور میڈیا دوست داریوں گروہ بندیوں اور اقربا پروری کی بجائے ادبی فعالیتوں کو مرکزی اہمیت دے کر اپنا دائرۂ عمل ہر تخلیقی آدمی تک بڑھائیں۔ ادبی تقریبات اور ادبی انجمنیں ذاتیات سے بلند تر ہو کر تخلیقی سرشاروں کو معاشرت کے مزاج کا رواج بنا دینے کے لیے سرگرم کار ہو جائیں۔۔۔ رہی بات استادی شاگردی کی تو شاید یہ اب ہمارے زمانے کے فسانے میں کہیں مذکور ہی نہیں۔۔۔ اب تو ہر شخص خود اپنا راہنما ہونے کا مدعی ہے۔۔۔ کبھی ''بے استادا'' ہونا عیب کی بات سمجھی جاتی تھی اب ہر شخص خود استاد ہے بلکہ ''بڑا استاد'' ہے۔۔۔ ایسے میں کون کسی کی سنے؟ اب تو کسی فنی سقم کی صورت میں بھی لکھ دیا جاتا ہے۔۔۔ ''میں اسے جائز سمجھتا ہوں۔۔۔'' یہی استکبار ہمیں تخلیقی زوال سے دوچار کر رہا ہے۔۔۔

کیسی بلندی ہماری تہذیبی اساس میں تھی اور آج کیسی پستی ہمارا اثاثہ بن رہی ہے؟ کبھی کبھی تو مجھے ہول آنے لگتے ہیں کہ ہم نے ماحول کو کیسا پُر ہول بنا دیا ہے۔۔۔ آپ نے بہتری کی صورت دریافت کی ہے تو وہ میں نے آغاز میں عرض کر دی ہے کہ اخلاصِ عمل اور حسن نیت سے بگڑے کام سنوارے جا سکتے ہیں داغستان کے دانشور شاعر رسول حمزہ توف نے ندیوں کے شفاف پانیوں سے زمینوں کی سیرابیوں کی خواہش کرتے ہوئے انھیں سیلابی جولانیوں اور طغیانیوں سے گریز کی نصیحت کرتے ہوئے بھی دراصل تو یہی اثباتی طرز عمل اور خلوص نیت کی منظر کشی کی تھی آج ہمارے تخلیق کاروں کو بھی ذہنوں اور دلوں کی ویران کھیتیوں کو سیراب کرنے کی ضرورت کا احساس ہونا چاہیے۔ قرطاس نگر کی آبادیوں کو بربادیوں سے بچانے اور شادابیوں کی تر و تازہ فصلیں اُگانے کی سبیل کرنی چاہیے کہ اب صرف یہی صورت رہ گئی ہے تخلیقی زندگی میں تابندگی بھرنے کی۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کہ ابھی موسم گل کی آرزو میں زیست کو خوشبو بنا دینے والے لوگ یاس کے کسی روگ میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ابھی ہرے موسموں کی آس زندہ ہے' سنہری رُتوں اور چاندنی راتوں کے انتظار میں جاگنے والی آنکھوں کے خواب ابھی بے آب نہیں ہوئے۔ ہواؤں میں پرندوں کے چہچہے اور تیز خرام ندیوں کے زمزمے اور فلک بوس پہاڑوں کے دبدبے اور معصوم بچوں کے قہقہے اس اُمید کو زندہ رکھے ہوئے ہیں جو فطرت کے ہمراز تخلیق کاروں کے لیے آنے والے کامران زمانوں کی نوید لاتی ہے اور جس کے آنگن میں چمکتے چاند کی آب و تاب جاوداں زمانوں کی جبینوں پر یوں رقم ہوتی ہے کہ صدیاں اسے

سلام کر کے آگے بڑھتی ہیں اور وقت ان کی دوامِ عظمتوں کی گواہی دے رہا ہوتا ہے اور لاریب وقت اپنی امانتوں اور شہادتوں کو کبھی بے وقعت نہیں ہونے دیا کرتا!!!

آپ نے جس والہانہ وابستگی سے ذیلی عنوانات کے حسن سے ''حریم ادب'' کو سجایا ہے۔ میرے تیقن کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔۔۔ آرائشِ جمال کا ذوق رکھنے والوں کی طبیعت میں قلبی شوق کی ثروت بھی موجود ہو تو لمحۂ شب فجر کے سہانے اجر کا ہراول بن جایا کرتا ہے۔۔۔ سو تمام تر کوتاہیوں کے باوجود ہمارا ادبی منظر نامہ ایک روشن سحر کی آس میں سانس لیتا ہے۔۔۔

اُفق پر رات ہے لیکن سحر کی آس زندہ ہے
اُبھر آئے گا سورج بھی یہاں آہستہ آہستہ

بس آپ اسی عزمِ صمیم اور جہدِ عظیم سے رواں دواں رہیے کہ منزلوں کو راستوں کی صعوبتوں سے نبرد آزما ہو کر بڑھتے رہنے والے مسافروں کی قدم بوسیوں کا بہت اشتیاق ہوتا ہے اور ''حریم ادب'' کو آپ نے ایسے کاررواں کی شکل دے دی ہے جس میں اہلِ علم وقلم نے منزل نصیب روشنیوں کی کہکشائیں آراستہ کر دی ہیں۔ ستیہ پال آنند کی نعتیہ نظم' خورشید میلسوی کی نعت' حیدر قریشی کی شاندار غزل (بہ فیض بلھے شاہ) بشریٰ رحمٰن' اعجاز توکل اور نوید صدیقی' کی غزلیں دلنوازی کی کیفیت سے مالا مال ہیں۔ افسانوں پر بات محمد حامد سراج بھائی کے لیے چھوڑتا ہوں کہ ان کا ہاتھ اس شعبہ کی نبض پر ہے اور گفتگو میں خوشبوان کی زبان اور قلم کی خو ہے ڈاکٹر بیدل حیدری کے ساتھ زندہ دوپہر کی عکس کاری نے ان کی قلمکاری کو بادِ بہاری بنا دیا ہے۔ قاری اور لکھاری کے مابین فاصلہ مٹ جائے تو لفظ خوشبو دینے لگتے ہیں اور قرطاس کی ہتھیلیوں پر دیے جل اُٹھتے ہیں روشنی بچی ہو تو چراغ منزلوں کے سراغ بن جایا کرتے ہیں۔۔۔ عصری دانائی اسی تخلیقی توانائی سے ترتیب پاتی ہے تو لمحۂ موجود کی دانش آئندہ زمانوں کی جھولی تابندہ خزانوں سے بھر جاتی ہے۔۔۔ ادب کو اسی لیے میتھیو آرنلڈ نے تشکیل حیات' تطہیر حیات اور تعمیر حیات کہا تھا۔ اب ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں کا مطالعہ اس کی تصدیق کر رہا ہے۔ بجھی گونج میں گم ہوتی صدا ایک آزاد فضا کی تمنا میں کسی ختم ہوتی ساعت کے کشکول میں کیونکر آ گری۔۔۔ کون جانے۔۔۔ مگر تخلیق کار جانتا ہے کہ صدیوں سے جاری زیست کا یہ تماشا شب وروز کے چولے بدلتا اسی طرح جاری رہے گا۔۔۔ روشنی سے بات کر کے دیکھ لینے کے بعد تیرگی سے ہمکلامی کی خواہش اس لیے بھی ہمکتی ہے کہ روشنی کی شعبدہ بازیاں کپکپاتی صورتوں کے ازدحام کے سوا کچھ ثابت نہیں ہوئیں شاید اسی لیے شاعر نے اپنی چوتھی نظم میں کچے رستے پر سفر آغاز کرتے ہوئے ایک بار پھر زمین نشینوں سے خاک کا تپاک برقرار رکھنے اور اس کی وفاداریوں کو یاد رکھنے کی آرزو بیدار کرنے کی اُمید تازہ کی ہے۔۔۔ یہ چاروں نظمیں مل کر ایک ایسا تخلیقی منظر تشکیل دیتی ہیں جس کے ہر رنگ میں الگ ترنگ ہونے کے باوجود لمحۂ تخلیق سے وابستہ سچائیاں بھرپور انداز میں ظہور کرتی ہیں۔ زمینی حقائق کا یہی تخلیقی اظہار ڈاکٹر وزیر آغا کے شعری اعتبار کی باوقار دستاویز رقم کرتا ہے! شہزاد احمد نے علامت کا خوبصورت استعمال کر کے اپنی نظم کو تخلیقی سطوت عطا کر دی ہے۔ ہمارے بے شکل تمدن اور بے بصیرت بصارت کا اس قدر مؤثر نوحہ کم کم لکھا گیا ہے۔ علامت بڑی ستم ظریف ہے کہیں گل کترتی ہے کہیں پَر کتر دیتی ہے۔ شہزاد احمد نے بلاغت کی روایت کو تخلیقی مہارت کے ساتھ ظہور پذیری کا سلیقہ دیا ہے۔ اپنی بات کہنے کی ادا نکہتِ گل کی صدا جیسی ہونی چاہیے یہی تخلیق کار کا قرینہ حیات ہے۔۔۔!

اکبر حمیدی نے اپنے انٹرویو میں ایک جگہ آفاقیت اور عظیم ادب کی تخلیق کے لیے تخلیق کار کے ''کسی قوم کے مخصوص دائرے میں رہ کر اس کے تاریخی یا عقائد کے پس منظر میں شاعری یا کسی خاص مذہبی عقیدے سے وابستگی'' کو سدِّ راہ قرار دیا ہے مگر آگے چل کر کہتے ہیں:

''اعلیٰ ادب سب سے پہلے ایسا ادب ہے جس کا تعلق ہماری اپنی زمین سے ہے۔۔۔ سب سے پہلے پاکستان اور ہماری اپنی زمین۔۔ جو اپنے ماں باپ سے مخلص نہیں۔۔۔ جو اپنے خون کے رشتوں سے وابستہ نہیں میرے نزدیک وہ قومی مجرم ہے''۔۔۔ یہ تضادِ فکر و نظر ہے!

البتہ حیدر قریشی کا انٹرویو علمی وادبی تناظر میں روشنیاں سجانے کا قرینہ رکھنے والا ثابت ہوا۔ تخلیقی عمل کے پس منظر کو روشن کرتا ہوا۔ پیش منظر میں اُجالے بھرتا ہوا یہ مکالمہ مثبت ادبی پیش رفت کا منظر آراستہ کرتا ہے۔ اسی آراستگی کا نام ادب دوستی ہے! یہی آرائش لمحۂ تخلیق کا لمس پا کر رفیق سندیلوی کی ہمسفر ہوتی ہے تو ''پانی کا سرمایہ'' وجود پاتا ہے ایسی جاندار نظموں سے ہی رفیق سندیلوی نے خود کو منوایا ہے۔۔۔ باقی نظموں میں محمد مظہر نیازی کی ''کہانی تو کہانی ہے''۔۔۔ ثناء اللہ ظہیر کی ''ننھی بچی ناچ رہی ہے''۔۔۔ اور سید تحسین گیلانی کی ''دُھن'' دردل پر دستک دینے میں

کامیاب رہی ہیں۔

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن ان دنوں خطوط کے آئینے میں ادب کے گئے زمانوں کے عکس محفوظ کرنے کی سعی مشکور میں مصروف ہیں۔ ان کے خلوص نے انھیں ہمیشہ بے ثمر شجر کاری سے بچائے رکھا ہے! مکتوبات کا حصہ آپ نے بھی خوب سجایا ہے۔۔۔ ہونا بھی چاہیے۔۔۔ یہ تجزیاتی تحریروں کا گلدستہ ہے۔ ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' کتابوں پر تبصرے اور فکری مباحث اور مزاحیہ تحریروں نے جریدے کی جامعیت اور تاثریت کو ہمہ گیریت کی چھاؤں مہیا کر دی ہے۔۔۔ البتہ آخر میں اوّل کی ایک بات۔۔۔ کہ فہرست کو اتنا مختصر بھی نہیں ہونا چاہیے کہ مندرجات کا پتہ ہی نہ چلے۔۔۔ آغاز سفر میں ہی دھند سے پالا پڑے جائے تو عزمِ سفر تشکیک کے غبار میں کھو کر بے وقار ہو جایا کرتا ہے!!!

محمد حامد سراج/چشمہ بیراج

مجھے ایک خط لکھنا ہے اور وہی خط لکھنا مجھے مشکل ہو گیا ہے۔ ''حریم ادب'' کھولتا ہوں۔ کسی ایک تحریر کو عمیق مطالعے کے بعد جذب کرتا ہوں اور پھر اس کیفیت کے بیان کو جتنے لفظ اور جملے اپنے اندر ترتیب دیتا ہوں وہ بے ترتیب ہو جاتے ہیں۔ ہم لکھنے والوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ہمیں ایسے لگتا ہے کہ سوچ کی دھرتی بانجھ ہو گئی ہے۔ آپ نے ''عملِ قرأت اور علم و ذوق'' کے عنوان سے جو اداریہ قلم بند کیا ہے وہ آگہی، شعور اور دانش کی وہ بلند سطح ہے جہاں ادب کے اس قاری نے حظ اُٹھایا ہے جو اعلیٰ ادبی، مطالعاتی قابلیت اس وقت حاصل کر پاتا ہے جب اس کی زیست قصرِ مطالعہ میں بسر ہوئی ہو۔ آپ کا کہنا ہے

> ''قاری کو مثالی بنانا ایک علمیاتی لازمہ ہے۔ اس سے کسی فردوس گم گشتہ کی بازیافت مراد نہیں بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک عام قاری کے مقابلے میں ادب کے قاری کے ساتھ علمی لحاظ سے زیادہ توقعات وابستہ ہوتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تخلیق اپنے خالق کی حسی و علمی تجربات کو منقلب کر کے ظاہر ہوتی ہے اور چوں کہ علم و ذوق کی سرحدیں وقت کے ساتھ ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہیں اس لیے جب تک تخلیق کار کے علم اور تجربے سے مس نہ ہو جائے تخلیق کا وجود نامکمل رہتا ہے۔''

آپ کی بات بجا، اس بات سے انکار کی گنجایش ہی نہیں ہے کہ جب تک تخلیق کار کے علم اور تجربے سے مس نہ ہو جائے تخلیق کا وجود نامکمل رہتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس پر اچھے تخلیقی ادب کی عمارت استوار ہوتی ہے لیکن اس منصب کو پانے کے لیے قاری کا وسیع المطالعہ ہونا ضروری ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قاری کیسے تخلیق کار کو اس کی ذہنی سطح اور دانش پر جا کر مس کرتا ہے۔ ظاہر ہے تیسرے درجے کے بازاری ڈائجسٹوں کے مطالعے سے تو بات بنتی نہیں ہے۔ تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صفِ اوّل کے ادبی جراید کے مطالعے سے قاری کی ذہنی سطح اتنی بلند ہو سکتی ہے کہ وہ تخلیق کار کے علم اور تجربے سے مس ہو جائے۔ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ہم قاری کی مطالعاتی زندگی کا ایک گوشہ مان سکتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ اداریہ میں آپ نے ایک ایسے موضوع کا چناؤ کیا ہے جس پر پوری کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔ آپ وسیع المفاہیم موضوع لے کر آئے ہیں اب دیکھنا یہ بھی ہے کہ اس علمی سطح کے مرفع اداریے پر قاری، کیا نصیر احمد ناصر کے ''تسطیر'' کے اداریوں کی مانند اتنی پُر مغز گفتگو کرتا ہے جسے ''حریم ادب'' میں الگ عنوان سے محفوظ کیا جائے تا کہ کل کو وہ ادبی تحقیقی کام میں معاون ہو۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ''حریم ادب'' کے اداریوں پر عہدِ حاضر کے معتبر نقادوں کو جرح و تعدیل سے اس میں پوشیدہ معانی اور مفاہیم کو نہ صرف آشکارا کرنا چاہیے بلکہ ان کی ناقدانہ علمی بصیرت سے قاری کو نہ صرف رہنمائی ملے گی بلکہ اداریے میں اُٹھائے گئے سوال کے Reference میں وہ قاری بھی تیار ہو گا جو تخلیق کار کے تجربے کو مس کر سکے۔ مَیں عرض کر رہا تھا ادبی جریدے کا مطالعہ تو قاری کی مطالعاتی زندگی کا ایک گوشہ شمار ہو سکتا ہے۔ ایسے قاری کے لیے ضروری ہے کہ اس کا قرآن، حدیث، تاریخ، فلسفہ، ادبی تاریخ، ادبی تھیوریز، عالمی ادب اور ساتھ ساتھ تمام اصنافِ سخن کا مطالعہ ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ قدیم اور جدید ادبی مباحث اس کے سامنے ہوں۔ اگر قاری کو دو چار غزلیں، نظمیں اور افسانے پڑھ کر جریدہ ایک طرف رکھ دینے کی عادت ہے تو وہ ان اصنافِ سخن سے بھی محظوظ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے رفائٹر کا جو حوالہ دیا ہے وہ بات من و عن فٹ بیٹھتی ہے کہ اعلیٰ تر قاری نہ صرف زبان کا معروضی اسلوبیاتی تجزیہ کرنے کا اہل ہو بلکہ یہ بھی کہ شارحین و مترجمین کے کام سے

بھی آگاہ ہوں۔ ''اطراف'' کے عنوان سے آپ کے اس وقیع اور بلیغ استعارے کے بطون میں یہ ناچیز بھی ایک پیشین گوئی کرتا ہے' گو میں منجم ہوں نہ مجھے علم جفر سے علاقہ ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ انشاءاللہ ''حریم ادب'' کے تسلسل میں انقطاع نہیں آئے گا۔ مجھے ''حریم ادب'' کے قارئین سے بھی یہ درخواست کرنا ہے کہ وہ جریدہ اپنی جیب سے خرید کر پڑھنے کی روایت کو فروغ دیں اس طرح یہ سلسلے صدیوں پر محیط ہو جاتے ہیں اور آنی والی نسلیں بھی اس سے مستفیض ہوتی ہیں یہاں میں ممبئی (ہندستان) سے سیماب اکبر آبادی مرحوم کے ''ماہنامہ شاعر'' کی مثال دوں گا جس کے مدیر افتخار امام صدیقی ہیں اور اس جریدے کی پون صدی (75 سال) مکمل ہو گئی ہے۔

سید معراج جامی اردو ادب کی ایک ہمہ جہت پُروقار اور زندہ دل ادبی شخصیت ہیں۔ ''سفیر اردو'' اور ''پرواز'' جیسے ادبی جریدوں کے اس مدیر کا خاکہ نما ''خامہ انگشت بدنداں ہے'' اپنی نوعیت کا منفرد اور شستہ مزاح نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی مرحوم ان کی تحریریں ''مطائبات'' کے عنوان سے چھاپا کرتے تھے۔ افسانوں میں محترم ڈاکٹر رشید امجد کا ''بکھری ہوئی کہانی'' اپنے مخصوص Diction میں ایک مکمل علامتی افسانہ ہے اردو افسانے کے اس بااعتبار اور باوقار نام ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ ترسیل اور ابلاغ میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ میرے خیال میں افسانے کا ہر جملہ اپنی جگہ لیکن ایک جملہ ایسا ہے جس میں پورا عصر متشکل ہو کر سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔

''میرے ساتھی نے تلملا کر اسے دیکھا

کیا تو نہیں جانتا کہ لوگ تجھے پہچان چکے ہیں اور تو ہمیشہ ظالموں کا ساتھ دیتا ہے۔''

سرزمین ہند سے مشرف عالم ذوقی کی 19 برس پُرانی کہانی ''اک گاؤں ابھی بھی شہر میں ہے'' شروع کے پندرہ صفحات غائب ہونے کے باوجود بھی مکمل ہے۔ قدیم داستانوی انداز میں لکھی گئی اس کہانی نے بچپن کے زمانے کی یاد تازہ کر دی جب ہم دادی اماں سے لحاف میں بیٹھ کر سردیوں کی راتوں میں لمبی لمبی کہانیاں سنا کرتے تھے۔ چھیدی کا کردار افسانہ نگار نے اس خوبصورتی سے نبھایا ہے کہ چھیدی قاری کے ساتھ خود مکالمہ کرنے لگتا ہے۔ افسانے ''آخری آئس کیوب'' پر ناچیز کو ''حریم ادب'' کے Reference سے پسندیدگی کے جو فون اور خطوط موصول ہوئے وہ اپنی جگہ لیکن ساتھ خوش کن خبر ''حریم ادب'' کے معیار اور اداریے کی معنویت پر خوشی کا اظہار تھا۔ خالد قیوم تنولی کا طوائف کے موضوع پر مکتوب کی ہیئت میں افسانہ ''نارسائی کا رشتہ'' انتہائی شاندار ہے۔ میرا خیال تھا کہ قاضی عبدالغفار کے ''لیلیٰ کے خطوط'' اور مرزا ہادی رسوا کی ''امراؤ جان ادا'' کے بعد اس نازک موضوع کے ساتھ انصاف کسی بھی قلم کار کے لیے ایک جاں گسل مرحلہ ہے لیکن آفرین ہے خالد قیوم تنولی پر جس کی رواں تحریر نے افسانے کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ تحریر شستہ رواں اور ڈھلی ہوئی ہے۔ لطف آ گیا۔ افسانہ نگار یقینی طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

آپ کا اکبر حمیدی صاحب سے مکالمہ اس لحاظ سے موجودہ شمارے میں خاصے کی چیز ہے کہ اس میں سوالات کی نوعیت میں اتنی جامعیت اور معنویت ہے کہ آپ قلم کار کا باطن کھوجنے میں کامیاب رہے ہیں۔ انٹرویوز میں سوالات کی نوعیت اس کے پُرمغز ہونے میں معاون ہوتی ہے۔ اکبر حمیدی صاحب کی ادبی سوچ اور ادبی مؤقف کی یہ انٹرویو کھلی وضاحت کرتا ہے۔ ان کی ادبی قامت سے کس کو انکار ہے لیکن انتہائی احترام سے انٹرویو کے چند مندرجات پر بات کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ افسانے کے تناظر میں ان کی دو Quotations سے مجھے اختلاف ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ ''انشائیہ کی بنیاد خیال ہے اور افسانہ کی وقوعہ'' سے اتفاق اس لیے ممکن نہیں کہ انشائیہ تو اپنی جگہ' کہانی اور افسانے میں بھی نمایاں فرق ہوتا ہے۔ کہانی کے بارے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی وقوعہ کی بنیاد پر کہانی کی بنت ممکن ہے لیکن افسانہ کی زمین ایسی سنگلاخ ہے کہ ایک بار تو اس کی کرافٹ میں تخیل کو بھی پسینہ آ جاتا ہے۔ کسی وقوعہ کی بنیاد پر بھی اگر مان لیا جائے کہ افسانے کی بنت ہو سکتی ہے تو بھی افسانے کی باطنی کیمسٹری کے لیے وہ وقوعہ مرکزی نقطہ قرار نہیں پا سکتا۔ افسانے میں تخیل کی کارفرمائی کے ساتھ افسانہ نگار کو افسانے کی کرافٹ میں شامل بہت سے تکنیکی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھنا ہوتا ہے۔ نہیں تو افسانہ بے جوڑ ہو جاتا ہے اور ایک مشکل عمل کرداروں کی باطنی کیفیات کو Paint کرنا ہوتا ہے۔ (اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی تحقیقی کاوش ''جدید اردو افسانے کے رجحانات'' کو اگر اکبر حمیدی صاحب دیکھ لیں تو شاید ان کا اشکال دُور ہو جائے) انشائیے کی حمایت میں اتنی توانا اور زندہ صنف سخن ''افسانہ'' کو بہ یک قلم یہ کہہ کر رد کرنا کہ افسانے کا وجود معرض خطر میں دکھائی دیتا ہے کسی بھی طرح روا نہیں۔ اکبر حمیدی صاحب کے منہ سے یہ سن کر اس لیے بھی حیرت ہوئی کہ کوئی نو آموز قلم کار یا ادیب ایسی Statement دیتا تو حیرت نہ ہوتی۔ قاری اس کے قلیل المطالعہ ہونے کی وجہ سے

صرفِ نظر کر جاتا۔ کیا انٹرویو کے دوران ان کو یاد نہیں رہا کہ ابھی تو صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں منشا یاد' رشید امجد' اسد محمد خان' منظر حسن' محمد الیاس' شمشاد احمد' اعجاز احمد فاروقی' نجم الحسن رضوی' آغا گل' مبین مرزا' آصف فرخی جیسے افسانہ نگار زندہ افسانے لکھ رہے ہیں۔ ادھر سرزمینِ ہند سے سید محمد اشرف' مسعود نیر' مشرف عالم ذوقی' عبدالصمد' شموئل احمد' م ق خان' مظہر زمان خان اور خالد جاوید جیسے افسانہ نگار جن کا نام ہی اردو افسانے کے لیے اعتبار کی علامت ہے۔ بات سیّد محمد اشرف کے ''نمبردار کا نیلا'' کی ہو یا مظہر زمان خان کے افسانے'' دستاویز'' کی خواتین میں قرۃ العین حیدر' بانو قدسیہ' نیلم احمد بشیر' پروین عاطف' خالدہ حسین' نیلوفر اقبال' شہناز شورو' طاہرہ اقبال اور نگہت رضوی کے افسانوں کا قاری انتظار کھینچتا ہے۔ دیارِ غیر میں ہم مقصود الٰہی شیخ اور قیصر تمکین کو کیسے نظرانداز کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنے فن سے افسانے کا دامن مالا مال کیا ہے۔ افسانے کا ماضی منٹو' بیدی' کرشن چندر' غلام عباس' آغا بابر' غلام الثقلین نقوی' عصمت چغتائی' حاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے نام سے روشن ہے تو حال کے چند قدآور افسانہ نگاروں کا ذکر پوری کہکشاں کے مترادف ہے اور حال سے مستقبل کی طرف افسانے کو وقار بخشنے والی جنریشن کا نام لکھوں تو مکتوب اور طویل ہو جائے گا۔ افسانہ اپنی پوری Strength کے ساتھ زندہ ہے اور اس کے وجود کو کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ عہدِ حاضر کے معتبر ادیب نقاد افسانہ نگار محمد حمید شاہد کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اردو افسانے کے سو سال مکمل ہونے پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو افسانہ مغربی فکشن پر فائق ہے۔

اب دوسری بات محترم اکبر حمیدی صاحب کا یہ کہنا کہ '' خالدہ حسین' رشید امجد' مظہر الاسلام اور اسلم سراج الدین کی افسانہ نگاری پر انشائیہ کے اسلوب کے اثرات نمایاں ہیں۔'' پہلے تو یہ وضاحت ضروری تھی کہ افسانے اور انشائیے کے اسلوب میں فرق کیا ہے۔۔۔؟ ناچیز نے خالدہ حسین' رشید امجد' مظہر الاسلام اور اسلم سراج الدین کے افسانوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ خالدہ حسین کے افسانوی مجموعوں ''پہچان' دروازہ'' اور'' مصروف عورت'' میں کہیں انشائیہ کے اثرات نظر نہیں آتے۔ رشید امجد صاحب کا افسانوی سفر علامتی Context میں ہے۔ انشائیہ اور علامت کا سرے سے کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا۔ مظہر الاسلام اردو افسانے کا منفرد نام ہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں '' گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی'' خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر' باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی'' میں کہیں دُور دُور تک انشائیے کا پرتو نظر نہیں آتا۔ جہاں تک اسلم سراج الدین کے فن کا تعلق ہے تو ان کے انعام یافتہ افسانوی مجموعے'' سمر سامر'' کو ایک Classic کا درجہ حاصل ہے۔ البتہ اسلم سراج الدین نے اپنے افسانوں میں جو زبان استعمال کی ہے اس کے بارے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مستنصر حسین تارڑ کے ناول ''بہاؤ'' کی مانند انتھراپالوجی کے تناظر میں ایک لسانی تجربہ ہے لیکن'' سمر سامر'' میں بھی کہیں انشائیے کا کوئی پیوند نہیں۔

اصنافِ سخن کا جس عرق ریزی سے مطالعہ کیا ہے۔ اسی انداز میں تبصرہ لکھنے بیٹھوں تو کئی صفحات درکار ہوں گے۔ اختصار کے ساتھ بات کو سمیٹتے ہیں ایوانِ غزل میں امین خیال' سیّد قاسم جلال' خاور اعجاز' کرامت بخاری' ناصر بشیر' عابد خورشید' شنا ور اسحاق' طاہر شیرازی' محمد مظہر نیازی' کاشف مجید' شہناز نور اور شگفتہ الطاف کی غزلوں میں دل کے تاروں کو چھو لینے والے اشعار بہ کثرت موجود ہیں۔'' راشد کا نیا آدمی'' کے لیے اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ اسے ناصر عباس نیر نے تراشا اور نبھایا ہے۔ لاریب: ناصر عباس نیر اردو تنقید کا ارسطو ہے۔ جیسے تاریخ نے ارسطو' افلاطون اور سقراط کو نہیں بھلایا ایسے ہی آنے والی صدیاں ناصر عباس نیر کو اپنے صفحات میں محفوظ رکھیں گی۔ تحسین زہرا کا مضمون '' ن۔ م۔ راشد کا نیا انسان'' قدرے کمزور ہے۔ ان کی اس Quotation سے اتفاق ممکن نہیں کہ'' ن۔ م۔ راشد کو شاعروں کا شاعر قرار دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ کسی بھی ادیب کے بارے میں ایسی حتمی رائے ممکن نہیں ہوتی۔ ایک اور عرض' تحسین زہرا صاحبہ نے اپنے مضمون میں ساغر صدیقی کے ایک شعر کو ن۔ م۔ راشد کے اکاؤنٹ میں ڈال دیا ہے۔۔۔ وہ رقمطراز ہیں۔ راشد کہتے ہیں۔۔۔

معبدوں کے چراغ گل کر دو
قلبِ انسان میں اندھیرا ہے (مطبوعہ حریم ادب 2' صفحہ نمبر 150' نومبر' دسمبر 2004ء)

حالانکہ یہ شعر درویش صفت شاعر ساغر صدیقی کا ہے:

رہبروں کے ضمیر مجرم ہیں
ہر مسافر یہاں لٹیرا ہے

معبدوں کے چراغ گل کر دو

قلب انسان میں اندھیرا ہے (ساغر صدیقی' کلیاتِ ساغر مطبوعہ: انتخابِ ادب لاہور

مارچ' 1979ء' صفحہ نمبر 43)

لیکن ایک بات کہنا ضروری ہے کہ مضمون نگار اپنی محنت جاری رکھیں تو تنقید میں ان سے توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ مقصود ان کی دل آزاری نہیں لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ ادب میں کوئی بھی صنفِ سخن ہو قلم کار کی دیانت دارانہ رہنمائی کے لیے تعریف کے جھوٹے قلابے نہیں ملانے چاہئیں۔ میں تو ادب میں ان سب احباب کا ہمیشہ ممنون رہا ہوں جنہوں نے مجھے میری خامیوں اور تحریر کے سقم سے آگاہ کیا اور اسی رہنمائی میں اپنا افسانوی سفر طے کرنے میں آسانی ہوئی اور میری خود احتسابی اور خود تنقیدی نے محنت اور غور وفکر کرنے کی عادت ڈالی۔ مان لیا مکاتیب میں سب اپنی تعریف وتوصیف کے منتظر ہوتے ہیں اور جائز تعریف ضرور ہونا چاہیے اس سے نہ صرف حوصلہ افزائی ہوتی ہے بلکہ یہ مہمیز کا کام کرتی ہے۔ کتابوں پر تبصروں میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کی نئی تخلیق ''اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار پر ڈاکٹر سلیم اختر کا تبصرہ' اختر ہاشمی کے شعری منظر نامہ پر ڈاکٹر شبیہ الحسن کا تبصرہ' ذوقی کے ناول' پوکے مان کی دنیا' پر اقبال جمیل کا' توقیر تقی کا' دریچے جاگتے ہیں' سیّد تحسین گیلانی کا ''عارف۔۔۔ کا یقین'' اور محمد فیروز شاہ کی ''باوضو آرزو'' پر محمد مظہر نیازی کا تبصرہ بہت پسند آئے۔

''حریمِ ادب'' میں شہلا صدیقی کی ایک خوبصورت تراشیدہ نظم ''نا اُمیدی گناہ ہے'' پڑھی۔ اس نظم پر ایک ناقدانہ جائزہ قلم بند کیا جاسکتا ہے لیکن وہی فکر دامن گیر کہ مکتوب جو پہلے ہی اتنا طویل ہو چکا ہے اسے اب سمیٹا جائے۔۔۔ شہلا صدیقی کی نظم کے ایک ٹکڑے نے وجدان کی کھڑکی پر دستک دی اور بہت کم نظمیں وجدان کو جا چھوتی ہیں۔۔۔ میرے اندرون/ ایک گنبد ہوا/ جس میں اپنے ضمیر کی گونج/ ان اذیتوں کی وجہ پوچھتی رہی/ مگر/ ٹکرا کر واپس آ گئی/ میرے بدن کی تمام ہڈیاں زنداں کی سلاخیں بن گئیں/ جہاں روح سر پٹختی ہے/ مگر رہائی کی صورت نظر نہیں آتی۔

مشاہیر اور بزرگ شعراء میں ستیہ پال آنند کی ''گیارھواں طاعون'' محترم ڈاکٹر وزیر آغا کی ''وہ آزاد کیسے ہوئی' تماشا' روشنی سے بات کر کے دیکھ لی' چلو ایک بار پھر ہم' امین راحت چغتائی کی کہاں گئے۔ آفتاب چہرے ایسی نظمیں ہیں جو قاری کے ساتھ اس کے دُکھ بانٹتی ہیں قاری کو سرشار کرتی ہیں۔ رفیق سندیلوی نظم کا معتبر حوالہ تو ہے ہی لیکن اس Trend Maker شاعر سے اردو ادب کو مستقبل میں بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ نظم ''درد ہوتا ہے'' تحسین وتوصیف کے لیے لفظ کم پڑتے دکھائی دے رہے ہیں' پانی کا سرمایۂ عالم حیرانی میں' غار میں بیٹھا شخص'' خاور اعجاز کی ''بابِ قفس کھلنے لگا ہے۔'' محمد فیروز شاہ کی ''عہدِ مفارقت کے دُکھ'' سجاد مرزا کی ''کبھی ایسا نہ تھا جاناں'' نے اردو نظم کے دامن بھرنے کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی سرشار کیا ہے۔ نوآموز شعراء کو ایسی نظموں کا عمیق مطالعہ کر کے اپنے فنی سفر کے لیے زادِ راہ کا بندوبست کرنا چاہیے۔

مظہر نیازی کی ''کہانی تو کہانی ہے'' خوب ہے۔ اوصاف شیخ کی ''ویلنٹائن ڈے پر تم سے گفتگو'' محبت کی تیسری ادھوری نظم'' اشفاق احمد اشفاق کی ''اک تری یاد'' جاوید خورشید کی ''وہ اِک لمحہ'' شازیہ انور کی ''تیرے بِن'' کلیشے ہیں۔ کسی بھی جریدے کو کمزور تخلیق بھیجنے والے قلم کاروں کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تخلیق تو انہی کی ہے نا۔ تخلیق اگر طاقت ور ہوگی تو وہ کسی کمزور جریدے میں بھی اپنا آپ منوالے گی۔ عمرانہ جبیں کی نظم ''کہیں پاگل نہ ہو جاؤں'' کو ایک مصرعے نے سنوار دیا ''تو لگتا ہے زمانے بھر کی نظریں میری نگراں ہیں'' اس میں تخلیق کار کا باطن ہے جس نے نظم کو معنویت سے معمور کر دیا ہے۔ ثناء اللہ ظہیر کی نظم ''ننھی بچی ناچ رہی ہے'' نے طبیعت مکدر کر دی۔

تخلیقات اور مکاتیب میں قلم کاروں کے ایڈریس بھی ساتھ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ''حریمِ ادب 3'' سے یہ طرح بھی ڈالیے۔۔۔!

اردو' پنجابی اور انگریزی' ہر تین زبانوں سے حریمِ ادب کو مزین رکھیے۔ ابھی ''حریمِ ادب'' میں اور بہت کچھ ہے اور زبردست ہے اور اس پر لکھا جاسکتا ہے لیکن اب اجازت لوں گا۔۔۔ کارکنانِ حریمِ ادب کو سلام کہتے ہوئے سیّد تحسین گیلانی سے ایک بات۔۔۔! بھائی آپ نے ''حریمِ ادب'' کا پنجابی حصہ محنت' لگن اور للک سے سنوارا ہے۔ پنجابی کے تمام قلم کاروں نے ''حریمِ ادب'' کے صفحات کو ثمر بار کیا ہے۔

کلیم شہزاد/بورے والا

عید قربان دے موقعیا تے ''حریم ادب'' داڈوجا سنگھار ُوپ سروپ عیدی دے طور ملیا۔ موجد دے رنگاں بھرے نویکلے ڈھنگ دے مُکھ داحسن دل نوں موہ گیا۔۔۔ میں تے حالی پہلے انک دا سواد ای مان رہیا ساں پئی تساں ادب نوازی نے ادب دوستی دے پکھوں نواں تے نویکلا کتابی سلسلہ میرے ورگے فقیر تیکر اپنے نگھ خلوص نال اپڑادِتا۔۔۔ کیویں شکریہ ادا کراں۔۔۔ شالا جذبے رہن سلامت!

تن زباناں (اردو، پنجابی تے انگریزی) دے ادب دی جہڑی رچنا تساں لائی اے اوہدیاں دُھماں نہ صرف پاکستان سگوں باہر لے ملکاں تیکر وی اپڑ گئیاں نیں۔ ایہدا ابھرواں ثبوت اوہ خط پتر نیں جہڑے دوجے ملکاں وچ وسدے بجناں تے تہانوں لکھے تے تساں ''حریم ادب'' وچ چھاپ کے اوہناں داماں تران ودھایا۔

''حریم ادب'' وچ چھپیاں لکھتاں ہر پکھوں صلاحن جوگ نیں۔ اوہناں دی ونڈ تہاڈیاں سوچاں دے اچیرے پن وی دَس دیندی اے۔ میں تاں سب توں پہلاں ''بیدل حیدری کے ساتھ ایک زندہ دوپہر'' نوں اکھراں داروپ دین والے محمد حامد سراج ہوراں نوں سلام پیش کرنا ضروری سمجھناواں پئی ایس انٹرویو راہیں حیدری جی ہوراں دی حیاتی دے کئی پکھ اُگھڑ کے سامنے آئے نیں۔ تہاڈی لکھت ''اکبر حمیدی سے مکالمہ'' وی خوب اے۔ تساں ادبی پکھوں ودھیرے اہم سوال کیتے تے اوہناں بارے جواب دے طور بہت ساریاں گلاں بارے جانکاری لبھی۔

ڈاکٹر رشید امجد جی علامتی کہانی دے آگو کہانی کار نیں۔ مَیں اوہناں دے ڈھنگ دا چاہیوان ہاں۔ خالد قیوم تنولی دا ''نارسائی کا رشتہ'' بہت ودھیا افسانہ شامل کیتا اے۔ پڑھ کے سواد آ گیا۔

اردو شاعری دے حصے وچوں خورشید بیگ میلسوی ہوراں دی حمد تے نعت، مرتضیٰ برلاس، اکبر حمیدی، عطاء الحق قاسمی، علی جاوید، عمران حیدر تھہیم، حیدر قریشی، اعزاز احمد آذر، خالد اقبال یاسر، ناصر بشیر، شہناز نور، شگفتہ الطاف دیاں غزلاں، رفیق سندیلوی، خاور اعجاز، افسر ساجد، تحسین گیلانی تے عبداللہ عظیم ہوراں نظماں تے سواد دِتا۔ جدکہ دوجیاں علم گیان بھریاں لکھتاں وی اہم نیں۔

جتھوں تیک ''پنجابی ویڑھا'' دی گل اے۔ اوہدے وچ سلطان کھاروی ہوراں ودھیرا سجایا اے۔ ستیہ پال آنند، سجاد مرزا ہوراں دیاں شعری کرتاں بہت سوہنیاں نیں۔ ایس واری پنجابی کہانی شامل نہیں، ایہدی گھاٹ محسوسی۔

انگریزی حصہ وی صلاحن جوگ اے۔ ''حریم ادب'' دے رکھوالے ہر پکھوں ایس نوں سجاون دی کوشش کردے نیں جہڑی اوہناں دے دِلاں دیاں ڈونگھاں وچ وسدے رسدے تے ہسدے ہتھیلے پھیرے تے اُچیرے جذبیاں دی دس پاؤندی اے۔ شالا نظر نہ لگے۔ تساں ''حریم ادب'' دی پرہیا وچ ایس فقیر دیاں شعراں نوں شامل کر کے ماں تران ودھایا۔ گل نوخیز اختر ہوراں میری کہانی ''پینڈے'' نوں سراہیا۔ اوہناں دی مہربانی۔ بشریٰ رحمن ہوراں نے اپنے خط وچ بابا حاجی شیر ہوراں نال رشتے ناتے دی دس پائی خوشی مہیا کیتی تے ایسے لئی تے اوہناں دی گل بات تے تحریراں وچ صوفیانہ جھلک محسوسدی اے۔ ایہہ رنگلی رمز ساڈے تے کھلی۔ اوہناں نوں مبارکاں ''حریم ادب'' دے وسنیکاں تے رکھوالیاں نوں سلام۔

محمود احمد قاضی / گوجرانوالہ

جہاں تک جنوبی پنجاب کے لوگوں کے ناموں اور کاموں سے مَیں واقف ہوں مَیں برملا کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے قول کے پکے اور کام دھنی ہونے کے علاوہ مخلص بھی ہوتے ہیں۔ اسی خطے میں محمد خالد اختر جیسے لوگ بستے تھے۔ اب آپ کام کرنے کے لیے آگے بڑھے ہیں۔ چونکہ ادبی کام جاری وساری ہے اس لیے نئے ادبی پرچوں کا سامنے آنا بھی اچھی بات ہے۔ ''حریم ادب'' کی دوسری کتاب اس سچائی کی مظہر ہے کہ آپ میں لگن اور محنت کی کوئی کمی نہیں بلکہ آپ کچھ مختلف انداز سے کام کرنے کے جویا لگتے ہیں۔ اسی لیے آپ کے پرچے میں ایک طرح کی تازگی اور نئی مہک ہے۔ لکھنے والے تو تقریباً وہی ہیں جو دوسرے پرچوں میں نظر آتے ہیں لیکن ان کے ناموں اور کاموں کو جس طرح آپ نے سجایا ہے اس سے ایک نئی طرح کا حسن اور توازن پیدا ہو رہا ہے۔۔۔ اس کا پنجابی حصہ اور پھر انگریزی میں چیزوں کے ترجمے۔۔۔ بے لاگ تبصرے۔۔۔ لوگوں کی آراء ان کے مشورے۔۔۔ اچھا ہے بلکہ خاصا اچھا ہے۔۔۔ جگہ جگہ خود آپ کی شمولیت بھی نظر آتی ہے۔۔۔ یہ بھی اچھی بات ہے۔ پھر کچھ موضوعات بھی نئے ہیں

اور خاص طور پر انٹرویوز۔۔۔ اس طرح لکھنے والا خوب خوب سامنے آجاتا ہے۔ انٹرویوز کا انداز بھی اچھا ہے۔ اکبر حمیدی کا انٹرویو تو خاصے کی چیز ہے۔ حمیدی صاحب چھپے نہیں کھلے رستم ہیں۔ ان کا کام مقداری اور معیاری لحاظ سے خاصے مقام کا حامل ہے۔ وہ بہت Devoted فنکار ہیں۔ مضامین' افسانے' غزل' نظم' انشائیے اور دوسری تمام اصناف کے حوالے سے بہرحال لوگوں نے /فنکاروں نے آپ کو نالا نہیں بلکہ اتنے بیش قیمت ادب پارے ہمیں پڑھنے کے لیے دیئے۔۔۔ مجھے اُمید ہے کہ بہت جلد ''حریم ادب'' ادبی میدان میں distinguished اہمیت کا حامل پرچہ قرار پائے گا اور بہت بڑے نام جو ابھی اس میں نظر نہیں آرہے جلد ہی اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ میری طرف سے مبارکباد۔

اکبر حمیدی/اسلام آباد

مجھے حیرت ہے کہ آپ نے دو ہی شماروں میں پرچے کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا جہاں تک پہنچنے میں برس ہا برس لگتے ہیں۔ اس شمارے میں بہت سے غیر معمولی اقدام آپ نے کیے ہیں۔ پہلے تو یہی کہ اردو تخلیقات کے تراجم آپ نے خود کیے اور پرچے میں شامل کیے۔ یہ تراجم بہت اعلیٰ درجے کے ہیں۔ انتخاب کے اعتبار سے بھی اور آپ کی انگریزی کے معیار کے لحاظ سے بھی۔ آپ اردو ادب کے واحد مدیر ہیں جو اتنا بڑا کام کر رہے ہیں اور اپنے تخلیق کاروں کے لیے بلکہ اردو ادب کو پروموٹ کرنے کے لیے اتنی محنت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر تو پیسے کمانے کی مشین ہوتے ہیں۔ مگر اردو ادب کی خوش بختی ہے کہ اسے آپ جیسا صاحب علم مدیر ملا جو پیسے کما کما کر ڈھیر کرنے کی بجائے ادب کے فروغ کے لیے پیسہ بھی' محنت بھی اور صلاحیتیں بھی صرف کر رہا ہے۔ اردو دنیا آپ کی شکرگزار ہے۔ دوسرے آپ کے فٹ نوٹ آپ کی علمی وجاہت کا بھرپور اظہار کر رہے ہیں۔ اداریے میں آپ نے بہت سے سوالات اُٹھائے ہیں جو اہلِ علم کی توجہ چاہتے ہیں۔

انشائیے چار ہیں اور سب اچھے ہیں مگر ڈاکٹر سلیم آغا نے ایک معمولی موضوع کو اپنی فکری اپروچ کے ذریعے غیر معمولی بنا دیا ہے۔ انشائیہ ایک فکری اور علمی صنف ہے اور نیا عہد بھی فکر اور علم کا عہد ہے اس لیے انشائیہ یقیناً مستقبل کی بڑی صنف ہے۔ میرا اندازہ ہے اکیسویں صدی میں انشائیہ بہت آگے نکل آئے گا اور انسانی زندگی کے بیشتر گوشوں تک پھیل جائے گا جیسے غزل۔ حصہ غزل میں آج کے نامور غزل گو ملتے ہیں۔ ظفر اقبال کی فکری شعاعیں دُور دُور تک دل و دماغ کو روشن کرتی ہیں۔ ناصر شہزاد کی غزل کے اپنے ہی رنگ ڈھنگ ہیں جس میں انہوں نے ہندی الفاظ کے چراغ روشن کیے ہیں۔

برادرم افتخار عارف ایسے شاعر ہیں جنہیں حقیقتاً صاحب اسلوب شاعر کہا جا سکتا ہے۔

میں اسلوب اور اسٹائل کی پوری طرح تعریف شاید نہ کر سکوں کیونکہ اس میں شاعر کی اپنی شخصیت اس کا لب ولہجہ' اس کی آواز اور اشعار میں شامل الفاظ کا برتاؤ اور ان کے رنگ ڈھنگ اور وہ کچھ بھی شامل ہوتا ہے جسے میں محسوس تو کر رہا ہوں مگر بیان نہیں کر پا رہا۔ ہمارے دور میں اگر کسی کو صحیح معنوں میں صاحب اسلوب شاعر کہا جا سکتا ہے تو وہ افتخار عارف ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان کا مخصوص اسلوب محض چند الفاظ کو بار بار استعمال کرنے سے تخلیق نہیں ہوا بلکہ ان کی شخصیت سے پھوٹا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی صاحب نے افتخار عارف کے اسلوب کو سمپورن راگ کا ٹھاٹھ قرار دیا ہے۔ یہ واقعی درست ہے مگر اس تعریف سے بھی ایک مماثلت سی محسوس ہوتی ہے مگر اسلوب کی پہچان اور وضاحت نہیں ہوتی۔ کسی نے کہا ہے Style is the Man۔ یہ بہت خوبصورت جملہ ہے مگر تشنہ۔ بہرحال افتخار عارف کا بہت بڑا اختصاص ان کا حقیقی رنگ میں صاحب اسلوب ہونا ہے اور یہ ان کی شخصیت کا بھی اظہار ہے اور عطیۂ خداوندی بھی ہے۔ یہ افتخار عارف صاحب کی خوش بختی ہے' مبارک باد' مرتضیٰ برلاس بہت مشاق شاعر ہیں روایت سے جُڑے ہوئے مگر ان کی روایت سے بھی نئے زمانوں کی روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی اس عہد کے سب سے بڑے کالم نگار تو ہیں ہی کہ وہ کالم کے رموز واسرار کو جانتے ہیں مگر غزل میں بھی انہوں نے اچھے اچھے اشعار نکالے ہیں۔ ''حریم ادب'' میں بھی ان کی غزل ان کے مزاج کا نمائندہ ہے اور دامنِ دل کھینچتی ہے۔ خالد اقبال یاسر بڑے ذہین اور تیز طبع اور الفاظ کو نئے نئے رخ سے برتنے والے شاعر ہیں۔ وہ اپنے ہم عصروں سے یقیناً سربلند ہو رہے ہیں۔ مشکل زمینوں میں جس آسانی سے وہ اچھا شعر نکالتے ہیں یہ یاسر ہی کا کمال ہے۔ موجودہ غزل میں انہوں نے قافیے کو جس ہنرمندی سے استعمال کیا۔ اس کی

جتنی بھی داد دی جائے وہ اس کے حقدار ہیں اور یہ ہنرمندی نہیں ہے معنی آفرینی بھی ہے اور یاسر کے مزاج اور معاملات سے ہم آہنگ بھی۔ حیدر قریشی نے بہت سی اصناف ادب میں پوری کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے مگر ان کی غزل ان کے مخصوص جمالیاتی مزاج کی نمائندہ ہوتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ وہ غزل پر زیادہ توجہ دیں۔ یہ اُن کی خاص صنف ہے۔ موجودہ غزل بھی حیدر قریشی کے جذباتی فکر اور جمالیاتی رجحانات کو ظاہر کرتی ہے جو صرف حیدر قریشی سے ہی مخصوص ہیں۔ صابر آفاقی جب اپنی آئی پر آتے ہیں تو راستے کاٹ کر نکلتے ہیں اور مکمل طور پر نیا شعر کہتے ہیں۔ یہی ان کا اختصاص ہے۔ ڈاکٹر جویہ صاحب اور تحسین گیلانی صاحبان کی غزلیں بہت دلکش ہیں مگر مدیران کی زیادہ تعریف کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ مبادا کوئی حرف گیر ہو۔ ڈاکٹر جویہ غزل پر توجہ دیں یہ ان کی خاص صنف بن جائے گی۔ انشائیہ نگار کے طور پر تو وہ بہت شہرت رکھتے ہیں اور فکر کی نئی جہتیں بھی۔ تحسین گیلانی صاحب بھی انشائیہ میں نامور ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن صاحب کے خطوط نے کتنی ہی شخصیتوں سے ہمیں ملوا دیا اور کچھ اس انداز میں کہ ان کے باطن کی روشنیاں ہمارے اندر اُترنے لگتی ہیں۔ برادرم جلیل عالی کے خطوط ان کے خاص عہد کے خطوط ہیں اور ان کی ذہنی کیفیات کے مظہر۔ ڈاکٹر معین الرحمن صاحب نے یہ خطوط چھپوا کر ماضی و حال کی بہت سی اہم شخصیتوں سے ملایا ہے یہ ان کا کرم ہے۔ وہ ایسی ہی کرم فرمائیاں کرنے کے عادی ہیں۔ سید جو ہوئے۔ خدا انھیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

افسانوں میں ابھی میں صرف رشید امجد کی کہانی ''بکھری ہوئی کہانی'' ہی پڑھ سکا ہوں۔ رشید امجد کو میں علامتی کہانی کا ''اکبر اعظم'' کہا کرتا ہوں جس کی کہانی نے اپنی طاقتور اور بامعنی علامتوں کے ذریعے اردو کہانی کو ایک نیا رنگ دے دیا اور کہانی کے رُخ کو یکسر تبدیل کر دیا۔ یہ ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ ن۔م۔ راشد پر مضامین بھی اچھے ہیں۔ خصوصاً ناصر عباس نیر نے راشد میں سے ''نیا آدمی'' تلاشنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ رفیق سندیلوی نئی نظم میں اب بہت اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کی سب نظمیں بہت دلکش ہیں۔ معنویت کے اعتبار سے بھی اور ان کی مخصوص دکشن کے اعتبار سے بھی۔

آخر میں ایک گزارش۔ میرے خیال میں فہرست میں لکھنے والوں کے نام درج کر دیجیے تاکہ تلاش میں سہولت رہے۔ موجودہ صورت نئی تو ہے مگر اچھی نہیں لگ رہی۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی نظمیں اس عہد کی بڑی نظمیں ہیں اور اب پورا عہد اس حقیقت کو تسلیم کر رہا ہے۔

ایسا بھرپور علمی و ادبی پرچہ شائع کرنے پر آپ کو اور تحسین گیلانی صاحب کو مبارکباد۔ اس کا ٹائٹل اس دور کے عظیم آرٹسٹ بشیر موجد صاحب کے فن کا شاہکار ہے۔ خدا انھیں صحت مند رکھے۔ میری طرف سے انھیں مبارکباد دیجیے۔

علی حسین جاوید / میلسی

''حریم ادب'' شاعری، افسانے، انشائیے اور تنقید کے سفر کو اپنے صفحات پر ساکن حرفوں کے ذریعے جس انداز سے متحرک دکھا رہا ہے وہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے جھونپڑیوں میں محلات کی نسبت زیادہ روشن چراغ ہوں۔ یہ اس لیے نہیں کہ بڑے ادبی پرچوں کے ادبی قد کو چیلنج کرنے کا کوئی عمل ہے۔ اس سارے ادبی نظام شمسی کے اندر یہ بھی اپنے مدار میں متحرک ہی۔ ''ادب'' جو سورج ہے وہ ان سیاروں کو روشن کر رہا ہے۔ ''حریم ادب'' اپنے مدار میں ہے لیکن اس کی صورت اور جدت پسندی وہ ایڈونچر ہے جو ادب کے امکان کو لامتناہی حدود تک پھیلا سکتا ہے۔ وہ وادی جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آتا۔ خوف اور فنا کے سائنسی اصولوں سے آہستہ آہستہ ہماری زمین اور سوسائٹی پر چلی آتی ہے، ایک ہشت پائے کی طرح جس نے سب کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس صورتحال میں جناب افتخار عارف کے بقول ''خیر پسند جانبدارانہ ادبی رویہ'' اس بڑھتے ہوئے طوفان کو روک سکتا ہے۔

برصغیر کی مٹی اتنی زرخیز ہے کہ اس نے بڑے بڑے ادیب اور فنکاروں کو طویل زندگی دینے کے لیے لکھنے پر مائل رکھا۔ میر کے حالات ہوں یا غالب کی فاقہ کشی، مجید امجد کی زندگی ہو یا احمد ندیم قاسمی کی حیات کا دورِ افلاس۔ یہ سب امتیازات اس مٹی کو حاصل ہیں کہ حرف کی توقیر انسان کا احترام قائم رکھتی رہی۔ معاشرے کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر مزاحمت اور تصادم کی طاقت پیدا کرنا ہمیشہ اہم رہا۔ ہمیں ''حریم ادب'' کی غزلوں، نظموں اور افسانوں میں زندگی کا یہ رویہ ملتا ہے۔ آج کے شاعر کو معلوم ہے کہ 5 کو ۵ لکھا جائے تو کتنا خوبصورت لگتا ہے اور پانچ یا فائیو کہا جائے تو Possession کا کونسا تصور اُبھرتا ہے۔ ہمارے نظم گو کو علم ہے کہ 5 میں سے 5 نفی کرنے سے کچھ نہیں بچتا تا ہم ''حساتی بیلنس شیٹ'' اس

سے مختلف ہے اور یہی ہمارے افسانہ نویس تخلیق کاروں کے ہاں وضاحت سے ملتا ہے۔ تنقید ان سب کا احاطہ کرکے روشنی کے مساکن کا اندھیروں کے مراکز سے مقابلہ کرتی ہے۔ تاریکی کا غالب پہلو پھیلنے یا سکڑنے سے راست متناسب ہے یا بالعکس۔ تنقید کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہ ہر پہلو سے خود کو نمایاں کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ کیونکہ یہ روشنی ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ سایہ کیسے بنتا ہے؟ چھاؤں کیوں تخلیق ہوتی ہے؟ رنگوں کی ترتیب کیوں ہے؟ کیا صرف لفظ اور جملے میں چھپا معنی معتبر ہے یا ان لفظوں اور جملوں کا انتخاب جو تخلیق کو نمایاں بنا سکتا ہے۔ تنقید کے باب سے مزین یہ مجلّہ ایک اکیڈمی بنتا جا رہا ہے جو براہِ راست تخلیق کاروں کے تخلیقی ماخذات اور مراکز پر آگہی کے مزید در وا کرتا ہے۔ نئے لکھنے والوں کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے؟ پھر کوئی ہنرور اگر نقش گری سے معنی کو لفظ کا پیرہن پہنانا چاہتا ہے تو برصغیر کے عظیم شاعروں اور تخلیق کاروں کی قابلِ فخر تخلیقات کا ایک میلہ یہاں موجود ہے۔ سیاحت اور بصیرت کے ساتھ اس میلے سے گزرتے جائیے اور خود کو مالا مال کرتے جائیے۔ یہاں خاک اُڑتی ہے نہ کوئی قبلہ گاہی کے لیے سجدۂ انا کا لیبل لگنے کا خوف۔

سو ''حریم ادب'' ایک بابِ ستائش بھی ہے اور ستائش گری کی خوبیاں پانے کی راہ بھی۔ اس کا اُفق زمین اور انسان کے باطن میں پنہاں ہے اور اس کی روشنی شدید ترین گرم خطوں میں اپنا اثر ختم نہیں کرتی۔ چاہے اس کا تعلق لفظ اور معنی کے غیر سماجی پہلو سے ہو یا یہ سماجی پہلو سے معتبر ہو۔ اس کی وجہ سائنسی حقائق کو وا ہے میں بدلنے والی وہ طاقت ہے جو ہر عہد کے تخلیق کار کو اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہی۔ وہ ہنستا رہا مگر اس لیے نہیں کہ اس ہنسی میں طنز تھا بلکہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کا خوگر تھا کہ لطیفے کو اس وقت تک Enjoy نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کو سُن کر تسلیم کی خو نہ ڈالی جائے۔ بہر نوع اس خطے کا یہ سرمایہ ہے۔ گو روایتی جملہ ہے مگر آنے والے عہد میں اس کا تسلسل اس جملے کو ایک بڑی حقیقت میں تبدیل کرے گا۔

''حریم ادب'' کے بارے میں میری ان معروضات میں یہی پہلو قاری کو یقیناً متاثر کرے گا کہ ڈاکٹر جاوید حیدر جوئیہ اور سیّد تحسین گیلانی سطحیت سے پاک ایک ایسی آفاقی اور ابدی ادبیت کے قائل ہیں جو رہتی دنیا تک قائم رہے۔ اسی پس منظر میں ''حریم ادب'' میں انہوں نے ایسے اربابِ علم و دانش کو اپنے ساتھ شریکِ کار کیا ہے جو یقیناً فلسفہ حیات کی ان گتھیوں کو سلجھانے میں اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لا رہے ہیں۔ اس میں کسی مرکز یا بڑے ادبی گروہ سے وابستگی اور کسی مضافاتی گوشے سے پہلوتہی نہیں کی گئی۔ اسی طرۂ امتیاز نے جہاں ''حریم ادب'' کی عظمت کو آفاقیت بخشی ہے وہیں اس کے فاضل مرتبین جناب ڈاکٹر جاوید حیدر جوئیہ اور سیّد تحسین گیلانی کی ادبی عظمتوں کا بھی اعتراف ہوا ہے۔ ''حریم ادب'' ان کی محنتوں کا ایسا ثمر ہے جو دوسروں کے لیے باعثِ تحسین بھی ہے اور باعثِ تقلید بھی۔

پروفیسر اکرم عتیق / لاہور

مرکز کی طرف کھنچنے والوں کی کمی نہیں لیکن مرکز کو اپنی طرف کھینچ لانے کی مثال شاذ ہے۔۔۔ خیر گلوبل ویلج سے گلوبل سٹریٹ ہو جانے والے عہد میں شاید مرکز بھی اپنی نئی تعریف طے کروالے گا۔ اس جملے میں ''آہستہ آہستہ'' کے الفاظ میں نے دانستہ استعمال نہیں کیے کیونکہ تبدیلیوں، نئے تقاضوں اور نئی جہتوں کے سفر اور رفتار سے شاید اب ان کا کوئی خاص تعلق بھی نہیں رہا۔ لفظوں کی جہات اور تنوعات کے دائروں سے منعکس ہوتی ہوئی شعاعیں بصیرت اور احساسات پر نئے روپ کے امکانات اور تعبیروں کے نقوش کا تسلسل ٹھہر گئی ہیں۔

یہ سارا منظر نامہ ''حریم ادب'' کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اب تک شائع ہونے والے ''حریم ادب'' کے دونوں پرچوں میں ایک فکری ربط نمایاں ہے۔ الفاظ و معانی کے نئے نئے رشتے، ادبی سطح پر منکشف ہوتے ہوئے نئے نئے نکات، رجحانات اور جدید ترین مباحث کی جلوہ گری نقشِ اول سے نقشِ ثانی تک کا کامیاب ارتقائی سفر ہے۔

تازہ شمارے کے پُر مغز مشمولات نے ''حریم ادب'' کی اہمیت کچھ اس انداز سے ثابت کی کہ میں اس کی پہلی کتاب کے مکرر مطالعے پر مجبور ہو گیا۔ میری رائے میں طلبائے ادب کے لیے اس کتابی سلسلے کا مطالعہ انتہائی سودمند ہے۔۔۔ روز افزوں مادہ پرستی، افراتفری، نفسانفسی اور اقدار کے تبدل کے ہاتھوں اگر ایک دو مسلمہ ادبی رسائل کے معیار میں اگر کچھ تنزل کی جھلک نظر آئی ہے۔ تو وہاں ''حریم ادب'' کا معیار معیاری ادب کے پرچار کی اُمید بندھاتا ہے۔ اس کی بیشتر تحریریں Readerly کی بجائے Writerly ہیں۔

تنقیدی و تحقیقی مضامین' فکری مباحث' کہانیاں' تراجم گویا کہ جملہ نثری تحریریں قابل داد ہیں اور شاعری کے متنوع رنگ لائق تحسین۔۔۔ شاملِ اشاعت نگارشات کا انتخاب مرتبین کے شوق اور طبیعت کے تطابق اور ذوق کے اخلاص کا مظہر ہے۔

ظفر اقبال نادر/عارف والا

''حریم ادب'' کتاب 2 موصول کیا' شکریہ

''بورے والا'' جیسے دُور افتادہ مقام سے ایسے اعلیٰ و معیاری ادبی پرچے کا اجراء کسی معجزے سے کم نہیں' یہ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی شخص خلاء سے پٹرول دریافت کر لے۔ ایسے اعلیٰ معیار کا پرچہ نکالنا ذہنی و جسمانی مشقت' کے علاوہ مالی قربانی کا بھی متقاضی ہوتا ہے۔ جو آپ دے رہے ہیں۔ سب اہلِ قلم حضرات کو اِس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ جب جاوید حیدر جوئیہ صاحب نے یہ بارگراں اُٹھالیا ہے تو ہمیں ہر طرح سے اُن کا ساتھ دینا چاہیے۔ کیوں کہ جنگ میں دُعاؤں کے علاوہ جان و مال بھی قربان کرنا ہوتے ہیں۔

نہایت معذرت کے ساتھ مستنصر حسین تارڑ صاحب سے عرض ہے کہ دنیا میں کسی بھی کام کا کامیاب ہونا یا ناکام ہونا امکانات میں شامل ہے۔ مانا کہ ایسے پرچے کو نکالنا اور پھر مسلسل نکالنا مشکل کام ہے تو کیا ہارنے کے خوف سے شکست تسلیم کر لی جائے؟ جیسا کہ مَیں نے پہلے عرض کیا ہے کہ دنیا کے تمام کام (تقریباً) امکانات میں شامل ہیں۔ مگر موت اک اٹل فیصلہ ہے۔ موت زندگی کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔ تو کیا مرنے کے خوف سے جینا ترک کر دیا جائے۔ کونسا راستہ اختیار کیا جائے؟ موت کو تو آخر آنا ہی ہوتا ہے۔

''حریم ادب'' میں مجھے باوجود کوشش کے کوئی ایسی خامی یا کمی نظر نہیں آئی جسے دُور یا درست کرنے کا کہا جائے' ہاں ایک دو جگہ پروف ریڈنگ کی غلطیاں تھیں۔ پہلے شمارے میں غزل کے حصے میں کچھ کچھ جھول تھی یعنی بالکل نوآموز شاعروں کا کلام بھی تھا۔ مگر کتاب نمبر 2 میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ آغاز میں فہرست کا اہتمام کر دیا جائے تو بہتر ہے تاکہ متعلقہ غزل' نظم' وغیرہ تلاش کرنے میں آسانی رہے۔

اِک واقعہ درج کر رہا ہوں۔ جب لاہور سے مولوی محبوب عالم نے پیسہ اخبار کا اجراء کیا تو مولانا حالی نے اُنھیں اپنے پیغام میں لکھا ''جو لوگ پنجابی اُردو پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اُردو زبان ان کے ہاتھوں سے نکل کر پنجاب میں جا رہی ہے اگر یہی سلسلہ مدت تک جاری رہا تو جس طرح عربی زبان عرب سے نکل کر مصر اور شام میں چلی گئی۔ یقیناً وہ وقت دُور نہیں ہے جب دلی اور لکھنو کی بجائے لاہور اُردو کا گھر ہو جائے گا اور اس طرح ہمیشہ کے لیے اس بحث کا فیصلہ ہو جائے گا۔''

پنجاب میں لاہور کے بعد 'بورے والا' زبان و ادب کے حوالے سے اہم فریضے سرانجام دے رہا ہے۔ بلکہ مَیں تو اسے دوسرا لاہور کہتا ہوں اس کی واضح اور ٹھوس مثال ''حریم ادب'' کی کامیاب اشاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ ''حریم ادب'' کے تمام سٹاف کو مزید حوصلہ و ترقی عطا فرمائے آمین۔

محمد بصیر رضا/لاہور

حریم ادب کی کتاب II' ارسال کرنے کا شکریہ۔ اس شمارے کے توسط سے بہت سارے بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملاقات ہوئی اور خوب ہوئی۔ ناصر بشیر' اعجاز توکل' عابد خورشید' افتخار مجاز اور بہت سارے دوسرے۔ آپ نے اِس شمارے میں گراں قدر مواد جمع کیا ہے۔ ہر گوشے پر لمبی چوڑی اور مربوط گفتگو ہونی چاہیے لیکن میں آزاد تلازمہ خیال میں چیدہ چیدہ تحریروں پر بات کر سکتا ہوں۔ غزلوں کا انتخاب بہت ہی اچھا ہے۔ پُرانے اور نئے شعراء سب جدت سے بھرپور غزلیں کہہ رہے ہیں۔ افتخار عارف کا یہ شعر وجد آفریں ہے:

چراغ حجرہ درویش کی بجھتی ہوئی لو
ہَوا سے کہہ گئی ہے اب تماشا ختم ہو گا

حیدر قریشی صاحب آپ نے کیا خوب کہا:

کُن کا اک لفظ اسیروں پہ کہیں سے اُترا
آسماں ہو گئے تخلیق قفس کے اندر

اعجاز توکل کی غزلوں میں کلاسیکی لہر قابلِ داد ہے۔ ناصر بشیر ایک بار پھر برسوں یاد رہنے والا مقطع کہہ گئے:

یہ جو غزلیں ہیں یہ غزلیں تو نہیں ہیں ناصر
اپنی تنہائی کو مشہور کیا ہے ہم نے

عابد خورشید نے ڈاکٹر وزیر آغا کے رنگ میں اچھا شعر کہا ہے:

سب نے اپنی جھولی کو پھیلایا ہے
چاند کی اُترن اب دیکھوکس کو جائے گی

شناور اسحاق کی غزلیں عہد حاضر کے آشوب کو انتہائی بلیغ زبان میں پیش کرتی ہیں۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے:

ایک بھی دل میں نہیں اسمِ محبت کی نیاز
صرف جھرمٹ کو پریوار نہیں مانتے ہم

خاور اعجاز کے اس شعر کی معنویت قابلِ داد ہے۔

ٹانکنے ہیں روح میں اُس آسماں کے مہر و ماہ
اور بدن پر اس زمیں کی خاک ملنا ہے مجھے

انشائیوں میں سلیم آغا کا انشائیہ ''رنجش'' بہترین ہے۔ یہ ایک مکمل ادبی تحریر ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہے۔ ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کی دلکش نثر نے بہت لطف دیا۔ اکبر حمیدی اور حیدر قریشی کے انٹرویوز نہ صرف اِن دونوں لکھاریوں کے طرزِ فکر کو اُجاگر کرتے ہیں بلکہ ادب کا جدید تر ویژن بھی دیتے ہیں۔ گل نوخیز اختر کا لکھا ہوا خاکہ اسٹیج ڈرامے کے مشہور جملے سے مزین ہونے کے باوجود دلکش ہے اور اُن کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ عامیانہ باتوں کو ادبی رنگ دینا بھی کسی کسی کا کام ہے۔

گوشۂ نظم میں آج کی نظم کے تمام بڑے نام نظر آئے اور ہر نظم ایک سے بڑھ کر ایک۔ کس کس کی تعریف کی جائے ہر نظم مفصل طور پر قابلِ تجزیہ ہے۔ خاص طور پر رفیق سندیلوی کی نظم ''پانی کا سرمایہ''

شفیع ہمدم / جھنگ

''حریم ادب'' مل گیا ہے اور اس میں شامل بیشتر تحریروں کا مطالعہ بھی کر چکا ہوں۔ اس مرتبہ رسالہ پہلے کی نسبت زیادہ ضخیم اور معیاری ہے۔ اتنا معیاری اور خوبصورت رسالہ نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارکباد ہو۔ اس شمارے میں شامل اکبر حمیدی کا انشائیہ ''جادوگری'' نظر سے گزرا۔ اکبر حمیدی کافی عرصہ سے انشائیے لکھ رہے ہیں اور اس میدان میں ان کا قلم تیزی سے رواں دواں ہے۔ ان کا یہ انشائیہ پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے وہ انشائیے پر نئے تجربات کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انشائیہ عام ڈگر سے ذرا ہٹ کر ہے مگر اپنے اندر پوری جاذبیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا اسلوب مجھے بہت پسند ہے۔ میں ان کے انشائیوں کو دو دو تین تین بار پڑھتا ہوں اور ان کی زبان آوری سے محظوظ ہوتا ہوں۔ اس شمارے میں ان کا انشائیہ ''رنجش'' کا مطالعہ کیا۔ اس انشائیے میں انہوں نے بتایا ہے کہ کینہ، بغض، حسد، عداوت اور غیبت انسان کو مستقل طور پر پابہ زنجیر رکھتی ہیں جبکہ رنجش کا کردار ان کے مقابلہ میں بہت ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ صرف دو میٹھے بول یا ٹیلی فون کی ایک کال سے اس کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ یہ انشائیہ دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

سیّد تحسین گیلانی کو انشائیہ کے میدان میں قدم رکھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ مگر انہوں نے چند خوبصورت انشائیے تخلیق کیے ہیں۔ ''حریم ادب'' میں شامل ان کا انشائیہ ''ہونا نہ ہونا'' بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ اس انشائیے میں بتایا گیا ہے کہ ''ہونے میں'' بے پناہ دُکھ اور اذیتیں انسان کو اپنے حصار میں لیے ہوتی ہیں مگر وہ ہونے کی خوشی کی سرشاری میں سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ اس کے برعکس ''نہ ہونے میں'' سکون اور شانتی ہے۔ اس لیے نہ ہونا ایک نعمت ہے۔ اچھا انشائیہ ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ ''بکھری ہوئی کہانی'' مشرف عالم ذوقی کا ''ایک گاؤں ابھی بھی شہر میں ہے'' اور محمد حامد سراج کا افسانہ ''آخری آئس کیوب'' معیاری اور خوبصورت افسانے ہیں۔ ''حریم ادب'' میں تین ادبی شخصیات کے انٹرویوز شامل ہیں۔ تینوں انٹرویوز پڑھے اور لطف اندوز ہوا۔

شاید صفحات کی کمی کی وجہ سے ابتدا میں مضامین کی فہرست نہیں دی گئی اور بذریعہ اصناف فہرست مرتب کی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ ناکافی ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ شمارے میں اس کمی کا ضرور ازالہ کریں گے۔

غزلیات میں مندرجہ ذیل اشعار نے متاثر کیا۔

وہیں وہیں میری راہ میں تھی کوئی رکاوٹ
جہاں جہاں مَیں ترے اشارے پہ جا رہا تھا (ظفر اقبال)

یہ قتل نامے پہ دستخط تو مرے نہیں ہیں
مگر یہ خلقِ خدا جو لیتی ہے نام میرا (افتخار عارف)

ہے زندگی میں حسن نشیب و فراز سے
نغمے کا سارا سوزِ دروں، زیر و بم میں ہے (مرتضٰی برلاس)

مجھے کچے گھڑے میں بھر لیا ہے
کسی نے رات، دریا کہہ دیا ہے (اکبر حمیدی)

ہمیں نہ روک رکھے ہیں یہاں سبھی رستے
ہمیں کو ہے یہ گلہ راستا نہیں ملتا (عطاء الحق قاسمی)

رس بنایا گیا اس زیست کو پہلے پھر
موت کا زہر ملایا گیا رس کے اندر (حیدر قریشی)

گرچہ مربوط نہیں قاری و راقم پھر بھی
ذہن مصروف مضامین کی ترسیل میں ہے (معین تابش)

رتجگے میرا مقدر ہیں یہ مجھ سے پوچھو
کیا گزرتی ہے کسی شب پہ سحر ہونے تک (معین تابش)

ہم جی رہے ہیں اپنی انا کے حصار میں
اک زہر نارسائی رگوں میں اُتار کر (صفدر سلیم سیال)

یہ عبادتوں کی رُت ہے، یہ گزارشوں کا موسم
میری آہ نارسا کو اثر دوام دے دو (بشریٰ رحمٰن)

آنسو جب فریاد بنیں تو کہتے ہیں
اب آواز کی گردن کون مروڑے گا (تحسین گیلانی)

تجھے پھلانگ کے اگلا قدم کہاں رکھوں
اے آسماں' مرے اندر سے بولتا ہے کوئی (جاوید حیدر جوئیہ)

ناصر عباس نیر نے ''راشد کا نیا آدمی'' میں ن۔م۔راشد کے نئے آدمی کو اپنے ضخیم مضمون میں بھر پور انداز میں ہائی لائٹ کیا ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے راشد کا تعلق رومی اور اقبال کی دانش وارانہ روایت سے جوڑا ہے۔ نیر صاحب ان کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رومی و اقبال کی روایت میں مابعد الطبیعات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جب کہ راشد کے یہاں اس کا انکار موجود ہے۔ اقبال مشرق کی تہذیبی عظمت کے قصیدہ خواں اور راشد بڑی حد تک اس کے نقاد ہیں۔ اقبال احیا کے اور راشد ارتقا کے قائل ہیں۔

راشد اقبال کے ماضی کو نمایاں نہیں کرتے بلکہ تنقید کا نشانہ بناتے ہیں' ناصر عباس نیر راشد کے نئے آدمی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''راشد کی نظموں کا نیا آدمی اپنی پوری قامت کے ساتھ اچانک نمودار نہیں ہوتا۔ بتدریج اور آہستہ آہستہ نئے آدمی کے اسرار کھلتے ہیں۔''

وہ اپنے مضمون میں اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ راشد کے ہاں آدمی سے نئی آدمی کا سفر تین مراحل میں طے ہوا ہے۔ یہ تین مراحل دراصل راشد کے تین تصورات ہیں۔ نیر صاحب کے اس علمی اور تنقیدی مضمون کو پڑھ کر راشد کے نئے آدمی کی مکمل تفہیم ہو جاتی ہے۔

تحسین زہرا کا مضمون ''ن۔م۔راشد کا نیا آدمی'' بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے راشد کے نئے آدمی کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ کوئی مثالی آدمی نہیں ہے بلکہ اس زمین پر چلنے پھرنے والی مخلوق ہے مگر وہ ان تمام روایتوں اور پابندیوں کو توڑنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے انسانوں میں درجہ بندی کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

''حریم ادب'' کو اس بلند مقام اور اعلیٰ معیار پر پہنچانے میں ڈاکٹر جاوید حیدر جوئیہ کی تنقیدی بصیرت' تجربہ اور ریاضت شامل ہے۔ علاوہ ازیں تحسین گیلانی کی والہانہ لگن اور محنت شاقہ کو بھی بڑا دخل ہے۔ ان کی شب و روز محنت نے ''حریم ادب'' کو وہ وقار بخشا ہے کہ بلاشبہ اس کا شمار اردو کے چند بڑے رسائل میں کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد اعجاز / گوجرانوالہ

مادیت کے اس تیرہ و تار دَور میں جبکہ ہر سُو زندگی کی اعلیٰ قدریں بڑی تیزی سے دم توڑ رہی ہیں۔ ایسے میں خالصتاً ادب برائے زندگی کا نعرہ مستانہ بلند کرتے ہوئے ادبی مراکز کی خود ساختہ ''اجارہ داریوں کی اندھیر نگری سے بہت دُور'' مضافات سے ''حریم ادب'' کی اشاعت ہمارے عہد کے ایک زریں دَور کا نقطۂ آغاز ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کے عزم' حوصلوں' ولولوں اور ادب کی عہد ساز کاوشوں کو ہمیشگی بخشے۔

ادب حقیقت میں کسی بھی عہد کا ایسا آئینہ ہے' جس کے باطن میں وہ پورا عہد اپنے تہذیبی' ثقافتی اور سماجی پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی دَور کی تہذیبی قدریں' ثقافتی طرزِ احساس' سماجی لوازمات اور ادب و حیات کا باہمی انسلاک' ان سب کے بارے میں حقیقی آگہی ہمیں اس دَور کے ادب کے مطالعے سے ہی مل سکتی ہے جو کہ اس دَور کی غزل' نظم' گیتوں اور کہانیوں میں پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔ ''حریم ادب'' بلاشبہ ہمارے عہد کے ادب کی حقیقی تصویر ہے۔ اسی زندہ جاوید کاوش پہ میں آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں (ممکن ہے جسے میں پوری ٹیم سمجھ رہا ہوں وہ صرف آپ بذاتِ خود اور آپ کے رفیق سیّد تحسین گیلانی ہی ہوں)

اطراف (اداریہ ''حریم ادب'') کے منفرد اسلوب میں آپ نے عملِ قرأت اور علم و ذوق میں جس طرح اپنے ادبی شعور' زاویے اور مقاصد کو پیش کیا ہے وہ بذاتِ خود ایک سنجیدگی کے ساتھ زندگی اور ادب میں گہری ہم آہنگی کا مبسوط مطالعہ ہے جو ہم پہ ہمارے عہد کے ادبی معاملات کی گہری بصیرت بھری ناقدانہ نظر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسی طرح اج آکھاں وارث شاہ نوں میں سیّد تحسین گیلانی نے جس کرب نارسائی کو رقم کیا ہے وہ ہمارے پنجابی ادیبوں اور قلمکاروں کا حقیقی المیہ ہے۔

''حریم ادب'' کے مجموعی مزاج کو (جیسا کہ ''حریم ادب'' کی اشاعت تازہ سے ظاہر ہے) مدنظر رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو افسانہ' انشائیہ' عملی تنقید اور انٹرویوز اس جریدے کے پورے ''حقیقی مہاندرے'' کو ہم پر آشکار کرتے ہیں۔ بکھری ہوئی کہانی (ڈاکٹر رشید امجد) جس طرح

تازہ لہو کا پیالہ' اقرار' انکار' اجنبی جیسی اساطیری و علامتی رمز و کنایئہ سے گندھی ہوئی کہانی ہے اُس کی داد نہ دینا کم ظرفی ہے۔ اسی طرح آخری آئس کیوب (محمد حامد سراج) جسم کی خواہش کا سراب سے حقیقت تک ایک بھرپور مطالعہ ہے۔ نارسائی کا رشتہ (خاور قیوم تنولی) ایک حرماں نصیب طوائف کی پوری زندگی اور ہمارے سماجی' معاشرتی' معاشی تعقلات و تعلیقات کی آئینہ دار ہے۔ ایک خط کے روپ میں عمر بھر کی کڑواہٹ اور محرومیاں لکھ دینا ایک یافت ہے۔''اک گاؤں ابھی بھی شہر میں ہے۔'' (مشرف عالم ذوقی) ایک باب ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر جامعیت کا کامل پہلو رکھتا ہے۔ کاش یہ کبھی پورا دستیاب ہوسکتا۔''حریم ادب'' میں شامل اشاعت یہ تمام افسانے ہمیں نہ صرف ان افسانہ نگاروں کے تخلیقی رجحانات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں بلکہ رسائی اور نارسائی کے درمیان باریک حدِ امتیاز سے بھی واقف کراتے ہیں۔

اکبر حمیدی کے جادو قلم سے''جادونگری'' اور ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کے انشائیے''رنجش'' نے انشائیے کے مہکتے رنگوں کی لذتِ بے پایاں دی۔ سیّد تحسین گیلانی کا''ہونا نہ ہونا'' بھی خوب انشائیہ تھا جس میں لطیف رنگوں اور چھیڑ چھاڑ نے ہمارے اردگرد کی خوب تصویر کشی کی۔ باقی رنگ ابھی مزید کی طرف گامزن ہونا مانگتے ہیں۔

اکبر حمیدی میرے شہر گوجرانوالہ کے مایہ ناز علمی ادبی سپوت ہیں۔ ان کے شعری مجموعے''تلوار اُس کے ہاتھ'' میں مجھے ان کے ہاں جس خوبصورت ویژن کی نشاندہی ہوئی تھی میں آج تک اس کی لذت نہیں بھول پایا۔ ان سے ایک مکالمہ جس کے محرک آپ تھے ایک پوری تاریخی دستاویز ہے۔ آپ نے جس طرح سے سوالات اُٹھا کر اکبر حمیدی کے نقطہ ہائے نظر اور تنقیدی بانکپن کو قارئین ادب کے مطالعے کے لیے اُجاگر کرتے ہوئے پیش کیا اس کے لیے آپ کو بے پناہ داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

عملی تنقید کے حوالے سے اس شمارے میں ن۔ م۔ راشد پہ ناصر عباس نیر کا مضمون خاصے کی چیز تھا۔ ناصر عباس کے ہاں مخصوص تنقیدی رچاؤ' امتزاجی تنقیدی تھیوری سے پریکٹیکل تک نئے تنقیدی عہد کی استواری کرتا دکھائی دیتا ہے اور ان کے مضامین کا گہرا تنقیدی تاثر تو ہمارے عہد کے ہر نقطہ ور ناقد اور تنقید کے قاری پر ہے۔ خدا تعالیٰ انھیں بے پناہ نوازے۔ تحسین زہرا نے''راشد کا نیا انسان'' مضمون کے حوالے سے راشد کی شعری تفہیم کے لیے اچھی کوشش کی ہے۔۔۔''حریم ادب'' میں عملی تنقید کا پورا گوشہ اس جریدے کے تنقیدی شعور کی آبیاری کی متعین راہوں پہ گامزن کرنے کی سعی دکھائی دیتا ہے۔

''حریم ادب'' کا پنجابی گوشہ سلطان کھاروی اور عبدالقدوس کیفی کی نظموں کے بانکپن سے سجا ہوا تھا۔ باقی پنجابی گوشہ میں کوئی کہانی یا تنقیدی مضمون شامل نہ دیکھ کر پنجابی ادیبوں کی آپ سے محبت سے واقعی گھبرا گیا۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ اپنے رسالے کے معیار کو ضرور مدنظر رکھیے گا اور پنجابی کہانی کے نام پہ ہونے والے آج کل کے کلام کو درخورِ اعتنا نہ سمجھیے گا۔

انگریزی حصہ/ ترجمہ اپنی خاص شان رکھتا ہے اور تراجم کے لطف سے ایک گونہ مزا آیا۔ آپ نے یہ جدت طرازی کر کے''حریم ادب'' کا مقام بلند پایہ ادب کے حامل جریدوں میں کرایا ہے۔

اکرم باجوہ/ بورے والا

''حریم ادب'' کے دو شمارے یکے بعد دیگرے نظر نواز ہوئے۔ یاد آوری اور محبتوں کا شکریہ! میں نے دونوں شماروں کو پوری توجہ' انہماک اور دلچسپی سے پڑھا ہے۔ جملہ نگارشات کا انتخاب آپ کے اعلیٰ ادبی ذوق کا مظہر اور آئینہ دار ہے۔ ان کے بطون سے ایک روشنی سی پھوٹتی دکھائی دیتی ہے اور ہمارا عہد سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔

بوریوالا کے مردم خیز خطے سے گزشتہ چالیس برسوں میں متعدد ادبی مجلّے آسمانِ ادب پر ستارہ وار طلوع ہوئے مگر اپنی مختصر سی جھلک اور لمحاتی سی چھب دکھا کر غروب ہو گئے۔ ان میں کئی مجلّے تو ایسے ہیں جن میں احباب کے ساتھ مجھے بھی معاونت کا اعزاز حاصل ہے۔ مگر چند قدم چلنے کے بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ راستہ وادی پُرخار کا راستہ ہے اور یہ کام خارِ مغیلاں کی نوک پر رقصِ جنوں کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ پتھر بے حد بھاری ہے۔ کمزور بازو اور ناتواں کندھے یہ بارِ گراں اُٹھانے سے قاصر ہیں چنانچہ مجبوراً یہ پتھر ایک طرف رکھ دیا۔

آپ کے بازو آہنی اور جذبے فولادی ہیں۔شریانوں میں دوڑنے والا لہو گرم ہے اور ادبی مجاہدوں بلکہ گوریلوں کی ایک مضبوط جماعت آپ کے ہمراہ ہے۔آپ نے یہ پتھر چوم کر اُٹھالیا ہے۔مرحبا صد آفرین! آپ کے جذبے اور ہمت کو سلام۔''حریم ادب'' کے جو شمارے منصۂ شہود پر آئے ہیں ان کے بغائر مطالعہ کے بعد میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب آپ بیٹھنے کے نہیں بلکہ آگے اور بہت آگے جائیں گے آپ کی ادب دوستی اور نقطہ شناسی قابلِ تحسین ہے۔

میری یہ دیرینہ خواہش تھی کہ بوریوالا کی اس سرزمین سے جو علم و ادب کا گڑھ ہے ایک ایسا پرچہ منظرِ عام پر آئے جو'اوراق''،''فنون'' ''نقوش'' اور''سیپ'' کا ہم پلہ ہو یہ دونوں شمارے پڑھ کر میری خوشی کی تکمیل ہوئی اور خوب ہوئی یوں سمجھئے ایک تشنگی تھی جو بجھ گئی۔۔۔آپ نے ان شماروں میں مادری، قومی اور عالمی زبانوں کی یوں نمائندگی کی کہ پاکستانی ادب کی قوسیں، عالمی ادب کی قوسوں کی چھوتی نظر آتی ہیں۔اس طرح معاصر ادب کی خوشبو جغرافیائی سرحدوں کو عبور کر کے قریہ قریہ پھیل گئی ہے۔

پرچوں میں شامل تحریریں جدت و روایت کا حسین سنگم ہیں۔بصیرت کی روشنی، سوچوں کی ہریالی اور لفظوں کی آب و تاب نے اسے آفتاب و ماہتاب کی طرح اُجال دیا ہے۔یہ آوزوں کا ایک ایسا قلزم بے تاب ہے جس کے ہلکوروں میں ڈاکٹر وزیر آغا، نصیر احمد ناصر اور رفیق سندیلوی کی نظمیں تیرتی ہوئی وہ سیپیاں ہیں جن میں گوہر چھپے ہوئے ہیں۔مناظر عاشق ہرگانوی، علی محمد فرشی کی تحریریں ابرنیساں ہیں۔عمران حیدر تھہیم کی نظم''عالم ہو جاگتا ہے'' میں تلمیحات کا ایک جہان آباد ہے۔شاعر کا وجدان ہابیل کی الوداعی چیخ، حضرت مریمؑ کے تقدس، طائف کی گلیوں کی سنگ باری اور کرب و بلا کے دلخراش المیے سے ہوتا ہوا لمحۂ موجود میں تحلیل ہو گیا ہے۔بلاشبہ یہ ایک شاہکار نظم ہے۔

''مرزا غالب بنام پی ٹی وی'' ایک منفرد تحریر ہے۔غالب کے انداز میں لکھنا تو جاں سے گزرنا ہے اور آپ نے یہ کام کر دکھایا ہے۔نثری تحریروں اور بالخصوص انشائیوں میں ایک بوقلمونی اور رنگارنگی ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر شبیہ الحسن، اقبال جمیل انڈیا، جمیل احمد عدیل، تحسین گیلانی، وحید اختر قریشی اور شازیہ انور کے کتابوں پر تبصرے جامع، مدلل اور انتخاب ہیں۔بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ادبی فن پارے ہیں۔ناصر عباس نیر کی تحریروں میں ایک نیا شعور انگڑائیاں لے رہا ہے۔ان کی سوچوں کا کینوس بڑا وسیع ہے۔ڈاکٹر رشید امجد، محمد حامد سراج اور خالد قیوم تنولی کے افسانے قاری کو اپنے حصار سے نکلنے نہیں دیتے یہ چونکا دینے والی تحریریں اسے جھنجھوڑتی ہیں۔انگریزی تراجم جگمگاتے چراغ ہیں بعض غیر ملکی پودوں کو پاکستانی گملوں میں لگا دیا ہے اور ان کی کونپلیں دلآویز ہیں۔سرورق پر مُوجد کے رنگوں سے وہ دھنک سی اُبھر آئی ہے جس کے پس منظر میں کئی خوبصورت منظر مسکرا رہے ہیں۔'موجد' سے بہتر رنگوں کا کھیل کھیلنا کون جانتا ہے۔ان کے ہاں تو رنگ کلام کرتے نظر آتے ہیں۔ان شماروں کے حوالے سے ملکی اور عالمی سطح کے تخلیق کاروں سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا ہے اور ان کے افکار کو آنکھوں کے کٹوروں میں اُنڈیلنے کا موقع بھی فراہم ہوا ہے۔

آپ نے''حریم ادب'' کی صورت میں ادب کی ہتھیلی پر ایک اور چراغ روشن کر دیا ہے۔یہ شمارے ایک عہد ساز ادبی دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں اور اوراق، فنون اور سیپ کا یہ نعم البدل ہیں۔اگلے شماروں میں تنقیدی مضامین اور پاکستانی ادب سے بہترین آفاقی کہانیوں کو بھی شامل کریں تو سبحان اللہ!

حریم ادب کے تمام معاونین کو اس مساعی کاملہ وجمیلہ پر دلی مبارکباد۔

مجھ کو مرے ماحول نے یہ دی ہے بشارت
سنگلاخ چٹانوں میں نیا پھول کھلا ہے

آلِ عمران / گوجر خان

سب سے پہلے آپ اور آپ کی پوری ٹیم کو''حریم ادب'' کی اشاعت پر قلبی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔آپ نے جس عمدہ انداز اور اعلیٰ معیار کے ساتھ اشاعت کا بندوبست کیا ہے اُس پر جی خوش ہو گیا۔حریم ادب میں''دستک'' اچھی لگی۔خاور احمد کا شعر یاد آ گیا:

در پہ دستک نہیں ہے خوشبو ہے
کوئی آ کر پلٹ گیا ہے کیا؟

لیکن ''حریم ادب'' کی دستک ہمیشہ اردو ادب کے شہر میں قائم رہے گی۔اس کی خوشبو بھی اور سارے خوشگوار لمحات بھی۔۔۔''اطراف'' میں آپ نے ''دستک'' دی ہے اور جب دروازہ کھلا تو ''اردو منزل اور پنجاب ویہڑا'' نظر آیا۔دونوں میں خوبصورت انداز' عصری رویے اور تقاضوں کے عین مطابق ترتیب دیا ہوا تخلیق کاروں اور اہلِ قلم کا گلشن۔آپ نے بڑے عمدہ گل چیں کی صورت میں خوبصورت اور مختلف رنگوں کے پھولوں' خوشبوؤں کا اہتمام کیا ہے'جس کی خوشبو میرے چاروں اور ہے اور ہمیشہ رہے گی ہمیں اب مضافاتی بحث کو بھی ختم کرنا ہوگا۔تخلیق کا اظہار کسی بھی جگہ ہو سکتا ہے۔آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ نے علمی کام کیا ہے۔باتیں' گالیاں اور ٹانگیں کھینچنے کی بجائے اہلِ قلم کو ایک نیا پلیٹ فارم مہیا کیا ہے اب قلم قبیلہ کو چاہیے کہ وہ آپ کے ساتھ معاونت کریں' مالی' اخلاقی اور تحریری طور پر۔کیونکہ ایسے خوبصورت پلیٹ فارم کم کم بنتے اور ملتے ہیں۔اس سلسلہ میں مَیں آپ کے ساتھ ہوں۔افتخار عارف نے خوب کہا ہے بلکہ یہ شعر تو میرے دل کے آس پاس خوشبو بکھیر رہا ہے:

میں کچھ کریموں کے بابِ نعمت سے منسلک ہوں
سو خود بخود ہو رہا ہے سب انتظام میرا

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ایسے لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں۔مَیں اس شعر کے بارے میں اور کیا کہوں۔۔۔بس میرے دل کو بار بار چھو رہا ہے۔بیدل حیدری سے محبتوں اور احترامات کا سلسلہ رہا۔آپ نے بہت اچھا کیا جو بیدل حیدری کا انٹرویو شائع کیا۔اُن کی تازہ کتاب اُن کی بیٹی نے ارسال کی ہے۔آپ کو اُن کی تازہ غزلیں ارسال کروں گا۔محمد حامد سراج ایک سیلف میڈ آدمی ہے اور اچھے افسانہ نگار بھی۔حیدری صاحب کے انٹرویو کو اُنہوں نے خوب کیا ہے۔بیدل حیدری جناب احمد ندیم قاسمی سے بے حد محبت کرتے تھے۔احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی ہر لمحہ اُن کی بڑی محبت و معاونت فرمائی۔ایک بار کبیر والہ جانا ہوا تو بیدل حیدری نے مجھے قاسمی صاحب کے حوالے سے ایسی ایسی باتیں اور بے شمار چیک دکھائیں جو قاسمی صاحب کے چاہنے والوں کی طرف سے بیدل حیدری کو ملتے تھے۔مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے بیدل حیدری کو یاد رکھا اور یاد رکھیں گے۔

جناب حیدر قریشی کا انٹرویو گل نوخیز اختر کا انچارج نقوی' ڈاکٹر وزیر آغا اور شہزاد احمد کی نظمیں' خالد قیوم تنولی نارسائی کا رشتہ عمدہ تخلیقات ہیں۔نوخیز بہت محبتوں والے دوست ہیں۔کچھ عرصے سے ملاقات نہ ہو پا رہی تھی خوشی ہوئی کہ حریم ادب کے پلیٹ فارم پر مل گئے۔ہو سکے تو اس خط کے وساطت سے رابطہ کریں کہ وہ کہاں ہیں اور کن رنگوں میں ہیں۔نوخیز کی کتاب ''نوخیزیاں'' میں میرے حوالے سے All عمران کے عنوان سے خاکہ لکھا ہے۔آخر میں اُمید' آس اور محبت کا پیغام دے کر اجازت چاہوں گا کہ آپ نے اچھا کام کیا ہے اور یہ اعزاز کم کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ آپ اس اعزاز پر مبارک۔۔۔مبارک۔۔۔مبارک کے مستحق ہیں۔۔۔مبارک ہو۔۔۔سیّد تحسین گیلانی' عمران حیدر تھہیم' توقیر تقی اور جاوید امجد بھی آپ خوش رہیں اور یونہی گلستان سجاتے رہیں اور خوشبوئیں آتی رہیں۔

کاشف مجید/ٹوبہ ٹیک سنگھ

کتابی سلسلہ ''حریم ادب II'' کا مطالعہ کیا۔خوشی ہوئی کہ آپ نے اور آپ کے معاونین نے حسبِ روایت کمال محنت اور خوش سلیقگی کا مظاہرہ کیا۔مبارک ہو یہ کتابی سلسلہ اس وقت اُردو دنیا میں شائع ہونے والے معیاری جرائد سے اپنے مواد اور معیار کے حوالے سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔آپ بوریوالا میں بیٹھ کر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔اس کے لیے اہلِ نظر کو آپ کا ممنون ہونا چاہیے۔

''عملِ قرأت اور علم و ذوق'' اور ''اَج آ کھاں وارث شاہ نوں'' دونوں فکر انگیز تحریریں ہیں۔حمد و نعت میں' ریاض مجید' خورشید بیگ میلسوی' ستیہ پال آنند اور محمد امین نے متاثر کیا۔

کہانیوں میں' ڈاکٹر رشید امجد' مشرف عالم ذوقی' محمد حامد سراج اور اسلم قریشی کی کہانیوں نے رُوح کے تاروں کو چھیڑا۔

''حریم ادب'' کے اس کتابی سلسلہ میں محمد حامد سراج کا مکالمہ بعنوان ''بیدل حیدری کے ساتھ ایک زندہ دوپہر'' جاوید حیدر جوئیہ کا ''اکبر حمیدی سے مکالمہ'' اور نذر خلیق کا ''جرمنی میں مقیم معروف شاعر اور ادیب حیدر قریشی سے انٹرنیٹ کے ذریعے مکالمہ'' خاصے کی تحریریں ہیں۔یہ تینوں انٹرویوز عہد حاضر کے عمدہ تخلیق کاروں کے علمی' ادبی اور معاشرتی نظریات کو نہایت سلیقے کے ساتھ ہمارے سامنے لاتے ہیں۔محمد حامد سراج'

جاوید حیدر جوئیہ اور نذر خلیق ہمارے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہی حضرات کی بدولت ہم عہد حاضر کے عمدہ تخلیق کاروں، بیدل حیدری، اکبر حمیدی اور حیدر قریشی کے نظریات سے آگاہ ہوئے۔

ن۔م۔راشد نئی نظم کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ جن کی تفہیم کا سلسلہ اب باقاعدگی کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ناصر عباس نیر کا مقالہ ''راشد کا نیا آدمی'' قابلِ مطالعہ مقالہ ہے۔ انہوں نے راشد کے ''نئے آدمی'' کے خدوخال کو ہنرمندی کے ساتھ اُبھارا ہے اور اسے ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اسی طرح تحسین زہرا کا مقالہ ''ن۔م راشد کا نیا انسان'' محنت سے لکھا گیا ہے۔

فکری مباحث میں ''ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی' ڈاکٹر احمد سہیل اور اسلم حنیف نے متاثر کیا۔ یہ تینوں اصحاب عہد حاضر کے سنجیدہ اور معیاری لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کے مقالات فکر اور بحث کی نئی راہیں سجھاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے ''چودھویں کی چاندنی کے سے چودہ خطوط'' میں ''معاصر'' میں بھی پڑھ چکا ہوں' معاصرین اور مشاہیر کے درج بالا خطوط نے دوبارہ لطف دیا۔ یقیناً قاری انھیں پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے۔

شعری ونثری تخلیقات کا اس طرح جائزہ لینا کہ ان کے محاسن ومعائب کھل کر قاری کے سامنے آجائیں بہت کڑا تخلیقی مرحلہ ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن' اقبال جمیل' محسن بھوپالی' جمیل احمد عدیل' توقیر تقی' سیّد تحسین گیلانی اور محمد مظہر نیازی نے مختلف شعری ونثری تخلیقات کا خوبصورتی کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور اس کڑے تخلیقی مرحلے سے بخیر وخوبی گزرے ہیں۔ ثمینہ راجا نئی اُردو نظم کی عمدہ شاعرہ ہیں ان کی تخلیق ''عدن کے راستے پر'' کے حوالے سے جمیل احمد عدیل کا جائزہ بہت عمدہ جائزہ ہے۔ قطعات کے حصہ میں ڈاکٹر خیال امروہوی اور جاوید حیدر جوئیہ کے قطعات اچھے لگے۔

غزلیات میں' ظفر اقبال' ناصر شہزاد' افتخار عارف' حیدر قریشی' صابر ظفر' معین تابش' خورشید بیگ میلسوی' خالد اقبال یاسر' ناصر زیدی' اعجاز توکل' خاور اعجاز' ناصر بشیر' عابد خورشید' سعید اقبال سعدی' شناور اسحاق' طاہر شیرازی' محمد مظہر نیازی' جعفر بلوچ' اشفاق بابر' علی حسین جاوید' غضنفر عباس سیّد' رابعہ سرفراز' احمد سلیم رفی' عمران حیدر تھہیم' توقیر تقی کی غزلیات پسند آئیں۔ جعفر بلوچ ہمارے عہد کے عمدہ شاعر وادیب ہیں۔ ''اقلیم بیعت'' اور ''آیاتِ ادب'' کے خالق جعفر بلوچ کو غزلیات کے حصہ میں نامناسب جگہ دی گئی ہے۔ حصہ نظم میں' ستیہ پال آنند' وزیر آغا' شہزاد احمد' امین راحت چغتائی' ادیب سہیل' رفیق سندیلوی' خاور اعجاز' محمد فیروز شاہ' محمد افسر ساجد' احمد سہیل' مظہر نیازی' محمد افضل مجید شہیر' ثناء اللہ ظہیر' توقیر تقی' سیّد تحسین گیلانی اور سیّد معراج جامی نے متاثر کیا۔ پنجابی ادب میں حنیف حنفی' قیصر نجفی' سلطان کھاروی' بشریٰ رحمان' عبدالقدوس کیفی' خاقان حیدر غازی' ستیہ پال آنند' کلیم شہزاد کی تخلیقات اچھی لگیں۔

شگفتہ نازلی/لاہور

''حریم ادب'' کا کتابی سلسلہ نمبر۲ اپنی ساری سج دھج کے ساتھ' جنوری کے اواخر میں نئے سال کے ادبی اُفق پر دیگر جرائد کے ساتھ' نیک شگون بن کے اُبھرا۔۔۔ سرورق کے رنگ کئی جہات سمیٹے ہوئے ہیں جو بولتے ہوئے۔۔۔ مسکراتے ہوئے۔۔۔ اور۔۔۔ گنگناتے ہوئے لگتے ہیں اور بجا طور پر معزز تخلیق کار۔۔۔ انتساب کا استحقاق رکھتے ہیں۔۔۔!

اردو منزل اور پنجاب وہیڑا کے مندرجات پہ نظر ڈالتے ہوئے۔۔۔ دونوں زبانوں کی مختلف اصناف نظم ونثر کی شمولیت۔۔۔ نہ صرف تنوع کا احساس دلاتی ہے۔ بلکہ۔۔۔ مختلف اسالیب کی شعری ونثری کاوشوں کو قاری کے مطالعے کے لیے یکجا بھی کرتی ہے جو یقیناً علمی توسیع کے خوشگوار تاثر کو برقرار رکھتی ہے۔۔۔

''لمس ماضی'' میں گزشتہ مرتبہ شخصیت اور اس مرتبہ منفرد جہت۔۔۔ ''چودھویں کی چاندنی کے سے چودہ خط'' کے مطالعے سے متعلقہ۔۔۔ گنج ہائے گرانمایہ۔ سے مستفید ہونے کا اعزاز ملا۔۔۔ یوں بھی مراسلوں سے کبھی کبھی نہایت نایاب پہلو منظر عام پر آتے ہیں۔

گزشتہ کتابی سلسلے کا' دستک' کا پیٹرن تعارف وتفہیم کے اعتبار سے زیادہ اپیل رکھتا ہے۔ کیونکہ۔۔۔ تخلیقات کے ساتھ تخلیق کاروں کے نام۔۔۔ کسی بھی صنف کو منتخب کرنے کے لیے سہل بنا دیتے ہیں جبکہ دیگر عنوانات پر بھی نظر پڑ جاتی ہے۔۔۔ مختلف اصناف کے مذکورہ عنوانات۔۔۔

قطعات' افسانے' انٹرویو اور انشائیے' بالخصوص محلِ نظر ہیں۔۔۔ان کو جزوی طور کی بجائے کلی طور پہ اکائی کی صورت میں قطعات' افسانے' انٹرویو' انشائیے کی ترتیب سے' مستطیل بلاکس میں کمپوز کروائیے تو بہت بہتر تاثر دیں گے۔۔۔

نظموں میں محترم آغا جی کی۔۔۔''روشنی سے بات کر کے دیکھ لی''۔۔۔اور۔۔۔''چلو اک بار پھر ہم''۔۔۔متنوع مفاہیم اُجاگر کرتی ہیں۔۔۔طنز و مزاح میں دونوں تحریریں۔۔۔دلچسپ اور اچھی کاوشیں رہیں۔۔۔اور۔۔۔ابھی پڑھے گئے انشائیوں میں سے۔۔۔جادونگری' رنجش' آئینہ اور ہونا نہ ہونا' نے اپنے موضوعات کی مختلف طرز سے توجیہات کیں۔۔۔

آپ کی غزلیات سے چند اشعار کا تذکرہ ضروری ہے اگر چہ بحیثیت مجموعی بھی نہایت اچھا تاثر دیتی ہیں۔

یہ کس نظام کی تشکیل ہو گیا ہوں میں — مری زباں مرے اندر سے بولتا ہے کوئی
یہ آبشار ہے' دریا ہے یا سمندر ہے — رواں دواں مرے اندر سے' بولتا ہے کوئی

اُس نے کہا کہ آج ہوا کتنی تیز ہے — مَیں نے کہا کہ دیکھ یہ جلتا دِیا گیا
کیا حرفِ حق کی بات کریں کیا ہوا اُسے — پیغمبر اپنے شہر میں جھٹلا دیا گیا

اور۔۔۔گیلانی صاحب کی نظم۔۔۔''کن'۔ بھی پسندیدہ رہی۔

کتابوں پر تبصرے نے منظر عام پہ آنے والی نئی کتب سے روشناس کرایا اور داد و تحسین کے زمرے میں سر دست ''مقتدرہ قومی زبان اور اُردو'' سے آگہی پائی۔

انگریزی حصے میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند صاحب کی I will come back india جناب محسن بھوپالی کی۔۔۔ the murder of tree' حامد برگی صاحب کی Call of the old house' شاہد علی خاں صاحب کی The Land of Peace' اور اکبر حمیدی صاحب کے انشائیے The Zeropoint کا ترجمہ خاص طور پر پسند آئے۔ Tresh meanings کی قریبی اشاعت بھی باعثِ مسرت ہے۔۔۔

اور ''حریم ادب'' کے بیک ٹائٹل پر منزل واٹر کی نسوانی تشہیر ادبی جریدے سے مطابقت نہیں رکھتی۔۔۔اس کی بجائے۔۔۔اگر ہر کتابی سلسلے کے ساتھ۔۔۔قومی یا عالمی ادب سے کچھ انتخاب شائع کیا جائے تو زیادہ مستحسن اور ذہنی ترفع کے لیے بھی معاون ثابت ہوگا۔۔۔

شگفتہ الطاف / بہاولپور

کیا حرفِ حق کی بات کریں' کیا ہوا اُسے
پیغمبر اپنے شہر میں جھٹلا دیا گیا

ایسا نہیں کہ یہ شعر آپ کا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ بہت خوب کہا ہے۔''حریم ادب 2'' کے مطالعے سے لطف آیا۔ غزلیں' نظمیں' تنقید' انشائیے و افسانے سبھی خوب ہیں مگر ن۔م۔راشد کی شخصیت و فن کے حوالے سے ناصر عباس نیر اور تحسین زہرا کی تحریریں پسند آئی ہیں۔ادھر افتخار عارف کا یہ شعر

تماشا کرنے والوں کو خبر دی جا چکی ہے
کہ کب پردہ گرے گا کب تماشا ختم ہوگا

یہ بھی نہیں کہ بے حسی اہلِ قلم میں ہے
لیکن یہ سچ ہے جراَتِ اظہار کم میں ہے (مرتضٰی برلاس)

اندر اندر دمکتا رہتا ہے
ہو نہ یہ بھی کوئی ستارہ کام (ظفر اقبال)

اس بے رخی کا ردِّ عمل دیکھنا سلیم
کچھ روز بھول جا اے صبر و قرار کر (صفدر سلیم سیال)

لوٹ آئے گا وہ کبھی نہ کبھی
پر یقیں بھی مرا گماں تک ہے (کرامت بخاری)

ایسے تمام اشعار سے طبیعت خوش ہوئی۔
علی حسین جاوید "دریچے جاگتے ہیں" عارف کا یقین دونوں تبصرے پڑھنے کے لائق تھے۔ جدید غزل کے تازہ جھونکے خوشگوار معلوم ہوئے۔

لذت ہجر کی تجھ پر بھی حقیقت کھلتی
تو بھی اے کاش پرندوں سے محبت کرتا (علی حسین جاوید

کچھ ایسا خوف سا پھیلا دیا ہے ظالم نے
ہمارے شہر کے بچے بھی اب نہیں ہنستے (عارف شفیق

مجھ کو یقیں ہے میرے عہد کے دانشور
اب تک تھے خاموش مگر اب لکھیں گے (عارف شفیق)

انگریزی ادبی گوشہ جدید فکری رجحانات کیلئے ترغیب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے امکانات روشن دکھائی دیتے ہیں۔ اس شمارے کا نہایت دلچسپ حصہ "مابعد جدیدیت" سے متعلق ہے۔ دیکھنا ہے کہ تنقید و مباحث کس نتیجہ تک پہنچتے ہیں۔ مختصر یہ کہ "حریم ادب" کی کاوش کے لیے ہدیۂ تحسین!

حنیف باوا/ جھنگ

آپ "حریم ادب" متواتر بھیج رہے ہیں یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔ اس لیے کہ "حریم ادب" کی وساطت سے آج کے اردو اور پنجابی ادب سے جڑا رہتا ہوں۔ اس کے تازہ شمارے میں اردو ادب کی دو اہم شخصیات جناب بیدل حیدری اور جناب اکبر حمیدی کے انٹرویوز پڑھ کے بہت لطف آیا۔ اُن کی باتوں نے مجھے بہت سی نئی معلومات فراہم کیں۔۔۔ ویسے تو "حریم ادب" کی تمام تخلیقات بہت معیاری ہیں لیکن خاص طور پر افسانوں میں مشرف عالم ذوقی کا "اک گاؤں ابھی بھی شہر میں ہے" اور حامد سراج کا "آخری آئس کیوب" بہت اچھے لگے۔۔۔ خاص طور پر ان میں جو پیرایۂ اظہار اختیار کیا گیا ہے اس میں بڑی نویکلتا ہے۔ انشائیوں میں سلیم آغا قزلباش کا "رنجش" اور شفیع ہمدم کا "آئینہ" بہت خوب ہیں۔ مقالات میں "راشد کا نیا آدمی" کمال کی چیز ہے۔ اس مقالے میں ناصر عباس نیر کا وسیع مطالعہ جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

شبہ طراز/ لاہور

پہلی مرتبہ "حریم ادب" ملا۔ بہت خوشی ہوئی یہ دیکھ کر لاہور سے دُور بورے والا میں ادب کا چراغ روشن ہے اور اس کی روشنی تمام ملک میں پھیل کر قلم کو توانائی بہم پہنچا رہی ہے۔ شمارہ ضخیم ہے اور میری پڑھنے کی رفتار سست کہ ادب کے علاوہ زندگی میں پھیلے ہوئے بے شمار کام ہیں جن کو بروقت نمٹانا میری ذمہ داری ہے۔ آپ کو "بزعم خود" جلدی جواب دو وجوہات کی بنا پر دے رہی ہوں۔ ایک تو یہ کہ میرا پتہ تبدیل ہو چکا ہے آئندہ نئے پتے پر رابطہ کیجئے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ "حریم ادب" بذریعہ وی پی بھجوا سکتے ہوں تو برائے مہربانی بذریعہ وی پی بھجوا دیں میں وصول کرلوں گی اس سے محروم مت کیجئے۔

بازغہ قندیل/ فیصل آباد

اُمید ہے بخیریت ہوں گے۔۔۔ پہلے بھی "حریم ادب" کے لیے خط لکھا جو شائد ڈاک والوں کو اتنا پسند آیا کہ آپ تک پہنچا نہیں۔ (یہ حامد

سراج انکل نے بتایا تھا کہ آپ کو ڈاک نہیں ملی) پہلے تو شکریہ۔ رسالہ بھجوانے سے زیادہ رسالے کی اشاعت پر۔ وہ اس لیے کہ آج کل کے دور میں کسی نئے ادبی میگزین کا اتنے طمطراق سے آنا خوشی کے ساتھ ساتھ باعثِ حیرت بھی ہے۔ اللہ آپ کو مزید استقامت دے تاکہ ادبی تاریخ میں ''حریم ادب'' کا نام ہمیشہ جاوداں رہے (آمین) ''حریم ادب'' کی یہ بات اچھی اور منفرد لگی کہ اس کے جملہ حقوق کے حوالے سے جو اپنے کہا تھا کہ حوالے کے ساتھ اس کا کوئی بھی جُز شائع یا جا سکتا ہے' جس سے آپ کی سوچ' ادبی عزائم اور ادبی گروپوں سے دُوری کا خوش گوار احساس ہوتا ہے۔ ''حریم ادب'' قلیل عرصے مگر سخت جدوجہد کے بعد بالآخر اپنا مقام بنا چکا ہے اور کسی بھی طور سے بڑے بڑے ادبی رسائل کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ کبھی خاص ہے اور افسانے کا حصہ بے حد متمول ہے اور شاعری تو ایسا سلسلہ ہے جو خاص جاذبیت اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ''عملی تنقید'' کو جاری رہنا چاہیے یہ بہت قابلِ ذکر حصہ ہے۔

ڈاکٹر خان محمد ساجد / ملتان

حریم ادب کتاب II موصول ہوئی۔ حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ بورے والا جیسے شہر سے اس قدر معیاری ادبی سلسلہ شروع ہوا۔ حالانکہ اس شہر کی شہرت زیادہ تر اس کی صنعتی ترقی کی بدولت ہے۔ دوسری حیرت اس بات پر ہوئی کہ مرتبین میں آپ جیسے لوگ ہیں جن کا شعبۂ طب سے تعلق ہے۔ گویا آپ لوگوں نے جسمانی مسیحائی سے ذہنی اور روحانی مسیحائی کی طرف سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ جو یقیناً خوش آئند ہے۔ اردو زبان کے ساتھ ساتھ پنجابی' سرائیکی اور انگریزی تخلیقات کا انتخاب بہت ہی قابلِ ستائش ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقامیت اور بین الاقوامیت کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ جذبہ بہت بلند ہے اور آج کی ضرورت بھی۔ اس وقت عالمی سطح پر ہماری تہذیب و تمدن کے بارے میں بے شمار غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور ہمیں ارتقائی میدان میں پچھڑے ہوئے انسان تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ تہذیبِ انسانی کا موجودہ عروج ہمارے بزرگوں کی کوششوں کے طفیل ہی۔ ہمارے اسلاف کی علمی و ادبی کاوشوں نے ہی انسانی ضمیر کی تکوین کی ہے۔ جب یورپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا تو ہمارے ہاں بابا فریدؒ' بابا نانک' بھگت کبیر جیسے چراغ جگمگا رہے تھے۔ ہمارا دورِ جدید و ماضی قریب بھی علمی اور ادبی لحاظ سے غریب نہیں ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ ہماری تخلیقات وہاں تک نہ پہنچیں۔ یا اگر پہنچیں بھی تو ہمارے لوگوں سے نہیں بلکہ اُن لوگوں سے جنہوں نے اُن کی من مانی تفسیر و توضیح کی۔۔۔ جس سے سوائے بدگمانیوں کے کچھ حاصل نہ ہوا۔۔۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری تخلیقات اصل اوصاف کے ساتھ وہاں تک پہنچیں۔ موجودہ کوشش اسی سلسلے میں انتہائی ممد ہوگی۔

پروفیسر پرویش شاہین / سوات

''حریم ادب'' کتاب نمبر ۲ موصول ہوئی۔ یاد فرمائی کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ کا خلوص' جذبۂ محنت اور شاندار کاوش صد قابلِ تحسین و آفرین ہے۔ شمارہ نمبر ۲ بذاتِ خود ایک اچھا' جاندار اور بھرپور شمارہ ہے۔ تمام لکھاری حضرات و خواتین قابلِ داد ہیں۔ شمارہ نمبر ۱ کے بارے میں جتنے خطوط آپ کو ملے ہیں اور جن اچھے' شاندار اور دلربا الفاظ میں قارئین نے آپ کی پہلی کاوش کو سراہا ہے۔ یقیناً آپ کام کے آدمی ہیں اور کام بھی آپ کا ایک اچھا کام ہے۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔

غوث متھراوی / کراچی

''حریم ادب'' کا دوسرا شمارہ کوئی عرصہ بیس روز سے زیرِ مطالعہ رہا۔ اب کہیں جا کر آخری صفحہ کو خیر باد کہا اس دوران مطالعہ کی طرف رغبت کم رہی۔ وجہ یہ کہ موسمی بخار کھانسی اور زکام نے پچھلے ماہ سے گھر میں ڈیرہ جمایا ہوا ہے۔ پہلے یہ بیماریاں بیگم صاحبہ پر حملہ آور ہوئیں اور پھر غالباً اُن سے ہماری طرف منتقل ہو گئیں۔ یوں سمجھیے کہ ہم پچھلے تین ہفتوں سے مستقل صاحب فراش ہیں اور وہ بھی عالم نقاہت میں' چونکہ کچھ پڑھے بغیر نیند نہیں آتی تو اس دوران حریم ادب ہی سرہانے رہا اور تفصیلی مطالعہ کا موقع ملا۔ آہستہ آہستہ سارا رسالہ یعنی پنجابی اور انگریزی کا حصہ بھی پڑھ ڈالا۔ کمزوری کے سبب تفصیلی تبصرے کی ہمت نہیں ہو رہی۔ مختصراً عرض کروں گا۔

پہلی بات تو یہ کہ آپ اور آپ کے معاونین نے رسالے کے مشمولات کے معیار کو برقرار رکھنے' معیاری مواد فراہم کرنے اور اس کو سلیقے سے ترتیب دینے میں یقیناً عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ دوسرا شمارہ ماشاء اللہ پہلے شمارے سے بھی زیادہ تابناک' دلچسپ اور وقیع نگارشات سے مملو ہے۔ میرے جانب سے دِلی مبارکباد! دوسری بت یہ کہ رسالے کے اٹھان' اس کی پروف ریڈنگ پر پوری پوری توجہ' ترتیب وتزئین کے بین الطسور قومی امکانات کی جھلک' یہ اشارہ دے رہی ہے کہ آپ کا یہ رسالہ بند ہونے کے لیے نہیں نکالا گیا۔ یہ انشاء اللہ جاری وساری رہے گا اور ہماری دُعائیں آپ کے لیے اور رسالے کی دن دُگنی' رات چوگنی ترقی کے لیے یہ لمحہ یوں سمجھئے کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

ریاض احمد/لاہور

''حریم ادب II'' کل تقریباً اسی وقت 2:30pm موصول ہوا۔ جذبہ تشکر نے تقاضا کیا کہ فوراً (شکریہ ادا کروں لیکن ساتھ ہی مندرجات کی فہرست پر بھی نظر دوڑ رہی تھی۔ آپ کا ''اطراف'' اس جذبہ پر غالب آ گیا۔ آپ کہاں سے چلے کہاں پہنچے اور وہ بھی بغیر کسی If اور But کے، اس سیدھی لکیر پر میں بھی آپ کے پیچھے چلتا رہا اور پھر جو وہاں سے بھٹکا ہوں تو مناظر کی نیرنگی میں ایسا کھویا کہ وہ ارادہ از خود فسخ ہو گیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کا قول یاد کیجئے!

بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یاد رکھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ میری چند ''ٹوٹی پھوٹی'' سطریں بھی شاملِ اشاعت کر لیں۔ حالانکہ اب دیکھتا ہوں تو دوسری منظومات کے مقابلے میں وہ اس قابل نظر نہیں آتیں کہ حریم ادب میں جگہ پاتیں۔

پنجابی کا حصہ پوری طرح نہیں پڑھا کہ خالص ''پینڈو'' ہونے کے باوجود پنجابی تحریر تیز رفتاری سے نہیں پڑھ سکتا۔ انگریزی حصے کے صفحات ۱۸۔۱۹۔۲۲ کسی فنی خرابی کے باعث پڑھے نہیں جا سکے۔ مضمون کا لطف ضائع ہو گیا۔

جاوید اختر بھٹی/ملتان

حریم ادب مل گیا۔ آپ نے اور جناب تحسین گیلانی صاحب نے بہت شاندار رسالہ مرتب کیا ہے۔ پہلی نظر میں ''فنون'' اور ''اوراق'' کا گمان ہوتا ہے۔ یہ حسن انتخاب اور حسن ترتیب کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

آپ نے ڈاک کے بہت زیادہ اخراجات برداشت کر لیے۔ کسی ایک دوست کے پاس آ جاتا وہ سب کو تقسیم کر دیتا۔

بہر حال۔۔۔ بہت شکریہ۔ اس شاندار اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

افسر ساجد/فیصل آباد

آپ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہیں)۔ آپ بڑے شہروں سے ہٹ کر ایک چھوٹے سے شہر میں ادب کے لیے قابلِ قدر کام انجام دے رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے تمام قلمکار آپ سے (پرچے کی تشکیل میں) مقدور بھر تعاون بھی کر رہے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند امر ہے۔

حصہ اردو کی فہرست میں نام درج نہیں ہیں۔ انگریزی کی پروف ریڈنگ خصوصی توجہ کی طالب ہے۔

غزل کے باب میں ظفر اقبال' افتخار عارف' صفدر سلیم سیال' مناظر عاشق ہرگانوی' معین تابش' خالد اقبال یاسر' کرامت بخاری' قاسم جلال' سعید اقبال سعدی' شگفتہ الطاف' رابعہ سرفراز' علی حسین' جاوید' سید تحسین گیلانی اور جاوید حیدر جوئیہ کو میں نے توجہ سے پڑھا اور پسند کیا۔

وزیر آغا' شہزاد احمد' رفیق سندیلوی اور فیروز شاہ نظم کے حصے میں متاثر کرتے ہیں۔ سلیم آغا قزلباش اور شفیع ہمدم کے انشائیے بھی خوب ہیں۔ تنقید کے ضمن میں ڈاکٹر احمد سہیل' اسلم حنیف اور مناظر عاشق ہرگانوی کا کام قابلِ قدر ہے۔ سجاد مرزا کی پنجابی غزل میں تازگی ہے۔ ستیہ پال آنند اردو' پنجابی اور انگریزی' سب حصوں میں نمایاں اور منفرد ہیں۔ ناصر عباس نیر تنقیدی مباحث میں خاصے مہجور ہو گئے ہیں۔

سارے رسالے پر آپ کے ذوق وشوق کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے اردو کے علاوہ آپ کی انگریزی دانی قابلِ توصیف ہے۔

اکرام تبسم / میر پور خاص

آپ کو اتنا خوبصورت رسالہ نکالنے پر مبارکباد۔۔۔ادب کے اس قحط سالی کے دور میں آپ جیسے لوگ ہی آنے والی نسلوں کے لیے مینارا نو ہے۔ جن سے روشنی حاصل ہوتی رہے گی اس گرانی کے دور میں جب ادبی پرچے بند ہوئے جا رہے ہیں۔ اپ نے اتنا صحت منداور خوبصورت پرچہ نکالنے کی ہمت کی جو قابل تعریف ہے۔

ایک خاص بات یہ کہ آپ نے ایک نیا انداز اختیار کیا ہے۔ اس وضع کا غالباً یہ پہلا پرچہ ہے۔ جس میں اردو، پنجابی اور انگریزی تخلیقات ساتھ ساتھ شامل کی گئی ہے۔ یقیناً یہ ایک قابل قدر بات ہے۔ اردو کے حوالہ سے خاص طور پر جو فکری مباحث آپ نے شامل کیے ہیں وہ قابلِ ذکر ہیں۔

ایسے مباحث کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ قاری کو یہ چیزیں کم کم پڑھنے کو ملتی ہیں۔ غزلوں اور نظموں کا حصہ بہت جاندار ہے۔

افسانے بہت اچھے ہیں خاص طور پر مشرف عالم ذوقی کا افسانہ ''ایک گاؤں ابھی بھی شہر میں ہے'' ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ ''ٹھہری ہوئی کہانی'' سید معراج جامی کا خاکہ ''خامِ انگشت بدنداں ہے'' غرض یہ کہ کس کس کی تعریف کروں حصہ نثر ہو یا نظم سب بھی بہت خوب ہے۔

پنجابی اور انگریزی کا حصہ بھی بھر پور ہے کہ اتنی تھوڑی جگہ میں آپ نے کافی کچھ سمو دیا ہے۔ ایک عرضداشت یہ ہے کہ نئے لکھنے والوں کو بھی اگر حریم ادب میں جگہ ملیں گی تو اچھا ہوگا مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقتوں میں ''حریم ادب'' ادب میں اپنی ایک شناخت بنائے گا اور اسے قائم رکھے گا۔

عبدالقدوس کیفی / چشتیاں

کہندے نیں ''دل کو دل سے راہ ہوتی ہے'' رات نوں میں سوچ رہیا ساں کہ میں یا تے بورے والا خود جاواں یا پھر کل ضرور خط لکھاں گا۔ صبح تہاڈا Message آ گیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ کافی دِناں توں میں بیماری دا شکار ساں اتے اُتوں موٹر سائیکل توں ڈگ پیا۔ اللہ دا شکر اے کہ ہڈی توڑ نہیں ہوئی۔ اجے سٹاں لگیاں نیں۔ دُعا کریا جے پہلاں تے دُوجے شمارے بارے کجھ سچیاں تے کھریاں گلاں۔

میں اپنی حیاتی وچ جنے وی رسالے' میگزین ویکھے پڑھے نیں۔ حریم ادب نوں سب توں وکھرا تے ودھیا پایا اے۔ ایہ خوشامد نہیں۔ حقیقت اے۔ اِکو کتاب وچ تن زباناں دی لذت' انگریزی' اردو تے پنجابی۔ ہوسکدا اے کتے ہور اسراں دا میگزین چھپیا ہووے پر اج تک میری نظر چوں نہیں لنگھیا۔ ایس لئی تسیں تے تہاڈے سارے متر مبارکباد دے حقدار نیں۔

شاعری وچ وکھو وکھ صنفاں دا ورتارا۔ غزل' نظم' ماہیا' ہائیکو' مرثیہ' کہانی' افسانہ' انشائیہ' انٹرویو' فکری مباحث' تنقید کیہ کجھ نہیں۔ پر پنجابی حصے نوں ویکھ دُکھ ضرور ہویا کہ پنجاب چوں چھپن والے ایس جریدے وچ پنجابی شاعراں ادیباں نے اُکا ای حصہ نہیں پایا۔ ایہہ دُکھ والی ای نہیں فکر والی گل اے۔

بہر حال تہاڈا شکریہ کہ تسیں میں جہے نکے بندے نوں وی یاد رکھدے او۔ نہ تے میں شاعر آں تے نہ ادیب۔ ایویں دل دے ساڑھے کڈھدا رہناں۔

مینوں مان اے تہاڈے تے کہ تسیں ایس نفسانفسی دے دَور وچ وی ادب لئی ویلا کڈھدے او۔ بلکہ قلمی جہاد کر رہے او۔ ایہدا اجر تے تہانوں اللہ ای دیوے گا۔

ساڈے لئی جو حکم ہووے سر متھے تے۔ ساڈی قوم تے ایس کھیتر وچ پہلاں ای بہت پچھے اے۔ ایس لئی وی تہاڈی عزت تے تہاڈا ساتھ دینا ساڈے تے فرض اے۔

اپنے سارے بجناں بیلیاں نوں میرا اسلام آکھیا جے۔ اک گزارش اے۔ کسے طرحاں ادبی تنظیم ''روش'' دے سجاد احمد سجاد نوں میرا فون نمبر پہنچا دیو کہ اوہ میرے نال گل کر لوے۔ کیوں جے میرے کول اوہدا نمبر نہیں اے۔ اتے سنیا اے کہ اوہ کتاباں دے چکر وچ سفر وچ رہندا اے۔ ایس لئی میرا بورے والہ آنا وی بے فائدہ ہووے گا۔ باقی تہاڈی خدمت وچ حاضری دین لئی تے سپیشل طور تے آواں گا۔

پروین فنا سیّد / راولپنڈی

پہلے آپ کا خط ملا' پھر خوبصورت رسالہ۔ چند نجی وجوہات کی بنا پر خط کا جواب نہ دے سکی۔ معذرت خواہ ہوں۔ منیر نیازی تو کہتے ہیں

''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں۔'' لیکن میرے ساتھ یوں ہے۔

کہ ''ہمیشہ دیر ہو جاتی ہے۔'' چند چیزیں حریم ادب کے لیے کچھ چیزیں لکھ رکھی ہیں۔ ''حریم ادب'' خالص ادبی رسالہ ہے اور چند ادبی رسالوں میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ ایسے ادبی رسالے شائع کرنا خاصہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ خدا اس رسالے کو زندگی دے اور آپ کو ہمت۔

''حریم ادب'' کی ٹیم کو میری جانب سے مبارکباد دیجئے۔

اوجِ کمال/ کراچی

''حریم ادب'' کا دوسرا شمارہ مجھے آج ہی ڈاک سے ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ پنجاب کے ایک چھوٹے سے علاقے سے کس قدر اہم اور معتبر پرچہ جاری ہوا ہے۔ اس مبارکباد کے آپ سزاوار ہیں۔

اگر پرچے پر سالانہ زرتعاون بھی شائع کر دیا جائے تو اچھا ہوگا اس طرح وہ احباب جو زرتعاون دینے کے خواہشمند ہیں وہ اپنا کردار بخوبی ادا کریں گے۔ میں آپ کو ماہنامہ دنیائے ادب بطور اعزازی بھیجتا رہوں گا تاہم اپنی جانب سے زرتعاون کی پیشکش کرتا ہوں اس لیے کہ آپ ایک بڑا کام کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کے شوقِ سفر کو اسی ولولے سے جاری رکھے۔ آمین

آپ جیسے احباب' ادب کے طالب علموں کی تربیت کرتے ہوئے سمت نمائی کر رہے ہیں۔ حریم ادب میں وہ سب کچھ ہے جس کی ایک سنجیدہ طالبِ ادب کو ضرورت ہے۔ اس میں سب سے اہم حصہ پنجابی زبان وادب کا ہے۔ میں ہمیشہ سے ماں بولی زبان کے فروغ کا خواہش مند رہا ہوں۔ بنیادی طور پر کسی بھی تخلیق کار کی بنیادی شناخت اُس کی مادری زبان ہوتی ہے۔ میں ہر اُس اہم شخص سے انٹرویو لیتے ہوئے اُس سے یہ سوال ضرور کرتا ہوں کہ ''اردو سے کمائی جانے والی شہرت اور نام ونمود کے سائے میں آپ نے اپنی مادری زبان کا بھی حق ادا کیا ہے یا نہیں'' ہمارے بیشتر عالمگیر شہرت یافتہ ادیب' شاعر و دانشور اپنی ماں بولی زبان میں لکھنے سے کتراتے ہیں محض اس لیے کہ اُس زبان کی عالمگیر شناخت یا وسعت نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ طمانیتِ قلب کے لیے اتنی طوالت میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماں کا حق ادا کرتے ہوئے اِن احتیاطوں کی ضرورت قطعی نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ آپ کو خوش رکھے' کسی بھی مرحلے پر میری ضرورت محسوس کریں بس حکم دیجئے' اپنا خیال رکھیے اور دُعاؤں میں یاد رکھیے۔

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہجہان/پشاور

آپ کا عنایت کردہ شمارہ آج موصول ہوا۔ ''کتاب میلہ'' دیکھنے لاہور گئی ہوئی تھی۔ اس لیے آپ کی عنایت دیر سے موصول ہوئی۔ آپ نے سالانہ چندہ کے بارے میں نہیں لکھا کہ میں روانہ کر سکوں۔ جلد اپنا مضمون بھی ارسال کروں گی۔

آپ کا ادبی پرچہ ہر لحاظ سے قابلِ توجہ ہے۔ مضامین کے انتخاب میں آپ کی دلچسپی عیاں ہے اس کے علاوہ شعری انتخاب بھی عمدہ ہے۔ نئی مطبوعات کا تعارف اور تبصرہ بھی شامل ہوں تو اچھا ہے' اس کے علاوہ انڈیا سے شائع ہونے والی نئی کتب کی تفصیل اور قیمت اس رسالے کا حصہ بنیں تو یہ اس کی انفرادیت کو مزید بڑھائیں گی۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن سے براہِ راست تلمذ تو نہیں پایا لیکن ان کی شفقت اور مہربانی نصیب ہے۔

ان کی نئی کتاب ''چند عزیز اور حفیظ شخصیتیں'' میں ایک صفحہ ناچیز کے لیے بھی ہے۔ ان کی قدردانی کے لیے ممنون ہوں۔ ان کے خطوط کا بہت اچھا انتخاب رسالے میں شامل کیا گیا ہے۔

مسعود چودھری/لاہور

احباب کے اختلافات میں آپ کے جوابات پڑھے خوب ہیں۔ دکھیا پنجابی میں مذکر استعمال ہوتا ہے اور دُکھی مؤنث اور مذکر دونوں طرح سے۔ حصہ پنجابی کو بھی نثر سے سجائیں۔ لوک اور کلاسیک مضامین کی بڑی گنجائش ہے۔ سیّد تحسین گیلانی' عمران حیدر تھہیم' توقیر تقی' جاوید احمد بھٹی' کلیم شہزاد ایڈووکیٹ و دیگر احباب کی خدمت میں سلام کلیم شہزاد صاحب پنجابی نثر میں حصہ لے سکتے ہیں۔

طاہر شیرازی/ڈیرہ اسماعیل خان

''حریم ادب'' کی صورت میں آپ کا محبت نامہ ملا۔ وہ یوں کہ اس ادبی مجلّہ میں قارئین کے لیے محبتیں ہی محبتیں ہیں۔ یقیناً حریم ادب آسمانِ ادب کے درخشندہ ستارے کی مثال ہے۔ رسالے میں اہلِ قلم کی بھرپور شرکت اس بات کی عکاس ہے کہ آپ اہلِ قلم اور اہلِ قلم آپ کو پذیرائی بخش رہے ہیں اور یہ بات آپ کے ادبی مقام کی غماز ہے کہ محترم ڈاکٹر وزیر آغا اور متعدد بڑے قلم کار ''حریم ادب'' میں شامل ہیں۔ بیدل حیدری مرحوم کا انٹرویو خاصے کی چیز ہے۔ حامد سراج اپنے تحریروں کی طرح شفاف اور سلجھے ہوئے انسان ہیں اور وہ کسی سے ملاقات کو یادگار انٹرویو میں ڈھال سکتے ہیں۔ حریم ادب کے شعری اور نثری مواد کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت آپ پر مہربان ہے۔۔۔ اپنا کلام آپ کو ای۔میل بھی کردوں گا۔

عبدالعزیز خالد/لاہور

حریم ادب II ملا۔ اس کرم فرمائی کا ممنون ہوں۔

کس سج دھج، کشادہ خیالی اور روشن نگاہی سے آپ نے یہ دلکش و دلکشا مرقع مرتب کیا ہے! جزاک اللہ!

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار

خدا کرے کہ یہ ادبی سلسلہ اسی آب و تاب سے جاری و ساری رہے!

سجاد مرزا/ گوجرانوالہ

''حریم ادب'' آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی ہمتوں اور کاوشوں اور محنتوں کا ایک ایسا حسین گل دستہ ہے، جس میں متنوع رنگوں کے پھول سجائے گئے ہیں۔ قابلِ مطالعہ مواد کا حصول اور پھر سلیقے سے اسے شائع کرنا، آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا غماز ہے۔

''حریم ادب'' کا سرورق موجد صاحب کے موقلم کا حسین شہکار ہے اور انتساب کا بھی جواب نہیں۔ موجود صاحب عہد ساز مصور ہی نہیں، بہترین نثر نگار بھی ہیں۔ آپ نے ''اطراف'' میں اپنے مطالعات کا نچوڑ پیش کیا ہے، جو سوچ اور فکر کے در وا کرتا ہے۔ سیّد تحسین گیلانی نے پنجابی کے حوالے سے جو باتیں درِدل کے ساتھ قلم بند کی ہیں، ان میں ہمارے دل کی آواز بھی شامل ہے۔

حمدیں، نعتیں، نظمیں، غزلیں، ماہیے، قطعے، کافیاں، منقبت اور مرثیہ (اردو، پنجابی) خوب صورت تخلیقات ہیں۔ انٹرویو تینوں ہی بڑے سچے تلے انداز میں کیے گئے ہیں۔ انٹرویو دینے والوں نے اپنا مافی الضمیر کھل کر پیش کیا ہے۔ سیّد معراج جامی نے اصغر خاں کا خاکہ بڑی محبت اور تعلق خاطر سے پینٹ کیا ہے۔ اتنا عمدہ خاکہ لکھنے پر انھیں مبارکباد۔ انگریزی حصہ شامل کرکے آپ نے ''حریم ادب'' کے وقار میں یقیناً اضافہ کیا ہے۔۔۔

رابعہ سرفراز/فیصل آباد

''حریم ادب'' کی صورت میں آپ نے اُردو، پنجابی، انگریزی تخلیقات اور فکری و ادبی مباحث کا کتابی سلسلہ شروع کرکے زبان و ادب کے قارئین کے ذوق کی تسکین کا جو سامان بہم کیا ہے۔ اُس کے لیے آپ داد کے مستحق ہیں۔ ادبی رسائل و جرائد تخلیق، تنقید اور تحقیق کے حوالے سے گراں قدر معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ غیر محسوس انداز میں اپنے دَور کی تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ ایسی تاریخ جس میں اس زمانہ کے ادبی رجحانات کے ساتھ ساتھ افرادِ معاشرہ کے اجتماعی رویوں کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اُردو زبان اور ادب کو اپنی بقا اور فروغ کے لیے جن سنجیدہ کاوشوں کی ضرورت ہے وہ آپ جیسے حساس فرد کے وسیلے سے منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ یہ ایک خوش آئند امر ہے کہ آپ نے اس کتابی سلسلہ میں اُردو کے ساتھ ساتھ پنجابی اور انگریزی زبان و ادب کے قارئین کے لیے بھی کچھ حصہ مختص کیا ہے۔

''حریم ادب'' کتاب II میں ''عمل قرأت اور علم ذوق'' کے عنوان سے آپ نے قاری کے ذوق کی تشکیل و تربیت کے حوالہ سے جو باتیں کی ہیں وہ ہر صاحبِ دل کو غور و فکر پر مائل کرتی ہیں۔

طاہر نقوی / کراچی

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ ابھی چند روز پیشتر کتابوں کی دکان پر آپ کا ادبی رسالہ نظر نواز ہوا۔ اس کا گیٹ اپ دیکھ کر ورق گردانی کی۔ مجھے اچھا لگا۔ مختلف زبانوں کے گوشوں سے نئے پن کا احساس ہوا۔۔۔ شمارہ دیکھ کر لگا کہ یہ مدت سے چھپ رہا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ چھوٹے شہروں میں زبان و ادب کی خدمت سنجیدگی سے ہو رہی ہے۔ فیصل آباد' ملتان' بہاولپور' وہاڑی' بورے والا اور میر پور خاص سے اچھے پرچے نکل رہے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ گروہ بندی اور ہر تعصب سے آزاد ہوتے ہیں۔

طالب جتوئی / ساہیوال

ہمہ جہت مزین حریم ادب نظر نواز ہوا۔ اس قدر معیاری پرچہ نکالنے پر فقیر کی جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ گو بورے والا کاروباری لحاظ سے چھوٹا سا شہر ہے۔ تاہم میرے نزدیک ادب سے سچی لگن رکھنے والے آپ ایسے جواں ہمت اہلِ قلم حضرات کے دم قدم سے یہ شہر ایک معتبر ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

رسالے میں نظم اور نثر دونوں حصے لائق ستائش ہیں۔

کرامت بخاری / لاہور

آپ کا ''حریم ادب'' نام' کام اور مقام کے حوالے سے انتہائی معتبر جریدہ ادب ہے' اردو منزل' یا پنجابی ویہڑا دونوں حصے دقیع' جامع اور مؤثر تخلیقی مواد کے حامل ہیں۔ مجھے برادرم قیصر نجفی' محترمہ شہناز نور اور شگفتہ الطاف کی غزلیں اچھی لگیں۔ سیّد معراج جامی بھی بہت ہی تخلیقی جوہر کے مالک ہیں۔ خماسی' سین ریو اور دیگر نئی نئی تخلیقات سے نوازتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی نظمیں اور برادرم سلیم آغا کی تحریر اچھی لگی۔ ناصر عباس نیر بھی بہت ہی محنتی ہیں۔۔۔

برادرم عرصہ بیس بائیس سال سے باقاعدہ لکھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ لفظ چونکہ خود ایک زندہ حقیقت ہے اس لیے انسانی محسوسات و محرکات کے اظہار کے لیے اس سے خوبصورت چیز اور ابھی تک تخلیق نہیں ہوئی' شخصیت کی تہذیب کے لیے' معاشرے کی اصلاح کے لیے' زبان کے ارتقاء کے لیے اور نسلوں کی بقا کے لیے لفظ یا حرف ہی وہ واحد وسیلہ ہے جسے دوام حاصل ہے۔ میری ایک غزل کے شعر ہیں:

عمر ساری ہی حروف لکھتا رہا — لکھ کے لوحِ جہاں پہ چھوڑ آیا
بے خودی میں یہ کیا ہوا مجھ سے — اپنا سب کچھ کہاں پہ چھوڑ آیا

خدا کرے یہ چھوڑے ہوئے حروف' بارآور ثابت ہوں' ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش / سرگودھا

A few days back` I received a copy of the latest issue of Hareem-e-Adab (BookII). This issue encompasses a wide variety of writings. It is an uphill task to select good material from the bulk of writings for publication. However, you have managed to do it. Your sheer hard work/dedication and involvement have made this issue very readable. It also attracts the attention of all types of readers. I have read Inshayyas, Inter-views and Fikri Mubahis as well as some parts of poetry. I have also read some segments of English section, which I found very thought provoking.

Now-a-days I am so much pre-occupied with farming activities that it is not possible for me to wirte in detail. I hope, the next issues of Hareem-e-Adab would definitely be more worth-reading. Lastly I must say you and other members of the editorial team have done a marvellqus job. Please accept my heartiest congratulations.

ای میل زE-mails

احمد سہیل/امریکہ

As salamoalaikum, received Hareem-e-Adab bookII. Thanks for it and also thank you for publishing my articles and poems in it. The entire book is very interesting, and provides new sensibility of intellect and modern Urdu Literature, specially your editorial about Action of Reading. Also I like the series of Interviews. Continue this trend of writing which would help develop the open discussion. I am going to send you some of my writing shortly.

Please convey mey salaam to Bhai Syed Tehseen Gilani.

منشایاد/اسلام آباد

حریم ادب کا تازہ شمارہ کتاب II' نظر نواز ہوا۔ بہت ممنون ہوں۔ ایسی بات نہیں کہ میں چھوٹے شہر سے نکلنے والے رسالے میں لکھنا پسند نہیں کرتا بلکہ اس کو تو کوالیفکیشن سمجھتا ہوں کہ آپ چھوٹے شہر سے بڑا رسالہ نکال رہے ہیں۔ میں پورا گزشتہ سال پریشانیوں میں گھرا رہا۔ اپریل اور دسمبر میں باری باری میری دو بہنوں کا انتقال ہوگیا اور ہم اس کے اثرات سے اب کہیں نکلنے کی کوشش کررہے ہیں۔

اگلے حریم ادب کے لیے میں انشاء اللہ ضرور اپنی تحریر بھیجوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ کا بہت شکریہ کہ یاد رکھتے ہیں ابھی پرچہ (کتاب) ملا ہے پورا پڑھ کر رائے دوں گا۔۔۔ اُمید ہے آپ سے ای میل کے ذریعے رابطہ رہے گا اگر آپ کے پاس اُردو ان پیج انسٹال ہو تو میں اُردو میں بھی خط لکھ سکتا ہوں۔

وحید احمد/اسلام آباد Waheed Ahmad/Islamabad.

Dear Javed Haider Joya Sahib.

Thanks a lot for sending me Hareem-e-Adab (BookII) which I received today. I was so pleased to see that a model literary magazine has been published from Burewala. It has a unique style of its own right from the list of Contents. The standard of the magazine shows the efforts put in by its editorial board. I wish that this magazine is published regularly in future.

ڈاکٹر بلند اقبال/ کینیڈا

حیدر بھائی میرے لیے بڑے بھائی کی طرح ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی تحریروں سے اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں بلکہ مجھ جیسے نئے لکھاریوں کو ادبی حلقوں میں متعارف بھی کرا رہے ہیں۔ جو بلاشبہ ایک اہم ادبی و اخلاقی ذمہ داری ہے''حریم ادب'' کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ واقعی ہم لوگ اس معاملے میں بدنصیب ہیں کہ ہمارا اعلیٰ ترین ادب بھی مغربی ادبی و غیر ادبی دنیا میں قطعی بے گانہ ہے۔ جس کا تدارک حریم ادب جیسے رسالوں سے ممکن ہے۔

آپ کا دلی شکریہ کہ آپ نے مجھے اس اعتبار کے لائق سمجھا میری دلی خواہش ہے کہ میں ''حریم ادب'' کا مطالعہ کروں اور اپنی ناچیز رائے کا بھی اظہار کروں۔۔۔ اپنا نیا افسانہ جلدی روانہ کروں گا اس اُمید سے کہ وہ حریم ادب کے معیار پر پورا اُترے۔

سورۂ اخلاص دا منظوم پنجابی ترجمہ

حیدر قریشی

تو کہہ دے اوہو اللہ اے — او اپنے آپ اِچ کلّا اے
اُس باجھ کسے نوں راہ نئیں — اوس کسے دِی پرواہ نئیں
اوہ اُچا ایسیاں پاپاں توں — او پاک اے پتراں باپاں توں
اوس جیہا ہور نہ جاپو اے — او اپنے ورگا آپو اے

نعت

حیدر قریشی

میں اپنے دل دے وچ جو آکھیا اے یا رسول اللہؐ
تساں او سارا کجھ ناں سن لیا اے یا رسول اللہؐ
انہاں اکھاں نوں جیویں ست سمندراں نیں نواہ دِتا
تہانوں اَج مَیں ایویں سوچیا اے یا رسول اللہؐ
میں پڑھ کے ''السلام علیکم ایھا النبی'' فر
نمازِ عشق کر لِتی ادا اے یا رسول اللہؐ
اجے کجھ ہور وی اپنے کرم دی دید فرماؤ
اجن وی ذہن دِل توں کجھ جدا اے یا رسول اللہؐ
نویں تختی سجائی اے میں اپنے دِل تے ہُن حیدر
تے اُس تختی دے اُتے لکھ لیا اے ''یا رسول اللہؐ''

مرثیہ سرائیکی

درحال حضرت حرؓ

قیصر نجفی

ابن زیاد کمینے ' جڈاں کوفہ ہتھ وچ کیتا　　واسطے قتل امیر دے' بہوں بے چین تھیا بد نیتا
لکھس خط شقی کوں مَیں ہاں ایں محاذ تے جیتا　　پاڑا ہویا گلمہ تیڈی شہی دا میں ہے سیتا
رکھ ترسلاّ سر مسلم دا جلد بھجیساں تیڈو
خون اِچ ترساں سیّداں دی تاں مونہہ کر یساں تیڈو

جے تیئیں میڈی جان ءِ چ جان اے شاہ نہ آ سی کوفے　　آیا وی تاں پھردا رہسی تھی اداسی کوفے
بجن متر نہ لبھسں کوئی دھوکا کھا سی کوفے　　مسلم وانگوں پیا سڈیسی اللہ راسی کوفے
ساتھ امیر دا چھوڑ تے سیھے اے کوفی لا یوفی
ہُن ہن میڈے سجے کھبے اے کوفی لا یوفی

گھتن سر حسینؑ دا حرؓ کوں بھیجا مَیں فی الحالے　　ہک ہزار دا لشکر وی اوں لائق افسر نالے
کوفے شہروں پرے تے ہووے جنگ اے میڈی چالے　　کجھ وی ہووے زد ساڈی وچ نبیؐ دی آلے
میں چھنداں جو نال حسینؑ سر نہ چاوے اُمت
اینویں تھیوے قتل حسینؑ وِند نہ پاوے اُمت

من تے حکم زیاد دا حرؓ آ طرف امام نکھتا　　کول امام دے پجا گھن تے لشکر بُھا تستا
سفر دا مارا ہا گھوڑے توں ڈھاندے ڈھاندے لتھا　　تس کنوں بے حال ہا ایڈا مردے مردے بچا
پانی منگدا خدمت وچ جاں آیا پتر نبیؐ دی
اکھ نہ بھالس ڈیکھ کراہیں کرم دی اکھ سخی دی

کال کریہہ تے جھر جنگل دے مارے وانگوں آیا　　نہر تلا چشمہ دریا دی گول ءِ چ بہوں چکرایا
ساوِل ون اتے چھاں کیتے ہر منزل تے للچایا　　جڈاں تس نے سنج بروچ چودھارا ونگوں بھرکایا
سکھے رتے شاہاں بُھلیا دِکھے دھوڑے کھاتے
وانگ غلاماں پیش امام دے تھیا سیس نواتے

سڈ عباسؑ کوں شہ آکھا گھن آوٗ آب شتابے　　حرؓ دے سارے لشکر کوں فی الفور کر ویرا بے
گھوڑے اُٹھ وی رج تے پیون ایڈا وندو آبے　　جتھ لکھو اُتھ کر ڈیو جل تھل وسو مشل سحابے
ہے ثواب دی گالھ پلاون رج تسیاں کوں پانی
ایں کنوں ودھ ثواب ہے ڈیون بے وطناں کوں پانی

نظماں

تیز ہَوا دے نال!

وزیر آغا

چھڈ بھوئیں دا کھیڑا
ہن توں تیز ہوا نل چل
چار پھیرے اُڈ
ادھا سمانی جا کے کھچرے
بدلاں نوں تڑفا
کالے شاہ پہاڑاں اُتے
چھالاں مار کے چڑھ
ننگیاں سُنجیاں میسیاں توں فیر
منہ دے بھارتوں ڈگ
چھلاں دی توں کرا سواری
مچھیاں نوں توں چک
اپنیاں لیراں کنجد اجا
تے اپنا آپ سنبھال
توڑ کے رشتے ناتے اُڈ جا
تیز ہوا دے نال!!

پنجابی سانیٹ

ستیہ پال آنند

ہزار کلیاں تے پُھلاں بھری بہار ایں توں
توں لے کے آئی ازل توں سہاگناں دا بھاگ
ترے بدن چ نیں سُتے ہوئے ہزاراں راگ
مری نظر جے نوازے، تاں اک ستار ایں توں

جے تار چھیڑدیاں، راگ بھیروی نکلے
پوے جے رات تاں جگ جان راگ دے دیپک
تری وفا دے ستارے، سہاگ دے دیپک
انہاں دی تان جے اُٹھے بکیشری نکلے!
کدی اہ وقت نہ آئے کہ دل دے مندر وچ
ترے خیال دی مورت دی پوجا میں نہ کراں
وفا دی سوہنی صورت دی پوجا مَیں نہ کراں
تراں نہ روز ترے عشق دے سمندر وچ!

سمجھ کے توں ای لڑی ایں انند دے سہرے دی
چل آ کہ نظم پڑھاں اج ترے چہرے دی!

(۱۹۵۷ء چ اپنی شادی دے موقعے تے لکھیا گیا)

نظمیں

کلیم شہزاد

ہینی

کچرا چگدی چگدی اک دن
آپوں کرچی کرچی ہو کے
دِن دے ویڑھے دیو چ کھلری!

رُوپ سروپ

سانول رُوپ سروپ جے سوچاں
رنگاں دا مینہہ وَرھ پیندا اے!

وصل جمالی

وصل جمالی جے کر لبھے
میرے ورگا کیہڑا جگ تے!

نَین خماری

رنگلی نین خماری تک کے
میری ہستی تے اِک پاسے
جگ دی ہر شے ڈوتی پھردی!

نظمیں

اکرم باجوہ

اُڈیک

نیں تے شہر چ آ کے کد دا
انساناں دے جنگل دے وچ
اپنا آپ گوا بیٹھا واں
پَر نیا ایں لوکاں کولوں
پنڈ دا رستہ' تے اک گوری
دووِیں۔۔۔ اَج وی
میریاں راہواں تکدے رہندے
کجھ بولن توں جھکدے رہندے

بینتی

ساون وچ وی توں نہ آیا
بدلاں نال روایا سانوں
وچ بہار اُڈیکاں رہیاں
پُھلاں تے زخمایا سانوں
رُت سرہوں دی سِک دی رہ گئی
توں نہ مکھ وکھایا سانوں
ہن تے مڑ کے آ جا سجنا!
کِھڑ پے پھل کریراں اُتے
کھلرے رنگ سریراں اُتے

مَیں

حنیف باوا

مَیں رکھڑا
اُجڑی جوہ دا
جیدے ساوے سُکے پتّر
پت جھڑاں دے
ترکھے بلیاں ہتھوں
آدھرتی تے ڈگیے
میں تن سکھنا
سکیاں شاخاں
سُکے تن نال
ڈور بھوریاں وانگوں
کھڑا اکھلوتا
اگے تے کدی پچھے
کدی کھبے سجے ویکھاں
ہے کوئی جیہا
لیکھاں مارے مَیں ول جیہڑا
پیار دی جھاتی پاوے
میں ازلاں توں پریم دا بُھکھا
مُحبتاں دا تر ہایا
روہی بھوں دا جایا
میں اپنت دے
اوس تیکے نوں ترساں
جیہڑا میرے
بھاں بھاں کردے اندر
وڑ کے
سکی تند حیاتی والی
ٹُمن توں ہن روکے
سکن توں ہن ہٹکے

نظمیں

فہیم شناس کاظمی

اَج تے ایسا ہویا

مُدھ قدیم دی راہواں اُتے
اک دیوے دی لو
چانی وانگر کھلری ہوئی اے
ہر پاسے خشبو
سبھے گردشاں تھمیاں ہویاں
گھڑیاں گئیاں کھلو
جہدا حسن اے وانگ مثالاں
گھر اج آیا او
سفنا اے یا ماجرا اے
کیہ دل وچ گیا سمو

مَیں وَر چنگے نال منگی آں

ٹھنڈے ٹھنڈے ہو کے بھردیاں
راتاں ہویاں لمیاں
ٹردیاں پتھریلی راہواں تے
لہو اج رنگیاں تلیاں

اتھرے عشق نے روگی کیتا
تن اج دوزخاں بلیاں
عشق دے تپدے صحراواں وچ
اکھاں ٹوٹ کے چلیاں

نظمیں

سلطان کھاروی

کافی

کونجاں دا دیس کہڑا؟
وینا اُنہاں کدائیں
سُن وی اساڈے سائیں
سُن وی اساڈے سائیں
ساون دا کوئی بدّل
جہڑی وی جوہ سدھاوے
پاگل پریت سچی
ہو کے اُڈار جاوے
شہریں نہ ساڈا واسا
رہنا نہ اُس گرائیں
سُن وی اساڈے سائیں
سُن وی اساڈے سائیں
نہوواں دے وچ دارو
زخماں دے وچ پیڑاں
کھنباں بنایا سانوں
پربت دے جیڈ چیڑاں
تاڑی پیا جگت مارے
اینا وی نہ نوائیں
سُن وی اساڈے سائیں
سُن وی ساڈے سائیں
مٹی اساں کوں جنیا
مٹی اساڈی سکی
ساڈے سراں تے مٹی
چلدی سے دی چکی
آونی اے وار ساڈی
آونی اے پر کدائیں
سُن وی اساڈے سائیں
سُن وی اناڈے سائیں

نہ پھر جھونگا

ساہواں دی
ایہہ ساری چیجی
مال پرایا اے
ایویں جا تک مَل مار کے
بوجھے دے وچ
نپی بیٹھا اے
کِنا کُوچر
میلے دی ایہ سَیر تے مُکّے
بُرج حشر دے
دین وکھالی
تنکڑ شکر لگن دیوو

اوتھے سنیا
ساویں وٹے تل جانے نیں
کم کسے وی آنئیں جانی
نہ کوئی آکڑ
نہ کوئی جی جی
ساہواں دی
ایہ ساری چیجی
وڈن گے سبھ
اپنی بیجی
نہ پھر جھونگا
نہ ای چیجی

نچّن خاب نشی

عبدالقدوس کیفی

ڈوریاں سوچاں گونگے ہاسے
سدھراں نیں قرضئی
خورے کہڑیاں غرضاں کھوہے
مکھن ساگ مکئی

حسرت بھریاں اکھیاں دے وچ
نچن خاب نشئی
ڈُکھنے، کھیڑے ہرتھاں وسدے
رووے رُت سرمئی
تتیاں ساہواں کرن نکور
پیڑاں دَڑ وٹ لئی
چن دے کولوں کرناں رُسیاں
ہجراں دی گنڈھ پئی
گھگھیاں دی کاں راکھی کردے
کیفی حد مُک گئی

تے۔۔۔ چنگا۔۔۔ اے

شگفتہ نازلی

رب راضی کرنے دی ریاضت کردی رہواں تے چنگا اے
سبھ توں سچی کتاب تلاوت کردی رہواں تے چنگا اے
سارے ای کم چنگے ہوون تے تاں ساڈے کم آون گے
اپنے ہتھاں نال سخاوت کردی رہواں تے چنگا اے!

اُدھیاں کماں نوں وی پورا کر جاواں تے چنگا اے
چپ چپیتے ایس جگ توں جے ٹُر جاواں تے چنگا اے
ڈونگھیاں پانیاں دے وچ کہڑا بھید دانائی لبھنی آں
نیک عملاں دی بیڑی تے مَیں تَر جاواں تے چنگا اے!
کھلے وال دُپٹے نال جے کج لواں تے چنگا اے
سوچ تصور کردے کردے رَج لواں تے چنگا اے
اکھراں دے سمندر دے وچ صورتاں جویں تردیاں نیں
اپنے سوچ ستارے دے نال سج لواں تے چنگا اے!

ٹردے ٹردے پئے گئے سوچیں رُک جائیے تے چنگا اے
لبھدے رہن گواچا جان کے لُک جائیے تے چنگا اے
کس کول ویہل کسے نوں سوچ دُنیا دا دستور ایہی
دُنیا نوں سمجھانا کیہ اے مُک جائیے تے چنگا اے!

کالا چِٹا دھن

کلیم شہزاد

مینوں ایس شہر وچ آئے نوں تھوڑے دن ای ہوئے سن۔ جہڑے پاسے میرا دفتر سی اوہ شہر دا وَدھیری رونق والا علاقہ سی۔ اک تھاویں سڑک کنارے بھرویں پپل دی چھاویں مُڈھ نال اک لماں والا بندہ بھوئیں تے دری وچھا کے بیٹھا اخبار پڑھدا نظرے پیندا۔ کسے توں کجھ منگدا وی نہیں سی۔ بس ہر ویلے کلا ای دِسدا۔ یاں فیر کدی کدی اوہدے کول بھوئیں تے پیراں بھار کوئی نہ کوئی چٹ کپڑیا بیٹھا دِس جاندا۔ مینوں اوہدی ٹوہ پنگری۔ خورے کیوں؟ پئی ایہہ کون اے؟ ایہہ ایتھے کیہ کردا اے؟ کدی کدی اوہ کول بیٹھے کسے بندے لئی ہتھاں دا بُک بنا کے دُعا کردا نظر دا۔

میں اوہدے نیڑے ہون بارے سوچیا۔۔۔ میں وی اک دن اوہدے کولدی لنگھدیاں سلام کیتا۔ اوہ کجھ نہ بولیا۔ دو چار دِناں بعد میں اوہدے کول جا کے بہہ گیا۔ اوس دن دفتروں چھیتی کم مکالیا سی۔۔۔ میں پچھیا ''بابا جی تسیں ہتھ ویکھدے او؟'' اوس نے میرے ول گوہ نال تکیا۔ میں دس دا نواں نوٹ کڈھ کے اوہدے ول ودھایا۔ اوس نے میرا ہتھ جھٹک چھڈیا تے ودھیری کڑتن نال بولیا۔ ''تینوں میرا پتہ نئیں۔ میں دُعا کرناواں تے گھٹ توں گھٹ پنجاہ روپے میری دُعا دی فیس اے۔ توں چیز کنا تیا کتھوں آ گیا ایں۔'' میں نموں جھان ہو گیا۔ اوہ دوبارا بولیا ''میری دُعا نال کالا دھن چٹا سفید ہو جاندا اے۔ شہر دے وڈّھے پاوے رات دے ہنیرے وچ میرے کول دُعا کراون لئی آوندے نیں۔ تے میں اوہناں توں منہ منگی فیس لینا واں۔''

اینی دیر وچ اک منڈا آیا۔ جس نے اوہدے ول سینت ماری تے اوہ بندہ چھیتی نال جُتی پا کے سامنے دکان وچ جا وڑیا۔ میں ویکھیا پئی اوہ بندہ فون تے کسے نال گل پیا کردا سی۔ جدوں اوہ پرتیا تے اوہدا مہاندرا اوگڑیا ہویا سی۔ اوہ منہ وچ ای بولیا'' بنے پھردے نیں وڈھے افسر۔ نذرانہ ویلے سر سیندے نہیں دُعاواں کراں ایہناں لئی؟ اج چار تریخ ہو گئی اے۔۔۔ راتاں نوں جاگ جاگ کے دُعاواں کر کے ایہناں دے کالے دھن نوں چٹا میں کراں۔ بھُوتنی دے نہ ہون تے۔ نبڑلواں گا۔ آکھدا سی ایس مہینے تنخواہ ای لبھی اے۔ لوڑاں وی پوریاں نئیں ہوئیاں۔ اگلے مہینے ڈبل نذرانہ۔''

میں حیرانی وچ ڈُبیا بیٹھا اوہدے ول تکدا رہیا۔ اوس نے اپنی داڑھی وچ انگلاں کنگھی وانگوں پھیریاں۔ سر دی ٹوپی ہور ٹیڈھی کیتی تے مینوں ہتھ دے اشارے نال ٹُر جان دا اشارہ کیتا میں چپ کر کے اُٹھ کھلوتا تے گھر نوں ٹُر پیا۔

میں راتیں منجی تے پیا وی اوس بندے دے ورتارے بارے سوچدا سوچدا نیند نگر اپڑ گیا۔ میں سفنے وی اوس بندے بارے ای تکدا رہیا۔۔۔ اوہدی بھیت بھری شخصیت تے رمزاں بھیرا لہجہ میرے حواس تے چھا گیا سی۔۔۔

میں ہولی ہولی اوس بندے کول ہر شام توں پچھوں روز جانا شروع کر دتا۔۔۔ خورے اوہدا وی میرے نال کجھ موہ پے گیا سی۔۔۔ میں اوہدی اصلیت تیکر اپڑنا چاؤہندا ساں۔

اک رات اسیں دووئیں ای ساں۔ اوہ بڑی موج وچ سی۔ اوس نے آپوں ای اپنی کہانی چھوہ دِتی۔ میں وی تے ایسے ٹوہ وچ ساں۔

اوہ بولیا: ''تیرے آون توں پہلاں شہر دا اک وڈھا سوداگر آیا سی بہت وڈھا نذرانہ پیش کر کے گیا اے۔ میں بڑا ای خوش آں۔ اوس نے وڈھی بازی جتی سی۔ نذرانہ کیویں نہ دے کے جاندا۔ میں ای تے دَم نال اوہدے کالے دھن نوں چٹا سفید کرناواں۔ میں ای وڈھیاں ساہوکاراں، سیاست داناں تے وڈھے افسراں لئی راتاں نوں دُعاواں کرناں۔۔۔ اوہناں کول ایس کم لئی ویلا جو نئیں ہندا۔ اوہ تے زَر دے پجاری نیں۔۔۔ اوہ زَر دی خیر منگدے نیں جان دی سلامتی نئیں۔

دُعاواں کرن دا گُر مینوں وی تے اک بابا جی نے دسیا سی۔ جہڑا اج توں کئی ورھے پہلاں ایتھے ای پپل دے مُڈھ نال بہندا سی ایس پپل دی چھاں اودوں دی سنگھنی سی۔۔۔ سامنے والی دکان وچ ٹیلی فون وی اوسے نے لوایا سی۔ بل وی اوہو ای دیندا سی۔ اوہنوں وی وڈھے لوکاں دے فون آوندے سن۔ اوہ وی دُعا نال کالا دھن چٹا کر دیندا سی۔ میں اوہدی گدی دا وارث ہاں۔ کیوں بنیا؟ توں وی سن لئے۔۔۔

''۔۔۔میں وی بڑا غریب ساں' تیرے ورگا ہماتڑ۔نوجوان سی۔کلا سی۔ ماں بیمار ہوگئی۔ ہسپتال والیاں نے سرکاری دواواں لکالئیاں۔ میرے ہتھ پرچی پھڑا کے بازاروئے ٹور دتا۔دکاندار پیسے منگدے سی۔ میں غریب نمانا کتھوں دیندا۔ میں لوکاں دے ترلے پائے۔ ہاڑے پائے۔ کسے نے مٹھا بول وی نہ بولیا۔ امیراں نے جھڑکاں تے دھکے دے چھڈے۔ میرے ورگے غریباں نے دُعاواں توں وکھ کیہ دینا سی۔۔۔ کسے نے ترس نہ کھاہدا۔۔۔

۔۔۔میں ویہلے ہتھیں ہسپتال پرتیا تے میری ماں پیڑاں دی سُوئی نال بُلھ سی کے وچ پئی ہوئی سی پر اوہدیاں کُھلیاں اکھاں وچ اُڈیک پئی سہکدی سی۔

میں ایتھے بیٹھے بابا جی کول آیا۔۔۔ جدوں دواواں نہ لبھن تے فیر بندہ دُعاواں دا آسرا ٹولدا اے۔ میں وی دُعا کرن لئی عرض کیتی۔ بابے ہوراں نے وی فیس منگ لئی۔ کتھوں دیندا۔''

میں تکیا اوس زلف دراز بندے دیاں اکھاں دی رنگت لال ہُندی پئی سی تے پلکاں دے پچھے ہنجوآں دا ہڑھ نچدا محسوسیا۔

''میں بابے ہوراں توں دُعا دی فیس کتھوں تے کیویں دیندا۔۔۔ میں پھُٹ کے رو پیا۔ دُکھاں درداں نال پُرچی تے غریبی دی ماری ہڈبتی دسی۔۔۔اوہدے من وچ رحم پنگریا۔ اوس آکھیا' میرے بیٹھ وچھی دری دے ہیٹھوں سارے پیسے لے جا۔ تیری ماں جگ جگ جیوے۔ میں تکیا تے اوہدی دری ہیٹھاں لال لال نوٹ وچھے ہوئے سن۔ میں چھیتی نال مٹھاں بھرلئیاں تے سرکاری ہسپتال وَل نس اُٹھیا۔ جدوں اپڑیا تے میری ماں دی بے وارثی لاش مردہ خانے وچ سُٹی پئی سی۔ میری روح نے میرا اسکھنا جسّہ چھنیا چھنیا ہو کے مردہ خانے دے ٹھنڈے فرش تے دوویں ای کھلر گئے سن۔۔۔ ہسپتال والیاں نے دھکے دے کے باہر کڈھ چھڈیا تے میری ماں دی لاش دین توں وی انکاری ہو گئے۔۔۔

میں روندا دھوندا ایسے ای تھاں بابے ہوراں کول آ گیا۔ میرا ہور کون سی؟۔۔۔ اوس بابے ہوراں نے مینوں اپنا وارث بنالیا۔ کالے دھن نوں چٹا کرن دے سبھے گُر سمجھائے۔ اپنا وارث دسیا۔۔۔ جدوں بابا جی چلاناں کر گئے تے میں ایس گدی نوں سنبھال لیا۔ میں دعا دے نذرانے وچ کسے نال رعایت نہیں کردا۔ سارے وڈھے اپنے کالے دھن چوں میرا اندرانہ دے کے اوہنوں چٹا جان لیندے نیں۔ اوہناں وے بھانے میری دُعا اثر کردی اے۔ اوہناں توں تے کالا دھن ای لبھدا اے پر میرا دھن' من تے تن چٹا سفیدا اے۔ کورے چِٹے لٹھے ورگا۔ میں اوہ چٹا دھن رنڈیاں زنانیاں' یتیماں تے غریباں وچ ونڈ دیناواں۔ علم دا چانن لبھن والے علم دے عاشقاں دے داخلے تے فیساں بھرناواں۔ ڈھلدیاں راتاں دے آبشاریاں وچ نیلی چھتری والے توں لوکائی دے بھلے تے آشتی دی بھکھیا منگدا ہاں۔۔۔ چَن سانول دیاں اُڈیکاں وچ چاندی دی سرحد نوں چھوہندیاں مٹیاراں نوں سونے وچ تول کے اوہ سرحد سلامتی نال پار کراون دے چارے ماردا رہناواں۔ جیہدے پار جا کے اوہ سرخرو ہو کے سوکھے ساہ لیندیاں نیں۔ موجاں مان دیاں نیں تے سنہری وصلی راتاں نوں مست گھڑیاں وچ نگھیاں دُعاواں میرے لئی کردیاں نیں۔ اوہناں دُعاواں دے نگھ پاروں مینوں پوہ ماگھ دیاں رُتاں وچ سیت وی نہیں لگدا۔ اوہناں دیاں سکھ مان دیاں ٹھنڈیاں ہواواں ہاڑ دیاں دُھپاں وچ کالجے نوں ٹھنڈ پاؤندیاں نیں۔ خورے نہیں سگوں پک اے پئی ایسے لئی میری دُعا اثر کردی اے۔ رحمت دا مینہ وردا اے۔ میں اوہدی مستی وچ مست رہناواں۔ ایسے لئی میری دُعا وچ تاثیر وی اے۔ ایہدے وچ میرا تے کوئی کمال نہیں ہیگا۔ کمال تے اوس کمال والے دا اے۔ جیہدا اکمالی ہتھ میرے ورگے نمانے دی کنڈ اُتے وے۔۔۔

بابا فرید شکر گنجؒ نے فرمایا سی'

کالے میڈے کپڑے کالا میڈا ویس
گناہیں بھریا میں پھراں لوک کہن درویش

اج محسوس دا سی پئی اوہدی آکڑی ہوئی دھون کسے وڈھی بارگاہ وچ جھکدی جا رہی سی۔ سیس پیانواوندا سی میں ویکھدا رہیا تے گم سم ساریاں گلاں سُن دا رہیا۔ میرا دل کیتا پئی میں نوکری چھڈ کے اوہدی چاکری کرلواں؟ خورے میرے نصیبے وی جاگ پین تے میریاں دُعاواں نوں وی رنگ بھاگ لگ جاون!!!

کھڈّ

زہیر کنجاہی

اکو کالج وچ پڑھاندیاں پڑھاندیاں جدوں سہیل اعجاز نوں چونتی سال ہو گئے تے اوہدی عمر وی سٹھ سال ہو گئی۔ گورنمنٹ نے اوہنوں پنشن دے کے فارغ کر دِتا۔ اوہ جدوں فارغ ہویا تے اوس ویلے اوہ وِیویں گریڈ وچ سی تے ایسوسی ایٹ پروفیسر سی۔ اُردو دا مشہور شاعر تے دو تِن غزل دے مجموعے شائع ہو چکے سن۔ دو ناول لکھ چکا سی تے ٹیکس بک بورڈ دیاں دو کتاباں اُردو برائے نہم و دہم وی ترتیب دے چکیا سی۔ پورے پاکستان دے ہائی سکولاں وچ اُردو گرائمر اوہدی ای لکھی ہوئی چل رہی سی۔

ریٹائر ہون توں پچھاں سہیل اعجاز اپنے پتر کول دوبئی چلا گیا۔ جدوں چھ مہینے بعدوں پرتیا تے اوہنوں اپنے علاقے دے اک بوہت وڈے تعلیمی ادارے وچ ملازمت مل گئی تے اوہ اوتھے پڑھان لگ پیا ایہہ ادارہ اوہدے گھر دے وی کول سی تے ایہدی مالک جیہڑی اپنا ناواں پرنسپل دے طور استعمال کر رہی سی جدکہ اوہ پرنسپل ہونے دے قابل ای نئیں سی تے اوہ ایہو جیہا بندہ لبھ رہی سی جیہڑا پرنسپل تے نہ ہووے پر کم سارے پرنسپل دے ای انجام دیوے۔ بورڈ تے یونیورسٹی وچ پرنسپل دی حیثیت نال ناواں اوہدا ہی گلیا جاوے۔ تاں جے سکول تے کالج آسانی نال رجسٹرڈ ہو جان تے اوہناں دے طالب علم ریگولر طالب علم دی حیثیت نال امتحان دے سکن۔ سہیل اعجاز نہ ہوندیاں ہویاں وی پرنسپل والے کم ای کردا رہیا تے جدوں کم کردیاں کردیاں اک سال تے کجھ مہینے لنگھے تے اوس ادارے وچ فزکس پڑھان لئی اک لیکچرر دی تعیناتی ہوئی۔ اوہ لیکچرر اک مرحوم جنرل دی بیٹی سی۔ امریکہ توں پڑھ کے آئی سی اوہدا خاوند نصیراوانی اک بہت بڑے پراجیکٹ دے ڈپٹی ڈائریکٹر سن۔ ایسے نسبت نال اوہ ثمرہ نصیراکھواندی سی۔ کجھ دن تے اوس نیں کالج وچ پڑھایا۔ کالج دا ماحول بڑا فضول سی کوئی کینٹین نئیں سی جتھوں دِن وچ اِک واری تے ٹیچرز چائے پی سکن۔ کئی واری پانی وی مُک جاندا تے دِن بھر طالب علم وی تریائے ای رہندے۔ ایسے ادارے وچ سہیل اعجاز وی نوے نوے آئے سن۔ پوسٹ گریجویٹ کالج توں رِٹائر ہو کے آئے سن تے اچھی خاصی پرسنیلٹی دے مالک سن۔ پڑھانے وچ وی کسے نالوں گھٹ نئیں سن۔ پہلے دن ملاقات ہوئی تے دوواں نیں اِک دوجے نوں ''قابلِ احترام'' جانیا تے ایہہ احترام اَج وی قائم اے۔

ہویا انج کہ کجھ دِن تے ثمرہ نے اوس کالج وچ پڑھایا تے فیر اِک دِن سہیل اعجاز نوں کہن لگی۔ مَیں تے چھڈ کے جا رہی آں طبیعت ایس ماحول نال کمپرومائز نئیں کر رہی۔ پر تسیں ایہہ دسو اگر کسی ہور ادارے وچ تہاڈی لوڑ ہووے تے تسیں کوآپریٹ کرو دے؟

سہیل اعجاز نیں جواب دِتا۔ ''ست بسم اللہ''

ایس طراں وعدے وعید ہو گئے تے تیجے کسے نوں علم وی نہ ہویا۔ اج پنج وریاں بعد وی اوہ احترام ایناں دوواں وچ قائم اے۔ ثمرہ اج وی سہیل اعجاز نوں اپنا بزرگ ای جاندی اے تے سہیل اعجاز وی ثمرہ نوں وڈے پیار دی اَکھ نال ویکھدا اے۔

ثمرہ کہن لگی ایہہ گل یعنی کالج چھڈن دی گل مَیں تے کسے نوں وی نئیں دسدی تے تسیں وی چپ ہی رہنا۔ ویسے تے مَیں کل آنا ای نئیں۔ دس پندرہ دِن کم کیتا اے تے ایناں دِناں دی تنخواہ اپنے کتھے دینی اے کیوں جے سنیا اے کہ اوہ تے جان والے اُستاد دی تنخواہ دیندی ای نئیں پا دیں تنخواہ دو مہینے دی باقی کیوں نہ ہووے ایس ادارے چ تنخواہ عام طور تے دو دو تِن مہینے بعد ای ملدی سی تے اوہ وی اک مہینے دی تھلے ہی رہندی سی۔

ثمرہ ایس ماحول تے لعنت بھیج کے چلی گئی۔ کیوں جے اوہ تے کھاندے پیندے گھرانے توں سی۔ خاوند وی چنگی بھلی تنخواہ پاندا سی۔ ثمرہ کول آن جان واسطے اپنی گڈی سی اوہدے تے آوندی تے اوہدے تے جاندی سی۔ اودھراوسے پراجیکٹ دے اندر اک کالج کھلنے والا سی۔

جیہڑے پراجیکٹ دا ڈپٹی ڈائریکٹر نصیراوانی سن یعنی ثمرہ دے مجازی خدا۔

کجھ دناں پچھوں سہیل اعجاز نوں ٹیلی فون ملیا۔

سہیل صاحب ''ثمرہ سپیکنگ (Samra Speaking)''

سہیل اعجاز ''میڈم السلام علیکم''

سہیل صاحب ''اے گڈ نیوز فار یو (A Good News for You)''

سہیل اعجاز ''میڈم! اوہ کیہڑی اینی چنگی خبر اے مَیں وی تے سُناں''

ثمرہ نصیر ''سہیل صاحب! کالج کی بلڈنگ تقریباً تیار ہوگئی ہے اگر آپ آ جائیں تو کل سے بسم اللہ کردیں۔ دیکھیں آپ کو علم ہے کہ مجھے پنجابی نہیں آتی اس لیے اُردو بول رہی ہوں۔ مجھے تو اُردو بھی نہیں آتی معذرت۔''

(سہیل جی۔ کالج دی بلڈنگ بن گئی اے آ جائیں تے کل توں کم شروع کر دیو۔ تساں نوں علم اے کہ مینوں پنجابی نئیں آوندی۔ ایس واسطے اردو بول رہی ہاں اُردو وی تے نئیں آوندی)

سہیل اعجاز ''میڈم! پنجابی دی سمجھ تے آندی ہووے دی؟''

''نہیں سہیل صاحب! مَیں پنجابی بالکل نہیں سمجھتی (نئیں سہیل جی میں پنجابی بالکل نئیں سمجھدی)

تو اس کا مطلب ہوا کہ آئندہ آپ سے اُردو میں یا انگریزی میں بات کی جائے۔ (ایدا مطلب ہویا کہ اگوں تہاڈے نام گل بات اُردو وچ یا انگریزی وچ کیتی جاوے۔)

Please, tell me the address, I shall come tomorrow, Sohail Ijaz.

(سہیل نیں آکھیا۔ مینوں ٹھکانہ دس دیو مَیں کل پہنچ جاواں دا)

دوجے دِن دسّے ہوئے پتہ تے سہیل اعجاز کالج وچ اپڑ گیا۔ کمریاں دے فرش تیار ہوندے سن پے اجے کئی کمریاں نوں دروازے وی لگنے سن۔

کالج وچ ہولی ہولی سٹاف پورا ہوندا گیا تے ایناں دوناں نیں مل کے کالج دی ساکھ وچ وڈا وادھا کیتا تے لوکی اپنے بچیاں نوں ایہدے وچ دھڑا دھڑ داخل کروان لگ پئے۔

کالج دے سربندیاں نے ایہہ فیصلہ کیتا کہ کالج دا آغاز اٹھویں جماعت توں کیتا جاوے تے ہر سال اِک کلاس اگے ودھدی جاوے۔ ایس طرحاں کالج ایف۔اے تے ایف۔ایس۔سی تیکر اپڑ پووے دا تے اوس وقت تک بلڈنگ وی ساری پوری ہو جاوے دی۔

ہُن دِنے راتیں کالج وچ وادا ہوون لگ پیا تے ون سونے بچے تے ون سونے اُستاد وی آن لگ پئے۔ اُستاد تقریباً زنانہ ای سن صرف اک قاری تے اِک پی ٹی ماسٹر مرد سن۔ ہر بندے دی اپنی اپنی طبیعت ہوندی تے ہر بندے دے اپنے اپنے وصف ہوندے نیں۔ اک اُستانی جدی پشتی ''چغل خور'' سی تے اوہ ہولی ہولی پرنسپل دے قریب ہوندی گئی تے نالے پرنسپل نوں خوش کرن واسطے ہر اک بارے صحیح تے غلط خبراں دین لگ پئی۔ پرنسپل وی کجھ کناں دی کچی ثابت ہوئی تے اوہ وی اودیاں گلاں تے یقین کر کے ملازماں نوں تنگ کرن لگ پئی۔ فیر جدوں سہیل اعجاز نے ایہہ ویکھیا کہ جدی پشتی ''چغل خور'' استانی نوں آندا جاندا تے کجھ نئیں تے نا ای اوہ پڑھا سکدی اے تے اوس نے ایس گل نوں بڑا ابُرا سمجھیا تے پرنسپل نوں سمجھان دی کوشش کیتی۔ ایہہ ویکھ کے چغل خور نیں پرنسپل نوں سہیل اعجاز ولوں بدظن کرن دی کوشش کیتی پر سہیل اعجاز تے رب مہربان سی تے اوس نیں اپنے بندے نوں دُکھ درد برداشت کرنے دی ہمت دِتی تے اوہ بڑے حوصلے تے صبر نال دو تن دفعہ میٹنگ کر کے اوس نوں سمجھاوندی کوشش کیتی فیر وی کوئی فائدہ نہ ہویا۔ آخر تنگ آ کے سہیل اعجاز نیں اپنی ڈور اللہ دے ہتھ وچ پکڑا دِتی تے خود اکھاں بند کر کے سارے دُکھ جرن لگ پیا۔ ایس عرصے وچ سہیل اعجاز نیں کالج چلانے والی سوسائٹی نوں رجسٹرڈ وی کروالیا تے وفاقی بورڈ نوں نیوندرا وی پا دِتا۔ ڈائریکٹر نیں خوش ہو کے سہیل اعجاز دی تنخواہ وی ڈھائی ہزار ودھا دِتی تے قرعہ اندازی وچ حج واسطے اوہدا ناں وی نکل آیا۔

کہندے نیں رب مہربان کل مہربان۔ ہُن ثمرہ وی کجھ کجھ کواپریٹ کرنے ول جھکدی نظر آئی۔ فیر آہستہ آہستہ ماحول ٹھیک ہوندا گیا۔

ایتھوں تیکر ہویا کہ سہیل اعجاز نیں کئی اک اُستاداں دی جواب طلبی وی کیتی ثمرہ نیں وی اوہدی تائید کیتی۔ اج فیر ماحول اوہ ہی سی جیہڑا شروع وچ سی ایس دوران ناویں جماعت دا نتیجہ وی آ گیا بچیاں وچوں اک بچہ بہت زیادہ نمبر لے کے پاس ہویا۔ اوس ویلے اوہدے ابو امریکہ وچ سن تے جدوں اوہ واپس آئے تے اوہناں اک ہوٹل وچ بچے دی کامیابی بارے دعوت کیتی۔ پرنسپل وی گئی' سہیل اعجاز وی تے سارا سٹاف وی گیا۔ دعوت وچ خوب چہل پہل تے گپ شپ رہی۔ واپسی فیر ثمرہ سب توں پہلاں نکلی۔ پچھے پچھے سہیل اعجاز وی آ گیا۔ ثمرہ نیں مسکراندے ہویاں آکھیا۔ ہم تو اب پانچ جنوری کو آئیں گے آپ اپنی ''کھڈ'' میں بیٹھ کر کہانیاں لکھیے۔ (اسیں تے ہُن پنج جنوری نوں آواں دے تے تسیں اپنی ''کھڈ'' (چھوٹا جیہا دفتر) وچ بہہ کے کہانیاں لکھنا)

پیری بوٹ کھڑکنے نی
اساں چن مُڑ جانا
تساں راہ پئے تکنے نی

واصف علی واصف ہوراں دے کجھ اُنملّے بول

جیناں لئی اساں دنیا بھلی اووی سانوں بھل گئے نیں
اک اک کر کے سارے اتھرو مٹی دے وچ رل گئے نیں

کل تک اپنے دل وچ گل سی اج او سارے شہر دی گل اے
وچ چوراہے پھٹے بھانڈے سب افسانے کھل گئے نیں

بند کواڑاں دے اوہلے وِچ دل نے جھیت لگائی سی
کھلے وال سجن دے ویکھے' سارے بوہے کھل گئے نیں

کیہ ہویا جے اک دو کنڈے میرے ور گے ذرتے آئے
تیرے دروازے تے لکھاں سجرے سوہنے پھُل گئے نیں

رنگاں دا اعتبار نہ کریے' اکھاں وچ نہ سُرمے بھریے
اِکو بوند چ رنگ پھٹ جاندے' گُجلے گُجلے ڈل گئے نیں

پُھلاں دی خوشبو ای چنگی' ایدھروں اودھروں بچ کے لنگھیں
جیہڑے پُھل سُن بر دا سہرا اج پیے وچ ٹُل گئے نیں

جتھے خوشبو پیار دی آوے اوتھے جا کے ڈیرا لا دے
روندی دنیا ویکھ کے واصف اپنا رونا بُھل گئے نیں

غزلاں

ظفر اقبال

اکھاں اندر اُگھڑیا اک نواں نکور اسمان
دِن نوں ہور جیہا لگدا، تے راتیں ہور اسمان

اوپر اوپر اچن اتے ہور ای ہور طراں دے تارے
جیوں اسمان دے پچھے ہووے کوئی ہور اسمان

سی وچکار اک ڈری، ترُٹھی ہوئی دھرتی دی دھوڑ
چار چفیرے کَسیا ہویا زورو زور اسمان

میرے آل دوالے وِچھیا ساون مانہہ دا پانی
پانی دے جنگل بیلے وچ نچّے مور اسمان

جے اسمان نہ ہُندا کِدھر جاندے ساڈے جیے
جس نوں دھرتی ڈھوئی نہ دیوے اُس دی ٹھور اسمان

تریہہ لگے تے اکھاں میٹ کے بھرا اُمبر دا گھُٹ
لگے بھکھ تے کجھ نہ کر، تھالی وچ بھور اسمان

کلیاں کدی سفر نئیں مُکنا، بھاویں لکھ ازما
جس دم ٹُرنا ہووے اپنے نال ای ٹور اسمان

دوہاں نال اے میری ڈوروں نیڑیوں رشتے داری
میری چپ زیناں ورگی، میرا شور اسمان

ظفرا، کدتائیں پینیدا رہیں گا سیم دا کھارا پانی
ایہنوں مٹھیاں کر، جھلیا، ٹھوٹھے وچ کھور اسمان

ستیہ پال آنند

میں سقراط دا زہر بھریا پیالہ سی، جے ہونٹھ لاندے تاں پینیدے وی کی لوک؟
مرے اس پگھلدے ہوئے درد دا زہر چکھدے تاں سندے مری شاعری لوک؟

اوہ دُکھاں دا جینا وی اے کوئی جینا، اوہ روگاں توں مرنا وی اے کوئی مرنا؟
جے ہوندا کوئی ہور چارہ انہاں* دا، یقیناً نہ کردے کدی خودکشی لوک!

محلے چ اک نال رہندے ہوئے وی، نہیں اے کسے نوں کسے دا تعارف
جے ویکھو مکھوٹے نوں لاہ کے تاں لگدے، اوہ جانے پچھانے سبھے اجنبی لوک!

جویں جھگ وہاندے ہوئے کوئی پتھر، پئے ہون جھرنے دیاں پانیاں وچ
کئی ٹھوکراں توں وی جاگے نہ چندرے، کہ مرگی دے دورے چ بے ہوش سی لوک

غلاظت بھری نالیاں دے اوہ کیڑے، اوہ لولے اوہ لنگڑے، اوہ ٹنڈے، اوہ منڈے
جے دل چیر کے ویکھدے زندگی دا، نہ منگدے خدا توں کدی زندگی لوک!

بھلا دوستی دا زمانہ اے کوئی، بڑی دیر توں مُک چکی اوہ روایت
جے ملدی کوئی دوستی جیہی شے تاں، نہ بھُل کے وی کردے کدی دشمنی لوک

کئی[1] سال پردیس لا کے جو مڑیا سی، پچھ وی نہ سکیا کہ کی ماجرا اے
کہ بُو ہے تے اُس دے گلی وچ چھپتے کھلوتے سی بستی دے سب چودھری لوک

فریداں کبیراں نوں نتے بلھیاں نوں، جے پچھدے تاں شعراں دی قیمت سمجھدے
اننداپنی رُکوتاراں لئی ڈھونڈدے نے ایوارڈاں اناماں نوں اج دے کوی لوک!

---

(1)۔ اک سچے واقعے توں متاثر ہو کے اوہ شعر لکھیا گیا۔ میری اک اُردو نظم وی ایسے سیناریو نوں لے کے لکھی گئی۔ (س۔ب۔ا)

طالب جتوئی

دِتے اج سنیہڑے کانواں اصل پنجابی
نویں نکوری سیج وچھاواں اصل پنجابی

شام سویرے دل دے کورے ورقے اُتے
چائیں چائیں حرف سجاواں اصل پنجابی

توں کدھرے جے ساڈی وِتی پھیرا پاویں
تینوں اوتھے رنگ وکھاواں اصل پنجابی

کھیڈن جیہڑی چھیل چھبیلے بانکے گبھرو
تینوں میں اوہ کھیڈ کھڈاواں اصل پنجابی

توں آکھیں تے اپنی جیون سانجھ بنائیے
پگڑی تیرے نال وٹاواں اصل پنجابی

شرم حیا دیاں رسماں جیوندیاں رکھن دے لئی
بلیا تینوں ڈھنگ سکھاواں اصل پنجابی

دل مستی وچ لڈیاں پاون لگ پیندا اے
جد وی ڈھولا ماہیا گاواں اصل پنجابی

ویہل ملے جے تینوں میرے پنڈ آون دا
اُلفت دے سنگیت سناواں اصل پنجابی

جی کردا اے دھرتی اُتے تھاں تھاں
پیار وفا دے بوٹے لاواں اصل پنجابی

سچ آکھاں تے پنجابی شہراں وچ مینوں
وسدا اے کوئی ٹاواں ٹاواں اصل پنجابی

شہراں دے وچ بولی وی دو رنگی ہوئی
سانبھ لئی اے پنڈاں تھاواں اصل پنجابی

پیر فرید تے وارث شاہ نوں چیتے کر کے
اپنا من بیلا مہکاواں اصل پنجابی

بلھے شاہ ' محمد بخش تے حضرت باہوؒ
ایہناں دے میں جشن مناواں اصل پنجابی

شہراں دے وچ آئے پُتراں بدلی بولی
بولدیاں نیں اج وی ماواں اصل پنجابی

کل نوں میری یاد کراوے گا سجناں نوں
میرے لفظاں دا سرناواں اصل پنجابی

طالبؔ جے آ جاویں کدھرے میرے ویہڑے
نچاں ' گاواں ' جھمر پاواں اصل پنجابی

کلیم شہزاد

روحاں دے تیک چھیڑدا پیکر کمال سی
اوہ دلبراں دے رُوپ دا منظر کمال سی

ہوشاں بھلا کے اوس نے لٹیا فقیر نوں
اوہدی سروپی رُعب دا چکّر کمال سی

ہُن تے بڈھیپا آ گیا ' بچپن دی بات ہے
جہڑی سریر لبھ گئی چھلتر کمال سی

کسراں اثر نہ ہووندا پتھر سریر تے
اوہدی زباں چوں نکلیا اکھر کمال سی

کسراں بھلاں گواچدا منزل دی بھال وچ
خوابیں سہارا دیوندا رہبر کمال سی

کھوجی نہ کوئی پہنچیا کھریاں دی دھوڑ نوں
جتھے ساں میں گواچیا' کھنڈر کمال سی

حرفاں چ سانول چاننا بھر کے جو بھیجیا
سوچاں نوں اوہ اجالدا پتّر کمال سی

پنچھی فضا چوں آن کے موتی سی کیردے
وچھیا ترے شہید دا ستّھر کمال سی

میری کلیمؔ روح دے پربت نوں پی گیا
رنگلی نظر دا سانولی پتھر کمال سی

اکرم باجوہ

ایویں رُتا گو پَر سی چھنڈے
داواں دے وچ اُگ پے کنڈے

خوشیاں پرے پریرے رہیاں
دُکھڑے میرے نال نیں ہنڈے

رِیجھ بسنتی لوکاں لُٹ لئی
راہواں وچ کھلار کے کنڈے

آکھو کلیاں جند وی کڈھ لے
لوکاں وچ نہ مینوں بھنڈے

مینوں اَت اُداسی دیوے
چاواں دے چھج پاسے ونڈے

دلِ چوں دُتر ہو جاندے نیں
کس نیناں دے تیر نیں چنڈے

اکرم لوں لوں برفاں لتھیاں
کِکّر نے اِنج جُثے پھنڈے

کاشف سجاد

متر مکھ پرتاون لگ پئے
دُشمن لڈیاں پاون لگ پئے

شہر دی حد ودھاون لگ پئے
وتی میری ڈھاون لگ پئے

اگے ای ہڑ دے مارے، اُتوں
بدل مینہ ورھاون لگ پئے

سچی گل کی منہ تے آ گئی
اُٹھ کے لوکی جاون لگ پئے

سفراں دے وچ رُل کے راہی
ڈھولے ماہیے گاون لگ پئے

تھاں تھاں تینوں لبھدے لبھدے
پکھی واس سداون لگ پئے

جیٹھ مہینے وچھڑے کاشف
اکھاں وچ کیوں ساون لگ پئے

ظفر اقبال نادر

انج لیکھ نمانے رُٹھے نیں
سب سنگی بیلی چُھٹے نیں

توں لکھ تلیاں دِیاں کوتاں دے
کدے انج وی ہیرے مُٹھے نیں

جد وی لیلیٰ صدقہ ونڈے
مجنوں دے ٹھوٹھے ٹُٹے نیں

جد وی اوہدی محفل جاواں
او مار کے اَڈّی اُٹھے نیں

رُت دا پنچھی ہتھ نہ آیا
سو جال اساں وی سُٹے نیں

اوہدی رنجگی سمجھ نہیں پائے
سوچاں دے پنچھی ہُٹے نیں

سازش دے چلے ہنیر ظفر
سدھراں دے بُوٹے پُٹے نیں۔

عبدالقدوس کیفی

تکڑے دے ایہ وچ نیں سارے — جی جی کردے اج نیں سارے
اندر گھپ ہنیرا وسدا — پھوکے ایہ تج دھج نیں سارے
کوڑ دی سُولی سچ نوں چاڑھن — اَنھے بولے جج نیں سارے
''آٹا گُھدی ہلدی کیوں اے'' — نکھڑن دے ایہ بج نیں سارے
بوہتے دانشور تے مُلاّں — کیہ دَسّاں بے چج نیں سارے
رب دا خوف نہ دل وچ بھورا — ہج ہج کردے حج نیں سارے

بازغہ قندیل

آ سائیں ہُن میرے نال — اج ہو جائے وصل وصال
تیرے باجھوں کُجھ وی ناہیں — سبھ کُجھ پھبدا تیرے نال
دِل کافر نوں ہٹکے کون — اُٹھ کھلوتا فیر سوال
ہجر فراق دے ننجے ویڑھے — ہنجو اج پئے کھیڈن حال
سُن قندیلؔ دے سوہنے رَبا — توں ای کریں جے کرم کمال

رفیق راجی

ویلے دی رفتار نوں ویکھ — کجھ تے ساڈے پیار نوں ویکھ
عینہ لہو دا دریا اے — روندے پئے اخبار نوں ویکھ
ویکھ نہ روگ رعایا دے — حاکم دے کردار نوں ویکھ
اڈیاں چک کے چار چفیر — اوہندی مست بہار نوں ویکھ
اگ لگے کی محلاں نوں — درداں بھری پکار نوں ویکھ
ایجے نہ اپنے آپ نوں ویچ — ایجے نہ اوس بزار نوں ویکھ
راجیؔ اپنی اصل پچھان — اندر دے فنکار نوں ویکھ

region too. Although these tribulations are of someway political in nature and political reforms an restructurings are needed to solve them, but they have too impinged on South Asian literatures and proved a challenge. A kind of diversification has emerged consequently. IN other words diversification is a challenge too, and it is being responded by insinuating a kind of unanimity; unanimity in a moral as well as in aesthetic sense, as you might say drawing attention to the intrinsic oneness of the extrinsic diversity of religion, language and ideology on the one hand and breaking up older generic demarcations on the other.

A Trilingual Literary Magazine
Simultaneously Available online as well as in Book Form.

HAREEM-E-ADAB

Compiled By:

Javed Haider Joya

Syed Tehsin Gilani

Co-ordinated by:

Imran Haider Thaheem, Tauqir Taqi,

Javed Amjad Bhatti.

Contact: 1-Setellite Town, Burewala, PC:61010, Pakistan.
E-mail:hareem_e_adab2@yahoo.com
hareem_e_adab2@hotmail.com
hareemeadab@gmail.com
Phone:92 (67) 3355546
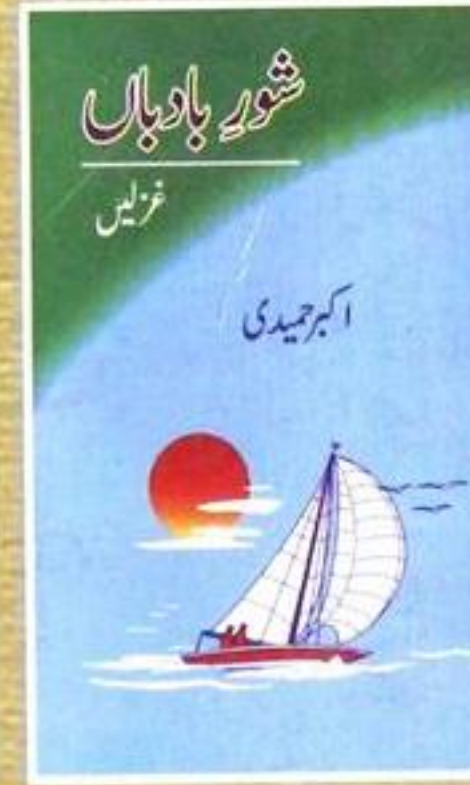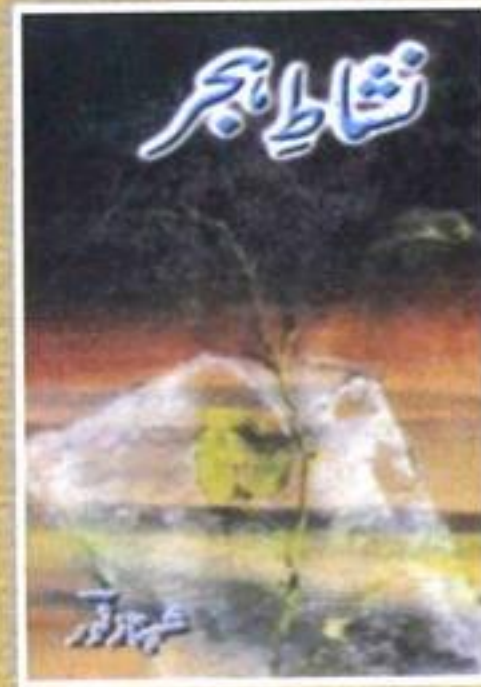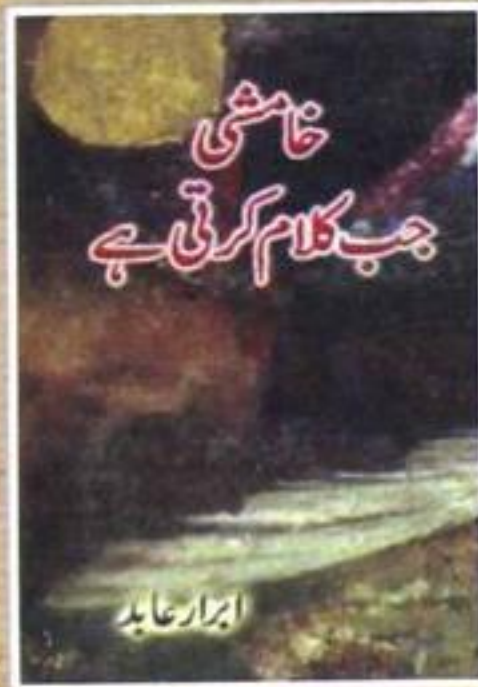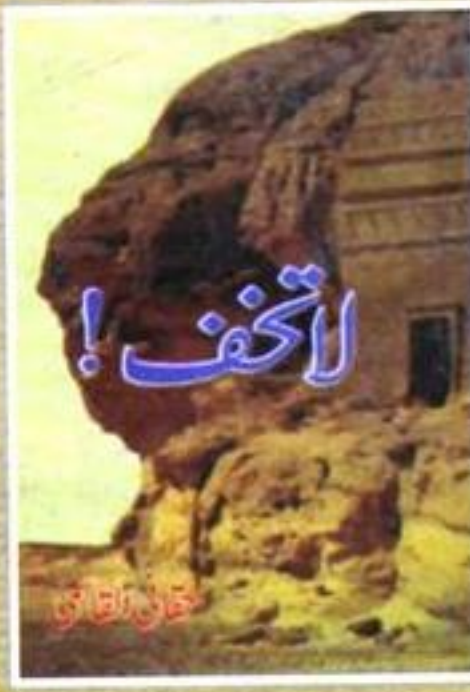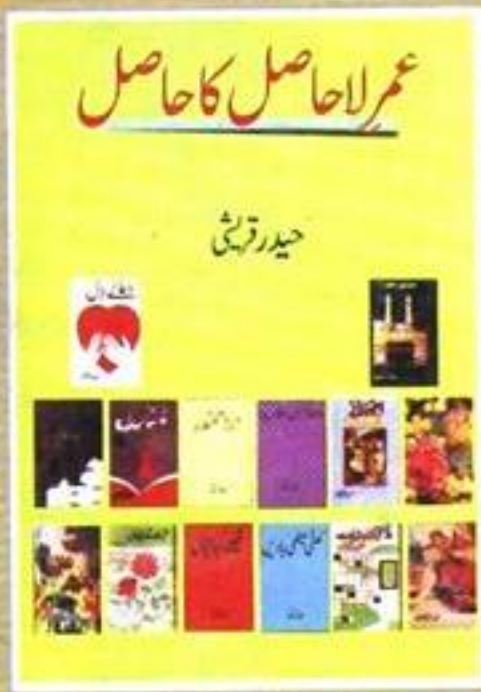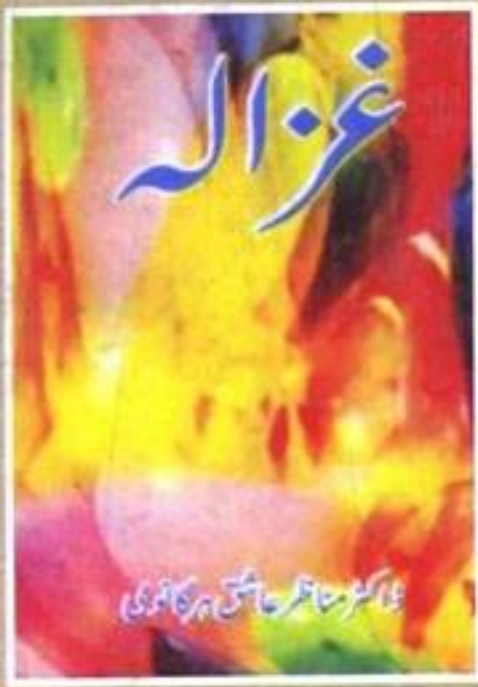
نوٹ: (۱) بیرون پاکستان سے موصول ہونے والی چیندہ، اور ''حریم ادب'' میں تبصرہ کی گئی تمام کتابوں کے رنگین سر ورق اعزازی طور پر بلا معاوضہ شائع کئے گئے ہیں۔ یہ روایت جاری رکھنے کی کوشش جائے گی (۲) وہ مصنفین جو اپنی کتابوں کے رنگین اشتہارات اندرونی صفحات پر شائع کروانا چاہیں، Rates کے لئے صرف دفتر ''حریم ادب'' کے اڈریس پر رابطہ فرمائیں۔ (۳) ''حریم ادب'' میں تبصرے بلا تعصب اور ادبی اقدار کے فروغ کے لئے شائع ہوتے ہیں۔ تاہم تمام تبصروں کے شائع ہونے کی گنجائش، ظاہر ہے، نہیں ہوتی۔ (ج۔ح۔ج)

CONTACT: 1-SETELLITE TOWN, BUREWALA, PAKISTAN-61010
Tel: 067-3355546, E-mail: hareem_e_adab2@yahoo.com